# DUE DATE

Cl No                Acc No.

Late Fine Ordinary books 25 Paise per day  Text Book Re 1/- per day, Over Night book Re 1/- per day



# جرعات

جلد | سالنامہ ساقی - دہلی - بابت جنوری و فروری ۳۲ء | نمبر ۱-۲

Munirul Hasan.

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# نگاہِ اوّلین

کیا فائدہ فکرِ بیش و کم سے ہوگا ٭ ہم کیا ہیں کوئی کام جو ہم سے ہوگا
جو کچھ کہ ہوا ہوا کرم سے تیرے ٭ جو کچھ ہوگا تیرے کرم سے ہوگا

الحمدللہ والمنۃ کہ ساقی کو جاری ہوئے تین سال پورے ہو گئے اور چوتھے میں قدم رکھا۔ اس عرصہ میں اپنی بساط بھر کوشش کی گئی کہ اردو لٹریچر کو ترقی دیجئے۔ ساقی اور بڑی حد تک اسے کامیابی بھی حاصل ہوئی۔ جن حضرات نے ساقی کے اجراء سے اب تک اس کے کل پرچے دیکھے ہیں، اس کی تدریجی ترقی کو محسوس کر سکتے ہیں۔ خمخانۂ ادب کا چھپا ساقی اپنے جرعہ کشوں کو ... بادۂ ناب سے متوالا بنا رہا ہے اس کا مزہ اس سے پوچھئے جس نے اس بادۂ سرجوش سے سرشاری حاصل کی ہو۔ ذوقِ این بادہ ندانی بخدا تا نہ چشی۔ زاہد خشک کے بس کی یہ بات نہیں کہ وہ تو خیام کی رائے میں "نقد" چھوڑ کر "ادھار" پر آس لگائے بیٹھا ہے۔

نیا سال شروع ہوا ہے نئے ولولوں اور نئی امیدوں کے ساتھ ساقی بھی میدانِ صحافت میں قدم اٹھا رہا ہے۔ یوں تو ابھی تک کسی ادبی پرچہ سے پیچھا نہیں رہا مگر اب بھی اس کے دل میں ترقی کا ارمان ہے۔ سالنامے کے مضامین سے اس کے آئندہ پرچوں کا اندازہ لگائیے۔

۱۹۳۲ء کے کل پرچوں کی ضخامت ۱۵۰۰ صفحات ہے۔ تین روپے سالانہ چندہ میں اتنی سالانہ ضخامت کسی اور پرچے کی نہیں ہے۔ ہر قسم کے بلند پایہ مضامین کے علاوہ نظر فریب تصاویر اور دیدہ زیب کتابت و طباعت میں بھی ساقی پیش پیش نظر آتا ہے۔ ہر سال چار خاص نمبر ساقی کو چار چاند لگاتے ہیں جو اسی قلیل چندہ میں مستقل خریداروں کی خدمت میں پیش کئے جاتے ہیں۔ ان چار خاص نمبروں میں سے "ظریف نمبر" "وردی نمبر" ساقی کے مخصوص نمبر ہوتے ہیں جو اپنی نمایاں خصوصیات کی وجہ سے انوکھے پرچے سمجھے جاتے ہیں۔ کوشش کی جا رہی ہے کہ اس سال ایک اور خاص نمبر کا اضافہ کیا جائے اور یہ نیا خاص نمبر بھی اپنی طرز کا پہلا پرچہ ہوگا۔ اس سال کے لئے جہاں ہم نے ساقی میں اور مفید اضافے کرنے کا ارادہ کیا ہے وہاں تصویروں کا بھی خاص انتظام کیا ہے چنانچہ ساقی کی آئندہ اشاعتوں میں متعدد تصاویر بھی شامل ہوں گی۔

## سالنامہ ساقی جنوری اور فروری کا مشترکہ پرچہ ہے

ہمیں بہت افسوس ہے کہ نامساعد واقعات کی بنا پر سالنامہ ساقی حسبِ اعلان دسمبر کے آخری ہفتہ میں شائع نہ ہو سکا۔ جناب اشتیاق احمد حسینی مہتمم ساقی کی طویل ناسازیٔ طبع اور منشی صاحب کی علالت کی وجہ سے سالنامہ

'SAQI'



موسم بہار اور ستم کش انتظار

Murari Art Press, Delhi

کی اشاعت میں تاخیر ہوئی لیکن اس کفارہ کو یوں ادا کرنے کی صورت نکالی کہ فروری کا پرچہ بھی سالنامہ ہی میں شامل کر دیا اگر جنوری کا پرچہ پندرہ دن دیر سے شائع ہو رہا ہے تو فروری کا پرچہ بیس دن پہلے شائقین ساقی کو مل جائیگا سالنامہ ساقی کی ضخامت ۲۲۲ صفحات ہوتی ہے اور عام پرچوں کی ۸۰ صفحات۔ چنانچہ اس نسبت سے بھی اگر سالنامہ کو دیکھئے تب بھی جنوری اور فروری کا یہ مشترکہ پرچہ گذشتہ سال کے سالنامہ اور فروری کے پرچے کی مجموعی ضخامت سے زیادہ ضخیم ہے۔

---

نئے سال کے ساتھ ساتھ مشہور اُردو رسائل کے سالنامہ بھی آئے جن میں سے نیرنگ خیال۔ ہمایوں عالمگیر۔ یادگار جہانگیر اور گرو گھنٹال اپنی اپنی طرز میں لاجواب رہے ایک نیا پرچہ کاروان نہایت آب و تاب سے لاہور سے جاری ہوا ہے اور سالنامہ ہی سے اسکی ابتداء ہوئی ہے یہ پرچہ صرف سال کے سال شائع ہوا کریگا۔ اس شان کا اُردو پرچہ آجتک دیکھنے میں نہیں آیا۔ صحافت اُردو کاروان کی اشاعت پر ناز کر سکتی ہے۔

ساقی بابت دسمبر ۳۲ء میں ایک نظم بعنوان "نگہ شوق کی شکایت" نواب ابو محسن بلگرامی کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ پرچہ شائع ہونے کے بعد متعدد حضرات نے ہمیں لکھا۔ نواب مذکور نے جناب اختر شیرانی کی یہ نظم سنہ ۲۷ء کے عشقیہ نگارین سے لفظاً بہ لفظ نقل کر کے ساقی میں چھپوا دی ہے ہمیں افسوس ہے کہ اختر صاحب کی یہ نظم ہماری نظر سے نہیں گذری تھی اور یہ قطعی ناممکن بھی ہے کہ ہر شاعر کا کلام ہماری نظر میں ہو۔ افلاس ایک ایسی کسوٹی ہے جس پر شرافت پرکھی جاتی ہے۔ اوچھی طبیعت والوں پر ناداری کا یہ اثر ہوتا ہے کہ اُن کا اخلاق اور بعض حالتوں میں ایمان بھی بگڑ جاتا ہے۔ اس کے ثبوت میں دور نہ جائیے۔ متذکرہ بالا نواب کی مثال موجود ہے۔ ع چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد۔

---

ہم اُن سب حضرات کے بیحد ممنون ہیں جنہوں نے سنہ ۳۲ء میں ساقی کی قلمی اعانت فرمائی خصوصاً:- خان بہادر میر ناصر علی صاحب۔ حضرت حسن نظامی۔ علامہ راشد الخیری۔ عبدالمالک آروی۔ جوش ملیح آبادی۔ ایم۔ اسلم۔ حضرت ناکارہ حیدر آبادی۔ محشر عابدی۔ اعظم کریوی۔ علی اختر۔ اختر۔ علامہ مضحک دہلوی۔ مرزا عظیم بیگ چغتائی۔ مرزا فرحت اللہ بیگ۔ فضل حق قریشی۔ سید انصار ناصری دہلوی۔ سید وزیر حسن۔ اثر صہبائی نصیر الدین ہاشمی۔ تنویر قریشی۔ سید ممتاز حسین دہلوی۔ اسعد الاشرفی۔ منظر انصاری۔ نہال سیوہاروی ظفر قریشی دہلوی۔ کنیز فاطمہ۔ مس حجاب اسمٰعیل۔ ح نقوی۔ سید بادشاہ حسن۔ اعظمی اجمیری۔ دیوانہ بریلوی تسنیم مینائی۔ نورالحسن برلاس۔ مقبول حسین احمد پوری۔ مرزا سلیم بیگ۔ آرزو جلیلی۔ رسا ہمدانی۔ محبوب طرزی۔ منشی کنہیا لال۔ سید انصار ناصری۔ وغیرہم

"شاہد"

---

# ارشادات عالیہ

از عالی جناب ہز اکسلنسی سر مہاراجہ کشن پرشاد بہادر یمین السلطنتہ شاؔد صدر اعظم حیدرآباد دکن

دل کو کر دیا بسمل اُس نے دل رُبا ہو کر
ہو گیا عدوئے جاں دیر آشنا ہو کر

عشق کی بدولت یوں بڑھ گئی مری عزت
رُتبۂ بقا حاصل کر لیا فنا ہو کر

درد ہو گیا افزوں دیکھ لی مسیحائی
درد کی دوا کیا کی تو نے خود دوا ہو کر

زندگی ہوئی بے کار عشق کا ہوا آزار
کر گیا مُجھے برباد مُجھ سے تو جُدا ہو کر

واہ ری مسیحائی لُطفِ زندگی اب کیا
نذر اُن کے جان کر دی جان سے خفا ہو کر

حیف تو نے اے ظالم کی نہ قدر عاشق کی
کھو دیا اعتبار اپنا دشمنِ وفا ہو کر

کس کا اعتبار اب ہو کوئی اب نہیں ہے دوست
دل بھی بے وفا تھا شاؔد اُس کا رہ گیا ہو کر

# شرحِ ہنگامۂ ہستی ہے گزرگاہِ خیال

یعنی

# تقریبِ وداعِ سالِ گذشتہ واستقبالِ سالِ حال

از جناب خان بہادر میر ناصر علی صاحب دہلوی

دُنیا کو جتنی مشابہت میکدے سے ہے اتنی کسی سے نہیں۔ جس طرح مستوں کی کوئی حرکت سمجھ میں نہیں آتی اس کی ساری باتیں نرالی دیکھیں۔ اس کا کارخانہ ہی مثل وضعِ مستان عجیب ہے ؎

مرنج اے شیخ از من گر سخن بے پردہ می گویم　　کہ ایں بے پردہ گفتنہا ز تاثیرِ خرابات است

ذرا سر اُٹھائیے تو ایسا خمخانۂ بے ستوں دیکھئے جس میں ایک ساغرِ واژگوں رات دن چل رہا ہے۔ گردن جھکائیے تو زیرِ قدم ایک اور ہی عالمِ سکوت، دیکھئے کہ اس طرف تو نعرۂ مستانہ تھا اُدھر چپ لگ رہی ہے۔ یہ اپنے حال میں مست ہیں تو وہ مدہوش پڑے ہیں، کسی کو کسی کی خبر نہیں۔ یہ اُن کی تو وہ اُن کی نہیں سُنتے۔ ساقیٔ روزگار نے دونوں کو ایسی داروئے بیہوشی پلادی ہے کہ وہ تو چپ ہو کر پڑ گئے اور یہ اپنی دُھن میں بکنے لگے۔ یعنی جب وہ تہ خم پہونچے تو دُردی کی طرح بیٹھ گئے اور یہ سرِ جوشِ مے کی طرح اُبلا کئے جب تک کہ یہ بھی اُنہیں میں جا ملے۔

جہاں نیست مستانہ در گفتگو　　زمیخانۂ اوست ایں ہائے و ہو

غرض یہ عالم ایسا خمکدہ ہے جس کا سر جوش سخن میں ہے، جس کی بدولت ہر شخص اپنی اپنی دُھن میں ہے۔ اسی میں زبان کا ہلانا نعرۂ مستانہ کے برابر ہے۔ رنگینیٔ کلام بادہ گلگوں سے بڑھ کر ہے، گلوئے خُم خوش بیانوں کی آوازیں ہیں، جوشِ فصاحت میں مَے پرتگال کی کیفیتیں ہیں۔ اس کی مستی سخن پرستی ہے۔ جس کے مرتبہ کو دنیا میں کوئی دولت نہیں پہونچتی۔ یہی ایک دولت ہے جس کے سوا انسان کچھ نہ لے۔ یعنی اگر اپنا بس چلے تو سب کو چھوڑ اسی کا ہو رہے۔ یا یوں کہئے کہ اگر آرزو اور حصول آرزو میں فرق نہ ہو۔ حوصلہ و زمانہ کا ساتھ ہو تو اپنے چلتے انسان اسے نہ چھوڑے۔ یہ وہ دولت ہے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ تک رہیگی۔ اس کا سِرا ازل میں تو کنارا ابد میں ہے، تمام دنیا کی قومیں کسی نہ کسی طرح اسی کی قائل ہیں۔

ابتدائے عالم کی نسبت توریت میں ہے کہ پہلے کچھ نہ تھا خدا نے جو کچھ کہا سو ہوتا گیا۔ انجیل میں ہے کہ شروع میں کلام تھا اور کلام خدا کے ساتھ تھا۔"

ازروئے اہلِ اسلام تمام عالم "کُن" سے ہوا۔ یہ سب سخن نہ ہو تو کیا ہوا؟ یہ تو آغاز کا حال ہوا، اب انجام دیکھئے کہ لازوال کتنا ہے۔ دُنیا میں کمال والوں کے ہمیشہ دو گروہ رہے ہیں۔ اہلِ سیف و اہلِ قلم۔ ان میں ظاہراً زیادہ اثر تلوار کا سمجھا جاتا ہے۔ سکندر نے اِسی کے زور سے ایک عالم کو ہلا دیا۔ ہلاکو، چنگیز خاں، تیمور، نادر وغیرہ ہزاروں نے اِسی

کی بدولت بہت کچھ سر اُٹھایا۔ مگر آخر کیا ہوا؟ یوں تو دیکھنے میں تلوار کا اختیار بڑی چیزوں میں ہے۔ مگر جن کو اس میں بڑی بڑی قدرتیں رہیں اُن کے حال پر غور کیجئے تو اُن کے سارے اختیار کیسے ناپائیدار اور درحقیقت کس قدر بے کار پائیے گا۔ سرِ دست تو اُن کی تلوار اور وفورِ اختیار بڑی نمود کا سبب ہوئی مگر نہ اُن کے لئے نہ دُنیا کے لئے کسی کا کچھ مآل ہوا۔

برخلاف اس کے اہلِ قلم ان سے کہیں اچھے رہے۔ فرعون اپنے ہزاروں شعلہ افشاں اسبابِ کارزار اور لاکھوں مبارزانِ آزمودہ کار کے ساتھ فنا ہو گیا۔ اور اب یہ بھی نہیں معلوم کہ مصر کے اتنے فرعونوں میں سے یہ کونسا تھا؟ مگر حضرت موسیٰؑ شریعت و کتاب کے سبب اب تک زندہ ہیں اور کلیم اللہ کہلاتے ہیں۔ فرعون کے مصریوں کا کہیں پتہ نہیں مگر دُنیا میں کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں اُمتِ موسوی نہ ہو۔

بڑے بڑے حبشیوں کے بڑے بڑے ستانے والے اب کہاں؟ کوئی اُن کے ناموں سے بھی اچھی طرح واقف نہیں، مگر حواریوں کا نام اُن کی انجیلوں کے سبب تمام عالم میں مشہور ہے۔ اسلام کو دیکھئے کہ صرف اپنے کلام مجید کے سبب کیسے کیسے دُشمنوں اور بڑے بڑے مخالفوں میں سربرآوردہ رہا۔ اور یہی کیا؟ کسی کی عظمت و جاہ (جنرل ہو یا بادشاہ) کا پتہ تھوڑے ہی دنوں بعد کاغذ و قلم کے سوا کہیں نہیں لگتا۔ تحریر کے سوا کوئی ساتھ نہیں دیتا ؎

بہ سلیم قست حسنِ بیں کشورِ معنی اس نقش ندارند جدیواں بہ نگیں ہا

اس تلوار کی حکومت و اختیار والے دیکھ لیں کہ اُن کے سامان کا اثر کتنا ناپائیدار ہے۔ اُس وقت تو ذرا شور مچا جس سے صاحبِ حکومت و اختیار خوش ہو لئے۔ مظلوم و بے کس رو دئے۔ پھر کیا تھا؟ مادرِ گیتی وہ وسیع دامن اور حوصلہ و ظرف والی ہے کہ جہاں سب کو ایک دفعہ ڈھانک لیا پھر کچھ نہیں۔ تلوار سے کوئی مُلک فتح ہوا جس کا غُل اُس وقت تو نوبت و نشان کی بدولت آسمان تک پہنچا لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد کسی کو یاد بھی نہیں رہا۔ برخلاف اِس کے صریرِ قلم کی آواز قیامت تک رہتی ہے۔ خیال کی رسائی کہاں نہیں جاتی؟ تلوار کی ظاہر میں تو دل تک پہنچتی ہے۔ یعنی وہ پرانی تو یہ اپنی تابعدار ہے، اور ایسی کہ جس سے سب کو لاچاری ہے، یا یوں کہیئے کہ وہ باہر کی تو یہ گھر کی حکومت ہے۔ وہ شحنۂ شہر تو یہ یارِ پری وش کی اطاعت ہے ؎

حیف است تنگاگ زگلستاں شناختن شاخ از خدنگ و غنچہ زپیکاں شناختن

یہ گفتگو مجھے خواہ مخواہ پھر عروسِ سخن کی طرف لے چلی کہ مے پرستی اسبابِ حُسن پرستی میں ہے۔ مستی میں ہوشیار رہنا جس سے ہو سکے رہے۔ مجھ سے تو رہا نہیں جاتا ؎

صیتِ قلم چو بانگِ غلغال دہر و رقم چو چہرہ و خال
تا تازہ و تر زنم رقم را در بادہ کشیدہ ام قلم را

---

وا کر دئے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حُسن غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

دیکھو تو یہ گوشۂ دل سے کون نکلا؟ جس نے خمخانۂ عالم پری خانہ بنا دیا جس کے دیکھنے کو الفاظ و معانی بیتاب ہو کر دوڑ سے۔ سحر بیانی نے قدم لئے۔ نغمے کی طرح مستیاں دہن سے اُبلنے لگیں۔ جادو بیانیاں بات بات پر لوٹنے لگیں۔ خوبانِ جہاں چھپ گئے۔ کسے مجال کہ اب کوئی دم مار سکے رند و پارسا یہ کہتے منفعل گئے ؎

با حُسن مکن دراز دستی ہشیار نشیں بوقت مستی

مستوں کے پیام تہ دل لب تک آئے کہ فدائے حُسنِ زیبا! جو جن کی نیرا ذرا اِدھر بھی! اُدھر دیکھنا تھا کہ دُخترِ رز کو بھول گئے۔ سب اسی کا کلمہ پڑھنے لگے۔ غرض جہاں دیکھا اسی کا بول بالا دیکھا۔ اور چونکہ فیضِ سخن سے دُنیا میں کوئی محروم نہیں رہا جس کو بھونے سے بھی حلاوتِ کلام کا مزہ پڑ گیا وہ پھر ہونٹ ہی چاٹتا رہ گیا۔ غرض سب کو گھر بیٹھے نعمت ہائے دُنیا کا مزہ آگیا۔ بے چلے پھرے سب کچھ دیکھ لیا۔ یہ کیا ملی سارے حوصلوں کی داد مل گئی۔ تمام آرزوؤں کی محنت ٹھکانے لگی۔ حسرت مندوں کو یہ سہارا ملا کہ اپنا دُکھ درد کہہ سکیں گے۔ حوصلہ مندوں کو ٹھکانا ہوا کہ اپنا چارا سُنیں گے۔ جب سارے جہان سے تنگ آئے تو یہاں آ بیٹھے۔ کہیں دل نہ لگا تو یہاں جی بہلا گئے۔

فرانس کے ایک لاجواب خوش بیان بالزیک نامی کو یہی تمنا رہی کہ "ہائے کوئی پری وش میری محنت کی داد دے، تو ساری جانفشانی ٹھکانے لگے۔ کوئی غنچہ دہن اتنا کہہ دے کہ بالزیک تو نے غضب کا خونِ جگر پیا!"

عروسِ سخن کی بدولت ہمیں یہ بات بالزیک سے کہیں زیادہ حاصل ہے۔ کیونکہ برخلاف مہوشانِ بازاری اس پردہ نشینِ گوشۂ دل نے ہمارے ساتھ وہ سلوک کئے جو بالزیک کی تمنا سے کہیں زیادہ تھے! وہ تو اسی قدر چاہتا تھا کہ اُسے روتے دیکھ کر کوئی رونے لگے۔ یہاں یہ روتوں کو ہنساتی ہے۔ اس کی غایتِ تمنا یہ تھی کہ کبھی کبھی چاکِ گریباں سی دیا کرے اور یہاں سینہ چاکی کا رفو کرنے کو موجود ہے۔ وہاں اسی قدر تمنا تھی کہ چشمِ خوں ریز سے آنسو پوچھ دے۔ یہاں کہو تو ساتھ رونے لگے۔ غرض جو کیفیت ہمیں اس کے طفیل میں نصیب ہے کسی کو کہاں ملی؟ ہم تڑپتے ہیں تو کسی کے نازک ہاتھ ہمارا دل تھام رہے ہیں۔ سر پٹکتے ہیں تو کسی کے زانو پر سر ہے۔ پہلو دُکھتا ہے تو بغل میں کچھ نرم سا رکھا ہوا ہے۔ ہمیں اضطراب تو وہاں بے چینی۔ ہمیں تکلیف تو وہاں بے کلی ہے۔

مگر بیداد دیکھئے کہ اس کی قدر ہمیں نہ ہوئی۔ اِس میکدہ کے مہمان سب جاں بہ لب ہو گئے۔ سارے مستانِ قدیم سو گئے۔ عروسِ سخن کا کوئی پوچھنے والا نہ رہا۔ اسکی وہ مٹی خراب ہوئی کہ خانۂ دل کے عوض یہ بے خانماں اب نہیں کہاں اور کس حال میں نظر آتی ہے۔

شبِ اخیر میں تم میرے ساتھ اس گلی تک ذرا چلو جسے اگلے کوچۂ فصاحت کہتے تھے۔ میں تمہیں اُس ٹوٹے مکان میں لئے چلتا ہوں جہاں سے شمع کی وہ دُھندلی روشنی دکھائی دیتی ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں کبھی آوازوں کے شور

سے کان پڑی بات نہیں سُنائی دیتی تھی۔ اب تم اپنے ہی دل کے دھڑکنے کی آواز سُن لو۔

اس وقت کی حالت جی میں سمجھ لینے کی ہے کہ سارا جہاں تو بے ہوش پڑا سو رہا ہے۔ سُنسان کا عالم ہے۔ اس میں ایک نازک اندام کسب میں کراہ رہی ہے۔ ایسی حالت میں جسے ذرا بھی آدمیت ہے اُس کا بھی قدم بے اختیار اُس مکان کی طرف اُٹھتا ہے کہ دیکھیئے تو سہی معاملہ کیا ہے؟ اس وقت تمکین وضبط کسے؟ گرتے پڑتے ہم دروازے تک پہنچے۔ دیکھا کہ ایک کریہہ منظر بُری شکل کا آدمی اندر سے نکلتا ہے جس کے بدن پر تمام جھریاں پڑ رہی ہیں چہرہ پر نہایت سختی برستی اور آنکھوں سے خون ٹپکتا ہے۔ ہم کو دیکھ کر یہ کچھ بڑاتا ہوا چلا گیا۔ کھٹکا تو ہمیں اُسی وقت ہوا مگر وہ بچ کر ایسا گیا کہ ہمیں زیادہ دیکھنے کا موقع نہ ملا۔ نہ اُن دردناک آہوں کے خیال میں جو اندر سے آرہی تھیں ہمیں کچھ سُوجھا۔ اندر جاکر کیا دیکھتے ہیں کہ یہ غضب کی مہ پارہ جس کی عمر بارہ تیرہ سے زیادہ نہیں غش میں ادھر اُدھر کروٹیں بدل رہی ہے مگر ہاتھ گلے پر ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ زیادہ تکلیف یہیں ہے ؎

ہاتھ رکھے ہیں اُٹھا زخم گلو پر دم حشر　　　مجھ سے ہوتا کہ میں جلاد کو رُسوا کرتا

اُسی وقت ذہن میں آیا کہ اُس کم بخت موذی پیر فرتوت کے جو ابھی ہمیں جاتے ملا (جسے سب زمانہ کہتے ہیں) یہ سارے کرتوت ہیں۔ بے ایمان گلا اس طرح گھونٹ گیا تھا کہ سانس مشکل سے لیتی تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ کوئی دم کی مہمان ہے۔

ہم نے اُٹھایا اور حال پوچھا تو بہت ہی آہستہ کچھ کہا جو کچھ سمجھ میں آیا اور کچھ نہیں کہا:۔

"لوگو! میں نے اپنا کیا پایا۔ زمانے کے مُنہ بہت لگ گئی تھی، کسی کا کیا قصور؟ جو کچھ ہوا میری قسمت کا لکھا ہوا۔ نہ اہل روزگار مجھے زمانے کے حوالے کرتے نہ یہ ہوتا۔ مرنے اور بھرنے کے سوا اب مجھ سے کیا بن پڑتا ہے؟"

یہ کہکر وہ پھر غش میں آگئی۔ لوگوں نے چادر اُڑھا دی، معلوم نہیں کہ چادر کے تلے اب لاش ہے یا جان بھی ہے۔ زمانہ کی ہوا لگے تو کچھ حال کُھلے کہ کچھ کُلبلاتا بھی ہے یا نہیں۔ مگر پہلے سُن لو کہ ؎

دربزم مرزن بلند و ستاں　　　آہستہ کہ خفتہ اند مستاں

تم کیا اور تمہاری بساط کیا؟ جہاں زمانہ ایسی بےہوشی سے اس طرح پیش آئے تمہیں اور تمہاری خرافات کو کون پوچھتا ہے؟۔

مگر اس مضمون میں عروسِ سخن کی حالتِ آخری سالِ اخیر کا رونا ہو گیا۔ آغازِ سال کی نسبت ہمیں بہت لکھنے کا منصب نہیں ؎

پُرزور تر از بادۂ تلخ است محبت　　　عشقے کہ بر و سال گزر کرد کُہن شد

اور نہیں تو حسبِ ضابطہ آغازِ سال کی نسبت کچھ لکھتے ہیں جس سے معلوم ہو اکہ ہمارا پرچہ اُس بچہ کی طرح جو گہوارہ سے بولا کیسا ہونہار ہے ؎

رازے کہ پیرِ صومعہ در خلوتِ نہ گفت　　　می ترسمش بہ میکدہ ہا برملا کنند

تنے کہ رفت ز پا بہ عذار می غلطد      سرے کہ رفت ز دوش از کنار می خیزد

دُنیا عجیب مقام ہے! اُس ہنگامہ جا و بیجا اور اُس کارگاہِ ہستی و فنا کا نام ہے، جہاں رات دن عدم و وجود میں لڑائی ہے۔ موت سے زیادہ ہستی کا کام جاری ہے! وہ جگہ ہے جہاں موت کو بھی زندگی سے لاچاری ہے۔ مرنے پر بھی زندگی سے مفر نہیں، پیدائش کی وہ دھوم ہے کہ کسی کو موت کی خبر نہیں۔ ایک جاتا ہے تو دو آتے ہیں، دو گئے تو چار آئے۔ دیکھتے ہیں تو ایک دانہ زمین میں چھپا اور سڑا مگر اس سے پیدا ہزار ہو گئے۔ ایک جسم بگڑا اور ہزار کیڑے دیکھ لیجئے۔

اِس سے کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ لو میں تناسخ کا قائل ہو گیا۔ میری غرض صرف اسی قدر ہے کہ یہاں موت میں بھی خلقت کا بازار گرم ہے۔ مرنے میں بھی پیدائشیں ہیں۔

# غزل

### از حضرت نہالؔ سیوہاروی

حُسنِ بشر کہیں ہیں، فروغِ قمر کہیں
چھائے ہوئے ہیں وسعتِ عالم میں ہر کہیں

کس کو رہے گا ہوش حساب و کتاب کا
وہ بے نقاب حشر میں آیا اگر کہیں

کب تک غمِ سرور سے خمیازہ کش رہوں
اے موجِ بادہ تو مرے لب سے گذر کہیں

سر تا پا زبان ہوں، جب بھی محال ہے
شکریۂ نوازشِ پیغام بر کہیں

مینا اُتار طاق سے، ناداں کہ آئی صبح
جاتی نہیں ہے شیخ نمازِ سحر کہیں

کس نشہ میں ہے، دیکھ نہ کھانا فریبِ دہر
دھوکا تجھے نہ دیتے ہوں دیوار و در کہیں

سوتے ہیں رندِ عرش پہ کملی کو تان کر
دیکھے ہیں اِس عروج کے زاہد بشر کہیں!

سر تن سے کیا گیا مجھے آرام آگیا
قاتل کے بھیس میں تو نہ تھا فتنہ گر کہیں

زاہد جوارِ میکدہ میں اب تو آگئے
آکر یہاں نہ جائیں گے ہم عمر بھر کہیں

قسمت میں مے نہیں ہے تو ساقی بھی کیا کرے
چلتی نہیں خلافِ قضا و قدر کہیں

ڈرتے ہیں شاخِ گل کی طرف ہاتھ کیا بڑھائیں
کوتاہی نصیب نہ ہو بیشتر کہیں

تو کیا جواب دے گا، بتا، ہم نے حشر میں
تیری جفائیں داورِ محشر سے گر کہیں

کیفیتِ بہارِ چمن اب کہاں نہالؔ
بُلبُل کہیں ہے، اُس کے شکستہ ہیں پر کہیں

# غیر مطبوعہ رُباعیات امیر مینائیؒ

مرسلہ اسمٰعیل احمد مینائی تسنیم

کیا دور ہے اہلِ نظم گھبراتے ہیں
سامان تو اردو کے نظر آتے ہیں
اس عہد کی شاعری ہی گویا ہے جہاد
مضمون سے مضمون لڑے جاتے ہیں

---

آفت ہے ضعیفی میں تن لاغر ہے
ٹوٹے ہیں پہاڑ بیکس و مضطر ہے
ہیں بال سفید اور دل افسردہ
مُردہ تو بغل میں ہے کفن سر پر ہے

# The Influence of the Conflict Between Classicism and Romanticism on Urdu Poetry

# اُردو شاعری پر کلاسیت و رومانیت کی جنگ کا اثر

از جناب محمد حسین ادیب ایم۔اے۔ بی۔ ای۔ ڈی۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو اُردو شاعری میں قدامت پسندی اور جدّت پرستی کی جنگ مغربی ادبیات میں کلاسیت اور رومانیت کی جنگ محض نقالی ہے۔ انگلستان کا ملک الشعرا "ورڈس ورتھ" رومانیت کا زبردست حامی تھا۔ اس نے اپنے مجموعہ کلام کے مشہور "دیباچہ" میں کلاسیت پر جو اعتراضات کئے ہیں اور رومانی شاعری کے لئے جو اصلاحات پیش کی ہیں انہیں کی مولانا حالی نے اپنے "مقدمہ شعر و شاعری" میں تقلید کی ہے۔ قدیم اُردو شاعری کی تنقیص اور جدید شاعری کی اصلاح کے متعلق مولانا نے جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے ان کا اکثر و بیشتر حصہ "ورڈس ورتھ" کی تجویز سے ماخوذ ہے۔ گویا "مقدمہ" "دیباچہ" کی صدائے بازگشت ہے۔ مولانا حالی کے بعد ہمارے ملک میں جدید شاعری کے حامیوں کی ایک جماعت قائم ہوگئی ہے۔ لیکن اس جماعت کا کارنامہ یورپ کی تحریک رومانیت کے پُرجوش علمبرداروں کے مقابلہ میں بالکل بودا اور پست نظر آتا ہے۔ ثانی الذکر کے دلوں میں جو خلوص، جوشِ کار اور شوق ترقی کارفرما ہے اس کا شائبہ بھی اوّل الذکر کے ہاں نہیں پایا جاتا۔ دونوں کی کارگذاریوں میں وہی فرق ہے جو اصل اور نقل میں ہوا کرتا ہے۔

مغرب میں ادبی انقلاب اصول ارتقا کے تحت ظہور پذیر ہوا ہے۔ لیکن ہمارے ملک میں اپنے عظیم المرتبت اسلاف کے روشن کارناموں کو بُرا کہنے کا رواج محض یورپ کی کورانہ تقلید اور اس کے سیاسی و حربی استیلا سے مرعوبیت کا نتیجہ ہے۔ سیاسی غلامی بالعموم ذہنی و روحانی غلامی کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔ رومانی تحریک کے حامیوں نے اگر کلاسیکل لٹریچر سے بغاوت کی تو اس کے بدلے میں اس سے اعلیٰ و برتر ادبیات کے نمونے بھی پیش کئے۔ اگر انہوں نے قدیم نظام کو توڑا تو اس سے زیادہ باقاعدہ نظام قائم بھی کیا لیکن ہمارے ہاں قدما کے لطیف و رنگین طرزِ بیان کی صرف زبان سے نکتہ چینی کی جاتی ہے اور اسی کو تنقید کا اعلیٰ مقصد خیال کیا جاتا ہے۔ کسی نے قدیم روش ترک کرکے کوئی بہتر مسلک قائم نہیں کیا۔ یہاں فقط خود آرائی اور بے راہ روی کو اجتہاد و تجدّد کا مرادف سمجھ لیا گیا ہے۔ کسی کو بحر و وزن کی قید اظہارِ خیال میں رُکاوٹ پیدا کرتی ہے تو کسی کی آنکھوں میں ردیف و قافیہ خار بن کر کھٹکتے ہیں۔ کوئی نحوی اُصول کی پیروی غیر ضروری خیال کرتا ہے تو کوئی عروضی قیود کو پائے آزادی کی زنجیر سمجھتا ہے۔

ذہنی انحطاط ہی کی جانب تو ہر شخص مائل نظر آتا ہے، لیکن کسی کو تعمیر کی توفیق نہیں ہوتی۔ جدّت پرست طبائع سے عملاً کوئی ایسا نمایاں کارنامہ پیش نہیں کیا جاتا ہے جو قدما کی رنگین بیانیوں کا جواب ہو سکے۔ اگر کوئی شخص پرانی ڈگر سے ہٹ کر چلا بھی تو راستے خود کو خارزار میں پایا جہاں اس کا دامن کانٹوں میں اُلجھ کر رہ گیا۔

کلاسیت اور رومانیت کی بحث بہت طوالت چاہتی ہے کیونکہ اس کا تعلق ادبیات کے ہر شعبہ اور ہر صنف سے ہے۔ تفصیلی بحث کی تو یہاں گنجائش نہیں ہے۔ البتہ اُردو شاعری میں نام نہاد حریت و آزادی کے علمبرداروں کو مختصراً ان کی نوعیت و ماہیت سے آگاہ کر دینا مناسب ہو گا تاکہ وہ کلاسیت اور رومانیت کی جنگ اور اُردو کی قدیم و جدید شاعری کی کشاکش کے فرق دریافت کر کے اپنے لئے کوئی مفید و صحیح راہ نکال سکیں۔ موجودہ زمانہ کی کوئی مغربی ادبی پیداوار اُس وقت کلاسیکل کہلاتی ہے جب کہ شاعر یا مصنف نے یونانی و لاطینی ماہرین فن کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی ہو اور فصاحت و بلاغت کے قدیم آئین و ضوابط کو شمع راہ بنایا ہو۔ اس کے برعکس اگر کوئی ادیب قدیم یونانی ولاطینی اصول و قوانین کی پیروی سے بے نیاز ہو تو اس کا ادبی کارنامہ رومانی کہلاتا ہے۔ کوئی ادبی پیداوار جس کا طرۂ امتیاز بے آئینی و بے قاعدگی ہو اعلیٰ درجہ کی ادبیات میں جگہ نہیں پا سکتی لیکن یورپ کے رومانی مصنفین نے نہایت بلند پایہ شاعری، ڈرامے اور افسانے بطور یادگار چھوڑے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے قدیم اصول و ضوابط کی خلاف ورزی کی تو ان کی جگہ ان سے بہتر قوانین بنا کر ان کی پیروی کی ہے۔ اُردو کے جدّت پرست شعراء کا یہ وتیرہ نہیں ہے۔ وہ قدیم عروضی و نحوی اصول و قواعد کی خلاف ورزی کر کے تمام قیود و شرائط سے آزاد ہو جانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ایک پروفیسر صاحب جو خود کو آزادی و حریت کا علمبردار خیال کرتے ہیں، ارشاد فرماتے ہیں کہ "میں ایک قید سے آزاد ہو کر دوسری قید اپنے اوپر عائد کرنا نہیں چاہتا۔ شاعری [illegible] میں آزاد ہے کہ جہاں اس کا جی چاہے نون کا اعلان کرے اور جہاں موقع دیکھے نون غنہ استعمال کرے۔ کسی لفظ کو مشدد یا بہ تخفیف استعمال کرنا بھی اس کی مرضی پر موقوف ہے۔ آج کل جب قافیہ کی ضرورت ہی تسلیم نہیں کی جاتی تو رابطہ یا شائگاں کی بحث ہی بیکار ہے۔" لیکن فی الحقیقت اس قسم کا تصرف شاعر کے ضعف و عجز کی دلیل ہے [illegible] میں خود آرائی مزاج اور پراگندگی کے مرادف ہے۔ جس طرح امور سلطنت کے اہتمام میں قوانین ملکی کی پیروی حریت و آزادی کے منافی نہیں بلکہ ضبط و انتظام کے قیام کی مؤید ہے اسی طرح ادب و شاعری کی قیود و ضوابط کی پیروی کسی قادر الکلام شاعر کے اظہار خیالات کے لئے سدِ راہ نہیں بنتی۔ البتہ ادنیٰ درجے کا [illegible] قدم قدم پر رکاوٹیں محسوس کرتا ہے۔ ان کا بے قاعدہ و بے اُصولی کلام شاعری کے [illegible] صافی کو [illegible] ایسے حضرات چمنستانِ سخن میں صرف گلگشت کر لیا کریں لیکن اس کی کسی روش یا کیاری میں اپنے [illegible] تو شاعری ان کی بہت ممنون ہو گی۔

کلاسیکل دبستان کے انتہا پسند حامیوں کا قول ہے کہ نظم میں یا نثر میں قدیم پیرایۂ [illegible] اسلوب اختیار کرنے کی ضرورت نہیں۔ تجربہ سے ثابت ہے کہ قدیم طریقہ بہترین اور پایۂ تکمیل [illegible]

کسی ادیب کو اس سے بڑھ کر اور کوئی نمونہ دستیاب نہیں ہوسکتا۔ اس لئے ادب و شاعری میں قدما کے اصول وضوابط کی پیروی ضروری امر ہے۔ جو شخص قدیم ڈگر سے ہٹ کر چلے گا وہ کبھی منزلِ مقصود کو نہیں پہنچ سکتا بلکہ گمراہی و ضلالت کے گڑھے میں گر جائیگا۔ نئی نئی راہیں نکالنا ادب و زبان کے حلق پر چھری پھیرنا ہے۔ ہر ملک میں ایک طبقہ قدامت پسندوں کا ہوا کرتا ہے جو قدیم ادبیات کا دلدادہ ہوتا ہے۔ وہ پرانی روایات کی حمایت کرتا ہے اور ہر جدت، بدعت یا تبدیلی کو خطرناک سمجھتا ہے۔ اس کا اعتقاد ہے کہ جو چیز صدیوں کے ارتقا و ترقی کے بعد قائم ہوئی ہے اس کی شائستگی و نفاست کا نئی چیزیں مقابلہ نہیں کرسکتیں۔ کلاسیت کے انتہا پسند حامیوں کی یہ سخت غلطی ہے کہ وہ زبان کو ساکن یا مکمل و غیر تغیر پذیر تصور کرلیتے ہیں جس میں ترقی کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں ہے۔ اگر کوئی موجودہ مغربی زبان یونانی یا لاطینی السنہ کی طرح معراج کمال کو پہنچ گئی ہوتی تو حامیانِ کلاسیت کا بیان صحیح خیال کیا جاتا اور اس مکمل زبان کو نئی جدتوں سے محفوظ رکھنے کی ضرورت پیش آتی۔ لیکن یورپ کی تمام زبانیں ابھی نامکمل ہیں اور ارتقا کے مدارج طے کر رہی ہیں اس بنا پر رومانی تحریک کے حامی جواب دیتے ہیں کہ قدیم اصول وضوابط سے سرمو تجاوز نہ کرنے اور پرانی لکیر پر چلتے رہنے سے زبان کی ترقی رک جاتی ہے۔ زبان میں وسعت، ہمہ گیری اور تنوع پیدا کرنے کیلئے نئی راہیں اختیار کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ اگر کسی شخص کو قدرت کی جانب سے ایسا دل و دماغ عطا ہوا ہو کہ وہ قدیم چیزوں سے بہتر و مفید تر چیزیں پیش کرسکے تو اسے ضرور رومانی تحریک کا ساتھ دینا چاہئیے۔ ہر ملک میں قدامت پسند جماعت کے بالمقابل جدت نواز طبقہ بھی پایا جاتا ہے جو عموماً ایسے نوجوانوں پر مشتمل ہوتا ہے جن کا دل ولولہ اور امنگ سے بھرا ہوتا ہے۔ وہ کسی قسم کی قید، بندش یا دباؤ کو گوارا نہیں کرتے۔ وہ قدیم سے زیادہ دلکش، رنگین اور پُرلطف اشیا پیش کرنے کی حتی المقدور کوشش کرتے ہیں۔ یہ بات ہے کہ ان دونوں جماعتوں کی مسابقانہ و حریفانہ سعیِ عمل کی بدولت بہترین ادبی کارنامے معرضِ وجود میں آتے ہیں۔

لفکاڈیو ہرن کا بیان ہے کہ خَیْرُ الْاُمُوْرِ اَوْسَطُہَا کا مقولہ ادبیات کے لئے نہایت خطرناک ہے۔ اس اصول کے تحت انسان جو کام کرتا ہے وہ صرف ادھورے دل سے اس مقولہ کی پیروی جوش کار، سرگرمی اور تلاش و شوقِ جستجو کو زائل کردیتی ہے۔ دنیا میں ہر قسم کی ترقی خواہ وہ ادبی ہو یا علمی، مذہبی ہو یا معاشرتی یا اقتصادی انتہا پسندانہ طرز روش کی رہین منت ہوتی ہے لیکن صرف ایک ہی جانب سے انتہا پسندی ترقی کے لئے مفید ثابت نہیں ہوتا۔ البتہ اگر دونوں جانب کی انتہا پسند جماعتیں ایک دوسرے پر تفوق حاصل کرنے کیلئے سرگرم عمل ہوں تو نہایت کامیاب نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ بالعموم عمر رسیدہ لوگ درمیانی راستے پر چلتے ہیں۔ یہ درمیانی راستہ ان کی وسیع معلومات اور بیش بہا تجربہ پر مبنی ہوتا ہے۔ درمیانی راہ کی تلاش ان کی پژمردگی و افسردہ دلی کی دلیل ہوگی۔ ناتجربہ کار نوجوانوں کو دنیا کی ورود کی کیا غرض۔ ان کے دل میں تو ہر وقت جذبات کا طوفان برپا رہتا ہے۔

ان کے مزاج میں گرمی، تیزی، جوش اور غلو کا مادہ فطرتاً موجود ہوتا ہے۔ یہی چیزیں انتہا پسندی کے لوازم ہیں۔ اصلاح و ترقی کے لئے ہنگامہ آفریں کوششیں بوڑھوں کا کام نہیں۔ عمر رسیدہ لوگ کسی کام میں سوچ بچار کر اور دیکھ بھال کر ہاتھ ڈالتے ہیں لیکن جوشیلے نوجوان جذبات سے مغلوب ہو کر سمندر میں گھوڑے دوڑانے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ جذبات کی آتش فشانی کے آگے غور و فکر اور تدبر و تحمل کو سپر انداز ہونا پڑتا ہے۔ اصلاح و ترقی کا دار و مدار نوجوانوں ہی کی کوہ ہمتی، جوش و خروش، ایثار و قربانی اور ہیجان جذبات پر ہے۔ نوجوانوں کے لئے درمیانی راستہ بالکل ناموزوں ہوتا ہے۔ اُن کو ہمیشہ انتہا پسند رہنا چاہیئے۔ اس میں اگر وہ غلو و مبالغہ اور تعصب و طرفداری سے بھی کام لیں تو کوئی مضائقہ نہ ہوگا۔ الغرض لفکاڈیو ہرن کے خیال کے مطابق یہ سوال کوئی اہمیت نہیں رکھتا کہ نوعمری میں کسی ادیب یا شاعر کو قدامت پسند بننا چاہیئے یا جدت نواز۔ کلاسیکل یا رومانی۔ دونوں دبستانوں میں سے کسی ایک کا انتخاب اس کی ذاتی دلچسپی، ہمدردی اور اخلاص پر منحصر ہے۔ لیکن جب وہ کسی دبستان میں شریک ہو جائے تو اسے چاہیئے کہ اس کا زبردست حامی بنے۔ انتہا پسندی کو خضر راہ بنائے اور اپنے حریف پر سبقت و برتری حاصل کرنے کی حتی الامکان کوشش کرے۔ یہی اس کی بہترین ادبی خدمت متصور ہوگی۔ اعلیٰ ادبی تصنیفات کی تکوین جذبۂ انتہا پسندی کی رہین منت ہوتی ہے۔ اگر کوئی شاعر ابتدا ہی سے درمیانی راہ اختیار کر لے تو اس کے دل سے مقابلہ و مسابقت کا جوش مٹ جائیگا۔ وہ سرگرمی و جانفشانی سے کام نہ لے گا اس لئے اس کی محنت کا ثمرہ ادبیات میں کوئی مفید اضافہ ثابت نہیں ہو سکتا۔

بہرحال مغربی دُنیا میں جس طرح زندگی کے ہر شعبہ میں انتہائی جد و جہد اور کشاکش کا نظارہ دیکھنے میں آتا ہے اسی طرح میدان ادب میں بھی مقابلہ و مسابقت کا تماشہ نظر آتا ہے۔ کلاسیت و رومانیت کی باہمی آویزش بہترین ادبی پیداوار کی ضامن ہے۔ دونوں دبستانوں کے حامی ایک دوسرے پر تفوق و برتری حاصل کرنے کی انتہائی کوشش کرتے ہیں۔ بحر فکر میں غوطے لگا کر نئے نئے آبدار موتی نکالتے ہیں اور جوہریان سخن کے آگے پیش کرتے ہیں۔ کیا ہمارے یہاں کے ادیبوں اور شاعروں کی یہ حالت ہے؟ کیا یہاں مقابلہ و مسابقت کا بازار گرم ہے؟ ہرگز نہیں، یہاں پُرخلوص ادبی خدمت کا جذبہ مفقود ہے۔ یہاں محض یورپ کی تقلید میں قدیم اُردو شاعری پر جا و بیجا اعتراض کئے جاتے ہیں۔ قدیم روش کو توڑ کر اس سے بہتر روش قائم کرنے کی مطلق کوشش نہیں کی گئی۔ جدید شاعری کی ابتدا کرنل ہالرائڈ کے قائم کردہ مشاعروں سے ہوئی جس میں شعرا کو بجائے مصرع طرح کے کسی مخصوص مضمون پر طبع آزمائی کی دعوت دی جاتی تھی۔ انگریزی شاعری کا بڑا حصہ وصف نگاری پر مشتمل ہے۔ مذکورہ مشاعرے میں وصف نگاری و مسلسل گوئی پر بڑا زور دیا جاتا تھا لیکن یہ ایسی نئی چیزیں نہ تھیں جن سے لوگوں کے کان آشنا نہ ہوں بلکہ ایک قدیم صنف سخن کو رائج کر کے جدت کا اظہار کیا گیا۔ علاوہ بریں اُردو زبان کی ہیئت، ساخت، فطرت، بساط اور امتیازی خصوصیات کا لحاظ کئے بغیر محض انگریزی کی تقلید میں نظم معرا لکھنے کی کوشش کی گئی جس کی ناکامیابی یقینی امر تھی۔ اگر یورپ کی طرح یہاں بھی مقابلہ و مسابقت کا سچا جوش پیدا ہو اور جدت نواز طبائع

تقلید و نقالی ترک کر کے صرف صحیح ادبی خدمت کو اپنا مطمح نظر بنائیں اور پورے غور و توجہ سے کام لے کر کوئی ایسی نادر و دلکش چیز پیش کریں جو قدیم شاعری سے بڑھ کر نہ سہی اس کے مساوی الرتبہ بھی ہو تو البتہ کچھ مفید نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔

دخانی انجن کا ایک حصہ ریگولیٹر یعنی ناظم کہلاتا ہے، جو مشین کی رفتار کو قابو میں رکھتا ہے۔ اگر ناظم نہ ہو تو کل پرزے نہایت تیزی اور بے قاعدگی سے حرکت کر کے ٹوٹ جائیں گے۔ ناظم فی الحقیقت انجن کا محافظ ہے جو اس کی حرکت اور رفتار کو حد اعتدال سے بڑھنے نہیں دیتا۔ کلاسیکل تحریک بھی ادبیات کے لئے وہی کام انجام دیتی ہے جو ناظم انجن کے لئے۔ قدامت پسندی کا جذبہ ادبی معاملات میں اعتدال قائم کرتا ہے اچانک تبدیلیوں اور انقلابوں کو روکتا ہے اور ادب و شاعری کی مشین کو پاش پاش ہو جانے سے بچاتا ہے۔ تاہم اگر ہر شخص قدامت پرست بن جائے اور مضمون و اسلوب میں جدت طرازی و نادرہ کاری کی کوشش نہ کرے تو ادب و شاعری کی ترقی یقیناً رُک جائے گی۔ جن جن ملکوں میں کلاسیت و قدامت پسندی کو زیادہ دنوں تک سیادت حاصل رہی وہاں پہلے تو ادبی رفتار میں ٹھہراؤ واقع ہوا پھر انحطاط و زوال شروع ہو گیا۔ اسی طرح اگر رومانی تحریک کو قابو میں نہ رکھا جائے بلکہ بالکل آزاد اور بے لگام چھوڑ دیا جائے تو نتیجہ اور بھی خطرناک پیدا ہو گا۔ اول اول کلاسیت کے پنجۂ استبداد سے نجات حاصل کرنے کے لئے چند نئی باتیں ایجاد کی جاتی ہیں اور بعض جابرانہ اصول کو پسِ پشت ڈال دیا جاتا ہے لیکن تھوڑے دنوں کے بعد ایسی بے صبری اور آزادی کی ہوا چلتی ہے کہ تمام اصول و ضوابط جن کی پہلے ہر شخص پیروی کرتا تھا ٹوٹنے لگتے ہیں۔ پرانی اور نئی ہر قسم کی پابندیاں اُٹھ جاتی ہیں۔ اور ادبی دنیا میں انتشار، بے آئینی اور تاراج پھیل جاتا ہے۔ ایسی حالت میں عوام اور خواص سب کے سب بے ترتیبی اور پراگندگی سے بیزار ہو کر کلاسیت کی حمایت کرنے لگتے ہیں اور قدامت پسند جماعت پھر برسر اقتدار ہو جاتی ہے۔ آج کل فرانس میں ادبی حریت کی بے اعتدالی کی وجہ سے شدت کے ساتھ ردِّ عمل شروع ہو گیا ہے اور کلاسیت اور قدامت پسندی کی جانب لوگوں کا عام میلان پایا جاتا ہے۔ انگلستان میں بھی ردِّ عمل کے علامات ظاہر ہو چکے ہیں۔ کئی سال تک وہاں رومانیت کا دور دورہ رہا اس کے بعد شاعری کی فضا میں خاموشی رُونما ہوئی پھر تنزل و انحطاط کا دور آیا۔ اب وہاں بھی اکثر نقاد قدما کے فصیح و بلیغ اسلوب کے مداح نظر آتے ہیں۔ بہرکیف جب زمانۂ دراز کے بعد کلاسیت دوبارہ نمودار ہوتی ہے تو اس کی استبدادیت میں بہت کچھ فرق آ جاتا ہے۔ اپنی شکست سے وہ پورا تجربہ حاصل کر لیتی ہے۔ دوبارہ برسرِ اقتدار آنے پر اس کی طبیعت سے جبر و تشدد کا مادہ زائل ہو جاتا ہے اور وہ فیاضی، ہمدردی، رواداری اور وسیع المشربی کا شیوہ اختیار کر لیتی ہے۔ اسی طرح رومانیت بھی اپنی ہر شکست سے کچھ نہ کچھ سبق حاصل کرتی ہے اور اپنی غلو پسندی، عدم التفاقی، بے آئینی اور جارحانہ روّیہ ترک کر کے بڑی حد تک اصول و ضوابط کی پیروی کرنے لگتی ہے۔ الغرض ہر انقلاب و تغیر کے بعد قدامت جدت کی طرف اور جدت قدامت کی جانب مُصالحانہ قدم بڑھاتی ہے اور بالآخر دونوں ایک دوسرے سے

مصالحہ گیر ہوتی ہیں۔

کلاسیت کی راہ پُرامن ہے لیکن رومانیت کے راستہ میں بڑے بڑے خطرے پیش آتے ہیں تاہم اصلاح و ترقی کے لئے خطرات کا مقابلہ کرنا ضروری ہے۔ ہر شخص مصلح نہیں بن سکتا۔ جدت و نُدرت پیدا کرنے کے لئے بہترین دل و دماغ کی ضرورت ہے۔ قدیم اصول و ضوابط کی محض خلاف ورزی کرنے سے کوئی شخص رومانی دبستان کا بہت بڑا ادیب یا شاعر نہیں بن سکتا۔ "نہ ہر کہ آئینہ سازد سکندری داند"۔ مدتوں کی بنی بنائی چیز کو توڑ دینا نہایت آسان ہے۔ کوئی عالیشان عمارت برسوں کی محنت و عرق ریزی سے تیار ہوتی ہے لیکن وہ صرف چند گھنٹوں میں منہدم و مسمار کر دی جا سکتی ہے۔ معمار کا کام محض قدیم عمارت کا توڑنا نہیں بلکہ اس سے بہتر اور عالیشان عمارت تیار کرنا ہے۔ اسی طرح رومانیت کا کام صرف تخریبی نہیں بلکہ تعمیری بھی ہے۔ کامیاب رومانی ادیب وہ ہے جو قدیم ادبی عمارت کو اگر توڑے تو اس کے بجائے کوئی اعلیٰ و شاندار عمارت تعمیر کرے۔ اگر قدیم عظیم الشان عمارت کو ڈھا کر کوئی شخص اس کے بدلے میں پھوس کا جھونپڑا تیار کرے تو وہ معمار نہیں بلکہ تخریب و ہلاکت کا دیو کہلائے گا۔ ایسے شخص کی مزاحمت کرنا اور اس کو تخریبی کاموں سے باز رکھنا ہر محبِ وطن کا فرض ہے۔ ادبی دنیا میں کوئی جدید و نادر کارنامہ پیش کرنے کے لئے کمال کی ضرورت ہے۔ جب کوئی جدت پرست و حریت نواز ادیب کوئی شاندار افسانہ یا ڈرامہ یا نظم قدیم ڈگر سے ہٹ کر لکھنے کا قصد کرے تو اُسے چاہیئے کہ پہلے اپنی قوتِ بازو کا اچھی طرح جائزہ لے لے۔ اپنی استعداد و قابلیت پر غور کرے اور سوچے کہ قدیم اسلوبِ بیان ترک کر کے محاورہ روزمرہ اور عوام کی بول چال کے استعمال سے وہ اپنی ذہنی پیداوار میں وہی تاثیر، رنگینی، دل آویزی و لطافت پیدا کر سکتا ہے یا نہیں جو قدما کے طرزِ نگارش کا طرۂ امتیاز ہیں۔ اگر وہ اپنے اندر اس کی صلاحیت پائے، اگر اس کا ضمیر اثبات میں جواب دے تو اسے ضرور نیا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے۔ لیکن قدیم نمونوں سے بہتر اور زیادہ موثر کارنامہ پیش کرنے کی صلاحیت نہ رکھنے کی صورت میں اسے بھول کر بھی قدیم راستہ سے ہٹ کر قدم نہ رکھنا چاہیئے ورنہ وہ بھٹک کر قعرِ ضلالت میں گر جائے گا۔

بعض ایسے اشخاص بھی پائے جاتے ہیں جن پر فیضانِ الٰہی تجلی ریز ہوتی ہے اور جو جدید راہیں نکالنے کی صلاحیت رکھتے ہیں تاہم ان کو سوسائٹی کے خوف سے قدیم روش ترک کرنے اور رسمی و رواجی طریقوں کے خلاف عمل کرنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ لیکن یہ ان کی اخلاقی کمزوری متصور ہوگی۔ صاحبِ استعداد کو عواقب و نتائج کی پرواہ نہیں کرنی چاہیئے۔ جن لوگوں کو کامل یقین ہو کہ وہ قدیم تصنیفات سے بہتر کارنامہ پیش کر سکتے ہیں انہیں ضرور جدید راہ پر گامزن ہونا چاہیئے اور ناقدروں کی نکتہ چینی یا عیب جوئی سے خوف نہیں کرنا چاہیئے۔ یورپ میں رومانی تحریک بڑی بڑی قربانیوں کے بعد سرسبز ہوئی تھی۔ صرف مذہب کی حمایت اور ملک و قوم کی حفاظت ہی کے لئے انسان کو جانبازی و ایثارِ نفس اور قربانی و شہادت سے کام لینا نہیں پڑتا بلکہ ادب و شاعری کی دُنیا میں بھی اس کی متعدد مثالیں پائی جاتی ہیں۔ اصلاح خواہ مذہبی ہو یا معاشری، علمی ہو ادبی، اس کے لئے ذاتی مفاد کی قربانی ضرو

شئے ہے۔ مغربی دنیا میں کلاسیت کو بڑی بڑی قوتوں کی حمایت حاصل تھی جن میں سے کلیسا، جامعات اور طبقہ امرا خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ تینوں زبردست ادارے طبعاً قدامت پرست واقع ہوتے تھے۔ ان قوتوں کے خلاف نہ صرف مذہبی روایات اور معاشرتی رسوم کی خلاف ورزی دشوار تھی بلکہ ادبی اسلوب بیان کو بدلنا بھی بڑا جرأت آزما کام تھا۔ رسمی و رواجی قیود میں بعض باتیں اچھی اور بعض بری ہوتی ہیں لیکن برے اور مضر رواج کی بیڑیوں کو توڑنے کے لئے بھی غیر معمولی اخلاقی بہادری کی ضرورت ہے۔ واضح رہے کہ یہ تمام باتیں مغربی ممالک سے مخصوص ہیں۔ ہمارے ہاں تو یہ دریافت کرنے کی بھی کوشش نہیں کی جاتی کہ قدیم اصول وضوابط میں کون سی باتیں مفید ہیں کون سی غیر مفید۔ کن قوانین پر کاربند رہنا مناسب ہے اور کن امور میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ کون سے عناصر قابل تقلید ہیں اور کون قابل ترک۔ اردو کی امتیازی خصوصیات کیا ہیں۔ اس کی ہیئت، ساخت اور بساط کا تقاضہ ہے۔ یہاں تو انگریزی تسلط قائم ہوتے ہی ہر مغربی چیز اچھی اور اپنی تمام باتیں بری معلوم ہونے لگیں۔ سیاسی غلامی ذہنی غلامی کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ لوگوں کو نہ صرف اپنی تہذیب و معاشرت اور روایات و شعائر سے بلکہ قدیم ادب و شاعری سے بھی عار آنے لگا۔ اپنے اسلاف کے روشن کارناموں کی تنقیص تضحیک اور قدیم عروضی ونحوی اصول و قواعد کی خلاف ورزی فیشن میں داخل ہوگئی۔ اردو زبان کی خصوصیات کا لحاظ رکھے بغیر محض انگریزی کی نقالی کے طور پر نظم معرا، سانیٹ اور اسٹانزائی طرز کی نظمیں لکھی گئیں لیکن ان میں تاثیر، دلکشی، غنائیت اور موسیقیت نام کو بھی نہیں پائی جاتی۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ چونکہ انگریزی جیسی ترقی یافتہ زبان کی شاعری میں ردیف وقافیہ شعر کے ضروری اجزا شمار نہیں کئے جاتے اس لئے اردو شاعری میں بھی ان کی ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ ایک جدت طراز پروفیسر صاحب فرماتے ہیں کہ "آج کل جبکہ انگریزی شاعری نے تعلیم یافتہ طبقہ پر اپنا سکہ بٹھالیا ہے۔ ردیف وقافیہ کی بحث ہی تحصیل حاصل ہے"۔ حالانکہ تعلیم یافتہ طبقہ پر یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ انگریزی اور اردو زبانوں میں بُعد المشرقین پایا جاتا ہے۔ دونوں کی امتیازی خصوصیات ایک دوسرے سے بالکل جداگانہ ہیں۔ جو اصلاحی تجاویز انگریزی شاعری کے لئے مفید ہوں ان کا اردو شاعری کے لئے بھی مفید ہونا ضروری نہیں۔ اگر کوئی جدت نواز شاعر عروضی قیود سے بے نیاز ہوکر کوئی ایسا کلام پیش کرے جو لطافت، رنگینی، دل آویزی اور اثر آفرینی کے لحاظ سے قدیم شاعری سے بڑھ کر نہ سہی کم از کم اس کی ٹکر کا بھی ہو تو وہ ہر طرح قابل قبول ہوسکتا ہے لیکن پست و حقیر پیداوار کے لئے قدیم اصول و ضوابط کو توڑنا نری حماقت ہے۔

(باقی باقی)

# ہجومِ آرزو

از حضرت جوشؔ ملیح آبادی

پھر دل کو ہے جراحتِ پنہاں کی آرزو — یعنی کسی کی جنبشِ مژگاں کی آرزو
پھر ہے جمودِ شامِ بلا وحشت آفریں — پھر ہے طلوعِ صبحِ درخشاں کی آرزو
پھر ڈس رہے ہیں جان کو غربت کے خار و خس — پھر ہے وطن کے سنبل و ریحاں کی آرزو
پھر رک رہی ہے شدتِ وحشت سے گرد میں — پائے طلب میں کوہ و بیاباں کی آرزو
پھر ولولوں پہ عرصۂ علم و عمل ہے تنگ — پھر ہے سوادِ کوچۂ جاناں کی آرزو
پھر عشق کو ہے شورِ ملامت کا انتظار — پھر دل کو ہے سیاستِ درباں کی آرزو
پھر نبضِ سرد میں ہے تپاں خونِ اضطراب — پھر جوئے سست رو کو ہے طوفاں کی آرزو
پھر زندگی کی اصل و حقیقت ہے بے نقاب — پھر ہے اجل کے چشمۂ حیواں کی آرزو
زنجیرِ عقل و ہوش سے اکتا چکا ہے جی — پھر ہے جنونِ سلسلہ جنباں کی آرزو
پھر سقف و بامِ گوشۂ خلوت پہ ہے محیط — بزمِ نشاط و سیرِ گلستاں کی آرزو
پھر مسندِ خیال پہ ہے گرمِ رستخیز — شمع و شراب و شعر و شبستاں کی آرزو
بیزار ہے سکون کی راتوں سے جانِ زار — آنکھوں کو پھر ہے خوابِ پریشاں کی آرزو
بے گریہ خال و خط پہ ہے رنگِ فسردگی — رخ پر ہے آنسوؤں سے چراغاں کی آرزو
پھر ہے طلسمِ عشوۂ ترکانہ کی تلاش — پھر ہے فریبِ وعدۂ جاناں کی آرزو
پھر شعلہ زن ہے روحِ تغافل گزیدہ پر — جاناں کے التفاتِ فراواں کی آرزو
پھر جلوہ گر ہے منظرِ وہم و خیال پر — اک نوبہارِ فتنۂ دوراں کی آرزو
پھر بخیہ ہائے چاکِ جگر کو ہے اِن دنوں — اک شوخ کے تبسمِ پنہاں کی آرزو
پھر زیرِ سر ہے زانوئے رنگیں کا اشتیاق — پھر دوش پر ہے زلفِ پریشاں کی آرزو
سینہ میں پھر ہیں شوقِ جراحت کے ولولے — وحشت کو پھر ہے چاکِ گریباں کی آرزو

پھر شب سے ڈبڈبائی ہوئی چشمِ جوشؔ میں
غلطاں ہے اُن کے گوشۂ داماں کی آرزو

# بہار کا ایک دل والا شاعر قعرِ گمنامی میں

از جناب عبدالمالک آروی

ایک ماہر سیاح جب سرحدِ بہار میں قدم رکھتا ہے تو یہاں کے گوناگوں مناظرِ عجائب قدرت کا ایسا دلکش مظاہرہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ بے اختیار اس کی زبان سے نکل ہی جاتا ہے "جمالِ یوسفی دفترِ بہنی دارد"۔ زندگی کے ہر ہر شعبہ سے قدیم تہذیب عریاں نظر آتی ہے۔ سلاطین اور فقرا کے مقبرے، کہنہ اور فرسودہ عمارات کے قدیم کتبات، ایک ماہر آثار کو اپنی طرف کھینچتے ہیں، شیر شاہ اور حسن سور کے روضے (سہسرام) دولت شاہ کا مقبرہ (منیر) اور بودھ گیا کی زیارت گاہیں، نالندہ کالج (بہار) کے جدید انکشافات اور راجگیر میں فقرا کے معابد کوہ رہتاس کا عجیب و غریب قلعہ، اور عظیم آباد کی ہندو اور اسلامی تہذیب کی یادگاریں اس کے لئے ایک "حسنِ رہگزر" بن کر رہ جاتی ہیں اور وہ ایک عالمِ محویت و بیخودی میں کھو جاتا ہے۔ یہاں کے قدرتی مناظر، بڑے بڑے دریا، اور آبشاریں، گھنے جنگل اور مرتفع پہاڑوں کے سلسلے شاعروں اور ادیبوں کے لئے کافی سامانِ بصیرت رکھتے ہیں۔ آیئے آج کی صحبت میں اپنی بہار کو اسی ادبی زاویہ نظر سے دیکھیں۔

یہاں کے ایک ممتاز ترین اُردو شاعر مولانا شیخ غلام علی راسخ میر تقی میر کے ہمعصر تھے، آپ ایک مرتبہ میر صاحب سے ملنے گئے اور میر صاحب کو اپنا یہ شعر سنایا۔

ہوئے ہیں بیر ہم اب دیدنی رونا ہمارا ہے　　　　پلک پہ اپنی آنسو صبح پیری کا ستارہ ہے

میر نے آپ کو لپٹا لیا۔ راسخ مرحوم کے شاعرانہ نوادرِ ادب آج زبانِ اُردو کے جواہر پارے سمجھے جاتے ہیں۔ اسی اُستادِ سخن کے ایک تربیت یافتہ مولانا انور علی یاس تھے۔

کچھ دن ہوئے میرے عزیز دوست احمد امیر صاحب آسیہ نے یاس مرحوم کا ایک مطبوعہ دیوان مجھے دیا۔ یہ دیوان اب نایاب ہے۔ مولوی محمد سعید صاحب رئیس عظیم آبادی اور مفتی علی اکرم صاحب آروی نے پہلے پہل ۱۲۹۰ھ میں مطبع نظامی واقع کانپور میں اس کو چھپوایا تھا۔

آرہ کے معمر لوگوں سے آپ کے حالات دریافت کئے لیکن دو ایک بات کے سوا کوئی مفصل بات معلوم نہ ہو سکی۔ اسی عرصہ میں مجھے نگرنہسہ (مضافاتِ بہار) جانے کا اتفاق ہوا، یہاں ایک عزیز نے مولوی محمد سعید حسرت کا کلیاتِ فارسی دیا[1]۔ یہ نسخہ بھی اب نایاب ہے، حُسنِ اتفاق سے اثنائے مطالعہ میں کلیات کے اندر آرہ کے بعض

---

[1] یہ کتاب میرے عزیز بھتیجہ ابوالخیر سلمہٗ کے پاس تھی، آپ کے پردادا سخاوت علی (صدیقی پھلواری) صاحب بڑے خطاط تھے آپ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے "کشف الخلاصہ" مصنفہ مولانا حافظ شجاع الدین عبدہ آبادی اور "مقدمۃ الصلوٰۃ" (نام حق) مصنفہ حضرت شرف بہاری کے قلمی نسخے میرے پاس ہیں۔ میرے دادا مرحوم عبدالعلی صاحب سخاوت علی صاحب کے حقیقی بھائی تھے۔ ع۔ م۔

لوگوں کا تذکرہ مل گیا، مزید تفتیش کی تو انور علی یاس مرحوم کا مفصل تذکرہ پایا۔ حضرت مرحوم یاس آروی کے داماد تھے۔ اور آج محض حضرت کے کلیات کی بدولت یاس کا تذکرہ محفوظ ہے، ورنہ شاید اس کے تلف ہو جانیکے بعد یہ بھی کوئی نہیں جانیگا کہ یاس کون تھے اور کب وفات پائی؟۔

## ابتدائی حالات و تعلیم

بعض سمر لوگوں نے بتایا تھا کہ یاس مرحوم کا وطن اصلی موضع بہپورہ ضلع پٹنہ تھا لیکن مولانا حضرت نے اس کا تذکرہ نہیں کیا ہے، بلکہ وہ آپ کا وطن آرہ بتاتے ہیں۔ ملکی محلہ میں بود و باش تھی، آپ کے بعض رشتہ دار اب بھی موجود ہیں۔ امیر صاحب کے والد مولوی محمد سعید صاحب رجسٹرار مرحوم کو بھی یاس سے ننہالی رشتہ داری تھی۔ آپ کے والد ماجد کا نام شیخ محمد حیات تھا جنہوں نے ۱۲۳۲ھ میں وفات کی، یاس ۱۲۱۷ھ میں پیدا ہوئے۔ لفظ "چراغ" سے آپ کی تاریخ ولادت نکلتی ہے، ابتدائی تعلیم کے سلسلہ میں عظیم آباد میں رہتے تھے۔ قاضی عباس علی مرحوم اور حسین خاں ریاضی داں سے فنون متداولہ کی چند کتابیں پڑھیں، اس وقت شیخ غلام علی راسخ کی شاعری کی شہرت تھی، یاس کو علوم عربیہ کے علاوہ شعر و سخن کا بھی ذوق تھا، راسخ مرحوم میر تقی کی صحبت دیکھے ہوئے تھے، یاس نے اُردو غزلوں میں راسخ مرحوم سے اصلاح لی۔ فنون جمیلہ کا شوق کافی تھا۔ بعض ماہروں سے فنِ موسیقی و آلاتِ موسیقی کا استعمال سیکھا۔ آپ کے بڑے بھائی مولوی کرامت علی نے جو ۱۲۳۱ھ میں عدالت آرہ میں مفتی مقرر ہوئے تھے، انتقال کیا تو حاکموں نے آپکو نوازا اور عدالت کا مفتی اور صدر امین بنا دیا۔

## صاحبان بلگرام و مارہرہ سے تعلقات

یاس کو فارسی ادبیات سے گہری دلچسپی تھی۔ بلگرام اور مارہرہ اس زمانہ میں فارسی ادب کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا۔ یاس کو میر افتخار علی ذرہ، میر امامی، میر محمد عسکری، سید سلطان عالم، اور سید صاحب عالم مارہروی کے ساتھ گہرے تعلقات تھے۔ سید سلطان عالم صاحب سجادہ نشیں مارہرہ نے ۱۲۵۳ھ میں انتقال کیا تو یاس نے عربی میں ایک نہایت پراثر تاریخ کہی:۔

| | |
|---|---|
| توفی ربنا سلطان عالم | وقد اعطاہ فی الجنات جاہا |
| سألت الناس عن تاریخ فوتہ | لتحصیلی علیہ انتباہا |
| فقالوا آہ و واویلاہ آھا | فآھا ثم آھا ثم آہا |

(ترجمہ) ہمارے آقا سلطان عالم نے وفات کی، اللہ تعالیٰ نے آپ کو جنت میں مرتبہ عطا فرمایا، میں نے لوگوں سے آپکی تاریخ وفات کے متعلق سوال کیا تاکہ مجھے معلوم ہو، لوگوں نے کہا آہ! واویلا! آہ! آہ! آہ! آہ!۔

یاس عربی زبان پر پوری قوت رکھتے تھے، انہوں نے فیضی کی تفسیر بے نقطہ "سواطع الالہام" کے تتبع میں ایک مطول خط لکھا تھا۔ اسی طرح میر امامی نے اپنی مثنوی "ثمر مراد" لکھی تو یاس نے تاریخ کہی:۔

میر امامی کہ در زمانہ نخود | باید ش جامی و نظامی گفت

شعر درمثالیں پائی جاتی ہیں۔ اصلاح ...

مثنوی لطیف و پاکیزہ — ہمچوں شاعراں نامی گفت

سال اتمام آں دل من یاسؔ — طاقت خامہ امامی گفت[۱]

## جوانا مرگ فرزند

یاسؔ کے ایک لڑکا مولوی منور علی اور ایک لڑکی تھی۔ لڑکی مولانا محمد سعید حسرتؔ عظیم آبادی سے بیاہی ہوئی تھی۔ لڑکا علوم متداولہ سے فارغ ہو چکا تھا لیکن زمانہ نے فرصت نہ دی یعنی عالم شباب میں ایک سال تک بیمار رہ کر ۱۲۴۳ھ میں وفات کی۔ بوڑھے باپ کے دل و جگر پر اس کا گہرا اثر ہوا، چنانچہ سید صاحب عالم صاحب مارہروی نے تعزیت میں یاسؔ کو جو خط لکھا تھا اس کے جواب میں یاسؔ فرماتے ہیں :-

> نامہ مہر دو بزرگو ساں بر یک قرطاس بہ پرسش عزائے فرزند مغفرت اباس ایں فقیر ماتم اساس رسیدہ رہین اخلاق کریمانہ گردانیدہ فی الحقیقت درین مدت عمر رسیدن ایں چنیں غم ظاہرا البتہ صعوبتے دارد کہ قوائے ہمچوں ماضیعفان و پیراں تاب تحمل آں نمی آرد و سود غم پیری مشہور است کہ اصعب می شود۔

آخر کار وہی ہوا جس کا یاسؔ مرحوم کو کھٹکا تھا۔ جوان بیٹے کی وفات سے دل بیٹھ گیا، جذبات میں امنگ نہ رہی دنیا سے دلچسپی کم ہو گئی یاد الٰہی کی طرف طبیعت مائل ہوئی ۱۲۱۲ھ میں ایک مرتبہ حج کر چکے تھے، دوبارہ حج کا ارادہ کیا آپ کو حضرت سید شاہ احمد پھلواروی قدس سرہٗ سے بڑی عقیدت تھی۔ آخر عمر میں حضرت مولانا شاہ فصیح صاحب غازی پوری کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے اور ہمیشہ ذکر و شغل میں مصروف رہنے لگے۔ ۱۲۶۲ھ میں حج کے ارادے سے اہل و عیال کو لیکر پٹنہ پہونچے، تاکہ کلکتہ سے جہاز پر سوار ہو کر بیت اللہ کی طرف روانہ ہوں لیکن حیات نے وفا نہ کی اور ۵ ذیقعدہ منگل کی شب کو ۱۲۶۲ھ میں ہیضہ کے عارضے سے انتقال کیا انا للہ الخ آپ کا مزار پٹنہ میں مولانا سعید حسرتؔ کے والد منشی حاجی واعظ علی صاحب کے مکان کے اندر ایک باغیچہ میں واقع ہے۔

## خصوصیات کلام

یاسؔ کے بعد بہار میں اُردو اور فارسی کے بڑے بڑے شعرا گذرے ہیں۔ شاہ ابوالحسن فردؔ، شاہ علی حبیب نصرؔ، محمد سعید حسرتؔ، ظہیر احسن شوقؔ نیموی،

---

[۱] سید بندہ علی بندہؔ مارہروی جو صفیرؔ بلگرامی آروی کے پردادا تھے۔ میر امامی کے چچا ہوتے تھے، زندگی نے وفا کی تو صفیرؔ مرحوم کے حالات زندگی اور شاعری پر ساقیؔ کے صفحات میں ریویو کیا جائے گا۔ صفیرؔ مرحوم کا خاندان علم و ادب اور معارف و رشاد کا گھرانہ تھا۔ یاسؔ کے اکثر دوست جن کا مولانا حسرتؔ نے تذکرہ کیا ہے۔ صفیرؔ مرحوم کے بزرگ تھے۔ شاعری صفیرؔ کی موروثی چیز تھی۔ وہ خود بھی ایک باکمال شاعر گذرے ہیں آرہ کے اکثر اساتذۂ سخن مولانا سید امیر حسن بدرؔ، مولوی اسمٰعیل تہرؔ، قاضی واجد حسین واجدؔ سبھوں نے آپ سے فیض حاصل کیا۔ ع۔م۔

میر علی محمد شاہ عظیم آبادی، سید فرزند احمد صفیر بلگرامی (آردی)، کی شاعرانہ نکتہ سنجیوں سے کس کو انکار ہو سکتا ہے، یہ لوگ صرف شاعر نہ تھے بلکہ عالم اجل اور فنی مہارت میں یگانہ تھے، شاہ نصیر پھلواری کا پورا دیوان رومی کے تاثرات حزین اور سوز و درد سے مملو ہے، نصیر کی شاعری کیفیات و جذبات کی شاعری ہے۔ آپ کے یہاں معنی آفرینی اور لفظی صناعیاں کم ہیں مگر اپنے سیلاب جذبات میں پڑھنے والے کو بھی بہالیجاتے ہیں۔ نعت میں کچھ اس انداز کے اشعار کہے ہیں کہ ہر ہر لفظ سے خلوص اور آشفتہ آرزوؤں کا اظہار ہوتا ہے، یہ مناقب شعری حب رسولؐ کا نتیجہ تھے جو صوفی گھرانہ کی خاص چیز ہے اور ذوق عامہ کا وہاں تک گذر نہیں فرماتے ہیں۔

چہ عشق است عشق احمد یارب ایں راہرزماں افزا ۔۔۔ چہ دردست درد احمد کاں دل پاکم نہاں دارد

کیا کوئی تہی نعتیہ نگار شاعر اس قسم کا بلند پاکیزہ خیال پیش کر سکتا ہے؟۔

مولانا حسرت اور شوق نیموی دین کے بلند پایہ عالم گذرے ہیں حسرت نے حافظ اور بابا فغانی، جامی اور عرفی کی غزلوں پر غزلیں کہی ہیں اور حق یہ ہے کہ ان کی بہترین غزلیں کامیاب رہی ہیں، عرفی کی مشہور غزل ہے۔

گر کام دل بہ گریہ میسر شدے ز دوست ۔۔۔ صد سال می تواں بہ تمنا گریستن

حسرت مرحوم نے بھی اس پر غزل کہی جس کا یہ شعر مجھے پسند آیا۔

مانند بہ خندہ چمن و گریہ سحاب ۔۔۔ از یار خندہ کردن و از ما گریستن

یار کے نوشخند اور اپنی گریہ وزاری کو خندۂ چمن اور گریہ سحاب بتانا حسرت کی تمثیل نگاری اور شاعرانہ جستجو کا پورا ثبوت پیش کر رہا ہے۔

شوق نیموی کی شاعرانہ قدرت، عذوبت بیان، بدایع شعری اور معاملہ بندی ان کی مثنوی "سوز و گداز" سے ظاہر ہوتی ہے، آپ کی غزلوں میں وہ جوش و خروش نہیں جو مثنوی میں ہے، پھر بھی آپ کی بہت سی غزلیں کامیاب کہی جا سکتی ہیں، مجھے آپ کا یہ شعر بہت پسند ہے۔

دیکھکر خلد دل بھر آیا شوق ۔۔۔ یاد آئی کسی کے گھر کی طرح

اسی غزل کا یہ شعر بھی ہے جو اثر اور کیفیت سے لبریز ہے۔

یاس و حسرت کی خاک اُڑتی ہے ۔۔۔ بے ترے دل ہے اُجڑے گھر کی طرح

مگر یاس مرحوم ان اساتذۂ سخن سے بہت قبل گذرے ہیں آپ کا زمانہ میر کے قریب تھا پھر بھی آپ کے کلام میں زبان کی لطافت و صفائی کے اعلیٰ نمونے پائے جاتے ہیں۔

یاس نے اردو میں راسخ مرحوم سے اصلاح لی، خود راسخ بھی یاس کی قدر کرتے تھے اور اُن کا کلام سنا کرتے تھے۔ دریائے اشک یاس ہوا چشم سے رواں ۔۔۔ آیا جو ذکر راسخ غفراں مآب کا

... ... ... ... ... ... ... ... ... ... ...

اے یاس قدرداں تھے جو اہل سخن کے وے ۔۔۔ کرتے ہیں یاد راسخ غفراں مآب کو

اب یاں طرزِ سخن میں اے یاسؔ — راسخؔ کے یادگار رہیں ہم

معلوم ہوتا ہے اُستاد اور شاگرد کے تعلقات بہت گہرے تھے، دونوں طرف سے خلوص و محبت کا برتاؤ تھا لیکن یاسؔ نے بعض مقطعات میں شاہ نصیر کا بھی تذکرہ کیا ہے۔

ہیں قدر شناس سخن اے یاسؔ نصیر اب — خدمت میں جو ان کی یہ غزل جائے تو اچھا

معلوم ہوتا ہے راسخؔ کی وفات ۱۲۳۸ھ کے بعد یاسؔ نے شاہ نصیر دہلوی سے مشورۂ سخن کرنا شروع کیا تھا اور یہ نظریہ اس لئے اور بھی محکم ہوتا ہے کہ شاہ نصیر کے تتبع میں یاسؔ نے بھی بعض غزلیں لکھیں۔

ٹیکا و طوق و بالی ہیں مل کر ہلال چار — ہیں گرد بدر عارض دل بر ہلال چار

شاہ نصیر اور آپ کے پیرؤں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ ادق قوافی و ردیف اور مشکل زمینوں میں کامیاب غزلیں نکالتے ہیں ظفر کے یہاں سنگلاخ زمینوں میں جو غزلیں پائی جاتی ہیں، وہ شاہ نصیر ہی کی مشکل پسندیوں کا نتیجہ ہیں۔ ظفر پہلے شاہ نصیر سے اصلاح لیا کرتے تھے، خود اُستاد ذوقؔ بھی شاہ نصیر کے شاگرد تھے اس "ہلال چار" کی ردیف میں شاہ نصیر کی غزل ہے، یاسؔ شاہ نصیر کے ہمعصر تھے، اُنہوں نے بھی شاہ صاحب کی دقت پسندی کی تقلید میں یہ نظم لکھ ڈالی اور کون کہہ سکتا ہے کہ یاسؔ نے شاہ نصیر سے کم جگر کاوی کی ہے یا ان کی غزل شاہ صاحب کی غزل سے رتبہ میں کم ہے، فرماتے ہیں :-

لے تیغ پیش ابرو وہ دیکھے نہ تھا ماہ صوم — تھی ایک خلق دیکھ کے ششدر ہلال چار

اس "ہلال چار" کو پورا کرنے کے لئے یاسؔ مرحوم نے نزاکتِ خیال کی کتنی وادیاں طے کیں، تیغ، ابرو، ساعد، سیمیں اور اصل "ہلال آسمانی" ان چاروں کا اجتماع ہو گیا۔ مشکل ردیف کو کس خوبی سے نباہا۔

دو چوڑیاں دو ٹکڑے جو اس مہ کی شب ہوئیں — وقت سحر تھے بر سر بستہ ہلال چار

الغرض اسی قسم کے "کوہ کندن" سے کام لیکر یاسؔ نے پوری غزل تمام کی ہے اور میرا خیال ہے شاہ نصیر کے اسکول کی یہ بہترین چیز کہی جا سکتی ہے۔

دیکھو ہر چاند رات میری نیاز — میں ہوں کُشتہ ہلال ابرو کا

بالکل شاہ نصیر کے تتبع کا نتیجہ ہے، مگر غور سے پورے دیوان کا جائزہ لیا جائے تو میرؔ کے اسکول کی یعنی حسیات کارفرما نظر آتی ہے۔ وہی سوز و درد، وہی معصومانہ اندازِ بیان، وہی درد مندانہ لہجہ ادا، وہی گداختگی و برشتگی، وہی حزن و الم، جو راسخؔ کو میرؔ سے ورثہ میں ملا تھا، یاسؔ کے یہاں بھی موجود ہے۔ یہ غزل ملاحظہ ہو۔

سامنے کب وہ یار گذرے ہے — یوں تو دل میں ہزار گذرے ہے

تا دم زیست تھے سبھی ہمدم — کون سوئے مزار گذرے ہے

یاسؔ رہ رہ جو آہ کرتے ہو — تیر سا ہے کہ پار گذرے ہے

اس میں شک نہیں آخری مصرع قدسی کے شعر سے مستفاد ہے، جس کو پہلے مرزا سوداؔ نے اُردو کا جامہ پہنایا

قدسی کہتا ہے۔

بہارے سپر جام و یاری گذرد　　　　نسیم ہمچوں خدنگ از کنارمی گذرد

دہلی کے ایک مجمع علم و ادب میں سودا نے قدسی کے اسی خیال کو اُردو میں یوں پیش کیا۔

بہارے سپر جام و یار گذرے ہے　　　　نسیم تیر سا سینہ کے پار گذرے ہے

اس عہد کا بہت بڑا انشا پرداز شیخ علی حزیں کا حریف اور مجمع النفائس (تذکرہ شعرات فارسی) کا بلند پایہ مصنف خان آرزو مجلس میں موجود تھا فوراً بول اُٹھا۔

شعر سودا حدیث قدسی ہے　　　　چاہیئے لکھ رکھیں فلک پہ ملک

لوگوں نے سمجھا کہ "حدیث قدسی" کہہ کر آرزو نے تعریف کی سودا بھی دکھانے کو خان آرزو سے گلے ملے کہ واقعتاً ان کا شعر بمنزلہ حدیث قدسی تھا اور اس لئے لایق ہے کہ ملائکہ اس کو آسمان پر لکھ رکھیں حالانکہ دل میں سمجھا کہ وسیع النظر ناقد کیسی بے لاگ تنقید کر گیا۔

یاسؔ کے اشعار بالا میں جو کیفیت المیہ ہے، وہ تشریح کی محتاج نہیں۔ میر تقی کے کلام کا دھوکہ ہوتا ہے، فرماتے ہیں۔

ہگی درد تھے ہم یاسؔ ولے آہ نہ کی　　　　یاں تلک درد محبت تو چھپایا ہم نے

یہ انداز بیان داغ مرحوم کے فیوض و برکات کا نتیجہ ہے۔

سینہ میں ایک مونس تھا قلب خستہ اپنا　　　　سو خون ہو کے ہمدم آنکھوں میں آرہا ہے

صبر و قرار و تسکیں دل سے تو لے گئے سب　　　　کیا ڈھونڈتے ہو تم اب اس گھر میں کیا رہا ہے

اسی غزل کا یہ شعر ہے

ہاتھوں کو اپنے لپکا ہے چاک پیرہن کا　　　　ناصح مرا گریباں کیا تو سلا رہا ہے

غالب آپ کے بعد گذرے ہیں انہوں نے اسی خیال کو کسی قدر اضافہ کے ساتھ یوں کہا ہے:۔

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائینگے کیا　　　　زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئینگے کیا

الغرض یاسؔ حقیقتاً میر کے اسکول کے پیرو تھے اور قدرتی طور پر دل بھی ایسا ہی لیکر آئے تھے، اس پر زمانے نے جوان بیٹے کو فنا کے گھاٹ اُتار کر اور بھی غمزدہ بنا دیا ان کی کامیاب غزلیں اسی دور حرمانی و حزن کی یادگاریں ہیں۔

ذیل میں آپ کے کلام کا مختصر سا انتخاب دیا جاتا ہے۔

عشق میں حال دل و درد نہ پوچھ　　　　ایک صحرا ایک دریا ہو گیا

.. .. .. .. .. ..　　　　.. .. .. .. .. ..

کہ گذرتے جو جی میں تھا حیف　　　　نہ ہوا ان تلک گزارا اپنا

منتیں ان کی کیں تمہارے لئے بات کرنا تھا جن سے عار اپنا
ہائے نکلے وہ دشمن جانی جن کو جانا تھا دوستدار اپنا

۔۔۔۔۔۔۔۔

اے یاس رقیبوں کو ہوا روز قیامت اس شمع کو جب میرے شبستاں میں ہوئی صبح

۔۔۔۔۔۔۔۔

ہم نے اس سرو کو دیکھا تھا خراماں اک دن پھر تی آنکھوں میں ہے وہ خوبیِ رفتار ہنوز

۔۔۔۔۔۔۔۔

ارتباطِ شمع سے روشن ہے پروانہ کا حال کیا کرے کوئی کسی سے آشنائی کی ہوس

۔۔۔۔۔۔۔۔

سوزاں ہیں اشکبار ہیں ہم محفل میں شمع وار ہیں ہم
چشم عالم کے توتیا ہیں کس کے در کے غبار ہیں ہم
جن کی خاطر شکن ہوئے آہ ان کی خاطر سے بار ہیں ہم

۔۔۔۔۔۔۔۔

بند سب کے کھلے باز و رہے پر اپنے بندھے فصلِ گل کے ہوئے اس رنگ سے ایام تمام

۔۔۔۔۔۔۔۔

اک عمر کے بعد ان کا میرے پاس یہ پیغام آیا ہے کہ اس کوچہ میں جا پا نہ کر دل میں

۔۔۔۔۔۔۔۔

سیرِ گلشن سے بافراغ ہوں میں ہمہ تن یعنی داغ داغ ہوں میں
سر میں شورِ جنوں و دل میں طپش طرفہ رکھتا دل و دماغ ہوں میں
کھویا جاتا ہوں دل میں سو سو بار کس کا یوں در پئے سراغ ہوں میں

۔۔۔۔۔۔۔۔

اعجازِ عیسوی سے توقع بریدہ ہوں جادوئے چشم یار کا آزار دیدہ ہوں
وضعِ جہان سے نفرتِ دل کا معاملہ یاں تک کھنچا کہ آپ سے بھی اب کشیدہ ہوں
بزمِ جہاں میں سوز دروں سے برنگ شمع جس دن سے میری آنکھ کھلی آب دیدہ ہوں
رونے کی جا ہے یاس یہ افتادگی مری حسرت بھری نگاہ کا اشک چکیدہ ہوں

**عبدالمالک آروی**

# میری دنیا

از حضرت علی اختر اختر

عزیزوں سے جو کی چشمِ کرم کی آرزو میں نے
عزیز ایسے جنہیں میں جان سے بڑھ کر سمجھتا تھا

جو میری قوتِ دل کیلئے سامانِ نازش تھے
میں اس دنیا میں اپنا خاص حق جنپر سمجھتا تھا

محبت بنگئی تھی جن کی رازِ زندگی میرا
جنہیں میں چارہ فرمائے دلِ مضطر سمجھتا تھا

یہی اس خاکدانِ دہر کے کچھ منتشر ذرے
انہیں میں رونقِ مہر و مہ و اختر سمجھتا تھا

تو دیکھا میکدہ آسودۂ رنگیں مقالی تھا
مگر صہبا کی دلکش جھلکیوں سے جام خالی تھا

ہوئی احباب سے آخر امیدِ اعتنا مجھکو
کہ یہ اس کشتِ زارِ ہستیِ دنیا کا حاصل ہیں

اگر دنیا کو سینہ فرض کرلیں اور پھر دیکھیں
تو احبابِ وفا احساس اسمیں صورتِ دل ہیں

مگر او عالمِ امواج کی شورش کے دیوانے
ترے دریا سکوں پروردۂ آغوشِ ساحل ہیں

نہ جا او بیخبر پھولوں کی رنگیں ماجرائی پر
کہ اجزائے خس و خاشاک بھی گلشن میں داخل ہیں

امیدیں نا امیدِ کامیابی ہو گئیں آخر
امنگیں تھک کے آغوشِ سکوں میں سو گئیں آخر

یکایک مطربِ فطرت نے اپنا ارغنوں چھیڑا
رگِ افسردۂ ہستی میں گویا روح دوڑا دی

ندا آئی کہ دیوانے اِدھر آ، جا دواں ہوجا
کسی نے پھر زمانہ کی حقیقت مجھکو سمجھا دی

مری خاطر خداوندِ جہاں آرائے فطرت نے
زمانہ سے جدا دنیائے نو اک خلق فرما دی

دبی چنگاریاں پھر مشتعل ہونے لگیں دل میں
فروغِ رنگ نے پھر آتشِ احساس بھڑکا دی
سکوتِ منظرِ شب نے کبھی تسکینِ دل بخشی
کبھی ہنگامۂ بزمِ سحر نے روح چمکا دی
گزر ناکامیوں کا میرے دل میں ہو نہیں سکتا
مجھے دنیا میں جنت بخش دی یہ زندگی کیا دی
فریبِ زندگی سے زندگی کی رمز بینی میں
جو گتھی پڑ گئی تھی ناخنِ فطرت نے سلجھا دی

سن اے غافل سرائے دہر نادانوں کی بستی ہے
یہ انسانوں کی دنیا چند بے جانوں کی بستی ہے

مرے احباب ہیں سفاک نہریں نرم رو جو ہیں
نئے غنچے شگفتہ گل ہیں میرے رشتہ داروں میں
مرے چہرے سے موجیں گرد تاریکی کو دھوتی ہیں
رہا کرتا ہے رقصِ شادمانی آبشاروں میں
مجھے افسردگی سے آشنا ہونے نہیں دیتی
لطافت سی ہے کچھ ایسی پھول کے رنگیں عذاروں میں
گراں ہوتا نہیں میری خوشی پر ان کو مٹ جانا
جو گل زیبِ گلستاں ہیں وہ گندھ جاتے ہیں ہاروں میں
مرے سوئے ہوئے جذبات کو بیدار کرتی ہے
وہ لرزش سی جو رہتی ہے نمایاں شب کو تاروں میں
مرے کھوئے ہوئے احساس کو ہشیار کرتی ہے
وہ جنبش سی جو ہوتی ہے سحر کو شاخساروں میں
رگِ گل پختگی کی شان ہی ہوتی ہے جب ظاہر
تو روحِ زندگانی دوڑنے لگتی ہے خاروں میں
مری شامِ سکوں پرور میں نغموں کا خزانہ ہے
مری روشن سحر ہے حسن کے آئینہ داروں میں
خزاں میرے چمن کی حد میں داخل ہو نہیں سکتی
کہ رنگِ جاوداں رکھا گیا ہے ان بہاروں میں

بس اب میں ہوں یہ عشرت گاہ ہے وارفتہ حالی ہے
میری دنیا غم و افکار کے جھگڑے سے خالی ہے

# دولت خانہ

از جناب سید حسن برنی بی۔اے۔ ایل ایل بی (علیگ) ایڈوکیٹ بلند شہر

ہندوستان کی تاریخ کے بے شمار جزئیات علمی تحقیقات کے محتاج و منتظر ہیں۔ مثلاً لفظ "دولت خانہ" کو لیجئے جو اپنی ایک تاریخ رکھتا ہے جسے ابھی تک ہمارے زمانے کے کسی مورخ نے نہیں لکھا۔

دولت خانہ دراصل اسلامی دہلی کے قدیم ترین شاہی قصر کا نام تھا، جسے دہلی کے ترک سلاطین کی نظر میں خاص احترام حاصل تھا۔ اُس میں ہندوستان کا سب سے پہلا اسلامی تخت رکھا گیا تھا، جس پر تقریباً ڈیڑھ سو برس تک نئے بادشاہ کی رسم تاجپوشی ادا ہوتی تھی۔

قدیم ترین تاریخوں، طبقات ناصری، تاریخ فیروز شاہی اور تاریخ مبارک شاہی اور دوسری بعد کی تاریخوں میں، جن کی معلومات اُن پہلی تاریخوں سے لی گئی ہیں، اس قصر کا ذکر جا بجا ملتا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ یہ قصر سلطنت قطب الدین آئبک کے زمانے میں تعمیر ہوا تھا اور غالباً دہلی کی جامع مسجد (مسجد قوۃ الاسلام) اور مادنہ (قطب مینار) کی طرح اس کی بنیاد بھی محمد غوری کے زمانے میں پڑ چکی تھی۔

۵۸۹ھ میں دہلی ہندوستان کی اسلامی سلطنت کا دار السلطنت قرار پایا، تو ایک ایسے شاہی محل کا تعمیر پانا ضروری ہوگیا۔ عجب نہیں کہ دہلی آکر محمد غوری اسی قصر میں ٹھہرتا ہو، اور اُسی کے انتساب سے اُسے "دولت خانہ" کا لقب ملا ہو۔

بہرحال اُس کا سب سے پہلا ذکر ایل تتمش کی تخت نشینی کے وقت ۶۰۷ھ میں آتا ہے۔ طبقات ناصری و تاریخ مبارک شاہی میں (جن کے مآخذ قدیم مگر جداگانہ معلوم ہوتے ہیں) لکھا ہے کہ اس بادشاہ کی تخت نشینی اسی قصر میں ہوئی تھی۔

اُس کے بعد خاندان غلامان کے حسب ذیل سلاطین کی رسم تاجپوشی دولت خانہ میں ہوئی:۔

(۱) رکن الدین فیروز شاہ (۲) سلطان رضیہ (۳) سلطان معز الدین (۴) سلطان علاء الدین مسعود شاہ (۵) سلطان ناصر الدین محمود شاہ (۶) سلطان بلبن (۷) سلطان کیقباد۔

جب دہلی کی سلطنت غلاموں کے خاندان سے نکلکر خلجیوں کے ہاتھ میں آئی تو جلال الدین خلجی کی ہمت فوراً دولت خانہ میں تخت نشین ہونے کی نہ ہو سکی۔ بلکہ وہ کیقباد کے قصر کیلو کھری میں جو جمنا کے کنارے بنا ہوا تھا تخت نشین ہوا۔ بعد میں جب اُسے پورا اطمینان حاصل ہوگیا، تو قدیم دہلی میں جاکر دولت خانہ میں تخت نشینی کی رسم ادا ہوئی۔

علاء الدین خلجی کی رسم تاجپوشی بھی دولت خانہ میں ہوئی تھی۔ لیکن اُس کا بدنصیب جانشین اپنے باپ کے بنوائے ہوئے قصر سیری میں تخت نشین ہوا تھا، وہ خلافت کے خواب دیکھتا تھا، اُس نے سری کا نام دار الخلافہ رکھا تھا اور اپنے آپ کو خلیفہ کہلواتا تھا۔

اُس کے قتل اور خسرو خاں کی تباہی کے بعد غیاث الدین تغلق بھی قصر ہزار ستوں میں جو سیری کے شاہی محل کی درباری عمارت تھی تخت نشین ہوا، لیکن اُس کا بیٹا جونہ اپنی روایات کا احترام کرتا تھا، اپنے باپ کے بنوائے ہوئے قصر تغلق آباد میں تخت نشین ہونے کے چالیس دن بعد ۵ ربیع الاول ۷۲۵ھ کو اپنی رسم تاجپوشی ادا کرنے کے لئے دولت خانہ میں آیا تھا۔ اُس روز دہلی کو خوب سجایا گیا تھا، اور بادشاہ نے بھی جلوس کے وقت دل کھول کر خیرات کی۔ جیسا کہ امیر خسرو نے اپنے ایک قصیدے میں جو اس موقع پر لکھا گیا تھا، اور ان کے اخیر دیوان نہایت الکمال میں موجود ہے۔ لکھا ہے، اُس دن پُرانی دہلی میں نئی رونق آگئی تھی۔

لیکن افسوس ہے کہ یہ اخیر تاجپوشی تھی، جو قصر دولت خانہ میں انجام پائی۔ بعد کے سلاطین نے اس قدیم روایت کو زندہ نہیں رکھا اور اس طرح دولت خانہ کا نام و نشان بھی گم ہو کر رہ گیا۔

البتہ ہمارے ملک میں "دولت خانہ" کا لفظ اب تک زندہ ہے۔ اور اُس توقیر و احترام کو ظاہر کرتا ہے جو اپنے زمانے میں اُس شاہی عمارت کو حاصل تھی۔ اپنے مخاطب کی عزت کے لئے ہم اب بھی اُس کے مکان کو "دولت خانہ" کے خطاب سے پکارتے ہیں، گویا ہماری نظر میں اُس کا مکان اُس قدیم شاہی محل کا ہمپایہ ہے جو "دولت خانہ" کہلاتا تھا۔

سید حسن برنی

# غزل

وہ حُسن، وہ ادا، وہ ستانہ نہیں رہا
وہ رنگِ عشق اور وہ زمانہ نہیں رہا

اب پاسِ ضبطِ عشق حسینوں کو ہو تو کیوں
وہ سازِ دلرُبا، وہ فسانہ نہیں رہا

یہ وہ غرورِ حُسن کی ڈھلتی سی چھاؤں ہے
دم بھر فضا میں جسکی ٹھکانہ نہیں رہا

زُلفِ دراز کی وہ سحر کاریاں ہوئیں
باقی جہاں میں کوئی سیانہ نہیں رہا

پیکر وہ عہد اور وہ نشاط و طرب کہاں!
خاموش ہی رہو کہ زمانہ نہیں رہا!!

# محبّت اور موت

از جناب خواجہ عبدالسمیع پال۔ اثر صہبائی۔ ایم۔ اے۔ ایل ایل بی وکیل سیالکوٹ

محبت بے خودی ہے سرخوشی ہے، شادمانی ہے
شکستِ دل میں بھی لطف و سرورِ جاودانی ہے
مگر یہ موت بھی گو جسم کو برباد کرتی ہے
غمِ ہستی کے زندان سے ہمیں آزاد کرتی ہے

محبّت کی سحر سے محفلِ دل جگمگاتی ہے
اجل کی شام میں لیکن سکوں کی نیند آتی ہے
محبت تلخ بھی شیریں بھی ہے گریاں بھی خنداں بھی
محبت گلشنِ عشرت بھی ہے خارِ مغیلاں بھی

فضائے موت میں لیکن ہے آزادی ہی آزادی
تمناؤں کی ناکامی، نہ قصرِ دل کی بربادی
محبت ایک ہنگامہ ہے جوشِ زندگانی کا
اجل پیغام ہے لیکن سکونِ جاودانی کا

محبت کے لئے غمہائے بے پایاں بھی سہتا ہوں
پیامِ موت پر بھی گوش بر آواز رہتا ہوں
اسیرانِ محبت کے بھی دن کیسے گزرتے ہیں
قیامت کی کشاکش ہے، نہ جیتے ہیں نہ مرتے ہیں

# تاج محل

از جناب سید وزیر حسن دہلوی

شاہجہاں بادشاہ کا حُسنِ سلوک ہے کہ اس نے اپنی چاہیتی، چاہنے والی رفیقِ زندگی ارجمند بانو بیگم ملکۂ تختِ طاؤس کو تاج محل جیسے شہرۂ آفاق روضہ میں آسودہ کیا۔ جو مرمر کا سُہانا خواب یا دریائے نور کا حباب ہے!

اس بادشاہ کی زندگی کا یہ منظر بھی بڑا دردانگیز ہے کہ اس کی خوب صورت، خوب سیرت محبوبہ کی سہاگ سیج بسترِ مرگ بنی ہوئی ہے جہاں مہر نہار ملکہ کمُلائے ہوئے پھُول کی طرح پڑی ہے، چہرے پر موت کے آثار ہیں اور بادشاہ اپنی آنکھوں اُس خوش اندام کا دم توڑنا دیکھ رہا ہے، جو دُنیا کا سب میں بڑا اور بُرا دُکھ ہے۔ اسی حالت میں ملکہ کہتی ہے "سرتاج! ... دُنیا کی ہر شے آنی جانی ہے۔ ... میرا بھی آخری وقت آلگا ... لیکن موت کا ہاتھ مجھے تمہاری آنکھوں سے اوجھل کرنا ہے تو کرلے دو ... جیسے تم میری روح میں سمائے ہوئے ہو میں بھی تمہارے من میں بسی ہوئی ہوں۔

مری آتما کے پیارے مری آتما تمہاری!!

مجھے تم سے کوئی قول لینا نہیں۔ ہاں اگر چیتے سے نہ اُتار تو سمجھو میں ہمیشہ تمہارے ہی قدموں کے پاس ہوں .... اور ہم میں تم میں تو یوں بھی جُدائی ممکن نہیں کہ ہماری شادی دراصل ہماری روحوں کا ابدی سنجوگ تھی ...... رہا جسم تو یہ کایا کا ایک پنجرا ہے۔ جس میں جان کی مینا کچھ روز بول کر اُڑ جایا کرتی ہے!"

یہ سُنکر شاہجہاں کی محبّت کے سرچیون ناسور بہہ نکلے۔ اور اُس نے جواب دیا کہ:۔

"میں کیا؟ دُنیا تم سی سراپا خوبی کو یاد کرے گی۔ مگر دُعا ہے خدا وہ دن جلد لائے کہ ہم اب آغوشِ الٰہی میں ملیں!"

اس وقت گو ملکہ ارجمند کی آواز بہت خیف ہو گئی تھی مگر بغیر بولے نہ رہا گیا۔ تو رُک رُک کے اس طرح کہیں جیسے کسی سُنسان جگہ پتوں پر شہد کی بوندیں ٹپک رہی ہوں!

"میرے آقا! دیکھنا ...... رات کی تاریکی دور ہوگئی .. کیا؟ ...... زندگی کا سانگ ختم ہوا چاہتا ہے! ....... اے لو! ...... صبح کا گلابی نور بھی نمودار ہوگیا ...... آسمان سے رحمت کے فرشتے اُتر رہے ہیں ....... اور ہم خوابِ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں ....... لوگو! اٹھو! اٹھو!! ...... محبّت کے گیت گاؤ کہ یہی اٹل ہے ........ یہی سب کچھ ہے ....... اسی کا سدا بول بالا ہے ... ...... محبّت ایک چیستاں ہے ...... جسے جو جانتا ہے .... وہ بتاتا نہیں .... جو .... بتاتا ہے .... وہ .... جانتا .... نہیں!"

یہی کلمۂ وفا زبان پر تھا۔ اور ساری زندگی نمازِ محبت بنی ہوئی تھی کہ ملکۂ زمانی اپنے سرتاج کے ہاتھوں میں ایک تھکے ماندے معصوم کی طرح موت کی میٹھی نیند سو گئی!

صبح ہوئی۔ دنیا نور کی کرنوں میں نہا گئی لیکن ہندوستان کی سرزمین اُداس تھی۔ قصرِ شاہی پر سکوت کا یہ عالم تھا کہ چاندنی رات میں تاج محل پر بھی کیا ہوگا۔ اِدھر حرم سرا میں ایک دل شکستہ شہنشاہ اپنی عزیز ملکہ کے بالیں پر بیٹھا روتا تھا۔ گویا دو جسم ابھی آمنے سامنے ہی تھے۔ مگر ایک روح بچھڑ گئی تھی۔

وہ دن بھی قیامت کا دن تھا جو گزر گیا۔ ایک وہی دن کیا؟ کئی مہینے گزر گئے۔ مگر شاہجہاں یہی کہتا تھا کہ اُس بہشت نصیب کے لئے جب ایک فردوسِ نظر نہ بنالوں گا چین سے نہ بیٹھوں گا۔ آخر اُس نے تاج محل بنایا۔ جو معلّیٰ شانِ حُسن کاری کی تصویر کاہے کو۔

ایک حور ہے جو مرمری جامے میں کھڑی ہے!

اس طرح سچی محبت ہمیشہ اپنا غم حسین بنا دیتی ہے۔ جس سے دُکھ کی چاشنی بھی دنیا کو سُکھ چین دینے لگتی ہے۔ بس تو آیئے! پھر ہم بھی اپنی حسرتوں کا ایک خوبصورت روضہ بنائیں۔ اور اس طرح محبت کی پینگ بڑھا کر عرشِ بریں پہونچ جائیں!۔

# غزل

از جناب سید احمد ترمذی بی۔ اے۔ ایل ایل بی

بند اُن کی نقاب کے نہ کھُلے ۔۔۔ راز اب تک حجاب کے نہ کھُلے
عقدے جامِ شراب کے نہ کھُلے ۔۔۔ رمز اِس آفتاب کے نہ کھُلے
میں نے سو سو طرح سے منت کی ۔۔۔ صدقے اُن کے حجاب کے، نہ کھُلے
اے شبِ غم قسم ہے کاکل کی ۔۔۔ راز اس پیچ و تاب کے نہ کھُلے
تیری آنکھیں نہ دیکھ لیں جب تک ۔۔۔ بخت جامِ شراب کے نہ کھُلے
اس میں کیوں ہے شمیم کاکلِ یار ۔۔۔ بھید بوئے گلاب کے نہ کھُلے
کیا معمہ ہے یہ جہان فریب ۔۔۔ رمز نقشِ سراب کے نہ کھُلے
مرتے مرتے بھی پیچ اے حسرت ۔۔۔ دلِ پُر اضطراب کے نہ کھُلے

# تخیلات

ہو کے خوش لذتِ آزار سے تم
کیوں ہوئے جاتے ہو بیزار سے تم

تم سے ملتے ہو تو بیگانہ وار
تھے نہیں ایسے وضعدار سے تم

ہر قدم پر ہے یہ لغزش کیسی
کس لئے چلتے ہو مے خوار سے تم

خامشی ہے یہ عیاں ہے گویا
ہو گئے محرم اسرار سے تم

ہے نگہ کہتی یہ رمزِ وحشت
آہ الجھے کسی رخسار سے تم

دیکھ لو دیکھ لو آئینہ میں
کچھ نظر آتے ہو بیمار سے تم

مٹ گئے، مٹ گئے، شکوہ بیکار
کیوں ملے ایسے ستمگار سے تم

خوب مقبول کیا یہ سودا
اب چلو عشق کے بازار سے تم

سید مقبول حسین احمدپوری

# سیاح عورت کا خط اپنے محب کے نام

از محترمہ مس حجاب امتیاز علی مدراس،

میرے "مس سیاح عورت" کے خطوط مختلف ادبی رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ یہ ساتواں خط ہے اور آخری خط ہے۔ جو سالنامہ ساقی کے لئے لکھا ہے۔ اس کے بعد یہ خطوط کتابی صورت میں شائع کرا دئے جائیں گے۔

حجاب اسماعیل

"زبرجد علاالدین"

از ایک ایشیائی فضا پہاڑ۔

۱۱ دسمبر سنہ

ترا دیدار ہی نسخہ ہے سب آزاروں کا　　　تیرا آنا تو چھٹ جانا ہے گرفتاروں کا

تندرست ہارلی!

کبھی بیمار نہ پڑو۔

بات اصل یہ ہوئی کہ جب میں "اودے پہاڑوں" سے مس جوری واپس آئی تو میری طبیعت کسی قدر مضمحل تھی۔ دراصل اُسی وقت ڈاکٹر سے رجوع کرانا چاہیئے تھا۔ مگر تم جانو کہ مجھ جیسی آزاد روح، کہاں بھلا ڈاکٹروں کو نبض دکھاتی پھرے گی! اور کہاں پرہیز کرے گی! دوائیں پئے گی ـــــ مگر ہارلی آخر یہ سب کچھ کرنا پڑا۔

تین ماہ حال کی شب کو بہانہ کے ڈاکٹر نے میرا معائنہ کیا اور کہا "تپ چڑھی ہے۔ یقیناً کسی وحشی جزیرے میں زہریلے مچھروں نے انجکشن کیا ہوگا۔ اس لئے برائے چندے کسی خشک مقام پر چلی جاؤ" یہ کہہ کر اس نامعقول نے ایک سرخ رنگ کی دوا میری بوڑھی حبشن (یعنی دہی زرد ناش) کو دی کہ وہ مجھے چار گھنٹے کے وقفے سے پانی میں ملا کر پلا دیا کرے۔

تین دن تو میں دوا سب کی نظر بچا کر گرجنے والے نیلگوں سمندر میں پھینکتی رہی۔ تیسرے دن کا نتیجہ معلوم ـــــ!! اے خدا!..... یعنی بے ہوشی، شدید بخار..... اور زندگی سے بیزاری مایوسی!!۔ ہارلی! دور افتادہ ہارلی! بے ہوشی کے عالم میں بھی جب کبھی ذرا دماغ ٹھکانے ہوتا تھا تو فوراً تم یاد آجاتے تھے! اُف! خدا جانے اس وقت تم کہاں تھے؟ شاید اپنے سفری خیمے میں بیٹھے مزے سے ہرن کے کباب کھا رہے تھے اور یہاں ـــــ سیاح عورت بخار میں بھنی جا رہی تھی۔ ستم ستم!!

چوتھے دن جب مجھے اچھی طرح ہوش آیا تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ میں نے دیکھا کہ میں ایک گہرے آسمانی رنگ کے کمرے میں برف کی سی سفید مسہری پر پڑی ہوں جاڑوں کی خنک اور لطیف ہوائیں چل

رہی ہیں، اور دریچے سے باہر خالص سونے کی زرد چمکیلی دھوپ لہریں مار رہی ہے، کھلے ہوئے دریچوں سے ایشیا کا گہرا نیلا چمکدار آسمان نظر آرہا ہے۔

جوں ہی زوناش نے مجھے بیدار دیکھا، دوڑی دوڑی میرے پاس آئی۔ یہ بوڑھی حبشن چوہیا اب تک بالکل ویسی ہی ہے جیسی زمانہ گذشتہ میں تھی یعنی اب بھی افیون کھاتی ہے، اور عمر خیام کی رباعیات جوش و خروش سے غلط تلفظ میں گاتی ہے۔ تو پھر ہارلی! وہ دوڑی دوڑی میرے پاس آئی اور جھک کر مسلسل پانچ منٹ اس نے میری پیشانی کو پیار کیا۔ اس ثقیل مشغلے کے بعد کہنے لگی کہ "بی بی! اب تک تم کو بخار ہے! شوربہ پی کر پھر سو جاؤ۔"

میں نے اس شیطان کی ساس کا کہا مان لیا۔ شوربہ پیا اور سو گئی۔ مجھے اب تک اس کی خبر نہ تھی کہ میں کہاں ہوں۔ شام تک سوتی رہی، جب اٹھی تو معلوم ہوا کہ میں ایک ایشیائی سانوٹوریم میں لائی گئی ہوں اور زیر علاج ہوں اور جس کمرے میں لیٹی ہوں وہ نرسنگ ہوم کا ایک خاص الخاص خوبصورت کمرہ ہے، یہ سن کر میرے ہوش اڑ گئے۔

"او بلند آسمان!! ..... نرسنگ ہوم!!" پھر بے ساختہ میں نے حیرت انگیز لہجہ میں زوناش کو مخاطب کیا "جنگلی مرغی!! ادھر آ! کیا میں خطرناک طور پر علیل ہوں؟"

زوناش اپنی کالی انگلیاں میرے سنہری مائل گھنگھریالے بالوں پر پھیرنے لگی۔ بولی "اب تو نہیں"

غرض اے شخص! ایک ہفتہ مجھ معصوم کی بری کیفیت رہی۔ ہارلی! میرے پیارے ہارلی! زندگی جسے میں تمہاری جدائی میں امرت سمجھی تھی، کونین سے زیادہ تلخ ہو رہی تھی۔ محض تمہاری محبت کا شوق اور شیرینی تھی جس کی امید پر میں زندہ رہی، ورنہ میری زندگی بھی کوئی زندگی تھی۔ مجھے خبر نہ ہوتی تھی کہ ڈاکٹر کب آتا ہے اور کب جاتا۔

خدا خدا کر کے وہ ناگوار دن گذر گئے۔ اب طاقت آگئی ہے۔ مزے سے گذر رہی ہے۔ اگرچہ ابھی زیر علاج ہوں، مگر اچھی ہوں۔ ہر روز دن میں بلاناغہ تین دفعہ ڈاکٹر اور نرس کی نظر بچا کر دوائیں پلنگ کے نیچے پھینکتی ہوں۔ تم بھی دعا کرو کہ کسی دن پکڑی نہ جاؤں ورنہ نرسنگ ہوم کے احاطہ سے دور نکال کر پھینک دی جاؤں گی۔

جاڑوں کے دن ہیں، بڑے پر لطف ہیں۔ کسی بہانے سے بیمار ہو کر تم بھی یہاں آ پہونچو نا! پھر تو مزے سے گذرے گی! پہاڑ کی سردیاں غضب ڈھا رہی ہیں۔ میں صبح کے آٹھ بجے اٹھتی ہوں۔ عبادت کا وقت گذر چکا ہوتا ہے، اس لئے مختصر سی عبادت کے بعد کسی حسین لباس میں زوناش کے ساتھ ایک لمبی چہل قدمی کو باہر نکل جاتی ہوں۔ باہر شہتوت کے بہت سے درخت ہیں۔ اک درخت کی صورت شکل بالکل ویسی ہی ہے جیسی میں نے اس سے پہلے ایک درخت کی دیکھی یعنی جو تمہارے صحن میں کھڑا ہے۔ جس پر ہم بلبل کا پنجرہ ٹانگا کرتے تھے۔ اور ایک دفعہ بہار کے موسم میں ایک سانبرک نے گھونسلا بنایا تھا۔ سردیوں کی چمکیلی دھوپ نیلے اور سرخ رنگ کے پہاڑوں پر بڑی دل فریب لگتی ہے۔ آج کل میں عمر خیام کے اشعار بہت زیادہ گنگنانے لگی ہوں۔

ہیں ساڑھے گیارہ بجے تک واپس اپنے کمرے میں پہونچ جاتی ہوں۔ اس کے بعد ایک لذیذ ناشتہ، اس کے بعد قہوہ ۔۔۔ اور اخبار پڑھ کر پھر پلنگ۔

شام کے ساڑھے تین بجے آنکھ کھلتی ہے تو میں مسکرا پڑتی ہوں، کیونکہ سامنے تپائی پر ملٹن کی "کھوئی ہوئی جنت" کی سنہری جلد کے نیچے تمہارا جاں نواز خط رکھا ہوا نظر آتا ہے۔۔۔ تمہارا خط!!! ۔۔۔ جو مجھے بعض اوقات اپنی قیمتی زندگی سے بھی زیادہ محبوب معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کے لفظ لفظ سے مجھے عمر خیام کی شراب یاد آجاتی ہے۔ اے خوش بخت! خط کا ہیکو ہوا شراب کا پیالہ کہو۔

برسبیل تذکرہ ۔۔۔! ایک دفعہ جب میں تمہارا خط پڑھ رہی تھی۔ تو اثنا فیہ جناب ڈاکٹر صاحب تشریف لے آئے۔ مجھے مطلق خبر نہ ہوئی۔ اور ویسے بھی ڈاکٹر کوئی قابل توجہ چیز نہیں ہے، میں نے کوئی بارہ پندرہ منٹ توجہ نہ کی، مگر تم جانو یہ ہمارے ڈاکٹر صاحب بھی بڑے تمسخر انگیز بزرگ ہیں مسکرا کر کہنے لگے "خاتون ایسے خطوط صحت کے لئے مضر ہیں!"

"ایں یہ کون؟ کیسے خطوط؟" میں نے کسی قدر وحشت زدہ ہو کر کہا "اوہو! ڈاکٹر تم ہو؟"

"ہاں میں ہوں۔ میں یہ کہتا تھا کہ ایسے خطوط جو دل و دماغ پر غیر معمولی اثر ڈالتے ہوں آج کل آپ کی صحت کے لئے مضر ہیں" یہ کہکر ڈاکٹر دریچے سے باہر سر ڈال کر باغیچے کے زرد پھولوں کو ایک شان بے نیازی سے دیکھنے لگا۔ دیکھا تم نے کس قدر اچھوتی شوخی ہے! اس کمبخت کا یہی مطلب تھا نا کہ میں تمہارا خط نہ پڑھوں۔

میں نے ابرو ذرا ترچھی کر کے کہا "ہرگز نہیں، معاف کیجئے آپ کا خیال غلط ہے۔ ایسے خطوط تو دل کے لئے باعث فرحت اور دماغ کے لئے وجہ سکون ہوتے ہیں"

ڈاکٹر نے اپنے ہونٹوں کے آخری کونے پہ ذرا سا تبسم پیدا کیا، ناک کو ذرا اونچا کر کے کہا "معاف کیجئے تم نے کیسے لیا؟ تم ڈاکٹر تھوڑی ہی ہو؟ تم نے طب کا امتحان دیا ہے؟ تم نے سائنس کی تحقیق کی ہے؟ ملٹن، بائرن، عمر خیام پڑھ لینا انسان کو طب کا ماہر نہیں بنا تا!" (طنزاً مسکرا کر) از راہ کرم ہر بات ڈاکٹر کی رائے لیکر کیجئے۔ مجھے آپکی زندگی بہت عزیز ہے اسی لئے محتاط ہوں۔ ادھر لائیے ۔۔۔ وہ خط! میں دیکھکر بتا سکوں گا کہ یہ آپکی موجودہ حالت میں آپ کیلئے مفید ہے یا مضر! ڈاکٹر کو آزادی میرے آگے پھول دان رکھا تھا۔ بے اختیار دل چاہتا تھا کہ پھول دان اٹھا کر اس موذی کی کھوپڑی پر دے ماروں۔

غرض محبوب ہار لی! دنیا کی یہی کیفیت ہے۔ اللہ سے میری یہی دعا ہے کہ وہ تمہیں جیتا جاگتا تا دیر زندہ اور خوش رکھے ؎

ہم سلامت رہیں بہت دن تک یعنی دنیا کے آخری دن تک

آمین! یا معبود! آمین!!

---

# نئی شادی

از جناب حافظ ولایت اللہ صاحب۔ ایم۔ ایل۔ اے

پُرانے قاعدے سب ہوتے جاتے ہیں ردّی
جما رہی ہے نیا رنگ بیسویں صدی

نئے طریق سے ہوتی ہے آج کل شادی
ہے انتخاب کی دولہا دولھن کو آزادی

بیاہ میں بھی نئی روشنی کا ہے جلوہ
کہ اولڈ گرل کا ہے اولڈ بائے دلدادہ

ہے جستجو کہیں صاحب کی اور کہیں مس کی
بڑی بہار ہے اِن منادیوں کے نوٹس کی

ہے لطف جبکہ ہوں سرگرمِ جستجو طرفین
کہیں تلاش ہو لیڈی کہیں ہو جنٹلمین

یہ آپ خط و کتابت سے طے کریں شرطیں
پسند کے واسطے فوٹو بھی ساتھ میں بھیجیں

کہیں تلاش ہو لیڈی بلند قامت کی
کہیں یہ شرط ہے جانے وہ علمِ موسیقی

یہ آرزو ہے پیانو بھی وہ بجاتی ہو
زہے نصیب اگر اس کے ساتھ گاتی ہو

...نی خوشی ہے کسی کی کیا چوری
...ں ساتھ کریں پارک کی ہوا خوری

پرانی باتوں کا اب اس زمانے میں کیا ذکر
گئے وہ دن کہ جو کرتے تھے والدین یہ فکر

بذاتِ خود یہ لگائیں گے جا کے بات اپنی
عجیب شان سے لے جائیں گے برات اپنی

نہ روشنی ہو نہ باجہ ہو، یہ سب کھٹراگ
چلے گا ساتھ میں دولھا کے صرف اک بُلڈاگ

بجائے پان کے ہوں گے سگار اور سگریٹ
بجائے سہرے کے دولھا کے سر پہ ہوگی ہیٹ

پہن کے آئیں گے قاضی بھی اک شکاری کوٹ
نہ وہ عبا نہ وہ سنجاب اور نہ اُس میں گوٹ

پہن کے آئیں گے قاضی بھی کوٹ اور برجس
کہ جن کے آنے سے افزوں ہو رونقِ مجلس

رہی جو مدِّ نظر کُل اُمور کی اصلاح
یقین ہے کہ بطرزِ جدید ہوگا نکاح

کہ چاکلیٹ بٹے گی بجائے خُرمے کے
دولھن لگائے گی عینک بجائے سُرمے کے

دلہن نہ جائے گی دولھا کے ساتھ اب سُسرال
بیاہ ہوتے ہی جائیں گے دونوں نینی تال

امیر جائیں گے منصوری اور شالامار
غریب کے لئے کافی ہے دامنِ کہسار

روانہ ہوں گے کوئی شملے کوئی دارجلنگ
کوئی جہاز میں جا کر منائیں گے رنگ

# جمالِ دوست

## از حضرت ایم - اسلم

میں ایک ریگستانی علاقے میں ہرن کے شکار کے لئے گیا ہوا تھا پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کے ایک بنگلہ میں میرے ایک دوست نے قیام کا انتظام کیا تھا سواری کے لئے بہت سبک رفتار اونٹ تھے۔

اس بنگلہ کے برآمدے سے ریت کا ایک سمندر لہراتا نظر آتا۔ جہاں تک نگاہ کام کرتی ریت ہی ریت نظر آتی۔ کہیں چھوٹے ٹیلے کہیں بڑے ٹیلے لیکن جب آندھی چلتی تو یہ ٹیلے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو جاتے صبح کے وقت یہ چھوٹا سا صحرا آسمان کے رنگ کا نظر آتا۔ اور دوپہر کے وقت نقرئی ذرات کا ایک میدان معلوم ہوتا۔ شام کے وقت ایسا معلوم ہوتا کہ قدرت نے اس پر سونے کی چادر سی بچھا دی ہے۔ سبزے کا کوسوں نام نہ تھا۔ کہیں کہیں ٹنڈ منڈ درخت ملتے تھے۔

میں ایک روز ہرن کا شکار کرتا اور ایک روز تیتر اور بھٹ تیتر مارتا۔ ادھر کے لوگ اسے "بھٹہ" کہتے ہیں۔ میرا میزبان بڑا زندہ دل اور باذاق آدمی تھا۔ اس کا گاؤں اس جگہ سے کوئی دس بارہ کوس تھا۔ سامان خورد و نوش لانے کے لئے اس نے دو اونٹ مقرر کر رکھے تھے۔ ہر چیز بافراط موجود رہتی اور تو اور وہ گاؤں سے ایک گراموفون بھی لے آیا تھا۔ رات کو کوئی دس گیارہ بجے تک اس کا بھی شغل رہتا۔ ایک روز اس نے ایک نیا "ریکارڈ" بجایا۔ شب کی سنسان فضا میں یوں معلوم ہوتا کہ کوئی دکھیا روح فراقِ یار میں فریاد کر رہی ہے۔ اس وقت ایک ہی مصرعہ یاد ہے ع قسم خدا کی تمہاری ادا نے لوٹ لیا۔

---

طرزِ ادا کچھ ایسی تھی کہ ایک تصویر آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتی۔ یہ ریکارڈ کئی بار ہم نے بجایا۔ میں نے اپنے میزبان سے کہا "شاعر جو تصویر الفاظ میں پیش کرتا ہے اگر ہو بہو ایسا ہو تو کیا لطف ہو!" "بات یہ ہے!" میزبان بولا۔ "ہر چیز مبالغہ نہیں کہی جا سکتی، عشق و الفت کی داستان بعض اوقات اس قدر غیر معمولی ہوتی ہے کہ سننے والا اسے مبالغہ ہی سمجھتا ہے"!

میں لیٹے لیٹے بولا "مجھ سے پوچھو تو لوگ رائی کا پہاڑ بھی بنا لیا کرتے ہیں!"

"غلط کہتے ہو تم!" میزبان بولا! "اتنا تو میں بھی مانتا ہوں کہ جب کوئی شخص کوئی واقعہ بیان کرنے لگتا ہے تو کچھ نہ کچھ مبالغہ بھی ضرور کرتا ہے یعنی ؎

فسانے اپنی محبت کے سچ ہیں پر کچھ کچھ　　　بڑھا بھی دیتے ہیں ہم زیبِ داستاں کے لئے

لیکن یہ بات تو قوتِ بیان پر منحصر ہے کوئی شخص چند الفاظ میں بات کہہ دیتا ہے اور کوئی اللہ کا بندہ اسی بات کے بیان کرنے میں دس منٹ ضائع کر دیتا ہے۔ رہیں عشق و الفت کی باتیں تو جانِ برادر ان میں کسی کو کیا مبالغہ کرنا ہے

آگ میں کوئی سوز کیا بھر سکتا ہے"۔

"میرے یار!" میں نے کہا: "یہ سب باتیں ہی باتیں ہیں۔ میرے خیال میں تو عشق و محبت کے افسانوں میں مبالغہ کے سوا اور کچھ ہوتا ہی نہیں عشق کیا ہے؟ یہی نا! کہ ایک دوسرے سے محبت کرتا ہے یا ایک جانب سے اظہار محبت اور دوسری جانب سے انکار یا خاموشی۔ بے اعتنائی۔ مجبوری۔ جو کچھ بھی چاہو کہہ لو نل دمن۔ شیریں فرہاد۔ لیلے مجنوں۔ ہیر اور رانجھا۔ الغرض اسی قسم کے سینکڑوں افسانے شاعرانہ مبالغہ نہیں ہیں تو کیا ہیں۔ رائی کا پہاڑ نہیں بنا تو کیا ہے' ذرا خدا لگتی کہنا"۔

"خدا لگتی کیا کہوں!" میزبان بولا "تم تو یوسف اور زلیخا کے قصے کو بھی مبالغہ ہی کہو گے حالانکہ اس کا ذکر تو قرآن میں بھی موجود ہے۔ پھر تمہارا ......"

"سنئے! سنئے!" میں نے بات کاٹ کر کہا۔ "لو اس بات پر فیصلہ ہوا جاتا ہے یوسف علیہ السلام کا جو قصہ قرآن میں مذکور ہے وہ تو تم نے بھی پڑھا ہوگا؟" وہ بولے "پڑھا کیوں نہیں!"

"اور مولوی عبدالستار کی یوسف زلیخا بھی تم نے پڑھی ہوگی؟"

"پڑھی تو نہیں!" میزبان بولا "لیکن کئی بار سنی تو ضرور ہے۔ واللہ! غضب کی پُر لطف داستان ہے"۔

"تو اب خدا لگتی کہو!" میں نے ہنسکر کہا "کہ قرآن میں جو یوسف زلیخا کا قصہ مذکور ہے اس سے مولوی عبدالستار کی یوسف زلیخا کو کیا نسبت! ہے نا رائی کا پہاڑ ——————

—— بس اس سے دوسرے قصوں کی صداقت کا بھی اندازہ کرلو۔ قدرت نے انسان کو درد کی لذت سے آشنا کیا ہے اور میرے خیال میں اس کا سب سے بڑا جوہر بھی یہی ہے عشق بھی دل میں درد اور سوز پیدا کر دیتا ہے اور پھر بیان کرنے والا اپنے طرز بیان سے اس میں کچھ ایسا رنگ بھر دیتا ہے کہ دل میں خود بخود کسک سی ہونے لگتی ہے۔

"خیر!" میزبان بولا۔ "اتنا تو تم بھی مانتے ہو عشق و الفت کے واقعات درد انگیز ضرور ہوتے ہیں"

"بیشک!"

"اچھا یہ تو بتلاؤ تمہارے خیال میں عورت زیادہ ایثار کرتی ہے یا مرد؟" میں نے ذرا اسے چڑانے کے لئے کہا "یہ بات تو واقعات پر منحصر ہے۔ کبھی عورت مرد کی خاطر جان پر کھیل جاتی ہے۔ اور کبھی مرد عورت کے لئے جان دے دیتا ہے"۔

"میں فضول بحث میں پڑنا نہیں چاہتا" میرا میزبان ذرا ماتھے پر بل ڈال کر بولا "میں تو اتنا پوچھتا ہوں کہ عشق و الفت کے معاملہ میں کون زیادہ ایثار کرتا ہے"۔

"بھائی!" میں نے ہنسکر کہا "یہ تو فلسفیانہ نکتہ ہے۔ اور اس پر ہر پہلو سے بحث ہوگی"۔

"ہیں!" میزبان بولا "فلسفیانہ بحث تو تم کسی دیوانے سے کر لینا۔ تم میرے سوال کا جواب دو"۔

"دونوں!"

"آخر کسی کو ترجیح بھی دوگے؟"

"حالات پر منحصر ہے!"

"پاگل ہو تم!" میزبان بولا "معلوم ہوتا ہے کہ تم نے کسی عورت کی فطرت کا کبھی مطالعہ ہی نہیں کیا پھر اتنا تو مانو گے کہ عورت مرد کی نسبت رحم دل زیادہ ہوتی ہے۔"

"نہیں!" میں نے مسکرا کر جواب دیا "مجھے اس سے بھی اختلاف ہے۔"

"اچھا رحم دل نہ سہی! لیکن عورت میں محبت کرنے کا مادہ تو مرد سے زیادہ ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "سنیئے حضرت! میں صرف اس قدر مان سکتا ہوں کہ عورت جب کسی سے محبت کرتی ہے تو دل سے محبت کرتی ہے۔ لیکن جب انتقام لینے پر اتر آئے تو جان لے کر رہتی ہے!"

---

"خیر! چھوڑو اس قصے کو" میزبان نے ہنس کر کہا "سبھی شکاری ہٹ دھرم ہوتے ہیں۔ ہاں تم اگر چاہو تو میں تمہیں عورت کے ایثار، وفاداری اور محبت کی ایک زندہ اور طرفہ تر مثال دکھا سکتا ہوں۔ لیکن تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔"

"ساتھ چلنے کی بھی ایک ہی کہی!" میں نے مسکرا کر کہا "جہنم کے دروازے تک تو تمہارا ساتھ دونگا لیکن آگے کی قسم نہیں کھا سکتا۔"

"بڑے بے مروت ہو تم!" میزبان نے ہنس کر کہا "سنا نہیں 'ہمہ یاران دوزخ، ہمہ یاران بہشت!' جنت میں اکیلے کیا کروگے؟"

"عورت کی فطرت کا مطالعہ کیا کروں گا!"

"منہ دھو رکھو! جنت میں شکاری نہ گھسنے پائیں گے۔"

"شکار کرنا تو قدرت کے عین منشا کے مطابق ہے!"

"وہ کیسے؟"

"اگر جانوروں کو مارا نہ جائے تو زمین پر انسان کا رہنا مشکل ہو جائے، دور کیوں جاؤ۔ ذرا اپنے ہاں کی ریاستوں کو ہی دیکھ لو۔ ہرن اور دوسرے جنگلی جانور کھیتی باڑی کو تباہ کر دیتے ہیں۔ زمیندار بیچارے سخت نالاں رہتے ہیں۔"

"یہ تو تمہارا نقطۂ نظر ٹھہرا!" میزبان بولا "اگر قدرت انہیں اس قدر نقصان رساں سمجھتی تو پیدا ہی کیوں کرتی"

میں نے ہنس کر کہا "میرے یار! یہ بھی ایک فلسفیانہ نقطہ ہے۔ آؤ بحث کرکے دیکھ لو!"

"بھاڑ میں جائے تمہارا فلسفہ!" میزبان نے تنگ کر کہا "اگر عورت کی فطرت کا مطالعہ کرنا ہو تو کل تیار ہو جاؤ۔"

آگ میں کوئی اور سوز کیا بھر سکتا ہے۔"

"میرے یار!" میں نے کہا۔ "یہ سب باتیں ہی باتیں ہیں۔ میرے خیال میں تو عشق و محبت کے افسانوں میں مبالغہ کے سوا اور کچھ ہوتا ہی نہیں۔ عشق کیا ہے؟ یہی نا! کہ ایک دوسرے سے محبت کرتا ہے۔ یا ایک جانب سے اظہار محبت اور دوسری جانب سے انکار، خاموشی۔ بے اعتنائی۔ مجبوری۔ جو کچھ بھی چاہو کہہ لو نل دمن۔ شیریں فرہاد۔ لیلےٰ مجنوں۔ ہیر رانجھا۔ الغرض اسی قسم کے سینکڑوں افسانے شاعرانہ مبالغہ نہیں ہیں تو کیا ہیں۔ رائی کا پہاڑ نہیں بنا تو کیا ہے۔ ذرا خدا لگتی کہنا۔"

"خدا لگتی کیا کہوں!" میزبان بولا۔ "تم تو یوسف اور زلیخا کے قصے کو بھی مبالغہ ہی کہو گے حالانکہ اس کا ذکر تو قرآن میں بھی موجود ہے۔ پھر تمہارا ......"

"سُنئے!" میں نے بات کاٹ کر کہا۔ "تو اس بات پر فیصلہ ہو جاتا ہے۔ یوسف علیہ السلام کا جو قصہ قرآن میں مذکور ہے وہ تو تم نے کبھی پڑھا ہوگا؟" "وہ یوسف؟" "پڑھا کیوں نہیں!"

"اور مولوی عبدالستار کی یوسف زلیخا بھی تم نے پڑھی ہوگی؟"

"پڑھی تو نہیں!" میزبان بولا۔ "لیکن کئی باتیں تو سنی ہیں۔ واللہ! غضب کی پُر لطف داستان ہے"۔

"تو اب خدا لگتی کہو!" میں نے ہنسکر کہا۔ "کہ قرآن میں جو یوسف زلیخا کا قصہ مذکور ہے اس سے مولوی عبدالستار کی یوسف زلیخا کو کیا نسبت! ہے نا رائی کا پہاڑ ——————

—— بس اس سے دوسرے قصّوں کی صداقت کا بھی اندازہ کر لو۔ قدرت نے انسان کو درد کی لذت سے آشنا کیا ہے اور میرے خیال میں اس کا سب سے بڑا جوہر بھی یہی ہے۔ عشق بھی دل میں درد اور سوز پیدا کر دیتا ہے اور پھر بیان کرنے والا اپنے طرزِ بیان سے اس میں کچھ ایسا رنگ بھر دیتا ہے کہ دل میں خود بخود کسک سی ہونے لگتی ہے۔

"خیر!" میزبان بولا۔ "اتنا تو تم بھی مانتے ہو عشق و الفت کے واقعات دردانگیز ضرور ہوتے ہیں"

"بیشک!"

"اچھا یہ تو بتلاؤ تمہارے خیال میں عورت زیادہ ایثار کرتی ہے یا مرد؟" میں نے ذرا اسے چڑانے کے لئے کہا۔ "یہ بات تو واقعات پر منحصر ہے۔ کبھی عورت مرد کی خاطر جان پر کھیل جاتی ہے۔ اور کبھی مرد عورت کے لئے جان دے دیتا ہے۔"

"میں فضول بحث میں پڑنا نہیں چاہتا۔" میرا میزبان ذرا ماتھے پر بل ڈال کر بولا۔ "میں تو اتنا پوچھتا ہوں کہ عشق و الفت کے معاملہ میں کون زیادہ ایثار کرتا ہے۔"

"بھائی!" میں نے ہنسکر کہا۔ "یہ تو فلسفیانہ نکتہ ہے۔ اور اس پر ہر پہلو سے بحث ہوگی۔"

"ہیں!" میزبان بولا۔ "فلسفیانہ بحث تو تم کسی دیوانے سے کر لینا۔ تم میرے سوال کا جواب دو!"

"دونوں!"

"آخر کسی کو ترجیح بھی دو گے؟"

"حالات پر منحصر ہے!"

"پاگل ہو تم!" میزبان بولا "معلوم ہوتا ہے کہ تم نے کسی عورت کی فطرت کا کبھی مطالعہ ہی نہیں کیا اچھا اتنا تو مانو گے کہ عورت مرد کی نسبت رحم دل زیادہ ہوتی ہے؟"

"نہیں!" میں نے مسکرا کر جواب دیا "مجھے اس سے بھی اختلاف ہے۔"

"اچھا رحم دل نہ سہی! لیکن عورت میں محبت کرنے کا مادّہ تو مرد سے زیادہ ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "سنئے حضرت! میں صرف اس قدر مان سکتا ہوں کہ عورت جب کسی سے محبت کرتی ہے تو دل سے محبت کرتی ہے۔ لیکن جب انتقام لینے پر اتر آئے تو جان لے کر رہتی ہے!"

---

"خیر! چھوڑو اس قصے کو" میزبان نے ہنس کر کہا "سبھی شکاری ہٹ دھرم ہوتے ہیں۔ ہاں تم اگر چاہو تو میں تمہیں عورت کے ایثار۔ وفاداری اور محبّت کی ایک زندہ اور طرفہ تر شان دکھا سکتا ہوں۔ لیکن تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔"

"ساتھ چلنے کی بھی ایک ہی کہی!" میں نے مسکرا کر کہا "جہنم کے دروازے تک تو تمہارا ساتھ دونگا لیکن آگے کی قسم نہیں کھا سکتا۔"

"بڑے بے مروّت ہو تم!" میزبان نے ہنس کر کہا "سنا نہیں "ہمہ یاران دوزخ۔ ہمہ یاران بہشت!" جنت میں اکیلے کیا کرو گے؟"

"عورت کی فطرت کا مطالعہ کیا کروں گا!"

"منہ دھو رکھو! جنت میں شکاری نہ گھسنے پائیں گے!"

"شکار کرنا تو قدرت کے عین منشا کے مطابق ہے!"

"وہ کیسے؟"

"اگر جانوروں کو مارا نہ جائے تو زمین پر انسان کا رہنا مشکل ہو جائے' دور کیوں جاؤ۔ ذرا اپنے ہاں کی ریاستوں کو ہی دیکھ لو۔ ہرن اور دوسرے جنگلی جانور کھیتی باڑی کو تباہ کر دیتے ہیں۔ زمیندار بیچارے سخت نالاں رہتے ہیں۔"

"یہ تو تمہارا نقطۂ نظر ٹھہرا!" میزبان بولا "اگر قدرت انہیں اس قدر نقصان رساں سمجھتی تو پیدا ہی کیوں کرتی"

"میں نے ہنس کر کہا "میرے یار! یہ بھی ایک فلسفیانہ نقطہ ہے۔ آؤ بحث کر کے دیکھ لو!"

"بھاڑ میں جائے تمہارا فلسفہ!" میزبان نے تنگ کر کہا "اگر عورت کی فطرت کا مطالعہ کرنا ہو تو کل تیار ہو جاؤ۔"

"کہاں چلو گے ؟"

"یہاں سے کوئی پندرہ بیس کوس"

"اور راستہ میں شکار بھی تو ملے گا ؟"

"ملے گا تو سہی۔ لیکن اگر شکار میں لگ گئے تو پھر وہاں پہنچتے پہنچتے شام ہوجائیگی"۔

پھر میرے پلنگ پر زور سے ہاتھ مار کر۔

"اور یہ میں کہے دیتا ہوں کہ وہاں چل کر جو کچھ دیکھوگے عمر بھر نہ بھولوگے"۔

"بہت اچھا!" میں نے کہا: "اب تو سونے دو!"

"اچھا!" میزبان بولا۔ "نیّتِ شب بخیر!"

---

اگلے روز علی الصبح ہی اونٹوں پر پاکھڑے ڈال دیئے گئے۔ کھانے پینے کا سامان ایک لادو اونٹ پر رکھدیا گیا اور ایک اونٹ پر میرا ملازم میری رائفل اور بندوق اور میرے میزبان کی بندوق سنبھال کر بیٹھ گیا۔ طلوعِ آفتاب سے قبل ہی ہم سوار ہوگئے۔

صحرا کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا جسم میں زندگی کی روح پھونک رہی تھی۔ ریت شبنم کے آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھی۔ اونٹ بھی اپنی لامبی لامبی گردن اُٹھائے رقص کرتے چلے جارہے تھے۔ ریت پر انکے پاؤں پڑنے سے "دھس دھس" سی جو آواز پیدا ہوتی اس میں بھی ایک ترنم تھا۔ تھوڑی دیر بعد شاہ مشرق سنہری رتھ میں سوار ہوکر اپنے جمال جانسوز کی جھلک دکھانے لگا۔ میرا ساربان جو اونٹ کے آگے بیٹھا تھا اچانک گانے لگا ع

"عشق تیرے نے کملی کیتی میرے.....،"

سہانا وقت، پھر صحرا کا سکوت اور اس پر گانے والے کی پرسوز آواز اُس وقت کی دل کی کیفیت بیان نہیں ہوسکتی۔ میرا میزبان اپنا اونٹ میرے برابر لاکر بولا "دیکھا اسے کہتے ہیں محبت کی تاثیر!"

"کیا ؟"

"یہ اپنے دل سے پوچھو!"

دل سے کیا پوچھتا۔ دل میں تو پنجابی کے اس ملک الشعرا کے گیت نے کئی خوابیدہ تمنائیں بیدار کردی تھیں۔

"اسے کہتے ہیں شاعر کا کمال!" میزبان کہنے لگا۔ "جسے تم مبالغہ سمجھتے ہو۔ ہے نا! الفاظ میں فراق اور درد کی تصویر کھنچی ہوئی۔ جان برادر جب تک دل میں درد مستور نہ ہو کسک نہیں پیدا ہوتی۔ شمع جلنے پر ہی پروانے آتے ہیں، چاند نکلے تو کبک صیاد کے دام میں آتا ہے آگ جلے تو شعلہ نکلتا ہے۔ کنول کھلے تو بھونرا بھی طواف کو آموجود ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر دل میں درد محبت ہو تو زندگی کا لطف حاصل ہوتا ہے۔ ارے بھائی! عشق بُری بلا ہے۔ اس نے منصور کو سولی پر لٹکوایا۔ بلالؓ کو ریگ طپاں پر جلوایا۔ محمود کو ایاز کا دیوانہ بنایا۔ مثالیں تو

سینکڑوں ہیں۔ مطلب یہ ہے۔ کہ عشق بچوں کا کھیل نہیں۔ آج تم حضرت عشق کا ایسا کرشمہ دیکھو گے کہ اگر میں تم سے یوں ہی بیان کر دیتا تو شاید تم یقین نہ کرتے۔"

اونٹ دھیرے دھیرے چل رہے تھے اور میں خاموش بیٹھا تھا۔ میرا میزبان سمجھتا تھا کہ میں اس کی باتیں غور سے سُن رہا ہوں حالانکہ میں اس وقت "ہیر اور رانجھا" کے قصے پر غور کر رہا تھا۔

---

اتنے میں پچھلے اونٹ والے نے آواز دی۔

"اے حضور! وہ دیکھئے ہرن کھڑے ہیں!"

اور پیشتر اس کے کہ میں کچھ کہوں میزبان بولا۔

"چلو چلو! لوٹتے وقت شکار کرینگے!"

پھر میری طرف ہنستے ہوئے دیکھ کر "تمہارے منہ میں تو پانی بھر آیا ہوگا" پھر ہرنوں کی طرف دیکھتے ہوئے

"دو تین کالے بھی ہیں۔ کیا صلاح ہے تمہاری؟"

"چلے چلو! لوٹتے وقت دیکھ لینگے!"

"ہاں میرے یار!" میں نے اپنے مہار والے سے کہا "تو چپ کیوں ہو گیا" وہ پھر گانے لگا۔ وہی وارث شاہ کی ہیر۔ جس کا لفظ لفظ محبت کی تفسیر تھی۔ اور جسے سُن کر اہلِ دل پر حالت طاری ہو جاتی ہے۔

---

سورج کافی اونچا ہو چکا تھا۔ اور منظر لحظہ بہ لحظہ بدل رہا تھا۔ اس وقت یہ چھوٹا سا صحرا اپنے اصلی رنگ پر آ چکا تھا۔ ریت کے ذرات کچھ اس طرح چمک رہے تھے۔ جیسے زمین پر آبِ زر کی بارش ہو رہی ہو۔ ہوا بہت خوشگوار تھی۔ اب ہم ایسے مقام پر پہنچ چکے تھے جہاں ریت کے بڑے بڑے ٹیلے دور تک چلے گئے تھے۔ کہیں کہیں سخت زمین بھی ملتی تھی۔ اور چھوٹی چھوٹی خاردار جھاڑیاں بھی تھیں۔ کہیں کہیں سے تیتر کی آواز بھی آ جاتی تھی۔ اس وقت ذرا فاصلے پر سے دس بیس کونجیں ہماری طرف آتی نظر آئیں۔ مقراض کے پروں کی طرح دو قطاروں میں پرواز کر رہی تھیں۔ راہبر آگے آگے تھا۔ جانے کہاں سے آئی تھیں۔ اور کدھر کے ارادے تھے۔ میں نے اپنا اونٹ روک کر ملازم سے بندوق لے لی کہ اگر سر پر سے گذریں تو فائر کروں۔ میزبان نے پوچھا۔

"کیا فائر کرو گے؟"

"کچھ ارادہ تو ہے۔"

"چھوڑو بھی! ایک تو یہ ہیں بھی زد سے باہر۔ اور پھر دیکھو تو کس بے فکری کے ساتھ اُڑی چلی آ رہی ہیں، مفت میں انہیں پریشان کرو گے اور اگر بالفرض محال ایک تم نے مار بھی لی تو اس کے ساتھ کی حرام موت مریگی۔ کونج کے جوڑے کی محبت تو مشہور بات ہے۔"

میں نے ہنسکر کہا "تو پھر کوئی قصہ سنا دونا"

"قصہ!" میزبان بولا۔ "ایک واقعہ سناتا ہوں سنوگے؟"

"کیوں نہیں!"

---

ہمارے قافلے کا ایک اونٹ ذرا سرکش تھا ساربان کہتا تھا کہ یہ مستی پر آیا ہوا ہے۔ دس بیس قدم چل لیتا تو مستی کرنے لگتا۔ لیکن جب پانچ دس ڈنڈے پڑ جاتے تو سیدھا ہو کر چلنے لگتا۔ اور پھر وہی منہ کے اندر سے کوئی سرخ سی تھیلی نکال کر "بڑ بڑ بڑ" کرنے لگتا۔ اب کے اس نے یہ شرارت کی کہ چلتے چلتے یک دم بیٹھ گیا۔ اونٹ والا ہوشیار آدمی تھا وہ جست کر کے اتر گیا۔ اور پھر سونٹے سے اس کی کچھ ایسی مرمت کی کہ مجھے ترس آ گیا میں نے کہا "کیوں مارتے ہو۔ بے زبان ہی تو ہے!"

اور میزبان بولا "مارنے دو۔ اس کا علاج یہی ہے حرامزادے نے بڑی شرارت کی تھی!"

"کیسی شرارت؟" میں نے تعجب سے پوچھا "یہی جو چلتے چلتے بیٹھ گیا!"

"تو اس سے کیا ہوتا؟"

"ہونا کیا تھا" میزبان بولا "اگر ساربان کا پاؤں پاکھڑے میں اٹک جاتا تو پھر اس کی ہڈی بوٹی پس جاتی"

"واقعی اب جو ما پڑ تو ڈنڈے پڑے تو حضرت اونٹ کے سب بل نکل گئے اور سیدھا ہو کر چلنے لگا۔ میں نے کہا "ہاں! وہ کونج والا قصہ تو بیچ میں ہی رہا!"

"ہاں سنئے!" میزبان بولا "دیر کی بات ہے ریں ملازم تھا میرا کام دیہات کے متعلق تھا۔ شکار کا خوب موقع ملتا تھا۔ ایک روز ایک جوہڑ کے کنارے میرا کیمپ لگا تھا۔ جوہڑ کے چاروں طرف پیپل کے بڑے بڑے پیڑ تھے۔ ان پر ہریل بکثرت رہتے تھے۔ اور مور بھی بہت تھے۔ ایک پیپل کے نیچے ایک سادھو دھونی رمائے بیٹھا تھا یوں تو خوش مزاج آدمی تھا۔ لیکن ان پیڑوں پر سے ہریل نہیں مارنے دیتا تھا۔ میں جب کبھی ادھر جا نکلتا تو گھنٹہ دو گھنٹے سادھو کے پاس بھی جا بیٹھا کرتا۔ اور وہ مجھ سے گیان دھیان کی باتیں کیا کرتا۔

---

ایک روز میں دورہ کر کے آ رہا تھا کہ ایک جگہ دس پانچ کونجیں چگتی نظر آئیں۔ ذرا فاصلہ پر ایک نیشکر کا کھیت بھی تھا۔ میں اس کھیت کی سمت ہو لیا۔ کھیت کے پاس پہنچ کر میں گھوڑے سے اترا اور ساتھیوں سے کہا کہ تم راستے راستے قدم قدم چلے جاؤ۔ وہ تو آگے بڑھ گئے اور میں چپکے سے کھیت میں گھس گیا۔ اور بڑی احتیاط سے کونجوں کی طرف بڑھنے لگا۔ ایک جگہ سے جھانک کر جو دیکھا تو صاف نظر آتی تھیں لیکن فاصلہ زیادہ تھا۔ اب آگے بڑھوں تو خوف تھا کہ کہیں اڑ ہی نہ جائیں۔ وہیں سے تاک کر فائر کر دیا۔ سب اڑ گئیں۔ اور میں بڑی حسرت سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔ لیکن میرے دیکھتے دیکھتے ایک کونج دوسری سے پیچھے رہ گئی۔ اور پھر اسی جوہڑ

کے پاس جہاں میرا ڈیرا تھا جا گری۔ میرے ہمراہیوں نے بھی اسے گرتے دیکھ لیا تھا۔ وہ بھی بھاگے اور میں بھی بھاگا۔ لیکن جب جوہڑ پر پہنچے تو اور ہی تماشہ دیکھا۔

کونج اسی پیڑ کے نیچے جہاں سادھو کی جھونپڑی بنی ہوئی تھی اس کا ایک بازو ٹوٹا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ سادھو لکڑی لئے پاس کھڑا تھا کیونکہ دو کتے اُسے گرتے دیکھ کر آ گئے تھے۔ میں نے پاس جا کر کہا "خیر! فائر خالی تو نہیں گیا"

اور میرا ایک ملازم بولا "فاصلہ زیادہ نہ ہوتا تو وہیں رہتی"

اور میں نے ہنس کر کہا "آج تو پوٹ اُڑے گی اس کی"

"ایک بولا پاؤ سے کیا کم ہو گی!"

سادھو خاموش کھڑا یہ سب باتیں سُن رہا تھا میری طرف دیکھ کر کہنے لگا "میاں! آپ نے ہی اس بے زبان کو مارا ہے؟"

میں نے کہا کچھ پوچھتے ہیں۔ کس مصیبت سے مارا ہے"

"بے زبان کو دُکھ دے کر آپ کو کیا ملا؟" سادھو سر ہلا کر کہنے لگا "پیٹ بھر کر بھی اتنی مزا بھی آئے گا؟"

"آپ کا بھی سامان ہو گیا تو اسے بھی دیکھ لینگے۔ آج تو اس کے ساتھ بیٹھیں گے!" میں نے مسکرا کر کہا "کس کے؟" سادھو نے زمین پر لاٹھی ٹیک کر پوچھا "کونج کے!" میں نے کہا۔

"رام کا نام لیجئے!" سادھو مسکرا کر بولا "کون مائی کا لال" اسے ہاتھ لگا سکتا ہے "گُسائیں جی!" میرا ایک ہمراہی بولا "حلال جانور ہے۔ حرام مرے گا آپ کے کیا ہاتھ آئیگا؟"

"ہم حلال و حرام کیا جانیں! ہم تو اس کی سیوا کرینگے۔ یہ ہمارا مہمان ہے!"

"جیسے آپ کی مرضی!" میں نے کہا "اگر آپ ناراض ہوتے ہیں تو ہم بھی اسے کچھ نہیں کہتے" یہ کہکر میں اپنے ڈیرے کی طرف چلا۔ سادھو ہاتھ اُٹھا کر بولا "شاباش میاں! رام بھلا کرینگے"

---

دوپہر کے وقت میں پیپل کے نیچے گھاٹ پر پڑا کوئی کتاب دیکھ رہا تھا۔ اچانک مجھے ایک کونج کے "کرلانے" کی آواز سنائی دی۔ میں نے جو اوپر نگاہ اُٹھائی تو ایک کونج کو پیڑوں پر منڈلاتے دیکھا۔ اپنی لامبی گردن نیچے جھکائے جہاں مجروح پڑی تھی اس کے اوپر چکر کاٹ رہی تھی اور زور زور سے چلا رہی تھی کبھی تو اُڑتے اُڑتے بہت اونچی چلی جاتی۔ اور کبھی بہت نیچے آ جاتی۔ مجروح کونج بھی گردن اُٹھا اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھتی۔ اور ہلکی ہلکی کبھی آواز بھی نکالتی پچھلے پہر میں نے اس جگہ سے کوچ کیا دوسری کونج ابھی تک ان پیپلوں پر منڈلا رہی تھی۔ اور چلا رہی تھی۔ بخدا اس کی چیخ و پکار سے مجھے بہت رنج ہونے لگا۔ اور میں نے عہد کر لیا کہ آئندہ کونج کبھی نہیں مارونگا!"

---

اس واقعہ کو کم و بیش چھ ماہ کا عرصہ ہونے کو تھا۔ اور میں پھر ایک بار دیہات کا دورہ کرتے ہوئے اسی جوہڑ پر جا اُترا۔ نوکر چاکر تو اسباب ٹھکانے لگانے لگے۔ اور میں سادھو کے پاس آ بیٹھا کچھ دیر ادھر اُدھر کی باتیں

ہوتی رہی۔ میں نے پوچھا "گسائیں جی! کہئے وہ آپ کا مہمان کہاں گیا؟"

"مہمان!" سادھو نے میری طرف کچھ تعجب سے دیکھا اور پھر مسکرا کر بولا "سمجھ گیا! آپ اس کونج کا ذکر کرتے ہیں جسے آپ زخمی چھوڑ گئے تھے" "جی ہاں!" میں نے پوچھا "زندہ ہے، یا مر گئی؟"

"دیکھ لیجئے!"

یہ کہہ سادھو جھونپڑی سے ذرا ہٹ کر زور زور سے "آؤ آؤ" کرنے لگا۔ ابھی اس نے کوئی پانچ سات بار ہی پکارا ہوگا کہ کونج کا ایک جوڑا ایک کھیت میں سے نکل کر بھاگا بھاگا آ گیا اور سادھو کی طرف گردن اُٹھا اُٹھا کر کچھ اس انداز سے دیکھنے لگا جیسے کوئی کھانے کو مانگتا ہو۔

سادھو "آؤ آؤ" کہتا ہوا اپنی گھاس پھوس کی کٹیا کے اندر گیا۔ یہ دونوں جانور بھی اس کے ساتھ ہی اندر گھس گئے۔ اس نے ایک دیگچی سے مٹھی بھر اُبلے ہوئے چاول نکال کر ان کے آگے ڈال دیئے اور پھر میری طرف دیکھ کر بولا "دیکھ لیئے میرے مہمان"؟

"یہ دوسرا کہاں سے آ گیا؟"

سادھو بولا "جس روز آپ نے اسے زخمی کیا اس روز یہ دوسرا جانور بھی آ پہنچا۔ شام تک تو سر پر منڈلاتا اور چیختا رہا۔ رات بسیرا کرنے کہیں چلا گیا۔ لیکن اگلے روز پھر آ موجود ہوا۔ صبح سے شام تک سر پہ منڈلاتا رہتا۔ پھر ہوتے ہوتے زمین پر اترنے لگا۔ لیکن بہت فاصلہ پر رہتا۔ پھر یہ حالت ہوئی کہ جب کوئی آس پاس نہ ہوتا تو اپنے مجروح ساتھی کے پاس آ کھڑا ہوتا۔ لیکن جب کوئی آہٹ پاتا تو اڑ جاتا۔ اسی طرح دو ایک مہینے گذر گئے۔ اور اب جو کچھ ہے آپ خود دیکھ رہے ہیں"۔

---

"توجان برادرا" میرا میزبان بولا۔ "جب بے زبان ایک دوسرے سے اس قدر اُلفت کر سکتے ہیں تو انسان جو اشرف المخلوقات ہے اُس کی محبت کا اندازہ ہو ہی نہیں سکتا"۔

"ہاں سچ ہے!" میں نے کہا "جس پر محبت کا جادو چل جائے جینے کا لطف کچھ اُسے ہی حاصل ہوتا ہے"۔

اسی طرح چلتے چلتے اور باتیں کرتے ہم ایسی جگہ جا پہنچے جہاں زمین پر کچھ ہریاول سی نظر آنے لگی تھی۔ دور فاصلہ پر درختوں کا ایک جھنڈ نظر آ رہا تھا۔ میرے میزبان نے ان درختوں کی طرف اشارہ کرکے کہا "لو دیکھو وہاں جانا ہے ہمیں"۔

"کتنا فاصلہ ہوگا؟"

"یہی کوس دو کوس!"

"میرے یار!" میں نے مسکرا کر کہا "یہ تمہارے کوس دو کوس کبھی ختم بھی ہونگے۔ پہر بھر سے یہی سُن رہا ہوں کہ بس کوس دو کوس"۔

"اب پہنچے ہی سمجھو" میزبان بولا "بہت پُرفضا مقام ہے"
"کوئی گاؤں ہوگا؟"
"ایک چھوٹا سا نخلستان ہے۔ جہاں صرف ایک مرد اور ایک عورت رہتی ہے"
"تو کیا بس یہی مرد و عورت دکھلانے تم مجھے لئے جا رہے ہو؟ کیا سینگوں والے انسان ہیں؟"
میزبان سنکر کہنے لگا "سینگوں والے تو نہیں، لیکن قدرت نے جو دل عطا کیا ہے شاید ہی کسی کو ملا ہو"

---

آخر خدا خدا کر کے یہ سفر ختم ہوا اور ہم درختوں کے پاس پہنچ کر کھڑے ہو گئے۔ مختلف قسم کے تین پچیس بہت بڑے بڑے پیڑ تھے۔ ان پیڑوں کے آس پاس دو دو چار چار ہرن ہو ساتے ہیں بیٹھے تھے (بلیں) دیکھ کر وہ بالکل خوفزدہ نہیں ہوئے۔ بس ذرا گردنیں اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگے پیڑوں پر طیور میٹھے میٹھے مزے مزے سے چہچہا رہے تھے دو چار بھیڑیں اور چند ایک بکریاں ایک طرف میٹھی میٹھی جگالی کر رہی تھیں۔ ایک طرف آم کے دو تین بہت بڑے بڑے پیڑ تھے۔ ان پیڑوں کے نیچے ایک چھوٹی سی جھونپڑی تھی۔ اس جھونپڑی کی کوئی ہری ہری بیل چڑھی تھی جھونپڑی کے سامنے ایک پیڑ پر جھولا پڑا ہوا تھا ایک عورت جس کے بال برف کی طرح سپید تھے۔ جھولے پر بیٹھی تھی اور ایک مرد جس کی لانبی جٹیں دودھ کی طرح اجلی اور سپید تھیں اسے جھلا رہا تھا۔ انھوں نے جو ہمیں دیکھا تو عورت جھولے سے اتری اور دونوں مسکراتے ہوئے ہماری طرف آئے۔ ہم نے بھی آگے بڑھکر انہیں ... اور انھوں نے ہاتھ اٹھا کر ہمیں اشیرباد دی"

کچھ دیر کھڑے کھڑے وہ ہم سے باتیں کرتے رہے "کہاں سے آنا ہوا۔ کیسے آنا ہوا" وغیرہ وغیرہ۔ پھر زمین خاکی پر بیٹھ گئے اور ہم سے بھی کہا "بیٹھ جاؤ نا!"

ہم بھی بیٹھ گئے۔ بوڑھے نے پوچھا "کچھ بھوجن کروگے؟"

اور بڑھیا بولی "باجری کی روٹی موجود ہے!"

ہم نے کہا کہ "ہمارے پاس کھانے پینے کا سامان موجود ہے" بڑھیا نے کہا "بکری کا تازہ دودھ پی لو"

"مہربانی!" میرا میزبان بولا "ہم تو آپ کے درشنوں کو آئے ہیں!"

"بیٹا!" بوڑھا بولا۔ "رام نے ایک سے ایک مورت بہتر بنائی ہے۔ من میں محبت کی جوت ہو اور گیان کا شوق ہو تو سب جلوے گھر بیٹھے نظر آ جاتے ہیں۔ من کا تیرتھ پوتر ہو تو آتما کو شانتی ہوتی ہے"

"... ہے!" میزبان نے جواب دیا "لیکن اللہ کے نیک بندوں کو دیکھنا بھی تو عبادت ہے!"

... پھر ادھر ادھر دیکھ کر کہا "جنگل میں منگل ہو رہا ہے! آپ کا دل تو یہاں خوش رہتا ہوگا؟"

... نے ہنسکر کہا۔ "جو من مارے۔ اس کے لئے شہر اور بن کی تمیز نہیں رہتی، دنیا من کے ... جس کی آنکھ پیتم سے لڑ گئی سمجھ لو اس کے من کی دنیا بس گئی۔ وہ دھرتی میں جہاں بھی جائیگا

سُکھ پائے گا؟"

"ہاں !" میں نے کہا "پھر بھی شہر کی بات شہر کے ساتھ ہے۔ آخر یہ ویرانہ ہی تو ہے۔ رہا من کا مارنا۔ تو یہ کوئی آسان کام نہیں !"

یہ سنکر بُڑھا اور بُڑھیا دونوں ہنسنے لگے۔ بڑھیا بولی "بیٹا ! تم اسے ویرانہ کہتے ہو۔ کیوں ؟ کس چیز کی کمی ہے یہاں ؟ وہ دیکھو ! چوپائے بیٹھے ہیں۔ یہ اوپر درختوں کے سینکڑوں پکھیرو آباد ہیں۔ سبزہ ہے۔ امرت ہے۔ دھوپ ہے۔ چھاؤں ہے۔ دھرتی ہے۔ سر پر اکاس کا منڈل ہے۔ رات کو تارے جگمگاتے ہیں۔ کیا بھلی بہار دکھاتے ہیں۔ جھاڑیوں میں جھینگر پریتم کی یاد میں تانیں اُڑاتے ہیں۔ صبح ہوتی ہے۔ سورج دیوتا درشن دیتے ہیں۔ دھرتی نور سے چمکنے لگتی ہے۔ زندگی کی لہر ذرے ذرے میں دوڑ جاتی ہے۔ رات آتی ہے تو دھرتی سوتی ہے۔ رام جاگتے ہیں۔ نہ چور کا ڈر نہ حاکم کا خوف ! من ہے اور من کی موج۔ بیٹا ! من مارنا کوئی مشکل کام نہیں۔ آتما ٹھنڈی ہو تو پرماتما کے درشن ہوتے ہیں اور جسے پرماتما ملا اُس کی آتما کو سُکھ ہی سُکھ ہے !"

---

میں نے سر جھکا لیا۔ اتنے میں ایک نوکر کچھ پھل لے آیا۔ ہم نے یہ پھل ان کی خدمت میں پیش کیا۔

بڈھا بولا "پھل تو سبھی میٹھے ہوتے ہیں۔ لیکن پریت کا پھل بہت میٹھا ہوتا ہے۔ جو لوگ پریت کی شراب پی کر مست ہوں وہ شہر میں رہیں یا بن میں ہمیشہ خوش رہتے ہیں۔ یہ سنسار تو دُکھ کی کھیتی ہے۔ سُکھ اور شانتی صرف اسے حاصل ہوتی ہے۔ جسنے پریت کے پیالے سے پریم کا رس پیا ہو۔ بیٹا ! پریت اور پریم کی دنیا میں ذات پات کا دخل نہیں۔ دھن اور دولت کا لحاظ نہیں (بُڑھیا کی طرف اشارہ کر کے) یہ راج پتری۔ دھن دولت والی۔ میں چاکر۔ یہ اکاس کے منڈل کا ایک سُندر تارا۔ میں دھرتی کا کیڑا ! یہ پھولوں کی سیج والی۔ میں خاک پر سونے والا۔ کچھ سمجھے بیٹا ! ہم نے پریت کے پیالے سے پریم کا امرت پیا۔ اور جب پریتم ملا تو بن میں آ ڈیرا لگایا۔ ہم نے سیوا کے میٹھے منتر سیکھے۔ اب پریت بھی ہے اور پریتم بھی۔ آتما آنند ہے اور پرماتما سے لو لگی ہے۔ اور اسی کی بدولت جنگل میں منگل نظر آرہا ہے۔ یہ پنچھی پکھیرو ہم سے پیار کرتے ہیں اور ہم ان سے دل لگاتے ہیں !"

"آپ یہاں کب سے مقیم ہیں ؟" میں نے پوچھا۔

بوڑھا مُسکرا کر بولا "وقت تو تب یاد ہو جب سر پر سے دُکھ پایا ہو۔ خوشی اور شانتی کی گھڑیاں تو پون کے جھونکے کی طرح گذر جاتی ہیں سمجھے لو ! جب آئے تھے مرگ کی طرح چوکڑیاں بھرتے تھے اور آج روئی کے گالوں کی حالت ہے !"

"کبھی وطن بھی تو یاد آتا ہوگا ؟"

"وطن !" بوڑھا بولا "جانے تم وطن کسے کہتے ہو۔ وطن بھی کبھی دیکھینگے ! دریا کے کنارے تو پہنچ چکے۔ اب ناؤ کی راہ دیکھتے ہیں۔ آئے تو اُس پار پہنچ جائیں۔ وطن بھی تو اُس پار ہی ہے نا۔ اور جو تم جنم بھوم کی پوچھو ! تو پھر (عورت کی طرف دیکھ کر) سُندری کی پریت نے وہ بھی بھلا دیا۔ بیٹا ! پرماتما کے بعد اس دھرتی میں پریت اور محبت کرنے والی عورت ہے۔ پرماتما نے اس کے کرموں میں پریم اور پریت لکھ کر سنسار کے دکھ کی دوا بنا کر اسے دھرتی پر بھیج دیا۔

اس کی ممتا اس کے بڑھنے پر آنچ نہیں آنے دیتی۔ اور اس کا پیار اس کے ساتھی اور پتی کے لئے آتم شکھ ہے"

---

سامنے بڑھ چکے تھے اور تاجدار مشرق اپنی مغربی مملکت کی سیاحت کا ارادہ کر رہا تھا۔ ہم نے اب جانے کی اجازت چاہی۔ بوڑھا اور بڑھیا ہمارے ساتھ ہی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور جہاں ہمارے اونٹ کھڑے تھے وہاں تک ہمارے ساتھ آئے۔ اور رخصت کے وقت خیر و برکت کے لئے ہاتھ اُٹھائے۔

جب ہم سوار ہوکر کچھ فاصلہ پر پہونچے تو میں نے دوربین لگاکر درختوں کے اس جھنڈ کی طرف دیکھا۔ دونوں میں سے ایک جھولے پر بیٹھا تھا۔ چونکہ فاصلہ زیادہ تھا اس لئے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کون ہے۔ ہمارے اونٹ تیزی سے چل رہے تھے۔ راستے میں ہرن بکثرت ملتے تھے۔ لیکن اس جوگی اور اس کی رفیقۂ حیات کی باتیں سنکر اس وقت تو زندگی کا یہ غونما بے کار معلوم ہوتا تھا۔ میزبان اپنا اونٹ میرے برابر لاکر بولا "وہ دیکھو! پانچ سات کالے کھڑے ہیں! فائر نہیں کروگے؟"

"نہیں!"

"کیوں کیا خیال ہے تمہارا؟"

"دیکھ لیا! اسے کہتے ہیں محبت کی صلحہ کاری!"

"ٹھیک ہے!"

میزبان کہنے لگا "واللہ! کیا مزے سے زندگی بسر کرتے ہیں"

اور میں نے ایک لمبا سانس لیکر کہا "یہ نکتہ تو آج ہی حل ہوا!"

"کیا؟" میزبان نے پوچھا "یہی!" میں نے کہا "جینا اسی کا نام ہے جسے جمالِ دوست میسر ہو"

ایم۔ اسلم

---

# باقیاتِ فانی

از جناب مولنا شوکت علی خاں فانی بدایونی بی۔ اے ایل ایل بی (علیگ)

اُٹھا لے نگاہِ شوق اُٹھ متاعِ جاں لئے ہوئے  
وہ دامن نگاہ میں ہیں بجلیاں لئے ہوئے

فلک کی ساری پستیاں سپہرِ قلبِ خاک ہیں  
زمین کی ساری رفعتیں ہیں آسماں لئے ہوئے

حجابِ روزگار میں جھلک ہے یادِ یار کی  
نشاط آشکار ہے غمِ نہاں لئے ہوئے

وصال ہو کہ ہجر ہو حیات ہو کہ موت ہو  
ہر اعتبارِ عشق ہے پیامِ جاں لئے ہوئے

بنائے غم کی خیر ہو کہ آج آہِ واپسیں  
چلی ہے دل کی وادیوں سے آندھیاں لئے ہوئے

نہ پوچھ عہدِ ہوش کو کہ دامنوں کی آڑ میں  
پھرا کیا ہوں دامنوں کی دھجیاں لئے ہوئے

فسانۂ ذات نام ہے لطافتِ حیات کا  
غبارِ راہِ کارواں ہے کارواں لئے ہوئے

ترے کرم سے کیا سماں ہے عالمِ گناہ کا  
سیاہیاں اُمید کی تجلیاں لئے ہوئے

وہی ہوں میں جو تو نہیں وہی ہے تو جو میں نہیں  
ترا ہر ایک کام ہے مرا نشاں لئے ہوئے

دلیلِ ختمِ عاشقی نویدِ صد شکست ہے  
امانتِ بہار ہے مری خزاں لئے ہوئے



مصری ممی بنا رہے ہیں

# محبت کی ٹھوکر

از جناب ڈاکٹر اعظم کریوی سابق ایڈیٹر اکبر الہ آباد

شیاما نے لڑکپن میں کسی کو پیار کیا تھا کسی سے محبت کی تھی لیکن جسے پیار کیا تھا اس کے پیار کا وہ مطلب نہ سمجھی تھی پیار محبت کا مطلب محبت کرنے اور محبت کی ٹھوکر کھانے سے ہی سمجھ میں آسکتا ہے پھر شیاما جو ٹھوکروں کے خیال سے گھبراتی تھی وہ اُس پیار کرنے والے کو کیسے سمجھ پاتی جو ٹھوکریں کھاچکا تھا۔ شیاما کی آنکھوں میں تو اب تک اس جوان کی صورت بسی تھی جس میں بانکپن تھا جو ہنس ہنس کر پریم کرنا جانتا تھا ایسی حالت میں وہ اس دیوانۂ الفت کو کیسے سمجھاتی جو ننگے پاؤں ننگے سر پھرا کرتا تھا جو اُس کے سامنے پہنچکر منہ سے ایک لفظ نہ نکالتا لیکن اس کی آنکھیں دل کا حال بتادیتی تھیں۔ ایسی محبت کا وہی نتیجہ ہوا جو اکثر لڑکپن کی محبت کا ہوا کرتا ہے ——— وہ دیوانۂ الفت شیاما کی محبت سے مایوس ہوکر دنیائے عاشقی سے کنارہ کش ہوگیا — ایسی حالت میں بہت دن گذر گئے لڑکپن کا زمانہ ختم ہوا اور وہ جوان ہوگیا اُس کے دل کے مندر میں شیاما کی مورت نے اپنا قبضہ جمائے رکھا۔ محبت کی آگ دل کے اندر جلتی تو رہی لیکن ظاہر نہ ہوسکی اس پر راکھ کی ہلکی سی چادر پڑگئی تھی ——— ایک دن ہوا کے ایک جھونکے نے چادر اُلٹ دی۔

(۲)

شام ہوچلی تھی۔ الہ آباد مُغل سرائے پسنجر کے انٹر کلاس کے ڈبہ میں انند کمار جو ایک مشہور اخبار کا ایڈیٹر تھا بیٹھا ہوا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا سامنے اخباروں کا ڈھیر تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد کتاب سے نظر ہٹا کر وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ گاڑی بھک بھک کرتی ہوئی تیزی سے جارہی تھی۔ ہر چیز بھاگتی دوڑتی چلتی پھرتی نظر آرہی تھی۔ جُتے ہوئے کھیت۔ ہرے بھرے میدان۔ پانی سے بھرے تال تلیان۔ کندھے پر ہل رکھے بیلوں کو ہانکتے ہوئے جفاکش کسان اور اُڑتی ہوئی چڑیوں کا نظارہ نہایت دلکش تھا۔ چاروں طرف خوشی و مسرت کا دریا لہریں مارتا دکھائی دیتا تھا لیکن اس کا اثر انند کے دل پر نہ تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ گوشت پوست اور ہڈی کا پُتلا تھا جس میں زندگی تھی لیکن زندگی کا سُکھ جسے کہتے ہیں اس سے وہ محروم تھا۔ اس کی کافی آمدنی تھی اُسے روپے پیسے کی کمی نہ تھی پھر بھی وہ سچی خوشی سے دور تھا۔ انند تفکرات میں ڈوبا ہوا تھا کسی نے "مسٹر" کہکر اس کے خیالات کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ انند نے پھر کر دیکھا۔ ایک کھدر پوش کمسن عورت سامنے کھڑی ہوئی اس کی طرف دیکھ رہی ہے اس کی آنکھوں میں جھجک یا بناوٹ کا نام ونشان بھی نہ تھا۔ "کیا میں آپ کا بمبئی کرانیکل دیکھ سکتی ہوں؟"

"بمبئی کرانیکل...... ضرور ضرور...... آپ بڑی خوشی سے دیکھ سکتی ہیں" سُکڑ کر بیٹھتے ہوئے انند نے کہا۔

وہ عورت بمبئی کرانیکل لیکر "شکریہ! شکریہ!" کہتی ہوئی اپنی بینچ کی طرف چلی گئی۔

آنند کو سخت تعجب تھا۔ اچھے گھر کی عورت اتنی نڈر ہوسکتی ہے یہ اس نے کبھی سوچا ہی نہ تھا جن ہندستانی

عورتوں کو وہ ابتک قفس کی چڑیاں سمجھتا تھا انہیں میں کی ایک قید قفس سے نکلی ہوئی عورت کو اتنا آزاد دیکھ کر اسے تعجب ہونا ہی چاہئے تھا۔ ادھر اُدھر بیٹھے ہوئے مسافروں کے درمیان سے ہو کر چلنے پھرنے والی عورت کو انند دیر تک عجیب حجاب غور سے دیکھتا رہا۔ وہ حسین نہ تھی پھر بھی اُسے کوئی بدصورت نہ کہہ سکتا تھا۔ اس کے گندمی رنگ کے۔ جسم چہرہ کی بناوٹ میں چھوٹے چھوٹے ہونٹوں اور بڑی بڑی آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی چمک تھی۔ اُن میں کشش تھی ایسی کشش جو انند کے دل کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ ہاں اُن میں چمک تھی ایسی چمک جو آسمان پر اس وقت ہوتی ہے جب سورج غروب ہوتا ہے اور آسمان کے نیلے آنچل سے نکل کر پہلا تارا مسکرانے لگتا ہے —— سادگی اور نفاست کی ایسی حسین عورت انند نے کبھی نہ دیکھی تھی —— اسی قسم کی ایک جھلک لڑکپن میں ضرور اُسے دکھائی دی تھی لیکن وہ تو بہت دنوں کی بات تھی جس کا اب خیال کرنا بھی بیکار تھا —— ایک مرتبہ اس عورت نے سر اٹھا کر انند کی طرف دیکھا، دونوں کی آنکھیں مل گئیں۔ نوجوان عورت کی آنکھیں فاتحانہ تمکنت سے ہنس پڑیں —— ہارنے والے کی طرح جھینپ کر انند نے اپنی نظریں نیچی کر لیں اور پھر کتاب اٹھا کر پڑھنے کی کوشش کرنے لگا —— نوجوان عورت پھر آئی اور بمبئی کرانیکل کو بعد شکریہ واپس کیا۔ جہاں آنند بیٹھا تھا اس کے سامنے والی سیٹ پر دو مسافر بیٹھے تھے وہ پچھلے اسٹیشن پر اُتر گئے تھے، دونوں بنچیں خالی تھیں۔

"آپ کہاں تشریف لے جا رہی ہیں۔ بیٹھئے" انند نے کہا

"میں تو بنارس جا رہی ہوں اور آپ؟" وہ سامنے والی بنچ پر بیٹھ گئی۔

"میں بھی بنارس ہی جا رہا ہوں، غالباً آپ وہاں کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے جا رہی ہیں"

"جی ہاں —— اور میرا خیال ہے آپ بھی اسی مطلب سے بنارس جا رہے ہیں"

"آپ کا خیال درست ہے —— اسم شریف؟"

"شیاما دیوی —— اور آپ کا .... ؟"

"شیاما دیوی! .... شیاما دیوی .... !" —— انند نے دل ہی دل میں اس نام کو دہرایا۔ لڑکپن کی ایک بھولی بسری ہوئی صورت انند کی آنکھوں کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ شیاما نے مکرر انند کا نام دریافت کیا تو اس نے چونک کر کہا —— جی ... معاف کیجئے گا مجھے انند کمار کہتے ہیں"

"آپ کیا کام کرتے ہیں؟"

"میں ایک اخبار کا ایڈیٹر ہوں —— اور آپ؟"

"میں ایک اسکول میں اُستانی ہوں"

دونوں خاموش ہو گئے۔ پوچھنے والی باتیں ختم ہو گئیں، اب انکی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا بات چیت کی جائے۔ اتنے میں بنارس کا اسٹیشن آ گیا۔ شیاما دیوی نے کھڑے ہو کر پوچھا۔ "بنارس میں آپ کہاں ٹھہریں گے؟"

"کسی ہوٹل میں ٹھہرنے کا ارادہ ہے، اور آپ؟"

"میں اپنی ایک سکھی کے یہاں ٹھیروں گی" ہونٹوں تک ایک استدعا آکر لوٹ گئی۔

"کانفرنس میں تو آپ سے ملاقات ہوگی نہ؟"

"ضرور! میں آپ سے ضرور ملونگی" اتنا کہہ کر شیاما دیوی نے ہاتھ جوڑ کر سر جھکاتے ہوئے انند کو نمسکار کیا اور اپنی بنچ کی طرف چلی گئی اور اپنا چھوٹا سا ٹرنک لیئے وہ گاڑی سے اتر گئی۔ انند بھی قلیوں سے اپنا اسباب اٹھوا کر ٹرین سے اتر پڑا۔

(۳)

جب کانفرنس کی پہلے دن کی کارروائی ختم ہوئی اور انند اپنی رپورٹ لئے پنڈال سے باہر نکلا تو وہ اُداس تھا۔ آج وہ دکھائی کیوں نہیں دی ---- کیا وہ نہیں آئی ---- کیوں نہیں آئی" وہ یہی سوچتا ہوا جا رہا تھا کہ کسی نے "آنند بابو" کہہ کر پکارا۔ ڈوبتے ہوئے کو سہارا مل گیا۔ گھنٹوں سے آسمان پر منڈلاتے ہوئے کبوتر نکیا یک چھتری پر اتر پڑے، خشک تالاب میں چاروں طرف سے یک بارگی پانی بھرنے لگا۔ جھاگ اٹھے اور لہریں مل مل کر ناچنے لگیں انند کے جسم میں خوشی و مسرت کی لہریں دوڑنے لگیں اس نے شیاما دیوی کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ قریب پہنچکر شیاما نے ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا۔

"میں آپ کو دیر سے تلاش کر رہا تھا"۔

آنند کے سُر میں جو پریم کی جھنکار تھی اس کی چوٹ کھا کر شیاما تلملا گئی اور اُس نے کہا --- "میں بھی آپ کا انتظار کر رہی تھی"۔

"پنڈال میں آپ کدھر بیٹھی تھیں میں نے تو آپ کو نہیں دیکھا"۔

"لیکن میں نے تو آپ کو دیکھ لیا تھا۔ بدلہ ہوگیا"۔

"اس وقت آپ کہاں جائیں گے۔ میرے ساتھ چلیئے"۔

انند الجھن میں پڑ گیا --- "چل تو سکتا ہوں لیکن مجھے آج کی رپورٹ اخبار کو بھیجنی ہے"۔

"ہاں یہ تو بہت ضروری بات ہے خیر پھر دیکھا جائیگا"۔

"کیا آپ میرے ساتھ ہوٹل چل سکتی ہیں"۔

"اس وقت تو معافی چاہتی ہوں میری سہیلی میرا انتظار کرتی ہوگی"۔

"کب تک آپ کو فرصت ہو جائے گی"؟

"شاید چھ بجے تک۔ آپ کہاں ٹھہرے ہیں؟"

"گرانڈ ہوٹل میں --- تو کیا میں آپ کا ہوٹل میں چھ بجے انتظار کر سکتا ہوں۔ کیا آپ وہاں تشریف لا سکتی ہیں؟"

"میں ساڑھے چھ بجے تک وہاں آجاؤنگی --- اچھا نمسکار"۔ شیاما نے اپنا ہاتھ انند کی طرف بڑھا دیا۔ شیاما سے ہاتھ ملاتے ہی انند کے جسم میں گویا بجلی کی ایک لہر دوڑ گئی وہ اپنا ہاتھ چھڑا کر آہستہ آہستہ ایک تانگہ کی طرف بڑھا۔

— خوابوں کی اُجڑی ہوئی دنیا پھر ایک مرتبہ آباد ہوگئی۔ وہ شیاما کو اپنے دل سے کسی وقت نہ بھلا سکا رپورٹ لکھتے وقت تار گھر جاتے وقت وہاں سے واپس ہوکر ہاتھ منہ دھوکر چائے پیتے وقت شیاما برابر اس کی آنکھوں کے سامنے کھڑی رہی۔ گویا وہ ہمیشہ سے اس کے ساتھ ہی رہی تھی۔

مقررہ وقت قریب آگیا۔ انند بڑی بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا کئی مرتبہ وہ ہوٹل سے نیچے اوپر آیا گیا آخر وہ آگئی۔ ہوٹل کے اوپر والی منزل کے برآمدہ میں شیاما کو آرام کرسی پر بٹھا کر انند اس کی طرف شکایت آمیز نظروں سے دیکھنے لگا وہ بہت کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن نہ کہہ سکا۔

"مجھے کچھ دیر ہوگئی، معاف کیجئے گا" شیاما نے محبت آمیز نظروں سے انند کی طرف دیکھکر کہا۔

"آپ آ تو گئیں میرے لئے یہی کیا کم ہے۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ شاید آپ نہ آئیں گی۔"

"یہ کیسے ممکن تھا — آپ مجھے آپ نہ کہا کیجئے"۔

"کیوں؟"

یوں ہی۔ مجھے اچھا نہیں لگتا۔"

شیاما سے آنکھیں ملاکر انند نے کہا۔ "مجھے تم سے ایسی ہی اُمید تھی شیاما"

"کیسی اُمید؟"

انند نے سنبھل کر کہا۔ "مہربانی کی"

"کیا خوب؟ آپ کو باتیں بنانا بہت آتا ہے۔"

تھوڑی دیر خاموش رہ کر انند نے کہا "میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں لیکن ہمت نہیں پڑتی"۔

"آپ کو جو کچھ پوچھنا ہے شوق سے پوچھئے میں بتانے کے لئے تیار ہوں۔ صرف ڈر ہے تو اس کا کہ میری باتیں سُنکر کہیں آپ مجھسے نفرت نہ کرنے لگیں"۔ اتنا کہکر شیاما نے اپنا سر جُھکا لیا۔

"تمہارا خیال غلط ہے شیاما! میں اتنا کمزور دل کا نہیں ہوں۔ زندگی زندگی ہے۔ ماں کے پیٹ سے کوئی قابل بنکر نہیں نکلتا۔ بار بار غلطیوں کی ٹھوکریں کھاکر ہی انسان اوپر اُٹھتا ہے"۔

شیاما بحر خیال میں غوطے کھانے لگی۔ جس راز کو دنیا سے پوشیدہ رکھنے ہی میں اس کی بہتری تھی اُسی راز کو آج کھولنے میں اس کو اپنا فائدہ نظر آیا۔ ڈوبتا ہوا آدمی پانی میں ایک لکڑی کا سہارا پاکر اُسے چھوڑ دینے کی کبھی ہمت نہیں کرسکتا خواہ وہ لکڑی اُسے کنارے سے دور ہی کیوں نہ بہا لیجائے۔ بار بار غلطیوں کی ٹھوکریں کھاکر ہی آدمی اُوپر کو اُٹھتا ہے۔ یہ وہ کئی مرتبہ سُن چکی تھی لیکن اس کا اس کے دل پر کوئی خاص اثر نہ ہوا تھا مگر آج — آج وہ انند کو سب کچھ بتانے کے لئے تیار ہوگئی"۔

خیالات میں ڈوبی ہوئی شیاما کی طرف دیکھکر انند نے کہا۔ "شیاما! میں تم سے صرف اتنا پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم کون ہو؟" خیالات کی دنیا سے نکل کر شیاما نے کہا۔ "یہ تو میں آپ کو پہلے ہی بتا چکی ہوں"۔

"لیکن اس سے میری تسلی نہیں ہوئی۔ اور اس سے بھی شاید اب تم کو انکار نہ ہوگا کہ سب کچھ جان لینے کا مجھے حق بھی ہے۔ جب میں نے تم کو پہلے پہل دیکھا تھا اُسی وقت سے سمجھ گیا تھا کہ تم کوئی معمولی عورت نہیں ہو۔ تمہاری زندگی میں ضرور ایسے حادثے ہوئے ہیں جن کی وجہ سے تم وہ بن گئی ہو جو اس وقت ہو۔ انہیں حادثوں اور واقعات کا حال میں تمہاری زبان سے سُننا چاہتا ہوں" ایک گہری سانس لیکر شیاما نے کہا "آپ میری آپ بیتی سُننا ہی چاہتے ہیں تو میں ضرور سُناؤں گی لیکن اگر اس سے آپ کو صدمہ ہو تو مجھے الزام نہ دیجئے گا"

(۴)

شیاما کچھ سوچتی رہی پھر اُس نے کہنا شروع کیا—— "اپنے ماں باپ کی میں اکلوتی اولاد تھی جب میں نے دسویں سال میں قدم رکھا تو میری ماں پرلوک سدھاری۔ میرے والد ایک دفتر میں کلرک تھے، وہ مجھ سے بہت محبت کرتے تھے میری تعلیم و تربیت کی طرف وہ میری ماں سے زیادہ خیال رکھتے تھے لیکن اب تجربہ نے مجھے یہ بتا دیا ہے کہ ماں سے بڑھ کر نہ تو کوئی لڑکی کو تعلیم دے سکتا ہے اور نہ اُن غلطیوں سے اُس کی حفاظت کر سکتا ہے جو زندگی کی راہ میں قدم قدم پہ پتھرا جال بچھائے رکھتی ہیں۔ دن میں پاٹ شالہ میں پڑھنے جاتی اور صبح و شام پتاجی خود مجھے پڑھاتے، اس طرح سے علمی تعلیم تو مجھے کافی مل گئی لیکن گرہستی کی تعلیم جس کی عورت کو سخت ضرورت رہتی ہے مجھے کچھ بھی نہ مل سکی میں باغ کے اُس پودے کی طرح تھی جس کی دیکھ بھال کرنے کے لئے کوئی ہوشیار مالی نہ ہو۔

اسی طرح چار یا پانچ برس گذر گئے، میں پاٹ شالہ جاتی رہی، ایک دن اسکول سے لوٹ کر گاڑی سے اُتر کر جب میں گلی میں گھسی تو مجھے ایسا معلوم ہوا گویا کوئی میری طرف دیکھ رہا ہے۔ خواہش ہوئی مڑ کر دیکھوں کہ کون ہے۔ اس وقت اگر میں اس خواہش کو روک سکتی تو شاید میری زندگی کا افسانہ وہ نہ ہوتا جو آج ہے لیکن لڑکپن کی اس خواہش کو میں نہ روک سکی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ ایک پکے مکان کے برآمدہ میں کھڑا ہوا ایک لڑکا میری طرف دیکھ رہا ہے، جلدی جلدی قدم بڑھا کر میں اس گلی میں مڑ گئی جس میں میرا اپنا مکان تھا۔ اُس دن بہت کوشش کرنے پر بھی میرے دل سے اس لڑکے کا خیال نہ گیا۔ جس طرح اس نے مجھے دیکھا تھا پہلے کسی نے نہ دیکھا تھا۔ دوسرے دن پاٹ شالا سے لوٹ کر گلی میں گھستے ہی میں نے پھر اس کو دیکھا۔ میرے دل میں گُدگدی پیدا ہوئی۔ نشہ سا چڑھ گیا۔ سر نیچا کئے میں آگے بڑھتی برآمدہ کے قریب پہنچتے ہی میرے سامنے کوئی چیز آکر گری۔ میں نے دیکھا کہ ایک رنگین لفافہ ہے۔ اُس وقت گلی میں کوئی نہیں تھا ہمت کر کے میں نے لفافہ اُٹھا لیا، جلدی سے گھر میں گھسی اور اپنے کمرہ میں جا کر کتابوں کا بستہ ایک طرف پھینک کر لفافہ کو پھاڑ کر خط پڑھنے لگی۔ ٹوٹی پھوٹی زبان میں لکھی ہوئی لڑکپن کی وہ پاگل پنے کی باتیں سُن کر آپ کو کیا فائدہ ہوگا۔ آپ خود سمجھ سکتے ہیں۔ اس وقت کی باتیں کر کے آج مجھے ہنسی آتی ہے لیکن اُس زمانہ میں مجھے وہ خط بہت پیارا معلوم ہوا۔ میں گھنٹوں اُسے پڑھتی رہی پھر بڑی رات تک بیٹھ کر میں نے اس کا جواب لکھا۔ میں نے

کیا لکھا اُسے بس نہ پوچھئے۔ دوسرے دن پاٹ شالہ جاتے وقت جب دائی کے ساتھ میں اُس گلی میں نکلی تو وہ اپنے گھر کے برآمدہ میں پھر کھڑا ملا خط زمین پر گرا کر میں جلدی جلدی سڑک پر کھڑی ہوئی گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔ گاڑی پر بیٹھکر میں نے دیکھا کہ وہ خط اُٹھا کر جلدی سے اپنے گھر میں گھس گیا اُس دن پاٹ شالہ کے کسی کام میں میرا جی نہ لگا۔ کسی طرح چھٹی کا گھنٹہ بجا۔ دھڑکتے ہوئے دل کو کسی نہ کسی طرح سنبھال کر میں گھر کی طرف چلی گلی کے سامنے پہنچکر گاڑی رُکی۔ وہ میرا انتظار کر رہا تھا۔ قریب پہنچکر میں نے اس کی طرف دیکھا وہ مسکرا رہا تھا۔ شرم سے میری آنکھیں نیچے جھک گئیں۔ تب میری زندگی کو تباہ کرنے والا میرے خط کا جواب میرے سامنے آکر گرا اُسنتی ہوں گناہ کرنے والے کے سر پر خدا کا غضب نازل ہوتا ہے آہ اُس وقت میرے سر پر بجلی کیوں نہ گری جب میں اس خط کو اٹھانے کے لئے جھکی۔ اگر اس وقت بھگوان جی مجھ پر دیا کرتے تو میرے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ کیوں لگتا۔ خیر اس خط میں جو کچھ لکھا تھا اس کو سوچ کر آج بھی شرم و ندامت سے میں کانپ اٹھتی ہوں۔ اس دن تو میری عقل ماری گئی اُس خط نے مجھے پاگل بنا دیا تھا۔ اُس نے رات کو مجھ سے ملاقات کرنے کی استدعا کی تھی میں اُس سے ملنے کے لئے تیار ہوگئی اور رات کے سناٹے میں دروازہ کے پاس کھڑے ہو کر میں نے انتظار کیا — کسی نے دروازہ پر تھپکی دی میں نے دروازہ کھول دیا — وہ آہستہ آہستہ قدم رکھتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اُس وقت میرے دل میں جذبات کا طوفان اٹھا ہوا تھا — بس انند بابو آگے کہنے کی ضرورت نہیں۔

ہم دونوں کی مخفیہ ملاقات کا سلسلہ بہت دنوں تک جاری رہا۔ ان دنوں میری حالت بالکل چورن کی سی ہو گئی تھی کسی سے کھل کر آنکھیں ملا کر باتیں کرنا میرے لئے مشکل تھا۔ آخرکار اس قسم کی باتوں کا جو کچھ نتیجہ ہوتا ہے وہی ہوا چوری پکڑی گئی۔ ایک رات جب وہ باہر نکل گیا اور میں دروازہ بند کرنے کو بڑھی تو مجھے ایسا معلوم ہوا گویا میرے پاؤں کے نیچے سے زمین کھسک گئی۔ سامنے پتاجی کھڑے ہوئے تھے غصہ کی ایسی خطرناک صورت میں نے کبھی نہ دیکھی تھی اس وقت اُن کے منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔ میرا ہاتھ تھام کر وہ اپنے کمرہ میں کھینچ لے گئے میں کمرہ کے فرش پر گر پڑی غصہ کی نظروں سے پتاجی میری طرف دیکھنے لگے۔ کتنا اچھا ہوتا اگر میں انکے غصہ کی آگ میں جل کر خاک ہو جاتی تھوڑی دیر تک وہ مجھے اسی طرح دیکھتے رہے پھر اُن کی بڑی بڑی آنکھوں سے آنسو کی جھڑی لگ گئی آنچل سے مونھ چھپا کر میں بھی رونے لگی جب غصہ اور نفرت کا جوش کچھ کم ہوا تو پتاجی نے مجھ سے حقیقت دریافت کی۔ میں نے اُن سے سب کچھ کہہ دیا۔ بڑی رات تک وہ مجھے نصیحت کرتے رہے۔

دوسرے دن سے میرا اسکول کا جانا بند ہو گیا۔ گھر میں ایک بوڑھی خادمہ میری حفاظت کرنے لگی۔ اپنی حرکت پر میں نادم تو ضرور تھی لیکن مجھے بدراہ کرنے والے اس نوجوان کی صورت میری آنکھوں سے کسی وقت اوجھل نہ ہوتی تھی۔ ہر گھڑی اسی کا دھیان رہتا۔ اسی کی میٹھی میٹھی باتیں میرے کانوں میں گونجا کرتیں۔ ایک دن جب میری خادمہ باہر گئی ہوئی تھی ایک ادھیڑ عورت میرے گھر میں آئی اور اس نے مجھے موہن کا خط دیا۔ خط میں میرا حال دریافت کیا گیا تھا۔ میں نے فوراً جواب لکھدیا۔ میرا جواب لیکر وہ عورت چلی گئی اور پھر دوسرے دن وہ موہن کا خط لائی۔ اس خط کو پڑھکر میں کانپ اُٹھی۔ آج ایک دوسری استدعا تھی جو اس سے پہلے کبھی نہ

کی گئی تھی۔ اس استدعا میں جو آزادی کی امید تھی اس نے مجھے پاگل بنا دیا۔

اسی دن رات کی تاریکی میں اپنے گہنے اور کپڑے لیکر میں گھر سے نکل پڑی اور موہن کے ساتھ لکھنؤ پہنچی۔ کانپور سے لکھنؤ کچھ دور نہیں، ہم ٹرین سے جلدی پہنچ گئے، ہم لکھنؤ میں ایک دھرم شالہ میں ٹھہرے، بعد میں ایک چھوٹا سا مکان لیکر رہنے لگے، موہن محبت تو بہت کرتا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں لکھنؤ پہنچکر میرے دل میں اس کی جانب سے نفرت پیدا ہونے لگی۔ مجھے ایسا معلوم ہونے لگا کہ وہ مجھے دل سے نہیں پیار کرتا۔ مجھے گھر کی یاد ستانے لگی، باپ کے گھر میں مجھے جو آرام تھا وہ کہاں نصیب میں۔ انکے درشن کے لئے تڑپنے لگی۔ لیکن اپنے ہاتھوں سے پاؤں میں کلہاڑی مار کر پچتانے سے کیا ہوتا ہے، ہم دونوں جو کچھ اپنے ساتھ لائے تھے وہ سب ختم ہو گیا۔ اب روپے کی ضرورت ہوئی۔ ایک دن موہن کام کی تلاش میں صبح سے جو گھر سے نکلا تو پھر وہ واپس نہ آیا۔ میرے چاروں طرف تاریکی تھی، ایک دن میں نے گومتی کی لہروں میں خود کو چھپانے کی کوشش کی تو ایک بھلے آدمی نے مجھے بچا لیا اور انہیں کی کوشش سے مجھے ایک پاٹ شالہ میں نوکری مل گئی، اسوقت سے میں ایک دھرم شالہ میں رہتی ہوں اور پاٹ شالہ میں لڑکیوں کو پڑھاتی ہوں۔ آنند بابو بس یہ ہے میری آپ بیتی۔" اتنا کہکر شیاما نے آنند بابو کی طرف دیکھا۔ اس نے کچھ دیر خاموش رہ کر پوچھا۔

"موہن سے پھر کبھی ملاقات نہیں ہوئی؟" "نہیں! اور نہ میں اب اس سے ملنا چاہتی ہوں"۔

"پتا جی کا کیا حال ہوا؟"

"ایک مرتبہ میں نے کانپور جاکر ان کا حال دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ گھر بار سب کچھ چھوڑ کر کہیں چلے گئے" آنند کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ بڑی مشکل سے خود کو سنبھال کر انھوں نے کہا۔ "شیاما! تمہاری کہانی درد سے بھری ہوئی ہے مجھے تو حیرت ہے کہ اتنی تکلیفیں سہکر کوئی عورت وہ کیسے بن سکتی ہے جو تم اس وقت ہو"۔ شیاما کا دل کچھ ہلکا ہو گیا۔ آنند بابو نے اس سے نفرت نہیں کی۔

"تمہاری طرح میں بھی اس دنیا میں تنہا ہوں شیاما! اور تمہاری طرح میں نے بھی ٹھوکریں کھائی ہیں"

آنکھیں ملا کر شیاما نے کہا۔۔۔ "یہ تو میں پہلے ہی سمجھ گئی تھی"۔

"لیکن تنہا رہنے میں آرام بھی بہت ہوتا ہے"۔

چپ رہ کر آنند سوچنے لگا کہ کیا جواب دے۔ آخر اس نے دل کو سنبھال کر کہا۔ "بنارس میں کب تک رہو گی؟"

"آپ کب تک رہیں گے؟"

"میں تو کل یہاں سے چلا جاؤنگا"۔

"تو میں بھی کل یہاں سے چلی جاؤں گی"۔

"کہاں؟"

ٹھنڈی سانس بھر کر شیاما نے کہا۔۔۔ "جہاں قسمت لے جائے"۔

شیاما کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیکر اس کی طرف تاکتے ہوئے آنند بابو نے کہا۔ "کیا تم میرے ساتھ چل سکتی ہو؟"

سر جھکا کر شیاما نے دھیرے سے جواب دیا۔۔۔ "بڑی خوشی سے"

"لیکن میں تم کو وہ سب کچھ تو نہ دے سکوں گا جو تمہیں ملنا چاہئے"!
"مجھے کچھ نہیں چاہیے"!
"پھر تو۔" آنند نے شیاما کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ اور دائمی محبت کی مہر اسکے لبوں پر لگادی۔ جس نے لڑکپن میں محبت کی ٹھوکر کھائی ہو وہی محبت کی قدر و قیمت سمجھ سکتا ہے۔

اعظم کریوی

# پیغامات

نہ گھبرا اے ضعیف العمر انساں ضعفِ اعضا سے
ابھی کچھ پھول چننا ہیں تجھے گلزارِ دنیا سے

ابھی ہیں ایسے کچھ لمحات تیری زندگانی کے
دلادیں یاد جو تجھکو مزے عہدِ جوانی کے

شباب آئینہ ہے گو زندگی کے لالہ زاروں کا
نہیں ہوتا ہے لیکن قحط پیری میں بہاروں کا

جوانی نامکمل اک مرقع پیش کرتی ہے
یہ پیری ہے کہ جو خالی جگہوں میں رنگ بھرتی ہے

فقط ذاتی مسرت ہی نہیں ہے حظِ روحانی
رعایا کی خوشی پر منحصر ہے عیشِ سلطانی

ابھی تک اور خوش ہوتے تھے تیری کامرانی پر
تو اب خوشیاں منا اوروں کے آغازِ جوانی پر

خدا پر رکھ بھروسہ دل کو تابِ کامگاری دے
خوشی کر اور خوشی سے زندگی کو استواری دے

اسمٰعیل احمد منائی

# اللہ میاں کی قواعد[1]

از جناب سید مقبول حسین احمد پوری۔ بی۔ اے

جگ میں ہے سب من کی شوبھا جگ میں ہے سب من کی شوبھا
من سُندر تو دُنیا سُندر

سانچ کہے من بڑ لُن رہتے سچ کی شکتی ہیں سب ہتے
سانچ کو آنچ نہیں۔ سچ کہتے جگ میں ہے سب من کی شوبھا
من سُندر تو دُنیا سُندر

پنڈت جی تھے تو اپنے مذہب کے پابند مگر مولانا کی دوستی نے لوگوں کے دل میں یہ خیال پیدا کر دیا تھا کہ اگر یہی خلا ملا رہا تو کسی نہ کسی دن یہ مسلمان ضرور ہو جائیں گے۔ ہندو رہے تو انھیں در پردہ مسلمان کہتے تھے۔ ایک عام بات اگر کچھ حقیقت نہ بھی رکھتی ہو تو عام ہونے پر مائل بہ حقیقت ہو جاتی ہے۔ پنڈت جی کے متعلق ایسا ہی کچھ ہوتا تھا سو ہو کر رہا۔ اور مذہب کے معاملے میں وہ یوں بھی بہت ہی صلاح کار واقع ہوئے تھے۔ پوجا پاٹ کے پابند تو ضرور تھے مگر پکے پجاری وہ ہرگز نہ تھے۔ پابندی اور چیز ہے اور پکا ہونا اور۔ مذہب کے معاملہ میں وہ ہندوستانی تھے نہ ہندو بلکہ سنسار نواسی یا Cosmopolitan۔ اگر مذہبی گفتگو کی نوبت کبھی تیز گفتاری تک پہونچتی تو پنڈت جی کی حالت عجیب ہو جاتی۔

قدم ڈگمگائے نظر بہکی بہکی

وہ اس قسم کی بات چیت سے کنارہ کشی کی کوشش کرتے۔ یا گفتگو کا موضوع بدل دیتے۔ جس آدمی کی زندگی کا خوشگوار وقت دیہات میں گذرا ہو اس کی سادگی تو ضرب المثل ہوتی ہے۔ یعنی لوگ کہتے ہیں۔ یار تم تو نرے دیہاتی ہو۔ جس کا مطلب یہی نہیں کہ تم بھولے۔ سادہ مزاج ہو بلکہ یہ بھی کہ احمق ہو۔ نادان ہو۔ اور نیرے مورکھ ہو[2]۔ غرض آجکل کے زمانے میں اگر کوئی دل کا صاف ہے تو اس سے بڑھکر بے وقوف کوئی نہیں۔ پنڈت جی تھے تو خدا کے فضل سے "گورنمنٹ سرونٹ" مگر انکی سادگی اور دل کی صفائی نے لوگوں کے سامنے انکی وقعت ایک کھلونے سے زیادہ نہ رکھی تھی۔ اور درحقیقت بات بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ انکے پاس بیٹھنے سے دُنیا کی فکریں اور زندگی کی کلفتیں یکقلم فِفترو ہو جاتیں۔ انکی صورت دیکھنا گویا کسی کھلے ہوئے پھول پر نظر ڈالنا تھا۔ وہ آدمی نہیں فرشتہ تھے۔ صاف رنگ ہنس مُکھ چہرہ، خندہ پیشانی، شگفتہ لب رسیلی مگر چھوٹی چھوٹی آنکھیں باتیں کرتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ ابھی سن بلوغ کو نہیں پہونچے۔ ہنستے تو خود ہنسنے کو جی چاہتا۔ غمگین ہوتے تو گلے

---

[1] قواعد کے معنی یہاں پریڈ کے ہیں یعنی "Drill"۔ [2] یعنی بے وقوف ۱۲

ملنے کو جی چاہتا۔ وضع سادی، رفتار دھیمی، گفتار نرم، نگاہ نیچی، لباس بجائے سودیشی ہونے کے دیسی ہوتا تھا، دیسی اس وجہ سے کہ کانگریسی نہ معلوم ہوں۔ اس طرح وہ اچھے خاصے شریف النسل ہندوستانی معلوم ہوتے تھے۔ پنڈت جی سے جو کوئی ایک مرتبہ ملتا ہمیشہ کا دوست ہوجاتا۔ اس طرح اُنکے احباب بے شمار تھے۔

مگر مولوی بیدل سے بڑی گاڑھی دوستی تھی۔ شاید اس وجہ سے کہ مولانا اور پنڈت جی ایک ہی دفتر میں ملازم تھے، ایک ہی محلے میں رہتے تھے اور ایک ہی جگہ رہنے بسنے سے دونوں ایک دوسرے کے سگے اور یگانے معلوم ہوتے تھے۔ فرق صرف مذہب کا تھا۔ ایک ہندو تو دوسرا مسلمان۔ یہ خدا کی شان نہیں تو اور کیا کہ ایسے وقت میں شیخ و برہمن ہم پیالہ و ہم نوالہ نظر آئیں۔ تاہم مذہب کا فرق کوئی معمولی فرق نہیں — مسلمان اور ہندو! ایک کا خدا آسمان پر عرش و کرسی سے پرے۔ دوسرے کا کہاں؟ — پتھر کی مورتی میں — یہ زمین و آسمان کا فرق نہیں تو اور کیا ہے۔

مگر پنڈت جی اور مولوی صاحب کا خدا تو کہیں اور ہی تھا۔ اور وہ مقام خدا کے ان دو نیک بندوں کے دل کے سوائے اور کیا ہوسکتا ہے۔ پھر بھی ایک ہندو اور دوسرا مسلمان! ہاتھ پاؤں دونوں کے، کھاتے پیتے دونوں، سوتے جاگتے دونوں، شادی بیاہ، بال بچے، مرنا جینا دونوں کے ساتھ، یہ تو کوئی تعجب کی بات نہیں مگر ایک ہر صبح اللہ اکبر کی آواز پر مسجد جاتا ہے۔ نماز پڑھتا اور سربسجدہ ہوتا ہے۔ اور دوسرا نوائے ناقوس پر شوالے میں ڈنڈوت کرتا ہے۔ اے بوالعجب!

دفتر کا کام اس میں شک نہیں کہ ذمہ داری کا کام تھا۔ دس سے چار تک پنڈت جی کو کرسی سے اُٹھنے کی مہلت نہیں ملتی تھی۔ برخلاف اس کے مولانا صاحب پندرہ منٹ کا اِنٹرول نماز پڑھنے میں ضرور منایا کرتے تھے۔ پنڈت جی کو مولانا پر اگر کسی قسم کا رشک تھا تو صرف یہ کہ ایک بجے کے بعد پنڈت جی کی طبیعت اُکتا جاتی اور مولانا صاحب نماز سے آ کر اسی طرح کام میں لگ جاتے گویا دس بجے گھر سے آئے ہوں۔ ان کو تکان نہ معلوم ہوتی۔ آخر ایک دن پنڈت جی سے نہ رہا گیا۔ اپنے سپرنٹنڈنٹ صاحب سے کہا کہ "حضور مجھے دوپہر کو پندرہ منٹ کی چھٹی مل جایا کرے۔ میں پوجا کرنے جایا کرونگا۔

سپرنٹنڈنٹ صاحب۔ "کیا آپ صبح کو پوجا نہیں کرتے؟"

پنڈت جی۔ کرتا ہوں۔ لیکن صبح و شام کے پوجے سے آتما کی سیری نہیں ہوتی۔ دوپہر کا پوجا بھی کرونگا۔

سپرنٹنڈنٹ صاحب۔ "اُس وقت دفتر میں تو کوئی پوجا نہیں کرتا۔ آپ یہ نیا دستور قائم کر رہے ہیں لیکن آپ کے ساتھ رعایت کیجائے گی۔ آپ خوشی سے پوجا کو جایا کیجئے۔"

غرض پنڈت جی روزانہ ایک بجے اُٹھتے اور دفتر سے تھوڑی دور اکیلی جگہ میں ایک درخت کی آڑ میں جا کھڑے ہوتے اور کوٹ اُتار، آستین چڑھا، دھوتی کس بیٹھک لگانا شروع کر دیتے۔ پندرہ منٹ اس طرح کسرت کرنے کے بعد پھر کاغذات کی اُلٹ پلٹ میں مشغول نظر آتے۔ سب جانتے کہ پنڈت جی پوجا کرنے

جایا کرتے ہیں لیکن وہاں ہوتی کسرت اور اُٹھا بیٹھی"

ایک دن پنڈت جی کے دوست مولوی صاحب استنجا کرتے ہوئے اُدھر جا نکلے۔ پنڈت جی بیٹھکیں لگا رہے تھے۔

"ہُون اوُن ہوُن ہوُن۔ ہوُن اوُن، ہوُن ہوُن۔ ہا ہا"

مولانا نے پکار کر کہا "ارماں پنڈت جی! پنڈت بھی! پنڈت.....!.... ........

......ارے بھائی یہ کیا؟۔ یہ کیسا پوجا؟۔ کیا خطا کی تھی کہ یہ سزا ملی؟"

پنڈت جی نے آواز سُنی اور ذرا جز بز ہو کر بولے "بھائی تم اِدھر کہاں آن پڑے؟۔ (اپنی طرف دیکھ کر) کیا کہوں یار ہاتھ پاؤں سیدھے کر رہا ہوں۔ دفتر میں بیٹھے بیٹھے ہاتھ پاؤں سُن ہو جاتے ہیں"

مولانا۔ "اچھا تو کیا پوجا کر چکے؟"

پنڈت۔ "ارے بھائی پوجا کون مورکھ کرتا ہے میں تو ہاتھ پاؤں کی پوجن کر رہا ہوں۔ اس لئے کہ رگوں میں خون رُکا ہوا تھا ذرا حرکت کرنے لگے۔ بس یہی مطلب ہے"

مولانا۔ "ترکیب تو اچھی ہے۔ آج یہ ترکیب سپرنٹنڈنٹ سے بتائی جائے گی"

پنڈت۔ "نہیں یار دیکھو اُن سے یہ نہ کہنا۔ تم تو بڑے مزے میں ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ تمہارے پیغمبر صاحب تھے بڑے عقلمند"

مولانا۔ "ہیں! پیغمبر صاحب عقلمند تھے؟۔ کیا مطلب؟"

پنڈت۔ "یار تم تو نماز میں اُٹھا بیٹھی کر لیتے ہو۔ اچھی خاصی کسرت ہو جاتی ہے تمہاری نماز تو عبادت بھی ہے اور کسرت بھی۔ یہ کیا عقل کی بات نہیں؟۔ سچ پوچھو تو محمدؐ صاحب نے نماز کی پابندی قائم کر کے مسلمانوں کے ساتھ بڑا بھاری سلوک کیا"

مولانا۔ "آخاہ! بڑی دور پہونچے۔ نہیں بلکہ تہہ کو پہونچے۔

پنڈت کو اکیلے میں بڑی دور کی سوجھی"

یہ بات ہے! کیوں نہ ہو برہمن ہونا۔ اگر نماز تم کو ایسی ہی پسند ہے تو یار تم بھی مسلمان ہو جاؤ۔ خدا کی شان مسلمان مسلمان ہوتے ہوئے نماز سے بھاگیں اس لئے کہ بیکاری کی دلیل ہے۔ اور بڑے لوگوں کے نزدیک تو نماز پڑھنا پُرانے خیالات کی پابندی کرنا ہے۔ روزے کا ذکر ہی کیا۔ رمضان شریف پر تو یار لوگ پھبتیاں کستے ہیں۔ ابھی دو ہی تین مہینے کا ذکر ہے کہ نواب صاحب کہتے تھے۔ میاں رمضان اپنی بھوک پیاس کی فوج کے ساتھ آرہے ہیں! اور چاند رات کے روز تو نواب صاحب فرمانے لگے وہ دیکھئے آج مطلع بھی صاف ہے۔ عید کے چاند پر بادل گھر آتے ہیں آج نام کو دھجی بھی نہیں۔ اور مصاحبین میں سے ایک صاحب بولے کہ حضور وہ دیکھئے باریک باریک خمیدہ خمیدہ ہلال بھی نظر آ رہا ہے آخر مطلع رمضان نے خندۂ دنداں نما کیا۔ اب کیا ہے کل سے ہر مسلمان

کے لئے دُنیا کرب و بلا ہے،" نواب صاحب۔ "ہاں بھائی بات تو یہی ہے۔ رمضان صاحب نے خندۂ دندان نُما کیا۔ نہیں بلکہ ہمیں کاٹ ہی بدیں حُسنِ طلب کہ روزہ رکھئے۔ معاذ اللہ دُنیا اور دُنیا کی زندگی بھی وبالِ جان ہے یہ ہیں مسلمانوں کے خیالات احکامِ شریعت پر۔ ان مسلمانوں سے تو ہندو بھلے پنڈت جی سنو بھائی اب تم یا تو مسلمان ہو جاؤ یا ہندو وغیرہ

پنڈت۔ "بات تو قریب قریب ایک ہی ہے"

مولانا "اگر تم مسلمان ہو جاؤ تو ہمارے ساتھ مل کر اُٹھا بیٹھی کرنا۔ یہ تو اللہ میاں کی قواعد ہے۔ پرماتما کی ڈرِل.... دوپہر ہی نہیں بلکہ پانچ وقت کی پریڈ۔ پنڈت جی ہماری قواعد تو پنج وقتہ ہے پنجوقتہ"

پنڈت۔ "ہاں یار بات تو یہی ہے۔ نماز پڑھنے سے جسم بھی پُھرت رہتا ہے اور آتما بھی مگن ہوتی ہے۔ بھائی ہم تم سے نماز پڑھنا تو ضرور سیکھیں گے چاہے کچھ بھی ہو"

مولانا۔ "پہلے مسلمان ہو لو۔ قرآن شریف پڑھ لو تب نماز پڑھو"

پنڈت "اس کی کیا ضرورت ہے۔ ہم نماز میں بجائے قرآن شریف کے رامائن پڑھ لیا کریں گے"

مولانا۔ "خیر یوں ہی سہی۔ تمہاری جو مرضی۔ دین میں زبردستی نہیں" القرآن

پنڈت۔ "نماز کے متعلق کچھ حال معلوم ہو جانا چاہئے۔ پہلے یہ ضروری ہے"

مولانا۔ اچھا تو آج شام کو چار بجے راستے میں اس کے متعلق بات چیت ہوگی۔ اب وقت کم ہے۔ آج تم اکیلے ساتھ چلنا۔ کوئی اور نہ ہو نہیں تو جانتے ہو یہ کونسا زمانہ ہے۔ اس قسم کی باتیں کرتے ہوئے لوگ ہمکو دیوانہ سمجھینگے"

اس گفتگو کے بعد مولانا نے مسجد کا رُخ کیا اور پنڈت جی دفتر میں آ ٹکے۔ چار بجے تک فائلوں کی دیکھ بھال کرتے رہے۔ کہیں تاریخ ڈالی کہیں حکم لکھا۔ کہیں دستخط کئے کسی جگہ "واپس" لکھا کسی جگہ "جواب طلب" اسی طرح کی لکھا پڑھی کرتے رہے۔ چار بجے کے بعد کچہری برخاست ہوئی" دونوں گھر کی طرف اس طرح باتیں کرتے ہوئے چلے۔

پنڈت۔ "ہاں مولانا۔ بتاؤ تم نماز میں کیا پڑھتے ہو؟"

مولانا۔ "یہ بات تو گھر چل کر بتائی جائے گی مگر تمہارا اصل مطلب کیا ہے؟"

پنڈت۔ "ہم بھی نماز پڑھیں گے اور کیا؟"

مولانا "بغیر مسلمان ہوئے؟"

پنڈت۔ "ہاں ہم نماز میں رامائن پڑھیں گے"

مولانا۔ "تو اسی اُٹھا بیٹھی اور ڈنٹر بیٹھک میں رامائن کیوں نہیں پڑھتے مطلب تو رگوں میں خون دوڑانے سے ہے"۔

پنڈت۔ (ہنستے ہوئے) "نہیں یار یہ بات تو اسی طرح ہونی چاہئے جیسے کہ تم لوگ کرتے ہو"

مولانا۔ "خیر اگر تمہاری اسی میں خوشی ہے تو آؤ سامنے والی مسجد میں چلو تمکو بتائیں نماز کیا ہے"۔

(دونوں ایک چھوٹی مسجد میں داخل ہوتے ہیں)

مولانا۔ "پہلے وضو کیا جاتا ہے یعنی ہاتھ موُنھ دھویا جاتا ہے۔ وضو کرتے ہوئے یہ پڑھتے ہیں۔ اُسے پرماتما ہمیں

پاک کردے اور ہمیں توبہ کرنے والوں میں داخل کر۔"
اس سے اعضا کی صفائی اور طبیعت کو فرحت ہوتی ہے۔ اس کے بعد نماز اس طرح شروع ہوتی ہے:۔
(مولانا دیسی زبان میں دھیرے دھیرے اس طرح اذان دیتے ہیں:۔)

اذان:۔

ایشور سب سے بڑا ہے۔ ایشور سب سے بڑا ہے۔
میں گواہی دیتا ہوں کہ سوائے ایشور کے کوئی (عبادت کے لائق) نہیں۔
میں گواہی دیتا ہوں کہ سوائے ایشور کے کوئی (عبادت کے لائق) نہیں
محمد پرماتما کے رسول ہیں۔ محمد پرماتما کے رسول ہیں۔
بھائیو ایشور کی پوجا کو آؤ۔ بھائیو ایشور کی پوجا کو آؤ۔
بھائیو آنند کے لئے آؤ۔ بھائیو آنند کے لئے آؤ۔
"ایشور سب سے بڑا ہے"
سوائے اُس کے کوئی نہیں"
(اس کے بعد تکبیر کہی اور نماز اس طرح شروع کی:۔)
مولانا۔ "دیکھو پنڈت جی کانوں تک ہاتھ اُٹھا کر اس طرح کہو۔
"ایشور سب سے بڑا ہے"
اُس کے بعد چاہے راماین پڑھو چاہے وید۔ تم کو اختیار ہے۔ اور......"
پنڈت۔ "پہلے یہ بتاؤ کہ آخر تم یہ کیا پڑھتے ہو۔؟ الحمد اور قُل وغیرہ کیا ہے؟"
مولانا۔ سُنو اور غور کرو۔ میں تمہارے سامنے پوری نماز پڑھتا ہوں"
(مولانے چار رکعت کی نیت اس طرح کی:۔)
"نیت کرتا ہوں میں چار رکعت نماز کی خدا کے لئے۔ قبلہ رو ہوکر۔ نماز وقت عصر (دونوں ہاتھ کانوں تک اُٹھا کر کہا) ایشور سب سے بڑا ہے"
(اس کے بعد مولانے اعوذ باللہ اور بسم اللہ اس طرح پڑھی)
ایشور سے پناہ مانگتا ہوں اپنا ئی دُشٹ کی حفاظت کے لئے اور ایشور کے نام سے جو بڑا مہربان اور دیا کرنے والا ہے شروع کرتا ہوں"
(اس کے بعد الحمد اس طرح شروع ہوئی:۔)
سنسار کے پیدا کرنے والے برہما کی تعریف جو دیا کرنے والا مہربان ہے۔ دھرم کے دن کا مالک ہے۔ اے پرماتما ہم تیری ہی پوجا کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد چاہتے ہیں، ہمیں سیدھے راستے چلا اُن

لوگوں کا راستہ جن پر تو نے دیا کی نہ کہ اُن لوگوں کا راستہ جن سے تو خفا ہوا اور جو بھٹک گئے"۔ (الفاتحہ)

(اس کے بعد مولانا نے کلام پاک کی یہ آیتیں پڑھیں)

"اے پیغمبر تو کہدے کہ اگر سمندر روشنائی ہو جائے اور پرماتما کی تعریف لکھے تو سمندر ختم ہو جائے پر
پرماتما کی تعریف نہ پوری ہو۔ چاہے ویسا ہی (سمندر) اور بھی لکھنے کے لئے لا دیں"۔ (سورہ کہف)

(اس کے بعد مولانا نے رکوع کرتے ہوئے کہا "ایشور سب سے بڑا ہے" پھر تین مرتبہ رکوع میں کہا)

"بزرگ پرماتما تو پاک ہے"!

(اس کے بعد سجدہ کرتے ہوئے کہا "ایشور سب سے بڑا ہے"۔ پھر تین مرتبہ سجدہ میں کہا:)

اے سب سے بڑے پرماتما تو پاک ہے"!

(مولانا نے التحیات وغیرہ پڑھتے ہوئے چاروں رکعتیں پوری کیں اور سلام پھیرا اس طرح)

(داہنی طرف) "آپ پر ایشور کی کرپا اور دیا ہو"

(بائیں طرف) "آپ پر ایشور کی کرپا اور دیا ہو"

(اس کے بعد اس طرح دعا مانگی)

دعا:-

"اے پرماتما سنسار کے مالک ہمیں دُنیا میں بھی بھلائی دے اور آخرت میں بھی اور نرک کے دُکھ سے بچا"

"اے پرماتما کل سنسار پر کرپا کر۔ سب کی سلامتی ہو۔ دُنیا کی سلامتی ہو۔ مسلمانوں کی سلامتی ہو۔ ہماری ہمارے ماں باپ عزیزوں اور دوستوں کی سلامتی ہو۔ ہمارے پیغمبر کی روحانی اولاد میں برکت ہو۔ اے دیا کرنے والے تیری دیا سمپورن ہے"۔

یہ سب سُنکر پنڈت جی نے کہا "بھائی مولانا۔ ایشور کی قسم اب میں ایسے ہی پڑھونگا اور یہی پڑھونگا۔ رام آئن میں اور اس میں فرق نہیں۔ بلکہ یہ زیادہ اچھا ہے۔ مہربانی کرکے مجھے یہ نماز کاغذ پر لکھدو۔ اس سے بڑا انند ہوتا ہے۔ لیکن یار مولانا یہ تو بتاؤ کہ اس اُٹھا بیٹھی کا مطلب تو سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ ہاتھ پاؤں میں چُستی آ دے"۔

مولانا۔ اگر نماز کا مقصد کسرت کرنے سے متعلق ہوتا تو صبح کی نماز بجائے دو رکعتوں کے دس بیس رکعتوں تک فرض کیجاتی۔ کیونکہ وہ وقت کسرت کے لئے زیادہ مناسب ہے۔ لیکن بات تو کچھ اور ہی ہے۔

پنڈت جی۔ "اس کے متعلق کچھ بیان فرمائیے"!

مولانا۔ کہاں تک بتاؤں۔ کیا کیا بتاؤں جو پوچھو اس کے متعلق ذکر کروں"۔

پنڈت جی۔ "یہ ہاتھ کانوں تک اُٹھاکر کیوں باندھتے ہیں۔ اس میں کیا حکمت ہے؟"

مولانا۔ "اس بات کا عہد کرنے کے لئے کہ ہم دُنیا سے الگ ہو کر ایشور کے سامنے ..."

**پنڈت۔** "اور جھکتے کیوں ہیں؟"

**مولانا۔** "آپ بڑے صاحب کو سلام کرنے کیوں جھکتے ہیں؟"

**پنڈت۔** (ہنستے ہوئے) "اب سمجھے۔ اچھا تو یہ زمین سے سر کیوں ٹیکتے ہیں؟"

**مولانا۔** "اپنی عاجزی اور خاکساری ظاہر کرنے کے لئے۔ جھکنے (رکوع) اور سر ٹیکنے (یعنی سجدہ) میں ایک نکتہ اور بھی ہے وہ یہ کہ جھکنے میں ہم کہتے ہیں کہ۔ اے بڑے پرماتما تو پاک ہے۔" لیکن سجدے میں کہتے ہیں۔ کہ "اے سب سے بڑے پرماتما تو پاک ہے"۔ مطلب یہ ہے کہ جھکنے میں تو ہمارا سر خاک سے دور رہتا ہے اور سر ٹیکنے میں سر خاک پر ہوتا ہے اور اس حالت میں ہم ایشور کو سب سے بڑا کہتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر خاکساری کے اظہار کا طریقہ اور کوئی نہیں کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ۔ اے پرماتما ہم خاک ہیں تو پاک ہے۔"

(پنڈت جی تھوڑی دیر تک خاموش کھڑے رہے۔ پھر کہا۔)

"مولانا سچ تو یہ ہے کہ نماز سے بڑھ کر آنند کی صورت دنیا میں کوئی اور نہیں۔ اس سے تو شریر (جسم) کو بھی چین اور سکھ ملتا ہے اور آتما کو آنند ہوتا ہی ہے۔ یہ تو واقعی اچھی خاصی "اکسرسائز" بھی ہے اور عبادت بھی۔"

**مولانا۔** "ابھی کیا۔ ابھی تو تم نے صرف "ریہرسل" ہی دیکھا۔ اصل "اکسرسائز" تو رمضان شریف کی تراویح میں ہوتی ہے۔ اور پورا آنند صبح کی نماز میں اُس وقت جو شانتی ہوتی ہے اس کا حال نماز پڑھنے سے ہی معلوم ہوگا اور بعض لوگ چار بجے رات کو تہجد پڑھتے ہیں۔ اس وقت کے آنند کو نہ پوچھو۔"

**پنڈت۔** (جلدی سے) "مجھے مسلمان کرلو۔"

**مولانا۔** "تم مسلمان ہوگئے۔ رہی ایک رسم یعنی یہ کہ نہانا، کلمہ پڑھنا، ساتھ ملکر کھانا پینا وغیرہ یہ رسم چاہو پوری کرلو اور چاہے نہ بھی کرو۔"

من سندر تو دنیا سندر

اس طرح پنڈت جی مسلمان ہوگئے۔ ایسے مسلمان کہ نماز بھی پڑھتے ہیں اور ٹھاکر جی کی مورتی کو اشنان بھی دیتے ہیں۔ پنڈت جی اس حالت میں بوڑھے ہوگئے۔

اب ان کو پنشن مل چکی ہے انکی صورت اب ایسی متبرک ہوگئی ہے کہ خود انکی پوجا کرنے کو جی چاہے۔ مولانا بھی سن سفید ہوگئے وہ پنڈت جی پاس برابر آتے جاتے ہیں۔ انکی محبت روز بروز بڑھتی ہی گئی ہے۔

لیکن اب پنڈت جی کچھ بیمار رہتے ہیں۔ وہ بالکل لٹ گئے مضمحل ہوگئے۔ اور یہی حال مولانا کا بھی ہوا۔ پنڈت جی اب بھی پوجا کرتے ہیں اور نماز بھی پڑھتے ہیں۔ دیسی پوجا اور سودیشی نماز۔ ان کو اسی میں آنند ہے۔

لیکن اب دیکھو پنڈت جی کا آخری وقت ہے۔ بستر مرگ پر پڑے ہیں۔ موت کا وقت آن پہنچا۔ وعدہ پورا ہونے کو ہے۔ چارپائی پر لیٹے ہیں۔ پاس بال بچے غمگین بیٹھے ہوئے ہیں۔ مولانا بھی سر جھکائے ایک کرسی پر بیٹھے ہیں۔ پنڈت جی مولانا سے کہہ رہے ہیں۔

"مولوی صاحب اس وقت کچھ قرآن شریف پڑھیے"

اور مولانا صاحب بلند آواز میں اس طرح قرآن شریف پڑھتے ہیں۔

صرف ترجمہ کہ سمجھ میں آ سکے۔ یعنی بالکل اس طرح:۔

"اللہ کسی کو دکھ نہیں دیتا۔ مگر جو اس کی گنجائش ہو۔ اس کو وہ ملتا ہے جو کمایا۔ اس پر وہ پڑتا ہے جو کیا۔

اے ہمارا اگر ہم بھولیں یا چوکیں تو ہماری گرفت نہ کیجیو۔ اور ہم پر بھاری بوجھ نہ ڈالیو۔" (سورۃ البقر)

پنڈت جی یہ سنتے ہیں اور ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ ہچکی آتی ہے اور ہو چکتے ہیں۔

کیا وہ مسلمان مرے؟ نہیں۔ کیا وہ ہندو تھے۔ بیشک ان کی نجات ہوگی یا نہیں؟ ضرور ہوگی بلکہ وہ دوسروں کی نجات کا باعث ہونگے۔ وہ خدا کے نیک بندے تھے وہ ہندو تھے۔ نیک ہندو۔ سچے ہندو ایسے ہندو جن پر مسلمان رشک کریں وہ مسلمان رشک کریں جو کلمہ تک کا صحیح ترجمہ نہیں جانتے۔ جنکو یہ بھی نہیں معلوم کہ دین کی اصلیت کیا ہے نماز کی حقیقت کیا ہے قرآن پاک میں کیا لکھا ہے اور موت کے وقت مرنے والے کے جذبات کیسے ہونے چاہییں۔ یوں کہنے کو تو سبھی کہتے ہیں کہ "نکل جائے دم یا خدا کہتے کہتے"۔ مگر دل تو نہیں ہلتا۔ موت کا مزا تو اسی وقت ملے جب دل ہلے۔

پنڈت جی نے مرتے دم تک اپنے من کے ٹھاکر کو اشنان دیا۔ انسان کا ہے سے؟ آنکھوں کے نرمل جل[1] سے اپنے دیوتا کو مرتے دم تک بھوگ پہنچایا۔ کیسا بھوگ؟ آنکھوں کے سوم رس کا۔ چاہے وہ قرآن شریف کے سننے سے حاصل ہوا ہو چاہے راماین، وید یا پران سننے سے کاش ہماری روح وید ہی سنتے سنتے بھیجتی اور کیف محبت کی محویت میں قفس عنصری سے نکل جاتی۔ راماین کا مصنف سچ کہتا ہے:۔

"بنا پریم ریجھے نہیں تلسی نند کشور۔ اپنے نند کشور کو رجھانے کے لئے۔ اپنے خدا کو منانے اور اپنے معبود کو راضی کرنے کے لئے آؤ جبین بر خاک ہو کر نماز پڑھیں۔ کوئی بھی حالت کیوں نہ ہو۔ اللہ کی عبادت سے جسم کو قوت اور روح ضرور ہوگی کاش مرحوم پنڈت کی طرح لوگ نماز کو اللہ میاں کی قواعد یا پریڈ تا کی مقرر کی ہوئی مذہبی پریڈ ہی سمجھ کر پڑھتے۔ اگر یہ جسمانی تو اس سے روح کو قوت پہونچتی ہے کیسی قوت؟ جو انسان کو مکاناً علیاً تک پہونچا سکے اور اس کے عروج تک پہونچنے نکلنے دے۔ اگر مکاناً علیاً تک پہونچنا ہے۔ اگر روحانی معراج حاصل کرنا ہے تو خدا کے اس حکم پر کیوں نہ عمل کیا جائے جو اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ خدا کو اپنے بندوں سے بڑی محبت ہے کیونکہ وہ انھیں اپنے سے دور نہیں رکھنا چاہتا۔

"کھڑے ہو نماز کے لئے سورج ڈھلنے سے رات کے اندھیرے تک اور قرآن پڑھنا صبح کو۔ بیشک صبح کا پڑھنا خدا کے روبرو ہوتا ہے" (سورہ بنی اسرائیل)

اور اس طرح دنیا میں بھی خدا اپنے بندوں کو قریب رکھنا چاہتا ہے۔

[1] بمعنی صاف پانی یعنی آنسو۔

سید مقبول حسین۔ احمد پوری

# محسوساتِ ماہر

از منظور حسین ماہر القادری

...قابل مریضِ ہجر کا انجام ہے — جانب در ہے نظر لب پر کسی کا نام ہے

...ری غمناک حالت موردِ الزام ہے — آنکھ میں آنسو نہیں ہے ضبط کا پیغام ہے

...آغاز میرا عشق ہی انجام ہے — میری فطرت بے نیازِ گردشِ ایام ہے

...پوچھتا نہیں حسنِ کرشمہ ساز کو — اُف رے ناکامی محبت مفت میں بدنام ہے

...ت جانے والے تو بھی سنتا جا ذرا — ہر شکستِ دل تمناؤں کا اک پیغام ہے

...آنکھوں کی نشاط انگیزیاں — میری بیہوشی ابھی تک بے نیازِ جام ہے

...است ہے کوئی دشمنی — دل کو کیا کہیے کہ ظالم خوگرِ آلام ہے

...کی آواز جنبشِ نبض کی — ہر صدا اپنی جگہ اک یار کا پیغام ہے

...کام ساقی کی نظر — میکدہ میں گردشِ ساغر برائے نام ہے

...یال وہم ہے — آدمی کچھ بھی نہیں اک پیکرِ اوہام ہے

...دنیا ساز فطرت دیکھ لی — اب تو تیرا آسرا اے مرگِ بے ہنگام ہے

فطرتِ شاعر ہے ماہر مہبطِ اسرارِ حق
شعر کہتے ہیں جسے الہام ہے الہام ہے

# اکبر الہ آبادی اور مغربی تعلیم

از جناب سید بادشاہ حسن حیدر آبادی

نجد میں بھی مغربی تعلیم جاری ہوگئی　　　لیلیٰ و مجنوں میں آخر فوجداری ہوگئی

(۱)

اوائل انیسویں صدی میں زمانہ کروٹ بدل رہا تھا۔ ہندوستان کی فضا میں انقلاب کے اجزا شامل ہوچکے تھے، انگریزی حکومت مستحکم ہوچکی تھی۔ اور اس کے سارے انتظامات مکمل۔ انگریزوں نے رعایا کی فلاح و بہبود کے مدنظر بے شمار سہولتیں مہیا کیں ؂

ہر طرف سامان ہیں آرام کے　　　کھل گئی ہے ہر طرف ہر شئے کی شاپ
ہوگئے روشن حدودِ آسمان　　　علم چمکا ہوگئی تاروں کی ناپ
ساری دھرتی دب گئی سائنس سے　　　لگ گئے پائپ گیا دنیا سے پاپ

ان ظاہری آرام و آسائش کے اسباب پر نظر رکھنے والی آنکھیں چندھیا گئیں اور نظر کو خیرہ کرنیوالی تہذیب حاضرہ کی چمک سے متاثر ہوکر انگریزی راج کے راگ الاپنے لگیں ؂

کیوں نہ اپنے دل کو ہو اُن سے ملاپ　　　لاٹ صاحب ہیں ہمارے مائی باپ
انکے حق میں بھی دعا کرتے ہیں ہم　　　مندروں میں جب کبھی جاتے ہیں جاپ
ان کی برہتی سب مناتے ہیں یہاں　　　خواہ وہ ہوں خواہ ہم ہوں خواہ آپ

حکومت نے "جاہل ہندوستان" کو تعلیم سے آراستہ کرنے کے لئے جابجا سرکاری مدارس اور کالج کھول دیئے شروع شروع میں ولزلی (Wellesley) جیسے نکتہ سنج اور موقعہ شناس نے ہندوستانی زبانوں کی تعلیم کا رواج عام کیا اور اس کی اہمیت پر زور دیا تھا لیکن رفتہ رفتہ حکومت نے اسے پس پشت ڈال دیا۔ اور مغربی زبانوں سے خصوصاً انگریزی کی تعلیم لازمی کردی۔ لارڈ میکالے نے انگریزی زبان کو اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ قرار دیا۔ اور حکومت نے یونیورسٹیوں کا طریقہ نصاب تعلیم ہندوستانیوں کے مشوروں کے بغیر مقرر کردیا۔ یہ حقیقت میں ہندوستانی طلبا کی قسمتوں کا آخری فیصلہ تھا۔ حالانکہ ان کی شنوائی نہ ہوئی۔ اور انھیں کوئی موقع اس موضوع پر بحث کرنے کا نہ دیا گیا۔ پھر بھی حکومت کی منصف مزاجی اور رعایا پروری مسلم رہی۔

مسلمانوں نے ہندوستان پر سالہا سال حکومت کی۔ اور ایسی حکومت جو انگریز مورخین کے نزدیک تعصب سے بھری اور خود مختاری اور خود غرضی کا پلڑا بھاری کئے ہوئے تھی، پھر بھی قدیم تہذیب، مذہب و ملت اور طریقہ تعلیم و تعلم کو ایسا نہ مٹا سکی۔ جیسا کہ انگریزی حکومت نے چند ہی سال کے اندر ہندوستانی طرز تعلیم و تربیت اور تہذیب و

معاشرت کو فنا کر دیا۔

یوں تو کمپنی کے زمانہ ہی میں مشن اسکول قائم ہو چکے تھے۔ لیکن حکومت کا قدم جب مستحکم ہو گیا تو سرکاری مدارس اور کالج جابجا کھُل گئے۔ انگریزی اسکول کے پڑھے لکھوں کو ترجیح دی گئی اور انہیں ترغیب و تحریص کے ذریعہ اس بات پر آمادہ کیا گیا کہ وہ پروپیگنڈا کریں۔ اس کے علاوہ زمانہ کی رو میں یہ ضروری تھا کہ ہندوستانیوں کی بھی ایک کثیر تعداد بہہ جاتی چنانچہ ہوا بھی یہی ؎

عجب بے تمیزی ہے اس دور کی — زمانہ کو دیکھو اور شیو شیو پکار
پپیہے سے کہتے ہیں کہ اب "پی" کو چھوڑ — ضرورت ترقی کی ہے "کیو" پکار

ایسے زمانہ میں جبکہ ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے "پی کیو" کی صدا بلند ہو رہی تھی اور وہ مکتب جو مشرقی روایات کا نمونہ تھا اسکول کی شکل میں بدل رہا تھا مولویوں اور پنڈتوں کی جگہ ماسٹر صاحب کے قدم جم رہے تھے درسگاہوں اور پاٹ شالوں کی بجائے گورنمنٹ یا مشن اسکولوں کا عمل دخل ہو رہا تھا حضرت اکبر الہ آبادی ۱۸۴۶ء میں معرضِ وجود میں آئے جب آپ کی عمر اس قابل ہوئی کہ تعلیم کی طرف آپ کو متوجہ کیا جانا مناسب خیال کیا گیا۔ تو چونکہ ابھی تو آپ کے گھرانے میں پرانی خصوصیات باقی تھیں اور آپ کے والد ماجد خود ایک جید عالم اور صاحب علم و ہنر شخص تھے۔ اس لئے آپ کی تعلیم کا انتظام گھر پر ہی ہوا اور خود والد بزرگوار آپ کو درس دیتے رہے اور بارہ پندرہ سال کی عمر تک۔ آپ نے اردو فارسی اور عربی کی معمولی کتابیں پڑھیں۔ بعد ازاں چونکہ زمانہ تیزی کے ساتھ کروٹ بدل رہا تھا اس لئے آپ پر بھی فضا اور ماحول کا اثر ہوا۔ اور آپ انگریزی پڑھنے کے خیال سے ایک مشن اسکول میں داخل ہوئے۔ لیکن کچھ عرصہ بعد آپ کو مغربی تعلیم ترک کر دینی پڑی۔ گو کہ اس قلیل مدت میں آپ نے اچھی طرح انگریزی سیکھی نہ تھی لیکن شدو مد سے ضرور واقفیت حاصل ہو چکی تھی۔

اس کے بعد آپ کو اپنا سلسلہ تعلیم ترک کرنا پڑا۔ ملازمت کی فکر میں سرگرداں، ادھر ادھر مارے مارے پھرا کئے۔ کچھ عرصہ تک مختلف مقامات پر ملازمتیں کیں۔ پھر وکالت کا امتحان پاس کیا اور یہ امتحان انگریزی کتابوں کے مطالعہ کے بعد آپ نے پاس کیا تھا۔ اس لئے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اس زمانہ تک آپ کی انگریزی کی قابلیت قابل لحاظ ہو چکی تھی۔

ان تمام واقعات کے مدِ نظر ہم آسانی سے کہہ سکتے ہیں کہ اکبر مغربی تعلیم کی طرف اس وقت مائل ہوئے جبکہ انکی شرقی تعلیم مکمل ہو چکی تھی اور اس کی جڑیں مضبوطی کے ساتھ جم چکی تھیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے انگریزی تعلیم اسکول میں رہ کر بہت کم حاصل کی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ قدامت پرستی اور مشرقیت کے رکھ رکھاؤ نے انھیں اپنے زمانہ کے اکثر افراد کی طرح مغربی تعلیم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے پر مجبور کر دیا۔ اگر غور کیا جائے اور اکبر کے اشعار کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اکبر نے انگریزی تعلیم کا جہاں کہیں مضحکہ اُڑایا ہے اس سے مُراد وہ مروجہ طریقۂ تعلیم تھا جو اُس وقت ساری ہندوستانی فضا پر چھا رہا تھا۔ اور اس کے دھندلے بادلوں نے ہندوستانیوں کو گھٹا ٹوپ اندھیرے میں کر رکھا تھا۔ جہاں کہیں بھی اکبر نے انگریزی کی مذمت کی ہے۔ ان کا مقصد یہ ہرگز نہ تھا کہ انگریزی زبان سرے سے سیکھی نہ جائے۔ بلکہ وہ اس غفلت پر احتجاج کر رہے تھے جو ہندوستانی نوجوان اپنی مادری زبان کے حق

میں برت رہے تھے۔ ان کا منشا حقیقی یہ تھا۔ کہ مادری زبان کو ذریعۂ تعلیم بنایا جائے۔ اور اس کی ترقی میں ہر طرح کوشش کی جائے۔ اس سے فرصت ملے تو انگریزی سیکھنے میں کوئی قباحت ان کے نزدیک نہ تھی۔ اور یہ حقیقت ہے۔ کہ انگریزی کو ذریعہ تعلیم بناکر ہندوستان آج پچھتا رہا ہے۔ یا میں یہ کہوں کہ آٹھ آٹھ آنسو رو رہا ہے۔

انگریزی نصابِ تعلیم کے ساتھ وہ پرانی کتابیں بالائے طاق رکھدی گئیں جن کا ایک زمانہ میں چرچا تھا فلسفہ کے لئے اسپنسر اور ملِ کی تصانیف داخلِ نصاب کی گئیں تو اکبر بگڑ پڑے ان کا کہنا یہ ہے کہ جب ہمارے ہاں ایران و عرب کے فلسفہ پر بین الاقوامی شہرت کی کتابیں موجود ہیں تو کیا ضرور ہے کہ ہمیں مغربی مصنفین سے روشناس کرایا جائے جن کی غیر زبان میں ہونے کی وجہ سے پڑھنا اور سمجھنا کارے دارد ہو گیا ہے:۔

غزالی و رومی کی بھلا کون سُنے گا　　　محفل میں چھڑا نغمۂ اسپنسر و مِل ہے

اسی مضمون کو ایک جگہ بہت ہی خوب انداز میں ادا کیا ہے ؎

ہماری محفلیں اب بھی لطیف اجزا سے مملو ہیں　　　مگر اخفش تھے قبل اس کے اب اسپنسر کے شیدا ہیں

کالج یا اسکول کا کورس اکبر کے نزدیک قابلِ اعتراض تھا۔ اور آج بھی ہر سمجھدار اس کا اعتراف کرتا ہے۔ کہ ہمارا کورس ہمیں تعلیم یافتہ بنانے کے عوض ہمیں انگریزی کی اس قدیم مثل کی طرف لے جا رہا ہے۔ (Jack of all t.) (master of none) اوّل تو مضامین کی تقسیم ہی غلط طریق پر کی گئی ہے۔ بہت سے ایسے مضامین مقرر کئے گئے ہیں جو ہندوستانیوں کے لئے کبھی بھی فائدہ مند ثابت نہیں ہو سکتے۔ اس پر طرّہ یہ کہ اتنے مضامین اور اس قسم کے امتحانات نازل کئے گئے ہیں کہ طالب علم اگر کتابوں کا کیڑا بن کر انہیں چاٹ جائے تو سوائے دماغ اور صحت خراب کرنے کے اور کوئی فائدہ ان سے اپنی آئندہ زندگی میں نہیں اٹھا سکتا۔ اور اگر بے پروائی اور بد مذاقی سے بے توجہی برتے تو اپنی عمرِ عزیز کا گراں قدر حصہ ضائع کرتا ہے۔ اس مشغولیت اور انہماک کا مضحکہ اکبر نے خوب اڑایا ہے ؎

یہ ان کا کورس کیا کم ہے کہیں بھی کچھ کہوں اُن سے　　　مری جانب سے بس کالج کے لڑکوں کو دعا کہیئے

اکبر کو کالج کی زندگی پر بھی اعتراض ہے۔ کیونکہ انگریزی تعلیم نے طالب علموں کو مذہب اور رسم و رواج سے بے نیاز اور بے بہرہ کر دیا ہے ؎

وضعِ روشن اطفال کی ہے قوم پر بارِ گراں　　　رسموں کا شکوہ اک طرف مذہب کا رونا اک طرف
کہتے ہیں لڑکے بھی مگر کالج سے فرصت ہی کہاں　　　یہ ساری باتیں اک طرف اور پاس ہونا اک طرف

بات یہ تھی کہ جب کالج اور اسکول نئے نئے کھلے ہیں تو ان کا رنگ روپ ان کی چمک دمک اور رعنائی صناعی ظاہری آنکھوں کو خیرہ کئے بغیر نہ رہ سکی۔ اور یہ نئی روشنی کا لازمی نتیجہ ہے۔ ہندوستان ہی پر کیا منحصر ہے ساری دنیا میں تہذیب جدید نے طالب علموں کی ذہنیت کو منقلب کر دیا ؎

طفلِ دل محوِ طلسمِ رنگِ کالج ہو گیا　　　ذہن کو تپ آ گئی مذہب کو فالج ہو گیا

ہندوستان میں کالجوں کے قیام اور اسکولوں کے وجود سے پہلے تعلیم زیادہ تر مذہبی دیجاتی تھی اور وہ

بھی عموماً مذہبی مقامات پر مثلاً مسجدوں، خانقاہوں، پاٹ شالوں وغیرہ میں۔ اسی لئے ہندوستانی مذہب سے بہت زیادہ بہرہ ور تھے۔ اس لئے جب انگریزی طریقہ پر تعلیم شروع ہوئی اور حکومت نے مذہبی تعلیم کی طرف زیادہ توجہ نہ کی اور اس کی تعلیم کا خاطر خواہ انتظام نہ کیا تو حضرت اکبر بھڑک اٹھے۔ طالب علموں سے متعلق فرماتے ہیں ؎

نظر ان کی رہی کالج میں بس علمی فوائد پر
گرائیں چپکے چپکے بجلیاں دینی عقائد پر

کالج اور اسکولوں میں تو دینی تعلیم کا کوئی انتظام نہ تھا۔ پھر صحبت بھی ماشاء اللہ سے خوب ملی۔

یکے ذی علم در اسکول روزے
فتاد از جانب پبلک بدستم
بدو گفتم کہ کافری یا بلائی؟
کہ بیش از اعتقادِ تو پستم
بگفتا مسلم مقبول بودم
ولے یک عمر با ملحد نشستم
جمال نیچری در من اثر کرد
دگرنہ من ہماں شیخم کہ ہستم

جب انگریزی تعلیم کا چرچا گھر گھر ہوا۔ اور ماں باپ نے اپنے لڑکوں کو مکتبوں سے نکال نکال کر اسکولوں میں شریک کرنا شروع کیا۔ تو لڑکوں نے اپنے مولویوں سے کہا ؎

ہم تو کالج کی طرف جاتے ہیں اے مولویو
کس کو سونپیں تمہیں اللہ نگہبان رہے

ظاہر ہے کہ کالج کا خرچ بہ نسبت مکتبوں کے زیادہ تھا اس لئے والدین کی ساری کمائی اپنے ہونہار سپوت کی پڑھائی میں صرف ہو جاتی تھی۔ اس لئے وہ مسجد وغیرہ کے چندوں سے کانوں پر ہاتھ دھرنے لگے ؎

مسجد کا ہے خیال نہ پروائے چرچ ہے
جو کچھ ہے اب تو کالج و ٹیچر میں خرچ ہے

یہ تھی حالت کالج کے اندر لڑکوں کی۔ اب ذرا فارغ التحصیل گریجویٹوں پر نظر ڈالئے۔ اس طبقہ سے اکبر کی مراد زیادہ تر علیگڈھ گریجویٹ یا فیشن پرست تعلیم یافتہ لوگوں سے ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ فیشن پرست اور انگریزی تعلیم کے رنگوں میں غوطہ کھایا ہوا طالب علم اکبر کی نظر میں صرف علیگڈھ کا تھا۔ اس لئے جہاں بھی وہ اس کی مثال پیش کرتے ہیں ان کا مطمح نظر علیگڈھ کا پاس شدہ طالب علم ہوتا ہے۔ تعلیم پا کر نوجوان نکلتے ہیں تو ان کی طبیعتوں میں زمین و آسمان کا فرق ہو جاتا ہے ؎

رنگ چہرہ کا تو کالج نے بھی رکھا قائم
رنگ باطن میں مگر باپ سے بیٹا نہ ملا

اس مطلب کو ایک اور جگہ ادا کیا ہے کہا جاتا ہے کہ "الولد سر لابیہ" یعنی ع بیٹا وہی قدم بہ قدم ہو جو باپ کے (انیس) لیکن گریجویٹ صاحب اس کلیہ سے مستثنیٰ ہیں ؎

کالج میں کسی نے کل یہ نغمہ گایا
قومی خصلت کا اٹھا سر سے سایہ
کہتے تھے ولد لوگ "سر لابیہ"
"سر لماسٹر" کا اب وقت آیا

ایک موقع پر فرماتے ہیں ؎

ہم ایسی کل کتابیں قابل ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

اکبر کے خیال میں موجودہ طرز تعلیم کی بدولت یہ ناممکن تھا کہ لڑکا اپنے باپ کے نقش قدم پر چل سکے۔ بچپن ہی سے لڑکے کا ماحول کچھ ایسا ہو جاتا تھا کہ لڑکے میں والدین کی خو بو ناممکن ہو جاتی تھی ؎

کیا ہو بو اطفال میں ماں باپ کے اطوار کی
دودھ تو ڈبے کا ہے تعلیم ہے سرکار کی

اسی مطلب کو ایک دوسری جگہ بیان کیا ہے ؎

تعلیم جو دی جاتی ہے ہمیں وہ کیا ہے فقط بازاری ہے
جو عقل سکھائی جاتی ہے وہ کیا ہے فقط سرکاری ہے

جس طرح [illegible] نشان تا [illegible] کی وہ تھی دنیا میں ایک ہلچل مچ گئی تھی۔ اسی طرح کالج سے [illegible] کہ وہ شیخ صاحب کے اقوال کو [illegible] اس پر [illegible] انھوں نے شروع کر دی۔ اکبر نے شیخ کی تائید میں شعر منظوم فرمائے ؎

بنی امت [illegible] شیخ کی بنی کالج

کالج کی فضا نے لڑکوں میں [illegible] کے جراثیم پیدا کئے اور [illegible] قوم اور وطن وطن کا راگ الاپنے لگے تو اکبر ان کا [illegible]

کالج [illegible] ہندوستاں ہمارا
[illegible] ہمارا
لیکن یہ سب [illegible] ہمارا

ان اشعار میں اقبال [illegible] سے مسلمانوں [illegible] خیال ظاہر کیا ہے۔ اکبر کے خیال میں مسلمانوں کا یہ دعویٰ آج صحیح نہیں رہا ؎

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

کیونکہ مسلمانوں کی موجودہ حالت بتاتی ہے کہ ترقی کی بجائے پستی کی طرف [illegible] ان کا وہ جھنجھناتی ہوئی شمشیر کا لوہا ان کا وہ تمدن جو ہسپین میں [illegible] یورپ کی آنکھوں کو خیرہ کر رہا تھا ان کے وہ اخلاق حمیدہ جو محمود و ایاز کو ایک ہی صف میں [illegible] ان کی وہ برادرانہ اخوت ان کی وہ حمیت کہ قوم کی ان کی خاطر جانوں کو معرض خطر میں ڈال کر [illegible] کر جاتے تھے اب یہ سب کچھ ایک خوش آئند خواب اور بھولا بسرا افسانہ ہو کر تاریخ پارینہ کے سوا اور کچھ نہ رہا۔ مسلمانوں کا اب تمدن کی لینا اور شیخی بگھارنا پدرم سلطان بود کہنے سے زیادہ نہیں۔

---

اکبر کے اشعار میں زیادہ طنز تمدن اور معاشرت پر ہے کیونکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ انگریزی تعلیم کس طرح نوجوانوں کی معاشرت اور ان کے تمدن میں خاص انداز پیدا کر رہی ہے۔ اکبر [illegible] قدامت پسند ہونے کی حیثیت سے یہ کبھی گوارا نہ کر سکتے تھے کہ جدید تعلیم یافتہ نوجوان قدیم تہذیب کا مذاق اڑائیں۔ اس کے علاوہ دوسری چیز جس نے

اکبر کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ انگریزی تعلیم کے خلاف اپنا قلم اٹھائیں۔ وہ ان کی مذہب پرست ذہنیت تھی۔ وہ پکے مسلمان تھے اور پورے مذہبی تھے [illegible] لیکن وہ بھی مسلمانوں کے [illegible] پر سامیت کا سکہ بیٹھتے دیکھنا چاہتے تھے [illegible] وہ چاہتے تھے کہ سب ہندستانی [illegible] قوم کی قیود سے بے نیاز ہو کر [illegible] علم [illegible] دولت حاصل کریں۔ [illegible] میں سرسید کی مغربی تعلیم [illegible]

اکبر چونکہ مغربی طرز تعلیم کے مخالف تھے [illegible] اس کی طرز روش سے بیزار اور طریقہ تعلیم کے مخالف ہوے [illegible] علیگڈھ [illegible] سرسید [illegible] تخریبی کا [illegible] تہذیب و تمدن کے بھی پرانے دلدادہ [illegible] بری معلوم ہوئے لگی [illegible] کالج کے چندہ وصول کنندگان [illegible] دکھائی ہے ؎

قوم [illegible] | [illegible] کی مانگ ہے
عالم [illegible] | [illegible] کی مانگ ہے

ایک اور جگہ چندہ وصول کرنے والوں [illegible] ہیں ؎

عمر گذری ہے اسی [illegible] | [illegible] علیگڈھ کی [illegible]

علیگڈھ [illegible] اس لئے اکبر [illegible] چاہتے تھے علیگڈھ کالج مسلم یونیورسٹی کے نام سے موسوم ہونے کے بعد [illegible] چنانچہ فرماتے ہیں ؎

سید سے علیگڈھ میں یہ جا کر کوئی کہدے | [illegible] قوم کی قسمت سے زیادہ
دین کو سیکھو [illegible] | [illegible] علیگڈھ سے ہو

اس کے بعد علیگڈھ کالج [illegible] خیال کا اظہار کرتے ہیں ؎

مسلمانوں کی خوشحالی کی [illegible] سید کو | مگر یہ کام نکلے گا [illegible]
وہ عشق کیا [illegible] | جو عقل کو نہ [illegible] وہ شاعری کیا ہے
[illegible] | [illegible] مقصود زندگی کیا ہے

لیکن یہ سمجھنا غلطی ہے کہ اکبر نے سرسید کے [illegible] اور اولوالعزمی کا اعتراف نہ کیا۔ اکبر مسلم یونیورسٹی کے مخالف نہ تھے بلکہ ان کی [illegible] قوم کی ترقی اور ملک کی اصلاح [illegible] کالج کے قیام کی بجید ضرورت ہے۔ [illegible] ان کو سرسید سے بغض تھا انھوں نے صرف طریقۂ تعلیم اور طرز روش کی مخالفت کی۔ سرسید کی دن رات کی محنتیں [illegible] کر اکبر کے دل میں گھر [illegible] سرسید کا خون [illegible] ایسا نہ تھا کہ اکبر کے کان پر جوں نہ رینگتی۔ سرسید کی [illegible]

ایسی نہ تھی کہ اکبر کا دل نہ ہلا دیتی سرسید کا ولولہ اور خلوص ایسا نہ تھا کہ اکبر کے دل میں جگہ نہ پیدا ہوتی۔ ان ہی حالات کے مدنظر اکبر کو سرسید کی کارگزاریوں کا اعتراف کرنا پڑا ؎

بے علم و بے ہنر ہے جو دنیا میں کوئی قوم — نیچر کا اقتضا ہے رہے بن کے وہ غلام
تعلیم اگر نہیں ہے زمانہ کے حسب حال — پھر کیا اُمید دولت و آرام و احترام
سید کے دل پہ نقش ہوا اس خیال کا — ڈالی بنائے مدرسہ لیکر خدا کا نام
صدمے اُٹھائے رنج سہے گالیاں سنیں — لیکن نہ چھوڑا قوم کے خادم نے اپنا کام
دکھلا دیا زمانہ کو زورِ دل و دماغ — بتلا دیا کہ کرتے ہیں یوں کرنے والے کام

(۲)

یہاں تک تو ہم نے مغربی تعلیم کا اثر لڑکوں پر دکھایا۔ اب کچھ اس سے بھی بحث کریں کہ مغربی تعلیم کا لڑکیوں پر کیونکر اور کس طرح اثر ہوا۔ یہ تو صاف سی بات ہے کہ جب ہندوستان کی فضا ہی بدل گئی۔ اور لڑکوں نے مغربی تعلیم شوق و ذوق سے حاصل کی تو لڑکیوں کے دلوں میں بھی اس کی اُمنگ فطرتاً پیدا ہوئی۔ لیکن جس طرح ہندوستان کے مرد آزاد ہیں اس طرح عورتوں کو آزادی کہاں نصیب۔ مردوں نے تو کالجوں میں شریک ہو کر گٹ پٹ سیکھ لی۔ لیکن عورتیں ایک زمانہ دراز تک قرآن شریف اور کریما وغیرہ سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ مگر وہ جو کہتے ہیں کہ ذہنیت میں جب انقلاب ہونا ہوتا ہے تو رفتہ رفتہ اور چپکے چپکے اپنا کام اس طرح کئے جاتا ہے جس طرح گھن لکڑی کو کھاتا ہے اپنی جگہ بالکل درست ہے نئی تعلیم سے آراستہ ہو کر جو نیا طبقہ معرض وجود میں آیا وہ تو اپنی ماؤں بہنوں پر جبر نہ کر سکا اور کیا بھی تو کوئی اثر نہ ہوا اور ان کی ذہنیت میں کوئی تبدیلی پیش نہ آئی لیکن جب ان کی شادی ہو چکی اور وہ بھی صاحب اولاد ہو گئے تو انھوں نے اپنی مرضی کے مطابق اپنی لڑکیوں کو جدید طرز کی تعلیم سے مرصع کرنے کا خیال پختہ کر لیا چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ مولٰنا اکبر کا خیال بالکل صحیح ہے کہ اس عظیم الشان ذہنی انقلاب کا اثر میاں اور بیوی دونوں پر یکساں ہوا ؎

مناسب ہے نئی تعلیم نسواں — یہی راہ آپ اب بے رد و کد لیں
سمجھ لیں لاکھ باتوں کی یہ اک بات — میاں بدلے تو بیوی کیوں نہ بدلیں

جب لڑکیوں کو بھی مغربی تعلیم کا شوق چرایا تو انھوں نے اسکولوں میں اپنے آپ کو شریک کرا دیا۔ لیکن وہ جلدی ہی محسوس کرنے لگیں کہ پردہ آمد و رفت اور دوسرے کاموں میں سنگ راہ ہے تو انھوں نے آہستہ آہستہ نقاب اُلٹ دی اس کے بارے میں اکبر فرماتے ہیں ؎

مجلس نسواں میں دیکھو عزت تعلیم کو — پردہ اُٹھا چاہتا ہے علم کی تعظیم کو

جب لڑکیاں مغربی طرز تعلیم سے بن سنور کر کالج سے نکلیں تو ان میں بھی وہ تمام اثرات جھلک رہے تھے جو لڑکوں کے چہروں پر نمایاں تھے مغربیت کی دلدادگی ضرورت سے زیادہ پیدا ہو گئی تھی۔ اور رشد بد انگریزی پڑھکر سمجھنے لگیں کہ وہ بھی سچ مچ کی کوئی "لیڈی" ہو گئیں۔ لباس میں انھوں نے تبدیلی کر دی۔ وضع قطع بدل دی۔ اور رانداز

بھی نڑا نے کرنے۔ اسی کو اکبر نے ایک مشرقی بی بی اور مغربی تعلیم یافتہ مس کے مکالمہ میں بیان کیا ہے ؎

مس سے بیگم نے کہا کل تو کہاں اور یہ ہم کہاں ۔۔۔ بوٹ کی چرچر نہیں کیا رکھا ہے یہ چھم چھم کہاں
مس یہ بولی پڑھ کے نکلو تو ذرا اسکول سے ۔۔۔ اور ہی جانیں نظر آئیں گی یہ عالم کہاں

اس کی وجہ زیادہ یہ ہوئی کہ شروع شروع میں زنانہ مدارس (مغربی طرز کے) بہت کم تھے اور جو تھے بھی وہ کانونٹ اسکول تھے جہاں کی صحبت کا لازمی نتیجہ انہیں اپنے رنگ میں رنگ دیتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ لڑکیاں جو مغربی تعلیم اور اسکولوں میں پڑھنے کی شیدا ہوئیں انہیں مجبوراً کانونٹ اسکولوں میں شریک ہونا پڑا۔ اور وہاں عیسائی لڑکیوں کے ساتھ ساتھ رہ کر ان کے لباس ان کے خیالات اور احساسات بھی شدہ شدہ بدل گئے۔ انھوں نے مشرقی تہذیب کو دقیانوسی چیز سمجھ لیا۔ اس کا مذاق اڑانا اپنی روشن خیالی اور تعلیم یافتہ ہونے کی حیثیت سے ضروری سمجھا۔ اسی وجہ سے ان کے عادات و اطوار بھی بگڑتے گئے۔ انھوں نے سب سے پہلے پردہ کی رسم توڑی جس کی وجہ سے اکبر نہایت برافروختہ ہوئے۔ لیکن وہی ہوا جو ہونا تھا ؎

غریب اکبر نے بحث پردے کی کی بہت کچھ مگر ہوا کیا ۔۔۔ نقاب الٹ دی یہ اس نے کہہ کر کہ یہ لیگا مرا موا کیا

اس کے بعد انھوں نے مذہبی الجھنوں سے اپنے آپ کو علیحدہ کر لیا مغربی تہذیب میں وہ اس قدر اپنے آپ کو کھو بیٹھیں کہ اکبر کو ایک بامزہ شعر کہنا پڑا ؎

تعلیم دختراں سے یہ امید ہے ضرور ۔۔۔ ناچے دلہن خوشی سے خود اپنی برات میں

پردہ کی قید سے چھوٹ کر عورت نے شوہر کی غلامی سے بھی پروانۂ رہائی حاصل کر لیا۔ مغربی تعلیم اور تہذیب نے اسے سکھلا دیا کہ وہ مرد کی لونڈی نہیں بلکہ شریک حیات ہے یہاں تک تو غنیمت تھا۔ لیکن اس نے ایک قدم اور آگے بڑھایا یعنی اس نے اپنے آپ کو مرد کا "نصف بہتر" سمجھنا شروع کیا۔ بجائے اس کے کہ اپنے شوہر کا کہا مانتی اس نے اب شوہر کے گلے میں طوق غلامی ڈال دیا۔ اس نے ڈنکے کی چوٹ علی الاعلان کہہ دیا کہ وہ مرد کی محتاج نہیں رہی بلکہ خود بھی روزی کما سکتی ہے اور ملازمت کے دروازے اس کے آگے کھلے پڑے ہیں۔ مرد ہٹ دھرمی اور ضد سے کام لینے لگا۔ تو وہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے پر کمربستہ اور تیار ہو گئی۔ مرد عجیب آفت میں مبتلا تھا۔ بیوی کو دیکھتا تھا کہ نہ تو وہ اس کی دلجوئی کرتی ہے اور نہ اطاعت ہی۔ نہ اولاد کی پرورش کی طرف توجہ کرتی ہے اور نہ امور خانہ داری کی طرف ہی۔ اس کو کوئی کام ہے تو کلب جانا، ناول پڑھنا اور سہیلیوں بھولیوں کے ساتھ گلچھرے اُڑانا۔ مگر یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی دم مارنے کا اس کو یارا نہ تھا بلکہ وہ اپنی بیوی کی ڈانٹ ڈپٹ سے ڈرنے لگا تھا۔ تنخواہ کا حساب اس کو پائی پائی جوڑ کر اپنی بیوی کے آگے رکھ دینا پڑتا تھا۔ اور بیوی اس کی ریاضی کے موجودہ اصولوں کے تحت تنخواہ کا حساب دیکھتی تھی۔ کیا مجال جو ایک آدھ پائی بھی ادھر کی ادھر ہو جائے۔ اس کے متعلق کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ "ننھا کیوپڈ اب تیر و کمان کے بدلے گو کھلے صاحب کی ارتھمیٹک کے لئے تنخواہ کے حساب کی جانچ پڑتال کر رہا ہے"۔ اس سے قطع نظر عورتوں کی تعلیم نے ان میں مضمون نگاری کا بھی ذوق پیدا کر دیا تھا۔ اور انھوں نے اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے ان ہتھیاروں کا استعمال شروع کر دیا۔ علامہ اقبال نے بہت خوب کہا ہے ؎

قاعدہ تھا کہ ہوتا تھا اگلے زمانے میں ۔۔۔ ملا کا محتسب کا خدا کا نبی کا ڈر

وہ عورت جو گئے زمانے میں　　مضمون نگار بیوی اور سپاہی کی ماں تھی
اس کی تھی تو مہیب کی داد دی اور نہ گنت پر اکبر طعن کرتے ہیں ؎

حامد و نیکی کی رہتی مکلس سے جب بیگانہ تھی　　اب ہے شمع انجمن پہلے چراغ خانہ تھی

یہ سمجھنا کہ اکبر تعلیم نسواں کے سرے سے مخالف تھے بلکہ وہ مغربی طرز تعلیم کے خلاف تھے۔ انھوں نے تعلیم نسواں کی ضرورت کو تسلیم کیا اور جا بجا اس کا اعتراف کیا کہ وہ روحانی اور اخلاقی تعلیم کے مؤید تھے۔ اسکولوں اور بے پردگی کو وہ لڑکیوں کے حق میں مضر سمجھتے تھے ان کے خیال میں لڑکیوں کو گھر پر ہی تعلیم دینا مناسب تھی مگر استاد ایک نیک نفس اور متقی ہونا چاہئے تھے۔

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر　　خاتون خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہوں
ذی علم و متقی ہوں جو ہوں ان کے منتظم　　استاد اچھے ہوں مگر استاد جی نہوں

دوسرا خیال ان کا یہ تھا کہ قومی زندگی میں عورتوں کو دخیل نہ ہونا چاہئے۔ اس لئے ان کی تعلیم اس طرز پر دی جائے کہ وہ قوم کی خدمت کے لائق بن سکیں بلکہ وہ شوہر کی اطاعت کریں اور آرام پہونچائیں اس کے دکھ درد میں شریک ہوں۔ اس کا غم غلط کریں اور اس کو مفید مشورے دیں اور ساتھ ہی ساتھ اولاد کی تربیت کو نہایت ضروری سمجھیں۔ دنیا کی مہذب قومیں جو عورتوں کو عمدہ مائیں بنانے کی دھن میں سرگرداں ہیں سب متفق ہیں کہ ماں کی گود بچے کا سب سے پہلا مکتب ہوتا ہے اس لئے اگر ماں تعلیم یافتہ ہو اور صحیح اصولوں کے تحت بچے کی نگرانی اور پرورش کرے تو وہ بڑا ہوکر اپنی قوم اور اپنے ملک کی گرانقدر خدمات انجام دینے کی صلاحیت آسانی سے پیدا کرسکا ؎

کون کہتا ہے کہ تعلیم زناں خوب نہیں　　ایک ہی بات فقط کہنا ہے یاں حکمت کو
دو اسے شوہر و اطفال کی خاطر تعلیم　　قوم کے واسطے تعلیم نہ دو عورت کو

یہ خیال بھی غلط ہے کہ اکبر لڑکیوں کی انگریزی تعلیم کے مخالف ہیں۔ البتہ یہ ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ لڑکی کو پہلے امور خانہ داری سکھلائے جائیں جن میں کھانا پکانا سینا پرونا تربیت اولاد و صفائی و صحت کا لحاظ ضرور رکھا جائے اس کے بعد موقع ملے تو اسکو حساب کتاب کی بھی مشق کرائی جائے تاکہ ضروری حساب میں عورت پیچھے نہ رہ جائے اور دوسروں کی دست نگر نہ رہنا پڑے تاریخ و جغرافیہ کی معلومات بھی نہایت دلچسپ ہوتی ہے اور ان سے لڑکیوں کے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے اور وہ اپنے ماحول کو اچھی طرح سمجھ سکتی ہیں آخر میں ہم اکبر کی اس نصیحت پر مضمون ختم کرتے ہیں جو انھوں نے تعلیم یافتہ لڑکیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کی ہے ؎

دانا نے دھن دیا ہے تو دل ہے غنی ترا　　پڑھ لکھ کے اپنے گھر کی بنی ہے بیوی تو
مشرق ہی کے خیال کا معمول ہے ترا　　مغرب کے ناز و رقص کا اسکول اور ہے
دنیا میں لذتیں ہیں نمائش ہے شان ہے　　ان کی طلب کی سارا جہان ہے
اکبر یہ غزل جو اس کا بیان ہے　　دنیا کی زندگی فقط اک امتحان ہے
حد سے جو بڑھ گیا تو ہے اس کا مآل خراب　　آرائش اس کا خوشنما ہے مگر ہوگا کا خراب

---

سید بادشاہ حسن حیدرآبادی

# بے جان سے محبت

از منشی محمد میاں غفران رامپوری

اے مری نازک ادا پیاری مری رنگیں جمال — دیکھ کر ہوتا ہے تجھ کو دل مرا کتنا نہال
چین مجھ کو آئے بے تیرے گھڑی بھر ہو محال — ہو مہارت تجھ کو غمخواری خاطر میں کمال

میری گودی میں رہی ہو ساتھ کھیلی ہو تو ہی
پیاری پیاری چھوٹی چھوٹی سی سہیلی ہو تو ہی

بھولی بھولی شکل و صورت اور وہ دلکش ادا — میٹھی میٹھی یہ نگاہیں یہ سکوت جانفزا
سنتا سب کی گفتگو منہ سے نہ کچھ کہنا ذرا — دل سے بھاتی ہے مجھے اے نازنین شرم و حیا

ہمنشیں اور مونس خلوت سمجھتی ہوں تجھے
سچ تو یہ ہے لائق الفت سمجھتی ہوں تجھے

تجھ سے اے مری اختر کی گڑیا دل بہلتا ہے مرا — تیری صحبت میں مجھے اس سن میں ملتا ہے مزا
فکر دنیا کی نہیں کچھ غم نہیں گھر بار کا — رات دن تو اور تیرا کھیل اپنا مشغلہ

راحت اس دل کی تو ہی آسائش جاں ہے تو ہی
میرے ارمانوں کی محفل ہے مرا فال ہے تو ہی

اے مری نازو کی پالی اے مری زہرہ جبیں — پیکر حسن و وفا ہے اور سراپا نازنین
گو ابھی کمسن ہے لیکن کس قدر ناز آفریں — دل میں گھر کرتی ہے تیری ہر ادائے شرمگیں

انشاء اللہ آئیں سے بڑی ہو تو تری شادی کروں
چاند سے دولہا سے بیاہوں خانہ آبادی کروں

اے مری پیاری سہیلی تو ہے تصویر سکوت — میں ہوں دیوانی تری اے مری تصویر سکوت
کھا گیا دل میرا دل کی تیری شمشیر سکوت — تو ہے اب کنج تنہائی میں زنجیر سکوت

ننھے ننھے منہ سے اے نازآفریں کچھ بولدے
میری چاہت کی قسم ہے اب زباں تو کھول دے

رہتی ہے آغوش شفقت میں مری آٹھوں پہر     جانتی ہوں تجھ کو میں نور نظر لخت جگر
تیرے ہر ساماں آرائش پہ ہے میری نظر     دل کی باتیں صاف کہدے مجھسے کچھ پروا نہ کر
میں نے مانا بولنا تجھ کو ابھی آتا نہیں
کیا اشاروں سے بھی کچھ تجھ سے کہا جاتا نہیں

مری جاں کچھ دن بھی باقی ہے اپنا بچپنا     نوجوانی میں کہاں یہ کھیلنا یہ کودنا
اس مزے کی زندگی کا پھر نہ ہوگا سامنا     نامناسب ہے ترا اسوقت یوں چپ بیٹھنا
اور ہے مہماں ابھی کچھ روز یہ طفلی کا سن
کھیل لیں آپس میں ہم مل بیٹھکر دو چار دن

دیکھ لی تیری ادائے دلنوازی دیکھ لی     ہائے چپ رہنے کی بھی عشوہ طرازی دیکھ لی
اس ادا کے میں تصدق بے نیازی دیکھ لی     بے رخی کیسا تیری فتنہ سازی دیکھ لی
چپکے چپکے دل کو پہنچاتی ہے تو گویا گزند
یہ سکوت بے محل مجھ کو ہے بالکل ناپسند

خیر اگر تجھ کو نہیں منظور منہ سے بولنا     میں بھی اب تجھ سے خفا ہو جاؤنگی او بیوفا
ہٹ مری آغوش سے جا دور ہو او ناسزا     منہ لگایا تھا تجھے میں نے یہ اسکا پھل ملا
ہوگیا معلوم مجھ کو تو وبال دوش ہے
ایک "تصویر سکوت" و "پیکر خاموش" ہے

منشی محمد میاں عنفرآن رامپوری

خانم

# اندھیرا

مصوّر ظرافت جناب مرزا عظیم بیگ چغتائی بی اے، ایل ایل بی (علیگ)

اندھیرا کس قدر شیریں اور پُرفسوں لفظ ہے! جو فوراً ہی واقعات کی کرختگی کو دور کر کے انسان کو تخیل اور جذبات کی دنیا میں لے جاتا ہے! وہاں... جہاں عشق و محبت کے ہوش رُبا واقعات اندھیرے کی پرسکون اور عافیت بخش فضا میں چاروں طرف سایہ کی طرح متحرک نظر آتے ہیں!

لیکن بُزدلوں اور شاعروں کا بھلا ہو کہ خواہ مخواہ اندھیرے کو بدنام کر رکھا ہے۔ یہ نہیں دیکھتے کہ عشق و محبت کی پیدائش کا راز ہی اندھیرا ہے۔ وہ کیسے؟ میں آپ کو بتائے دیتا ہوں

## پہلا اندھیرا

جب کا ذکر ہے کہ ہماری نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ اور دو ایک مرتبہ سے زائد خانم کا اپنے گھر جانا نہ ہونے پایا تھا دریں اثنا عجیب وقت کا سامنا کرنا پڑا۔ بات دراصل یہ ہے کہ جب نئی نئی شادی ہوتی ہے تو لڑکے والے اور لڑکی والے دونوں ایک قسم کی حماقت میں گرفتار ہوتے ہیں۔ لڑکے والے کہتے ہیں کہ جب تک لڑکی کے گھر سے سچ مچ کوئی لینے نہ آجائے اس وقت تک لڑکی کو اُس کے میکے نہ جانے دینا چاہئے۔ چنانچہ یہی ہمارے یہاں ہوا۔ اگر کبھی ہم نے اس بات کا ارادہ کیا کہ لاؤ ہم گھر پہنچا آئیں تو فوراً ہی والدہ صاحبہ نے خوفزدہ ہو کر کہا "نہیں! لو اور سنو! وہاں سے کوئی لینے والا آنا چاہئے"

اب جناب ادھر تو یہ معاملہ اور اُدھر یعنی ہماری سسرال کا یہ حال کہ خانم کی اماں جان ایک سے ایک "جرنگی" رشتہ دار لینے بھیجتیں۔ وہاں سے آدمی کیا لینے آ رہے ہیں، بس یہ معلوم ہو رہا ہے کہ ہم بیٹھے تاش کھیل رہے ہیں اور ہو رہا ہے شاہ کٹ... طرح طرح کی باری آ رہی ہے... کبھی پان کا بادشاہ چلا آ رہا ہے تو کبھی چڑی کا بادشاہ۔ خدا کی پناہ ایک صاحب آئے تھے اُنھوں نے مفلر کو اس زور سے کس کر ڈاڑھی چڑھانے کے کام میں لیا کہ اُس میں سلوٹیں پڑ گئیں جو کبھی نہ گئیں۔ اور خانم سے جو پوچھا تو وہ بولی کہ اُس نے خود ماتھے پر باندھا تھا! ایک اور ایک دفعہ آئے تو ڈنڈ کرنے میں کرسی توڑ گئے۔ اب ظاہر ہے کہ اس قسم کے حضرات خانم کا سفر میں کس کس طرح نہ ناطقہ بند کرتے ہونگے۔ تھرڈ کلاس میں گھُس کر بےخبر ہو جاتے ہیں مگر ادھر کوئی ڈھنگ کا اسٹیشن آیا نہیں کہ پہونچے یہ حضرت۔ جھانکنے سے منع کرنے۔ دہی بڑے وہ نہ لینے دیں۔ چائے یا برف وہ نہ پینے دیں۔ قصہ مختصر اسی قسم کے جھَرُوسوں کے ساتھ خانم کو سفر کرنا پڑا تھا حتیٰ کہ نوبت بہ اینجا رسید کہ آخری مرتبہ جو وہ اسی قسم کے اینٹ کے بادشاہ کے ساتھ گئی تو اُس کے ہوا سر میں درد سفر کی تکان سے اور وہ حضرت خفا ہوئے، ان باتوں کا نتیجہ ظاہر ہے۔ اب جو جانے کا موقعہ ہوا تو کوشش کر کے ہم خود خانم کو لیکر پہونچانے گئے

دوپہر کا وقت تھا جب ہم سسرال پہونچیں ہیں۔ گرمی کے دن تھے عمر میں یہ تیسری مرتبہ ہم سسرال پہونچے تھے کیونکہ ہمیں لینے جانے کی بھی اجازت نہ تھی۔ نہا دھو کر شاندار کھانا کھایا گیا۔ اس کے بعد ہم کمرہ میں پہونچے خانم کے۔

ایک مسہری بہت ہی عمدہ بچھی ہوئی تھی۔ قریب ایک آرام کرسی رکھی تھی۔ مسہری پر ہم لیٹ گئے۔ اور نازو نے پنکھا کھینچنا شروع کیا۔ لیٹے ہی تھے کہ خانم آئی اور مجھے سونے کا مشورہ دیکر چلنے لگی۔

میں نے خانم سے کہا کہ "تم دروازے کمرے کے چاروں طرف سے بند کردو" اُس نے دروازے بند کر دیئے۔ جھلمیاں چڑھا دیں اور کمرے میں ایک دلربا اندھیرا چھا گیا۔ بالکل اندھیرا گھُپ ہوگیا۔ نازو بولی کہ بالکل اندھیرا ہوگیا۔ جھلملی کے باریک باریک سوراخ سے روشنی کی ایک طلسمی سلاخ نکلکر خانم کے چہرہ پر پڑی اور مجھے معلوم ہوا کہ خانم کا دلچسپ چہرہ ہے کہ پارہ تڑپ رہا ہے! خانم نے جُنبش جو کی تو روشنی کا بھالا آنکھوں میں لگا اُس نے آنکھ بچا کر اور مسکرا کر کہا "میں جاتی ہوں۔ یہ نازو پنکھا کھینچتی رہے گی۔ تم سو رہو پڑ کر"

میں نے اس کے جواب میں کہا کہ "پردے بھی کھینچ دو" خانم نے پردے کھینچ دیئے اور ننھے ننھے سوراخوں سے روشنی کی جھلملی اور نرم نرم سلاخیں سب کی سب بند ہوگئیں۔ خانم نے دروازہ کا پٹ آدھا کھولا۔ کمرے میں ایک دم سے روشنی ہوئی مگر فوراً ہی خانم نے باہر سے دروازہ اسی طرح بند کرکے اندھیرا کر دیا۔ میں آنکھیں بند کرکے پڑ رہا۔ پنکھے کی جُنبش کی آواز نیکی کے فرشتہ کے وجود کا قائل کرتی رہی اور میں سو گیا۔

---

میں سو کر اس وقت اُٹھا ہوں جب یہ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ صبح کا تڑکا ہے یا شام کا جھٹپٹا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عقل خراب ہوگئی۔

مگر کمرہ میں بدستور خاموشی تھی پنکھا بدستور چل رہا تھا۔ یہ سسرال تھی کوئی گھر تو تھا نہیں جو ٹانگ پکڑ کر کھینچے جاتے اور اُٹھا دیئے گئے ہوتے۔ اندھیرا ابھی بدستور ہی تھا گو برابر کے دروازہ کا ایک پٹ کھُلا ہوا تھا مگر پردہ پڑا ہوا تھا۔ پھر شام ویسے ہو چکی تھی لہذا اندھیرا بدستور تھا۔ میں نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ معاً خانم کی شیریں آواز برابر کے برآمدے سے کسی دوسری آواز میں اُلجھتی ہوئی یعنی باتوں میں مشغول سنائی دی۔ میں نے کان لگائے تو سنائی دیا۔

"یہ دن بھر نازو تیرے دولہ کے ساتھ کمرہ میں بند رہی؟" (کوئی بڑی بی تھیں)

خانم نے کہا "پنکھا کھینچ رہی تھی"

"آج .... جہا .... آ .... " بڑی بی نے طنز سے کہا "لڑکی تو دیوانی ہوئی ہے"

میں جگہ سے اُٹھ کر دروازہ کے پاس آ کھڑا ہوا۔ نازو کو اشارہ کیا کہ پنکھا اُسی طرح کھینچے جائے۔ اب میں نے جھانک کر دیکھا۔ ایک عدد بڑی بی خانم کے پاس بیٹھی تھیں اور پنکھا اپنے کو اس طرح جھل رہی تھیں کہ ہر دفعہ بال بال اپنی خود کی ناک بچ جاتی تھی۔

خانم نے چہرہ کو متعجب بنا کر کہا "کیوں نانی۔ کیا ہوا؟" (یہ دراصل پڑوسن تھیں)

Good Man Really



مرزا عظیم بیگ چغتائی

Mirza Azeem Baig Chughtai

Murari Art Press, Delhi

"کیا ہوا؟" بڑی بی نے پنکھا جھلنا روک کر خانم کی طرف گھور کر بڑی تیزی سے دو تین دفعہ اپنی ٹھوڑی سے ناک کی پھننگ چھوئی اور پھر خود ہی بولیں "کچھ ہوا ہی نہیں؟۔۔۔ خیر!۔۔۔ نازو کو سسرال لے گئی تھی نا؟"

خانم بولی۔ "جی ہاں"

"کیوں؟" بڑی بی نے پلنگ پر پنکھا مار کر خانم سے سوال کیا۔

خانم نے کہا۔ "کام کرنے کے لئے۔ اپنا آدمی۔۔"

خانم کا اتنا کہنا تھا کہ بڑی بی نے بڑی تیزی سے پان کو اس کلے سے اس کلے میں کیا۔ چہرہ پر زلزلہ کے آثار پیدا کئے۔ پنکھا پلنگ پر پٹک کر خانم کا بازو پکڑ کر جھنجھوڑ کر ایک پر احتجاج مگر خاموش لہجہ میں کہا۔

"اری کمبخت سمجھ کر۔ رہنگی۔۔۔ دیکھ سمجھ یہ نازو ایک دن تیرا ہی چونڈا مونڈے گی۔۔۔ پتلی ہے غضب کی وہ تو۔۔۔ دیکھتی نہیں ہے تو۔۔۔ اٹھتے اٹھتے تو زہرک رہا ہے۔۔۔ بال بال اُس کا پھڑکتا ہے۔۔۔ ہے نا میرا کسن آخر کو"

معاً یہ الفاظ سنتے ہی مجھے نازو کی طرف دیکھنا پڑا۔ یہ دیکھنے کو کہ غضب کی پتلی کیسی ہوتی ہے۔ اس نے فوراً نظریں نیچی کر لیں۔

ادھر خانم کو میں نے دیکھا۔ بڑی بی کا کہنا اُسے بُرا لگا۔ کیوں؟ کیا یہ میری بچی محبت کی توہین نہ تھی؟ تھی اور ضرور تھی پھر کیوں نہ میری پیاری رفیقہ حیات بُرا مانتی۔ اُس نے بڑی بی سے کہا:۔

"خدا کے لئے آپ کیسی باتیں کرتی ہیں"

"کیسی باتیں کرتی ہوں؟"

خانم بولی "وہ (مطلب اس خاکی پتلے سے) خدا نہ کرے ایسے ہوں۔ پھر نازو۔۔۔ صورت نہ شکل بھاڑ میں سے نکل"

بڑی بی بولیں۔ وہ بھی کچھ تیز ہو کر "لڑکی۔۔۔ میرے بال دھوپ میں سفید ہوئے ہیں؟ سانپ کا بچہ ہوتا ہے خصم۔ سانپ پر بھروسہ کرنا ٹھیک نہیں۔ جٹ سے کاٹ لیگا۔ جو بھروسہ کرو گی۔ تو بھلا کس گنتی میں ہے۔ سچ سچ کی خوبصورتوں اور پریوں کو چھوڑ کر جیتوں۔ نے چڑیلوں کو گھر میں ڈال لیا۔ رہ گئی تو صورت شکل تو نازو کی اُٹھتی جوانی ہے۔ حمیدن سے تو لاکھ درجہ اچھی ہے۔ جس نے اسلامی کے میاں کو اُلّو بنا دیا۔ ذرا ہوش کی دوا کر تو۔ دیکھتی نہیں ہے تو نازو کی آنکھیں۔ زہر بھرا ہے"

میں نے فوراً کنکھیوں سے نازو کو دیکھا۔ اُس کی زہریلی آنکھوں کو۔ اتنے میں خورشید امن صاحبہ کی آواز آئی اور مجھے پوچھا تو میں دبے پاؤں لپک کر پلنگ پر لیٹ گیا۔ نازو گردن نیچی کئے پنکھا جھل رہی تھی میری نظر اس پر گڑ گئی۔ گو اندھیرا تھا مگر میں نے دیکھا۔۔۔ یہ دیکھا کہ نازو کی اُٹھتی جوانی ہے! مجھے اب پتہ چلا! اُس کے خوبصورت مگر پیچ دہانہ کو دیکھا کہ جو اس کان سے اُس کان تک چلا گیا تھا۔ موٹے موٹے ہونٹ جوانی کا گلدستہ تھے۔

ناک البتہ نہیں دکھائی دی۔ کیونکہ دن ڈھلے روشنی میں اُس کا دیکھ لینا کبوتر کی نظر کا کام تھا۔ رہ گئیں آنکھیں تو ایک چمک اُن کی اندھیرے میں بھی دیکھی۔ زہر کا چھلکتا ہوا پیالہ تھیں!

اوّل نمبر کی چڑیل ہے یہ" میں نے دل میں کہا۔" آئی وہاں سے ہماری خانم کا چونڈا مونڈنے۔ مارے جوتوں کے فرش گردوں گا۔ بہت دیکھی ہیں ایسی اُٹھتی جوانی کی چڑیلیں اور زہریلی آنکھوں والی خوبصورت لڑکیاں۔"

خانم اتنے میں کمرہ میں داخل ہوئی۔ بولی۔ "غضب ہے خدا کا سوتے چلے جاتے ہو۔" دروازے مُڑ کر اُس نے کھولدیئے۔ میں نے اپنی پیاری رفیقہ حیات کے بشاش چہرہ کو دیکھا۔ ایک پھول تھا کھلا ہوا۔

---

دوسرے روز ہی میں واپس آیا۔ پندرہ بیس روز بعد ہی خانم کا خط آیا کہ جی گھبراتا ہے کوئی ترکیب نکالو بلالو۔ یہاں سوائے اس کے کیا ترکیب ہو سکتی تھی کہ لیٹ گئے لمبے لمبے بنکر۔ پانی بہت سا پی کرتے کردی اور رات بھر غل مچایا۔ دوسرے روز والد صاحب نے تار دلوا دیا۔ خانم کو اور ایک صاحب اُس کو لیکر آ پہنچے۔

میں نہیں بیان کر سکتا کہ میرا کیا حال تھا۔ خانم کا تانگہ کمرہ کے باہر رکا جہاں میں بنا ہوا بیمار پڑا تھا۔ اس کے ہونٹ کی شیریں آواز آئی۔ مگر سوال یہ تھا کہ نازو بھی آئی یا نہیں۔ چشم زدن میں نازو اور نازو کی مالکہ دونوں سامنے تھیں۔ میں نے لیٹے ہی لیٹے ہاتھ اُٹھایا۔ خانم نے گرمجوشی سے مسکراتے ہوئے دبایا۔ پیشانی پر میرے ہاتھ پھیرا۔ وہ نازو کو ساتھ لائی تھی اس وجہ سے میرے دل میں محبت کا میٹھا میٹھا درد ہونے لگا۔ اگر نازو کو نہ لاتی تو مجھے بے انتہا صدمہ ہوتا کیوں محض اس وجہ سے۔ بلکہ اس وجہ سے کہ میری محبت کی قدر نہ کی۔ مجھے سانپ سمجھا۔ میں خوش اور بیحد خوش تھا اس لئے کہ میری پیاری رفیقہ حیات کا میرے اوپر بھروسہ ہے۔ قصہ مختصر میں اپنی خوشی کا الفاظ میں اظہار نہیں کر سکتا۔ میری بیوی محبت کے امتحان میں کامیاب اُتری!

---

# دوسرا اندھیرا

بدقسمت ہیں وہ احمق جو اپنی ننھی منی بیویوں سے سر کے بال منواتے ہیں یا سر میں تیل ڈلواتے ہیں۔

شام کا جھٹپٹا تھا۔ دسمبر کا مہینہ اور جاڑوں کی شام۔ ہوا میں خنکی تھی۔ باہر برآمدہ کے سامنے میں کرسی پر بیٹھا تھا اور اُٹھ کر اندر جانے والا ہی تھا کہ خانم نے میری پُشت پر پہونچ کر میرے سر کے بالوں میں اپنی نرم نرم اور رچیلدار انگلیاں نکا کنگھا کیا۔ سر کے بال کرید کر کہا "خدا کی پناہ! تمہارے سر میں خشکی کتنی ہے۔"

میں نے لاپرواہی سے اُٹھتے ہوئے کہا "رہنے دو!"

مگر خانم نے مجھ سے کہا "میں ابھی ابھی تیل ڈالوں گی" اور یہ کہکر مجھے روکا:

مجھے سر میں تیل ڈالنے سے نفرت ہے۔ میں نے انکار کیا مگر اُدھر کے اصرار کے آگے! نتیجہ یہ کہ خانم نے مجھے

کمرہ میں لا بٹھایا۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا اور چشم زدن میں میرے سر پر تیل ملا جانے لگا۔

بیوی سے سر میں تیل ڈلواتے وقت ایک "فنا فی القوم" کہاں سے کہاں پہونچ سکتا ہے۔ یہاں اس سے بحث نہیں ہے بلکہ سوال یہ ہے کہ اندھیرا ہونے پر بھی بغیر روشنی کی امداد کے یہی عمل جاری رہے گا۔ پھر بدقسمتی سے تیل ختم ہوگیا۔ میں نے ساتھ ہی اندھیرے کی طرف توجہ دلائی۔ خانم شیشی لیکر اُڑ گئی۔ "ابھی آئی!" یہ کہکر تیل لینے دنشاید والدہ صاحبہ کی طرف سے) گئی۔ میں نے آواز دی کہ "لالٹین بھی" کیونکہ لیمپ اور لالٹینیں تیل بھرنے اور صاف ہونے کے لئے اپنے مرکز پہ جاتی تھیں اور یہ شام اس وقت تک واپس بھی آجائیں مگر اس وقت یہاں نہ تو لیمپ تھا اور نہ لالٹین۔

میں اُس وقت کمرہ میں تن تنہا بیٹھا تھا۔ کمرہ کے باہر درختوں کی شاخیں تاریکی میں ڈوب چکی تھیں سامنے کا میدان ایک تاریک ہیولا سا ہوتا جا رہا تھا۔ کمرہ میں تو بالکل اندھیرا گھپ تھا۔ دور سے پرندوں کے بسیرا لینے کی آوازیں کان میں آرہی تھیں قصہ مختصر اندھیرا اپنی پرفسون چادر میں دنیا جہان کو چھپا رہا تھا ایک عالم خموشی تھا اور میں اندھیرے کے طلسمی اثر سے بت کی طرح خاموش تھا۔ اندھیرا کیا تھا ایک دلفریب تخیل تھا کہ اس میں بہت جلد میں گم ہوتا معلوم ہوا جس کی بیکاری اور آنکھ کی لاچاری یہ دونوں چیزیں اندھیرے کو سچ مچ کا طلسم بنا دیتی ہیں۔ ایک سکون قلب کے ساتھ نیم باز آنکھوں میں غنودگی کا سا عالم لئے ہوئے میں بیٹھا تھا کہ تیزی سے بائیں جانب سے خانم داخل ہوئی یہ بھی گویا اس اندھیری دنیا کے پروگرام کا ایک حصہ معلوم دیا لہذا میں خاموش کا خاموش رہا۔ لالٹین کی چمنی اُٹھانے کا کھٹکا ہوا تو میں گویا ایک دم سے چونک پڑا مڑکر (ایک لمحہ کے لئے) میں نے دیکھا کہ خانم میری طرف سے پشت کئے بیٹھی لالٹین روشن کر رہی ہے اور کہا: جلدی کرو۔

چشم زدن میں لالٹین روشن ہوگئی۔ میری پشت کی طرف لالٹین تھی۔ اور میں نے اپنی اور کرسی کی عظیم الشان پرچھائیں کو سامنے دیوار پر دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ دیوار پر خانم کی پرچھائیں پڑی اور میں نے دیکھا کہ شیشی میں سے تیل نکالا شیشی رکھی اور میں نے بائیسکوپ کی طرح پرچھائیں میں دیکھا کہ وہ میرے سر پر تیل بڑا مالش ہو رہی تھی۔

مالش کے شروع ہوتے ہی ہاتھوں کی لازمی جنبش اور جسم کے حرکات و سکنات کی جو کچھ بھی کیفیت سامنے دیوار پر بصورت پرچھائیں موجود تھی وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

اس بائیسکوپ سے محفوظ ہونے کے لئے اول تو میں نے سامنے کی پرچھائیں کو دیکھ دیکھکر اس کی کوشش کی کہ خانم کو دق کروں اور اپنی انگلی اپنے سر پر سے لیجا کر آنکھوں کے سامنے نچائی۔ میں نے پرچھائیں کو دیکھا کہ کس طرح میرا وار خالی گیا۔ میں نے بار بار کوشش کی اور بار بار میرا وار خالی گیا۔ اب میں نے سوچا کہ یوں معاملہ ٹھیک نہ رہے گا بیخبری میں اُس کی ناک پکڑنی چاہئے۔ چنانچہ پرچھائیں کو غور سے دیکھتا رہا۔ ایک ذرہ داہنی طرف جو سر مڑا ہے تو ناک کا سرا پرچھائیں میں نظر آیا اور میں نے لپک کر ناک پکڑ ہی تو لی اور ایک قہقہ کے ساتھ مڑا جو ہی تو ...... اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے! ......
یہ تو نازو تھی!

حجاب اور شرم کے ساتھ پریشانی۔ اور اُس کے ساتھ ہی میں نے دیکھا کہ اُس کے بدصورت اور موٹے لبوں پر ایک سکنڈ پیشتر مسکراہٹ ہونے کے تمام آثار موجود تھے۔ اُس کی نظر نیچی تھی۔ اور میں الگ خفیف ہو رہا تھا۔

رفع گھبراہٹ کے لیے میں نے تفصیل پوچھی تو اُس نے بتایا کہ خانم کو والدہ صاحبہ نے ضرورت سے باورچی خانے میں روک لیا اور اُس نے تیل کی شیشی دیکر کہا کہ جلدی سے جاکر روشنی کرکے میرے سر میں تیل لگا دے۔

میں نے سرزنش کے طور پر اُس سے کہا "پھر تجھے سانپ کیوں سونگھ گیا"

ظاہر ہے کہ مالش ختم ہوگئی اور میں نے اُس سے کہا کہ بھاگ جاؤ وہ ہوا ہوگئی

—— x —— x —— x ——

میں تنہا کرسی پر بیٹھا غور کر رہا تھا۔ کچھ متردد اور شاید کچھ تھوڑا سا رنجیدہ بھی کہ اتنے میں خانم آئی اور کمرہ میں روشنی اور زندگی کا نور پھیل گیا۔

خانم نے مجھ سے دریافت کیا کہ نازو نے ٹھیک مالش کی یا نہیں اور میرے جواب بالثواب پر اُس نے والدہ صاحبہ کے روک لینے کا عذر پیش کیا۔ میں نے خانم سے نازو والی غلط فہمی کا ذکر تک نہ کیا شاید یہ سوچکر خدا معلوم یہ کیا سوچے گی۔ میں جانتا تھا کہ اس منحوس نانی نے بدظن کر ہی دیا ہے۔ میں اگر کہونگا تو خواہ مخواہ بات بڑھ جائیگی۔ لہذا اس کو یہیں ختم کردو۔

اس کے تیسرے دن۔

اتوار کا دن تھا برآمدہ کے سامنے چبوترہ پر کرسی پر بیٹھا ہوا میں نہاکر تولیہ سے سر خشک کر رہا تھا نرم نرم دھوپ چھٹکی ہوئی تھی اور بدن میں غسل کے بعد دھوپ کی خوشگوار سینک محسوس ہو رہی تھی قریب ہی بیٹھی ہوئی نازو خانم کے جوتہ پر پالش لگا رہی تھی۔ خانم کمرہ کے دروازہ پر رنگین پالش کر رہی تھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خانم نے میرے سر کی خشکی کے خلاف جہاد بول دیا تھا۔ فوراً نازو سے پکار کر کہا کہ میرے سر میں تیل ڈال دے یہ تو کیونکر کہتا کہ نازو سے اب یہ خدمت کبھی نہ لونگا۔ لہذا کہدیا کہ تھوڑی دیر بعد ڈالونگا۔ یہ سوچکر کہ جب تک خود اُسے فرصت ہو جائیگی۔

خانم نے اس دروازہ پر اپنا کام ختم کیا تو اندر جانے والے دوسرے دروازے پر پہونچی نازو نے دوسرا جوتا شروع کیا ہی تھا کہ "سلام علیکم" کہکر۔ رفیق آن دھمکے نازو کو اس طرح میری نگرانی میں مشغول دیکھکر انگریزی میں بولے۔

"اُس کی آنکھیں بہت اچھی ہیں"

معاً مجھے اُن منحوس نانی کا جملہ یاد آگیا کہ ان آنکھوں میں زہر ہے لہذا میں نے بھی انگریزی میں کہدیا کہ "اینڈ پوائزنس ٹو" (اور زہریلی بھی)

وہ بولے "بیشک.... مگر یہ دن دہاڑے!.... کیا چوروں پر اُلو کی لکڑی پھیر دی"

میں نے نازو کو سگرٹ کے بہانہ سے بھگایا اور اُن سے آہستگی کی فرمائش کرکے کہا کہ "احمق ہو تم"

رفیق بولے "اس وقت ہم تمہاری جگہ ہوتے اور تم ہماری جگہ تو بجائے ہمارے تم احمق ہوتے"

میں نے پوچھا۔ اس سے کیا مطلب ہے تمہارا"

انھوں نے جواب دیا۔ تصنع کو توڑا لو چوٹھے ہیں اب یہ بتاؤ کہ کچھ ڈر سے بھی ڈالے اس پر؟

کچھ تو بناوٹی اور کچھ واقعی قدرتی تھی میں نے رفیق کو ان کی صحافت کی طرف توجہ دلائی۔ اپنی پارسائی

کا حوالہ دیا۔ نازو کو کریہ المنظر ثابت کیا۔ دبے چھپے الفاظ میں خانم کے حسن و خوبصورتی کا اعادہ کیا، اور یہ کوشش کی کہ اس قسم کے خیالات دل میں لانا لغو ہیں۔

رفیق ایک ضدی آدمی ٹھہرے۔ منطقی دلائل کی انھوں نے جھڑی لگا دی۔ ایک طرفہ بحث کا آغاز ہو گیا۔ امور تنقیح طلب سے متعلق ماں کی ناک اور ہونٹھ اور آنکھیں قرار دی گئیں اور اس کو دوبارہ پان کے بہانہ سے طلب کیا گیا۔ وہ پان لائی تو رفیق نے اس کو اس قدر غور سے دیکھا کہ بوجہ پریشانی اس کے ہاتھ سے پان کی تھالی چھوٹ پڑی ہوتی وہ تو چلی گئی اور میں نے فوراً ہی دوبارہ اس نے بدصورت چہرہ پر روشنی ڈالی اور رکھے الفاظ میں خانم کے ہوتے ساتے اس کو خوبصورت یا غیر بدصورت۔ رفیق نے بحث کا پہلو نکل ہی نزالا اختیار کر لیا۔ انھوں نے میری تمام دلیلیں یہ کہکر رد کر دیں کہ بیوی کا اور کسی دوسری عورت کا تقابل ہی ایک مہمل سے سے معنی ہے وجہ اس کی یہ کہ بیوی تو اپنی ہے ہی یہ ظاہر ہے کہ میری تمام دلیلیں از خود دھوئیں نازو کے مقابلہ میں اب کوئی دوسرا موجود ہی نہ تھا۔ لہذا یہ جاننا پڑا کہ نازو ... بس ٹھیک ہے۔"

جب یہ طے ہو گیا کہ ٹھیک ہے تو سوال تھا کہ اب کیا کیا جائے۔ میں نے تجویز کی کہ کچھ نہ کیا جاوے۔" اور انھوں نے تجویز کیا کہ محض ان کی خاطر محض ان کے کہنے سے۔ محض ان کی فرمائش پر کم از کم یہ تو جانچ لینا ضروری ہے کہ آخر کو میرا اس سے بد معاملہ بھی ہے یا نہیں۔ وہ اس طرح کہ کسی موقعہ پر اس سے کچھ کہا جائے۔ کیا کہا جائے، وہ بھی مجھے رفیق نے بتا دیا اور مجھ سے پختہ وعدہ لیلیا۔

——— × ——— × ——— × ——— × ———

اس کے دوسرے تیسرے روز رفیق ملے۔ پوچھنے لگے کہ نازو سے کہا بھی کہ نہیں میں سچ مچ بھول ہی گیا تھا پھر میں نے سوچا تو نامناسب معلوم ہوا کہ کہیں خانم سے کہدے تو اور مصیبت میں جان پڑ جائے۔ چنانچہ میں نے رفیق سے وجوہات بیان کئے انھوں نے خفا ہو کر مجھے ایک ڈانٹ پلائی اور کہا "تم بڑے ناتجربہ کار ہو" یہ کہکر پھر مجھ سے پختہ وعدہ لے لیا۔ اس کے چوتھے ہی روز ایک عجیب معاملہ پیش آیا۔

# تیسرا اندھیرا

(دسمبر کا مہینہ تھا اور رحھاوٹ کی رات۔ ننھی ننھی بوندیں باہر درختوں پر گر گر کر راگ گا رہی تھیں۔ ٹھنڈی ہوا کا سنسناتی اور اون کو کاٹتا ہوا جا کر ہڈی کے گودے پر بولتا تھا۔ بلا کی سردی تھی

کمرہ چاروں طرف سے بند تھا۔ خانم نے کھڑکی کھول کر باہر دیکھا اور مجھے بھی دکھایا گھنگور گھٹا چھائی ہوئی تھی ہوا سائیں سائیں کر رہی تھی دور تک۔ سامنے بنگلہ کے جنگل اور کھیت کا سماں ایک خوفناک تاریکی میں ڈوب کر رہ گیا تھا۔ اندھیرے کے خوفناک ہوکا راج تھا بڑی بھیانک اور اندھیری رات تھی۔ وہی اس تاریکی کی ہیبت کا اندازہ لگا سکتے ہیں جن کا کمرہ مکان سے بالکل علیحدہ ہو اور اس کا رخ جنگل کی طرف ہو۔

خانم نے اس تاریکی اور وحشت خیز "اندھیرے" کو دیکھا۔ ایک پھریری لیکر کہا "خدا کی پناہ!" اور کھڑکی بند کر دی۔

——— × ——— × ——— × ——— × ———

لطف یہ کہ ابھی شام ہی تھی۔ دس بھی نہیں بجے تھے اتنے میں نازو کھانا لیکر آئی کچھ سردی کی وجہ سے خانم کے سر میں درد تھا۔ لہذا خانم نے کھانے سے انکار کر دیا بجائے کھانے کے خانم نے کہا کہ میں ہریرہ پیوں گی۔

سولہ باداموں کو پیکر چھٹانک بھر مکھن میں مصری ملا کر گھونٹ گھاٹ کر بگھار کر لی جائے تو سر کا درد کافور ہو جاتا ہے مجھے کھانا کھلا کر نازو ہریرہ تیار کرنے گئی۔ اور ادھر میں نے چھوٹی میز اپنے سرہانے رکھکر اس پر لیمپ رکھا اور تکیہ سے لگ کر کلاس کی ایک کتاب پڑھنے لگا۔ خانم نے اول تو کس کر اپنے ماتھے پر رومال باندھا اور پھر اپنے پلنگ کا پردہ آہستہ سے اٹھا کر کہ کہیں جنبش سے درد نہ بڑھ جائے لحاف میں اپنے اچھی طرح سمٹ کر لیٹ گئی۔

رات کا سناٹا تھا۔ باہر سے ہوا کی تیزی کی آواز آ رہی تھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تاریکی اور درختوں سے لڑائی ہو رہی تھی۔ میں نے خانم کی طرف دیکھا۔ پردے کی جالی سے اس کے چہرہ پر جنبش تھی اور روشنی اس کے سنجیدہ اور پاکیزہ چہرہ پر ناچ رہی تھی۔ کس قدر خاموش لیٹی ہوئی تھی۔

پانچ منٹ بھی مشکل سے گذرے ہونگے کہ خانم نے کہا۔

"تم زور زور سے مت پڑھو۔ ہمارے سر میں درد ہوتا ہے"

خانم کا کوئی ایسا رشتہ دار تو میں تھا نہیں جو اس بات پر خفا ہوتا۔ میں تو شوہر تھا۔ گنگنا کر آہستہ آہستہ پڑھ رہا تھا۔ جواباً میں نے خانم کی طرف بغیر دیکھے ہوئے کہا۔ "ہشت" لیکن پھر بھی گویا تعمیل حکم میں اس سے بھی آہستہ آہستہ پڑھنے لگا۔

اس طرح کوئی پانچ منٹ بھی نہ گذرے ہونگے کہ لیمپ کی بتی گویا ہوئی ..... "بھق"

خانم چونک پڑی اور بولی۔ "ارے"

میں نے خاموشی سے ذرا لیمپ کی بتی کو کم کیا۔ خانم نے اپنے تکیہ پر کہنی ٹیکا کر لیمپ کی طرف سے کچھ حراساں ہو کہا۔ "یہ لیمپ بجھ جائے گا"

"بجھ جانے دو" میں نے لاپرواہی سے کہا اور پھر کتاب کی طرف توجہ کی۔ خانم بھی بدستور لیٹ گئی۔

اتنے میں نازو ہریرہ لیکر آئی۔ میں نے خانم کی طرف پر معنی نگاہ ڈالی۔ خانم سمجھ گئی مسکرا کر تصنع سے بگڑ کہنے لگی۔ "پھینک دونگی پیالہ" میں نے کہا۔ "خدا کے واسطے یہ دوا ہے اسے پی لو۔" وہ ہنسی کو روکتی رہی اور آہستہ آہستہ پینا شروع کیا۔ میں بار بار خانم کو دیکھ رہا تھا اور مسکرا رہا تھا۔ اس نے کہا۔ تمہاری نظر لگ جائے گی۔ یہ لو۔ یہ کہکر باقی بچا ہریرہ بڑھا دیا۔ میں سچ مچ اس کا منتظر تھا۔ میں نے لے لیا اور ادھر پیالہ منہ سے لگایا ہے کہ لیمپ کی بتی پھر بولی زور سے "بھق" ۲۱ دفعہ ایسے کہ خانم سچ مچ اچھل پڑی۔ میں نے پھر بتی کم کر دی۔

لیمپ اب خاموشی سے جل رہا تھا۔ خانم کے سرہانے جالی میں نازو بیٹھی خانم کا سر دبا رہی تھی مگر دو دفعہ بتی کم کرنے کی وجہ سے روشنی کم تھی آہستہ سے میں نے بتی ذرہ تیز کی لیمپ بدستور خاموشی سے جلتا رہا۔

لیمپ خاموشی سے کوئی پندرہ منٹ جلتا رہا۔ خانم کی آنکھیں بند تھیں کہ ایکدم سے لیمپ نے "بھقا تا تا رارا" خانم اچھل پڑی اور لیمپ نے اب بھڑکنا شروع کیا۔ میں نے بتی کم کر دی تو اس نے پھریریاں لینی شروع کیں۔ ننھی ننھی پھریریاں چھوڑ کر دیپک کا راگ گانے لگا۔ اب جو میں بتی اور کم کرتا ہوں تو وہ زیادہ ہوتی ہے۔ "بھق بھق" کر کے انجن کی طرح لیمپ نے آخری سانس لئے اور "بلیک لیک" کے ساتھ گل ہو گیا۔ اندھیرا گھپ!

خانم نے نازو سے کہا۔ "کمبخت لا جلد دیا سلائی کی ڈبیا۔"

میرے تکیہ کے نیچے دیا سلائی نہیں ملی۔ نازو سامنے الماری سے دیا سلائی کی ڈبیا لینے گئی۔ دیا سلائی کا ملنا بہت آسان تھا۔ الماری کے اوپر کے تختہ میں بائیں ہاتھ کو جہاں گلاس رکھا رہتا ہے اس سے ذرا ہٹ کر بسکٹ کے پاس ہی چار پانچ چیزوں کے درمیان کہیں نہ کہیں دیا سلائی کی ڈبیا بھی رکھی ہے اور بالفرض وہاں نہ ملی تو نیچے والے تختہ میں تو ہونا اس کا لازمی ہے۔

—— × —— × —— × —— × ——

اب نازو کو خانم دیا سلائی کا پتہ پہ پتہ دیتی ہے۔ مگر اس اندھی کو دیا سلائی ملتی ہی نہیں اور ادھر اندھیرے کے ملسے خانم کا جی ہے کہ الٹا آتا ہے اندھیرے کا یہ عالم کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سجھائی دیتا۔ میں نے تیسرے پہر کو خود دیا سلائی الماری میں رکھی دیکھی تھی۔ حتیٰ کہ اس اندھیرے میں مجھے معلوم ہو رہا ہے کہ جیسے وہ رکھی ہے۔

خانم نے اور میں نے جب دیکھا کہ اندھی نازو کو دیا سلائی نہیں ملیگی تو ادھر میں اٹھا اور ادھر وہ نازو کو کوستی ہوئی اٹھی خانم نے مجھ سے اندھیرے میں کہا۔ "تم کدھر ہو؟" اور یہ کہتی ہوئی مسہری سے اٹھی۔

میں نے کہا۔ "یہ کیا ہوں میں۔ . . . ادھر۔"

خانم رینگ کر ٹٹولتی ہوئی آگے پہونچی اور ایک انتظام کے ساتھ کرسی میں الجھ کر گری۔ ایک تو دردِ سر پھر اندھیرے کی تکلیف۔ اور دیا سلائی نہ ملنے کی کوفت۔ اس پر اسطرح گرنا۔ لہذا میرا فرض کیا ہوا؟ یہی کہ میں لپکا خانم کو سنبھالنے ادھر نازو نے دیکھا کہ اس کی مالکہ گری اور دھڑام سے گری لہذا وہ بیچاری بھی خانم کو سہارا دینے یا اٹھانے بڑھی مگر اندھیرا تو جیسا اندھیرا ہی ہوتا ہے نتیجہ یہ کہ خانم کے دھوکہ میں اندھیرے میں مجھ سے خانم کی بجائے نازو پر دستِ شفقت پھر گیا! اور ساتھ ہی خانم جھنجلا کر اٹھی ہی تھی! اس نے نازو سمجھکر دیا ایک دھموکا میری پیٹھ پر کس کر یہ کہکر کہ "کمبخت کو دیا سلائی ہی نہیں ملتی۔"

ادھر میرے "امداد رساں" ہاتھوں سے نازو "ایک ہوں" کر کے ہٹ گئی کہ میں خانم کا گھونسا کھا کر چلایا۔ "پگلی کہیں کی [illegible] ہوں۔"

خانم کے منہ سے نکلا "ارے" اور اندھیرے میں ہم دونوں کے قہقہوں کی آواز سے کمرہ گونج گیا۔ خانم کا مارے ہنسی کے [illegible] "کدھر ہو تم؟" اس نے ہنسی کو روکتے ہوئے کہا۔

[illegible] "ہو رہے" میں نے کہا۔

"خدا کے واسطے دیا سلائی ۔ ۔ ۔ ۔ اسے کمبخت کو ملتی ہی نہیں دیا سلائی۔"

اتنا کہکر خانم خود الماری کی طرف بڑھ گئی کچھ کھٹ پٹ کی آواز آئی اور پھر دیا سلائی کے بکس کی کھڑکھڑاہٹ کی آواز۔

"اسے کمبخت کو دیا سلائی ہی نہیں ملتی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ لو" یہ کہکر خانم نے دیا سلائی دینے کو میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ حماقت تو دیکھئے خود نہ جلائی کیونکہ دوسرے ہاتھ سے بسکٹ کا ڈبہ اور گلاس وغیرہ سنبھالے تھی۔ اب واقعہ یہ ہے اور میں صحیح عرض کرتا ہوں کہ بوجہ سخت اندھیرے سے آنکھوں میں تو تارے ناچ رہے تھے اور زیادہ سے زیادہ خالی سایہ کی طرح خانم اور نازو کا وجود سیاہی میں ایک تخیل کی طرح حرکت کر رہا تھا۔ ادھر خانم نے میری طرف دیا سلائی والا ہاتھ بڑھایا اور دیا سلائی سچ مچ میری عینک کے پاس پہونچی مگر مجھے خبر نہیں اور میں نے جو ادھر سے دیا سلائی لینے کو ہاتھ بڑھایا تو بدقسمتی تو ملاحظہ ہو کہ وہ پہونچا نازو کے کان کے گرد و نواح میں اور کان کی مالکہ خانم کو سمجھکر میری نالائق ہاتھ نے لگے ہاتھوں کان کے مغربی سمت کے صحرا کی بادیہ پیمائی کا خیال ہی جو کیا تو کان تو تھا نازو کا لہذا اس نے ایک دبی اور گھٹی ہوئی اونھ کے ساتھ میرے ہاتھ کو جو ہاتھ سے تیزی سے جھٹکا تو خانم کا ہاتھ جو دیا سلائی لئے میری عینک کے پاس آ چکا تھا ایک جھٹکے سے دیا سلائی اور عینک کو اڑاتا ہوا چلا گیا! "ارے میری عینک! بوکھلا کر میں نے ناک اپنی ٹٹولتے ہوئے کہا۔

"چڑیل کمبخت۔ یہ کیا ہوا! ۔ ۔" خانم کے منہ سے نکلا۔

میں نے کہا "ہٹنا مت اپنی جگہ سے ورنہ میری عینک کی خیر نہیں کھڑی رہو جوں کی توں"۔ خانم نازو پر برس پڑی۔

"اری کمبخت یہ تو نے اتنے زور سے کیوں ہاتھ چلایا؟ اندھی کہیں کی ۔ ۔ ۔ آئی وہاں سے پٹہ بازی کرنے ۔ ۔ ۔ اری بولتی کیوں نہیں کمبخت ۔ ۔ ۔ یہ اندھیرے میں کوئی ہاتھ نچاتا ہے ایسے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ بات کیا تھی"۔ ۔ ۔ وغیرہ وغیرہ۔

میں اوپر اپنی عینک ٹٹول رہا تھا۔ خانم بولی "تم کیا عینک ڈھونڈ رہے ہو؟"

میں نے کہا "ہاں"۔

وہ بولی "وہ تو میں سمجھی ہی تھی۔ اندھیرے میں عقل بھی کھو بیٹھے۔ ارے پہلے دیا سلائی دیکھئے"۔ میں نے کہا "تم خود احمق ہو رہی۔ میں تو ڈھونڈ رہا ہوں۔ دیا سلائی ہاتھ پڑ جائے تو کیا چھوڑ دوں گا اُسے"۔

"یہ تو میں بھی جانتی ہوں۔ مگر دیا سلائی ادھر کہاں ہو سکتی ہے۔ ۔ عینک کو چھوڑ و اور ادھر دیکھو دیا سلائی کو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کدھر ہو؟ ۔ ۔ ۔ ۔ گرے اب تم بھی الجھ کر ۔ ۔ ۔ ۔ (نازو سے) کدھر گئی کمبخت ۔ ۔ ۔ دیکھ رہی ہے بیچ میں سے کرسی نہیں ہٹا دیتی ۔ ۔ ۔ ۔ ادھر کر دے ۔ ۔ ۔ ۔ یہ ادھر ۔ ۔ ۔ ۔ تو مت ڈھونڈھ کچھ ۔ ۔ ۔ ۔"

اب بدقسمتی ملاحظہ ہو کہ خانم کی کرسی بتانے کی غلطی تھی یا اس اندھیرے میں خود نازو کا اندھاپن۔ کچھ ہی ہو۔ میں جھکا ہوا تھا اور جسے اس نے کرسی سمجھا وہ یہ خاکسار تھا چنانچہ نازو نے کرسی کے دھوکہ میں اب پکڑی میری ناک! مگر جس طرح جلتے توے کو آدمی چھوتے ہی نہیں بلکہ چھونے سے پیشتر ہی چھوڑ دیتا ہے یا ہاتھ خود بخود اچھل جاتا ہے۔ اسی طرح نازو کے ساتھ ہوا کہ میری تھوڑی پر زور کا ایک گھسا لگا "ارے" میری زبان سے نکلا۔

مگر ساتھ ہی بجھے دیاسلائی مل گئی اور جلدی سے میں نے دیاسلائی کھینچکر گویا دن کر دیا۔ دیاسلائی میرے سر پر تھی اور اس کی روشنی خانم اور نازو پر پڑی۔ دونوں کی آنکھیں چوندھیا سی گئیں۔ میں نے دیاسلائی کی بجھتی ہوئی روشنی میں نازو کے چہرہ کو دیکھا جب اس نے میری عینک اُٹھا کر دی۔ اس کی آنکھوں میں خانم کی پڑوسن نانی والا زہر سا دکھائی دیا۔ خانم نے دیاسلائی کا بکس مجھ سے لیکر دوسری دیاسلائی کھینچکر موم بتی میں لگا دی اور دن ہو گیا!

— × — × — × — × —

اندھیرے کی پرفسوں سیاہی میں روشنی کے جالے لگے اور کمرہ اس دلچسپ روشنی میں جگمگا اُٹھا۔ خانم نے نازو کو اندر لالٹین لینے بھیجا اور میں اپنے پلنگ پر بیٹھکر سوچنے لگا۔ میرے کان میں اُن بڑی بی کے الفاظ گونجتے معلوم دیئے۔ کیا میں واقعی سانپ ہوں جو موقعہ پاتے ہی چٹک لو لگا کیا واقعی نازو کی اُٹھتی جوانی "اتنی جاذبیت رکھتی کہ میں اپنی پیاری رفیقہ حیات کو چھوڑ بیٹھوں گا۔ لاحول ولا قوۃ۔ چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ کجا ملی کا پسینہ کجا گلاب کی بدبو۔ کجا میری پیاری رفیقۂ حیات اور کجا یہ بدہئیت اور کریہ المنظر نازو۔ نتیجہ میں نے یہ نکالا کہ وہ پڑوسن خانم کی نانی کی بچی کہیں کی ایک فسادن معلوم ہوتی ہے۔ بلکہ ہے۔ . . . قطعی۔

دوسرے روز کا ذکر ہے کہ میں تنہا کرسی پر بیٹھا گذشتہ رات کے واقعات پر غور کر رہا تھا اندھیرے کی گڑبڑ سڑ میں جو کچھ بھی معمولی واقعات پیش آئے تھے وہ ہوتے ہی رہتے ہیں مگر خانم سے میں نے اس بات کا تذکرہ نہیں کیا۔ اب اس وقت سوچ رہا تھا کہ کہدوں یا نہیں کوئی بات تو ہے نہیں کہنے کی کہ خانم کے دھوکہ میں نازو کا کان مروڑ دیا یا نازو نے کرسی کے دھوکہ میں مجھے کھینچ لیا۔ پھر خیال آیا کہ کہیں نازو نے خود خانم سے کہہ دیا نہ ہو گا۔ اس خیال سے کچھ طبیعت کو بیچینی سی محسوس ہوئی۔ کہنے کو تو میں فوراً کہہ دیتا۔ اسی وقت کہدیتا مگر مجھے ایک خیال تھا۔ وہ یہ کہ خانم کی منہ بولی پڑوسن نانی نے کیا کچھ میرے اور نازو کے بارہ میں خانم سے نہیں کہہ دیا تھا اور میں اب ڈر رہا تھا کہ ایک ذرہ سا شوشہ خانم کو کہیں سے کہیں پہونچا دیگا اور خواہ مخواہ اس کے دل کو ٹھیس لگے گی۔

میں اسی فکر میں غلطان تھا کہ بھائی رفیق آ گئے۔ خوب موقعہ سے آئے میں نے دل میں کہا اور فوراً اُن سے گذشتہ شب اندھیرا ہو جانے کے دلچسپ واقعات بیان کئے۔ وہ خوب ہنسے اور میں بھی خوب ہنسا۔ مجھے اُنھوں نے مشورہ دیا کہ ہرگز ہرگز خانم سے اس کا ذکر نہ کرنا چاہیئے" بلکہ خود نازو سے چپکے سے کہہ دینا چاہیے کہ وہ بھی خانم سے نہ کہے۔

اس کے بعد ہی نازو کی بابت اور باتیں ہوتی رہیں۔ معاملہ در اصل یہ درپیش تھا کہ اس کا پتہ لگایا جائے کہ وہ کہیں واقعی "بدمعاش" تو نہیں ہے۔ نازو کو بلایا گیا۔ اس کو غور سے دیکھکر بالکل ہی ایک نئے زاویہ سے اُس کے چہرہ کو دیکھنے کی رفیق نے فرمائش کی اور اس کا میں نے پختہ وعدہ کیا۔ رفیق بہت جلد چلے گئے۔ مگر نازو سے وہ بات کہنے کا سخت تقاضہ کر گئے۔

رفیق تو چلے گئے مگر اب میں اس فکر میں تھا کہ نازو سے ضرور بالضرور کہدینا چاہیئے کہ اندھیرے کی غلط فہمی کا ذکر کر کے کہیں خانم کو تکلیف نہ پہونچائیں۔

میں اسی فکر میں تھا کہ ایک زرین موقعہ ہاتھ آ گیا خانم باورچی خانہ میں لگی تھی۔ اور اس نے میرے

تکیہ کے نیچے سے نازو سے کہا کہ کنجی لے آئے۔ درحالیکہ میں تکیہ لگائے پلنگ پر دراز تھا۔ نازو آئی اور قریب پہنچکر کچھ ٹھٹک کر رہ گئی۔ میں نے وجہ پوچھی تو اس نے مقصد بیان کیا۔ دونوں ہاتھ میرے کتاب سے گھرے ہوئے تھے۔ لہذا میں نے سر اُٹھایا کہ کنجی نکال لے سرہانہ سے وہ کنجی نکالنے کے لئے جھکی۔ بدقسمتی سے اُس کا چہرہ اس نئے زاویہ سے مجھے دکھائی دیا جو رفیق نے دریافت کیا تھا چنانچہ میں نے دیکھا کہ اس کا دہانہ اس طرح دیکھنے سے بالکل چھپ گیا اور تھائی رہ گیا۔ ناک کے وجود کا الگ قایل ہونا پڑا اور بڑی بڑی غلافی آنکھیں لمبی لمبی پلکوں کی چلمن میں بہت خوبصورت معلوم ہوئیں۔ اُس نے کنجی نکالی تو میں نے جھٹ سے ایک ہاتھ سے کتاب چھوڑ کر کنجی کی زنجیر پکڑ لی اور اس سے کہا: "سُن تو.... رات کو اندھیرے کی گربڑ کا تو نے . . . کہہ تو نہیں دیا"

ایک ہاتھ سے وہ کنجی پکڑے تھی اور دوسرا سرا میرے ہاتھ میں تھا۔ اُس نے شاید جواب دینے میں تامل کیا کہ میں نے آہستہ سے کنجی کی زنجیر کو جھٹک کر کہا۔ "اری کمبخت کہیں کہہ مت دیجیو" یہ سُنکر وہ مسکرائی اور کنجی اُس نے ذرا کھینچی تو میں نے چھوڑ دی اور جاتے جاتے اُس نے دروازہ پر پہونچکر مُڑ کر دیکھا۔ وہ مسکرا رہی تھی اور میں نے گھونسا دکھا کر "خبردار کہنا مت" وہ چلی گئی اور میں اپنی عمر کے پہلے تجربہ سے ایک عجیب گھبراہٹ اور پریشانی میں ایک دم سے پڑ گیا۔ بدن کے رونگٹے کھڑے ہوگئے کہ کہیں خانم سے یہ سب باتیں جا کر نہ کہدے تن بدن میں پسینہ سا آگیا اور دل دھڑکنے لگا۔

—— × —— × —— × —— × ——

ایسے موقعہ پر کہ میں ابھی بدحواسی کے عالم میں تھا خانم کی آواز برآمدہ کے موڑ پر سنائی دی۔ میں سن سے ہوگیا۔ یا الٰہی کیا نازو نے سب جاکر کہدیا! تیزی سے خانم کے پاؤں کی چاپ آئی۔ کس تیزی سے؟ شاید غصہ میں بھری آرہی ہے۔ غالباً کہدیا سب کچھ نازو نے! بس میں کیا عرض کروں۔ میرا دل ہل گیا۔ سانس رکتا سا معلوم ہوا۔ اب کیا ہوگا! یہ سوچکر میں نے جلدی سے کتاب رکھکر رضائی میں منہ چھپا لیا۔

پیر کی آہٹ چارپائی سے قریب ہوئی۔ بالکل قریب آکر رُک گئی۔ میں سچ مچ جیسے سناٹے میں آکر رضائی کے اندر سُن ہوکر رہ گیا۔

میں تو اس سناٹے میں تھا کہ ایک دم سے اُس نے زور سے میرا سر رضائی میں دبا دیا۔ گھبرا کر میں نے رضائی سے سر نکالا اُس کی ہنسی کی آواز سے کمرہ گونجنے لگا۔ کس طرح اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "سو رہے تھے تم تو!" لاحول ولاقوۃ میں کس خیال میں تھا۔ اُس کے چہرہ پر تو دہی خوشدلی کا نور تھا۔ میں بیحد خوش ہوا۔ دل ٹھکانے ہوا کہ سب کچھ تو وہم تھا۔ نازو نے کچھ نہیں کہا۔

# چوتھا اندھیرا

شام ہی کو میں محسوس کر رہا تھا کہ یہ تو بڑی واہیات بات ہوئی ایک طرح نازو کے بس میں ہوں میں۔ ہردم کا ڈر لگا رہیگا کہ کہیں وہ کہہ نہ دے۔ طبیعت اُلجھکر رہ گئی۔ سوال یہ تھا کہ اب کیا کرنا چاہئے۔ خیال آیا کہ لاؤ خود کہدوں سب کچھ مگر ہمت نہ پڑی۔ یہ طے کیا کہ نازو سیدھی لڑکی ہے وہ ہرگز نہ کہیگی۔

دوسرے روز کا ذکر ہے ایک دوست کے ساتھ شام کو ٹہلنے جانے لگا۔ خانم کہنے لگی میں بھی مامانی جان کی طرف جاؤں گی۔

میں جب ٹہل کر واپس ہوا ہوں تو سڑک چھوڑ کر کھیتوں کھیتوں ہو لیا۔ اس طرح کہ اپنے کمرہ کے سامنے جا کر نکلوں شام کا وقت تھا جنگل اور کھیتوں میں کس تیزی کے ساتھ اندھیرا دوڑتا ہے۔ دیکھتے دیکھتے شام کا سُرمہ سارے میں پھیل گیا رفتہ رفتہ بڑھتی ہوئی تاریکی میں عفریت نا پیکر معلوم ہونے لگے کھیتوں اور گھاس پر سبزی کی بجائے سیاہی دوڑ گئی ہر بار طرف آسمان پر سیاہی کی چادریں اُٹھتی معلوم ہو رہی تھیں۔ میں گھر کے قرب میں پہونچا تھا کہ سامنے مامانی جان والے بنگلہ سے میں نے دیکھا کہ کوئی تیزی سے نکلا۔ نہر کا نالا سرعت سے پار کیا اور تیزی سے اپنے گھر کی طرف رُخ کیا۔ لباس تو صاف نظر آیا مگر میں جان گیا کہ کون ہے۔ خانم ہے اکیلی میں نے دل میں کہا کہ لینا چاہئے اسے اندھیرے میں ایسا ڈرایا ہو کہ یاد ہی کرے۔ دونوں بنگلوں میں تین چار کھیت کا فاصلہ ہے۔ یا پھر وسیع احاطہ کا میدان اس میں اور ملا لیجئے میں تیزی سے دوڑ کر بائیں ہاتھ کے کھیت میں گھس گیا۔ اور اب میں نے پہچان لیا کہ وہی ہے سرخ رنگ کی ساڑی پہنے ہوئے تھی۔ میں نے دور ہی سے پہچان لیا۔ وہ کھیت کی مینڈ پر تیزی سے آ رہی تھی اور میں داہنی طرف کھیت میں چھپ گیا۔

بجائے مینڈ سے ہو کر آنے کے اس نے کھیت کا گوشہ کاٹا اور بالکل ہی میرے قریب سے ہو کر نکلی اتنے قریب سے کہ میں نے سُرخ ساڑی کے آنچل کو اپنے چہرے کے سامنے سے اُڑتے دیکھا چشم زدن میں ایک "ہاؤ" کے ساتھ میں نے اچھل کر دونوں بازوؤں میں اُسے مضبوطی سے جکڑ لیا..... ادھر سے ایک چیخ اور ادھر میرے منہ سے قہقہ کی آواز نکلی جب جا کر کہیں مجھے پتہ چلا کہ جس کو میں اس بے تکلفی اور آزادی اور مضبوطی سے اپنے ہاتھوں میں جکڑے ہوں وہ خانم نہیں بلکہ نازو ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون میں نے ایک دم سے اس کو ایسے چھوڑ دیا کہ وہ دھم سے گر پڑی اور ادھر میں محو حیرت۔ وہ اُٹھی ہی اُسکے برابر آیا کچھ پریشانی کے ساتھ دبی ہوئی زبان سے میں نے کہا "خدا کے واسطے نازو اس کا..... اس کا ذکر مت کرنا۔ یہ ساڑی تو نے کیسے پہن لی؟"

وہ بولی "مجھے آج ہی دی ہے"۔

میں نے کہا "مجھے دھوکہ ہو گیا..... تو کہاں جا رہی ہے۔ وہ کیوں نہیں آئیں۔ (ہم دونوں گھر کی طرف جا رہے تھے)

وہ بولی "مجھے جلدی سے بھیجا کہ کمرہ میں روشنی کر دوں اور کہدوں کہ وہ ذرا دیر سے آئینگی"!

دو چار قدم میں چپ رہا۔ انسانیت کو میں نے اپنے مرکز کی طرف مائل دیکھا۔ انسانیت جب اپنے مرکز سے دور ہوتی ہے تو علوی صفات کی حامل ہو کر "احسن التقویم" کی تفسیر ہوتی ہے ورنہ اپنے مرکز پر تو "اسفل السافلین" ہے ہی مطلب یہ کہ مجھے نازو کی اس وقت کی معیت نمعلوم کیوں دلچسپ معلوم دی۔ میں نے اُس سے کہا "تو ڈر گئی سچ مچ"!

"ڈرا دیا آپ نے"

"تو کیا سمجھی تھی"؟ میں نے دل میں خوش ہو کر کہا۔

"میں سمجھی نمعلوم کون ہے"!

ہاتھ اُس کا پکڑ کر میں نے کہا: "اگر تو نے کہدیا خانم سے تو بس یہ سمجھ لے کہ خیر نہیں ہے تیری...... کہے گی تو نہیں؟"

"نہیں" اُس نے ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا اور وہ تیزی سے چلی۔ میں قصداً ذرا آہستہ ہو گیا، وہ کچھ آگے ہو گئی معاً مجھے خیال آیا کہ وہ جو رفیق نے کہا تھا...... بہترین موقعہ ہے...... کیوں نہ کہوں اس سے۔

چنانچہ "سن تو" کہکر میں لپکا۔ قریب جو پہنچا تو زبان میں لکنت آگئی۔ سب بھول گیا۔ کیا کہوں۔ اور کیسے کہوں۔ ہکلایا جو سہی تو مجبوراً بجائے اور کوئی بات کہنے کے پھر وہی بات کہی یعنی یہ کہ "کہے گی تو نہیں" اس کا جواب اس نے قدرے آزادی سے اور ہنسی کے لہجہ میں دیا۔ "نہیں کہونگی"۔

میں نے کہا "اچھا" اور روہڑکا وہیں کھڑا رہ گیا تاکہ نازو آگے نکل جائے پھر آہستہ آہستہ ٹہلتا ہوا نہ معلوم کس فکر میں غلطاں و پیچاں اندھیرے میں اینٹوں اور گڈھوں میں ہوتا ہوا کمرہ میں پہنچا۔ کمرہ خالی تھا اور لیمپ جل رہا تھا۔ میں کرسی پر لیٹ کر آنکھیں بند کرکے سر ٹیک کر لیٹ گیا۔ ایک سوچ میں ڈوب گیا۔ سوال یہ تھا کہ نازو کے بس میں آگیا، اگر بگڑ گئی تو فوراً کہدے گی۔ کیوں نہ خود خانم سے سب کہدوں۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ کتنی دیر اسی خیال میں مستغرق رہا۔ گویا سو سا رہا تھا کہ خانم کے بوٹ کی سخت مگر شیریں اور نپی تلی آواز کے کہنے سے جاگ اٹھا۔ دروازہ میں خانم داخل ہوئی تو مجھے یہ معلوم ہوا کہ جیسے کوئی آسمان سے حور نازل ہو گئی۔ تیزی سے چلنے کی وجہ سے روشنی میں چہرہ تمتما رہا تھا اور سُرخ لباس نے چہرہ پر آگ سی لگا دی تھی اسکے ساتھ ہی نازو بھی اُسی رنگ میں داخل ہوئی جو واپس اُسے لینے چلی گئی تھی۔ یکے بعد دیگرے دونوں اس طرح سامنے آئیں کہ مجھے معلوم ہوا کہ پریوں کے ساتھ ساتھ چڑیلیں بھی ہوتی ہیں۔ لاحول ولا قوۃ۔

خانم تیزی سے نکلی ہوئی ایک لحہ بھر کے لئے کپڑے بدلنے غسل خانہ میں چلی گئی۔ اور میں اب جو نازو کو دیکھتا ہوں تو کتنی تیزی اور کتنی سادگی کے ساتھ اس نے کھانے کے لئے میز کو ہٹایا ہے۔ میری طرف نظر اٹھا کر اس نے دیکھا تو خود کو مجھے دیکھتا پایا۔ اس کے احسان نے شاید اسے کچھ پریشان سا کر دیا۔ وہ تو تیزی سے چلی گئی۔

—×—×—×—×—

تین دن کے تخیل نے اور الجھنوں نے مجھے نہ معلوم کس خلجان میں ڈال دیا۔ ہر دم نازو کے معاملات کی فکر میں الجھا سا رہتا۔ او جھکر رہ گیا۔ مجھے کیا کرنا چاہئے؟ یہ سوال تھا اور اس کے ساتھ ساتھ ایک ٹرین کی ٹرین خیالات کی آتی تھی۔ یہ کب کا طے ہو چکا تھا کہ خانم کی صورت شکل سے کچھ بحث نہیں، نازو بد صورت قطعی نہیں ہے۔ پھر ویسے بھی ایک خادمہ ہے کہ ناممکن ہے کوئی ایسی باتمیز اور فرمانبردار (بلکہ کچھ کچھ دلچسپ) ہو سکے۔ وہ کمرہ کا کمرہ اور ہر چیز درست رکھتی ہے۔ کپڑوں پر برش کرتی ہے۔ درست رکھتی ہے۔ اور ہر چیز کو فٹ رکھتی ہے۔ وہ جو سنتے ہیں کہ رئیسوں کے یہاں نوکرانیاں تمیزدار خوش پوشاک اور صاف اور ستھری اور جاذب نگاہ ہوتی ہیں۔ تو واللہ وہی معاملہ یہاں ہے گویا ہم رئیس نہیں جیسے کم از کم ظاہراً تو وہی شان آرہی ہے۔

اب ایک اور لطف دیکھئے کہ رفیق سے اس آخری غلط فہمی کا کچھ تذکرہ نہ کیا۔ جو بات کہلانا چاہتے تھے اس کے جانے کا قصہ سے تعلق نہیں۔ مگر اس کی البتہ فکر تھی۔ دن میں درجنوں موقعے ملتے تھے۔ اور اب تو اتنی ہمت تھی کہ منٹ بھر کو بھی موقع ملے تو کہدوں۔ دن میں دس مرتبہ موقعہ ملا مگر کوئی بات نہ کہی جاتی لہٰذا وہی بات کہدیتا کہ "کہنا مت" چنانچہ ایک روز نازو کھڑی بھائی کو پلنگ پر جا رہی تھی کہ میں نے پھر کچھ کہنا چاہا۔ مگر آخر کو وہی کہا کہ "خانم سے مت کہنا"۔

بار بار سُنکر وہ بھی شاید تنگ تھی۔ کچھ اُس کی طبیعت بھی موزوں ہوئی لہٰذا اُس نے مسکرا کر کہا "کہدونگی"۔

میں نے یہ سُنا اور دفعتاً میری آنکھوں کے سامنے اُس کے چہرہ کی تبسم شرارت کیا سے کیا معلوم دی۔ اور تو کچھ نہیں میں نے اس کی داد یوں دی کہ "کمبخت" کہکر اُس کی پیٹھ پر ایک گھونسا دیا زور سے اور ہنستی ہوئی "آہ" کہکر دوہری ہوگئی "مار ڈالا زور سے" ہنستے ہوئے اُس نے شرارتاً کہا "کہدونگی سب کچھ"۔

میں اتنی سی بات سے اس قدر وحشت زدہ ہوگیا کہ سیدھا کمرہ سے بھاگا یہ دیکھنے کو کہ خانم کہاں ہے۔ دوڑ کر دوسری طرف سے گھر میں گیا۔ خانم گھر کی دلچسپیوں میں مصروف تھی اور کتنا اطمینان مجھے حاصل ہوا ہے یہ دیکھ کر کہ وہ کمرہ سے کتنی دور اور بیخبر تھی جب میں نے نازو کے گھونسا مارا ہے۔

افسوس کہ یہ ایک انجام کا آغاز تھا۔

# پانچواں اندھیرا

کرھائے تو مارا کر گستاخ۔

میں یاروں کے ساتھ چار روز کی چھٹی میں دلی جا رہا تھا۔ اس دوران میں نہ معلوم کتنی مرتبہ نازو کو گھونسے لگا چکا تھا۔ لے دے کے یہی بھونڈا مذاق مجھے آتا تھا۔ رفیق بار ہا تقاضے کر چکے تھے مگر جو کچھ وہ چاہتے تھے وہ کہنے کی اب تک تو مجھے ہمت نہ پڑی تھی اب تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لاحول ولا قوۃ۔ آخر ڈر کا ہیکا۔

خانم نے پوچھا تھا کہ کب واپس آؤ گے تو کہدیا تھا کہ فلاں تاریخ کو دن کے دو بجے والی گاڑی سے آئیں گے۔ یہ بالکل غلط کہا تھا۔ حالانکہ اُس سے قبل رات ہی کو ڈیڑھ بجے والی ایکسپریس سے آنا طے تھا۔ یہ مصلحتاً کہا تھا۔ اب اس کی فکر تھی کہ نازو سے اپنی آمد کا صحیح وقت بتا دیا مگر کس طرح؟ اور کیسے اور کن الفاظ میں؟ یہ ایک سوال تھا۔

دن بھر اسی فکر میں رہا۔ بات کرنے کا تو موقعہ ملا۔ مگر سب باتوں کے کہنے کا موقعہ نہ ملا۔ حتیٰ کہ شام ہوگئی۔ خانم گھر میں بیٹھی ... کے ... بین پھینٹ رہی تھی اور بے طرح مشغول تھی میں اُٹھکر باہر چلا کہ خانم نے نازو سے پھر باورچی خانہ کی الماری ... میرے سرہانے سے کنجی منگائی۔ میں چوکھٹ پر دروازہ کی پہونچ ہی چکا تھا۔ لہٰذا تیزی سے باہر نکل گیا اور ہوا کی طرح لپک ... اپنے کمرہ میں پہونچا۔ چشم زدن میں لالٹین گل کر دی اور اپنے بچھونے پر رضائی اوڑھ کر اندھیرے میں لیٹ گیا۔ میرا دل دھڑک رہا تھا اور میں سُن رہا تھا کہ نازو آئی "لالٹین کون لیگیا" اُس نے خود ہی سے گویا کہا۔ یہ کہکر کھٹ پٹ کرتی لوٹ گئی۔ مگر پھر فوراً ہی آئی۔ میرا کلیجہ بلیوں اُچھل رہا تھا۔ سیدھی وہ میرے سرہانے ٹٹولتی ہوئی آئی۔ ہاتھ اُس کا میرے تکیہ کے نیچے آیا ہی

تھا کہ میں نے اپنا ہاتھ اندھیرے ہی میں "خانم سے مت کہنا" کہتے ہوئے اُس کی طرف بڑھایا۔ وہ کچھ چونک سی پڑی کہ میں نے ہاتھ سے اُس کو اپنی طرف گھسیٹا تو وہ بل کھاکر میری طرف آگئی مگر اپنا سر بالکل دوسری طرف کر لیا۔ میں نے اس سے کانپتے ہوئے لہجہ میں کہا "پرسوں رات کو دو بجے والی گاڑی سے آؤنگا.... کچہری والے کمرہ......"

اتنا کہکر میں نے اُس کو اپنی طرف گھسیٹنا چاہا۔ زور سے۔ مگر وہ زور کرکے کنجی لیکر نکل گئی۔ میں ایک دم سے تڑپ کر اُٹھا۔ جلدی سے لالٹین روشن کر دی۔ اور پریشانی دفع کرنے کو ایک گلاس بھر کے ٹھنڈا پانی حلق میں اُنڈیل لیا۔ کچھ دیر چہل قدمی کی۔ پھر طبیعت کا ہیجان رفع کرنے کے لیے بڑے اطمینان سے لالٹین کو دھیما کرکے اور لیمپ جلا کر میز کے قریب کتاب لیکر بیٹھ گیا۔

مگر جناب کہاں کا پڑھنا اور کیسا پڑھنا کن کن خیالات میں غرق ہو گیا۔ ڈوب کر کہاں سے کہاں پہنچا۔ کمزوری نے میرے اوپر غلبہ پایا۔ دل بھر آیا۔ انسانیت کو اپنے مرکز سے جنبش کرتے ہوئے پایا۔ حتیٰ کہ میری کتاب پر ایک آنسو ٹپ سے گرا! میں تکلیف سے بیکل ہو گیا۔ اپنی پیاری رفیقۂ حیات کی لافانی محبت کے درد کی دل میں کھٹکن محسوس کی۔ وہ جو میری محبت میں ڈوبی ہوئی ہے وہ جس نے مجھے اپنا مقصد حیات بنایا ہے وہ جس کا وجود میرے ہر تخیل کا آئینہ دار ہے۔ میں سب باتیں کیوں نہ اُس سے کہدوں چنانچہ بہت جلد یہ طے کر لیا کہ ابھی ابھی سب کچھ کہدونگا۔ دل کو ایک دم سے سکون سا محسوس ہوا۔ طبیعت شادمان ہو گئی۔ اُٹھکر اندر گیا دیکھا تو خانم کو دہی بڑے بنانے میں بطرح مشغول پایا۔

---

دس بجے کی گاڑی سے جا رہا تھا۔ چلتے چلتے ارادہ کیا کہ کہدوں مگر رُک گیا۔ خانم نے پھر پوچھا کہ کب آؤگے تو بغیر سوچے سمجھے وہی جواب دیا جو پہلے دیا تھا۔ کیونکہ اب ارادہ بھی وہی تھا۔ گو یا سچ کہا خانم کا چہرہ بیحد دلچسپ اور بیحد سنجیدہ معلوم دیا جب میں نے کہا۔ "اچھا لو رخصت۔ سلام علیکم" ہم دونوں گرمجوشی سے بغلگیر ہوئے اور سلام علیکم کہکر رخصت ہو گیا۔

# چھٹا اندھیرا

دہلی پہونچکر کیا ضروری کام انجام دیئے گئے۔ یہاں اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔ یہ کہئے کہ وہاں چوکڑی میں سوچنے تک کا موقعہ نہ ملا۔ مگر دوسرے روز رات گئے جب سونے کو لیٹا۔ تو عجیب خیالات میں غرق ہو گیا۔ کسی نے کہا ہے کہ اندھیرے میں بیوی کی محبت بہت ستاتی ہے اور اس کا بہت خیال آتا ہے۔ چنانچہ کمرے میں اندھیرا تھا۔ اور خانم کا بہت خیال آیا۔ بہت سوچ بچار کے بعد طے کیا کہ غلطی اپنی ہے یا پھر اُس میراسن کی بچی کی خود کی عیاری۔ اب جو ہوا سو ہوا اس ناگوار سلسلہ کو ختم کرنا چاہیئے۔ ویسے تو زبانی یہ ہونے سے رہا۔ (اور اُس وقت جوش بھی تھا) خیال آیا کہ ابھی ابھی خط لکھنا چاہیئے۔ سارا حال شروع سے آخر تک لکھ دینا چاہیئے کہ تا زہ در اصل اوّل نمبر کی حرافہ ہے صبح خط ڈال دیا جائیگا اور شام کے چار بجے پہونچ جائیگا۔ دوسرے روز ہم خود پہونچ جائینگے۔ چنانچہ یہ طے کرکے اُٹھا بتی روشن کی اور ایک طول طویل ایسا خط لکھا کہ دل ہلکا ہو گیا۔ دو مرتبہ اُس کو پڑھا اور پھر بند کرکے رکھ دیا کہ صبح تڑکے ہی اسے ڈلوا دینگے۔ دل کو اطمینان ہوا اور سو گیا۔ رات کو ایک خواب دیکھا۔ کیا دیکھا؟ یہ نہیں بتایا جا سکتا۔ صبح آنکھ کھلی تو خواب کی کیفیت کو مد نظر رکھتے ہوئے اور یہی ضروری معلوم ہوا

کر خط ڈلوایا جائے. چنانچہ ہوٹل کے ملازم کو خط دیا کہ منیجر صاحب سے ٹکٹ لیکر جلد سے جلد ڈال دے اور خود غسل خانہ میں چلا گیا۔

—— × —— × —— × —— × ——

اب وہاں سے آیا تو کیا دیکھتا ہوں یار لوگ کمرے میں کھڑے سر جوڑے میرا خط پڑھ رہے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی ایک قہقہہ نکلا۔ غصہ مجھے بھلا کیسے آتا بلکہ یہ کہئے کہ آنے کب دیا جاتا۔ خط پڑھا جا چکا تھا۔ اور میں نے اخلاقیات کا لیکچر دیتے ہوئے چھین لیا۔ ایک نے کہا "یار بڑے گھنے ہوئے نکلے۔ دوسرے حضرت بولے "اکیلے ہی اکیلے"۔ ایک اور صاحب نے کہا "ہم نے تو" میں نے جو پوچھا کیوں تو بولے "جو رومانٹ کیجی کر دیگی۔ آنے وہاں سے چونچلہ میں کیا سمجھے ہو کہ ہم روا اس خط کو پا کر خوش ہونگی"۔ میں نے کہا "کیوں ہیں"۔

وہ بولے ضرور (اس پر زور دیکر) تمہیں اتنی عقل نہ آئی، بھی اگر غلطی ہوئی اور واقعی معاملہ رفت گذشت کرنا ہے تو اب یہ جھگڑے کھڑے کرنے سے آخر کیا مطلب"۔

دوسرے صاحب بولے "... معاملہ کو یہیں ختم کر دو ورنہ ...."

"کیا ورنہ؟" میں نے کہا۔

وہ بولے "ورنہ یہ کہ جو رو خط پاتے ہی جوتیوں میں دال بانٹنا شروع کر دیگی اور نہ باوا سے پٹوایا ہو تو میرا ذمہ۔ میاں گھر سے نکالے جاؤ گے ان باتوں پر۔ وہ ماریگی نازو کو خط ملتے ہی اور یہ بات چھپے گی نہیں نتیجہ ظاہر ہے۔

چنانچہ اس قسم کی جو یاروں نے ردو قدح کی اور سارا حال معلوم کیا پھر مسخرہ پن کے بعد یہ صلاح دی کہ معاملہ کو جانے دو بس جھونکو اور قصہ ختم کرو۔ چنانچہ اس قصہ کو ختم کیا معلوم ہوا کہ واقعی غلطی کر رہا تھا مگر خط جیب میں رکھا رہنے دیا۔

—— × —— × —— × —— × ——

دلّی سے چلنے کی رائے ہوئی تو میں نے کوشش کی کہ اس طرح روانہ ہوں کہ اُس وقت پہونچیں جس کا خانم سے وعدہ تھا مگر اور ساتھی نہ مانے اور روانگی وہی رہی کہ رات کے دو بجے پہونچیں جس کا نازو سے وعدہ تھا۔ اکیلے بھلا کون جانے دیتا مجبوری تھی۔

میرا بستر او غیرہ سب ایک اور صاحب کے ہولڈال میں تھا اسی طرح دوسرا سامان بھی اوروں کے سوٹ کیسوں میں چنانچہ میں تو خالی ہاتھ تھا۔

—— × —— × —— × —— × ——

رات کے ڈھائی بجے ہونگے جب بنگلہ کے احاطہ میں پہونچا۔ طرح طرح کے خیالات میں غرق تھا۔ تانگہ کو پھاٹک سے ہی رخصت کیا اور سیدھا اپنے کمرہ پر پہونچنے کی نیت باندھکر آہستہ آہستہ سوچتا ہوا چلا۔

رات اندھیری تھی سردی سخت تھی۔ مگر ہوا بند تھی۔ ایک خاموشی چاروں طرف چھائی ہوئی تھی اور بنگلہ کا منظر تاریکی میں ایک کوہ پیکر ہیولے کی طرح سیاہ آسمان میں منجمد سا نظر آتا تھا۔ ادھر اُدھر درخت ایک ناقابل بیان سیاہی میں لپٹے ہوئے

تاریکی کے سنتری بنے کھڑے تھے۔ میں گردن میں اونی مفلر لپیٹے۔ ہاتھوں کو سردی سے بچانے کیلئے پتلون کی جیبوں میں ڈالے سوچتا جا رہا تھا۔

جو کچھ بھی ہو چکا تھا، وہ تو ختم ہو گیا کر ہی چکا مگر سوال یہ تھا کہ وہ حرّافہ یعنی نازو کی بچی کیا واقعی کچہری والے کمرہ میں حسب ہدایت سو رہی ہوگی؟ دیکھنا چاہیے یا مار و گولی!

جب اس مقام پر پہنچا کہ یا تو سیدھا اپنے کمرہ کی طرف رخ کروں اور یا پھر بائیں ہاتھ کو مڑ کر کچہری کے کمرہ کو دیکھوں، دوراہہ بنا اور ایک ڈانٹ سکر نازو کو چنانچہ جب اس مقام پر پہنچا تو گویا از خود رک گیا کھڑا رہا کچھ دیر تک بھی سوچا کہ شاید کوئی اور ... دوسرے کبھی خیال ہوا کہ تصدیق تو کرنا ہی چاہئے ... دو چار سکنڈ گذرے کہ ایک دم سے قدم کچہری والے کمرہ کی طرف بڑھ گئے ... کہ دیکھنا چاہئے۔

---

برآمدے کے قریب پہونچا تو سرو کے درختوں کے سایہ نے اندھیرے کو اور بھی سیاہ کر دیا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ نہ سوجھتا تھا۔ برآمدہ میں آہستہ آہستہ چوروں کی طرح پہنچا۔ خاموشی اور تاریکی میں کمرہ کی طرف بڑھنے سے دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ آہستہ سے جو کمرے کے دروازہ کو چھوا تو تن بدن میں سنسنی دوڑ گئی، دل بلیوں اچھلنے لگا کیونکہ حسب معمول بند نہ تھا بلکہ کھلا ہوا تھا مطلب یہ کہ نازو اندر ہے تحقیق ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ جب قصہ حل ہو گیا اور جس بات کو چاہتا تھا اُس کا پتہ لگ گیا۔ تو اب واپس ہونا چاہئے مگر غرض ہے کہ جب آدمی کی شامت آ جاتی ہے تب عقل بھی ساتھ نہیں دیتی۔ چنانچہ یہ خیال ہوا کہ لاؤ دیکھ لیں۔

کمرہ میں سر ڈال کر دیکھا۔ بالکل سناٹا چھایا ہوا تھا سوا دل کی دھڑکن کے، کچھ سنائی نہ دیا۔ اندر آہستہ سے داخل ہوا داہنی طرف مڑ کر آگے بڑھا اور صوفہ کو آہستہ سے جو ٹٹولا تو دیکھا تو رضائی ... کیا اب بھی شبہ کی گنجائش تھی ہرگز نہیں ... واپسی ناممکن تھی اور "بالکل" ہی تصدیق ضروری نتیجہ یہ کہ میں نے رضائی جو ذرا سرکائی تو سونے والی نے بڑی سی سانس لیکر ایک کروٹ لی اور میری زبان سے ایک عجیب رازدارانہ لہجہ میں کانپتی ہوئی آواز سے نکلا "نازو ... نازو" رضائی کو علیحدہ کرتے ہوئے اٹھ کر بیٹھی اور ساتھ میں نازو کو کہتا ہوا جو صوفہ پر بیٹھنے کو ہوا تو ... خدا کی پناہ! ...

## "اندھیر"

غرض ہے کہ اس سے پہلے نہ تو میں نے کبھی بم کا گولہ پھوٹتے دیکھا تھا اور نہ میں خود کسی توپ میں بھر کر داغ دیا گیا تھا۔ اور نہ کبھی کسی میگزین کے ساتھ بھک سے اُڑ گیا تھا۔ قصہ مختصر یہ پہلا اتفاق تھا۔ ... شامت اعمال کہئے ... حماقت کہئے ... یا پھر شدنی امر کہ "نازو" کہتے ہوئے میں شاید بیٹھنے کو ہوا تھا کہ حضرت ایک طوفان خیز زلزلہ آیا ... زور کا دھماکا ہوا۔ بس یہ معلوم ہوا کہ صوفہ اور کمرہ سب کا سب اُڑ گیا! یا میرے اللہ! اندھیرا نہیں بلکہ سچ مچ کا "اندھیر" ہو گیا ...

خانم کی غضبناک چیخ تھی کہ بم گولہ! ... دھماکے کے ساتھ ساتھ مشتعلہ بھی تھا یعنی یہ واقعہ تھا کہ خانم کے ہاتھ میں اب بجلی کا جیبی لیمپ روشن تھا اور میں دھکے کے تیز ازل سے بوکھلا کر کہہ رہا تھا "خط ... خط ... خط" اگر توبہ کیجئے۔

اس کے بعد کیا ہوا؟ آپ میری درخواست پر عبید راز ہی میں رہنے دیجئے کیونکہ میں بتاؤں گا نہیں جھوٹ سے فائدہ کیا۔ ہاں قیاس دوڑانے کے لئے اتنا بتایا جا سکتا ہے کہ پائیوں اندھیرے میں نازو کمبخت نے دبو کے میں خود خانم سے ملاقات ہوئی تھی۔ نازو سے نہیں بلکہ خانم ہی سے میں نے نازو سمجھ کر کہا تھا کہ..... خانم سے مت کہنا" ..... آہ!

## نتیجہ

یہاں اس سے بحث نہیں کہ نازو نکال دی گئی اور اس کے بعد وہ وہ قدر ذی شکل والی خادمائیں دیکھنے میں آ رہی ہیں کہ بہانوں سے بچوں کو لانا چھوڑ دیا مبادا کہ ڈر کر یا سہم کر مر جائیں یا یہ کہ آپ چڑیلوں کے قائل نہ ہوں تو ہمارے یہاں کبھی ہو جائے۔ یہاں تو موجودہ صورت کا ذکر ہے۔ بخ۔ ایک بغیر ناک والی ملازمہ کچھ دن رہ کر چلی گئی ہے، وہ گھر والی سے کہتی رہی ہے اس کے غم میں واقعہ یہ ہے کہ اچھی ملازمہ ذرا مشکل سے ملتی ہے کسی لالچ سے نہیں آتی کمبخت۔ افسوس۔

# بی، اے، بی بی

از حضرت "ناکارہ" حیدرآبادی

منحصر شادی پہ ہو جس کی اُمید ٭ نااُمیدی اُسکی دیکھا چاہیئے

شہر میں ایک محیرالعقول واقعہ سے سنسنی پھیلی ہوئی تھی۔ بچہ بچہ کی زبان پر اس کا چرچا تھا۔ گھر گھر اسی کا ذکر ہو رہا تھا۔ ہر طرف چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ گرما گرم خبروں کا خوب بازار گرم تھا۔ اخبارات کے افتتاحیہ اور مزاحیہ کالموں کے لکھنے میں ایڈیٹروں کا شہب قلم خوب خوب دولتیاں چلا رہا اور پینترے جھاڑ رہا تھا۔ دواخانوں میں، شفاخانوں میں، چاے خانوں میں، مدک خانوں میں، اور خدا جانے کن کن خانوں میں اس بیسویں صدی کے معرکۃ الآرا واقعہ پر اظہار رائے ہو رہا تھا۔ اور خدا کو بُرا بھلا کہنے والے بھی اُسکی قدرت کے قائل ہو چلے تھے۔

حیدرآباد میں لڑکی لڑکا ہو گئی تھی (یا ہو گیا تھا)!!

جب میں نے پہلے پہل یہ خبر حیرت سُنی تو بے اختیار ہنس دیا۔ اُس قسم کی ہنسی جو ہمارا ہندوستانی ایکٹر اسٹیج پر ہر فقرہ کے بعد ہنستا ہے۔ مجھے بالکل یقین نہ آیا۔ میں نے کہا واللہ! ان ستم ظریفوں کو جب سوجھتی ہے نئی سوجھتی ہے۔ دیکھو تو اب کے کیا اچھوتی غپ اُڑائی ہے! چند دنوں کے لئے سارے شہر میں سنسنی پھیلا کے رکھدی۔ شہریوں کی یہ حالت ہو گئی کہ مجھا مجھی اور اس انوکھی خبر کو جلد از جلد رفاہِ عام کے لئے عام کرنے کے سوا اُنہیں گویا اور کام ہی نہیں!

اسی سلسلہ میں میرا کمرہ بھی ایک روز رات کو اچھا خاصہ کانگریس کمیٹی یا مسلم کانفرنس کا اجلاس بنا ہوا تھا۔ میں تھا۔ شاہ تھے۔ ڈاکٹر تھے۔ اور "ہیملٹ" تھے!

---

"ہیملٹ" سے تعارف حاصل کیجئے۔ آپ شاہ کے نہایت دوست ہیں۔ اور ہر وقت شاہ کے ہمراہ دُبلری طرح نظر آنا اوّلین مقصدِ حیات سمجھتے ہیں۔ شاہ میری دوستی کا ہمیشہ دم بھرتے ہیں اور ہیملٹ شاہ کی دوستی و محبت کا! شاہ نظروں کے سامنے ہوں تو مارے شکایتوں کے ان کے کان پکانا۔ اور نظروں سے دور ہوں تو مارے خطوں کے شاہ کا ناک میں دم کر دینا ہیملٹ کے بائیں نہیں، دائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ اُن کی شکایتوں کی نوعیت بھی عجیب و غریب ہوتی ہے۔ مثلاً اگر شاہ ان کے ہاں نہ جائیں۔ تو شکایت کریں گے "کیوں نہیں آئے؟" اور جائیں تو بعد میں شکایت کریں گے "جلدی کیوں چلے گئے؟" اگر شاہ کسی وجہ سے خاموش ہوں تو کہینگے "شاہ! تم مجھ سے کیوں بے اعتنائی برتتے ہو؟" اور اگر ہنسیں بولیں تو چڑکر عرض کریں گے "تم مجھے بناتے ہو!" اور اگر میں انہیں بناؤں اور شاہ تفریحی قہقہہ بلند کریں۔ تو بعد میں یعنی تنہائی میں رو رو کر شکایت کریں گے "شاہ! تم ...

کی ہمت افزائی کرتے ہو۔ تم مجھے اپنا دوست نہیں سمجھتے!"

ہیملٹ رونے پر آتے ہیں تو دریا ہی بہادیں۔ بس ہو۔ پر کہ لڑکیاں بھی آپ کے آگے زانوئے تلمذ تہ کریں اور ہنسنے پر آئیں (جس کا بہت کم اتفاق ہوتا ہے) تو یقیناً گھر کی چھت اڑادیں۔ کوئی انجان آدمی اس حالت میں آپ کو دیکھے۔ تو سمجھے ہنسنے اور ہنستے رہنے کی شاید شرط بندی ہے اور پھر ہنستے ہنستے آپ کا یکبارگی رُک جانا واقعی قابل دید منظر ہوتا ہے اور قابل داد بھی (بارہا ہمیں گمان ہوا ہے کہ کہیں غریب کے قلب کی حرکت یکایک رُک نہ گئی ہو) اور صرف یہی نہیں بلکہ ہنسی کا سلسلہ یوں منقطع کرکے آپ کبھی گہری سوچ میں پڑتے ہیں۔ اور پھر کسی پیشگی اطلاع کے بغیر رونے لگتے ہیں (کہئے ہنسی کے بعد رونا ہے یاں مثلِ تلقلِ مینا" کی اس سے بہتر تشریح اور کیا ہو سکتی ہے؟) اور ہم اور شاہ دونوں آپ کو ایک بچے کی طرح سمجھانے، منانے، دلاسا دینے ہمدردی ظاہر کرنے اور آنسو پونچھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ آہ و زاری کی وجہ دریافت کرنے پر کہیں گے "آہ! میں زندگی سے بیزار ہوں شاہ! تمہیں میری پرواہ نہیں۔ مجھ سے کوئی ہمدردی نہیں۔ میں مرجاوں گا۔ خودکشی کرونگا" اور جب میں مزاحاً کہوں۔ "ہاں ہاں! خودکشی کرو اور ضرور کرو۔ خودکشی کے جراثیم تم میں پائے جاتے ہیں۔ آخر ہم نے تمہارا نام یونہی ہیملٹ رکھدیا ہے؟" تو آپ مارنے مرنے پر سچ مچ آمادگی ظاہر فرمائیں گے۔ بلکہ مارنے سے زیادہ مرنے پر!

ہیملٹ کی صحت کے متعلق بھی دو لفظ کہنے کی اجازت دیجئے۔ آپ کی جب سے شاہ سے ملاقات ہوئی ہے تب سے دیکھنے والے دیکھ رہے ہیں کہ آپ کی صحت خراب ہوتی جارہی ہے۔ اگر آپ کی تندرستی کا گراف (ترسیم) وزن کے اعتبار سے کھینچا جائے تو یقینی طور پر اور باقاعدہ طور سے گراف بتدریج برابر نیچے گرتا جائیگا۔ اور چڑھنے کا کبھی بھولے سے نام نہ لے گا۔ اور ہونا بھی یہی چاہیئے۔ کیونکہ آپ ہمیشہ سے کوئی نہ کوئی روگ ضرور پالتے رہے ہیں۔ کبھی سر کا درد ہے۔ تو کبھی پیٹ کا درد۔ کبھی زکام ہے۔ تو کبھی ملیریا۔ ... کچھ ہے۔ تو کبھی کچھ اور۔ اور ... پھوڑا ... کیل! اگر خدا کے فضل وکرم سے ان میں سے کسی عارضہ میں مبتلا نہیں تو آپ ... میں کھل جائیں گے کہ میری صحت کیوں اچھی ہے! اس پر شاہ اور شاہ کے طرز عمل اور خالی بے توجہی ... متعلق سوچ بچار اور غور و فکر مستزاد۔ جس کی وجہ سے آپ (گھٹ گھٹ کر تو نہیں کہہ سکتا) گھل گھل کر اور ... کر روز بروز سوکھ کے کانٹا ہوتے جارہے ہیں اور ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ ہیملٹ نے ... کے پہلے درجہ میں قدم رکھدیا ہے ـــــ غرض ہیملٹ کیا ہے ایک تماشہ ہے۔ ہمیں بیچارے کی حالتِ زار پر ... بڑا ترس آتا ہے۔

---

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ میں بیمار تھا اور ملیریا کا شکار۔ آج مرض میں کچھ افاقہ تھا۔ بخار کم تھا۔ مگر پھر رات میں بڑھ جانے کی دھمکی دے رہا تھا، نقاہت اتنی زیادہ ہوگئی تھی کہ بات کروں تو سامنے بیٹھنے والے کو لاوڈ اسپیکر

کی ضرورت محسوس ہو۔ شاہ، ہیملٹ، اور ڈاکٹر عیادت کو آئے تھے۔ لیکن میری نبض پر ہاتھ اور منہ میں تھرمامیٹر رکھتے رکھتے اس کے "لڑکی لڑکا ہوگئی" والے موضوع پر بحثنے لگے تھے اور اس زور شور سے مباحثہ ہو رہا تھا۔ کہ معلوم ہوتا تھا گویا گنجفہ کے ایک ہاتھ پر لڑ رہے ہیں۔ ڈاکٹر زور سے اور میاں منحنی آواز سے یہ ظاہر کر رہے تھے کہ ہم اس خبر پر یقین نہیں کرتے۔ اور ہم ہرگز نہیں کریں گے۔

لیکن شاہ کہہ رہے تھے "........ بھئی اب تم نہ مانو تو اس کا کیا علاج ہے۔ تم کو اب کون سمجھائے؟ خواہ مخواہ ظاہر کرنا چاہتے ہو۔ ایسا نہیں ہو سکتا . . . . "

چونکہ شاہ تائید میں تقریر کر رہے تھے اس لئے اُن کی ہاں میں ہاں ملانا ہیملٹ کا فرضِ عین ٹھہرا۔ اسے بھی یہ احمق ہی ملا۔ انہوں نے کہا "بیسیوں ایسے واقعات ہندوستان اور یورپ میں پیش آ چکے ہیں۔ حال ہی میں میں نے اخبار میں پڑھا تھا کہ آئرلینڈ میں ایک ........"

میں نے بالآخر بیٹھی بیٹھی آواز میں کہا "ہیملٹ صاحب! آپ اخبار بینی کے زعم میں مت رہیے۔ آپ لاکھ سر ماریں۔ مگر میں کبھی ماننے کے لئے تیار نہیں۔ یہ سب جھوٹ ہے۔ نرا فریب ہے اپنے آپ کو مشہور کرنے کا یہ نرالا طریقہ نکالا ہے لڑکی کے باپ نے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو یار" ڈاکٹر نے سگرٹ کا کش لے کر اور بہت سا دھواں ہیملٹ کے منہ پر چھوڑ کر کہا۔ "بھلا آپ کا قد دیکھو۔ اور ان مسائل پر بحث کرنا دیکھو۔" ڈاکٹر نے ہیملٹ کے "گِدّا"[1] ہونے پر چوٹ کی تھی۔ اور ہیملٹ تڑپ کر کچھ کہنے والے تھے کہ . . . .

شاہ بول پڑے "سارا دُنیا ایک طرف ہے۔ اور تم ایک طرف۔ جن لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اب اس لڑکی کے لڑکا ہونے میں شبہ کی گنجائش نہیں۔ علامات سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ......."

"اور پھر ڈاکٹروں نے معائنہ کیا ہے" ہیملٹ نے بات کاٹ کر کہا "اور تصدیق کی ہے کہ یہ تو لڑکا ہے کوئی انسانی قوت اب اسکو پھر لڑکی نہیں بنا سکتی۔"

میں نے پلنگ پر کروٹ بدلکر کہا "سمجھ میں نہیں آتا۔ تم لوگ سنی سنائی باتوں پر یقین کیوں کر لیتے ہو۔ میں پوچھتا ہوں۔ کیا تم نے خود دیکھا ہے؟"

"دیکھا تو نہیں" شاہ نے اپنی بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں میں چمک پیدا کر کے کہا۔ "مگر ان باتوں پر یقین نہ کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہو سکتی ہے۔ اس لڑکے کی چال ڈھال میں اور بات چیت میں، وہی بات ہے۔ وہی زنانہ پن ہے۔ جو پہلے تھا۔ ابھی مردانگی نہیں آئی ہے گی!"

ہم نے آہستہ سے طنزاً کہا۔ "او شاہ! انگلی دانتوں پر رکھ کر وہ کہتا ہوگا۔ "اوئی اللہ! میں کیا کروں؟ یہ موئے کالے ایسا کاہے کو گھور رہے ہیں مجھے؟ میں تو لڑکی ہوں!" کیوں سچ نا؟ یہی کہتا ہوگا نا وہ لڑکا؟!"

---

[1] "گِدّا" حیدرآبادی لفظ ہے۔ اسکے معنی ہیں پستہ قد۔ چنانچہ خاص حیدرآبادی آیت ہے "بالشت بھر آدمی فتنہ" جسکی تفسیر ہے "ٹھنگنے آدمی فتنہ ہوتے ہیں۔"

ڈاکٹر ہنس کر کہنے لگے "اور ڈرامہ میں عورت کا پارٹ کرنے کے واسطے اس سے بہتر کون مل سکتا ہے شاہ!
——بھئی ایسی باتیں رہنے دو۔ ہم کو ذرہ برابر اعتماد نہیں ان پر"

میں نے شاہ سے چپکتے ہوئے تعبیس بالوں کو تکتے ہوئے کہا "اچھا اس کے بالوں کے بارے میں بھی کوئی روایت مشہور ہے؟ وہ کیا ہے؟"

"کہا جاتا ہے جس صبح کو اس لڑکی میں یہ زبردست تبدیلی واقع ہوئی اس کی رات کو لڑکی کے بال بستر پر یوں کٹے ہوئے پائے گئے جیسے کسی ماہر حجام نے کاٹے ہوں"

[illegible] چوٹی غائب ہے اور مردانہ بال موجود ہیں [illegible]

میں نے ایک مریض کی طرح مسکرا کر کہا "میں سکھوں کو [illegible] چوٹی کا جھوٹا [illegible] علاج معلوم ہوتا ہے نا بالکل؟"

ہیملٹ پلنگ پر لیٹ کر ہنسنے لگے۔ ہیملٹ کی یہ خصوصیت خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ ان کو لیٹ کر کئی کام کرنے آتے ہیں۔ مثلاً پان کھائیں گے تو لیٹ کر۔ سگریٹ سلگائیں گے تو لیٹ کر۔ پڑھیں گے تو لیٹ کر۔ ناچیں گے تو لیٹ کر۔ کسی دوست سے ملاقات اور بات چیت کریں گے تو لیٹ کر۔ سوچیں گے اور دن بھر کوئی کام کئے بغیر سوچتے رہیں گے۔ تو لیٹ کر۔ تصور جاناں کریں گے تو لیٹ کر۔ اور سب سے بڑھ کر ہنسیں گے اور ہنستے چلے جائیں گے تو لیٹ کر۔ بلکہ گدھے کی طرح لوٹ لوٹ کر۔ اب دو ایک کام ہی رہ گئے ہیں جو وہ لیٹ کر نہیں کرتے۔ یعنی کھانا پینا لکھنا وغیرہ (حوائج ضروری سے فارغ ہونے کا ذکر میں نے عمداً نہیں کیا ہے) مگر وہ دن دور نہیں جبکہ وہ یہ بھی کرنے لگیں۔ آثار و قرائن سے تو یہی ظاہر ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے لیٹنے کے طریقے بھی عجیب و غریب ہوتے ہیں کبھی پلنگ پر جسم بے حس بنے پڑے ہیں تو کبھی د کی شکل میں لیٹے ہیں۔ کبھی ہمزہ (ء) بنے ہوئے دراز ہیں۔ تو کبھی نیچے پاؤں دھڑ لٹکائے "محو لیٹ" ہیں۔ اسی "مرض" کی وجہ سے میں نے انہیں "لیٹ ہیملٹ" کا خطاب عطا کیا ہے!

شاہ کہنے لگے "...... اور صرف یہی نہیں۔ اس لڑکی کی چوڑیاں ٹوٹی ہوئی بستر پر پائی گئیں اور لوگوں کا خیال ہے کہ ......"

"مگر میرا خیال ہے۔ ان باتوں اور چوڑیوں کو عجائب خانہ میں محفوظ رکھنا چاہئے" میں نے طنزاً کہا۔

ڈاکٹر قہقہہ مار کر بولے "نہیں۔ بالوں کا تعویذ بنا کر پیارے شاہ کے گلے میں ڈال دینا چاہئے۔ اور چوڑیوں کو جوڑ کر ان کی نازک کلائی میں"

یہ بات ڈاکٹر نے اس لئے کہی تھی کہ شاہ چڑنے اور ناک بھوں چڑھانے کا خوبصورت مظاہرہ کریں گے لیکن وہ تو ہنسا کئے چپ ہو رہے مگر ہیملٹ چڑ گئے۔ شاہ کی نمائندگی کر کے کہنے لگے "ڈاکٹر آپ کیسا بھونڈا مذاق کرتے ہیں یہ بھی کوئی ہنسنے کی بات ہے!"

میں نے جھٹ سے کہا "یہ ہنسنے ہنسانے کی بات نہیں۔ بلکہ رونے رلانے کی!"

ڈاکٹر میری طرفداری پر خوش ہوگئے۔ کہنے لگے "اگر سچ مچ شاہ لڑکی ہوجائیں۔ تو......"
میں نے بے اختیار ہوکر اپنا لاغر ہاتھ جلدی سے بڑھایا۔ جو نقاہت کی وجہ سے ابتک سینما کے "سلوموشن" کا عادی ہوچکا تھا۔ بول اُٹھا۔ "واللہ! کیا بات سوجھی ہے ڈاکٹر تمہیں! اگر سچ مچ شاہ لڑکی ہوجائیں تو بڑا مزا آئے" ہیملٹ تو دن رات دل سے یہی دعا کرتے ہوں گے۔ خدا کرے ان کی دعا قبول ہوجائے!"
شاہ جھینپ رہے تھے۔ ڈاکٹر مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہورہے تھے۔ اور ہیملٹ رونی صورت بنا رہے تھے۔ میں سمجھ گیا۔ گھٹا چھاگئی ہے۔ اب کوئی دم میں ابرِ بہار کی طرح یہ رو پڑیں گے۔ خدا خیر کرے۔
ڈاکٹر نے ہنسنے سے فرصت پاکر کہا "افسوس کہ فاضل اس وقت یہاں نہیں ہے۔ ورنہ بڑا مزا آتا۔ مارے خوشی کے شاہ کو ساتھ لیکر ناچنے لگتا۔ دیوانوں کی طرح۔"
گلے کی رگیں پھلا کر ہیملٹ گرج کر کہنے لگے "ڈاکٹر صاحب! آپ احمق ہیں۔ بلکہ احمق الحمقا ہیں! آپ کو مذاق کرنا کب آتا ہے؟ بلکہ مذاق سمجھنے تک کا حوصلہ نہیں۔ مجھے آپ سے سُن کر سخت کوفت ہوتی ہے۔ آپا خیال شریف ہیں؟ آپ ہماری سوسائٹی کے قابل نہیں۔ بڑے لچر لوچ خیالات ہیں آپ کے۔ آپ کا مذاق خراب ہو۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ شاہ وغیرہ آپ کی صحبت کیسے گوارا کرتے ہیں؟ آپ......"
یکایک مشین گویا رک گئی ہیملٹ بیچ تقریر میں یوں ٹھیر گئے۔ گویا فالج اُن پر یکبارگی گرا ہو۔ بولنے لگیں گے تو لگاتار بولتے ہی چلے جائینگے بے تحاشا۔ اس طور پر کہ مشاق سے مشاق شارٹ ہینڈ لکھنے والے کو بھی مصیبت کا سامنا ہوجائے۔ اور بولتے بولتے دفعتاً خاموش ہوجائینگے تو یوں ہونٹ سی لینگے گویا قیامت تک بلکہ اس کے بعد بھی چُپ شاہ کا روزہ ہے۔ اور جب ہم انہیں سلسلۂ کلام جاری رکھنے پر مجبور کریں۔ تو یہ ظاہر کرینگے کہ ماشاء اللہ سے گونگے بھی ہیں اور بہرے بھی!
لیکن ڈاکٹر بُرا نہ مان کر زندہ دلی سے بولے "ہیملٹ! تم لاکھ خفا ہو۔ مگر شاہ کے عورت ہوجانے پر شادی کی درخواستیں جتنی بھی ان کے چچا صاحب کے پاس آئیں مگر اُن سب میں اس خاکسار کا نام سب سے اوّل رہے گا۔ انشاء اللہ! کیونکہ تمہارے سے میرے حقوق زیادہ ہیں۔ اور ہیملٹ تم یہ سُنکر یقیناً خوش ہوگے کہ شاہ کی شادی بھی انشاء اللہ با بدولت ہی سے ہوگی!"
ڈاکٹر مارے خوشی کے جامے سے باہر ہورہے تھے تو ہیملٹ مارے غصہ کے آپے سے باہر۔ شاہ شرم سے پانی پانی ہورہے تھے تو میرا صاحب فراشِ دل اس دلخوش کُن خیال کا خیال کرکے باغ باغ ہورہا تھا۔
ڈاکٹر نے آخری ضرب لگائی۔ "ہیملٹ! کیا سمجھ رکھا ہے تم نے مجھے؟" انھوں نے سگریٹ پھینک کر ہنستے ہوئے کہا "ایسی لائق فائق اور گریجویٹ بیوی مجھے کہاں ملے گی؟ ہم دونوں مل کر ریاضی کے مسئلے حل کرینگے! ...... اور شادی کے بعد ہمیں یہ پُرمسرت خبر ملے گی کہ ہیملٹ نے آخر خودکشی کرلی!"
ہیملٹ تو پہلے سے آپے سے باہر ہوہی رہے تھے۔ اب آپے، احاطۂ انسانیت اور گھر چاروں سے باہر ہوگئے!

# مقہور تارہ

(از لارڈ ڈلٹن)

مترجمہ جناب نور الحسن برلاس۔ بی۔ ایس۔ سی۔ بی۔ ٹی (علیگ)
(پروفیسر ٹوکیو یونیورسٹی (جاپان)

تارے اپنے جواہر نگار تختوں پر بیٹھے ہوئے دنیا کے انتظام میں مصروف ہیں۔ سال کی آخری رات ہے۔ آدھی رات ہوتے ہی نیا سال شروع ہونے والا ہے۔ آج کی رات سب تاروں کے سال بھر کے کام کی جانچ کیجاتی ہے اور حضرت جبرئیل انکو گذشتہ سال کا کام سپرد کرتے ہیں۔ انسانوں اور سلطنتوں کی قسمتیں آئندہ سال کے واسطے مقرر ہوجاتی ہیں اور ہمارے علم بغیر ہمارے متعدد تاروں سے وابستہ ہوجاتے ہیں۔ اس موقعہ پر سنسان عالم ہوتا ہے۔ سنجیدگی بھری خاموشی ہر طرف چھائی رہتی ہے کہ دفعتہً سیاہ پھاٹک کھلتے ہیں اور پرانے سال کا بھوت الوداع کہنے کے لئے اندر داخل ہوتا ہے اور نوزائیدہ اجنبی ازل کی ابر آلود فضا کر نمودار ہوتا ہے کہا جاتا ہے کہ اس رات بھوتوں کو عجیب طاقت عطا ہوتی ہے مُردے قبروں میں جھنجھوڑے جاتے ہیں آدمی نئے سال کی خوشی میں عیش و طرب کے جلسے کرتا ہے جنات اور فرشتے اپنے مقدر پر جھگڑتے ہیں۔

آسمان پر رات کی تاریکی چھائی ہوئی ہے۔ ہر طرف بھیانک خاموشی ہے اور تاروں کے فرشتے بھی آواز نہیں نکالتے، ستر ہزار تاجداران روشن تختوں کو زیب دیتے ہیں۔ ازلی جوانی نے ان کے چمکیلے اعضا کو روحانی حُسن بخشا ہے اور انکے لبوں پر خاموشی کی مہر لگی ہے۔ ایسی خاموشی جو نہ تو ان قسمتوں کو محسوس کرتی ہے اور نہ ان سے ہمدردی کرتی ہے جن پر وہ حکمران ہیں۔ ان کے زیر اثر جنگ، طوفان، وبا، سلطنتوں کا عروج و زوال اس قسم کے واقعات ہمیشہ ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن ان کو ان واقعات سے نہ خوشی حاصل ہوتی ہے اور نہ ان کے دل میں رحم پیدا ہوتا ہے۔ وہ خوفناک اور شرمناک جُرم جو رات کے اندھیرے میں کئے جاتے ہیں۔ قزاق برہنہ خنجر ہاتھ میں لئے ہوئے چُپ چاپ اپنے شکار کی تلاش میں نکلتا ہے اور اکیلے دوکیلے پر قابو پاکر خنجر کی پیاس بجھاتا ہے، غیر منکوحہ ماں چُھپ کر گھر سے نکلتی ہے اور اپنی عصمت کی بربادی کے زندہ پھل کو دریا میں ڈال آتی ہے، ننھے بچے کی آواز سُنتی ہے اور رحم نہیں آتا۔ پانی کے تھپیڑے کی آواز سُنتی ہے اور خوف نہیں کھاتی۔ یہ اور اسی قسم کے اور جرائم کی طرف یہ تارے خبیث خصائل کو آمادہ کرتے ہیں لیکن گناہ سے ان کی چمک کم نہیں ہوتی اور نہ ندامت سے انکے نوخیز چہروں پر جُھریاں پڑتی ہیں، ہر تارہ کے سر پر شاہی تاج رکھا ہے اور ہر ایک کی کمر میں پیٹی بندھی ہے جس پر عجیب و غریب نشانات کندہ ہیں۔ ہر ایک کا پاؤں ایک آتشی گولہ پر رکھا ہے اور جھکنے میں ہر ایک کا داہنا ہاتھ گھٹنے پر پڑا ہوا ہے سوائے اُنگشت شہادت کے ان کا کوئی عضو حرکت نہیں کرتا۔ کلمہ کی انگلی سے وہ کبھی کبھی اشارہ کرتے ہیں اور اس کے ذریعہ سے انسانوں کی قسمتوں میں تبدیلیاں کرتے ہیں اسی طرح جیسے گھنٹے کی سوئیاں وقت ظاہر کرتی ہیں۔

ان ستر ہزار تاروں میں صرف ایک کا حلیہ دوسروں سے مختلف ہے۔ یہ سب سے چھوٹا ہے اور چمک میں بھی کم ہے دوسرے تاروں کی طرح اس کے چہرہ سے خوفناک خاموشی کے آثار ظاہر نہیں ہوتے بلکہ اس کی پیشانی پر بے صبری اور پیچ و تاب نمایاں ہے۔

اس تارہ نے اپنے دل میں کہا "مجھے اپنے ساتھیوں سے کم شاندار بنایا گیا ہے اور جبریئل میرے سپرد عظیم الشان قسمتیں نہیں کرتا۔ میرے حوالے نہ تو بادشاہوں اور شاعروں کی قسمتیں کیجاتی ہیں جو سلطنتوں پر حکومت کرتے ہیں اور نہ ان سے زیادہ شریف انسانوں یعنی عارفانِ خدا کی قسمتیں میرے ہاتھ میں دیجاتی ہیں۔ میرے سپرد ایسے آدمیوں کی قسمتیں ہوتی ہیں۔ جن کا مقدر بگڑا ہوا ہے اور جن کی زندگی غیر معروف انجام پر ختم ہوتی ہے۔ آخر اس کا سبب کیا ہے؟ کیا یہ میرا قصور ہے یا بے خطا مجھ کو اور بھائیوں کی نسبت کم چمکدار شعاعوں سے بنایا گیا ہے؟ جب جبریئل آئے گا تو میں اپنا تاجدار سر اس کے آگے خم نہیں کرونگا میں وہی کروں گا جو ہمارے دوست اعلیٰ ابلیس نے کیا تھا۔ اس نے اپنی شان پر نازاں ہوکر بغاوت کی، میں اپنی گمنامی سے نالاں ہوکر بغاوت کرونگا۔ اس نے غرور کے نشہ میں بغاوت کی میں بے صبری کے اضطراب میں بغاوت کروں گا۔"

یہ تارہ اسی طرح اپنے دل سے باتیں کر رہا تھا کہ آسمان اس طرح پھٹ گیا گویا روشنی کا دریا بہنے لگا اور دریا پر سے جبریئل فرشتہ بغیر کسی آواز کے تیزی کے ساتھ اُڑتا ہوا آیا۔ اس کے بڑے بڑے اعضا گویا سیال روشنی پر تیر رہے تھے۔ اور اس کے پھیلے ہوئے بازو جو سورج سے زیادہ درخشاں تھے، اس کو خاموشی سے اُڑائے جا رہے تھے۔ لیکن گہرے بادلوں نے اس روشنی کو انسانوں کی نگاہ سے چھپا رکھا تھا اور جب کہ آسمان اس کی روشنی سے بقعۂ نور بنا ہوا تھا زمین پر آندھی اور طوفان برپا تھے۔

تاروں کے چہروں کی خاموشی زیادہ بڑھ گئی اور ان کی ہیبت ناک صورتیں ہیبت زدہ ہوگئیں، انکے تختوں کے اوپر جبریئل آکر ٹھیرا۔ اس کے بازو مشرق سے مغرب تک پھیلے ہوئے تھے اور روشنی کی کثرت نے فضا کی بے پایانی کو چھپا لیا تھا۔ پھر اس نے خدا تعالےٰ کی نقابت کا فرض ادا کیا اور دہشت ناک آواز سے خاموشی کو توڑا اور ہر تارہ کو اس کا مقررہ کام سپرد کر دیا جبریئل کا حکم سنکر ہر تارہ نے اپنا سر اور بھی نیچے جھکا لیا اور آواز کی دہشت سے ہر تارے کا تخت لرزنے لگا۔ آخرکار جب ہر تارہ کو خدا کا فرمان پہنچ چکا اور زمین کے باشندوں پر خدا کی نیابت عطا ہوچکی تو جبریئل اس چھوٹے تارہ سے مخاطب ہوا جو سب سے الگ منہ پھلائے بیٹھا تھا۔

جبریئل نے کہا "مغرب کی غیر مہذب قومیں، دریا کے ماہی گیر اور جنگلوں کے شکاری یہ سب تیرے سپرد ہیں۔ اور انکی قسمتوں کی باگ تیرے ہاتھ میں دیجاتی ہے۔ اے مدھم تارے! یہ نہ خیال کر تیرے فرائض تیرے ساتھیوں کے فرائض سے درجہ میں کم ہیں کیونکہ تیرے اور میرے آقا کے آگے دہقان بادشاہ سے کم نہیں ہے اور نہ یہ بات ہے کہ سلطنتوں کا عروج و زوال عام آدمیوں کی نسبت بادشاہ پر زیادہ منحصر ہو۔ تاروں کی حکومت جذبات پر ہے اور وہ بہت بڑی سلطنت ہے مشرقی ممالک کے بادشاہوں کے زریں لباس کے اندر جو دل پوشیدہ ہے اس کے جذبات کی حکومت شان میں ان جذبات کی حکومت سے زیادہ نہیں ہے

جو چرواہے کی پھٹی پرانی گدڑی کے اندر چھپے ہوئے دل میں پیدا ہوتے ہیں"!

تب اس تارہ نے اپنا سر اُٹھایا، اور جبرئیلؑ سے کہا: "زمانہ گذر گیا اور تو ہر سال مجھے وہی ذلیل کام دیتا ہے اے جبرئیل! میں تیری منت کرتا ہوں مجھے ایسے کام سے نجات دے جس سے مجھے نفرت ہے یا اگر تو یہ چاہتا ہے کہ انسانوں کے حقیر طبقے میرے سپرد ہوں تو میرے حوالہ بہت سے انسانوں کی قسمت نہ کر بلکہ صرف ایک آدمی کی اور مجھے اجازت دے کہ اُس میں اُس جوش کی روح پھونک دوں جو زندگی کے نشیب و فراز کی پرواہ نہیں کرتا اور بلندیوں پر چڑھا کر آدمی کو معراجِ زندگی پر پہنچا دیتا ہے۔ اگر حقیر لوگ میرے سپرد ہوں تو ان میں ایک ایسا ہو جس کو میں ایسے راستہ پر چلا سکوں کہ مغرور لوگوں کا غرور توڑ سے۔ اے تاروں کو مقرر کرنے والے! ہزاروں لاکھوں برس سے میں اپنے تخت پر اکیلا بیٹھا ہوا نیچے کی چیزوں کی دیکھ رہا ہوں تو میری روح نے وہاں کے تغیرات سے عقل حاصل کر لی ہے زمین کی قوموں کو دیکھکر میں نے معلوم کر لیا ہے کہ انسانوں کے گروہوں پر کس طرح حکومت کی جاتی ہے اور ان راستوں کا پتہ چلا لیا ہے جن پر چل کر کمزور طاقت ور بنجاتا ہے اب میں ایسے انسان کا حاکم بنا چاہتا ہوں جو کمزور ہو لیکن حکومت کی خواہش رکھتا ہو"

یہ سُن کر جبرئیل کی پیشانی پر ایسی فوری تبدیلی پیدا ہوئی جیسے گرمیوں میں دوپہر کو یکایک بادل نمودار ہو جاتا ہے نقیب نے کہا: "او مغرور و مغموم تارے! تیری خواہش اس غیبی قوت کی تجاویز سے بغاوت کرنیوالی ہے جو وہاں اوپر بیٹھکر تمام عالموں پر حکومت کرتی ہے اور سب میں اتفاق قائم رکھتی ہے وہی چشمہ ہے جہاں سے قسمت کے چھوٹے چھوٹے دریا اُبل کر موجودات کے دل میں بہتے ہیں۔ کیا تو خیال کرتا ہے کہ تیری عقل بذات خود ایک دہقان کو بادشاہ بنا سکتی ہے"؟

تاجدار تارہ نے نڈر ہو کر جبرئیل کی طرف دیکھا اور کہا "ہاں! مجھے صرف ایک موقعہ امتحان کا عطا ہو"۔

جبرئیل کے جواب دینے سے پہلے آسمان بیچ میں سے اس طرح پھٹ گیا گویا کہ بجلی کوند گئی اور آسمانی نقیب نے اپنا چہرہ ہاتھوں سے چھپا لیا اور ایک ہلکی اور باریک اور شیریں آواز نے جس میں لازوال قوت ظاہر ہوتی تھی مغموم تارہ سے کہا: "اب وقت آگیا ہے کہ تیری التجا قبول کی جائے۔ جا! تیرے نیچے اس سنسان جنگل میں ایک آدمی تجھ جیسا اُداس بیٹھا ہے جا! اُس آدمی کی قسمت تیرے سپرد کی جاتی ہے وہ تیرے ہی زیر اثر پیدا ہوا تھا اور تیری ہی مرضی کے مطابق تربیت پا سکتا ہے"۔

یہ کہکر وہ آواز اس طرح غائب ہو گئی جیسے خواب میں ہو جاتی ہے۔ عالم فضا میں خاموشی غالب تھی۔ جبرئیل اُٹھا اور آہستہ سے اُٹھکر آسمان کے دوسرے سرے پر چلا گیا۔ کہ خدا کا حکم بعید ترین تاروں کو پہنچا دے لیکن اس بے صبر تارہ کی روح خوشی سے پھڑپھڑائی اور اس نے اپنے دل میں کہا: "میں چرواہوں میں سے بادشاہ پیدا کرونگا۔ جو اُن بادشاہوں کو پامال کر دے گا جو میرے ساتھیوں کے زیر اثر ہیں اور حقیر تارہ کے محکوم کو اپنے خوش قسمت

بھائیوں کے محکوم بادشاہوں سے زیادہ شاندار بناؤنگا اور اس طرح غفلت کا بدلہ لونگا۔ اور زمین کے بڑے بڑے لوگوں کی قسمت پر اپنا حق ثابت کردونگا"

---

اس زمانہ میں اگرچہ دُنیہ قرنوں سے آباد تھی اور انسان زندگی کے مختلف مدارج طے کرچکا تھا تاہم مغرب میں ہماری نسل کی حالت ایسی تھی جو وحشیانہ زندگی سے کچھ ہی بہتر کہی جاسکتی ہے۔

پتھروں کے بدنما اور بڑے ڈھیر کے پاس، جو شاید کسی زمانہ میں فن معماری کی صنعت کا نمونہ ہو ایک آدمی آدھی رات کو اکیلا بیٹھا ہے۔ ایک طوفان ابھی اپنا زور ختم کرچکا ہے، بادل اُڑ گئے ہیں اور بلند تاروں کا عکس دریائے ٹیگس کے پل رواں میں صاف نمایاں ہے، گھنے درختوں سے پانی کی ٹپ ٹپ کی آواز سنائی دیتی ہے، ان آوازوں کے سوا ہر طرف سُنسان ہے، سفید بھیڑیں درخت کے نیچے سے نکل کر میدان میں جا کھڑی ہوئی ہیں۔ اور سونے کی تیاری کررہی ہیں۔ یہ آدمی ان بھیڑوں کی نگہبانی کررہا ہے، تاکہ قرب وجوار کا کوئی حریف قبیلہ ناگہانی چھاپہ نہ مار سکے، وہ خاموشی میں اپنے دل سے یہ باتیں کررہا ہے: "بادشاہ اپنے تخت پر بیٹھا ہے اور ایک جنگجو قوم اس کی عزت کرتی ہے، بہادر سورما اپنے جنگی کارناموں پر نازاں ہے، شکاری دلیری سے پہاڑ اور جنگل چھانتا پھرتا ہے اور شاعر رات کے وقت الاؤ پر اس کے نام کے گیت گاتا ہے۔ شاعر بھی دربار میں عزت کی جاتی ہے۔ ایک میں ہوں کہ نہ تو شاہی خاندان سے تعلق رکھتا ہوں، نہ میرے اعضا میدان جنگ میں پھرتی دکھانے کے قابل ہیں، نہ عقاب کے گھونسلے کا پتہ لگا سکتا ہوں، نہ ہرن کا تعاقب کرسکتا ہوں، نہ میرا ہاتھ ستار پر چل سکتا ہے اور نہ میری آواز گانے کے کام کی ہے نہ مجھے عزت حاصل ہے نہ حکومت۔ جب میں بازار میں نکلتا ہوں تو میری کوئی تعظیم نہیں کرتا۔ مگر مجھے اپنے اندر ایک بڑی قوت محسوس ہوتی ہے جو دوسروں کی اطاعت کرنا نہیں چاہتی۔ بلکہ اس میں حکومت کرنے کی قابلیت ہے۔ میری نظر آدمیوں کے دلوں میں گھس جاتی ہے اور میں لب کھولنے سے پیشتر ان کے خیالات معلوم کرلیتا ہوں، مجھے کمزوری اور کم ہمتی سے نفرت ہے کیونکہ یہ عیب مجھ میں ہیں ہی نہیں۔ مجھے بہادروں کے جوش پر ہنسی آتی ہے اور میں بادشاہوں کے ظلم کا مذاق اڑاتا ہوں۔ یقیناً آدمی کی فطرت میں زور بازو، تیز رفتاری اور خاندانی شرافت سے بڑھ کر کوئی شئے اور موجود ہے جو اسے حکومت اور شہرت کے لئے موزوں بناتی ہے"۔

جب شاطر بن دھوبیا آسمان کی طرف منہ کئے ہوئے اس طرح اپنے دل سے باتیں کررہا تھا تو اس نے دیکھا کہ ایک تارہ یکایک ٹوٹ کر ہوا میں چلا اور دریا کے ٹھیک اوپر آکر ٹھہر گیا۔ اور اس کے دیکھتے دیکھتے تیز چمکنے لگا۔ وہ تارہ کو غور سے دیکھ رہا تھا کہ اس کے دل میں عجیب عجیب خیالات پیدا ہوتے گویا اس نے تارہ کی چمک سے ایک عجیب خوشگوار مستقبل کی روح حاصل کرلی۔ تھوڑی دیر میں ایک بادل سامنے آگیا اور تارہ اس میں چھپ کر نظر سے غائب ہوگیا۔ لیکن اس کے دل میں خیالات کی ایک فوج اُمنڈ آئی تھی۔

جب آفتاب طلوع ہوا تو اس کی برادری کا ایک آدمی گلہ کی نگہبانی کو آگیا اور شاطر وہاں سے چل دیا۔

وہ اپنے باپ کے گھر نہیں گیا بلکہ خیالات میں غرق جنگل میں چلا گیا اور تنہائی میں غور و خوض کرنے کے بعد اپنے پریشان خیالات کو جمع کر کے ایک خوش آئند مستقبل کا خاکہ ذہن نشین کر لیا۔ وہ انہی خیالات میں غرق تھا کہ دور سے آدمیوں کی آواز سنائی دی اور اس ڈر سے کہ کہیں بربوت کے حریف قبیلہ کے آدمی نہ ہوں صنوبر کے گھنے پتوں والے درخت پر چڑھ گیا۔ پتوں میں سے اسے ہتھیاروں کی چمک نظر آئی اور تھوڑی دیر میں اسی قبیلہ کے آدمیوں کی ایک مختصر ہتھیار بند جماعت آتی ہوئی دکھائی دی۔ یہ پتوں میں اچھی طرح چھپا ہوا تھا اور جب وہ جماعت قریب آئی تو اس نے یہ باتیں سنیں:

ایک شخص: "رات ہر شئے کو چھپا لیتی ہے۔ ان پر دن کو حملہ کیوں کریں؟"

دوسرے شخص نے جو وضع سے اس جماعت کا سردار معلوم ہوتا تھا یوں جواب دیا: "درست" آج رات کو جب وہ اپنے شہر میں سوتے ہونگے تو ہم ان پر جا پڑینگے۔ وہ شراب میں مست ہونگے اور ہم بھیڑ بکریوں کی طرح ان کا صفایا کر دینگے۔"

تیسرا شخص: "لیکن اے سردار ہمارے آدمی دن کے وقت کہاں چھپینگے؟ کیونکہ ترکن قبیلہ کے نوجوانوں میں بہت سے شکاری ہیں اور اگر کسی نے ہم کو جنگل میں دیکھ پایا تو اپنی قوم کو ہمارے آنے کی خبر کر دے گا۔"

سردار: "میں نے اس کے لئے تجویز سوچ رکھی ہے۔ کیا بولن کا غار قریب نہیں ہے؟ کیا وہ ہمیں ہمارے شکاری کی نظر سے نہیں چھپا لیگا؟"

تب ان آدمیوں نے زور سے قہقہہ مارا اور خوشی کے نعرے مارتے ہوئے غار کی طرف روانہ ہوئے۔ جب وہ آدمی نظر سے غائب ہو گئے تو شاطر احتیاط سے اترا اور تیزی سے اس گھاٹی کی جانب روانہ ہوا جو دریا اور جنگل کے درمیان واقع تھی اور جہاں قوم کا سردار رہتا تھا۔ شہر کے بازاروں میں جنگجویانِ قوم کا جگہ جگہ مجمع تھا جن کا قد اس زمانہ میں دیوؤں کے برابر تھا۔ ان کی پیٹھ پر ترکش تھے۔ اور ہاتھ میں شکار کی نیزے۔ جب انھوں نے شاطر کو دیکھا تو ہنسے اور اس کی طرف انگلی اٹھا کر کہا: "او شاطر عورت! او شاطر لنگڑے! تیرا مردوں میں کیا کام ہے؟"

کیونکہ شاطر کا قد چھوٹا تھا اور اعضا کمزور تھے اور اس کے پاؤں میں پیدائش سے قدرے لنگ تھا۔ لیکن وہ پہلوانوں کے طعنہ پر توجہ کئے بغیر ان میں گذر گیا اور شہر کے کنارے ایک وسیع عمارت کے پاس پہنچا۔ جہاں معمر آدمی رہتے تھے جو بادشاہ کو خطرہ کے موقعوں پر مشورہ دیتے تھے۔

ان بزرگوں کے مشورے تجربے پر مبنی ہوتے تھے اور اگر کسی مسئلہ میں تجربہ ان کی مدد نہ کرتا تھا تو وہ آسمانی ہواؤں اور چاند کی تبدیلیوں اور پرندوں کے پرواز سے شگون لیتے تھے۔ چونکہ بالائی قوتوں کا یقین انکے دلوں میں پختہ تھا وہ اپنی جہالت میں اوہام کے اشاروں سے رہنمائی حاصل کرتے تھے۔ لیکن اب تک وہ جعل سازی سے ناواقف تھے اور دھوکہ بازی سے کام نہ لیتے تھے۔ وہ ان قدرتی بھیدوں سے جو ان کے ایمان کو تقویت دیتے تھے اتنا ڈرتے تھے کہ انکار کرنے کی مجال نہ تھی جیسا وہ یقین رکھتے تھے ویسا ہی مشورہ دیتے تھے اور اپنے پہلوانوں اور بادشاہوں کو دھوکہ بازی سے قابو میں لانے کا خیال ان معمر بزرگوں کے خواب میں بھی نہ آتا تھا۔

دھولیا کا لڑکا دلیری سے عمارت کے اندر گھسا اور کمرہ کے بالائی کنارہ تک جہاں وہ بوڑھے آدمی بیٹھے مشورہ کر رہے تھے چلا گیا۔ اس دلیری پر سب سے بزرگ آدمی نے جو اپنے زمانہ میں مشہور پہلوان تھا۔ کہا "کیوں رے او کمینے! تو عقلمند آدمیوں کے خفیہ جلسوں میں بغیر بلائے آنے کی جرأت کرتا ہے؟ بدذات! تجھے نہیں معلوم کہ اس کی سزا موت ہے؟"

شاطر نے جواب دیا "تو چاہے تو مجھے قتل کر دے لیکن پہلے سُن لے۔ رات کو جب میں اپنے باپ کے حکم کے موجب گزشتہ با۔شاہوں نے ویران محل کے پاس بھیڑوں کی رکھوالی کر رہا تھا تو یکایک آسمان پر گھنگھور گھٹا چھا گئی۔ جب بارش کے بعد ابر کھلا اور میں نے آسمان کی طرف دیکھا تو ایک تارہ اپنے بلند مقام سے اُتر کر میری طرف آیا اور مجھ سے یوں مخاطب ہوا "اے دھولیا کے لڑکے! اپنا گلہ چھوڑ دے اور عقلمندوں کی مجلس میں جا اور ان سے کہہ کہ مجھے اپنی جماعت میں داخل کر لو ورنہ تمہاری اور تمہارے متعلقین کی بربادی قریب ہے" لیکن میں نے جرأت کر کے جواب دیا "اے روشن تارے! چرواہے کے غریب لڑکے کی ہستی نہ اڑا۔ وہ میرے منہ سے ایسی بات سُنیں گے تو فوراً مار ڈالیں گے کیونکہ میں غریب ہوں اور ترکن کے قبیلہ والوں کی نگاہوں میں میری کوئی وقعت نہیں ہے عقلمندوں کی مجلس میں صرف وہ لوگ بیٹھتے ہیں جنھوں نے بڑے بڑے کام کئے ہوں اور جنکے بال سفید ہو گئے ہوں" تب تارہ نے کہا "جیسا میں کہتا ہوں ویسا کر اور میں تجھے ایک نشانی دونگا کہ تو ان قوتوں کا پیغام لایا ہے جو موسموں اور ہواؤں پر حکومت کرتی ہیں۔ عقلمندوں سے کہنا کہ اگر مجھے اپنی جماعت میں داخل کرنے سے انکار کرو گے تو تمہارا برا ہوگا اور صبح خون میں ہوگی" یہ کہکر وہ تارہ چھپ ہو گیا اور بادل نے اسے چھپا لیا۔ پھر میں نے اپنے دل میں غور کیا اور اے محترم بزرگو! اب تمہارے پاس ڈرتے ڈرتے آیا ہوں کیونکہ مجھے خوف معلوم ہوا کہ میری زبان کی دلیری پر تم مجھے سزا دو گے اور ایسی شئے طلب کرنے پر جو بادشاہوں کے لڑکوں کو بھی نہیں ملتی ہے تم مجھے مار ڈالو گے۔ مگر تارے کی نشانی کا مجھے زیادہ ڈر ہے کہ کہیں میری قوم تباہی میں مبتلا نہ ہو"

تب وہ سنجیدہ بزرگ حیرت میں ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے اور خاموش تھے کہ چرواہے کے لڑکے کو کیا جواب دیں۔ آخر ان میں سے ایک نے کہا "یقیناً دھولیا کا لڑکا سچ کہتا ہے کیونکہ اسے آسمان کی بڑی روشنیوں کے متعلق جھوٹ باور کرانے کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ اگر وہ عام آدمیوں کے سامنے تارے کی باتیں بیان کر دیتا تو ضرور ہم اس کی سچائی میں شک کرتے۔ لیکن رات کے دیوتاؤں کا انتقام برداشت کرنے کی طاقت کس میں ہے"

اس پر دوسرے بزرگوں نے پسندیدگی سے اپنا سر ہلایا لیکن ان میں سے ایک نے جواب دیا "کیا ہم چرواہے کے لڑکے کو اپنا ہم رُتبہ بنا لیں؟ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا"

جس شخص نے یہ جواب دیا اس کا نام پوشا تھا اور اس کے الفاظ دوسروں کو اچھے معلوم ہوئے اس پر شاطر نے بہت ادب سے جواب دیا "اے بادشاہوں کے صلاح کارو! درحقیقت میں تمہارا ہم رتبہ بننے کی خواہش نہیں رکھتا۔ میرے لئے یہ کافی ہے کہ میں تمہارے محل کی دربانی کروں اور تمہاری خدمت اس

طرح کروں جیسے دھولیا کے لڑکے کو کرنی چاہئے۔

تب ان بزرگوں کے سردار نے جو سب سے زیادہ عقلمند تھا دریافت کیا "تو ہمیں آنیوالی مصیبت سے کیسے نجات دے گا؟ یقیناً تارے نے اس خدمت سے تجھے مطلع کر دیا ہوگا۔ جو ہماری جماعت میں داخل ہو کر انجام دے گا اور تیرے شریک نہ کرنے سے جو مصیبت ہم پر آئے گی وہ بھی تجھ کو بتا دی ہوگی"۔

شاطر نے نرمی سے جواب دیا "اگر تو اپنے خادم کو قبول کرے گا۔ تو یقیناً تارہ اس کمترین کو کچھ بتا دیگا جو تیری اس عنایت کا عوض ہو۔ لیکن اب تک میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا جتنا بیان کر چکا ہوں"۔

اس کے بعد ان معمر لوگوں نے شاطر کو ہٹا کر ایک جلسہ کیا اور بہت مباحثہ ہوا۔ اگرچہ وہ لوگ میدان میں بہت دلیر اور خونخوار تھے۔ لیکن تارے کی پیشین گوئی پر خوف سے لرزتے تھے آخر کار وہ سب شاطر کی خدمت قبول کرنے پر متفق ہوئے اور اسے دربار کے کمرہ کا دربان مقرر کر لیا۔

شاطر نے بہت ادب سے ان کا فیصلہ قبول کیا اور دروازہ پر جا کر خاموش بیٹھ گیا۔ جب آفتاب غروب ہوا اور افق کے تارے ٹمٹمانے لگے تو شاطر اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کے جسم میں لرزہ کی کیفیت طاری ہوئی" اس کے منہ سے جھاگ نکلنے لگے اور فرش پر اس طرح تڑپنے لگا جیسے کوئی نیزہ کا کاری زخم کھا کر تڑپتا ہے یہ حالت دیکھکر معمر لوگ بہت متحیر ہوئے اور اس کو زمین سے اٹھایا۔ تھوڑی دیر میں شاطر کو ہوش آیا۔ لیکن اس کی پتلیاں حلقوں میں پھر رہی تھیں۔ اس نے دریافت کیا کہ تم نے تارہ کی آواز نہیں سنی؟

بزرگوں کے سردار نے جواب دیا کہ ہم نے کوئی آواز نہیں سنی۔ تب شاطر نے ایک سرد آہ بھری اور کہا تو صرف مجھے ہی ہدایت ہوئی ہے۔ اسے بادشاہ کے صلاح کار و! فوراً فوج کو آراستہ کرو۔ تمام ہتھیار بند آدمیوں کو اور قوم کے کل جوانوں کو طلب کرو اور انہیں تلوار اور نیزہ سے مسلح کر کے میرے ساتھ کردو کیونکہ تارے نے مجھے مطلع کیا ہے کہ دشمن ہمارے ہاتھ میں اس طرح آپڑیگا جیسے جنگل کے وحشی درندے ہمارا شکار ہوتے ہیں"۔

شاطر نے یہ الفاظ حاکمانہ لہجہ میں کہے اور معمر لوگ بہت متعجب ہوئے تو اس نے کہا "کیوں توقف کرتے ہو؟ کیا رات کو دیوتا جھوٹ بولتے ہیں؟ اگر میں جھوٹ کہوں تو میری جان تمہارے حوالے ہے"۔

تب ان بزرگوں نے آپس میں مشورہ کیا اور یہ قرار پایا کہ تارے کے حکم کی تعمیل کرنی چاہئے۔ قوم کے تمام نوجوان اور ہتھیار بند اشخاص طلب کئے گئے اور سب کو تلوار اور نیزہ سے مسلح کیا گیا۔ شاطر نے بھی تلوار نیزہ لیا اور سب کے آگے آگے تارہ کو دیکھتا ہوا چلا۔ جب وہ جنگل میں داخل ہوا تو اس نے چپ رہنے کا حکم دیا اور کہا کہ پاؤں کی آہٹ نہ ہونے پائے" اس طرح وہ جنگل کے سب سے گھنے حصہ میں چلے گئے یہاں تک کہ ایک بڑے غار کے منہ پر پہنچ گئے جس کے آس پاس پرانے اور گھنے ہوئے درخت لگے ہوئے تھے۔ اس غار کا نام غاربوتن تھا۔ یہاں اس نے سرداروں سے کہا کہ مسلح آدمیوں کو دہانہ غار کے دونوں پہلوؤں پر دائیں بائیں جھاڑیوں میں چھپا دیں۔

وہ لوگ اسی طرح جھاڑیوں میں چھپے رہے یہاں تک کہ تقریباً آدھی رات گزر گئی جب کہ غار میں شور ہوا اور بوں کی آواز سنائی دی ایک مسلح آدمی باہر نکلا اور شاطر نے اس کے نیزہ رسید کیا اور وہ غار کے منہ پر ستے ہی مرگیا۔ اس کے بعد دو آدمی یکے بعد دیگرے باہر نکلے اور دونوں مارے گئے۔ پھر غار میں قبیلۂ برق صلائے جنگ کا نعرہ بلند ہوا اور مسلح آدمیوں کا دریا اُمنڈ آیا۔ قبیلہ ترکن کے آدمی چاروں طرف سے ن پر آپڑے۔ دشمن رات کی تاریکی میں اپنے تئیں حریف سے گھرا ہوا پاکر گھبرا گیا اور بڑا قتل عام ہوا۔

جب صبح ہوئی تو ترکن کے نوجوانوں نے مقتولوں کو گنا اور ان میں برق کا سپہ سالار اور سرداران رج پائے گئے۔ اس غیر معمولی کامیابی پر وہ خوشی خوشی شہر کو واپس چلے اور دہولیا کے بہادر لڑکے کو کندھوں پر ٹھاکر جلوس نکالا اور راستہ بھر "تارہ کے اوتار کی جے" کے نعرے لگاتے گئے۔

اس واقعہ کے بعد شاطر بزرگانِ ترکن کی مجلس میں شریک ہونے لگا۔

---

ترکن کے بادشاہ کی ایک لڑکی تھی اور وہ تمام قوم میں ممتاز تھی اور بہت حسین تھی۔ شاطر کو اس سے محبت ہوگئی لیکن اظہار محبت کی جرأت نہ ہوتی تھی۔

شاطر تنہائی میں لوگوں کی بیوقوفی پر ہنسا کرتا تھا۔ اس کو ان سے نہ تو محبت تھی کیونکہ انھوں نے اس کی ہنسی اڑائی اور نہ اس کے دل میں ان کا ادب تھا کیونکہ اس نے سب سے عقلمند لوگوں کو بیوقوف بنایا تھا۔ وہ ان کے عیش و طرب کے جلسوں سے دور رہا کرتا تھا اور تنہائی اور خلوت پسند کرتا تھا اس کی رہبانیت نے لوگوں کے دلوں میں اس کی عظمت اور بڑھا دی جو تاروں سے تعلق رکھنے کی وجہ سے ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ بہادر سے بہادر پہلوان دیوتاؤں کے منظورِ نظر کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے لگے۔

ایک دن وہ دریا کے کنارے پھر رہا تھا کہ اس کے سامنے سے ایک بڑا شکاری پرند اڑا اور ایک نوجوان عقاب کا تعاقب کیا جس کے بازوؤں میں ابھی تک پوری قوت پرواز نہیں آئی تھی خلوت پسند شاطر اپنے بچپن سے جنگلوں اور دریاؤں کے کناروں پر ان اشیا کا مشاہدہ کرنے کا شوقین تھا جن کو قدرت نے آدمی کا مطیع بنایا ہے اور اب ان جانوروں کو دیکھ کر اس نے اپنے دل میں کہا کہ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے کہ فریب یا قوت کے ذریعہ سے ہر شئے اپنی مماثل اشیا پر فوقیت حاصل کرنا چاہتی ہے۔ وہ اس سوچ میں تھا کہ بڑا پرندہ نو عمر عقاب پر غالب آگیا۔ اور یہ شاطر کے قدموں پر خوف زدہ اور ہانپتا ہوا گر پڑا اس نے عقاب کو زمین سے اُٹھا لیا اور شکاری پرند کو ہنکا دیا جو اپنے شکار پر قابو پانے کی غرض سے اس کے سر پر چکر لگا رہا تھا۔ عقاب کو سینے میں چھپا کر گھر لے گیا اور اسے اپنے ہاتھ سے کھلانا شروع کیا یہاں تک کہ اس کی قوت عود کر آئی اس عرصہ میں عقاب اس سے ہل گیا اور کتے کی طرح اس کے پیچھے پیچھے پھرنے لگا۔ شاطر نے اپنے دل میں کہا کہ سریع الاعتقاد بیوقوف لوگ پرندوں کے پرواز اور حرکات پر ایمان رکھتے ہیں۔ میں اس عقاب کو سدھا کر ان کی

سادہ لوحی سے فائدہ اُٹھاؤ نگا۔ پس اس نے لوگوں سے چُھپا کر اسے سدھانا شروع کیا۔

اس ملک کا بادشاہ بہت بڈھا ہوگیا تھا اور اس کے مرنے کے دن قریب آگئے تھے لوگوں کی آنکھیں اس کے دونوں لڑکوں پر لگی ہوئی تھیں۔ لیکن ان میں سے انتخاب کرنا مشکل تھا۔ ایک دن شاطر جنگل میں پھر رہا تھا کہ بادشاہ کا ایک چھوٹا لڑکا ایک درخت کے نیچے بیٹھا ہوا دکھائی دیا وہ سر جھکائے کسی سوچ میں بیٹھا ہوا تھا۔

شاطر نے آگے بڑھ کر دریافت کیا "اے تیز قدم شہباز! تو مغموم کیوں بیٹھا ہے؟"

شہزادہ نے سختی سے جواب دیا "میرا کام تجھ سے نہیں ہو سکتا، جا، اپنا راستہ لے"

شاطر بولا "تو خود نہیں سمجھتا کہ تو کیا کہتا ہے۔ کیا میں تاروں کا منظور نظر نہیں ہوں"

شہزادہ نے جواب دیا "میں فاتر العقل بڈھا نہیں ہوں کہ تیری باتوں میں آجاؤں۔ میرے آگے تاروں کا ذکر نہ کر۔ میں صرف ان چیزوں کو جانتا ہوں جنکو میری آنکھیں دیکھتی ہیں اور میرے کان سنتے ہیں"

شاطر نے اپنا چہرہ ہاتھوں سے چھپا لیا اور سنجیدگی سے کہا "خاموش اے شہزادے! خاموش! کہیں آسمان تیری جلد بازی کا انتقام نہ لے۔ دیکھ تاروں نے مجھے آدمیوں کے خیالات دریافت کرنے کی طاقت عطا کی ہے۔ میں تیرے خیالات بتا سکتا ہوں"

شہزادہ نے کہا "بتا اے کمینہ"

شاطر بولا "تو اپنے بھائی سے چھوٹا ہے اور تیرا نام میدان جنگ میں اس سے کم مشہور ہے۔ مگر تو اس پر غالب آنا چاہتا ہے اور اپنے باپ کے بلند تخت پر بیٹھنا چاہتا ہے"

نوجوان شہزادہ کا چہرہ زرد پڑ گیا اور لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہا "تیرے الفاظ میں سچائی ہے"

شاطر نے جواب دیا "سچائی میری طرف سے نہیں ہے۔ بلکہ تاروں کی طرف سے آئی ہے"

شہزادہ نے دریافت کیا "کیا تارے میری خواہش کو قبولیت عطا کر سکتے ہیں؟"

شاطر نے کہا "ہاں، وہ تیری خواہش قبول کر سکتے ہیں میں کل تجھے جواب دونگا"

یہ کہہ کر شاطر جنگل میں چلا گیا۔ دوسرے روز دوپہر کو وہ پھر ملے اور شاطر نے کہا کہ "میں نے رات کو دیوتاؤں سے مشورہ کیا تھا اور انھوں نے میری دعا قبول کر کے مجھے قوت عطا فرمائی ہے۔ لیکن ایک شرط پر" شہزادہ کے دریافت کرنے پر اس نے کہا "شرط یہ ہے کہ تو انکے نام پر اپنی بہن کی قربانی چڑھا۔ پتھروں کا ایک ڈھیر بنا اور اپنی بہن کو جنگل میں لاکر قربان گاہ پر لٹا اور اس کے سینہ میں اپنی تلوار بھونک دے تب حکومت حاصل کر سکتا ہے"

یہ سُنکر شہزادہ غصّہ سے کانپ اُٹھا اور شاطر پر نیزہ تان کر کھڑا ہو گیا۔

اتنے میں آسمان پر بادل گرجا اور شاطر نے کہا "ڈر! اے شہزادے دیوتاؤں کے غضب سے ڈر!

ان کی آواز سن جو تجھے موت سے ڈراتے ہیں کہ تو نے ان کے خادم پر ہاتھ اٹھانے کی جرات کی ہے!"

شہزادہ کے اعضا میں رعشہ طاری ہوگیا۔ اس کے ہاتھ سے نیزہ گر پڑا' اس کی آنکھیں نیچے جھک گئیں اور وہ زمین پر بیٹھ گیا۔

شاطر نے دریافت کیا: "کیا تو تاروں کے حکم کی تعمیل کریگا اور بادشاہ بنے گا؟"

شہباز نے مایوسانہ لہجہ میں کہا "ہاں، میں تیار ہوں"

شاطر نے شہباز کو نشتر، بانگاہ کی جگہ بتائی اور کہا: "آج رات کو قربانی ادا کر۔ میں تیرے لئے دعا کروں گا۔ اور تیرے ساتھ نہ آسکوں گا۔"

---

بڑے سورج کا مرنا بھی ایک دلکش سماں ہے۔ پرندوں کے آخری چہچے خاموشی کی گود میں آکر ماند پڑ جاتے ہیں بادلوں کے بزیرے روشنی میں سرشار ہوجاتے ہیں اور پہلا تارہ دن کی قبر پر پھوٹ نکلتا ہے۔

"بھائی تو مجھے کہاں لئے جاتا ہے؟ تیرا ہونٹ کیوں ہلتا ہے! اور تو اپنا منہ کیوں موڑے لیتا ہے؟" یہ سوالات موہنی نے اپنے بھائی سے پوچھے۔

"میری بہن، کیا جنگل خوبصورت نہیں ہے؟ کیا یہ تمہیں آگے چلنے پر آمادہ نہیں کرتا؟"

"اور یہ پتھر کے ڈھیر کیسے لگے ہیں؟"

"اس کا جواب دوسرے لوگ دینگے' میں نے ڈھیر نہیں لگائے"

"بھائی تو کانپ رہا ہے' چل ہم واپس چلیں"

"ابھی نہیں ان پتھروں کے پاس ایک پرندہ ہے جس کو میں نے آج تیرے چھیدا ہے' اس پرندہ کے پر بہت خوبصورت ہیں اور میں نے تیرے لئے مارا ہے"

"اب ہم اس ڈھیر کے پاس آپہنچے۔ تو نے پرندہ کہاں چھپایا ہے؟"

شہباز نے کہا "یہاں" اور اس نے لڑکی کو گود میں اٹھالیا اور قربان گاہ پر ڈال کر اپنی تلوار کھینچ لی کہ اپنی بہن کے خون سے اس کی پیاس بجھائے۔

پتھروں کے اوپر ایک پرانا شاہ بلوط کا درخت لگا تھا اور شاہ بلوط سے یا آسمان سے ایک بلند اور سنجیدہ آواز آئی۔ "اے شاہوں کی اولاد! تلوار مت چلا۔ تاروں نے تیری قربانی قبول کرلی اور تو ترکن کی قوم پر حکومت کریگا۔ لڑکی کو قتل نہ کر بلکہ تاروں کے منظور نظر سے بیاہ دے۔ اٹھ اور اپنا راستہ لے۔"

اتنا کہہ کر آواز رک گئی۔ آس پاس کسی انسان کا پتہ نہ تھا۔ موہنی کی دہشت اس کی زندگی کے چشمہ پر غالب آگئی تھی اور شہباز اسے گود میں اٹھاکر گھر لے گیا۔

دوسرے دن جب شاطر اس حوصلہ مند شہزادہ سے ملا تو اس نے کہا "افسوس! تاروں نے ایسی چیز میرے

ٹیبرولی ہے جس کی مجھے خواہش نہیں میں دنیا میں اکیلا ہوں اور لنگڑا بھی ہوں محبت کی گرمی میرے دل پر اثر نہیں کرتی۔ تو اور تیری قوم جانتی ہے کہ میں عورتوں سے آنکھ چراتا ہوں کیونکہ میرے لنگڑے پن پر اور میری اوداسی پر ہنستی ہیں۔ جس میں نے آغاز جوانی ہی میں اپنے دل سے محبت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا تھا۔ لیکن چونکہ تاروں نے مجھ سے کہا ہے اور تجھ پر ظاہر کیا ہے کہ صرف اس شادی سے اسے محبوب شہزادہ! تو صرف اس شادی سے اپنے باپ کا تخت و تاج حاصل کر سکتا ہے تو میں بھی ان کی مرضی پر راضی ہوں"

شہزادہ نے جواب دیا "لیکن جب تک میں بادشاہ نہ ہو جاؤں اپنی بہن کو تجھ سے نہیں بیاہ سکتا۔ کیونکہ تو جانتا ہے کہ اگر میں اپنی قوم کے پھول کو دھولیا چہ واہے کے لڑکے سے بیاہنے کی صلاح دوں تو میرا باپ میری ہڈیاں تک برباد کر دے گا"

"تو سچ کہتا ہے۔ گھبرا اور خوف نہ کر لیکن جب تو بادشاہ بنجائے تو قربانی ادا کرنا۔ اور موہنی میری ہونی چاہئے آہ! میں کیسے اس سے آنکھ ملانے کی جرات کر سکتا ہوں؟ لیکن رات کے دیوتاؤں کا یہی حکم ہے۔ اور ان کے حکم سے کون سرتابی کر سکتا ہے؟"

شہزادہ نے جواب دیا "جس دن میں بادشاہ ہو جاؤں گا۔ اسی روز موہنی تیری ہوگی"

اس کے بعد شاطر حسبِ عادت جنگل کو روانہ ہو گیا۔ اس نے اپنے دل میں سوچا کہ بادشاہ بڈھا ہو گیا ہے لیکن شاید میری امید کے اور میرے درمیان زیادہ عرصہ تک حائل رہے" وہ اس بات پر غور کرنے لگا کہ اس عرصہ کو کیسے کم کرنا چاہئے" بے خیالی میں وہ کہیں کا کہیں نکل گیا رات زیادہ آگئی اور وہ راستہ بھول گیا۔ راستہ کی تلاش میں اِدھر اُدھر پھرا مگر کہیں پتہ نہ چلا۔ آخر عاجز ہو کر ایک درخت کے نیچے لیٹ رہا اور رات وہیں بسر کی۔ صبح کو اسے بھوک لگی اور جھاڑیوں میں ایسی معمولی جڑوں کی تلاش کرنے لگا جن سے وہ قدرتی احتیاج پوری کرنے کا عادی تھا کیونکہ وہ ہمیشہ کھانے کی طرف سے بے پرواہ تھا۔

منجلہ اور جڑی بوٹیوں کے اُسے سُرخ رنگ کے رسیلے اور میٹھے بیر ملے جن کو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ان میں سے تھوڑے سے کھائے" وہ زیادہ دور نہ گیا تھا کہ اس کی ہچکیاں حلقوں میں پھرنے لگیں۔ سخت نجا۔ چڑھ آیا اور ہاتھ پاؤں اینٹھنے لگے" وہ کئی گھنٹہ تک اسی طرح موت کے انتظار میں زمین پر پڑا رہا لیکن اس کا لاغر جسم اور اس کی محتاط زندگی زہر پر غالب آگئی، سخت درد اور اینٹھن کے بعد آہستہ آہستہ اس کی طبیعت سنبھلنی شروع ہوئی۔ جب چلنے پھرنے کی طاقت آئی تو لڑکھڑاتا ہوا اس جگہ پہنچا جہاں وہ زہریلے بیر ملے تھے اور بہت سے توڑ کر اپنی جیبوں میں رکھ لئے اور شام ہونے پر گھر چلا گیا۔

دوسرے روز وہ اپنے باپ کے گلے میں گیا" ایک بھیڑ کا بچہ پکڑا اور اس کے منہ میں بیر ٹھوس کر حلق میں اُتار دیئے۔ بھیڑ کا بچہ چھوٹ کر بھاگا اور تھوڑی دور جا کر گرا اور مر گیا۔ پھر شاطر نے اور بیر لئے ابال کر اُن کا عرق شراب میں ملایا اور اپنے باپ کے ایک نوکر کو چپکے سے وہ شراب پلا دی اور وہ نوکر بھی مر گیا۔

تب شاطر بادشاہ کے محل میں گیا اور اکیلا اس کے حضور میں حاضر ہو کر اس کی خیریت دریافت کی۔ بادشاہ کوچ پر بیٹھا تھا جو بھیڑیئے کی کھال کا بنا ہوا تھا۔ بڑھاپے سے اس کی بینائی کم ہو گئی تھی لیکن اس کے اعضا بہت مضبوط تھے۔ اس کا قد اتنا لمبا تھا کہ دوسرے آدمی اس کے کندھے تک آتے تھے۔ کوئی آدمی اس کمان کو نہیں موڑ سکتا جو اس نے اپنی جوانی میں موڑی تھی۔ اس کے بال سفید ہو گئے اور اس کا جسم لاغر ہو گیا تھا۔

بادشاہ نے دھیمی آواز سے کہا۔ "تو میرا مزاج کیا پوچھتا ہے میری عمر کے آدمی ہمیشہ شاکی رہتے ہیں۔ میری قوت اب میرے کسی کام کی نہیں۔ بہتر ہوتا کہ میں تیری طرح لنگڑا ہوتا کہ بڑھاپے میں کسی قوت کے زوال پہ افسوس نہ ہوتا۔"

شاطر کے چہرہ پہ ہلکی سی سرخی دوڑ گئی۔ لیکن اس نے اپنا غصہ ضبط کر کے عاجزی سے جواب دیا۔ "اے بادشاہ! اگر میں تیری جوانی واپس لا دوں تو؟ کیوں! اگر میں تجھے وہ قوت دلا دوں جس نے تجھے دوسرے انسانوں پر ممتاز کیا تھا جب برق کے پہلوان تیری تلوار کے آگے کٹ مرے تھے۔"

بادشاہ نے آنکھ اُٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ "اے دھولیا کے لڑکے تیرا کیا مطلب ہے؟ میں نے تیری عقل کی بہت تعریف سنی ہے اور یہ بھی سنا ہے کہ تو رات کے تاروں سے باتیں کیا کرتا ہے۔ کیا رات کے دیوتا تجھے وہ بھید بتا سکتے ہیں جس سے بوڑھے جوان بن سکتے ہیں؟"

شاطر نے جواب دیا۔ "ان کی قدرت پر شک کر کے انہیں ناراض نہ کر۔ اندھیری رات کے حاکموں کے آگے سب کچھ ممکن ہے۔ دیکھ اس تارہ نے، جو تیرے خادم سے محبت رکھتا ہے آدھی رات کو مجھ سے کہا کہ اُٹھ اور بادشاہ کے پاس جا اور اس سے کہہ کہ تاروں کو یاد ہے کہ ترکن کے قبیلہ کے بادشاہ نے قبیلہ برق کے مقابلہ میں اپنی قوی کمان کھینچی تھی اور ترکن کی قوم ان کو عزیز ہے۔ پس مکان کے دائیں پہلو پر جو صنوبر کا درخت ہے اس کی جڑ میں تلاش کر پتھر کے نیچے ڈھونڈھ اور تجھے مٹی کا برتن ملے گا۔ اس برتن میں تو ایک میٹھا عرق پائیگا جو تیرے آقا بادشاہ کے دل سے ہمیشہ کے لئے عمر کا خیال مٹا دیگا۔ میرے آقا! صبح کو جب میں نے پتھر کے نیچے تلاش کیا تو یہ دیکھ! یہ برتن مجھے ملا۔ میں اسے اپنے بادشاہ کے حضور میں لے آیا ہوں۔"

"جلدی کر، او کمینے۔ میں اسے پی کر اپنی جوانی حاصل کروں۔"

"اے بادشاہ! جلد بازی نہ کر کیونکہ تارہ نے مجھ سے کہا تھا کہ صرف رات کے وقت جبکہ تاروں کی حکومت ہوتی ہے اس عرق کا اثر ہو سکتا ہے پس بادشاہ کو آدھی رات تک انتظار کرنا چاہئے جب چاند بلند ہو جائے تو یہ عرق شراب میں ملایا جائے اور بادشاہ کو یہ بات کسی پر ظاہر نہ کرنی چاہیے کہ اس نے یہ نعمت تاروں کے خادم کے ذریعہ حاصل کی ہے کیونکہ تارے اپنا کام مخفی طور سے انجام دیتے ہیں۔ اور جب لوگ سوتے ہیں تو ان کی قدرت ظاہر ہوتی ہے جو کوئی انکے عطیہ کو شہرت دیتا ہے تو یقیناً اس کے لئے موت ہے۔ اے میرے آقا! یہ الفاظ تارے نے مجھ سے کہے تھے اور میں نے تیری بہتری کے خیال سے تجھ پر ظاہر کر دیئے۔"

بادشاہ نے بڑے شوق سے برتن لیکر کہا۔ "کچھ خوف نہ کر یہ بات کسی پر ظاہر نہ ہوگی۔ اور صبح کو میں اُٹھونگا اور اپنے دونوں لڑکوں سے، جو میرے تاج پر جھگڑ رہے ہیں، یقیناً ان دونوں سے زیادہ جوان ہو جاؤنگا۔"

یہ کہہ کر بادشاہ نے زور سے قہقہا مارا اور اس نے تاروں کے خادم کا شکریہ بھی ادا نہیں کیا اور نہ کسی انعام کا وعدہ کیا کیونکہ اس زمانہ کے بادشاہ اپنے سوا دوسروں کا خیال مطلق نہ کرتے تھے۔

شاطر نے پوچھا: "اے میرے آقا! کیا میں حاضر نہ رہوں؟ کیونکہ میرے بغیر شاید دوا کا اثر کم ہو۔"

بادشاہ نے کہا: "ہاں تو یہیں رہ۔"

شاطر نے جواب دیا: "نہیں، تیرے نوکر اگر دھولیا کے لڑکے کو تیرے محل میں مقیم دیکھینگے تو متعجب ہونگے اور بہت باتیں بنائیں گے۔ اس سے شاید رات کے دیوتا ناراض ہو جائیں۔ اپنے محل کا چور دروازہ کھلا رہنے دے تاکہ رات کو جب چاند نصف النہار پر ہو تو میں چپکے سے تیرے کمرے میں آجاؤں۔"

بادشاہ نے کہا: "اچھا ایسا ہی ہوگا۔ تو عقلمند ہے اگرچہ تو لنگڑا ہے اور تیرے اعضا چھوٹے ہیں اور تارے کسی لمبے آدمی کا انتخاب کر سکتے تھے۔"

یہ کہہ کر بادشاہ نے پھر قہقہہ مارا اور شاطر بھی ہنسا لیکن شاطر کی ہنسی میں خطرہ کے آثار نمایاں تھے۔ پھر شاطر چلا گیا۔

---

آدھی رات گزر چکی تھی اور ترکن کے باشندے گہری نیند میں غرق تھے کہ بازار میں ایک بلند آواز سنائی دی "غضب! قہر! جاگو اے ترکن کے فرزندو! قہر! غضب!" سب حیران اور پریشان آنکھیں ملتے ہوئے نیزے ہاتھوں میں لئے ہوئے اس وحشی قوم کے باشندے گھروں سے نکل پڑے اور انھوں نے شہر کے وسط میں بلند مقام پر کھڑا ہوا ایک آدمی دیکھا جو "غضب غضب" پکار رہا تھا اور یہ دھولیا کا لڑکا شاطر تھا۔ جب وہ اسکے چاروں طرف جمع ہو گئے تو انہیں اس طرح مخاطب کیا: "اے مردو اور پہلوانو! سنو اور کان دو! مغرب کے تارے نے مجھے خبر دی ہے اور یوں کہتا ہے کہ ترکن کے شاہی خاندان پر مصیبت نازل ہوگی۔ ہاں دن نکلنے سے پہلے مصیبت آئے گی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ بازاروں میں جا اور باشندوں کو جگا کہ ماتم کریں۔ پس میں آیا اور تارہ کے حکم کی تعمیل کی۔" شاطر نے اپنا کلام ختم کیا ہی تھا کہ شاہی محل کا ایک آدمی دوڑتا ہوا آیا اور چلا کر کہا کہ بادشاہ مر گیا۔ تب وہ محل میں گئے اور بادشاہ کو کوچ پر مردہ پایا۔ اس کے اعضا مڑ گئے تھے اور اکڑ گئے تھے اور اس کی مٹھیاں بند تھیں۔ گویا کہ وہ کسی دشمن کو دھمکا رہا تھا۔ تب دیکھنے والوں پر دہشت طاری ہوگئی اور شاطر کو اس قدر خوف سے دیکھنے لگے جیسا خوف کوئی بہادر سے بہادر پہلوان بھی ان کے دل میں پیدا نہ کر سکتا تھا۔ وہ شاطر کو عقلمندوں کی مجلس شوریٰ میں لے گئے۔ وہ راستہ میں آہ و بکا کرتے جاتے تھے اور ماتم میں اپنے ہتھیاروں کو کھڑکاتے جاتے تھے اور "ناہیں کا ہے شاطر پیغمبر کی جے" کے نعرے لگاتے جاتے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ پیغمبر کا لفظ ان ملکوں میں استعمال ہوا۔

---

بادشاہ کی وفات کے تیسرے روز دوہیرکوش تہباز شاطر سے ملنے گیا اور اس نے کہا: "دیکھ، میرا باپ گزر چکا ہے آج شام کو اس کا جانشین انتخاب کرنے جمع ہونگے اور پہلوان اور نوجوان آدمی میرے بھائی کو منتخب کرینگے ... جنگ آزمائی میں زیادہ مشہور ہے پس تو میری مدد کر۔"

شاطر نے سختی سے جواب دیا "صبر کرو لڑکے! رات کے دیوتاؤں کی سچائی میں شک کرنے کی جرات نہ کر"
کیونکہ شاطر اپنی قوت اور اثر پر زعم کرنے لگا تھا اور بادشاہوں کے لڑکوں سے بھی حاکمانہ لہجہ میں گفتگو کرتا تھا۔ اس کی آواز پر تیز مزاج شہباز خاموش ہو گیا۔ اور جواب دینے کی بھی جرات نہ کی۔ شاطر نے شہباز کو سُرخ پروں کی ایک ٹوپی دی اور کہا "اسے پہن لے اور ناامیدی کا خیال دل سے دور کر دے کیونکہ لوگ زندہ دلی کو پسند کرتے ہیں۔ اپنے بھائی کے ساتھ جائے انتخاب میں چلا جا اور باقی کام تاروں پر چھوڑ دے لیکن اس ٹوپی کو نہ بھولنا کیونکہ رات کے دیوتاؤں نے اسے برکت دی ہے۔"

شہزادہ نے ٹوپی لی اور گھر چلا گیا۔ شام ہوئی اور پہلوان اور سرداران ترکن جلسہ انتخاب میں جمع ہوئے۔ اکثر لوگ شہباز کے بھائی شہزادہ بلنج کے موئید تھے کیونکہ اس نے اپنے نیزہ سے بارہ دشمنوں کو مارا تھا اور اس زمانہ میں بادشاہ میں یہ بڑا وصف شمار ہوتا تھا۔

یکایک بازاروں میں شور بلند ہوا اور لوگ چلّانے لگے "شاطر پیغمبر کو راستہ دو" کیونکہ عام لوگ شاطر کا ادب سرداروں سے زیادہ کرتے تھے۔ اب چونکہ وہ مشہور ہو گیا تھا اس نے ایسی شان اختیار کر لی تھی جو نوعمری میں چرواہے کے لڑکے کے خواب و خیال میں بھی نہ آئی تھی۔ اگرچہ اس کا قد پست تھا اور پاؤں لنگڑاتے تھے مگر اس کا سر بلند تھا۔ تمام قوم میں صرف وہی ایسا لباس پہنتا تھا جو زمین پر گھسٹتا تھا اس کا سر ننگا تھا۔ اور اس کے لمبے سیاہ بال کمر تک پہنچے تھے۔ اس کے چہرہ پر شاذونادر کوئی تبدیلی یا انسانی جذبہ ظاہر ہوتا تھا۔ وہ نہ عورتوں میں جاتا تھا اور نہ شراب پیتا تھا اور نہ کثرت سے بازاروں میں پھرتا تھا۔ نہ وہ ہنستا تھا اور نہ مُسکراتا تھا سوائے اُس وقت کے جب وہ جنگل میں تنہا ہوتا تھا اور وہاں وہ اپنی قوم کی بیوقوفی پر ہنستا تھا۔

پس وہ بغیر دائیں بائیں نگاہ ڈالے خاموشی سے بھیڑ میں سے گزر گیا۔ سہارے کے واسطے صنوبر کا گرہ دار عصا اس کے ہاتھ میں تھا۔ جب وہ اس جگہ پہنچا جہاں سردار جمع تھے اور دونوں شہزادے بیچ میں کھڑے تھے تو اس نے لوگوں کو خاموش کیا اور ایک چٹان پر چڑھ کر مجمع کو یوں مخاطب کیا۔

"اے شہزادو! پہلوانو! اور شاعرو! اور اے عقلمندوں کی مجلس والو! اور اے جنگل کے شکاریو! اور اے دریائی مچھلیوں کو پھنسانیوالو! دھوبیا کے لڑکے شاطر کی بات سنو! تم جانتے ہو کہ میری پیدائش ادنیٰ طبقہ کی ہے اور میرے اعضا کمزور ہیں۔ لیکن کیا میں نے برکتی کی قوم تمہارے قبضہ میں نہیں کر دی اور کیا تم نے رات کے اندھیرے میں اُن کا صفایا نہیں کر دیا؟ یقیناً تمکو یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ چرواہے کے لڑکے نے یہ کام اپنی ذات سے انجام دیا۔ یقیناً یہ اُن روشن دیوتاؤں کا ایک آلہ تھا جو ترکن کی قوم کو محبوب رکھتے ہیں۔ تین راتیں گزریں جب دنیا سوتی تھی، کیا میری آواز بازار میں نہیں سُنائی دی؟ کیا میں نے ترکن کے شاہی خاندان پر مصیبت نازل ہونے کی خبر نہیں دی تھی؟ یقیناً موت کے اندھے ہاتھ کا وار اس عالی شان بادشاہ پر چل گیا جواب ہم میں نہیں ہے۔ کیا یہ بات خواب میں دیکھ سکتا تھا اور کیا میں اُن روشن دیوتاؤں کی آواز نہیں تھا۔ جو ترکن کی قوم کی نگہبانی کرتے ہیں؟

ں اسے آدمیو اور سردارو! دھولیا کے لڑکے کو حقارت سے نہ دیکھو۔ بلکہ اُس کی بات غور سے سنو۔ کیوں کیا اس کی باتیں روں کی عقلمندی سے ماخوذ نہیں ہیں؟ پچھلی رات کو میں گھاٹی میں اکیلا بیٹھا تھا اور درخت چپ چاپ کھڑے تھے اور ذرا سی آہٹ بھی نہ تھی میں نے اس تارے کی طرف دیکھا جو مجھے مشورہ دیتا ہے اور میں نے کہا "اے بادلوں فتح پانیوالے حاکم! تو جو دریاؤں میں غوطہ لگاتا ہے اور صنوبر کی شاخوں میں جلوہ آرا ہوتا ہے! دیکھ کہ تیرا خادم جیدہ ہے کہ قوت والا بادشاہ گزر گیا اور میرے بھائیوں کے چاروں طرف دشمن ہیں مناسب ہے کہ ان کو ایسا بادشاہ ملے جو بہادر ہو اور جنگ میں کامیاب ہو۔ اور تاروں کا محبوب ہو۔ پس اے تارے! جیسا تو نے ہمارے ہاتھوں میں برق کے پہلوانوں کو ڈال دیا اور ہمیں ہماری قوم کے ستون کے گرنے سے آگاہی دے دی ویسی ہی ہماری قوم کو ایک عالی نشانی عطا فرما جس سے ہم ایسے بادشاہ کا انتخاب کر سکیں جو رات کے دیوتاؤں کو مقبول ہو" میں نے ائے سے اس طرح التجا کی اور اس خاموشی میں سے ایک دھیمی اور شیریں آواز آئی "اپنی قوم میں سے تیری محبت رات کے تاروں کو پسند آئی۔ پس جا اے دھولیا کے لڑکے! سرداروں اور عام لوگوں کے جلسۂ انتخاب میں داخل ہو اور ان سے کہہ کہ تجھے نفرت سے نہ دیکھیں کہ تو شکار میں سُست اور جنگ سے ناواقف ہے کیونکہ تاروں نے تجھے ان تمام نقائص کے عوض عقل دی ہے۔ لوگوں سے کہہ کہ جیسے عقلمند لوگوں کی مجلس پرندوں کی پرواز سے اشارے حاصل کرتی ہے ویسے ہی پرندوں کی پرواز سے ان کو ایک نشانی دکھائی دیگی اور وہ اپنے بادشاہ کا انتخاب کرینگے کیونکہ رات کا تارہ کہتا ہے کہ پرندے ہوا کی اولاد ہیں وہ ہوا کے سمندر میں اِدھر اُدھر پھرتے ہیں اور بادلوں سے ملتے ہیں جو دیوتاؤں کے جنگی جہاز ہیں کیا وہ طوفان کی خبر دینے والے نہیں ہیں؟ پیشتر اس کے کہ دریا کنارے سے ٹکراتا ہے اور مینہ برستا ہے کیا تم پرندوں کے چلانے اور زمین کے قریب چکر لگانے سے نہیں سمجھتے کہ طوفان قریب ہے؟ پس یہ تمہاری ہوشیاری ہے کہ تم ہوا کی اولاد کو زمین کے باشندوں اور آسمان کے حاکموں کے درمیان ترجمان سمجھتے ہو۔ پس لوگوں اور سرداروں سے کہہ کہ محل کی چھتوں میں گھونسلہ بنانیوالی فاختاؤں میں سے ایک سفید فاختہ لو اور اُسے ہوا میں چھوڑ دو اور یقیناً رات کے دیوتا فاختہ کو لوگوں کی دعا سننے اور دعا قبول کرنیوالے کے واسطے اور ترکن کی قوم کو انکے لائق بادشاہ دینے کے واسطے تارے ایک قاصد بھیجینگے" اور یہ ہے جو کچھ تارہ نے مجھ سے کہا"

تب بلینچ کے دوست بڑبڑانے لگے اور آپس میں کہنے لگے "یہ آدمی اب بادشاہ کا انتخاب کرنے نکلا ہے۔ کیا ہم اس کی تعمیل کریں؟" لیکن عام لوگ اور پہلوان چلائے "تارے کا کہا مانو۔ کیا ہم پرندوں کی پرواز کے مطابق لڑائی میں پیشقدمی یا پسپائی اختیار نہیں کرتے؟ تو ہمیں اس شگون سے اس شخص کا انتخاب نہیں کرنا چاہئے جو ہمیں لڑائی میں لے جاتا ہے"

یہ بات انہیں قدرتی معلوم ہوئی کیونکہ انکے دستور کے موافق تھی تب وہ ایک سفید فاختہ پکڑ لائے جو محل کی چھتوں میں اور فاختاؤں کے ساتھ رہتی تھی اور اس جگہ لائے جہاں شاطر کھڑا تھا۔ اس نے فاختہ کو نے کر

تاروں کی طرف دیکھا اور کچھ گنگنا کر چھوڑ دیا!"

اس مقام سے کچھ فاصلہ پر درختوں کا جھنڈ تھا۔ جونہی فاختہ اڑی ایک عقاب یکایک جھنڈ سے نکلا اور اس کا تعاقب کرنے لگا۔ فاختہ خوفزدہ ہوگئی اور آدمیوں کے سروں پر چکر لگانے لگی کہ عقاب ذرا ٹھٹکا اور شکار کو چھوڑ کر تیر کی مانند نیچے آیا اور شہباز کے سر پر آ بیٹھا۔

اس پر شاطر نے بلند آواز سے کہا: "اے لوگو! اپنے بادشاہ کو پہچان لو"

لوگ خوشی سے چلا اٹھے: "بادشاہ کو تاج مبارک ہو! تاروں کے پسندیدہ بادشاہ کو تخت مبارک ہو!"

تب شاطر نے اپنا داہنا ہاتھ اٹھایا اور عقاب شہزادے کے سر سے اڑ کر اس کے کندھے پر آ بیٹھا۔ اس نے بہت ادب سے کہا: "اے دیوتاؤں کے پرندے! کیا تو میرے لئے کوئی خفیہ پیغام نہیں لایا ہے؟" تب عقاب نے اپنی چونچ شاطر کے کان میں رکھدی اور شاطر نے اپنا سر عاجزی سے نیچے جھکالیا۔ اس وقت سے عقاب اسی کے پاس رہا۔ اور اسے چھوڑ کر اڑ نہیں گیا۔ شاطر نے کہا: "تاروں نے یہ پرندہ مجھے بھیجا ہے کہ دن کو جب میں انہیں نہیں دیکھ سکتا ہم کبھی مصیبت کے وقت بے صلاح کار نہ رہیں"

اس طرح شہباز بادشاہ ہوگیا اور بادشاہ نے حکم دیا کہ شاطر موہنی کو اپنی بیوی بنائے۔ سرداران قوم اور عام لوگ شاطر پیغمبر کی عزت قوم کے معمر لوگوں سے زیادہ کرنے لگے۔

---

ایک دن شاطر اپنے دل سے یوں باتیں کر رہا تھا: "کیا میں اب بادشاہ کے برابر نہیں ہوں؟ برابر کیوں! کیا بادشاہ میرا نوکر نہیں ہے؟ کیا میں نے اسے اس کے بڑے بھائی پر فوقیت نہیں دلادی ہے؟ تو کیا میں اس سے بڑھکر حکومت کرنے کے قابل نہیں ہوں؟ کیا اب شہباز کو اپنی جگہ سے نہیں ہٹا دینا چاہیئے؟ لیکن نزحن کی وحشی قوم پر حکومت کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ مزید براں بڑے مجمعوں میں دعوتوں میں شریک ہونا اور پہلوانوں کو میدان جنگ میں لڑانا میرے واسطے مشکل کام ہے۔ یقیناً اگر میں نے دعوتیں نہ دیں اور لڑائی میں نہ گیا تو لوگ کہیں گے کہ یہ بادشاہ نہیں ہے یہ تو لنگڑا شاطر ہے اور شہباز کے خاندان کا کوئی شخص چپکے سے مجھے قتل کر ڈالے گا۔ لیکن کیا میں بادشاہوں سے بڑا نہیں ہو سکتا کہ اس کا انتخاب کرتا رہوں اور ان پر اپنی حکومت قائم رکھوں اور خود آرام سے زندگی بسر کرتا رہوں؟ یقیناً تارے مجھے نیا محل اور بہت سی رعیت عطا کرینگے"

وہاں کے عقلمندوں میں ایک شخص پوشا تھا اور شاطر اس سے ڈرتا تھا کیونکہ وہ ہمیشہ اس کی حرکات وسکنات کا غور سے مشاہدہ کرتا تھا۔ ایک دن شاطر نے سوچا کہ اس آدمی کو اندھا بنانے سے دوست بنانا بہتر ہے کیونکہ مجھے ایک دوست اور مددگار کی ضرورت ہے۔

پس وہ ایک دن شام کو پوشا سے ملنے گیا جب کہ وہ دھوپ کھا رہا تھا اور کہا: "اے پوشا! میرے خیال میں آتا ہے کہ ہمکو تاروں کے اعزاز میں ایک بڑی عمارت بنانی چاہیئے۔ وہ عمارت تمام سرداروں کے محلوں اور نیز

بادشاہ کے محل سے زیادہ عالی شان ہو، کیونکہ تارے کیا ہمارے آقا نہیں ہیں؟ تو اور میں اس محل کے مخصوص رہنے والے ہونگے اور ہم رات کے دیوتاؤں کی خدمت کرینگے۔ ان کی قربانگاہوں پر فربہ سے فربہ جانوروں کی اور لذیذ سے لذیذ کھانوں کی قربانیاں چڑھائینگے۔"

پوشا نے کہا "تو وہی کہتا ہے جو تاروں کے خادم کے لئے موزوں ہے۔ لیکن کیا لوگ محل بنانے میں مدد دینگے؟ کیونکہ وہ جنگجو قوم سے ہیں۔ اور ایسی محنت کرنا پسند نہیں کرتے۔"

شاطر نے جواب دیا۔ "اس کا خوف نہ کر۔ یقیناً دیوتا یہ کام کرنے کا حکم دینگے۔"

پوشا بولا "واقع میں تو بڑا عجیب آدمی ہے۔ تیری بات ہمیشہ ہو کے رہتی ہے۔ دوست میں چاہتا ہوں کہ تو مجھے تاروں کی زبان سکھا دے۔"

شاطر نے جواب دیا "یقیناً اگر تو میری خدمت کرے گا تو سیکھ جائیگا۔"

اس پر پوشا دل میں بہت خفا ہوا کہ چیدا بے کا لڑکا ہو کر ایک سردار اور بہتر شخص سے خدمت لینی چاہتا ہے۔

جب شاطر اپنی بیوی کے پاس گیا تو دیکھا کہ وہ رو رہی ہے۔ اس کو دہوتیا کے لڑکے سے بہت محبت تھی کیونکہ وہ ان لوگوں کی طرح جن کو وہ جانتی تھی، وحشی اور خونخوار نہ تھا۔ شاطر نے اسے گلے سے لگایا، پیار کیا اور رونے کا سبب پوچھا اس نے کہا میرا بھائی میرے پاس آیا تھا اور تیری نسبت بہت سخت الفاظ استعمال کئے تھے۔ شہباز یہ کہتا تھا: "شاطر نے میری رعایا کی محبت مجھ سے چھین لی ہے اور ان کو جھوٹے قصوں سے اندھا بنا دیا ہے۔ چونکہ اس نے مجھے بادشاہ بنایا ہے کیا تعجب ہے مجھ سے بادشاہت چھین لے۔ یقیناً تاروں کا کوئی نیا قصہ پرانے قصوں کو غلط کر دیگا۔" بادشاہ نے مجھ سے یہ بھی کہا ہے کہ تیری حرکات کو خفیہ طور سے دیکھتی رہوں اور یہ بھی معلوم کروں کہ آیا تو اپنے اس دعوے میں سچا ہے کہ رات کے دیوتاؤں سے گفتگو کیا کرتا ہے۔ لیکن مجھے شہباز کی نسبت تجھ سے زیادہ محبت ہے اس لئے میں نے سب کچھ تجھ سے کہدیا۔"

شاطر بادشاہ کی احسان فراموشی سے بہت ناراض اور پریشان ہوا کیونکہ بادشاہ بہت طاقتور دشمن ہوتا ہے۔ لیکن اس نے موہنی کی تسلی و تشفی کی اور کہا کہ "اپنے دلی خیالات کو چھپا اور میری شکایت اپنے بھائی سے کرنا تاکہ وہ میرے خلاف جو تجویز کرے تجھ پر ظاہر کر دے اور شبہ نہ کرے۔"

شاطر کے مکان کے قریب ایک غار تھا جس میں وہ متبرک عقاب کو رکھتا تھا اور جس میں دوسرے پرندے آئندہ ضروریات کے واسطے سدھایا کرتا تھا۔ غار کا دروازہ ہمیشہ بند رہتا تھا۔ ایک دن جب وہ پرندوں کو سکھانے پڑھانے میں مصروف تھا تو اس نے دیوار میں ایک شگاف دیکھا جو پہلے کبھی نہ تھا۔ وہاں سے سورج کی شعاع اندر آرہی تھی۔ اس کے دیکھتے دیکھتے سورج کی شعاع رک گئی۔ اور شگاف میں سے کوئی جھانکتا ہوا نظر آیا۔ شاطر خوف زدہ ہو گیا کیونکہ وہ سمجھ گیا کہ اس کی تاک جھانک میں آدمی لگے ہوئے ہیں۔ وہ جلدی سے غار کے باہر آیا مگر باہر والا آدمی درختوں میں غائب ہو گیا تھا۔ پھر شاطر پوشا کے مکان پر گیا اور اندر جا کر بیٹھ گیا۔ پوشا دیر تک گھر نہ آیا اور جب اس نے شاطر کو دیکھا تو ٹھٹکا اور ... سے اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ لیکن شاطر اس سے بھائی کی طرح ملا اور دعوت میں شرکت کی درخواست کی۔ یہ پہلی مرتبہ تھی کہ اس نے

تاروں کے عزازمیں چودھویں کی رات کو دعوت دینے کا ارادہ کیا پھر پوشا سے رخصت ہوکر وہ اپنی بیوی کے پاس گیا اور کہا کہ صبح ہوتے ہی اپنے بال پریشان کرکے بادشاہ کے پاس جانا اور میرے برتاؤ کی سخت شکایت کرنا اور اسی طرح بادشاہ کے دل کا بھید معلوم کرلینا کیونکہ پوشانے بادشاہ سے میری نسبت جھوٹی روایتیں بیان کی ہیں اور بادشاہ نے میرے ساتھ برائی کرنے کا ارادہ کیا ہے جو میں معلوم کرنا چاہتا ہوں"

پس صبح کو موہنی بادشاہ کے پاس گئی اور کہا "چرواہے کے لڑکے نے میرے ساتھ بدسلوکی کی ہے اور مجھے سخت الفاظ کہے ہیں۔ کیا میرا بدلہ نہیں لیا جائیگا؟

بادشاہ نے غصہ سے اپنا پاؤں زمین پر مارا اور اپنی تلوار کو جنبش دی اور کہا "یقیناً تیرا بدلہ لیا جائیگا کیونکہ ایک معتمر آدمی سے مجھے ایسی باتیں معلوم ہوئی ہیں جن سے مجھے یقین ہوگیا ہے کہ شاطر نے لوگوں کے آگے جھوٹ بولا ہے اور یقیناً وہ کمینہ قتل کیا جائیگا۔ ہاں جب وہ جنگل میں اکیلا جائے گا تو میرا بھائی اور میں اس پر جا پڑینگے اور اسے قتل کر ڈالیں گے"

یہ دلاسا دیکر شہباز نے موہنی کو رخصت کیا۔ اور گھر آکر اپنے خاوند کے قدموں میں گر پڑی اور رو کر کہنے لگی "بھاگ اے پیارے! میرے بھائیوں سے دور جنگلوں میں بھاگ جا۔ ورنہ شہباز کی تلوار یقیناً تیرا کام تمام کر دے گی"

تب دھوبیا کا لڑکا دونوں ہاتھ سینہ پر رکھکر سوچ میں پڑ گیا۔ وہ اپنے خیالات میں ایسا غرق تھا کہ موہنی کے گڑگڑانے کی بھی پرواہ نہ کی جب تک کہ اس نے بار بار بھاگ جانے پر زور نہ دیا۔ آخر کار اس نے کہا "میں بھاگ جاؤں؟ نہیں میں یہ سوچ رہا تھا کہ تارے دشمنوں کو کیا سزا دینگے۔ پہلوان بھاگینگے مگر شاطر پیغمبر ایسے ہتھیاروں سے کامیاب ہوتا ہے جو تلوار سے زیادہ قوی ہیں"

باوجود اس کے شاطر کے خیالات پریشان تھے اور کوئی تدبیر اس کے ذہن میں نہ آئی جس سے وہ اپنے تئیں بادشاہ کے انتقام سے بچا سکے وہ ایسی ناامیدی کی حالت میں خیالات میں غرق تھا کہ پانی کی شور کی آواز کانوں میں آئی۔ موسم خزاں کا آخر تھا اور دریا اپنی حدود سے اوپر چڑھ آیا تھا اور گھاٹی سے ابل کر شہر کے مکانوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ شہر کے مرد عورت اور بچے دوڑتے ہوئے آئے اور شاطر کے مکان کے سامنے ہو کر شور کرنے لگے "تاروں کے حاکم! ہمیں بچا۔ دیکھ دریا ہم پر چڑھا آ رہا ہے"

تب شاطر کے دل میں ایک فوری خیال آیا اور اس نے مصمم ارادہ کرلیا کہ اپنی قسمت کا فیصلہ ایک دا تدبیر کی کامیابی پر چھوڑ دے۔ وہ غمگین صورت بنا کر مکان سے باہر نکلا اور کہنے لگا "تم نہیں سمجھتے تم کیا مانگتے میں تمہیں اس خطرہ سے نہیں بچا سکتا۔ یہ تمہارے ہی کئے کی سزا ہے"

لوگوں نے چلا کر کہا "کس طرح؟ اے دھوبیا کے لڑکے ہم اپنے جرم سے ناواقف ہیں"

شاطر نے جواب دیا "بادشاہ کے محل کو جاؤ اور اس کے سامنے ٹھہرو۔ یقیناً میں تمہارے پیچھے آتا ہوں اور تمہیں معلوم ہو جائیگا کہ دیوتاؤں نے یہ عذاب تم پر کیوں نازل کیا ہے"

تب مجمع اس طرح واپس ہوا جیسے سمندر میں چڑھاؤ کے بعد اُتار ہوتا ہے جب لوگ چلے گئے تو شاطر پوشا کے مکان پر گیا جو اس کے مکان کے قریب ہی تھا۔ پوشا بہت خوفزدہ تھا۔ کیونکہ اس کی عمر بہت زیادہ تھی اس کا نہ کوئی دوست تھا اور نہ اولاد تھی۔ اُسے خوف تھا کہ میں خود پانی سے کسی طرح نہیں بچ سکتا۔ شاطر نے اس سے تشفی کے طور پر کہا: "دیکھ پوشا! لوگ مجھ سے محبت کرتے ہیں اور میں خیال رکھونگا کہ تو بچا لیا جائے کیونکہ تو نے مجھ سے دوستانہ برتاؤ کیا ہے اور بادشاہ کے حضور میں بہت فائدہ پہنچایا ہے۔"

جب یہ باتیں ہو رہی تھیں تو شاطر نے مکان کا دروازہ کھولا اور اچھی طرح دیکھ بھال لیا کہ آس پاس کوئی نہیں ہے اور بالکل تنہائی ہے۔ تب اس نے اس بڈھے کا ٹیٹوا دبا لیا۔ اور جب تک وہ مر نہ گیا اپنی گرفت نہ چھوڑی۔ اس معمر آدمی کی لاش فرش پر چھوڑ کر شاطر چپکے سے گھر سے نکلا اور دروازہ بند کر دیا جب وہ اپنے غار کو جا رہا تھا تو اس کے دل میں طرح طرح کے خیالات موجزن تھے۔ پھر اس نے بڑھتے ہوئے پانی کا شور سنا اور دور فاصلہ پر عورتوں کی چیخیں سنیں اور اپنا سر اٹھایا اور فخریہ کہا۔ "نہیں! اس وقت صرف خوف میری غلامی کرے گا اور سوائے اپنی روح کی قوت کے میں کوئی ترکیب استعمال نہیں کرونگا۔"

پس وہ صنوبر کے عصا کے سہارے سے متانت کے ساتھ محل کی طرف روانہ ہوا۔ اب شام ہو گئی تھی اور بہت سے لوگ مشعلیں لئے ہوئے تھے کہ عام خوف کی حالت میں ایک دوسرے کے چہرے دیکھ سکیں مشعلوں کی سُرخ روشنی شاطر کے سیاہ لباس اور زرد چہرہ پر پڑی اور دوسروں سے زیادہ قوی معلوم ہوتا تھا کیونکہ اس ہنگامہ میں اسی کا چہرہ سنجیدہ اور متین تھا۔ پانی کا شور بلند ہوتا جاتا تھا اور رات کی تاریکی بڑھتی جاتی تھی۔ شاطر نے مجمع میں پہنچکر کہا "بادشاہ کہاں ہے اور مصیبت کے وقت وہ اپنی رعایا سے الگ کیوں ہے؟"

تب محل کا دروازہ کھلا اور شہباز وسیع کمرہ میں آگ کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس کا بھائی اسی کے پہلو میں بیٹھا تھا اور اس کے سردار اس کے گرد جمع تھے کیونکہ وہ معزز لوگ ایک چرواہے کے لڑکے کے حکم پر عام لوگوں کے مجمع میں آنا گوارا نہیں کرتے تھے تب شاطر ایک چٹان پر چڑھا وہی چٹان جہاں سے اس نے بادشاہ کے انتخاب کا اعلان کیا تھا اور لوگوں سے یوں خطاب کیا۔ "اے ترکن کے فرزندو! تم نے یہ معلوم کرنے کی خواہش کی تھی کہ دریا کیوں چڑھ آیا ہے اور تم پر یہ مصیبت کیوں آئی ہے۔ تو سن لو کہ تارے اپنے خادموں اور پیغمبروں کی تحقیر کو انسانی جرموں میں بدترین گناہ سمجھتے ہیں۔ تم سب واقف ہو کہ شاطر جس کو تم نے پیغمبر کا خطاب دیا ہے کیسی زندگی بسر کرتا ہے۔ وہ نہ تو انسان کو ستاتا ہے نہ حیوان کو۔ وہ تنہا رہتا ہے اور تمہاری قوم کے وحشیانہ خوشی کے جلسوں سے دور رہ کر رات کے دیوتاؤں سے خوف کھا کر ان کی عبادت کرتا ہے اسی سبب سے وہ اس قابل ہے کہ آنیوالی مصیبت سے تمہیں آگاہ کرے اور تمہیں دشمن سے بچائے۔ اسی وجہ سے تمہارے شکاری تیز ہیں اور تمہارے پہلوان بہادر ہیں اور اسی وجہ سے مویشی بچے جنتے ہیں اور زمین پھل اگلتی ہے اب تم کیا خیال کرتے ہو اور آگے کیا سُننا چاہتے ہو؟ تو سنو! اے ترکن کے فرزندو! انھوں نے

میرے مارنے کا جال بچھایا ہے اور تم میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اپنی تلواریں اس سینہ میں بھونکنے کے لئے تیز کر رہے ہیں جو تمہاری محبت سے معمور ہے۔ اسی لئے آسمانوں کے حاکموں نے دریا کے پاؤں کی زنجیریں کھول دی ہیں اور اسی لئے یہ مصیبت تم کو دھمکانے آئی ہے۔ اور یہ مصیبت اس وقت تک رفع نہ ہوگی جب تک کہ وہ لوگ جنھوں نے تاروں کے خادم کے واسطے گڑھا کھودا ہے اسی گڑھے میں دفن نہ کر دیئے جائیں"

تب مشعلوں کی روشنی میں آدمیوں کے چہرے خونخوار اور ڈراؤنے معلوم ہونے لگے اور دس ہزار آوازیں بلند ہوئیں۔" اے پاک پیغمبر! انکے نام بتا جنھوں نے تیرے خلاف بغاوت بلند کی ہے اور یقیناً ہم انکی بوٹیاں اڑا دینگے"

اس پر شاطر نے اپنا منہ پھیر لیا اور لوگوں نے دیکھا کہ وہ رو رہا ہے۔ اس نے کہا "تم نے مجھ سے پوچھا اور میں نے بتا دیا۔ لیکن اب تمہیں مشکل سے یقین آئیگا کہ میرے خلاف کونسا دشمن پیدا ہوگیا ہے۔ میں آسمانوں کی قسم کھاتا ہوں کہ اگر میری موت سے ان کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے اور تم پر اور تمہاری اولاد کی اولاد پر تخت و تاج والے تاروں کا غضب نہ نازل ہو تو بڑی خوشی سے میرا سینہ خنجر کے لئے حاضر ہے۔ ہاں!" اس نے اپنی آواز بلند کرکے اور اس کمرہ کی طرف اشارہ کرکے جہاں بادشاہ بیٹھا تھا۔ کہا "سُن اے شہباز! تو جس کو تاروں نے میری آواز پر تیرے بھائی کو ترجیح دی۔ اے گنہگار شہباز! اپنی تلوار نکال اور باہر آ اور اگر تجھ میں جرأت ہے تو دیوتاؤں کے پیغمبر پر وار کر!"

بادشاہ کھڑا ہوگیا اور لوگوں پر سناٹا چھا گیا۔ پھر شاطر نے تقریر شروع کی: "پس اے ترکن کے باشندو! جان لو کہ شہباز اور اس کا بھائی بلنچ اور عقلمندوں میں سے پوشا معمر پوشا ان تینوں نے تمہارے پیغمبر کو قتل کرنے کی تجویز کی ہے اور اسے وقت مارنا چاہتے ہیں جب وہ تمہارے فائدہ ہی فائدہ کی نئی نئی تدبیریں سوچنے کی غرض سے جنگل کے سایہ میں اکیلا جاتا ہے۔ اگر بادشاہ میں جرات ہو تو انکار کر دے"

تب دیو قامت بلنچ متانت کے ساتھ کمرہ سے باہر آیا اور نیزہ ہلا کر کہا "میرے باپ کے چرواہے کے کمینے لڑکے! تو نے سچ کہا۔ تو اپنے گناہوں کے عوض مارا جائیگا کیونکہ جب تو تاروں سے اپنا تعلق ظاہر کرتا ہے تو تو جھوٹ بولتا ہے اور تارے تو ان پر ہنستا ہے جو تیری بات کا یقین کرتے ہیں۔ پس اے لوگو! اسے قتل کر دو"

اس پر سرداروں نے کمرہ میں اپنے اپنے ہتھیار سنبھالے اور باہر جھپٹے کہ دھولیا کے لڑکے کو قتل کر دیں۔ لیکن اس نے آسمان کے آگے ہاتھ پھیلا کر چلا کر کہا "اے رات کے خوفناک حاکمو! تم اس کے الفاظ سنتے ہو۔ دیکھو وہ کیسا کفر بکتا ہے"

لوگوں نے اس کے الفاظ دُہرائے اور سب مل کر کہنے لگے "وہ کفر بکتا ہے۔ وہ پیغمبر کے خلاف کفر بکتا ہے"

لیکن بادشاہ اور سردار جو شاطر سے اس بات پر نفرت کرتے تھے کہ عام لوگوں پر اس کا اثر ہے مجمع کی طرف جھپٹے اور لوگ اپنی جگہ جمے رہے۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ کیا کرنا چاہئے کیونکہ انھوں نے اپنے سرداروں سے کبھی بغاوت نہیں کی تھی۔ وہ پیغمبر سے اور بادشاہ سے یکساں طور سے ڈرتے تھے۔

شہباز نے چلا کر کہا "پوشا کو ہمارے سامنے بلاؤ کیونکہ وہ شاطر کی حرکات کو غور سے دیکھتا رہا ہے اور وہ میری

رعایا کی آنکھوں سے پردہ اُٹھا دیگا!"

تب تین تیز رفتار آدمی پوشا کے گھر کی طرف روانہ ہوئے اور شاطر نے بلند آواز سے کہا "سُنو! وہ تارہ جو ابھی اس بادل کی آڑ سے نکل کر میرے سامنے آیا ہے کہتا ہے: "اُس جھوٹ کے بدلے جو متمرّد آدمی نے میرے خادم کے خلاف کفر کیا ہے تاروں کی لعنت اس پر پڑیگی۔ پس اے لوگوں! پوشا کو تلاش کرو اور جیسا تم اُسے پاؤ گے ویسا ہی ہمیشہ شاطر کے اور دیوتاؤں کے دشمنوں کو پاؤ گے"۔

شاطر کے ان الفاظ سے مجمع پر ایک عجیب خوف طاری ہوگیا یہانتک کہ شہباز کا چہرہ بھی زرد پڑ گیا۔ اور شاطر سیاہ لباس پہنے ہوئے اور سینہ پر ہاتھ رکھے ہوئے سیدھا کھڑا تھا اور مشعلوں کی روشنی میں بھیانک معلوم ہوتا تھا۔

اس اثنا میں پانی بڑھا چلا آتا تھا۔ لوگ موجوں کا شور سنتے تھے اور پانی کے جھاگ ہوا میں اُڑتے ہوئے دیکھتے تھے۔ شاطر نے سنجیدگی سے کہا: "تم یہاں باتوں میں مشغول ہو اور دریا امنڈا چلا آتا ہے، جلدی کرو کیونکہ دیوتاؤں کی بھینٹ چڑھانی ہوگی، وہ چاہے تمہارا پیغمبر ہو چاہے تمہارا بادشاہ ہو۔"

شہباز نے غصہ سے جھلا کر کہا: "کمینے غلام! کیا بکتا ہے؟" اور اس کے ہاتھ سے نیزہ چھوٹ نکلا اور لوگوں کے سروں پر گذرتا ہوا شاطر کے جسم کے پاس سے نکل گیا اور اس کے پیچھے والے درخت کے تنے میں گھس کر اُسے چیر ڈالا۔ تب لوگ اپنے محبوب پیغمبر کی جان کے خطرہ سے برافروختہ ہوئے اور جنگ کا نعرہ لگایا اور تلواریں نکال کر اپنے سرداروں اور بادشاہ کے مقابلہ پر اس کے گرد جمع ہوئے۔ اسی وقت لڑائی شروع ہونے سے پیشتر تینوں پہلوان واپس آئے وہ پوشا کو اپنے کندھوں کے اوپر اُٹھائے ہوئے تھے۔ انھوں نے بادشاہ کے قدموں پر رکھدیا اور کانپتے ہوئے کہا: "ہم نے پوشا کو اس طرح کمرہ کے وسط میں پایا"۔ لوگوں نے اس وقت دیکھ لیا کہ پوشا مردہ ہے اور شاطر کی پیشین گوئی صحیح نکلی۔ تب شاطر نے بلند آواز سے کہا: "اس طرح شاطر کے اور تاروں کے دشمن مرجاتے ہیں!" لوگ بھی یہی کہنے لگے اور ان کی آواز سے ہوا گونج اُٹھی۔ تب شہباز غصہ کی شدت سے جھنجھلا کر اٹھا اور تلوار سر پر ہلا کر مجمع میں یہ کہتا ہوا گھس پڑا "کمینے تیرا خون یا میرا خون!"

شاطر نے نڈر ہو کر جواب دیا۔ "اس کا فیصلہ رات کے دیوتا کرینگے!" اور مجمع سے کہا: "لوگو! کافر کو مار ڈالو دیکھو دریا تمہارے مکانوں اور تمہارے بچوں کی طرف بڑھا چلا آتا ہے۔ مارو! مارو! ورنہ تم تباہ ہو جاؤ گے!"

شہباز پانسو نیزوں کے زخم کھا کر زمین پر گرا۔ جونہی شاہی خاندان کے سردار بادشاہ کو بچانے کے لئے بڑھے شاطر نے لوگوں سے کہا "مارو! مارو!" تلواروں کی جھنکار اور نیزوں کی چمک اور مرنے والوں کی چیخوں اور روندنے والوں کے نعروں نے دریا کے شور کے ساتھ مل کر قیامت کا سماں پیش کر دیا۔

اس رات تین سو سردار اپنی ہی قوم کے ہاتھوں تہ تیغ ہوئے۔ اور فاتحوں کا آخری نعرہ یہ تھا "شاطر پیغمبر! شاطر بادشاہ!"

دھولیا کا لڑکا پانی کو بڑھتا اور پھیلتا ہوا دیکھکر اپنی بیوی موہنی کو اور نزکن کے باشندوں کو اور ان کی عورتوں کو اور ان کے بچوں کو ایک اونچے ٹیلہ پر لے گیا۔ یہ سب لوگ سورج نکلنے تک وہیں ٹھیرے رہے۔ لیکن موہنی الگ بیٹھی تھی اور شدت غم سے زار و قطار روتی تھی کیونکہ اس کے بھائی مر گئے تھے اور اس کی خاندانی نسل ناپید ہو گئی تھی۔ شاطر نے اس کی دلجوئی کی بہت کوشش کی لیکن بے فائدہ۔

---

جب صبح ہوئی تو معلوم ہوا کہ دریا شہر کے بڑے حصہ پر حاوی ہو گیا ہے اور گھاٹی سے خلاؤں میں قدم جما لیا ہے تب شاطر نے لوگوں سے کہا "رات کے دیوتاؤں کا انتقام پورا ہو گیا۔ اور ان کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ اب صرف اس وقت تک یہاں ٹھیرو جب تک کہ پانی زمین میں جذب ہو جائے" چوتھے روز وہ لوگ شہر میں واپس آئے اور کسی شخص کو شاطر کے سوا دوسرا نام بادشاہی کے لئے پیش کرنے کی جرات نہ ہوئی۔

لیکن شاطر اپنے غار کی تنہائی میں خلوت گزیں ہوا اور الجھے ہوئے خیالات سلجھانے میں مصروف ہوا تب اس نے لوگوں کو جمع کیا اور انکے واسطے نئے قوانین بنائے۔ ان سے تاروں کے اعزاز میں ایک عظیم الشان مندر تعمیر کرایا اور اس میں تمام وہ چیزیں جنکو وہ قوم عزیز ترین سمجھتی تھی جمع کرائیں۔ اس نے قوم کے مشہور آدمیوں کے پچاس لڑکے لئے اور جن لوگوں نے اس کی اچھی طرح خدمت کی تھی ان میں سے دس آدمی انتخاب کئے۔ اس نے انہیں حکم دیا کہ اس عظیم الشان مندر میں تاروں کی خدمت کریں اور خود ان کا سردار بنا۔ اس نے شاہی تاج کو رد کر دیا جو لوگوں نے اس کے سامنے پیش کیا تھا اور معمّر لوگوں میں سے ایک کو بادشاہ بنایا۔ اس نے حکم دیا کہ آئندہ صرف اس مندر کے پرستار تاروں کے خدام ہی بادشاہ اور حاکموں کا انتخاب کرینگے اور مجلس شوریٰ قائم کرینگے اور جنگ کا اعلان کرینگے۔ مگر اس نے بادشاہ کو دعوتوں سے اور شکار سے اور عیش و طرب کے جلسوں سے روکا۔ اس نے مندر میں تیرہ قربانگاہیں بنائیں اور مغرب میں وہ پہلا شخص تھا جس نے جانوروں اور پرندوں کی اور بعد میں انسانوں کی قربانی قربان گاہوں پر چڑھائی۔ وہ جانوروں کی آنتوں سے شگون لیتا تھا اور اس نے علم پیغمبری کا مدرسہ قائم کیا۔ اس کی پرہیزگاری خصوصاً تخت و تاج کا رد کرنا قوم کے لئے بڑے تعجب کی بات تھی۔ مگر شاطر شیخ الاعظم بادشاہ سے دس ہزار گناہ زیادہ قوی تھا۔ اس نے لوگوں کو کاشتکاری اور باغبانی سکھائی اور اپنی عقل اور اس جوش سے جو اس کی پیشین گوئیوں نے لوگوں کے دلوں میں بھر دیا تھا اس نے قرب و جوار کی تمام قوموں کو فتح کر لیا۔ نزکن کے فرزند ایک وسیع سلطنت میں پھیل گئے اور انکے ساتھ شاطر کا نام اور شاطر کے قوانین اشاعت پذیر ہوئے۔ جو ملک اس نے فتح کیا وہاں اس نے تاروں کے اعزاز میں ایک مندر بنانیکا حکم دیا۔

لیکن شاطر کو ایک شدید صدمہ پہنچا۔ شہباز کی بہن ہمیشہ غمگین رہتی تھی۔ وہ اپنے خاندان کی بربادی کو زیادہ عرصہ تک برداشت نہ کر سکی۔ اور اس نے شاطر کو لاوارث چھوڑا۔ شاطر نے سخت ماتم کیا وہ دیوانوں کی طرح روتا چلاتا تھا کیونکہ تمام دنیا میں اس کا دل صرف موہنی سے محبت کر سکتا تھا۔ آخر وہ مایوس ہو کر بیٹھ گیا اور اپنا منہ چھپا لیا اور اپنے دل سے اس طرح باتیں کرنے لگا "آہ! میں نے جان توڑ کر کوششیں کیں اور سخت مصیبتیں جھیلیں اور کٹھن منزلیں طے کیں۔ مجھ سے پہلے دنیا میں کسی فرد

واحد ہے اتنا رتبہ حاصل نہیں کیا تھا جتنا میں نے حاصل کیا ہے یقیناً اب قوی اعصاب اور جسم اعضا کی حکومت نہیں رہی۔ میں نے ایک نئی سلطنت قائم کی ہے جو آئندہ زمین پر قائم رہے گی۔ یہ سلطنت سازشی دماغ اور حاکمانہ دل کی ہے۔ لیکن افسوس! میری قسمت بانجھ اور بنجر ہے۔ مجھے ابھی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں نہ پھل لگے گا۔ اور نہ درخت ہی اُگیگا جو بڑھاپے میں مجھے پناہ دے سکے۔ مجھے تنہا اور اکیلا قبر کو جانا پڑے گا۔ او موہنی! اے میری جان! اے میرے دل کی کلی! اے میری حسین دیوی! تیرے مقابلہ کا کوئی نہ تھا۔ تیری محبت نے میری زندگی اور میری شان وشوکت کی نشو ونما کی ہے۔ کاشکہ تیری خاطر اسے خوش الحان پرندا جس نے میرے دل کی اندھیری کوٹھری میں گھونسلا بنایا تھا، کاش کہ تیری خاطر تیرے بھائی بچا لئے گئے ہوتے! کیونکہ میں اپنی جان دیکر تیری زندگی خرید لیتا۔ افسوس! اب جبکہ میں تجھے کھو چکا اب مجھے معلوم ہوا کہ دوسروں کے خوف کی نسبت تیری محبت مجھے زیادہ عزیز تھی"!

شاطر رات دن ماتم کرتا تھا اور کوئی اس کی دلجوئی نہ کرسکا۔ لیکن اس وقت سے اس نے اپنے تئیں اپنے پیشہ کے لئے وقف کردیا۔ اس کی فطرت اور اس کے جذبات میں جو کچھ لطافت باقی تھی وہ جاتی رہی اور اب اس کا دل پتھر کی طرح سخت ہوگیا۔ اس میں محبت کا جذبہ باقی نہ رہا اور اس نے پجاریوں کو محبت اور شادی سے قطعاً منع کردیا۔

اس کی عمر کے آخری حصہ میں دوسرے پیغمبر اُٹھے کیونکہ دنیا نے خود شاطر کی دانائی سے عقل حاصل کرلی تھی۔ بعض لوگ اپنے دل میں کہتے تھے" دیکھو چرواہے کا لڑکا بادشاہوں کا بادشاہ بن گیا ہے اور یہ سب کچھ تاروں نے اپنے خادم کے واسطے کیا ہے ہم بھی تاروں کے خادم کیوں نہ بنیں؟"

وہ شاطر کی طرح سیاہ کپڑے پہنتے تھے اور جو کچھ تارے ان سے کہتے تھے وہ پیشین گوئیاں کرتے پھرتے تھے۔ شاطر بہت خفا ہوا کیونکہ تمام آدمیوں کی نسبت وہ بہتر جانتا تھا کہ وہ سب جھوٹ بولتے ہیں! وہ پجاریوں کو ساتھ لیکر انکے پیچھے نکلتا تھا۔ اور ان کو پکڑ پکڑ کر دھیمی آگ میں جلا کر مار ڈالتا تھا۔ وہ لوگوں سے کہتا تھا کہ "سچے پیغمبر کے لئے عزت ہے لیکن سچا پیغمبر صرف میں ہوں تمام جھوٹے پیغمبر یقیناً موت کے سزاوار ہیں" اور لوگ دھولیا کے لڑکے کی پرہیزگاری کی تعریف کرتے تھے۔

شاطر نے سب سے عقلمند بچوں کو مندر کے رازوں کی تعلیم دی اور وہ تربیت پاکر اس کے عہدہ کے فرائض بجالانے کے قابل ہوگئے۔

وہ عمر طبعی کو پہنچکر عزت وحرمت سے اس جہان سے رخصت ہوا اور لوگوں نے مندر کے سامنے اس کا سنگین بت بنایا۔ وہ بت ایک ہزار برس تک قائم رہا۔ جو کوئی اس کو دیکھتا تھا ڈر سے کانپ اُٹھتا تھا کیونکہ چہرہ سنجیدہ تھا اور سنجیدگی میں ناقابل بیان رعب وداب ظاہر ہوتا تھا۔

---

سال کی آخری رات ہے اور تارے اپنے جواہر نگار تختوں پر بیٹھے ہیں اور کبھی بند نہ ہونے والی آنکھوں سے دنیا کی نگہبانی کررہے ہیں۔ رات اندھیری اور طوفان خیز ہے تیز آندھی چل رہی ہے اور بادل تیزی اور کثرت سے رات کے بادشاہوں کے تختوں کے نیچے ادھر اُدھر اڑ رہے ہیں کبھی کبھی شہاب ثاقب آسمان سے ٹوٹتے ہیں اور تاریکی کی قبر میں غائب ہوجاتے

ہیں، اپنے بھائیوں سے بہت نیچے اور زردی مائل روشنی میں وہ بے صبر تارہ بیٹھا ہے جو مغرب کی شکاریوں کی نگہبانی کرتا ہے۔

آدھی رات کے وقت فضا کے عمیق ترین طبقۂ اسفل السافلین سے ایک عظیم الجثہ شئے اُٹھی اور اس کے پروں سے دنیا پر سیاہی چھا گئی۔ یہ خوفناک صورت اُڑ کر بے صبر تارہ کے تخت کے پاس آئی۔ جب وہ اس کے سامنے اُکر ٹھیری تو تارہ اپنے تخت پر ڈر کے مارے کانپنے لگا۔ اس ڈراؤنی صورت نے تارہ سے کہا: "اے بھائی السلام"

تارہ نے جواب دیا: "میں تجھے نہیں جانتا۔ تو جبرئیل نہیں ہے جو رات کے بادشاہوں کے پاس آیا کرتا ہے"

اس صورت نے قہقہہ مارا اور کہا: "میں صبح کا مقہور تارہ ہوں۔ میں ابلیس ہوں تیرا بھائی۔ کیا تونے میری اور میرے پیروؤں کی خدمت نہیں کی ہے؟ کیا تونے زمین کو اپنے آقا سے جو اوپر ہے نہیں چھین لیا ہے؟ اور کیا تونے آدمیوں کی روحوں کو خوف کے مذہب سے تاریک کرکے زمین پر میری مملکت قائم نہیں کردی ہے؟ پس اے بھائی میرے ساتھ آ! گھپ اندھیرے میں میرے تخت کے پاس تیرے لئے تخت موجود ہے۔ آ! آسمان تیرے لئے موزوں نہیں ہے"

تب وہ تارہ اپنے تخت سے اُٹھا اور نیچے اُتر کر ابلیس کے پاس چلا گیا۔ کیونکہ ہمیشہ سے بے صبری سے غرور کی ہمدردی رہی ہے۔ اور وہ دونوں آہستہ آہستہ تاریکی کی خلیج میں اُتر گئے۔

---

نئے سال کی پہلی رات ہے اور تارے اپنے جواہر نگار تختوں پر بیٹھے ہیں اور کبھی بند نہ ہونے والی آنکھوں سے نگہبانی کر رہے ہیں لیکن رات کے بادشاہوں کے چہروں پر غم کے آثار ہیں کیونکہ وہ خاموشی میں اور حالتِ خوف میں ایک گنہگار بھائی کا ماتم کر رہے ہیں۔

اتنے میں آسمان کے دروازے کھلے اور تیز رو فرشتہ خاموشی سے اُڑ کر آیا اور پہلے کی طرح ہر فرشتہ کو اپنے مالک کا پیغام پہنچایا۔ جب نقابت کا کام ختم ہو چکا تو اسفل السافلین کی تاریکی میں سے قہقہہ کی آواز آئی اور تاریک خلیج میں سے ابلیس شیطان نکلا اور جبرئیل سے کہنے لگا۔ "اے روشن چہرہ! تو اپنے گلّے کو غلط گنتا ہے۔ دیکھ ستر ہزار تاروں میں سے ایک تارہ غائب ہے"

"دُور نافرمانبردار ملعون ابلیس! اپنی تاریک خلیج میں واپس جا۔ تیرے مقہور بھائی کا تخت پُر کر دیا گیا ہے"

جبرئیل کے کہنے پر جب تاروں نے دیکھا تو گنہگار تارہ کے تخت پر ایک نوجوان اور چمکدار اجنبی نظر آیا۔ اس کے چہرہ کا رنگ ایسا پھیکا تھا کہ کمزور سے کمزور آنکھ بغیر چُندھیائے ہوئے اس پر نظر جما سکتی تھی لیکن صرف ابلیس کی آنکھ اس کی روشنی سے چندھیا گئی۔ اور ایسی چیخ ماری کہ عالم کے آتشی ستون لرز گئے اور وہ تاریکی میں واپس چلا گیا۔

تب دُور سے نامعلوم جگہ سے خدا تعالیٰ کی شیریں آواز سنائی دی "دیکھو! بے صبر تارہ کے تخت پر اُمید کا تارہ جلوہ گر ہے اور یہ اس کا جانشین ہے۔ جس نے انسان کو خوف کا مذہب سکھایا۔ یہ تارہ انسان کو محبت کا مذہب سکھائیگا!"

چنانچہ جب سے خوف کا تارہ ابلیس کے ساتھ رہتا ہے اور محبت کا تارہ آسمان پر نگہبانی کرتا ہے۔

---

نور الحسن برلاس

# پنچایتی فسانہ

## پُر اسرار وصیّت

### از آوارگانِ ادب

مدّتوں کا کیا ہوا ارادہ آج پورا ہوتا ہے۔ ایک عالم جمود کے بعد پھر آنکھیں کُھلتی ہیں۔ جہاں تک واقعات سے معلوم ہوا ہے۔ بعضے تو آوارگانِ ادب کے افراد کو مردہ تک تصوّر کرنے لگے۔ حالانکہ ان میں سے ہر ایک بفضلہ زندہ ہے۔ چنانچہ زندگی برقرار رکھنے کے لئے یہ تازہ ثبوت پیش کیا جاتا ہے۔ اب وہ حضرات جو ہم کو مردہ تصوّر کر کے فاتحہ خوانی کرنا چاہتے تھے۔ براہ کرم زندگی کے لئے دعائے خیر کریں۔ کیا عجب کہ تھوڑی بہت ہمت ان ہم سے بھی اور ہو جاتے ...... آوارگانِ ادب۔

---

از ایم۔ شمیم بلہوری۔

اُف ........ خدایا؟ ۴ر نومبر ۱۸۷۶ء کی وہ کبھی نہ بھولنے والی رات ...... ہاں ...... اس بلا کی تھی، کہ جس کی یاد آج تک باقی ہے ..... کہر کا وہ سخت طوفان، جس نے ۴ بجے دن سے شروع ہو کر صرف تین گھنٹے کے اندر سارے شہر بمبئی کو تاریکی میں لپیٹ کر پردہ ظلمات کی شکل دیدی تھی۔ دو، چار گز کے فاصلے کا تو ذکر کیا! پاس کی چیزیں نظر نہ آتی تھیں۔ بجلی کی روشنیاں اس کہر کی تابِ مقابلہ نہ لا کر ایسا دھندلا سماں پیش کر رہی تھیں کہ اُن کا عدم وجود برابر معلوم ہوتا تھا۔ ٹراموے، رئیسوں کی گاڑیاں، موٹر وغیرہ سب بند ہوتی جا رہی تھیں۔ اور اگر کوئی ایک آدھ گاڑی اِدھر اُدھر نظر بھی آجاتی تو وہ اپنے منزلِ مقصود پر واپس جانے کے لئے تیزی سے گذر کر اس قدر جلد تاریکی میں غائب ہو جاتی کہ آسیب کا گمان ہوتا۔ دوکانداروں، مکان والوں نے اس کہرے کی دم گھٹنے والی فضا سے بچنے کے لئے اپنی اپنی دوکانوں اور مکانوں کی کھڑکیاں بند کر لی تھیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ رمقِ روشنی جو اُن کی راہ سے سڑک پر آسکتی، غائب ہو گئی۔ اور اس بلاخیز تاریکی میں مزید اضافہ ہو گیا۔ چنانچہ چھ بجے دن کو بمبئی جیسا آباد و بارونق شہر بلائے شب کی ہیبت آفریں سیاہ چادر میں ملبوس کہرے کے طوفان کا ماتم کناں نظر آ رہا تھا۔ بھولے بھٹکے، تھکے ہارے، نو وارد اجنبی آدمیوں کی چیخ پکار ذرا ذرا دیر بعد ضرور سنائی دیتی، جسے فوراً پولس کا سپاہی ہدایات دے کر آگے چلتا کرتا۔ کرایہ کے تانگوں کا اوّل تو کہیں پتہ نہ تھا اور اگر اتفاق سے ایک آدھ کہیں نظر آ جائے، تو وہ اُس وقت ایسی بے پر کی اُڑاتا کہ کسی شخص کو ریلوے اسٹیشن یا بازار سے اپنے گھر پہنچنا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ ہر شخص، ہر ذی روح شے اپنی اپنی جگہ پر حیران و سراسیمہ تھی صورتِ حال دشوار

بھی تھی اور خوفناک بھی۔ دشوار اس لئے کہ ایسے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں صحیح سڑک اور گلی کا پہچاننا ناممکن۔ مشعل، بتی روشنی، لالٹین وغیرہ سب بیکار … خوفناک اس لئے کہ گاڑی اور تانگے کو راستہ پہ چلانا سخت مشکل۔ خدا معلوم کیا افتاد پڑے۔ اور گاڑی صحیح راستہ سے اُتر کر کہاں اُلٹ جائے۔ اور مفت میں لینے کے دینے پڑ جائیں۔

بمبئی میں یہ تو قیامت زا ساں، نمونہ حشر …………… اور رات کے آٹھ بجے کا وقت! ……… کہ کپتان ساجد، حاجی ہارون، موسٹے کمپنی کے جہاز خسرو چین، کا ناخدا، اپنے علم ویقین کے مطابق اس وقت آر نبی روڈ پر چل رہا تھا۔ وہ ابھی ابھی ذرا دیر پہلے ایک شخص سے ٹکر کھا گیا تھا جس کی زبانی اُسے معلوم ہوا کہ یہ قلعہ کی سڑک آر نبی روڈ ہے۔ اور اگر وہ سیدھا بڑھا چلا جائے تو آگے تاروں کی باڑھ پھاند کر وہ شہر کے حصہ آبادی میں داخل ہو جائے گا۔

کپتان ساجد اُسی روز اپنا جہاز لیکر ساحل بندرگاہ پہ لنگر انداز ہوا تھا۔ اور یہاں آتے ہوئے راستہ میں اُسے ایک عجیب وغریب واقعہ پیش آیا تھا۔ اسکندریہ سے جہاز روانہ ہونے کے کچھ ہی دن بعد ایک درجہ اول کے مسافر نے اُس سے ملنے کی درخواست کی۔ یہ مسافر جوان العمر، خلیق اور اعلیٰ اطوار کا تھا۔ اُس نے جہاز کا ٹکٹ نور وزجی عادل شاہ کے نام سے خریدا تھا۔ مگر یہ جس وقت جہاز پر سوار ہوا ہے تو بظاہر سخت بیمار و ناتواں معلوم ہوتا تھا۔ وہ کسی روز عرشہ جہاز پر تفریحاً ٹہلتے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔ اُس نے ہمیشہ ناسازیِ طبع کا عذر پیش کیا۔ نہ کسی سے ملتا جلتا، برابر اپنی بند کوٹھری میں پڑا رہتا۔ کپتان ساجد نور وزجی کی درخواست پر اُس سے ملنے گیا۔ تو اُس نے اُسے عجیب حالِ زار میں مبتلا پایا۔

"کپتان صاحب" اُس نے کہا "میرے دل کو القا ہو رہا ہے کہ میں بمبئی پہونچنے تک زندہ نہیں رہ سکتا۔ اب اگر یہ غیبی اندیشہ صحیح نکل جائے تو میری خواہش ہے کہ آپ میرا تمام اسباب اور ایک خط جو میں آپ کے حوالہ کروں گا بمبئی پہونچ کر میرے ایک عزیز کو پہونچا دیں۔ اگر آپ اِس ذراسی تکلیف کو ازراہِ ہمدردی میری خاطر گوارا کرنا منظور کرلیں، تو میرے قلبِ حزیں کو بڑی حد تک تسکین ہو جائے اور آغوشِ لحد میں جانے کا مجھے مطلق رنج نہ ہو"

"مہربانِ محترم" کپتان نے جواب دیا "مجھے بڑا افسوس ہے کہ آپ روشن خیال اور صحیح الدماغ ہو کر اپنے دل کو ایسے خیالات باطلہ سے پریشان کر رہے ہیں۔ ظاہراً آپ کو کچھ اختلاجِ قلب کی شکایت معلوم ہوتی ہے۔ اچھا ٹھیرئیے، میں ابھی جہاز کے ڈاکٹر کو آپ کے پاس بھیجتا ہوں"

"نہ …… نہ …… میرا علاج کوئی ڈاکٹر نہیں کر سکتا۔ نہ میں کسی سے ملنا چاہتا ہوں" مسافر نے کسی قدر بگڑ کر مایوس لہجہ میں زور سے کہا "میں یہ تو نہیں کہتا کہ میں ابھی مر رہا ہوں، صرف ایک خیال ہے۔ بفرضِ محال میں مر ہی جاؤں تو کیا آپ میری درخواست پوری کرنیکا وعدہ کرتے ہیں … یا …"

"یقیناً...... لیکن......"

"دلی شکریہ" مسافر نے کپتان کو فقرہ پورا کرنے کی فرصت نہ دے کر کہا "یہ لیجئے، خط ہے۔ رہ گیا سامان تو اگر میں زندہ نہ بچوں تو آپ اُس کو اپنی حفاظت میں لیکر قبضہ میں رکھیں۔"

نوروزجی نے اپنی جیب سے ایک لمبا سربمہر لفافہ نکالا۔ اور کپتان کی طرف بڑھا کر ہاتھ میں دیدیا۔ اس پر یہ پتہ درج تھا۔

"مس آر۔ د شاہ گوہربائی۔ نمبر...... کھٹاؤ بلڈنگ..... شہر بمبئی"

"اب آپ مجھے اس امر کا حلفیہ اطمینان دلائیں کہ آپ میری ہدایات کے مطابق عمل کریں گے" نوروزجی نے کپتان کے چہرہ کو اپنی نقیہہ آنکھوں سے گھورتے ہوئے سوال کیا۔

"میں آپ سے حلفیہ اقرار کرتا ہوں... مگر.... اگر بمبئی پہونچنے کے وقت تک آپ بخیر و خوبی زندہ و سلامت رہے...... تو......"

"تو وہ خط آپ فوراً میرے حوالے کر دیں گے۔ یعنی اُس لمحہ آخر میں، جب میں جہاز سے اُتر کر ساحل کی طرف چلدوں..... اُس وقت......"

کپتان ساجد نے نوروزجی کو اطمینانِ کلّی دلایا کہ اُس کی عجیب درخواست کو حرف بحرف پورا کیا جائیگا اور اُس کو ہمدردی کے ساتھ تسلّی و تشفّی دی کہ اس کی طبیعت بہت جلد رو بہ اصلاح ہو کر درست ہو جائے گی۔

اس کے بعد وہ واپس ہوا اور اس لفافہ کو باحتیاط اپنے ذاتی کاغذات کے صندوق میں بند کر کے رکھدیا۔

اُسی شب میں بہت رات گئے، جب جہاز کے قریب قریب تمام مسافر آرام کیلئے لیٹ چکے تھے۔ دفعتاً محافظ جہاز کی ایک چیخ نے سب کو بیدار و حیران کر دیا۔

"کوئی شخص جہاز سے گر پڑا ہے!"

ہر طرف بوکھلاہٹ اور سراسیگی پھیل گئی۔ جہاز پر ہر شخص پریشان و سہمگیں نظر آنے لگا۔ انجن رد کدیا گیا۔ آدمیوں نے بندھی ہوئی کشتیوں کی رسیاں ڈھیلی کیں، اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں، مگر کسی چیز کا نشان نہ معلوم ہوا۔

"کیا تمہیں یقین ہے کہ تم نے کسی شخص کو جہاز سے گرتے دیکھا؟" کپتان ساجد نے متفکرانہ انداز سے سوال کرتے ہوئے سطحِ بحر کو غور سے دیکھا۔

"یقیناً حضور... وہ اُس جگہ جہاز کے سلاخوں کا سہارا لئے کھڑا تھا کہ یکایک وہ اُن پر چڑھا اور معاً سمندر میں پھاند پڑا۔ میں نے اُسے گرتے دیکھا اور پانی اُچھلنے کی آواز بھی سُنی۔"

رات نہایت پُرسکون تھی۔ فوراً ایک کشتی پانی میں اُتاری گئی۔ اور چند ملاحوں نے اس پر سوار ہو کر جہاز کے ہر طرف کچھ کچھ فاصلہ تک تلاش کی خوب دیکھا بھالا۔ مگر ڈوبنے والے کا کوئی پتہ نشان نہ مل سکا۔

کافی عرصہ تک تلاش کر لینے کے بعد جب کوئی اُمید باقی نہ رہی تو کپتان نے جہاز کو آگے بڑھنے کا حکم دیدیا۔

اسی اثنا میں جہاز کے دوسرے عمال تمام مسافروں کا جائزہ لے رہے تھے، تاکہ یہ معلوم ہوجائے کہ گمشدہ مسافر کون شخص تھا۔ یہ کام چنداں مشکل نہ تھا، چند ہی منٹ بعد معلوم ہوگیا کہ نوروزجی عادل شاہ کا کمرہ خالی تھا اور وہیں میز پر ایک لفافہ کپتان ساجد کے نام لکھا ہوا رکھا تھا جو فوراً اُس کے پاس پہونچا دیا گیا۔

کپتان ساجد نے فوراً اُسے کھولا ...... پڑھا ... لکھا تھا:۔

"مہربانم! ... نمبر ... کا مکین میں نے خودکشی کرلی۔ یہ کیوں، اللہ بہتر جانتا ہے۔ میں آپ کو انسانیت واخلاق کا واسطہ دیتے ہوئے ... درخواست کرتا ہوں کہ براہ کرم میرے دئیے ہوئے لفافہ کو بلا کھولے ہوئے آپ مکتوب الیہ کو پہونچا دیں۔ اس میں کوئی ایسی ... بات نہیں جو اس وقت تک آپ کو معلوم نہیں۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ مادر ہند کے رہنے والے ایک شخص نوروزجی عادل شاہ نامی نے سمندر میں گر کر خودکشی کرلی اور جان سے گذر گیا......

ہاں، میرے کمرہ میں رکھے ہوئے دستی بیگ کو کھول کر دیکھئے......"

کپتان ساجد نے خود ہی دل میں یہ فیصلہ کیا کہ سربمہر لفافہ کھولنے سے کوئی فائدہ نہیں، دوسرے یہ کہ مرنے والے نے وصیت کردی تھی کہ اُسے نہ کھولا جائے۔ اس لئے اُس کی خلاف ورزی کرنا انسانیت سے بعید تھا۔ مگر وہ خوب سمجھتا تھا کہ اس نمبر کو مکتوب الیہ خاتون کے روبرو پیش کرنا بہت ہی المناک واقعہ ہے، جو غالباً متوفی کی کوئی قریبی رشتہ دار ...... یا بہت ممکن ہے ...... محبوبہ دلنواز ہو......

اُس نے اس دردناک موت کے تمام واقعات کو تفصیل کے ساتھ قلمبند کیا تاکہ بمبئی پہونچکر حکام بالا کے سامنے رپورٹ پیش کی جاسکے۔ اس کے بعد متوفی کے تمام سامان کو اپنی حفاظت ونگرانی میں لیکر اُس نے اس واقعہ کو دل سے بھلانے کی کوشش کی۔

جس وقت اُس نے متوفی کی کوٹھری سے دستی بیگ نکال کر کھولا تو اُس کو ایک بات کچھ عجیب سی نظر آئی۔ اور باوجود کوشش اُس کے دل کو اطمینان نہ ہوسکا۔ اس میں ایک بہت ہی باقاعدہ دستخطی، گواہوں کے سامنے تحریر کیا ہوا وصیت نامہ رکھا تھا جس میں نوروزجی یا نواز بھائی نے اپنی وفات کے بعد اپنے تمام مال ومتاع کا جائز وارث مس آرد شاہ گوہر بائی کو قرار دیا تھا۔ جو اس وقت مکان نمبر ...... متصل کھٹاؤ بلڈنگ بمبئی میں مقیم تھی۔

"نوروزجی یا نواز بھائی!" کپتان ساجد نے اپنے دل میں کہا "بڑی حیرت ہے... کیا اس شخص کے دو نام تھے اور کیا عجب کہ ان ناموں کی تہ میں ہی اسکی خودکشی کا راز مضمر ہو!"

چنانچہ جس وقت کپتان ساجد ۱۶ رنومبر کو بمبئی پہونچا تو اُس نے حکام بالا کو اس واقعہ کی باقاعدہ اطلاع پہنچا اور متوفی کے تمام صندوق اور اسباب اپنے مالکوں کی سپردگی میں رکھوا دیا تاکہ گوہر بائی کا پتہ معلوم ہونے پر ہر چند بآسانی اُس کے حوالہ کردی جائے۔

رہ گیا سربمہر لفافہ کا سوال۔ یہ اس سامان سے قطعی مختلف تھا۔ اس کے بابت اُس نے متوفی سے حلفیہ وعدہ کیا تھا کہ وہ خود اسے مکتوب الیہ تک پہونچائیگا جہاز پہونچنے کے بعد کچھ دیر تو وہ اپنے فرائض منصبی کی اُلجھنوں میں پھنسا رہا اور شام کو جس وقت فرصت ملی تو وہ گھنٹا ؤبلڈنگ کی طرف روانہ ہوا۔ مگر سوء اتفاق دیکھئے کہ کہر کے حشر آفریں طوفان نے قیامت صغریٰ بپا کردی۔

مگر اس کہرے کے طوفان کی پرواہ نہ کرکے، وہ تمام مشکلات کو نظر انداز کرتا ہوا کس طرح گھنٹاؤ بلڈنگ کے علاقہ تک پہونچا۔ اس کی تفصیل غیر ضروری ہے۔ مگر وہاں پہونچ کر جس وقت اُس نے دستک دی اور دروازہ کھلا تو ایک بہت ہی معزز شخص نے یہ اطلاع دی کہ مس گوتھربائی اب اس مکان میں مقیم نہیں۔ حالانکہ کچھ ہی روز پیشتر وہ تقریباً تین برس سے وہیں بہ حیثیت اُستانی و اتالیق کے ملازم تھی۔ صرف ایک ماہ قبل وہ اس عہدہ سے برطاست کردی گئی۔ اب معلوم نہیں کہ وہ کہاں گئی، نہ یہ علم ہے کہ اُس کا کیا حشر ہوا۔

معزز شخص کی طرز گفتگو سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس ملاقات کو زیادہ طول نہیں دینا چاہتا۔ اس لئے کپتان بھی سلام کرکے وہاں سے رُخصت ہوا۔ مگر مرحوم کی وارثہ کو تلاش کرنے کی پہلی ہی کوشش میں جیسی ناکامی ہوئی وہ بادی النظر میں بیحد حوصلہ شکن تھی۔

"میرے خیال میں یہ بہتر ہوگا" وہ دل ہی دل میں کہنے لگا "کہ میں اس خط کو بھی اپنے مالکوں کے پاس رکھادوں، وہ خود اس نوجوان خاتون کو تلاش کرلیں گے۔ میں بمبئی ایسے وسیع شہر میں اُس کی تلاش کس طرح جاری رکھ سکتا ہوں اور نہ ایسا کرنے کی مجھے فرصت ہے۔"

اُس نے اس عجیب و غریب واقعہ کی تفصیلات پر دوبارہ نظر ڈالنا شروع کیا تو وہ کچھ ایسے گہرے خیالات میں غرق ہوا کہ کہرے کے طوفان کی ہیبت کو بھی نظر انداز کرگیا۔ چنانچہ اپنی جائے قیام کی طرف واپسی کے بجائے وہ راستہ بھول کر آخر کار جہاں پہونچا، وہ قلابہ اسٹیشن کا نواح تھا اور اب اُس نے آنکھ کھولکر ایک بار دیکھا تو اس طوفانی رات میں آٹھ بجے وہ قلابہ اسٹیشن کے گرد باغات کے قریب کھڑا ہے۔ وہ بالکل سراسیمہ ہوگیا۔ راستہ کا بھولنا اور پھر ایسے ناوقت، سخت تشویش کن تھا۔ پھر لطف یہ کہ آس پاس کوئی متنفس بھی موجود نہ تھا جس سے دریافت حال کیا جاسکے۔

اس تمام تگ و دو میں اُس کی ملاقات صرف ایک شخص سے ہوئی تھی، جس سے وہ ٹکرا گیا تھا۔ اور اُس نے یہ ہدایت دی تھی کہ آگے تاروں کی باڑھ پھاند کر حصہ شہر ہے۔ لیکن حصہ شہر سے یہ مراد تو نہیں ہوسکتی کہ وہ اپنے جائے قیام جو پالی پہونچ جائے۔ مگر اب تا کیا نہ کرنا کسی طرح حصۂ شہر میں پہونچکر راستہ کا دریافت کرنا ضروری تھا۔ یہاں کیا کیا جاتا۔ مجبوراً کپتان ساجد نے اُنہیں احاطہ باغ کے تاروں کو احتیاط سے پکڑ کر ایک ایک قدم بڑھنا شروع کیا۔ کہرے کی بے پناہ شدت نے حبس پیدا کر رکھا تھا۔ حلق میں سانس رُکتی اور گلا گھٹتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ مگر کپتان اپنے افسردہ ہاتھوں سے تاروں کو تھامے، آنکھوں کو زمین پر گاڑے تاروں کی

باڑھ کو اپنا رہبر قرار دئے آگے بڑھا چلا جارہا تھا کہ یکایک اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اُسے کسی چیز کی ٹھوکر لگی...... اور......

وہ یک دم رُک گیا۔

اُس کے پیر نے زمین پر پڑی ہوئی کسی چیز سے ٹھوکر کھائی تھی اور اس طرح اچانک کہ وہ گھٹنوں کے بل آرہا اور اپنے بچاؤ کی کوشش میں جس وقت اُس کے ہاتھوں نے فطرتاً زمین کی تلاش کی، تو بجائے فرش زمین کے وہ کسی انسانی جسم پر رُکے جو راستہ میں پڑا ہوا تھا۔ ساجد کے بدن میں پھُریری آگئی۔ مگر فوراً ہی اوسان بجا کر کے اُس نے ہاتھ پھیر کر معلوم کیا کہ وہ کسی عورت کا لباس تھا۔ اور یہ یقیناً کوئی عورت ہی پڑی تھی۔ اب یہ سوال کہ وہ نوجوان تھی یا ضعیفہ، اچھے کپڑے پہنے تھی یا بُرے، غریب گھرانے کی تھی یا امیر، کسی ادنیٰ طبقہ کی تھی یا اعلیٰ کی، تاریکی میں یہ دیکھنا ناممکن تھا۔ مگر یہ امر واقعہ تھا کہ وہ کوئی عورت تھی اور اب اس کو اس طرح سڑک پر پڑا ہوا چھوڑ دینا کپتان ساجد ایسے پیکرِ اخلاق کے لئے ناممکن تھا۔ اُس نے آہستگی سے شانہ ہلا کر اسے آواز دی اور کئی بار ہلایا۔ ایک مرتبہ چلا کر زور سے پوچھا۔

"اوہو... بانو... اچھی بانو... کیا بات ہے... ہوش میں آؤ..."

لیکن کوئی جواب نہ ملا

"خدایا!... اگر کہیں وہ مرچکی ہے" کپتان نے خود ہی بُڑبُڑانا شروع کیا "تو میں اسے ایسی سرد اور طوفانی رات میں کس طرح تنہا چھوڑ سکتا ہوں۔ مگر ہاں، میں اکیلا کر ہی کیا سکتا ہوں، میں کتنی بار آوازیں دیکر اسے ہوشیار کرنے کی کوشش کر چکا ہوں" وہ پھر ایک بار دو زانو ہو کر جھک گیا اور عورت کے نبض پر ہاتھ رکھ کر اسکی حرکت کا اندازہ کرنے لگا۔

نبض تیزی سے حرکت کر رہی تھی۔

کپتان ساجد نے فوراً ہی کھڑے ہو کر اپنی پوری طاقت سے چلّانا شروع کیا۔

"مدد... مدد... مدد... جلد دوڑو... اس طرف آؤ"

ذرا ہی دیر میں اُسے قدموں کی چاپ سُنائی دی اور کسی کی آواز نے کہا۔

"کیا بات ہے۔ تم کہاں ہو؟"

"یہاں، یہاں" کپتان نے فوراً کہا "اس طرف، اس جگہ ایک عورت زمین پر پڑی ہوئی ہے"

آوازیں اور قریب تر آگئیں، اور آن کی آن میں دو پولیس کے جوان اپنی لالٹینوں کو روشن کئے اُس کے قریب آن کر کھڑے ہو گئے۔

کہرے کی شدت میں تاریکی کا وہ عالم تھا کہ اُن کی لالٹین انتہائی خفیف روشنی پیدا کر رہی تھیں۔ اور جس وقت روشنی کی یہ رمق اُس بیہوش خاتون کے چہرہ پر پڑی تو تینوں آدمیوں کی زبان سے رحم آمیز

ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

زمین پر پڑی ہوئی بیہوش، بیکس و لاچار ایک بلا کی حور وش، حسین و خوبصورت دوشیزہ تھی، اُس کا چہرہ بُری طرح سفید تھا، آنکھیں بند تھیں، مگر خد و خال سے وہ نہایت معزز، شریف، اور تعلیم یافتہ معلوم ہوتی تھی۔ لباس گو معمولی تھا مگر نہایت صاف ستھرا۔ ساڑھی کے آنچل نے سر سے سرک کر پریشان بالوں کی لٹوں کو ادھر اُدھر چہرے پر بکھیر دیا تھا۔ مگر یہی پریشان بال اُس کے زرد اور خوبصورت عارض پر اس وقت بلا کے دلفریب معلوم ہو رہے تھے۔

پولیس کے ایک آدمی نے متفکرانہ انداز سے اُس کے چہرے پر نگاہیں ڈالیں اور دوسرا لالٹین لیکر کھڑا ہو گیا۔

"نہیں" وہ بولا "میرا یہ خیال ہرگز نہیں کہ اس کو کسی نے حملہ کر کے گرایا ہو، بلکہ کہرے کے حتباس اور فضا کی تاریکی نے اسے بیہوش کر دیا ہے... آہ.. غریب معصوم... افسوس.. کچھ بول تو..."

مگر پھر بھی کوئی جواب نہ ملا۔

---

### از دیوانہ بریلوی

بیہوش حسینہ کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر ایک کانسٹبل نے اس کو کھڑا کرنے کی کوشش کی ___ دوسرے نے اس کے کف ہائے نازک کو اپنے کھُرے ہاتھوں سے جھامہ کرنا شروع کیا جو نہ صرف دودھ کی طرح سفید بلکہ برف کی طرح ٹھنڈے بھی تھے۔

دوشیزہ نے دفعتاً آنکھیں کھول دیں۔ وہ حشر ساماں آنکھیں جو دوشیزہ کے ہوش میں آنے کے باوجود ابھی تک خود مدہوش تھیں۔ حاضرین نے ہلانے کو تو نظریں ملالیں لیکن فضا کی تاریکی اور کہر کی دبیز چادر میں اُن لوگوں نے ایسا محسوس کیا گویا کسی نے بیک وقت دو برقی قمقموں کی روشنی ڈال کر اُن کی نگاہوں کو خیرہ کر دیا ہے۔

دوشیزہ نے دو چار بار اپنی ہموار سیاہ پلکوں کو حرکت دے کر اپنی آنکھوں کا بھاری پن دور کرنے کی کوشش کی اور پھر ایک بار سامنے والے تینوں چہروں پر بھیانک نظریں ڈال کر ضعیف آواز سے بولی "میں....

...میں کہاں ہوں؟"

ایک کانسٹبل نے جواب دیا "آپ پریشان نہ ہوں ___ خدا کا شکر ہے کہ..... کیا آپ بیہوش ہو گئیں تھیں؟"

"جی ہاں ___ جی ہاں ___ میں ڈر گئی تھی اور... میں بیہوش ہو گئی..... اور....."

"آپ کہاں رہتی ہیں؟"

دوشیزہ نے پھر ایک مرتبہ ہر شخص کو سر سے پاؤں تک بغور دیکھا۔ اس کے حواس بتدریج واپس ہو رہے

تھے اور اس کا ذہن رفتہ رفتہ اپنا کام کر رہا تھا۔

"ہاں، تو میں نے یہ عرض کیا کہ آپ کہاں تشریف رکھتی ہیں۔ہم چاہتے ہیں کہ آپ کو بآرام تمام آپ کے گھر پہونچا دیں۔"

"آہ! مجھ بدنصیب کا کوئی گھر در نہیں ہے" یہ کہکر اُس نے اپنے دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ لئے اور پھوٹ پھوٹ کر بے طرح رونے لگی۔

کپتان کے دل پر چوٹ لگی اور عالم سکوت میں بے خود ہو کر رہ گیا۔

کانسٹبل نے کہا "صاحبزادی! خدا کے لئے اپنے جائے قیام سے ہم کو جلد آگاہ کر دیجئے۔ہم اس حال اور اس مقام پر آپ کو کسی طرح نہیں چھوڑ سکتے۔

"چھوڑ دیجئے!—آپ مجھ کو میرے حال پر یہیں چھوڑ دیجئے" دوشیزہ نے کرب اور بے چینی کے انداز میں جواب دیا۔

"یہ ناممکن ہے، خاتون سمجھ لیجئے کہ یہ قطعی ناممکن ہے، کیا آپ تھانہ تک چلنا گوارا کرینگی۔وہاں ڈاکٹر کے مشورہ سے آپ کی نگہداشت اور علاج کا معقول انتظام کر دیا جائیگا۔"

"تھانے! ہاں یہ سچ ہے۔گردش قسمت نے ابھی تک یہی گھر باقی چھوڑا تھا اب اس کا وقت بھی آگیا—لیکن نہیں میں ہرگز نہ جاؤں گی۔آپ مجھے زبردستی تو ..."

رنج کی فراوانی نے ایک دل سوز آہ بھرنے اور جوش گریہ نے گرم گرم آنسو بہانے پر کپتان کو مجبور کر دیا۔اس نے خوشامدانہ انداز میں کہا۔

"محترمہ! بظاہر کسی خاص تکلیف و مصیبت یا رنج والم نے آپ کو اس حال پہونچایا ہے۔کیا کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں آپ کی مرضی کے مطابق آپ کو پہونچا دیا جائے۔کیا ہرج ہے کہ آپ اپنے نام اور پتہ سے ان لوگوں کو آگاہ کر دیں، یہ سرکاری آدمی ہیں۔آپ کو ہرگز کوئی تکلیف یا گزند نہ پہونچے گا۔میں بھی ہر خدمت کے لئے بسروچشم حاضر ہوں۔

"آپ الگ ہٹ جائیے" ایک کانسٹبل نے ترش رو ہو کر کہا "ہم اس کو تھانے لئے جاتے ہیں صبح ہونے تک یہ خود بخود اپنا نام و نشان اور جائے قیام بتا دیگی۔

دوشیزہ نے رحم اور التجا کے اظہار کے لئے اپنے دونوں کانپتے ہوئے ہاتھ بمشکل تمام اوپر اٹھا دئے۔ اور بھیانک نظروں سے دیکھ کر کہا "بہت اچھا میں اپنی بابت الٹی سب کچھ عرض کئے دیتی ہوں، مگر اس شرط کے ساتھ کہ آپ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔"

اس نے کوشش کی کہ اپنے بازواں قوی ہاتھوں سے چھوڑائے جنکی گرفت میں اب تک وہ مقید تھی لیکن اس کی کوشش ناکام رہی۔

کپتان نے پھر کہا: "آپ کے کوئی عزیز رشتہ دار، دوست احباب ایسے ضرور ہوں گے جو اس حال میں آپکی اعانت اور ہمدردی کریں؟"

"دوست!۔ عزیز!!۔ حضور عالی، دنیا میں میرا کوئی عزیز نہیں۔ مجھ نصیبوں جلی کا کوئی ہمدرد نہیں میں ناوام معلّمہ ہوں۔ ایسی مفلس کہ جس کے پاس مکان کا کرایہ دینے یا پیٹ بھر روٹی کھانے کے لئے ایک حبہ تک نہیں ہے"

کانسٹبل نے کہا: "اچھا، اچھا۔ مہربانی کر کے آپ ہمیں اپنا نام بتائیں اور یہ بھی بتائیں کہ آخر مرتبہ آپ کہاں ملازم تھیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہم کو آپ یہاں شاہراہ عام پر بیہوشی کی حالت میں ملیں اور ......"

"بہت خوب" دوشیزہ سر سے پیر تک بید کی طرح کانپ رہی تھی۔ اس کی خوبصورت آنکھیں خود اپنی آنسوؤں کے سیلاب میں ڈانواں ڈول ہونے لگیں: "میں عرض کرتی ہوں ــــــ میرا نام مس آرڈ شاہ گوہر بانی ہے اور ابھی پچھلے مہینے تک میں..... کمشاؤ بلڈنگ میں بطور معلّمہ کے ملازم تھی"

کپتان ساجد کو اپنی سماعت پر اعتبار نہ ہوا۔ حیرت و استعجاب کی حالت میں ایک قدم آگے بڑھ کر اس نے پوچھا "کیا فرمایا..... مس آرڈ شاہ گوہر بانی؟ ــــــ یہ نہیں ہو سکتا!" پھر کچھ دیر سوچ کر بولا "میرے پاس تو آپ کے لئے ایک خط ہے جو مجھے ......"

پولیس والوں کی حیرت قابل دید تھی۔ دونوں پاگلوں کی طرح منہ کھولے عالمِ سکوت میں بے خود ہو کر رہ گئے۔ لیکن دوشیزہ کے چہرے اور آنکھوں نے حُسن کا وہ خواب دکھا دیا جس کو حضرت غالبؔ نے "اور بن جائیں گے تصویر جو حیراں ہونگے" سے تعبیر کیا ہے۔

کپتان نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر پاکٹ بُک نکالنے کے لئے جیب کی تلاشی لینا شروع کر دی لیکن گھبراہٹ کے ساتھ پورا ہاتھ ایک سے دوسری جیب میں ڈالنے کے بعد بھی پاکٹ بُک کا سراغ نہ ملتا تھا۔

پاکٹ بُک کہیں گر چکی یا گم ہو چکی تھی۔

"او رب العالمین! ابھی تو پاکٹ بُک میرے پاس تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس جیب میں تھی۔ اب کہاں گئی ــــــ کسی نے نکال لی کہیں شاید گر پڑی....."

وہ خاموش ہو گیا۔ کانسٹبل کی ایک غیر اختیاری چیخ نے اسکو اپنی طرف متوجہ کر لیا... دوشیزہ پھر کانسٹبلوں کے ہاتھوں پر بیہوش ہو کر ہاتھ پاؤں چھوڑ چکی تھی ایک نے ہاتھ اس کی کمر میں ڈالا۔ دوسرے نے پاؤں کو سہارا دیا۔ اور دوشیزہ کو باحتیاط تمام اُٹھا کر سامنے والی بنچ پر لٹا دیا۔

---

صبح ہوتے ہی کپتان ساجد نے شب گذشتہ کی ساری سرگذشت سے اپنی کمپنی کے منیجر کو آگاہ کرنا مناسب جانا اس نے مختصراً سب کچھ بیان کر دیا۔ گوہر بانی کی اتفاقیہ ملاقات کا معجزہ، پاکٹ بُک کی گم شدگی کا واقعہ اور

دیگر اسباب جن کے ماتحت اس بدنصیب بچی کو کانسٹبل کی مہربانی سے قریب والے مکان میں بآرام قیام کرا دیا تھا جس کی مالک ایک ضعیفہ تھی، شریف خدا ترس اور پاکباز۔ ساجد خود دوڑ کر ایک ڈاکٹر کو بلا لایا۔ جس کے سپرد اس دلچسپ مریضہ کا علاج اور دیکھ بھال کر دی۔ ڈاکٹر نے عضو عضو کا امتحان کرنے کے بعد اعلان کیا کہ مریضہ بفضلہ کسی مہلک مرض کا شکار نہیں بلکہ موجودہ تکالیف کے اسباب فاقہ کُشی، نقاہت اور رنج و الم تھے۔ اس نے ضعیفہ کو چند ہدایتیں دیں اور صبح کو دوبارہ دیکھنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ کپتان ساجد کو خط کے گُم ہو جانے کا بڑا ملال تھا۔ خاص کر اس لئے کہ وہ اس کے مضمون سے آگاہ نہ تھا۔ کمپنی والوں کے مشورے سے بالآخر یہ طے پایا کہ کپتان کو گوہر بائی سے اسوقت ملکر جبکہ وہ اس قابل ہو جائے۔ سارا قصہ بے کم و کاست کہدینا چاہیئے۔

صورت حال کسی قدر نازک ضرور تھی۔ مس گوہر بائی بلا شبہ حسین اور جوان تھی۔ اِدھر کپتان پر بھی عالم شباب تھا۔ ظاہر تھا کہ ایک بن بیاہے نوجوان جہاز کے کپتان کا کسی حسین، کنواری معلمہ سے جس کا گھر ہو نہ بار اور جو بقولِ خود مفلس و نادار ہو، تنہائی میں ملنا خالی از علت اور خدشہ نہ تھا۔ کپتان نے اس پر غور کیا اور فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہونچا کہ اس معاملہ کو اپنے مشیر قانونی سے مشورہ کرنے کے بعد اس کی رائے پر چھوڑ دینا ہی زیادہ مناسب اور موزوں ہوگا۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔ نتیجہ کار ایک خط لکھا گیا۔ جس میں مس گوہر بائی سے چند نہایت ضروری اور اہم معاملات پر گفت و شنید کی ضرورت کا اظہار کرتے ہوئے ملنے کے وقت اور مقام سے اطلاع دی گئی تھی۔

متذکرہ خط ملنے کے دو روز بعد مس گوہر بائی کی حالت اتنی سنبھل چکی تھی کہ وہ ایفائے وعدہ پر کمربستہ ہو گئی۔ موقعہ پر پہنچکر کپتان ساجد اور مسٹر نسیم بیرسٹر کو اپنے مخصوص کمرہ میں منتظر پایا۔

مس گوہر بائی نے کپتان ساجد کو مطلق نہ پہچانا۔ اس شب دیجور اور کہرے کے طوفان میں اس نے بمشکل اس کے چہرے پر ایک دو یونہی چلتی نظریں ڈالی تھیں اور پھر بھلا اس نیم بے ہوشی، کیفیت اور خوف و ہراس کی حالت میں اتنا ہوش کسے تھا کہ اپنے پاس والوں کو اس نظر سے دیکھا جاتا کہ اُن کی صورتیں ذہن نشین ہو جاتیں۔

نسیم نے اپنے مخصوص قانونی لہجہ میں کہا۔ "مس گوہر بائی ـــــ یہ مسٹر ساجد، حاجی ہارون موسیٰ کمپنی کے مشہور جہاز 'خسرو چین' کے کپتان ہیں۔ اس مرتبہ کے سفر میں ان کو کسی مسافر نے آپ کے نام ایک خط دیا تھا جس کا نام غالباً نوروزجی یا نوانہ بھائی تھا۔"

متوفی کا نام سُنتے ہی دوشیزہ کے زرد چہرہ پر خوف و ہراس کی بے رنگیاں کچھ اس طرح واضح طور پر نمودار ہوئیں کہ کپتان ساجد کو دیکھکر انتہائی حیرت ہوئی۔

"ایک خط ـــــ میرے نام ـــــ اس شخص کی طرف سے ـــــ کیا مجھے آپ نے فقط اسی لئے طلب کیا تھا؟"

یہ کہکر وہ کھڑی ہو گئی۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ آتا ایک جاتا۔ اس کی گھبرائی ہوئی نظریں اِدھر اُدھر پریشان پھر رہی تھیں۔ "کوئی وجہ نہیں کہ میں آپ لوگوں کی ہمدردی پر شبہ کروں۔ لیکن، لیکن میں نوروزجی کی جانب سے ہر قسم

کا خط پہنچ یا اس کے متعلق ہر قسم کی اطلاع وغیرہ قبول کرنے سے قطعی انکار کرتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ ڈری اور دروازہ کی طرف بڑھ گئی۔

مسٹر نسیم نے کپتان ساجد کی طرف پرمعنی نظروں سے دیکھا مشورہ طلب بات یہ تھی کہ آیا مس گوہر بانی سے صاف الفاظ میں اب کہدیا جائے کہ یہ شخص دار فانی سے اُٹھ گیا! اور یہ کہ متذکرہ خط بھی کہیں گم ہو چکا۔ کپتان کا اپنی جگہ خیال یہ تھا کہ اس کے علاوہ آخر چارہ کار ہی کیا تھا شکر ہے کہ گفت و شنید کا پہلو ہمت شکن نہیں بلکہ حوصلہ افزا ہے۔ چنانچہ آگے بڑھکر اس نے کہا "گوہر بانی صاحبہ، میرا خیال تھا کہ شاید یہ سُنکر آپکو ناقابل برداشت صدمہ گذرے کہ مجھ سے یہ خط کسی غیبی افتاد یا حادثے سے گم ہو گیا۔"

"گم ہو گیا؟" اُس نے گھبرا کر پوچھا۔

"جی ہاں، ۱۳ر نومبر کی شب کو جبکہ میں آپ کی تلاش میں اس پتہ پر پہونچا جو مسٹر نوروزجی نے مجھے بتایا تھا تو معلوم ہوا کہ آپ کا تعلق وہاں سے منقطع ہو چکا ہے۔ واپسی پر کہرے کے طوفان میں پھنس کر میں راستہ بھول گیا مجھے نہیں معلوم کہ اسی عرصے میں میری پاکٹ بُک جس میں آپ کا خط باحتیاط رکھا ہوا تھا کہاں اور کس طرح گم ہو گئی یا کسی نے جیب سے نکال لی۔"

"خط پر پتہ کیا تھا؟" دوشیزہ نے پوچھا۔

"مس آر دشاہ گوہر بانی۔ نمبر..... کھتا و بلڈنگ۔ شہر بمبئی۔"

"او خدا! او خدا!!" دوشیزہ دفعتًا چلا اٹھی۔ اس کے چہرے پر خوف کے آثار نمایاں ہو گئے "ہائے ان کو اگر کہیں معلوم ....... اگر کہیں وہاں پہونچ جائے اور وہ اس کو کھول کر پڑھ لیں" لیکن یہ دیکھکر کہ کپتان ساجد اور مسٹر نسیم دونوں اس کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے ہیں اس نے معذرت کے طور پر کہا "آپ مجھے معاف کریں۔ آپ کو نہیں معلوم کہ اس کا میری ذات پر کیا اثر پڑیگا۔ مجھے بتائیے ...یہ شخص... کیا آپکو معلوم ہے کہ وہ کہاں ہے، مجھ سے جواب پانیکا کس جگہ منتظر ہے؟"

"مس گوہر بانی" کپتان نے متانت کیساتھ جواب دیا "نوروزجی عادل شاہ کو جواب کا مطلق انتظار نہیں بلکہ وہ تو دوران سفر ہی میں مر گیا۔"

"ایں مر گیا! ــــــ مر گیا، مر گیا" دوشیزہ نے آہستہ آہستہ ان الفاظ کو دوہرایا۔ اس کی سراسیمہ نظریں دلفریب ادا کے ساتھ ایک طرف کو جم گئیں اور جن سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کا دماغ کپتان کے الفاظ سمجھنے اور سمجھکر کسی فیصلہ کرنیکی فکر میں مبتلا ہے۔

کپتان نے سارا قصہ جلد ختم کر دینے کے شوق میں پھر کہنا شروع کیا "جی ہاں، سفر ہی میں اس کا دفعتًہ انتقال ہو گیا۔ خط ملنے کے بعد اس کے کمرے میں وصیت نامہ بھی پایا گیا جس کی رو سے اس کے جملہ اثاث البیت کی مالک آپ قرار پاتی ہیں۔ جو کچھ سامان اور کاغذات وغیرہ اس کے کمرے میں پائے گئے وہ کمپنی میں موجود ہیں آپ جب

چاہیں شوق سے وصول کر سکتی ہیں۔

اس کی کھوئی ہوئی حالت سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کپتان ساجد کی کوئی بات نہیں سمجھی۔ لیکن چند لمحوں کے بعد اس نے اتنا ضرور کہدیا "مر گیا۔ اے خدا تو اس پر اتنا ہی مہربان ہوتا جتنا وہ دوسروں پر نامہربان تھا"۔

"گوہربائی صاحبہ۔ کیا مرحوم آپ کا رشتہ دار تھا؟"

"جی ہاں" یہ کہکر وہ کرسی سے اٹھی اور کپتان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی "ساجد صاحب! میں آپ کی مہربانی اور ہمدردی کی بے حد ممنون ہوں۔ آپ کی زبانی جو کچھ مجھے معلوم ہوا اس کے متعلق ضروری ہے کہ میں قانونی مشورہ کرنے کے بعد کسی فیصلہ پر پہونچوں" مسٹر نسیم کی طرف رُخ پھیر کر "حضور اقدس! بمبئی میں سوائے خدا کے میرا کوئی شریک غم یا ہمدرد نہیں۔ کیا میں اپنی سرگذشت بیان کر کے اتنی امید کروں کہ آپ اپنے نیک مشورہ سے میری رہنمائی فرمائیں گے۔

"بیشک! میں بخوشی تیار ہوں"

کپتان دوشیزہ کے بشرے سے سمجھ گیا کہ وہ اپنا قصہ تنہائی میں کہنا چاہتی ہے۔ چنانچہ مسٹر نسیم سے یہ کہکر کہ وہ ایک ضرورت خاص سے کہیں جانا چاہتا ہے تقریباً ایک گھنٹہ بعد واپس ہوگا" مس گوہربائی سے معانقہ کیا اور چلتا بنا۔

---

دماغی انہماک نے بلا قصد اور بلا ارادہ اس کو چوپائی کے میدان میں جا پہونچایا۔ جہاں ایک تپائی پر بیٹھ کر نہایت اطمینان کے ساتھ اُس نے سگرٹ سلگا کر کش پر کش اُڑانا شروع کر دئے۔ فرصت تھی اس لئے لازم تھا کہ خیالات واقعہ حائلہ کی جانب رجوع ہوں اور اس طرح کہ تجاویز کا طوفان بے تمیزی اپنے ہمراہ لئے ہوتے۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اس کو کسی راز سربستہ یا رومان سے سابقہ پڑا تھا۔ لیکن اس کی جوانی کی اُمنگیں اور دل کے ولولے اس سے غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کر رہے تھے۔ اس کو حیرت تھی کہ آخر ان سب باتوں کا مطلب کیا ہے۔ یہ پُراسرار خط، شب تاریک میں خودکشی، ایک حسین دوشیزہ کا سرراہ بیہوش پڑا رہنا، اور پھر بے یار و مددگار ہونا۔ لیکن جب اُس نے واقعات مابعد پر نظرثانی کی ــــ یعنی اس خط کی گمشدگی، مس گوہربائی کا اس کو قبول کرنے سے انکار، اور پھر اس خوف کا اظہار کہ مبادا کہیں وہ غیر ہاتھوں میں پہونچ جائے۔ مزید برآں نوروزجی یا نواز بھائی کی ہلاکت کی خبر پاکر عجیب و غریب جذبات کا اظہار۔ اس نے سمجھ لیا کہ کم از کم اس کی عقل و تمیز اس گتھی کو سلجھانے سے قاصر تھے۔

ایک بات جس پر کپتان ساجد کے خیالات نے قدم جما دئے وہ یہ فیصلہ تھا کہ فوراً مناسب الفاظ اور احتیاط مضمون کے ساتھ اخبارات میں اشتہار شایع کر کے خط مطلوبہ کی واپسی کے لئے ایک انعام

مقرر کر دیا جائے، بشرطیکہ اس عرصہ میں وہ کسی کے ہاتھ نہ لگا ہو اور اس نے حسب پتہ اس کو جائے مقصود پر نہ پہونچا دیا ہو، خط کی تلاش میں اس کو یہ خیال کبھی نہ گذرا کہ اس کے متعلق اس مقام پر جاکر بھی تحقیق کرے جس کا پتہ اس پر تحریر تھا لیکن مس گوہر بائی کے اس شبہ کے اظہار نے کہ مبادا وہ کسی طرح وہاں پہونچ گیا ہو یا پہونچا دیا گیا ہو، کپتان کو اپنی غلطی اور فرو گذاشت کا احساس کرا دیا۔ ابھی اس کو پورے ایک گھنٹے کی فرصت تھی۔ اُس نے سوچا اور فوراً فیصلہ کر لیا کہ چلو مسٹر تسیم کے پاس واپس جانے سے پہلے اس شبہ کو بھی رفع کیوں نہ کر لیا جائے۔ اشارہ پر ایک کرایہ کا موٹر حاضر تھا، وہ اس میں بیٹھا اور ڈرائیور سے جلدی! آرنبی روڈ کہکر اپنی تجاویز کے مزید دماغی مدارج طے کرنے لگا۔

دستک کا جواب ایک ملازم نے دیا جس سے کپتان نے مالک مکان کو دریافت کیا۔

"میں حضور اُن سے کیا عرض کروں؟"

"کہدینا وہی شخص ہے جو کل شام کو مس گوہر بائی کے دریافت حال کے لئے حاضر ہوا تھا۔"

۳

از نظر بریلوی۔

چند ساعت میں ملازم واپس آیا اور کپتان ساجد کو ملاقات کے کمرے میں لے گیا۔ صاحب خانہ جسکا نام سہراب جی تھا تیزی کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا اور دروازہ بند کرتے ہوئے بولا۔

"ہاں جناب! کیسے تکلیف فرمائی، میں تو پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ مس گوہر بائی کی بابت کچھ نہیں جانتا لیکن پھر بھی آپ نے پریشان کر رکھا ہے!"

سہراب جی کے طرز تکلم اور درشت لہجے سے کپتان کی رگوں میں سپاہیانہ خون تیزی کے ساتھ گردش کرنے لگا لیکن اُس نے جذبات پر پورا قابو رکھتے ہوئے نہایت متانت سے جواب دیا۔

"معاف کیجئے حضرت! واقعی آپ کو زحمت ہوئی لیکن اس قدر پریشانی اور برافروختگی کا باعث میری سمجھ میں نہ آیا!"

"آپ سمجھنا ہی چاہتے ہیں تو سمجھ لیجئے کہ میں اُن خدمتگاروں کی بابت جو میری ملازمت سے برطرف ہو چکے ہوں کوئی سوال سننا پسند نہیں کرتا!"

"لیکن مس گوہر بائی خادمہ نہیں تھی بلکہ ایک شریف اور ذی عزت معلمہ تھی!"

"بہرحال وہ میری ملازمت سے علیحدہ ہو چکی ہے اور اُس کا کل مطالبہ ادا کیا جا چکا ہے۔ اس سے زیادہ مجھکو اُس سے کچھ مطلب نہیں!"

"صحیح ہے لیکن شاید یہ خبر آپ کی دلچسپی کا باعث ہو کہ جس خاتون کا آپ ایسے کریہہ الفاظ میں ذکر کر رہے ہیں اس وقت صرف علیل ہی نہیں ہے بلکہ بے خانماں اور بے مونس و مددگار اپنی زندگی کے

دن نہایت کلفت میں کاٹ رہی ہے۔"

"جہنم میں جائے آپ کی خاتون اور اُس کی کلفت! آخر مجھے تعلق؟"

"تعلق کی بابت میں کیا عرض کر سکتا ہوں جب کہ مجھے نہ اُس کی برطرفی کے اسباب معلوم ہیں اور نہ وہ وجہ جس کے باعث آپ اُس کا نام سُنکر چراغ پا ہو جاتے ہیں۔"

"بجا ارشاد ہے! لیکن کیا میں بھی دریافت کر سکتا ہوں کہ جناب کی یہ ہمدردی خاتون سے کن تعلقات کی بنا پر ہے۔ کیا جناب کو بھی اُن کے زمرۂ عشاق میں شامل ہونے کا شرف حا......"

پیشتر اس کے کہ سہراب جی اپنا جملہ پورا کریں کپتان نے ڈپٹ کر کہا "زبان سنبھال کر کلام کیجئے میں آپ کی بابت زیادہ نہیں جانتا لیکن ہیں آپ بڑے کمینے شخص۔"

"میں آپ کی طرح بازاری گفتگو کرنے کا عادی نہیں ہوں لہذا آپ سے کوئی کلام کرنا نہیں چاہتا، مہربانی فرما کر میرے مکان سے فوراً تشریف لے جائیے۔"

"میں خود آپ جیسے شخص کے مکان کے اندر سانس لینا شرافت کی توہین سمجھتا ہوں، لیکن میرے جانے سے پہلے آپ کو ایک سوال کا جواب دینا پڑے گا۔ مس گوہر بائی کو آپ کی ملازمت سے سبکدوش ہوتے ایک ماہ کا عرصہ ہوا لیکن تین دن ہوئے وہ رات کے وقت نہایت نازک حالت میں فاقہ کشی کی نقاہت کی وجہ سے بیہوش، پارک کے اندر پائی گئی۔ آپ بتلا سکتے ہیں کہ وہ پارک کے اندر کس طرح آئی؟"

"یہاں سے چلے جانے کے بعد سے میں اُس کی نقل و حرکت کا ذمہ دار ہوں نہ مجھ کو کوئی غرض و مطلب۔"

"خیر دیکھا جائے گا لیکن اگر آپ انسانیت کا جامہ پہن کر چند لمحوں کے لئے تحمل سے کام لے سکیں اور شرافت کے ساتھ گفتگو کر سکیں تو ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔"

"وہ کیا؟"

"وہ یہ کہ آپ نے مس گوہر بائی کے نام کے وہ خطوط جو اُن کے چلے جانے کے بعد یہاں موصول ہوئے وہ کیا کئے؟"

سہراب جی کی کج خلقی اور بدتہذیبی نے کپتان کو بدگمان ضرور کر دیا تھا لیکن اُس نے یہ سوال ملاقات کو طول دینے کی غرض سے یونہی کر دیا تھا۔ کوئی خاص مقصد ذہن نشین نہ تھا۔ بہر کیف تیر اگرچہ تاریکی میں مارا گیا تھا لیکن نشانہ خطا نہ ہوا۔ سہراب جی کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا اور وہ اپنی گھبراہٹ چھپانے کی انتہائی کوشش کرتے ہوئے بولا "مجھ کو کوئی خط نہیں ملا۔ براہِ کرم میرا سر نہ کھائیے اور یہاں سے تشریف لے جائیے۔"

ایسے غیر مہذب الفاظ کپتان کی آتشِ غیظ و غضب کو مشتعل کر دینے کے لئے عام طور پر کافی سے زیادہ ثابت ہوتے لیکن گمشدہ خط کی تلاش اُس کا تنہا مقصد تھا اور حصولِ مقصد کی سعی میں وہ اس درجہ منہمک تھا کہ اس بدتہذیبی کے برتاؤ سے متاثر ہونے کے بجائے خط کا ایک حد تک سراغ چل جانے کی ناممکل کامیابی پر مسرور تھا۔ اُس نے کہا "بہتر ہے، میں جاتا ہوں لیکن مس گوہر بائی کے نام کا ایک خط جو میری جیب سے کہیں گر پڑا ہے یا کسی نے نکال لیا ہے، آپ کو ان دو دن کے اندر ضرور موصول ہوا ہے، انکار کرنا بے سود ہے۔ میں آپ کو چوبیس گھنٹے کی مہلت دیتا ہوں اگر اس مدت کے اندر آپ نے وہ خط بغیر کھولے ہوئے مجھ کو واپس نہ کر دیا تو سمجھ لیجئے کہ آپ کے حق میں بہتر نہ ہوگا۔"

کپتان نے اپنی فراست سے اندازہ کر لیا تھا کہ اُس کا مدِ مقابل ایک بزدل بدمعاش ہے اور بغیر سختی کئے کامیابی نہ ہوگی۔

سہراب جی اپنی پریشانی چھپاتے ہوئے نہایت لاپروائی سے بولا "مجھ کو ہرگز کوئی ایسا خط نہیں ملا۔ اس معاملہ کے متعلق اگر اب کوئی شخص مجھ کو ذرا بھی پریشان کرے گا تو میں قانونی چارہ جوئی پر مجبور ہو جاؤں گا۔ اچھا تخفیف تصدیعہ۔"

کپتان نے سہراب جی کی طرف ایک حقارت آمیز نگاہ ڈالی اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

---

تقریباً ایک گھنٹہ بعد کپتان بیرسٹر تبسم کے کمرے میں داخل ہوا۔ مس گوہر بائی رخصت ہو چکی تھی۔

بیرسٹر صاحب نے کہا "کپتان صاحب، یہ معاملہ نہایت غیر معمولی قسم کا ہے۔ نوجوان خاتون نے جو واقعات میرے گوش گذار کئے ہیں اس درجہ تحیّر زا ہیں کہ میں نے اپنی تمام زندگی میں اُن کی مثل کبھی نہیں سُنے۔ اچھا آپ سوچئے خاتون کا اُس شخص سے کیا رشتہ ہوگا جس نے آپ کو خط دیا تھا؟"

"میرے خیال میں چچا زاد بہن ہوگی یا شاید حقیقی بہن ہو" کپتان نے جواب دیا۔

"جی نہیں! اُس کی منکوحہ بیوی ہے!"

"منکوحہ بیوی! وہ تو خود کو ناکتخدا ظاہر کرتی ہے۔"

"یہ بھی بلا وجہ نہیں ہے، آپ بتلا سکتے ہیں کہ نور و زجی کون بزرگ ہیں؟"

"مجھ کو علم نہیں۔"

"صحیح ارشاد ہے، آپ کیا کسی کو بھی علم نہیں ہو سکتا کیونکہ اس شخص کے لئے یہ بالکل ضروری تھا کہ اپنی اصلی شخصیت کو ظاہر نہ ہونے دے۔ مسئلہ کی اہمیت اور نزاکت نے اُس کو ہر ممکن احتیاط برتنے پر مجبور کر رکھا تھا۔"

"تو اس کا نام بھی نور و زجی نہ ہوگا۔"

"یقیناً نہیں۔ اس کا اصلی نام نواز بھائی ہے۔"

"نواز بھائی، نواز بھائی، یہ نام تو مجھ کو گوش آشنا معلوم ہوتا ہے۔"

"ضرور سُنا ہوگا کیونکہ یہ اس شخص کا نام ہے جس پر ایک شہرۂ آفاق حسینہ کے قتل کا الزام لگایا گیا تھا۔"

"قتل کا الزام! قتل کس طرح ہوا تھا؟"

"نہایت معمولی طریقے سے۔ یہ حسینہ ایک شخص کے ہمراہ بوری بندر سے اپنے مکان واقع ــــ روڈ جانے کے لئے ایک بند لینڈو میں سوار ہوئی۔ تقریباً نصف فاصلہ طے ہو جانے کے بعد یہ شخص پائدان پر پاؤں رکھ کر چلتی گاڑی سے سڑک پر کود پڑا اور کوچبان سے کہتا گیا کہ خاتون کو مکان پر لے جائے۔ لینڈو مکان کے سامنے رُکی لیکن خاتون گاڑی سے نہیں اُتری۔ کوچبان نے نشست سے نیچے اُتر کر دروازہ کھولا۔ لیکن اس کے حیرت و خوف کی کوئی انتہا نہ رہی جب اُس نے خاتون کو گاڑی کے فرش پر مردہ لیٹا ہوا پایا۔ خاتون کے جسم پر کسی زخم کا نشان نہ تھا لیکن قریب ہی کلورا فارم سے بھیگا ہوا ایک رومال پڑا تھا جس سے صاف ظاہر تھا کہ خاتون کی موت زیادہ دیر تک دار وئے بیہوشی جبراً سونگھنے سے واقع ہوئی ہے۔ یہ بھی محض اتفاق تھا کہ خاتون کے ہمسفر کا سراغ لگ گیا۔ گاڑی سے اُترتے وقت اُس کی جیب سے پاکٹ بُک گر پڑی تھی، جس کے سرورق پر اُس کا نام تحریر تھا۔"

"ہاں ہاں مجھ کو بھی تمام واقعات یاد آ گئے۔ روزانہ اخبارات کئی دن تک اسی تذکرہ سے معمور رہے تھے۔ مقتولہ کا نام شیریں تھا اور قاتل گرفتار نہ ہو سکا تھا۔"

"گرفتار نہ ہو سکنے کی وجہ اب صاف سمجھ میں آتی ہے۔ قاتل فوراً ہی کسی دوسرے ملک کو فرار ہو گیا تھا۔ قاتل کا نام نواز بھائی تھا اور مس گوہر بائی جس کے نام آپ خط لائے ہیں دراصل اسی بدمعاش کی بدقسمت بیوی ہے۔"

کپتان تمام واقعات نہایت خاموشی سے سنتا رہا اور ساتھ ہی اس کوشش میں بھی مشغول رہا کہ چہرے سے ان جذبات کے آثار کا اظہار نہ ہونے دے جو اس وقت اس کے سینہ میں متلاطم ہے۔ انجام کار بیرسٹر صاحب نے پوچھا۔ "کہئے کپتان ساجد صاحب، آپ کی ان واقعات کے متعلق کیا رائے ہے؟"

"میرا دماغ بالکل معطل ہو گیا ہے۔ آپ واقف ہیں کہ میری زندگی اب تک ایک دوسری ہی دُنیا میں گذری ہے۔ میرے کارنامے سمندر اور صرف سمندر ہی تک محدود رہے ہیں، جن میں صنفِ نازک کو کبھی کوئی دخل حاصل نہیں ہوا۔ یہ تجربہ میرے لئے بالکل جدید ہے۔ اس قدر جدید کہ میرے حواس باختہ ہو رہے ہیں، اور دماغ نے اپنا فعل کرنے سے قطعی انکار کر دیا ہے۔ آپ کی تقریر اگر واقعات

پر مبنی ہے تو یہ ظاہر ہے کہ مس گوہر بائی اس شخص کی بیوی ہے جس نے شیریں کو ہی قتل نہیں کیا بلکہ خود بھی ہلاک ہوگیا ہے۔"

"بالکل یہی۔"

"لیکن کس قدر تعجب انگیز امر ہے کہ میں خاتون کا پتہ چلانے میں کامیاب ہوگیا اور وہ خط جس کی وجہ سے یہ تلاش تھی گم ہوگیا۔"

"تعجب انگیز ہی نہیں بلکہ پریشان کن بھی ہے۔ ہم کو وہ خط دوبارہ حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنا چاہئے۔ ممکن ہے وہ خط ایسے واقعات کا حامل ہو جن کو پردۂ خفا میں رکھنا از بس ضروری ہے میں یہ بات مس گوہر بائی کے وکیل کی حیثیت سے عرض کر رہا ہوں۔"

"بیرسٹر صاحب مجھ کو یہ گمان ہے کہ خط کھٹاؤ بلڈنگ پر پہونچا دیا گیا ہے اور سہراب جی نے وصول کر لیا ہے۔"

"ایسا ہوا تو بڑا غضب ہو جائیگا ـــــ لیکن آپ اس نتیجہ پر کس طرح پہونچے۔"

"میں سہراب جی سے مل کر آرہا ہوں۔ اُن کی طرز گفتگو سے میرے دل میں شبہ پیدا ہوگیا ہے، جس کا رفع ہونا ذرا دشوار ہے۔"

"لیکن اس کو جھوٹ بولنے سے فائدہ۔"

"مجھ کو نہیں معلوم، ممکن ہے مس گوہر بائی اس معاملہ پر روشنی ڈال سکیں۔ ہاں وہ یہ بھی بتلا گئی ہیں کہ اُن سے کہاں ملاقات ہوسکتی ہے۔"

"سر دست جب تک کوئی مناسب انتظام نہ ہو وہ بیگم کی مہمان کی حیثیت سے غریب خانہ ہی پر قیام کریں گی۔ مجھ کو اُن سے کچھ دلچسپی پیدا ہو چلی ہے۔"

"دلچسپی تو مجھ کو بھی ......" کپتان بیرسٹر صاحب کی نظریں اپنے چہرے پر جمی ہوئی دیکھ کر شرما گیا اور رُکتے رُکتے بولا "بیچاری کس قدر غریب لڑکی ہے اور واقعات کس درجہ دردناک ہیں۔"

بیرسٹر صاحب مسکرائے اور بولے "کپتان صاحب ذرا سنبھلے ہوئے، جوانی دیوانی مشہور ہے۔ سب واقعات، اُن کا علم ہم کو اب تک صرف مس گوہر بائی ہی کے ذریعہ سے ہوا ہے۔"

"لیکن مجھ کو اس ذریعے پر کامل وثوق ہے، آپ اس درجہ بدگمان کیوں ہیں۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی شخص بغیر عشق میں مبتلا ہوتے ایک بے مونس و مددگار خاتون سے اظہار ہمدردی کر سکے۔"

"ممکن ضرور ہے لیکن صرف وہی شخص کر سکتا ہے جو میری طرح متاہل زندگی بسر کر رہا ہو اور شباب کے اس مہلک عہد سے گذر چکا ہو، جس میں تمنائیں حُسن کی جلوہ ریزیوں کی متجسس رہتی ہیں۔ کپتان صاحب

آپ ماشاء اللہ ایک خوبرو جوان ہیں اور خاتون انتہائی حسین ہونے کے ساتھ ہی بیوہ بھی۔ آپ کے لئے یہ تجربہ خطرہ سے خالی نہیں ہے۔"

کپتان نے جواب دینا چاہا لیکن الفاظ اُلجھ کر رہ گئے اور جملہ مرتب نہ ہوسکا۔ بیرسٹر صاحب کے بروقت انتباہ نے اس کو اس جذبہ کا احساس کرادیا جو پوشیدہ طور پر اندر ہی اندر سرگرم کار تھا کپتان پر یہ حقیقت پوری قوت کے ساتھ منکشف ہوگئی کہ خاتون اُس کی تمام تریں توجہات کا مرکز بن گئی ہے۔ اور اس کا دل کسی غیر مرئی طاقت کے زیر اثر خاتون کی طرف کھنچا جا رہا ہے۔ گفتگو کا رُخ بدلنے کی غرض سے اُس نے کہا۔" اور ہاں، ان چیزوں کی بابت کیا ہوگا جو دفتر میں پڑی ہوئی ہیں۔ میرے خیال میں خاتون کو قبضہ کر لینا چاہیئے۔"

"نہیں، خاتون اُس قسم کی کوئی چیز لینے کے واسطے رضامند نہیں ہے بجز اس گمشدہ خط کے جس نے اس کو مشوش بنا رکھا ہے۔ وہ یہ نہیں چاہتی کہ قاتل کے ساتھ اُس کے خفیہ رشتہ کا راز کسی پر ظاہر ہو۔"

"ایسا ہے تو میں خط حاصل کرنے کی انتہائی کوشش کروں گا۔ مجھ کو یقین ہے کہ خط سہراب جی کے پاس ہے۔ میں بدمعاش کے ساتھ سختی کا برتاؤ کرنا بھی جانتا ہوں۔ اُس کو خط واپس کرنا پڑے گا یا یہ بتلانا ہوگا کہ اُس نے خط کیا کیا۔"

"کپتان صاحب مشتعل نہ ہوجیئے عقل سے بھی کام لیجئے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کی رگوں میں جوانی کا خون موجزن ہے لیکن ہر کام بہادری سے نہیں نکلتا۔ سب سے پہلے ہم کو مس گوہربائی سے مل کر سہراب جی کے حالات کی تفتیش کرنا چاہیئے۔ ممکن ہے کوئی ایسی راہِ عمل نکل آئے جو معاملات کو آسانی سے سُلجھا سکے۔"

(۴)

از سلیم نیدوردی۔

اگلی صبح کو کپتان ساجد نے اپنے کونسل مسٹر نسیم کی کوٹھی پر ہی ناشتہ کیا۔

مس گوہربائی بھی موجود تھی۔ مسٹر نسیم نے کپتان ساجد کے اوصاف حمیدہ کا نہایت پُرجوش طریق پر اظہار کیا اور مس گوہربائی کو واضح الفاظ میں بتلا دیا کہ اگر اس کی خواہش ہے کہ گمشدہ خط کی تلاش کی جائے تو اُس کو کپتان ساجد پر قطعی بھروسہ اور اطمینان کرنا چاہیئے۔

کسی قدر مطمئن ہونے کے بعد مس گوہربائی نے واقعات کا اُتنا حصہ جس سے کپتان ساجد کا واقف ہونا ضروری تھا اس طرح بیان کرنا شروع کیا کہ "اُس کا باپ جہاز پر معمولی افسر تھا۔ ابھی اس نے زندگی کی پندرھویں بہار بھی جی بھر کر نہ دیکھی تھی کہ قدرت کے بے رحم ہاتھوں نے اس کو سایۂ پدری سے محروم کردیا۔

اسی یتیمی و بیکسی کے عالم میں اتفاقاً وہ ایک ایسی تعلیم یافتہ رحم دل خاتون کے یہاں پہونچ گئی جو بچوں کی پرورش و نگہداشت کا کام کیا کرتی تھی۔ اور اُس کی وساطت سے ایک معزز شخص مسٹر سہراب جی کے یہاں بطور معلمہ ملازم ہوگئی جہاں اس کی نگرانی اور محافظت میں صرف چھ سال کی ایک بچی دی گئی۔ سہراب جی ایک بہت ہی مشہور اور مالدار ادارہ کے سکریٹری تھے۔ اور اُن کی بیوی کی خود بھی اس کی ذاتی جائداد سے بہت کافی آمدنی تھی لیکن بدقسمتی سے بیگم صاحبہ کو خفیہ مے نوشی کی قبیح عادت کچھ ایسی پڑی کہ باوجود شوہر کی سخت تنبیہ کے وہ اُس سے باز نہ رہ سکیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سہراب جی کی برہمی دن بدن بڑھتی گئی اور رشک گلزار مکان —— وہ مکان جس میں ہر وقت خوش طبعی اور مسرت کی بارش ہوا کرتی تھی اچھا خاصا میدانِ جنگ بن گیا۔ تقرری کے تھوڑے دنوں بعد مس گوہر بائی کو گھر کے کل حالات سے واقفیت ہوگئی جس کے بعد وہ چاہتی تھی کہ فوراً اس ملازمت سے سُبکدوش ہوکر ہمیشہ کے لئے اس گھر سے رُخصت ہوجائے، مگر اُس کو معصوم بچی سے جو گلاب کے پھول کے مانند انتہائی خوبصورت اور نازک ہونے کے باوجود ماں کی محبت اور توجہ سے محروم تھی انتہائی محبت اور اُنسیت ہوگئی تھی۔ باپ بھی بہت کم اپنی بچی کی طرف توجہ کرتا، چنانچہ پیار اور محبت کی بھوکی معصوم بچی چند ہی دنوں میں اپنی نئی معلّمہ سے نہ صرف انتہائی مانوس ہی ہوگئی بلکہ اُس کے بغیر ایک لمحہ بھی اُسکو چین نہیں پڑتا تھا۔

مس گوہر بائی کو ابھی اس گھر میں رہتے زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا کہ اُس کو ملازمین کی گفتگو اور اپنی مالکہ کے سکوت آمیز طرز سے جلد ہی معلوم ہوگیا کہ اس گھر کی ناخوشگواری کا اصلی باعث کیا تھا۔ سہراب جی بہت ہی خود غرض، بے اصول اور عشرت پسند آدمی تھا۔ اُس کی نوجوان اور حسین بیوی کو شادی کے تھوڑے ہی دنوں بعد معلوم ہوگیا کہ حقیقت میں اُس کا حُسن جہاں سوز اور اس کی معصوم محبت سہراب جی کے لئے باعث راحت نہیں ہے بلکہ اُس کی دولت اس شادی کا واحد راز ہے۔ ایک دن اس راز کا انکشاف ناقابلِ تردید طریق پر ہوگیا۔ جب کہ اُس کا شوہر تمام رات گھر سے غائب رہا اور دریافت پر اُس نے کہدیا کہ چند ضروری تجارتی مشاغل میں مصروف رہا تھا۔ حالانکہ درحقیقت وہ اُن عشرت کدوں میں سے ایک میں محوِ عیش تھا جہاں مرد اور عورت دونوں کی آمد کا واحد مقصد محض عشرت پسندی ہوتا ہے۔

گھر کی ناخوشگواری اپنی انتہا کو پہونچ گئی۔ جب بدقسمت بیوی کو وثوق کے ساتھ معلوم ہوگیا کہ مس فیروزہ بائی کے ساتھ اُس کے شوہر کے گہرے تعلقات قائم ہوچکے ہیں اور نیز یہ کہ اُس نے مس فیروزہ بائی کو کئی ایک قیمتی جواہرات بھی تحفتاً پیش کئے ہیں۔ مس فیروزہ بائی خود بھی بہت ہی حسین، دولتمند اور عشرت کی متوالی مشہور تھی۔ اُسی وقت سے بے بس و بیکس، بدقسمت بیوی نے جو اپنے شوہر کی سچی پرستار تھی اور اُس سے ایک لمحہ کے لئے بھی جُدا رہنا پسند نہیں کرتی تھی اپنے والہانہ خدمت اور سچی پرستاری

کو دل سے محو کرنے میں ناکامیاب ہوکر غم غلط کرنے کے لئے اُس نے مے نوشی شروع کر دی اور اس طرح گردشِ جام کو ناقابلِ برداشت غم سے نجات حاصل کرنیکا ذریعہ بنالیا۔

مس گوہر بائی جس نے مشکل سے ابھی عمر کی بیسویں منزل میں قدم رکھا تھا، حالات کے اس جدید انکشاف سے دوچار ہوگئی۔ اُس کا معصوم دل اس سفاکی کو سنکر پاش پاش ہوگیا اور اُس کو مظلوم و لاچار بیوی پر بیحد ترس آیا۔ اُس نے ہر امکانی کوشش اُس کے بچانے کی کی لیکن سب رائیگاں گئیں۔ مگر بیوی اس سے بیحد مانوس ہوگئی اور ہمیشہ کہا کرتی کہ اُس کو چھوڑ کر وہ کہیں نہ جائے۔ حقیقتاً اُس کو ایک دلی محبت پیدا ہوگئی تھی۔ چنانچہ محض اُس کے اصرار اور بچے کی خاطر مجبوراً دوشیزہ کو وہاں کا قیام جاری رکھنا پڑا۔

گوہر بائی کو یہاں رہتے تقریباً دو سال ہوگئے تھے کہ نوروز بھائی کی آمد و رفت شروع ہوئی۔ سہراب جی اور نوروز بھائی میں کچھ تجارتی تعلقات تھے جسکی بنا پر اکثر رات کا کھانا بھی نوروز بھائی، سہراب جی کے ساتھ ہی کھاتے اور شب میں قیام بھی کرتے۔

نوروز بھائی ایک خوبصورت، تنومند، ناک نقشہ سے درست نوجوان تھا۔ علاوہ مردانہ خوبصورتی کے تعلیم میں بھی وہ ایم۔ اے تھا۔ جب سہراب جی کے یہاں وہ قیام کرتا تو زیادہ تر مس گوہر بائی کو اس کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوتا۔ رفتہ رفتہ ان دونوں میں بے تکلفی بڑھ گئی اور دونوں ایک دوسرے کے گہرے دوست بن گئے۔ نوروز بھائی ہمیشہ غریب معلمہ کے احساسات کا بیحد خیال رکھتا اور گھنٹوں اُس کے تصور میں محو رہتا۔ مس گوہر بائی بھی بسا اوقات اپنے کو اس کا ممنونِ احسان پاتی اور اُس کی طرف سے دل میں ایک نامعلوم خلش سی محسوس کرتی۔ چنانچہ اسی دوران میں ایک روز نوروز بھائی نے مس گوہر بائی کے روبرو نہ صرف اظہار محبت ہی کیا بلکہ اُس کو شادی کا پیغام بھی دیدیا۔

مس گوہر بائی کی حالت اس وقت بہت تکلیف دہ تھی کیونکہ بیگم سہراب جی کے حالات دن بدن بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے جس کے باعث اکثر اُس کا شوہر کہا کرتا کہ وہ جلد ہی اُس کو کسی پاگل خانہ میں بھیج دے گا اور بچی کو بورڈنگ ہاؤس میں داخل کر دے گا۔ ایک دن سہ پہر کو جب مس گوہر بائی اور نوروز بھائی دونوں پائیں باغ میں تنہا تھے اور ننھی بچی کسی کام سے مکان میں چلی گئی تھی تو نوروز بھائی نے بڑے ہمت و استقلال کے ساتھ اپنی محبوبہ دلنواز کے روبرو اس کو اپنی شریک زندگی بنانیکی استدعا پیش کر دی۔ دونوں اس وقت شرم و حیا کے مجسمہ بنے ہوئے تھے اور الفاظ ہر ایک کے حلق تک آتے آتے خشک ہو جاتے تھے۔

بہرصورت اُسی ساعت سے دونوں ایک دوسرے کے منگیتر کی حیثیت سے رہنے لگے۔ مگر ایک بات کی خاص طریقے سے نوروز بھائی نے احتیاط برتی کہ چند تجارتی وجوہات کی بنا پر اس نسبت کو سہراب جی سے قطعی پوشیدہ رکھا جائے۔ مس گوہر بائی نے بھی اس تجویز کا مسرت کیساتھ استقبال کیا کیونکہ اُس کا خیال تھا کہ

اس کا اعلان مکان میں اُس کی شخصیت کو مشکوک بنا دیگا۔ حالانکہ اُس کی دلی خواہش تھی کہ جس قدر زیادہ عرصہ تک ممکن ہو سکے وہ اپنی بھولی شاگرد کیساتھ قیام کرے۔

اس نسبت کے تقریبًا دو روز بعد نواز بھائی نے خفیہ شادی کا مشورہ پیش کیا۔ اُس کا ظن غالب تھا کہ بہت ممکن ہے کہ صرف چند دنوں کے نوٹس پر اُس کو ممالک غیر کا سفر کرنا پڑے اور اس وقت عجلت و تنگی کے باعث شادی کے متعلق ضروری باتوں کا تکملہ ناممکن ہو جائے۔ کیونکہ وہ تجویز جس سے دولتمند بننا یقینی تھا پیش نظر تھی۔ اور اب صرف تھوڑے روپیہ کی فراہمی کا سوال باقی تھا۔ اس لئے نواز بھائی نے مکرر فوری شادی پر اصرار کرتے ہوئے اپنی مجبوریوں کا نہایت پرحسرت انداز میں اعادہ کیا اور یہ بھی مشورہ پیش کیا کہ ہم اس راز کو اُس وقت تک ظاہر نہ کریں گے جب تک کہ ہم ایک ساتھ اسکندریہ کے لئے روانہ نہ ہو جائیں۔

تھوڑی دیر بحث و تمحیص کے بعد مس گوہر بائی نے بھی اس تجویز کے آگے سر نیاز خم کر دیا اور اگلی صبح کو دونوں نے بظاہر خاموش مگر دلی جذبات سے متلاطم سینوں کے ساتھ اپنے معبد میں خدائے قدوس کے روبرو اپنی زندگیاں ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے وابستہ کر دیں۔

نوروز بھائی اب مستقل طور پر سہراب جی کیساتھ رہنے لگا۔ گویا شمع و پروانہ آٹھوں پہر کے لئے ایک ہی بزم کی رونق بن گئے۔ مگر اس یکجائی کے باوجود دونوں بظاہر ایک دوسرے سے جُدا تھے اور کسی نے بھی الفاظ یا نظر سے اس راز کو کسی پر افشا نہیں ہونے دیا۔

اس رشتہ مناکحت کے ایک ہفتہ بعد شب میں جب تمام ملازمین اپنے اپنے کاموں سے فراغت پا کر شاگرد پیشہ بھی جا چکے تھے، مس گوہر بائی کو اتفاقیہ اپنی مالکہ کی کنجیوں کا گچھا لینے کے لئے باورچی خانہ جانا پڑا۔ دار المطالعہ کے دروازہ سے گذر کر وہ زینہ پر قدم رکھنے ہی والی تھی کہ اسکے کانوں میں کچھ ایسے الفاظ پڑے کہ وہ دم بخود ہو کر رہ گئی۔ فی الحقیقت وہ گفتگو سننا نہیں چاہتی تھی لیکن موضوع گفتگو اور متکلمین کا لہجہ کچھ ایسا عجیب تھا کہ وہ از خود مسحور ہو کر رہ گئی۔

"اس عورت کو اس کی دھمکی کی تکمیل سے فورًا روک دو۔" سہراب جی نے تیز لہجہ میں کہا۔ "ورنہ ہم دونوں کو انتہائی بربادی کا سامنا کرنا پڑے گا۔"

"وہ اپنی دھمکی پر قائم نہیں رہ سکتی۔" نوروز بھائی نے جواب دیا۔

"وہ ضرور قائم رہے گی! وہ پکی چڑیل ہے!! اُس نے مجھ کو گذشتہ کئی ماہ سے بدنام کر رکھا ہے۔ یوں جو تمہارا جی چاہے کرو، مگر اس معاملہ کو فورًا طے کر دو۔ اور اُن خطوط کو جس طرح ممکن ہو واپس لے آؤ۔"

"بہرصورت وہ ہمارا کر ہی کیا سکتی ہے؟" نوروز بھائی نے استفہامیہ لہجہ میں جواب دیا۔ "زیادہ

سے زیادہ کوئی ہتک آمیز طریقہ اختیار کریگی جس کے لئے آپ کی بیگم صاحبہ پرواہ کرنے سے رہیں، رہ گیا درسگاہ کا معاملہ۔ اگر وہ آپ کو علیحدہ بھی کرنے تو بفضلہ اب آپکے پاس کافی آمدنی موجود ہے۔ علاوہ بریں اگر ایک مرتبہ ہماری تجویز کو کامیابی کا جامہ نصیب ہوگیا تو پھر ———"

"جناب من! ایک مرتبہ آپ کو پھر بتلاتا ہوں اور آپ کو متنبہ کرتا ہوں کہ اگر وہ عورت اپنی دھمکی پر قائم رہی تو ہماری بربادی یقینی ہے!!! اور پھر ہماری تجویز تمام عمر کبھی کامیابی کا منہ نہیں دیکھ سکتی کیونکہ ہمارا نام بدنام ہو چکا ہوگا۔"

"اب میں سمجھا" نوروز بھائی نے قدرے گھبراہٹ سے کہا "آہ! میرے اللہ! سہراب جی آپنے کیسی فاش غلطی کی ہے۔"

مس گوہر بائی اس سے زیادہ سننے کے لئے نہیں رکی، اُس کو عجلت تھی اور وہ چلی گئی۔

صبح کو جب وہ ناشتہ پر آئی تو اُس کا شوہر جا چکا تھا۔ نوکر نے اطلاع دی کہ مسٹر نوروز بھائی نے آج جلدی ناشتہ کر لیا ہے اور مالک کے ہمراہ شہر چلے گئے ہیں۔

۲ تمام دن باہر رہنے کے بعد شب میں سہراب جی تنہا مکان واپس آئے اور کھانا بھی تنہا کھایا، تمام شب گذر گئی لیکن نوروز بھائی کا پتہ نہیں تھا۔ مس گوہر بائی کی بے چینی ہر لحظہ بڑھتی جارہی تھی۔ تمام رات اُس نے آنکھوں آنکھوں میں کاٹ دی۔ ایک ایک آہٹ پر اس کو نوروز بھائی کا گمان ہوتا تھا مگر آہ! ہر اُمید یاس سے بدل کر رہ جاتی۔

اگلی صبح کو جب وہ نیچے آئی تو سہراب جی کو تنہا ناشتہ پر پایا۔ اُس کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی اور دماغ میں ہیجان پیدا ہوگیا۔ بالآخر تاب برداشت نہ لاکر اس نے ہمت کرکے سہراب جی سے سوال کیا "کیا نوروز بھائی شہر تشریف لے گئے ہیں؟"

"ہاں" سہراب جی کی زبان سے صرف ایک لفظ نکلا اور وہ خاموش ہوگئے۔

شام کو مس گوہر بائی اپنی ننھی شاگرد کو تفریح کرانے لے جارہی تھی کہ اچانک اس کی نظر بمبئی کرانیکل کے ایک خبر کی سُرخی پر پڑی۔ اس میں جلی حروف میں تحریر تھا:-

"ایک عورت کا غیر معمولی قتل"

مس گوہر بائی نے اخبار خرید کر تفصیلی واقعات پڑھنا شروع کئے جس کا خلاصہ یہ تھا کہ "ایک عورت مس فیروزہ بائی نامی اپنی گاڑی میں مقتول پائی گئی۔ گذشتہ شب چوپاٹی سے مس صاحبہ اپنی اسی گاڑی میں ایک نوجوان کے ساتھ جاتی دیکھی گئی تھیں۔ نوجوان راستہ میں ہی اُنہیں گاڑی سے اُتر گیا اور گاڑی جب مکان پر آکر رکی تو مس فیروزہ بائی مردہ تھیں۔"

اس واقعہ کو پڑھ کر غریب مس گوہر بائی پر بجلی سی گری۔ عالم خود رفتگی میں اخبار اس کے ہاتھوں سے

گر پڑا اور وہ نیم مردہ ہو کر رہ گئی۔

شب کی گفتگو کا ایک ایک لفظ اس کے دماغ میں گونج رہا تھا اور یقین ہوتا جا رہا تھا کہ سہراب جی کے ترغیب و ہدایت کے بموجب اُس کے شوہر نے مس فیروزہ بائی سے ہمیشہ کے لئے نجات حاصل کر لی ہے اور یقیناً اس عورت کا قاتل اس کا شوہر ہے۔

اس وقوعہ کے بعد سے مس گوہر بائی نے اس شخص کا نام پھر کبھی نہیں سُنا، جس کے لئے اُس نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ پولیس انتہائی جانفشانی کے ساتھ تفتیش میں مشغول تھی اور اس نے جلد ہی سہراب جی کو طلب کر کے نوروز بھائی کا نام معلوم کر لیا۔ سہراب جی نے نہایت فصاحت اور صفائی کے ساتھ بیان کیا کہ نوروز بھائی شب وقوعہ کی صبح کو ہی اسکندریہ جانے والا تھا اور وہ اپنا اسباب وغیرہ لیکر شام کو ہی اس کے یہاں سے رخصت ہو چکا تھا۔ اُس نے مقتولہ کے ساتھ اپنی شناسائی بھی بیان کی لیکن ساتھ ہی یہ بھی بیان کیا کہ ایک عرصے سے اُس سے کشیدگی ہو جانے کے باعث تعلقات ختم ہو چکے تھے۔

بحری آفس کی تمام تحقیقاتیں نوروز بھائی یا اُس کے علیہ کے کسی شخص کے سفر پر روانہ ہونے کے بارے میں ناکامیاب ثابت ہوئیں۔ چنانچہ مجبوراً پولیس نے تحقیقات ختم کر کے فائنل رپورٹ مرتب کر دی۔ وقوعہ کا سب سے عجیب پہلو یہ تھا کہ مس فیروزہ بائی کے گلے میں نادر الوجود ہیروں کا بیش قیمت ہار اور کانوں میں عدیم المثال بُندے پڑے تھے اور یہ سب بدستور محفوظ تھے۔ اس لئے یہ ظاہر تھا کہ قاتل کا مقصد سرقہ بالجبر یا ڈکیتی نہیں تھا بلکہ کسی دشمنی کا بدلہ یا رقابت، کچھ عرصہ کی گرما گرمی کے بعد یہ واقعہ بھی گردشِ زمانہ کیساتھ سرد اور لوگوں کے دلوں سے فراموش ہو گیا۔

مس گوہر بائی کی حالت اب انتہائی مایوس کن اور دردناک تھی۔ سہراب جی کی صورت سے اس کو دلی نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ وہ اچھی طرح سمجھتی تھی کہ اس تمام واقعہ کا ذمہ دار محض سہراب جی تھا۔ مگر اس کیلئے دوگونہ کشمکش تھی۔ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔ اگر وہ سہراب جی کے یہاں سے ملازمت ترک کرتی تو فوراً دوسری ملازمت اس زمانہ بیکاری میں ملنا محال۔ علاوہ بریں وہ فرضی نام بتلا کر کسی شریف کو دھوکہ بھی دینا نہیں چاہتی تھی۔ اور اگر وہ سچ بولتی کہ وہ ایک قاتل کی بیوی ہے تو پھر ملازمت ملنا معلوم۔ انہیں خیالات کی اُدھیڑ بن میں وہ بدستور سہراب جی کے یہاں باوجود دلی اذیت اور قلبی پریشانیوں کے کام کرتی رہی۔

سہراب جی کی نظروں سے ہمیشہ وہ دور رہنے کی کوشش کیا کرتی لیکن اس کے باوجود سہراب جی اُس سے مشکوک رہنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ جو کچھ اس کو جاننا چاہیئے اُس سے کہیں زیادہ وہ جانتی ہے، اس خیال سے مس گوہر بائی کے سینہ کی آگ اور زیادہ تیزی سے روشن ہو گئی اس کا دل و دماغ حتیٰ کہ

تمام بدن سوزشِ نہاں سے بھٹکنے لگا۔ اور اس نے تہیہ کر لیا کہ جو کچھ اس کو معلوم ہے الم نشرح کر دے لیکن آہ! عورت پھر عورت ہے محض یہ خیال کہ عورت خود اپنے شوہر کے جرم کو ثابت کر کے اس کو لوگوں کی نظروں میں حقیر و خوار بنا رہی ہے حالانکہ وہ اُس کی شریک زندگی اور اُس کے معائب کی پردہ پوش ہے۔ اس کے دل کی دہکتی آگ کو یکسر سرد کر دیتا۔

زمانہ ہر آن نئی کروٹ بدلتا ہے۔ اس ظالم سے اس بیکس کی یہ حالت بھی نہ دیکھی گئی اور مرے پر سو درّے کی مصداق اُس کو بے گھر کرنے کی ٹھان لی۔ سہراب جی جس سے مس گوہر بائی ہر وقت دور بھاگتی انتہائی اختلاط بڑھنے لگا اور کوشش بلیغ کی کہ اُس کی پژمردہ زندگی میں بجائے شرابی بیوی کے وہ ایک خوشگوار تبدیلی اور مسرت کا باعث بن جائے۔ مس گوہر بائی جیسی شریف، معصوم خیال اور باعصمت خاتون کے واہمہ میں بھی کبھی یہ خیال نہیں گذر سکتا تھا۔ اُس کی عزت اور خودداری کو سخت ٹھیس لگی اور باوجود ننھی شاگرد اور دل شکستہ مالکہ کی جُدائی کے المناک خیال کے اُس نے فوراً مکان خالی کر دینے کا قصد مصمم کر لیا۔

مگر آہ! جب قسمت کسی کو برباد کرنے پر تُل جاتی ہے تو تمام انسانی منصوبے اور کوششیں کسی دل خوش کن خیال سے زیادہ وقیع ثابت نہیں ہوتیں۔ جس دن اُس نے سہراب جی کے گھر سے باہر قدم نکالا اُسی روز اُس کی تمام عمر کی پونجی جو اُس نے قلیل تنخواہ سے ایک ایک پیسہ بچا کر جمع کیا تھا چوری ہو گئی۔ اس پر بھی وہ ہمت کی دیوی اور صبر کی پتلی مایوس نہیں ہوئی، اور ہر امکانی سعی حصولِ ملازمت کے لئے کرتی رہی۔

ایک ماہ تک تو کسی نہ کسی طرح گذر معاش ہوتی رہی اسکے بعد فاقہ کشی کی نوبت پہونچ گئی اور ہر وہ چیز جو اب تک اس کی اپنی ملکیت تھی محض ایک کمرے کے کرایہ کے عوض اُس سے ہمیشہ کے لئے چھین لی گئی۔ اور وہ چھت کے سایہ سے بھی محروم ہو گئی۔

پہلے دن جب وہ بے خانماں ہوئی تو مشکل سے اس کو اپنی حالت کی نزاکت کا احساس ہوا تھا۔ اُس کو اتنا یاد ہے کہ وہ بھوک سے بیتاب تھی۔ اُس کا بدن شدتِ گرسنگی سے لرزاں اور دماغ چکرا رہا تھا۔ اُس کو یہ بھی یاد ہے کہ جب رات گہرے کُہر کے گھٹا ٹوپ اندھیرے اور یخ بستہ سردی کے ساتھ کائنات پر مسلط ہوئی تو نحیف و زار، بیکس و بے بس، بے یار و مددگار، معصوم و غریب اِن لامتناہی اور فوری مصائب کی برداشت نہ لا کر غش کھا کر فرشِ زمین پر گر پڑی تھی۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اُس سے کپتان ساجد ناواقف نہیں۔ یہی تھا وہ پُر درد قصہ اور یہی تھی وہ المناک کہانی جس کو مسٹر نسیم بیرسٹر اور کپتان ساجد نے مس گوہر بائی کی خود زبان سے سُنا۔

اس کے بعد جب کپتان ساجد اور مسٹر نسیم نے تنہا کمرے میں بیٹھ کر تبادلہ خیالات کیا تو متفقہ

رائے سے مزید جانچ کے لئے نہایت کامیاب راہ عمل تجویز کرلی۔

(۵)

### اندرز سوا سیوانی۔

بمبئی جیسے بے پناہ شہر میں یہ مسٹر نسیم ہی کی ذکاوت طبع تھی کہ ایک لفافہ کا پتہ چل جاتا۔ ورنہ یہی بہت ٹیڑھی کھیر ہوتی۔ دوسرے دن ٹائمس آف انڈیا میں یہ اشتہار جلی حرفوں میں درج تھا۔

"ایک سربمہر لفافہ جس پر مکتوب الیہ کا نام مس آرڈ شاہ گوہربانی تحریر ہے ہارنبی روڈ پر قلابہ اسٹیشن کے نواح میں مع ایک پاکٹ بک جیب سے گر گیا ہے۔ پانے والا اگر اس کو میرے پاس بھیجدے تو سو روپیہ شکریہ کے ساتھ بطور انعام پیش کیا جائیگا۔"

"مسٹر نسیم۔ بیرسٹرایٹ لا۔ ۲۱۹ مرزبان روڈ۔ فورٹ بمبئی۔"

دو روز کے بعد ایک مزدور بیرسٹر صاحب کے دفتر میں آیا۔ اُس نے بیان کیا کہ "۱۵ اکتوبر کی صبح کو جب میں کارخانہ جارہا تھا سڑک پر ایک لفافہ پڑا ملا تھا اُس کے ساتھ ایک پاکٹ بک اور تین کاغذ کے ٹکڑے بھی تھے، اُن کو میں نے اپنے پاس رکھ لیا اور شام کو لفافہ پر لکھے ہوئے پتہ پر گیا۔ وہاں ایک معزز شخص نے یہ کاغذات لے لئے میں اس شخص کو پہچان سکتا ہوں۔"

کپتان ساجد کو اتنا یاد تھا کہ کھٹاؤ بلڈنگ سے واپسی کے وقت اُس نے اُس لفافہ کو مع پاکٹ بک اور کاغذات کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیا تھا۔ لیکن جب وہ کچھ دور چل کر ایک شخص سے ایسا متصادم ہوا کہ زمین پر آتے آتے بچا۔ تو بہت ممکن ہے کہ یہ کاغذات گر گئے ہوں۔

مسٹر نسیم اُس مزدور کو ہمراہ لیکر کھٹاؤ بلڈنگ پہونچے، عین اُس وقت سہراب جی دروازے سے باہر نکل رہا تھا۔ مزدور نے دور ہی سے پہچان لیا۔ سہراب کی نظر ان پر پڑنا تھی کہ وہ کچھ سٹ پٹایا اور اسکے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں، لیکن فوراً ہی اُس نے دبے ہونٹوں مسکراتے ہوئے آگے بڑھکر مسٹر نسیم کا استقبال کیا۔ اور اپنے کمرے میں لے جاکر بٹھایا۔ مسٹر نسیم نے بغیر تمہید کہا "مسٹر سہراب میں اس وقت یہاں مس آرڈ شاہ گوہربانی کے وکیل کی حیثیت سے آیا ہوں۔ اگر آپ وہ خط اور پاکٹ بک وغیرہ بغیر حیل و حجت میرے حوالے نہیں کرتے تو میں قانونی کارروائی کرنے پر مجبور ہوں گا۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے، پاکٹ بک اور کاتب کے سوانح حیات طشت از بام ہوں گے۔ اور وہ جملہ واقعات بھی جو آپ کی ذات خاص سے متعلق ہیں۔ اب بتائیے آپ کا کیا خیال ہے؟"

سہراب نے کچھ پس و پیش کے بعد جواب دیا "اور بالفرض میں نے اس خط کو ضایع کردیا ہوتو؟"

مسٹر نسیم "آپ مجسٹریٹ کے روبرو اپنا بیان دیں گے۔ یہ بھی ذہن نشیں رہے کہ کپتان ساجد سے خط وغیرہ کے متعلق اپنی قطعی لاعلمی کا اظہار کر چکے ہیں۔"

سہراب :" اب میں بتاتا ہوں کہ وہ خط میرے قبضہ میں آچکا ہے میں نے اس کو کھول کر پڑھ لیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ مس آرڈ شاہ گوہر بائی متوفی نور وزجی یا نواز بھائی کی زوجہ ہیں۔ چونکہ اُنہوں نے اس حقیقت کو ابتک پردۂ راز میں رکھا ہے۔ لہذا میرے خیال میں وہ اب بھی ہرگز یہ پسند نہیں کریں گی کہ یہ راز دنیا کے سامنے بے نقاب ہو۔"

مسٹر نسیم :" جی !"

سہراب :" دوسری قابل غور بات یہ ہے کہ یہ خط مس آرڈ شاہ گوہر بائی کے حق میں مفید اور منفعت بخش ہے، مگر اس میں چند باتیں ایسی مرقوم ہیں جو میری عزت و وقار اور شہرت کے منافی ہیں۔"

مسٹر نسیم :" ممکن ہے ... لیکن وہ خط آپ دیتے ہیں یا نہیں ؟"

سہراب :" یہ خط میں اس شرط پر آپ کے حوالے کرنے کو تیار ہوں کہ آپ اس کا عہد کریں کہ یہ میرے خلاف استعمال نہیں کیا جائیگا۔"

مسٹر نسیم :" مسٹر سہراب ! اس میں شبہ نہیں آپ ہیں بہت چالاک۔ بہرکیف اس میں چنداں مضائقہ نہیں، اگر اس کی تحریر میری موکلہ کے مفید مطلب ہے تو میں اس کا ذمہ لیتا ہوں کہ اس کا وہ حصہ جو آپکے لئے مضرت رساں ہے، نہیں استعمال کیا جائے گا۔ بشرطیکہ اس سے میرے پیشہ کی نزاکت کو ملحوظ رکھتے ہوئے میری حیثیت پر کوئی بدنما دھبہ نہیں لگتا ہو۔"

سہراب :" بس، میرا اطمینان ہوگیا۔ میں آج ہی وہ خط آپ کے دفتر میں پہونچا دونگا۔"

---

اُسی روز گُمشدہ خط مسٹر نسیم کے قبضہ میں تھا۔ اُنہوں اُسے نہیں کھولا، بلکہ فوراً المکتوب الیہ کے پاس لے گئے۔ آرڈ شاہ گوہر بائی نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے لیا اور کھول کر پڑھنا شروع کیا۔ اس پیام کا مضمون جو نوروزجی نے کپتان ساجد کے توسط سے اپنی بیوی کو بھیجا تھا یہ تھا۔

میری گوہر

تمہارے معصوم ہاتھوں میں یہ خط پہونچنے سے پیشتر میری ہستی کا چراغ گل ہو چکا ہوگا۔ میں ارادہ کرچکا تھا کہ بمبئی آکر نتائج کا مردانہ وار مقابلہ کروں، میری بے گناہی ثابت ہو جائے ........ تمہارے بھولے پن کے وسوسے کافور ہوں۔ تمہارے آستانِ ناز پر میری جبین نیاز ہو تمہاری بلورین باہیں میرے گلے میں حمائل ہوں۔ تمہارا برق پاش تبسم میری حسرت و یاس کا خاتمہ کردے اور یہ میری حیات کے پُرکیف لمحات تمہاری محبت یا ر دنیائے نشاط میں گم ہوں..... یہ ملہم غیب کی صدا تھی جو میرے کانوں میں گونج رہی تھی..... یہ وہ کہربائی کشش تھی جو اس شہید تمنا کو تمہارے گلزارِ حُسن و معصومیت کی طرف کھینچ رہی تھی..... مگر آہ! میری کمزوری! میری کم ہمتی! تو نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔

ہاں! میں اپنی بیوفائیوں کی تلافی کے لئے تیار تھا...... میں تمہیں کیوں اپنی رفیقۂ حیات بنانے پر آمادہ ہوا تھا۔ اس میں کوئی فریب کاری نہ تھی... میں تمہاری جیسی فرشتہ سیرت عورت کے لئے مضطرب تھا۔ کیونکہ میرا عنفوانِ شباب ایک شیطان طینت ساحرہ کی نذر ہو چکا تھا۔ جس نے میری دولت پر قبضہ جما کر مجھ سے بیوفائی کی۔ اُس ناپاک سیرت عورت کی آرزو باقی تھی اور نہ پھر اُس کی صورت دیکھنے کا امکان، مجھے یقین واثق تھا کہ وہ پیوندِ زمین ہو چکی تھی...... سہراب جس کی بچی کی تم اتالیقہ تھیں میرا گہرا دوست، ہمراز اور میں ایک بڑے کارخانے پارچہ بافی کے سرمایہ میں برابر کا حصہ دار تھا۔ ایک دن اُس نے مجھ سے یہ خواہش ظاہر کی کہ میں ایک عورت موسومہ مس فیروزہ بائی سے خطوط واپس لے آؤں، جو اُس نے جنون شباب کی ہوس رانیوں سے اندھا ہو کر اُس عزت باختہ عورت کو لکھے تھے۔ اُس قتالۂ روزگار سیہ کار نے ان خطوں کو الم نشرح کر کے سہراب کی آبروریزی کی دھمکی دی تھی۔ سہراب ان خطوط کے حصول کے لئے بیتاب تھا کیونکہ یہ وہ خطوط تھے جو صدہا سہراب سے زیادہ پاکباز اور شریف آدمی ان عورتوں کو لکھ چکے ہیں، جن کے فریب حسن و رعنائیوں سے وہ کسی وقت مغرور اور از خود رفتہ تھے۔ اگر یہ خطوط منظرِ عام پر آجاتے تو سہراب کی ساری عزت و ثروت خاک میں مل جاتی اور ہمارے کارخانے کی ساکھ اور اعتماد پر وہ ضرب کاری لگتی کہ ہم تباہ ہو جاتے۔ کیونکہ ان خطوط سے سہراب کی شاطرانہ عیاریاں عریاں ہو جاتیں۔

سہراب کی ہمدردی کو میں نے اپنا فرض تصور کیا اور اُس عورت سے مل کر جن داموں ممکن ہو اُن خطوط کو حاصل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ سہراب نے اُس عورت کو مطلع کر دیا تھا کہ اُس سے سودا کرنے کی غرض سے ایک پیامبر جائے گا۔ میں وقت مقررہ پر سہراب کے بتائے ہوئے پتہ پر گیا۔ جب اُس کے مکان پر پہونچا تو ملازمین کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ چوپاٹی کی سیر کو گئی ہے مجبوراً میں چوپاٹی کی طرف چل دیا۔ ساحل کے قریب پہونچ چکا تھا کہ ایک سرو قد حسینہ میرے برابر سے گذری ہماری آنکھیں چار ہوئیں اور ہم دونوں اپنی اپنی جگہ پر نقوش حیرت بن کے رہ گئے...... وہ میری بیوی تھی جس کی موت کا دس برس پہلے مجھے یقین ہو چکا تھا۔

"دیکھو یہاں کوئی ایسی بات نہ کرنا جس سے ہماری رُسوائی ہو" اُس نے مجھ سے کہا "چلو گھر چلکے جو کچھ کہنا ہو کہہ سُن لینا"

اُس وقت میں بتا نہیں سکتا کہ میری کیا حالت تھی۔ حیرت و استعجاب، رنج و تعب، نفرت و حقارت بیک وقت میرے جذبات کی رو میں طوفان برپا کر رہے تھے۔ میں غیر ارادی طور پر اُسکے پیچھے ہو لیا۔ دس پندرہ قدم چلکے وہ اپنی گاڑی تک پہونچی اور سوار ہو گئی۔ میں بھی اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اُس نے کوچبان سے کہا "سیدھے مکان چلو" اور میری طرف مخاطب ہوئی "میری موت کا

تم یقین کر چکے تھے نا؟۔ دیکھو خفا نہ ہو۔ تم سے پیچھا چھوڑانے کی یہی ایک ترکیب تھی۔ اتنے دِنوں بعد آج جو مل گئے تو گڑے مُردے کیوں اُکھاڑے جائیں ......... اُف دانتوں کا درد مارے ڈالتا ہے۔"

اُس نے جیب سے کلوروفارم کی ایک شیشی نکالی۔ دانتوں میں لگایا اور شیشی جیب میں رکھ لی۔ اتنے میں ایک تیز رفتار موٹر سے بچنے کی کوشش میں کوچبان نے گاڑی کو ایک ستون سے جا ٹکرایا۔ ایک جھٹکا لگا اور میری بیوی گاڑی میں زور کیساتھ گری۔ لیکن سنبھل کے بیٹھ گئی اور بولی "ہاں خوب یاد یاد آیا۔ مجھے اس وقت ایک صاحب سے چند ضروری کاموں کے متعلق ملنا ہے۔ وہ مکان پر میرے منتظر ہوں گے۔ اس لئے تمہارا ابھی مکان پر چلنا مناسب نہیں۔ تم جہاں چاہو کل مجھ سے مل سکتے ہو تاکہ ہمارے معاملات طے ہو جائیں۔"

میں "تم کہاں رہتی ہو؟"

وہ "نمبر ۲۷ مالابار ہل"

یہ وہی پتہ تھا جہاں میں مس فیروزہ بائی کی تلاش میں گیا تھا۔ میں نے حیرت سے پوچھا "تم نے اپنا نام بھی بدل دیا ہے؟"

وہ "ہاں اب میرا نام مس فیروزہ بائی ہے"

یہ سنتے ہی میرے تن بدن میں آگ سی لگ گئی، اور آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ میں نے پھر استعجاب کے لہجہ میں کہا "ہائیں! تم ہی سہراب کی وہ معشوقہ ہو جس کے پاس میں اُس کا پیام لیکر آیا ہوں"

وہ۔ (قہقہہ لگاکر) "خوب، پھر تو تم سے بہتر سہراب کا پیامبر اور کوئی نہیں ہو سکتا..... ہمارا معاملہ اب بخوبی طے ہو جائیگا۔ میں تمہیں اُس کے خطوط دے دیتی ہوں، اور تم یہ قسم کھالو کہ آج کے بعد آیندہ تم میری راہ میں کبھی مخل نہ ہو گے"

میں "وہ خطوط یہاں تمہارے پاس ہیں؟"

وہ "ہاں میرے اس بٹوہ میں موجود ہیں۔ میں اپنے ملازموں کا اعتبار نہیں کرتی، کیونکہ سہراب بہت شاطر اور چالاک ہے"

میں "اچھا لاؤ، مجھے دیدو"

یہ کہہ کر میں نے اُس چھوٹے سے پلندے کو جو اُس نے نکال لیا تھا پکڑ لیا۔ اُس نے اپنی گرفت مضبوط رکھتے ہوئے کہا "نہیں، نہیں جب تک تم مجھ سے عہد و پیمان نہ کر لو"

تھوڑی دیر تک یہ کشمکش جاری رہی۔ دفعتاً اُس نے اپنی گرفت ڈھیلی کر دی۔ اور ایک ہلکی

چیخ کے ساتھ جیب سے رومال نکال کر اپنے منہ پر رکھ لیا۔ غالباً وہ دانتوں کے درد سے بیتاب ہو رہی تھی اس کے بعد ایسا معلوم ہوا کہ درد و کرب کی شدت سے وہ بیہوش ہو گئی۔ کیونکہ وہ اُسی طرح مُنہ پر رومال رکھے ہوئے بے حس و حرکت گاڑی کے گوشہ میں گر گئی۔.... وہ خطوط میرے قبضہ میں تھے، دماغ مختل ہو رہا تھا اور اُس سیہ کاری کی مجسمہ سے نفرت اور حقارت بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے گاڑی رُکوائی اور فوراً اُتر پڑا۔ کوچبان کو اشارہ کیا، وہ چلتا ہوا۔ میں نے اپنی راہ لی۔

اُسی شب میں نے سہراب سے ملکر وہ خطوط اُسے دیدئیے، اُس سے جنگ کا ارادہ عبث تھا اس لئے اصل واقعہ اُس سے کچھ نہیں بتایا..... اُسی وقت اپنے کمرے میں آیا بکس نکالا اور ایک گاڑی میں سوار ہو کر وہاں سے رخصت ہو گیا۔

تمہیں یہ شکایت ہو گی کہ میں تم سے کیوں نہ ملا... سنو وہ ماحول میرے لئے جاں گسل تھا، روح فرسا تھا میں اُس فضا سے نکل جانے کے لئے مضطرب تھا کسی دور دراز مقام میں جا کر سکونِ قلب حاصل کرنے کے لئے بیقرار تھا۔ اس کے بعد یقیناً تم کو من و عن حالات لکھنا...... میں ایک ہوٹل میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا کہ میری نظر ایک عنوان سنسنی خیز قتل پر پڑی، نیچے یہ خبر درج تھی "بمبئی کی ایک ممتاز اور متمول خاتون مس فیروزہ بائی اپنی گاڑی میں مردہ پائی گئی۔ گاڑی میں ایک رومال کلوروفارم سے تر ملا۔ اُس کے ہمراہ نوروزجی عادل شاہ نامی بمبئی کا ایک تاجر تھا جو راستہ میں گاڑی رُکوا کر اُترا اور تیزی کے ساتھ تاریکی میں غائب ہو گیا۔ پولیس اُس کی تلاش میں ہے۔"

فیروزہ بائی کی موت کی وجہ صاف تھی۔ جب گاڑی کی ٹکر سے جھٹکا کھا کر گری تھی تو اس کی جیب کی شیشی ٹوٹ گئی ہو گی اور رومال کلوروفارم سے تر ہو گیا ہو گا۔ وہی رومال اُس نے بعد کو منہ پر رکھا تھا جس کے اثر سے اس پر بے ہوشی طاری ہو گئی۔ بیہوشی کے وقت بھی وہ رومال اس کے مُنہ پر پڑا رہا اور گاڑی کی دیوار اور اُس کے مُنہ کے درمیان دبا رہا۔ اس کا اثر اُس کے کمزور قلب کے ساتھ مل کر اس کی موت کا سبب ہوا۔ حقیقت یہی تھی۔ لیکن میرے خلاف شہادت بہت قوی تھی۔ وہ میری زوجہ تھی۔ اُس کی موجودگی میں میں نے دوسری شادی کر لی تھی۔ گاڑی میں اُس وقت میں موجود تھا، راستہ میں کود پڑا تھا۔ اور مفرور تھا...... میری کمزوریٔ قلب مجھے ان جملہ شہادتوں کے مقابلے کے لئے آمادہ نہ کر سکی۔ اصل واقعہ کا کوئی گواہ نہ تھا اس لئے میری پھانسی یقینی تھی..... اب بجز فرار اور کوئی چارۂ کار نظر نہیں آیا۔ میں اپنا نام بدل کر پاسپورٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا اور اسی دن جہاز پر سوار ہو گیا۔ بمبئی سے بصرہ اور وہاں سے بندر عباس اور اسکندریہ ہوتا ہوا قاہرہ پہونچا...... میں اپنی رام کہانی سُنا کر تمہارے نازک دل کو پریشان کیوں کروں..... لیکن نہیں۔ دنیا مجھے قاتل قرار دے چکی مگر میری روح کے سکون کے لئے صرف یہی کافی ہے کہ تمہاری نگاہوں میں میری معصومیت ثابت ہو جائے..... ہاں سنو! میں نے تجارت

میں خاطر خواہ ترقی کی۔ مجھے اُن شہروں میں کسی نے نہیں پہچانا۔ زمانہ میرے موافق رہا اور میں اس عرصہ میں بہت بڑی دولت کا مالک ہوگیا .... بالآخر میں نے وطن کو مراجعت کا قصد کیا تاکہ اپنے کو قانون کے حوالے کر دوں اور اپنی بے گناہی ثابت کر دوں .... کیا میں اس میں کامیاب ہو جاتا؟ اگر نہیں تو کیا حشر ہوتا! .... پھانسی کا تسمہ میری گردن میں ہوتا .... آہ گوہر! میں دل کا بہت کچا ہوں، بزدل ہوں، ڈرپوک ہوں۔ یہ خوفناک خیالات، یہ بھیانک نقشے، یہ روح فرسا نتائج ہمت شکن ہیں۔ میرے حوصلے پست ہو رہے ہیں... آہ دنیا! تیری دلفریبیوں اور خوش اداییوں کے پردے میں خوفناک سیہ کاریاں اور ناپاک ترین بدکاریاں پوشیدہ ہیں ...... یہ خط میں جہاز کے کپتان کو دونگا تاکہ وہ تم تک پہونچا دے۔ اور پھر ......

اور پھر میں اس بے یار و مددگار ہستی کا خاتمہ کر دوں گا .... میرا حسرت زدہ اور تشنہ کام وجود فنا کے دامن میں ہمیشہ کے لئے روپوش ہو جائے گا .... کاش تم میرے پاس موجود ہوتیں اور مرنے سے پہلے تمہاری صورت دیکھ لیتا .... مگر نہیں، نہیں، تمہاری دلکش ادائیں تمہاری گفتگو کی ترنم ریز موسیقیت مجھے پیکار حیات کے لئے اُبھارتیں ...... تمہارے نام بینک میں دس لاکھ نقد چھوڑتا ہوں۔ اگرچہ میری بیوفائیوں کی تلافی کے لئے یہ رقم ناکافی ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ تم مجھے معاف کر دوگی۔ اس لئے کہ میں مجبور تھا .... دیکھو سمندر کی متلاطم موجیں مجھے بلا رہی ہیں۔ اور مرقد آبی ہم آغوش ہونے کے لئے بیتاب ہے ...... آؤ تمہیں ایک بار اور یقین دلا جاؤں کہ میں اُس معصیت کوش ساحرہ نیروزہ کا ہرگز قاتل نہیں ہوں۔

تمہارا شہید ناز نوروز"

گوہر خط پڑھتی جاتی تھی اور باوجود انتہائی ضبط کے اپنی پُرنم آنکھیں رومال سے پونچھتی جاتی تھی۔ جب خط تمام ہوچکا تو اُس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر فرش پر گرا۔ اور دوسری طرف وہ خود آرام کرسی پر بیہوش ہوگئی۔

---

محولہ بالا واقعہ کے ایک سال بعد مس آرڈ شاہ گوہر بائی کپتان ساجد کی چہیتی اور دلنواز بیگم تھی۔ نوروزجی عادل شاہ کی دولت میں اُس حسینہ نے خود ایک حبہ بھی نہیں لیا۔ بلکہ مساجد، دار الیتامیٰ، محتاج خانوں اور زنانہ درسگاہوں کی طالبات کے وظائف کے لئے وقف کر دیا۔ جب بیگم سہراب اس دار فانی سے چل بسی اور سہراب تجارت میں بددیانتی اور خیانت کے باعث دیوالیہ مشتہر ہونے کے بعد ذلت و رسوائی کے خوف سے تارک وطن ہوا تو بیگم ساجد نے اُس بچی کو جسے وہ اپنی اولاد سے زیادہ چاہتی تھی اپنے پاس رکھ لیا۔ اس طرح اس کے زخم دل کا مداوا ہوگیا۔

اب کپتان ساجد دنیا کا سب سے زیادہ خوش قسمت انسان ہے۔ اس نے بحری زندگی ترک کر دی ہے۔ حاجی ہارون موسیٰ کمپنی نے اپنے منافع کا ایک معتدبہ حصہ اس کو اُس کی نیک نیتی اور

'SAQI'



Mutari art Press Delhi

42190

۱- عبدالرشید چهارم

۲- محمد سعید ششم

۳- خامس [illegible]

۴- [illegible] هشتم

ایمانداری کے صلہ میں بطور پنشن دیدیا ہے۔ اور وہ مرفع الحالی کی زندگی بسر کر رہا ہے۔

جب کبھی مسٹر نسیم سے اُن واقعات کا ذکر آتا ہے تو وہ کہتا ہے "بھائی نسیم اُس گُمشدہ خط کے دوبارہ حصول کا سہرا تو تمہارے سر ہے۔ لیکن سچ کہنا تمہیں خواب میں بھی یہ گمان تھا کہ ایسے المناک واقعات کا اتنا پیارا انجام ہوگا؟"

# شاعر کی منزل

از جناب مظہر انصاری بی اے (آنرز)

ربط مجھ کو شاہد و ساقی سے ہے مینا سے ہے
ربط مجھ کو دہر کے ہر زندگی پیما سے ہے

میرے آئینہ میں ہے ہر زندگی عکس آفریں
شعلہ کامِ تابِ ہستی ہے مری لوحِ جبیں

ہے مرا حرفِ محبت پڑھنے والے کے لئے
ہے مرا آغوش وا ہر بڑھنے والے کے لئے

زندگی، دل، آرزو، اُلفت، گماں دیتا ہوں میں
جنکو ہے سودائے ہستی اُنپہ جاں دیتا ہوں میں

کوہکن کے عشق کی تیشہ سرائی بھی مری!
قیس کی آوارگی، آہوگدائی بھی مری

شمعِ سوزاں پر بھری محفل میں روتا ہوں کہیں
کرمکِ محزوں پہ اپنی جان کھوتا ہوں کہیں

ہے رگِ خونِ گلِ فرخندہ میں میرا لہو
پوچھتا ہے مجھ سے منزل کاروانِ رنگ و بو

ہوں شریکِ رہ نورداں قافلوں کا دستگیر
میری اُلفت کیوں رہے میرے ہی پہلو تک اسیر

ہم نوا سب کا ہوں لیکن ہے نوا میری جدا
ہم صدا سب کا ہوں لیکن ہے صدا میری جدا

ساتھ ہوں سب کے مگر گم کردہ رہ ہوتا نہیں
اپنی منزل جانتا ہوں رہ گذر کھوتا نہیں

# میری بیوی

از جناب فضل حق قریشی دہلوی

*A happy union with wife is like the music of lutes and harps.*

"Confucius"

*Thy wife is a constitution of virtues; she is the moon, and thou art the man in the moon.*

"Congreve"

ایک شاعر نے کہا۔

"تم جانتے ہو عورت کیا چیز ہے! ــــــ ارض مجازی کا لاثانی شاہکار، قدرت کاملہ کی بہترین تخلیق، مئے حیات کا سرورِ جانفزا، کاشانۂ عبودیت کا فانوسِ اتقاء ــــ پیکرِ عصمت کا نقابِ حُسن، سفینۂ شباب کی ناخدا، بوستانِ خیال کا غنچۂ ناشگفتہ۔"

لیکن جس طرح فلسفیوں کے اصول عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں رکھتے، اسی طرح شاعر کے اقوال میں سوائے شوکت الفاظ کے دوسری چیز نظر نہیں آتی۔ وہ لغت کے بہترین الفاظ منتخب کرتا ہے اور مناسب ترکیب دے کر ایک قصیدہ عورت کی شان میں لکھ دیتا ہے۔ درانحالیکہ اگر اس کی معاشرتی زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ وہ عورت ذات کو دنیا کی بدترین مخلوق تصور کرتا ہے اور بجائے مئے حیات کا سرورِ جانفزا سمجھنے کے کوسِ اجل کی صدائے جانستاں جانتا ہے اور نہ صرف یہ بلکہ جب وہ اپنے ناقص جذبات سے مغلوب ہوتا ہے تو ہر جائز و ناجائز طریقے سے اس پیکرِ عصمت کا نقابِ حُسن اُلٹ دینے میں تامّل نہیں کرتا۔ جس کو اپنے شاعرانہ خیالات کی رَو میں کاشانۂ عبودیت کے فانوسِ اتقاء سے تشبیہ دے چکا ہے۔ اور اس طرح قدرتِ کاملہ کی وہ بہترین تخلیق بجائے ارضِ مجازی کا لاثانی شاہکار ہونے کے اس دارالمحن کی ناقص ترین مخلوق اور بجائے رفیقِ حیات ہونے کے وبالِ جان ثابت ہو جاتی ہے۔

ہمارے گھرانے میں بھی خدا کے فضل سے کئی شاعر موجود ہیں۔ اور اگر شاعر نہیں ہیں تو کم سے کم شاعر سمجھے ضرور جاتے ہیں۔ چچا جان کہتے ہیں کہ "عورت کی ہستی قابلِ پرستش ہے" مگر تعجب ہے کہ وہ چچی جان سے ہمیشہ کیوں بیزار رہتے ہیں؟ خالہ کو اپنی زندگی خالو جان کے ہاتھوں دوبھر نظر آتی ہے۔ ممانی صاحبہ بھی ماموں صاحب کے ظلم و ستم سہتے سہتے زندگی پر موت کو ترجیح دینے لگی ہیں۔

میں روزمرہ کے ان تمام واقعات کو دیکھتا ہوں اور غور کرتا ہوں کہ آخر عورت کی زندگی کا کیا مقصد ہو سکتا ہے؟ اور لوگ شادی کیوں کرتے ہیں؟ اگر وہ رشتۂ مناکحت قائم کر لینے کے بعد بھی صحیح معنوں میں مسرت حاصل نہیں کر سکتے تو خودکشی کر لینی بہتر ہے۔ لہٰذا چچا غالب کے بعض اشعار کی طرح یہ مسئلہ آج تک سمجھ میں نہیں آیا کہ لوگ ازدواجی زندگی کو مسرت و انبساط کا پیش خیمہ کیوں کہتے ہیں۔ جبکہ عملی طور پر دیکھا گیا ہے کہ شادی کرنے کے بعد روح کو سب سے زیادہ انقباض حاصل ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے میں نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ اپنی شادی نہیں کروں گا تاوقتیکہ اپنی شریکِ حیات کے ساتھ خوشی کی زندگی بسر کرنے کی صلاحیت اپنے اندر نہ پیدا کر لوں۔ مگر رشتہ داروں اور دوستوں نے ناک میں دم کر رکھا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ میں بھی اُن کی طرح بہت جلد اپنی انفرادی شخصیت کو خیرباد کہہ کر "واحد" سے "تثنیہ" کا صیغہ بن جاؤں اور اگر ان کی طرح زن مرید نہیں تو کم سے کم ایک عورت کے ہاتھوں اپنی خودی کو "نقشِ ونگارِ طاقِ نسیاں" بنا دوں۔ کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ شادی ہو جانے کے بعد ہر عورت یہ چاہتی ہے کہ میرا خاوند میرے بنائے ہوئے طریقہ کے مطابق عمل کرے، اور خواہ مرد کی مرضی نہ ہو۔ مگر ماما حوا کی نواسیاں اس کو اس قدر مجبور کر دیتی ہیں کہ وہ غریب گیہوں کھا کر جنت کے باہر آ جاتا ہے۔

---

ابھی میرا بچپن ہی تھا کہ والدہ نے مجھ کو اپنی ہمشیرزادی سے منسوب کر دیا۔ حالانکہ والد صاحب کا اصرار یہ تھا کہ میری شادی ان کے بھائی کی لڑکی سے ہو۔ بھائی صاحب چاہتے تھے کہ میرا رشتہ اُن کی چھوٹی سالی سے ہو جائے اور ہمشیرہ کا خیال تھا کہ ان کی چھوٹی نند زیادہ مناسب رہے گی۔ ایک دوست صاحب اپنی بہن کو ہماری لونڈی بنا دینے کا ارادہ رکھتے تھے۔ غرض یہ کہ ہر شخص ہمارے ساتھ ایک جدید رشتہ قائم کرنے کا آرزومند تھا۔

میرا عہدِ طفولیت گذر کر وہ زمانہ آ چکا تھا جبکہ انسان اپنے مستقبل کی بابت خود غور کرنے لگتا ہے۔ شادی کے چرچے اب بھی جاری تھے۔ مگر میں کسی ایک کی بات پر بھی کان نہیں دھرتا تھا۔ کیونکہ اپنے کنبہ کی تمام لڑکیاں خوب دیکھی بھالی تھیں اور اُن میں سے ایک بھی اس قابل نہیں تھی کہ میرے اس معیار پر پوری اُتر سکے جو میں نے اپنی شریکِ حیات کے متعلق قائم کر رکھا تھا۔ میں حسین و جمیل صورتوں پر فریفتہ ہوں مگر اس صفت کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دیتا کیونکہ یہ چیز جلد فنا ہو جاتی ہے۔ میں ان عورتوں سے بھی نفرت کرتا ہوں جو غازہ لگا کر مصنوعی حُسن سے مردوں کو دھوکہ دیتی ہیں۔ میں چاہتا تھا کہ بیوی تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ خانہ داری کے اصول سے کماحقہ واقف ہو۔ وہ اپنے ناز و انداز سے میری اقلیمِ دل کو فتح کرنے کی کوشش کرے، مگر اس میں تصنع اور بناوٹ نہ ہو۔ میں اس چیز سے بیزار ہوں۔ وہ فرمانبردار ہو گی۔ اپنی خودداری اور اپنے حقوق کو فراموش کرنا نہ جانتی ہو۔ رشتہ کی بہنیں کچھ بُری نہیں تھیں، مگر اس معیار کے مطابق

نہیں۔ کوئی نہایت حسین تھی، مگر تعلیم سے بے بہرہ۔ بعض تعلیم یافتہ تھیں مگر خانہ داری کے اصول سے ناواقف، نہایت بدسلیقہ۔ چنانچہ میری زندگی کی تیس بہاریں گذر چکی تھیں۔ اور پھر بھی میں مجرد تھا۔ میرے حلقۂ احباب میں تبسم اور نذیر ایسے دوست تھے جو اکثر شادی کی ترغیب دیتے رہتے تھے۔ مگر میں ہمیشہ یہ کہہ کر ٹال دیتا تھا کہ ابھی کیا جلدی ہے۔"

---

ایک روز کا ذکر ہے، میں دفتر سے واپس آکر بیٹھک میں بیٹھا "صنفیات" سے متعلق ایک کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا۔ کہ اتنے میں تبسم ایک اخبار ہاتھ میں لئے میرے پاس آیا۔ وہ متبسم تھا اور مسرت اسکے چہرے پر رقص کر رہی تھی، وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ پھر اخبار کو میری جانب بڑھاتے ہوئے ایک اشتہار کی طرف اشارہ کیا جس کو سرخ پنسل سے محصور کر دیا تھا۔

پہلے تو میں نے یہ سوچا کہ اس قسم کے سینکڑوں اشتہار روزانہ شایع ہوتے ہیں اور میں اس کو نظر انداز کر دینا چاہتا تھا۔ مگر پھر خیال آیا۔ کہ اس میں ضرور کوئی خاص بات قابل توجہ ہے۔ ورنہ تبسم اس کو لیکر میرے پاس کیوں آتا۔ اشتہار کا عنوان تھا "شادی کی ضرورت" جو ایک بیرسٹر صاحب نے اپنی دختر کی بابت شائع کرایا تھا۔ میں نے اس کو خوب غور سے پڑھا۔ میں نہیں بتا سکتا کہ اس وقت میری کیا حالت تھی۔ جی بیٹھنے لگا تھا۔ اور خواہ مخواہ ایک قسم کی خلش دل میں پیدا ہو گئی تھی۔ بیرسٹر صاحب کو اپنی صاحبزادی کے لئے ایک ایسے شریف نوجوان کی ضرورت تھی جو خوب تعلیم یافتہ ہو اور برسر روزگار ہو۔ انہوں نے یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ لڑکی انٹرنس پاس ہے۔ کافی جائداد کی مالک ہے۔ اور خانہ داری کے اصول سے واقف ہونے کے علاوہ نہایت ہنرمند ہے۔ طلب کرنے پر لڑکی کا فوٹو بھیجا جا سکتا ہے۔ امیدواران شادی کو بھی رقعہ کے ساتھ اسناد اور فوٹو روانہ کرنیکی ہدایت کی گئی تھی۔

پہلے تو میں بہت متعجب ہوا۔ کیونکہ یہ اپنی نوعیت کی پہلی چیز تھی جو میری نظر سے گذری۔ اس وقت تک تمام اشتہار ایسے پڑھتے تھے جو لڑکے والوں کی طرف سے ہوتے تھے اور لڑکی کی تلاش ہوتی تھی۔ مگر یہاں رنگ دوسرا تھا کہ اشتہار خود لڑکی کے باپ نے دیا تھا۔ اور اس کے لئے خاوند کی ضرورت تھی۔ تاہم میں اس خیال سے خاموش ہو گیا کہ اب لوگوں میں سے پرانے زمانے کی کورانہ ذہنیت نکلتی جا رہی ہے اور بیداری کا دور دورہ شروع ہو گیا ہے۔ ایسی صورت میں لڑکی کے باپ کا دعوتِ مناکحت دینا کچھ بُری بات نہیں تھی۔ کیونکہ اس کو نہ مذہبی نقطۂ نگاہ سے ناجائز کہا جا سکتا ہے نہ اخلاقی زاویہ نظر سے معیوب، صرف اتنی بات ہے کہ خلاف رسوم ہونے کے باعث ایک نئی چیز ضرور سمجھی جاتی ہے۔

"میں دو مرتبہ اشتہار پڑھ چکا تھا۔" تبسم نے کہا۔

"اس سے اچھا رشتہ ملنا مشکل ہے۔ میں بیرسٹر صاحب سے ذاتی طور پر متعارف ہوں۔ میرٹھ

میں میرے گھر سے کچھ فاصلہ پر ان کی کوٹھی ہے، نہایت باوضع اور منکسر آدمی ہیں۔ تم اللہ کا نام لیکر رقعہ روانہ کر دو۔ آخر کب تک تنہا زندگی بسر کئے جاؤ گے؟"

میں ابھی کوئی جواب بھی نہ دینے پایا تھا کہ نذیر صاحب آدھمکے اور اشتہار کا مطالعہ کرنے کے بعد شمیم کی تائید کرنے لگے۔ میں عجیب کشمکش و پیچ میں تھا کہ کیا کروں۔ پھر یہ بات میں ایک زبردست تلاطم برپا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ اس وقت کوئی کافر ادا حسینہ سامنے آجائے، میں اس کے قدموں پر اپنا سر رکھدوں اور دل کھول کر اس قدر آنسو بہاؤں کہ اشکوں کا ایک سیلاب پیدا ہو جائے۔ ایک ایسا سیلاب جس کے ورطۂ اضطراب میں اپنی ہستی کو ہمیشہ کے لئے گم کر دوں ــــ آہ! صنفِ نازک کا تصور بھی کس قدر دلآویز ہے، جتنا اس سے اجتناب کرنا چاہو، اتنا ہی زیادہ اس کا سکہ دل پر بیٹھتا جاتا ہے۔

"کس سوچ میں پڑ گئے؟"

شمیم کے غیر متوقع جملے نے میری محویت کے طلسم کو توڑ دیا اور میرے وہ آنسو جو نوک پلک تک ڈھلک آئے تھے آنکھوں میں واپس جاکر آئندہ نکلنے کی آرزو میں جذب ہو گئے۔

"ہوں!" میں نے جواب دیا "بیشک اب میں نے بھی ارادہ کر لیا ہے کہ بہت جلد شادی کر ڈالوں اور اگر چہ کوئی معقول وجہ نہیں بتائی جا سکتی تاہم میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ ان بیرسٹر صاحب کی صاحبزادی میرے مقررہ معیار کے مطابق رہینگی۔ مگر بھائی شمیم! اس معاملہ میں تمہاری امداد کی بہت ضرورت ہوگی۔ کیونکہ تمہارا دولت خانہ بھی میرٹھ میں ہے"

"خاطر جمع رکھو" شمیم نے جواب دیا "میں ہر طرح مدد کرنے کے لئے تیار ہوں، بلکہ اگر ممکن ہوا تو بیرسٹر صاحب کو راضی کر لوں گا کہ وہ شادی سے قبل کچھ دیر کے لئے اپنی دختر کو تمہارے سامنے کر دیں تاکہ تم دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح دیکھ لو۔ کیونکہ ازدواجی زندگی اسی وقت نہایت خوشگوار اور پر لطف ہو سکتی ہے، جبکہ رشتۂ مناکحت طرفین کی پسند کے مطابق کیا جائے"

"بہت خوب" میں نے خوش ہو کر کہا "اگر یہ ممکن ہو سکے تو نہایت اچھی بات ہے ــــ اچھا میں اس بات کا تذکرہ والدہ صاحبہ سے کر دوں کیونکہ ان کے مشورے کی نہایت ضرورت ہے۔ وہ بزرگ ہیں"

---

میں اپنے دوستوں سے چند منٹ کی اجازت لے کر زنانخانہ میں گیا۔ والدہ صاحبہ خدا معلوم کس ادھیڑ بن میں سر جھکائے خاموش بیٹھی تھیں۔ میرے پاؤں کی چاپ سے ایک دم اچھل پڑیں میں قریب جاکر بیٹھ گیا۔ اور اخبار کے اشتہار کا مفصل مضمون اور اپنے دوستوں کی رائے ان کے گوش گذار کر دی۔ یہ سن کر کہ میں بھی شادی کرنے کے لئے آمادہ ہو گیا ہوں۔ ان کے دل کا کنول کھل گیا۔ انہوں نے خوش ہو کر مجھے دعائیں دیں اور سب کام میری مرضی پر چھوڑ دئے۔

ان سے اجازت لیکر میں واپس بیٹھک میں گیا اور اپنے دوستوں کو مطلع کر دیا کہ والدہ رضامند ہیں۔ انہوں نے بھی اظہار مسرت کیا اور شمیم نے زور دیا کہ رقعہ بہت جلد روانہ کر دیا جائے۔ تاکہ مجھ سے پہلے کسی اور کو منتخب نہ کر لیا جائے۔ رقعہ کا مضمون تیار کرنے سے قبل اپنی تصویر کھچوانی اور مختلف ذمہ دار ہستیوں سے اسناد حاصل کرنی لازمی تھیں۔ کیونکہ اُن کو رقعہ کے ساتھ منسلک کرنے کی ہدایت کی گئی تھی۔

بقول حضرت غالب ؎

ہے خبر گرم ان کے آنے کی آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

یوں تو میرے پاس کئی سوٹ نہایت اعلیٰ رہا کرتے تھے۔ مگر اتفاق سے اس وقت ایک بھی اس لایق نہیں تھا کہ اس کو پہن کر تصویر اتروا لی جاتی۔ مجبوراً شمیم کا ایک نفیس سوٹ مستعار لیا اور ٹائی اور کالر نذیر سے مانگا۔

لباس کا انتظام تو اس طرح ہو گیا مگر اب ایک مشکل اور درپیش تھی۔ چہرا کس سے لیا جائے۔ اللہ کے حکم سے ہماری صورت کسی ایسے سانچے میں ڈھلی تھی جو کسی اناڑی فرشتے کے ہاتھوں تیار ہوا تھا۔ تمام نقش و نگار میں ایک چیز بھی اس قابل نہ تھی کہ اس کو اچھا کہا جا سکتا۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور اندر کو دھنسی ہوئی۔ چکی کے پاٹ کی مانند گول چہرے پر ایک موٹی بیٹھی ناک۔ گویا کسی نے نہایت بدسلیقگی کے ساتھ مصالحہ پیسنے کی سِل پر کھرل کی موصلی لٹا کر کھڑی ہے۔ اوپر کا ہونٹ بہت پتلا اور نیچے کا غیر معمولی طور پر نہایت موٹا۔ گویا ڈھاک کے پتے کے ساتھ گلاب کی پتی کو وصل کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ تمام چہرے پر چیچک کے داغ اس قدر موجود ہیں کہ بقول شخصے تمام جلد ایک نقشین کٹورہ معلوم ہوتی تھی۔ چنانچہ جب تصویر تیار ہو کر آئی تو اپنی بیکسی اور قدرت کی ستم ظریفی پر بہت غصہ آیا اور ساتھ ہی غالب کا یہ شعر یاد آ گیا کہ ؎

چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسدؔ
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیئے

عظیم بیگ چغتائی نے اپنے ایک افسانے میں نہایت معقول بات لکھی ہے کہ "خدا غلام بنائے مگر غلام صورت نہ بنائے"۔

ہماری افسردگی سے شمیم کو بھی صدمہ ہوا اور اس نے دلاسا دیتے ہوئے کہا "دوست فکر نہ کرو اس تصویر کو چولھے میں جھونکو اور میرے چھوٹے بھائی کا فوٹو جو نہایت دلکش معلوم ہوتا ہے —— رقعہ کے ہمراہ روانہ کر دو۔ بعد میں اگر پتہ بھی چل گیا تو کیا ہوتا ہے"۔

---

رائے نہایت صائب تھی، اور اس کے سوا چارہ بھی کیا تھا۔ لہذا یہ طے پا گیا کہ فوٹو شمیم کے

چھوٹے بھائی کا روانہ کر دیا جائے گا۔ اس کے بعد چند سندیں حاصل کرنی تھیں، لہذا کالج کے پرنسپل کے پاس گئے اور تمام حال بیان کر کے سارٹیفکٹ طلب کیا۔ وہ نہایت شریف آدمی تھے۔ فوراً ہماری مرضی کے مطابق ذیل کی سطور تحریر کر دیں:-

"میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر تصدیق کرتا ہوں کہ مسمی ۔۔۔۔۔۔ کے چال چلن جہاں تک میرے علم کا تعلق ہے سو فی صدی بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ اعلیٰ افضل ہے۔ اس نے چار سال تک میری نگرانی میں تعلیم حاصل کی اور اس دوران میں اپنے اوصاف حمیدہ اور اطوار پسندیدہ سے تمام اساتذہ سے خراجِ تحسین حاصل کیے۔ ابتدا میں اس کا خیال تھا کہ عورت اس دنیا کی بدترین تخلیق اور تمام مصائب و آلام کی علت ہے۔ مگر اب اس کے خیالات نہایت پاکیزہ ہو گئے ہیں۔ اور پرستش کی حد تک صنفِ نازک کی قدر کرنے لگا ہے۔ مجھے یہ سُنکر خوشی ہوئی کہ اس نے شادی کرنے کا ارادہ کر لیا ہے اور اسی مقصد کے لیے یہ سند درکار ہے۔ لہذا میں نہایت پر زور الفاظ میں یقین دلاتا ہوں کہ یہ ہر دو شخص مستحق مبارکباد ہے جو اپنی صاحبزادی کو اس کی زوجیت میں دینا منظور کر لے۔"

اس کے بعد نذیر کی تجویز پر ایک ڈاکٹری سارٹیفکٹ بھی حاصل کر لیا۔ کیونکہ جب ملازمت کرنے کے لئے اسکی ضرورت محسوس ہونے لگی ہے، اور دفاتر کے حکامِ بالا کو جب تک وہ امیدوار کی قوتِ جسمانی اور اعصابی کیفیت معلوم نہ کر لیں چین نہیں آتا ہے، تو شادی کے سلسلہ میں تو اس سند کی ضرورت زیادہ ہونی چاہیے۔ کیونکہ ۵۵ سال کی عمر ہو جانیکے بعد بھی بیوی کو خاوند کے ساتھ اور خاوند کو بیوی کے ساتھ گذارہ کرنا پڑتا ہے، اور شریفوں میں یہ دستور نہیں ہے کہ قبل از وقت ریٹائر ہو جائیں یا استعفےٰ پیش کر دیں۔ چونکہ ڈاکٹر اشرف مجھ سے اچھی طرح واقف تھے اور اس کے علاوہ میں نے بجائے پانچ روپے کے دس روپے فیس دی تھی، اس لئے انہوں نے بھی نہایت اچھے الفاظ میں تصدیق کی:-

"مسمی ۔۔۔ کے خاندان کے تمام رکن ہمیشہ میرے زیرِ علاج رہتے ہیں۔ اس لئے میں ان کو بخوبی واقف ہوں۔ موصوف کے والدِ مرحوم کو بواسیر تھی۔ خالو تپِ دق میں مبتلا تھے۔ چچا کو ہر سال نمونیہ ہو جاتا تھا اور اسی مرض میں انتقال کیا۔ ماموں کو گٹھیا کی بیماری ہے اور قریب المرگ معلوم ہوتے ہیں۔ نانا سودائی تھے اور دادا پر فالج گرا تھا۔ مگر مسمی ۔۔۔۔ آج کل کا خراب و ناسپتی گھی کھانے کے باوجود کسی مرض میں مبتلا نہیں ہے۔ اور موجودہ صحتِ جسمانی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کسی مہلک مرض کا اس پر اثر بھی نہیں ہوگا۔ خون نہایت صالح ہے۔ وزن تقریباً ۱/۲ ۱ سو پونڈ اور سینہ کا محیط ۳۴ انچ ہے۔ جمناسٹک کا شوق ہونے کے باعث اعضاء نہایت خوبصورت اور فطرت میں چستی و چالاکی بہت زیادہ ہے۔ عمر تخمیناً تیس سال ہوگی مگر ظاہری طور پر اٹھارہ سے بھی کم معلوم

ہوتی ہے۔ البتہ ایک نقص ہے اور وہ یہ کہ دنیا ئے شاعری میں رہنے کے باعث تخیلی معشوق کی ہر ناز و ادا پر دن میں پانچ چھ مرتبہ مرتا ہے اور اس کے اعجازِ مسیحائی سے زندہ ہو جاتا ہے۔ مگر پھر بھی عالمِ شباب قابلِ رشک ہے۔ اس لئے یقیناً وہ خاتون دلی مبارکباد کی مستحق ہے جو اس جیسے نوجوان کی شریکِ حیات بنے۔"

ان کے علاوہ امام جامع مسجد، دفتر کے افسرِ اعلیٰ، محکمۂ پولیس کے انسپکٹر، محلہ کے چوکیدار اور دیگر معزز ہستیوں کی اسناد حاصل کرلیں۔ جن کی تفصیل اس جگہ پیش کرنی زیادہ مناسب نہیں ہے۔ صرف مختصراً عرض کر دینا کافی ہے۔

امام صاحب نے لکھا تھا کہ "اس شخص کے زہد و اتقار کی بابت صرف اس قدر کہا جا سکتا ہے کہ اس نے کبھی کسی نمازی کی جوتیاں نہیں چرائیں اور نہ مسجد کی کوئی بدھنی توڑی جس سے میں یہ نتیجہ نکال سکتا ہوں کہ یہ اور لوگوں کی طرح اپنی بیوی کا زیور بیچ کر روپیہ فضول خرچی میں برباد نہیں کرے گا۔"

دفتر کے سپرنٹنڈنٹ نے لکھا تھا کہ "بابو ــــ میں سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ تمام مہینہ ختم ہو جانے کے باوجود کبھی تنخواہ طلب نہیں کرتا، اور اگر وصول بھی کرتا ہے تو اُسی دن مٹھائی منگا کر تمام عملہ میں تقسیم کر دیتا ہے۔ اسی وجہ سے تمام بابو اس کو اس قدر فیاض اور ہمدرد دیکھ کر حاتمِ ثانی کے خطاب سے یاد کرتے ہیں۔"

انسپکٹر پولیس نے لکھا تھا کہ "ــــ کے تمام رشتہ دار کسی نہ کسی جرم میں گرفتار کئے گئے جن پر عدالت نے خوب جرمانے کئے یا انہوں نے قید بامشقت برداشت کی مگر یہ اپنی ذات سے اس قدر شریف ہے کہ عدالت کے کمرے میں بُلانا تو درکنار آج تک کسی جج نے اسکی شکل بھی نہیں دیکھی۔"

چوکیدار کا بیان تھا کہ "ــــ صاحب کسی آوارگی میں نہیں ہیں۔ دفتر سے پانچ بجے واپس آنیکے بعد صبح تک گھر سے نہیں نکلتے۔ میں نے ان کو کسی سنیما، بائسکوپ یا قمار خانے میں جاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اگرچہ محلہ کے تمام لوگ دس نمبر کے بدمعاش ہیں اور رات کے بارہ بجے اُن سب پر آواز پڑتی ہے۔ مگر یہ نہایت معصوم زندگی بسر کرتے ہیں۔"

---

ان مراحل سے فارغ ہو کر رقعہ کا مسودہ لکھنا شروع کیا۔ رات کے بارہ بجے تک تین دماغ متواتر کام کرتے رہے۔ اس امر کی کوشش کی گئی کہ عبارت میں فصاحت و بلاغت کے پورے جوہر دکھائے جائیں۔ شوکتِ الفاظ اور جملوں کی ترکیب اس قدر چست ہو کہ پڑھنے والے کے دل کو موہ لے۔ چنانچہ جب تک وہ تیار نہ ہوا کسی ایک نے بھی آرام کرنا گوارا نہ کیا۔ مناسب القاب وغیرہ کے بعد اصل نفسِ مضمون حسبِ ذیل تھا۔

"روزنامہ انقلاب مورخہ ـــــ کا تازہ پرچہ پیش نظر ہے۔ یہ معلوم کرنے کے بعد کہ جناب کو اپنی دختر بلند اختر طول عمرہ کے لئے ایک خوبصورت اور تعلیم یافتہ نوجوان کی ضرورت ہے۔ میں بصد ادب و احترام اپنی ناچیز ہستی کو آپ کے حضور میں پیش کرتا ہوں اور اُمیدوار ہوں کہ جناب اپنی عنایاتِ "بیرسٹرانہ" سے کام لیتے ہوئے اس احقر کو اپنے حبالۂ "وکالت" میں جگہ دے کر ایک ذرہ خاک کو رشکِ بدرِ منیر بنا دیں گے اور یہ آپ کی "داماد پروری" کا بہت بڑا ثبوت ہوگا۔

شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدا را

اپنی علمی قابلیت اور استعداد کے سلسلہ میں صرف اس قدر عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ بندہ نے فی الحال ایم۔ اے تک تعلیم حاصل کی ہے۔ بی۔ اے فیل ہوں اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لینے کا ارادہ ہے۔ تاکہ کسی کالج کا پرنسپل اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو کم سے کم کسی یونیورسٹی کا چانسلر بن جاؤں۔ طبیعت کا رجحان بیرسٹری کی طرف بھی ہے۔ ہائی کورٹ کا چیف جسٹس بننے کی تمنا دل میں ہے۔ عزیز و اقارب آئی۔ سی۔ ایس کی تیاری کرنے کے لئے زور دے رہے ہیں۔ والد صاحب نے انتقال کے وقت وصیت کی تھی کہ ڈائریکٹر تعلیم کا عہدہ حاصل کرنے کے لئے انتہائی کوشش کر لینا۔ اس لئے یہ خیال بھی پیش نظر ہے۔ والدہ صاحبہ کا اصرار ہے کہ اگر درگاہ شریف سید حسن کے سجادہ نشین نہ بنے تو قیامت تک دودھ معاف نہیں کروں گی۔ فی الحال کمیٹی کے دفتر میں مبلغ ۱۰ روپے ماہوار کے مشاہرہ پر ملازم ہوں۔ کچھ اوپر کی آمدنی بھی ہو جاتی ہے۔ اس محکمہ میں کافی ترقی کی اُمید ہے۔ ذرا کوشش کی تو مبلغ ۰ ۵ روپے ماہوار ہو جانے کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ اس کے علاوہ مضمون نگاری بھی کرتا ہوں اور چونکہ اس سے کوئی آمدنی نہیں ہوتی۔ اس لئے اپنے اس انہماک کو اردو ادب کی خدمت قرار دیتا ہوں۔ غالب کے دیوان میں سے خیالات چرائے بغیر کچھ شعر بھی موضوع کر لیتا ہوں۔ روپیہ نہ ہونے کے باعث مجبور ہوں ورنہ اب تک کئی کتابیں دائرہ وجود میں آ جاتیں۔ یادداشت اس قدر تیز ہے کہ اب سے دس بارہ ہزار سال پہلے کی باتیں طوطے کی طرح ازبر ہیں۔ ہر سوال کا جواب نوکِ زبان پر رہتا ہے حافظہ پر زور دئے بغیر بتا سکتا ہوں کہ شیطان نے حضرتِ آدم کو کس سنِ عیسوی میں بہکایا تھا؟ جب نوح کا طوفان آیا ہے تو ہندوستان میں خاندانِ مغلیہ کے کونسے بادشاہ کی حکومت تھی؟ ارسطو نے سقراط کو کس جرم میں زہر کا پیالہ پیش کیا تھا؟ وغیرہ وغیرہ۔

خاندانی اعزاز کے ضمن میں یہ عرض کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ میرے تمام رشتہ دار سرکارِ انگریزی کے وظیفہ خوار رہے ہیں۔ جنگِ عظیم کے زمانے میں میدانِ کارزار سے بھاگ جانے کے باعث تمام دنیا میں ان کی عزت ہوتی ہے۔ میرا شجرۂ نسب اکتالیسویں پشت میں

اس اولوالعظم ہستی سے ملتا ہے جس کی شہرت چار دانگ عالم میں مچی ہوئی ہے۔ اور کسی مزید تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ ماموں نقشہ نویس ہیں۔ پاپا ریلوے کے گارڈ تھے، اور چھوٹے بھوئی موٹر ڈرائیوری کرتے ہیں۔ ذاتی طور پر کافی جائداد کا مالک ہوں جو آج کل ایک مہاجن کے پاس رہن رکھی ہوتی ہے۔ شادی ہوجانے کے بعد اس کو چھڑا لینے کا ارادہ ہے۔ اور قبلہ ماموں صاحب کے انتقال کے بعد اُن کے تمام مکانات و اراضیات کا واحد وارث آپ کا یہی غلام ہوگا

اس وقت میری عمر والدین کے قول کے مطابق بائیس ۲۲ سال ہے طبی تشخیص کے لحاظ سے تیئس ۲۳ سال ہے۔ کالج کے رجسٹر میں چھبیس ۲۶ سال درج ہے۔ بظاہر اٹھارہ ۱۸ سال کا معلوم ہوتا ہوں۔ دوستوں کا اندازہ چوبیس ۲۴ سال ہے۔ حالانکہ درحقیقت میری پیدائش ۱۹۰۵ء کی ہے، جس کے حساب سے عمر ستائیس ۲۷ سال ہوتی ہے۔ حسنِ ظاہری اور قوتِ جسمانی کا اندازہ منسلکہ فوٹو سے لگایا جاسکتا ہے۔ صحت نہایت اعلیٰ ہے اور ڈاکٹر کے بیان کے مطابق میرا عہدِ شباب قابلِ رشک ہے۔

اگر میری عرضداشت پر غور و خوص کرنے کے بعد میرے حق میں مسرت بخش فیصلہ کیا گیا اور جناب نے اپنی صاحبزادی کا گوہرِ حیات میرے رشتۂ زندگی میں منسلک کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا تو میں مدینۃ الاسرار کی منہدم جامع مسجد اپنے ہاتھوں پہ اُٹھا کر قسم کھاتا ہوں کہ ہمیشہ آپ کا تابعدار اور آپ کی دخترِ بلند اختر کا فرمانبردار رہوں گا اور اس کے گلشنِ حسن و جمال میں افلاطون کی ہدایت کے مطابق گل چینی کیا کروں گا اور اگر نخواستہ آپ نے میری آرزوؤں کو پامال کردیا تو یاد رکھئے کہ میری آتشِ انتقام صرف آپ کا خون بہانے سے سرد ہوسکے گی۔

حسب الحکم چند اسناد کی نقول اور ایک فوٹو کی کاپی رقعہ ہذا کے ہمراہ منسلک ہے۔ اس کے علاوہ بندے کا چال چلن اور حسب و نسب جہاں چاہیں دریافت کرلیں اور بندہ کو اپنی دامادی میں قبول کرلیں۔

مسرت بخش جواب کا منتظر ـــــ اور شرفِ نیاز حاصل کرنے کا متمنی

احقر.........

جمعہ کے مبارک دن ایک نیک ساعت میں رقعہ وغیرہ کے تمام کاغذات روحِ گلاب میں معطر کر کے لفافے میں بند کئے اور وہ پتہ جو اشتہار میں درج تھا مشک و عنبر سے تحریر کرکے اپنے نوشتۂ تقدیر کو سپردِ ڈاک کردیا۔

---

ایک وہ دن تھے جب کہ شادی کی آرزو ہی دل میں پیدا نہ ہوتی تھی، یا اب یہ حال تھا کہ دوسرے ہی روز سے جواب کا انتظار ہونے لگا۔ چٹھی رساں کو دو روپے پیشگی انعام دے کر اچھی طرح ہدایت کردی کہ ہمارا ایک

خط میرٹھ سے آنے والا ہے۔ اس کو فوری تار تصور کرنا اور بلا تاخیر یہاں پہونچا دینا۔ اگر دیر ہوئی تو تمہاری رپورٹ کردی جائے گی۔" اور دوسرے ہی روز سے ہم تینوں دوست بیٹھک میں لیٹے خط کا انتظار کرنے لگے۔ دفتر سے پانچ روز کی چھٹی لے لی تھی۔ کیونکہ کسی اور کام کاج کو جی ہی نہ چاہتا تھا۔ بس یہ حال تھا کہ جہاں آہٹ ہوئی اور میں نہایت بے تابی سے دوڑا کہ شاید چٹھی رساں آیا ہے مگر ہر بار مایوس ہونا پڑتا تھا۔ آخر چوتھے روز ایک دبیز لفافہ وصول ہوا۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس کو کھولا مگر ——— اف! ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس کے اندر سے رقعہ مع چند اسناد اور ایک عدد فوٹو کے برآمد ہوا۔ تاہم وہ میری بھیجی ہوئی نہیں تھیں بلکہ کسی اور ذاتِ شریف کی تھیں۔ جو کچہری میں پندرہ روپے ماہوار پر ملازم تھے۔ مڈل فیل تھے۔ اور ان کے خاندان کے بعض افراد تجارت پیشہ تھے۔ اور بعض جلد سازی اور بڑھئی کا کام کرتے تھے۔ ان کا فوٹو اس قدر ذلیل تھا کہ اگر قارئین اس کو خود نمائی نہ سمجھیں تو میں یہ کہنے کے لئے مجبور ہوں کہ میری تصویر ان سے لاکھ درجے بہتر تھی۔ اور میں ان کے مقابلے میں نہایت حسین اور خوبصورت معلوم ہوتا تھا۔

ان کے علاوہ بیرسٹر صاحب کی قلم سے تحریر کردہ ایک مختصر پرچہ تھا۔ انہوں نے لکھا تھا۔

"آپ کا رقعہ مسترد کرکے واپس کیا جاتا ہے۔ آیندہ آپ ایسی جرأت بھی نہ کریں۔ ٹاٹ کا پیوند ٹاٹ ہی میں زیب دیتا ہے۔ پندرہ روپے ماہوار پر میری لڑکی کی خدمت کے لئے کئی کنیزیں ملازم ہیں، آپ کو قبول نہیں کیا جاسکتا۔ لہذا اس خیالِ خام کو اپنے دل و دماغ سے نکال دیجئے۔"

میں غصہ سے بیتاب تھا اور شمیم مسکرا رہا تھا۔

"بڑی غلط فہمی ہوئی" شمیم نے ہنستے ہوئے کہا "کسی اور کا رقعہ تمہارے پتہ پر واپس کردیا گیا ہے۔ اور خدا معلوم تمہارے رقعہ کا کیا حشر ہوا۔ اب صرف یہی تدبیر ہوسکتی ہے کہ تمام کاغذات کی دوسری نقل اور فوٹو کی دوسری کاپی روانہ کردی جائے۔ اگر قسمت نے یاوری کی تو کامیابی ہو جائیگی۔"

[illegible] نے معقول تھی، میری بھی سمجھ میں آگئی۔ لہذا بہت جلد دوسری نقلیں تیار کرکے روانہ کردیں [illegible] ان کے ساتھ وہ رقعہ اور فوٹو بھی واپس کردیا جو میرے پاس آیا تھا۔ رقعہ کے نیچے بطور نوٹ یہ بھی لکھ [illegible] یہ درخواست مکرر روانہ کی جارہی ہے۔"

---

[illegible] سے [illegible] شمیم بھی میرٹھ چلا گیا تاکہ بیرسٹر صاحب سے مل کر میری سفارش کرے۔

[illegible] اور [illegible] جواب کا انتظار کرنے لگے۔ شمیم کے جانے کے تیسرے ہی روز کا ذکر ہے کہ [illegible] شمیم نے فوراً میرٹھ بلایا تھا۔ اور کامیابی کی امید دلائی تھی۔ میرا دل خوشی سے باغ باغ ہوگیا [illegible] شروع کردی۔ زیادہ سامان لینا فضول تھا۔ صرف ایک سوٹ کیس اور چھڑی پر اکتفا [illegible] میرے ساتھ تھا۔

جب میرٹھ کے اسٹیشن پر گاڑی پہونچی تو تسنیم ہمارا منتظر تھا میں نے بے تابی سے استفسار کیا اور اس نے مختصر الفاظ میں بیرسٹر صاحب کے خیالات اور ان کا انقطاعی فیصلہ میرے گوشگذار کر دیا انہوں نے مجھ کو اپنی دامادی میں قبول کر لیا تھا۔

اسی روز شام کو بیرسٹر صاحب نے اپنی کوٹھی پر ہم تینوں کو چائے پینے کے لئے مدعو کیا میرے دل کی عجیب کیفیت تھی۔ گویا بغیر پئے مدہوش ہو رہا تھا۔ اور کسی غیر مرئی طاقت نے میری روح میں ایک ارتعاشِ عظیم پیدا کر دیا تھا۔ زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ میری جبینِ نیاز کسی کے نقشِ پا کی تلاش میں بے چین تھی۔

شاید ایک گھنٹہ میں تسنیم نے خوب کریم اور پاؤڈر وغیرہ لگا کر میرے چہرے کو آدمی جیسا بنایا۔ اور اپنا نفیس سوٹ پیش کیا جس کو پہن کر ہم نہایت ٹھاٹھ کے ساتھ اپنی ہونے والی بیوی کے دولتکدہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

کوٹھی نہایت شاندار تھی۔ چاروں طرف چمن لگا ہوا تھا۔ اور بیچ میں سفید عمارت تھی، گویا زمرد کی انگوٹھی میں ہیرا جڑا ہوا تھا۔ ملازم کے ہاتھ کارڈ بھیجکر ہم ملاقاتی کمرے میں بیٹھ گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں فیروزی رنگ کا سوٹ زیب تن کئے، بیرسٹر صاحب تشریف لے آئے۔ نہایت خلوص کے ساتھ مصافحہ کیا اور ایک دوسرے کمرے میں لے گئے۔ جو اس سے زیادہ شاندار اور پُر تکلف تھا۔ آرام دہ گدیلوں کی کرسیاں اور صوفے بچھے ہوئے تھے ہم سب بیٹھ گئے اور کچھ دیر نہایت دلچسپ گفتگو ہوتی رہی۔

اس کے بعد چار کی غرض سے ہمیں کھانے کے کمرے میں جانا پڑا۔ اس کی تفصیل کہ وہاں کیا کیا نعمت ہائے غیر مترقبہ ہمارے سامنے پیش کی گئیں، طوالت کے خوف سے نظر انداز کر دی جاتی ہیں تاہم جب ہم دوبارہ آرام کمرہ میں واپس آرہے تھے۔ تو تسنیم نے شاید بیرسٹر صاحب کے ایما پر مجھ سے دریافت کیا۔

"اگر تم اپنی منسوبہ سے نیاز حاصل کرنا چاہو تو اس وقت بلا تکلف بتادو کبھی بعد میں پچھتاؤ"

اندھا کیا چاہے۔ دو آنکھیں۔ میں نے فوراً رضامندی ظاہر کر دی، کیونکہ یہ بات میری عین آرزو کے مطابق تھی۔ چنانچہ تسنیم نے بیرسٹر صاحب سے چند لمحے سرگوشی کی اور وہ اٹھ کر چلے گئے پھر تھوڑی دیر بعد واپس آگئے اور وہی کانا پھوسی ہونے لگی۔ آخر تسنیم نے مجھے ہدایت کی کہ میں بلا روک ٹوک دائیں جانب کھلنے والے دروازے سے دوسرے کمرے میں چلا جاؤں، جہاں بیرسٹر صاحب کی صاحبزادی موجود ہیں۔

---

میں نے دروازے پر لٹکنے والے مخملیں پردے کو جنبش دی اور مضطرب دل کے ساتھ دوسرے کمرے میں داخل ہو گیا۔ غروب ہونے والے سورج کی الوداعی شعاعیں کھڑکی کے ریشمیں پردوں میں سے چھن چھنکر

اندر آ رہی تھیں اور میرے تمام تواں پر صبح بہار کے وقت دکھائی دینے والے پُرکیف خواب کی سی خود فراموش محویت طاری تھی۔

میں نے دیکھا —— ہاں مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ میں نے دیکھا کہ تاریک بادلوں میں سے چاند نکل رہا ہے۔ ایک بجلی سی میری آنکھوں کے سامنے کوند گئی —— وہ سیاہ اطلس کی پوشاک میں ملبوس ایک کرسی پر بیٹھی تھی۔ مجھے آتا دیکھ کر کھڑی ہوگئی۔ خاموش تکلم کے ساتھ صرف دستِ نازک کی جنبش سے سلام کیا، اور اس کی محجوب نگاہیں زمین کا جائزہ لینے لگیں۔ شاید اس میں کشش تھی۔ میں بالکل غیر ارادی طور پر اس کے قریب پہونچ گیا۔ اس نے کرسی پیش کرتے ہوئے کہا "تشریف رکھئے" اور اس کی آواز کے ساتھ کمرے کی تمام فضا دلفریب نغموں سے معمور ہوگئی۔ میں حیران تھا کہ سلسلۂ کلام کس طرح شروع کیا جائے۔ تاہم چند لمحے سوچنے کے بعد میں اپنی کشمکش میں کامیاب ہوگیا۔ میں نے کہا "آپ سے غائبانہ تعارف حاصل ہو چکا ہے مگر اسم گرامی سے ہنوز گوش ناآشنا ہیں"

شاید اس کے لبوں کو جنبش ہوئی کیونکہ میں نے سُنا "مجھے سہیل بہن کہتے ہیں"

میں "شکریہ! ....... آپ کو یقیناً اس بات کا علم ہوگیا ہوگا کہ ہماری اس ملاقات کا مقصد کیا ہے؟"

وہ "جی ہاں! میں نے آپ کا رقعہ اور فوٹو دیکھا تھا" وہ شرما گئی) اس کے علاوہ ابھی ابھی والد صاحب نے جناب کی تشریف آوری کی خبر دی تھی۔ اور یہ بھی فرمایا تھا کہ آپ مجھ کو شرفِ ملاقات بخشنا چاہتے ہیں"

میں "بہت خوب! اچھا اب میں چند باتیں دریافت کرنا چاہتا ہوں"

وہ "فرمائیے کیا ارشاد ہے"

میں "آپ شادی کے سلسلہ میں اپنے انتخاب کو بہتر تصور کریں گی یا والد صاحب کی رائے کو ترجیح دیں گی"

وہ "والدین کے احکام کی تعمیل میرا فرض ہے، اس لئے ان کی رائے کو ترجیح دینا لازمی ہے۔ تاہم مجھے یقین کامل ہے کہ میرے والد بزرگوار کوئی امر میری مرضی کے خلاف نہیں کریں گے"

میں "اچھا اگر آپ سے کوئی دریافت کرے کہ میرے متعلق آپ نے کیا فیصلہ صادر فرمایا تو آپ کا جواب کیا ہوگا؟"

سہیل بہن نے میرے اس سوال پر شرما کر گردن جھکالی اور میں نے دیکھا کہ اس کی محجوب نگاہوں میں ایک خفیف تبسم رقص کر رہا ہے۔ میرے اصرار پر کہ اس بات کا جواب ضرور دینا ہوگا اس نے کہا۔

وہ "میں کافی عرصے سے آپ کے مضامین کا مطالعہ مختلف رسائل میں کر رہی ہوں، اور چونکہ مضامین انفرادی [illegible] کا آئینہ ہوتے ہیں۔ اس لئے میں کہہ سکتی ہوں کہ میں نے آپ کا کردار سمجھنے میں غلطی نہیں کی ہوگی۔ میرے [illegible] میں آپ کی عزت ہے"

وہ ایک بار پھر شرمائی اور اس کے چہرے کا رنگ سرخ ہوگیا۔

میں: "اس ذرہ نوازی کا شکریہ! لیکن یہ تو بتائیے کہ کیا آپ کو خود بھی مضامین لکھنے کا شوق ہے؟"

وہ: "جی ہاں! میرے مضامین آنسہ کمال کے فرضی نام سے شائع ہوتے ہیں۔"

میں۔ (حیرت سے) "آنسہ کمال! اخاہ! دنیائے ادب میں آپ ہی کی ذات اس نام سے روشناس خلق ہوئی ہے۔ اس کے یہ معنے ہوئے کہ آپ غائبانہ طور پر مجھ سے اپنے طرز تحریر، اسلوب بیان اور ندرت خیال کی داد لے چکی ہیں؟"

وہ: "شکریہ! جناب کی ذرہ نوازی ہے!"

میں: "اچھا اب صرف ایک بات دریافت طلب ہے۔ کیا آپ مجھے بتائیں گی کہ آپ کے خیال میں ایک شریف عورت کے خاوند کو کن اوصاف کا حامل ہونا چاہئیے؟"

میں نے یہ سوال محض اس لئے کیا تھا کہ سہیل یمن کا نقطہ نگاہ معلوم ہو جائے کہ اس نے خاوند کے لئے کیا معیار قائم کر رکھا ہے۔ مگر اس دفعہ وہ اتنی زیادہ شرمائی کہ کافی دیر تک اسکی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ مگر میں نے بھی جواب دینے پر مجبور ہی کر دیا۔

وہ: "اگر مرد کے اندر صنف نازک کی قدر و منزلت اور اس کا احترام کرنے کی صلاحیت موجود ہے تو میرے خیال میں وہ بہترین خاوند بن سکتا ہے۔"

کس قدر معقول جواب تھا کہ میں داد دئے بغیر نہ رہ سکا۔

اس کے بعد ہم دونوں میں کیا گفتگو ہوئی؟ میں اس کا جواب صیغۂ راز میں رکھنا چاہتا ہوں۔ تاہم یہ بتا دینا ضروری ہے کہ میں نے اس مختصر ملاقات میں اندازہ لگا لیا کہ سہیل یمن میرے اس معیار کے مطابق ہے جو میں نے قائم کر رکھا تھا۔ سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ انٹرنس تک انگریزی مدرسہ میں تعلیم حاصل کر لینے کے باوجود شرم و حیا کی مجسم دیوی بنی ہوئی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ تمام گفتگو کے دوران میں اس نے صرف ایک یا دوبار نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا ہوگا۔

---

میں جب شمیم اور نذیر کے ساتھ بیرسٹر صاحب کی کوٹھی سے چلا ہوں تو یقین جانئیے کہ میرا دل عجیب و غریب کیفیات کا حامل تھا۔ سہیل یمن کی آواز ایک صدائے بازگشت کی طرح اس وقت بھی میرے لئے جلوۂ برق فنا ثابت ہو رہی تھی۔ میں اپنے دوستوں کے دوش بدوش چل رہا تھا اور مجھے کچھ خبر نہ تھی کہ کس سمت میں جا رہا ہوں اور منزل مقصود کہاں ہے۔

گھر پہنچ کر شمیم نے بتایا کہ بیرسٹر صاحب بالکل رضامند ہیں اور چاہتے ہیں کہ شادی کی تقریب ہفتہ عشرہ میں طے پا جائے تو بہتر ہے۔ کیونکہ بہت جلد وہ تمام یورپ کا سفر کرنے والے ہیں اور اس سے قبل اپنی صاحبزادی کی شادی کر دینی مناسب سمجھتے ہیں۔ لہٰذا میرٹھ میں زیادہ دیر ٹھیرنا بیکار تھا۔ دوسرے ہی روز

صبح کی گاڑی سے ہم تینوں دہلی چلے آئے۔ میں نے والدہ صاحبہ کو خوشخبری سنائی۔ وہ بھی بہت مسرور ہوئیں، مگر جب ان واقعات کی اطلاع عزیز و اقارب کو ہوئی تو سب ناراض ہو گئے۔ بعض اس لئے کہ میں نے اُن کی آرزوؤں کو پامال کر دیا تھا اور بعض اس وجہ سے کہ ان کے خیال کے مطابق میں نے اپنی شریکِ زندگی کے انتخاب کرنے میں بزرگوں کی رائے نہ لیکر نہایت بدتہذیبی کا مظاہرہ کیا۔ اسی لئے سوائے چند قریبی عزیزوں کے میری شادی میں کوئی رشتہ دار شریک نہ ہوا میں نے بھی اپنے دل میں سوچا کہ یہ لوگ شرکت نہیں کرتے نہ سہی آخر میرا کیا بگڑ جائیگا۔ بلکہ الٹا فائدہ ہے کہ خرچ کم ہوگا۔

شمیم کی رائے کے مطابق اگلی ہی اتوار مقرر ہوئی اور تیاری شروع ہو گئی۔ بارات کے ساتھ جانے والوں میں والدہ اور حقیقی بھائی بہن کے علاوہ چند دوست بھی شامل تھے۔ میرٹھ میں ہم سب لوگ شمیم کے مکان پر مقیم ہوئے جو کافی وسیع تھا۔ اور ہمارے لئے ہر طرح کی آسایش میسر تھی۔

میری شادی میں ان رسوم کا خیال نہیں رکھا گیا جو عام طور پر ہندوستان کے مسلمانوں میں رائج ہیں۔ کیونکہ میں ان سب کو لغو اور غیر ضروری سمجھتا ہوں۔ تاہم سہرا باندھنے کی رسم ایسی ہے جو مجھ کو بھی پسند ہے، اور وہ محض اس لئے کہ سہرے میں پھول ہوتے ہیں جن کی خوشبو سے لطف اندوز ہونا اور اپنے دماغ کو معطر کرنا میرے خیال میں ہر خوش مزاق شخص پسند کرتا ہوگا۔ چاندنی رات کا لطف کیا خاک نصیب ہو اگر بستر پر پھول موجود نہیں ہیں۔

نکاح کے کاغذ پر علاوہ برادر حقیقی کے میرے دوستوں نے بطور گواہ دستخط ثبت کئے۔ کیونکہ عزیز و اقارب نے شرکت ہی نہیں کی تھی۔ مہر صرف پانچ ہزار روپے کا مقرر کیا گیا اور اس کے علاوہ کوئی خاص بات قابلِ ذکر نہیں ہے۔ کیونکہ سب کچھ وہی ہوا جو عام طور پر ہوتا ہے، البتہ عام رسم و رواج سے جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں حتی الامکان احتراز کیا گیا۔

---

شام کا وقت گذارنے کے لئے میں اپنے دوستوں کے اصرار پر نمایش میں چلا گیا جو ان دنوں میرٹھ میں ہو رہی تھی۔ میرے دوست بہت اچھی طرح سیر و تفریح سے لطف اُٹھا رہے تھے مگر میری حالت ناگفتہ بہ تھی۔ سینہ کے نیچے دلِ مضطر نے ایک شور قیامت بپا رکھا تھا۔ بیکلی لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی، کیونکہ ہم کو نمایش کے میدان میں گھومتے گھومتے رات کے نو بج گئے تھے اور کسی کا جی نہیں چاہتا تھا کہ اس چراغاں کو چھوڑ کر واپس گھر جائے۔ صرف میرا دل ایسا تھا جو وہاں کے مناظر سے لطف اندوز ہونے کے بجائے انقباضِ شدید حاصل کر رہا تھا۔ اشتیاقِ دید نے مجھے مجبور کر دیا کہ بہت جلد اس غیر شاعرانہ انہماک کو چھوڑ اور گھر چل کر اس شبِ عروسی کی نیرنگیوں سے مسرور ہو۔ جس کے مقابلے میں باقی زندگی کے سینکڑوں روزِ روشن ہیچ ہیں۔ اور جس کی دنیا میں پہونچ کر ہر بے کیف شام بھی صبحِ نو بہار معلوم ہونے لگتی ہے اور جس کی

"منور تاریکیوں" میں اپنی ہستی کو فراموش کر دینے کے لئے ہر شخص آرزومند ہوتا ہے ــــ مگر میرے دوستوں کا یہ حال تھا کہ واپس چلنے کا نام بھی نہ لیتے تھے۔ آخر مجھ سے برداشت نہ ہو سکا اور میں نے صاف کہدیا کہ "اگر تمہاری سیر و تفریح ابھی ختم نہیں ہوئی اور واپس نہیں چل سکتے تو مجھ کو اجازت دو کہ میں نمودِ سحر تک کیلئے تم سے جدا ہو جاؤں۔"

میرے قلب کی اضطرابی کیفیت معلوم کرنے کے بعد انہوں نے یہی مناسب سمجھا کہ میرے ساتھ گھر کی طرف مراجعت کر چلیں۔ مگر پھر بھی دس بجے سے قبل نہ پہونچ سکے۔

میرے بہت سے دوستوں نے اپنی اپنی شبِ عروسی کے افسانے مجھے سُنائے تھے، اور ان کے علاوہ "جنسیات" کے ضمن میں شایع ہونے والی چند کتابوں کا مطالعہ بھی کیا تھا۔ اس لئے میں اچھی طرح واقف ہو گیا تھا کہ اس ایک پُر لطف رات کو کس طرح بہترین طریقہ پر بسر کیا جائے۔ میں نے کئی روز پہلے سے اپنے عالمِ خیال میں ایک دلچسپ مکالمہ تیار کر لیا تھا تاکہ چمنستانِ شباب میں گل چینی کرنے سے قبل ایک ایسا شاعرانہ ماحول بھی پیدا ہو جو نطق کو زبان کے بوسے لینے کے لئے مجبور کر دے۔ خدا کے فضل سے سہیل بیگم تعلیم یافتہ تھی اور ذوقِ سلیم بھی رکھتی تھی۔ اس لئے شعریت کا پیدا کر لینا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ عام لوگوں کا خیال ہے کہ شبِ عروسی صرف جذبات کی تسکین اور اُن میں مضمر رہنے والی "کثیف لطافتوں" کے حصول کے لئے تخلیق کی گئی ہے۔ مگر میں اپنے مذاق کو اس سے زیادہ بلند رکھنا چاہتا تھا۔ میری آرزو تھی کہ ہم دونوں اپنا نقاب ایک ایسے آئینہ کے سامنے الٹیں جس کے جوہر میں ظرافت اور سنجیدگی کی آمیزش مساوی تناسب کے ساتھ کی گئی ہو۔ تاکہ ہم کو ایک ہی وقت میں دونوں قسم کے جلوے نظر آسکیں اور درحقیقت یہی دیدہ بینا کا معراجِ کمال ہے۔

---

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ دولھا میاں سہرا باندھ کر تمام شہر کا گشت لگاتے ہیں اور جب برات ان کے گھر پر پہونچ جاتی ہے تو وہ سہرے کو وبالِ دوش سمجھ کر فوراً اُتار دیتے ہیں۔ جس کی ایک ایک لڑی تمام نوعمر لڑکیوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ اور جب وہ اپنے حجلۂ عروسی میں داخل ہوتے ہیں تو سہرا تو درکنار مکمل پوشاک بھی زیبِ تن نہیں ہوتی۔ میں لوگوں کے اس طرزِ عمل کو نہایت احمقانہ تصور کرتا ہوں۔ ذرا سوچنے کی بات ہے کہ شہر کے تمام باشندے ہم کو دولھا بنا ہوا دیکھ لیں مگر ہماری شریکِ حیات ــــ جس کا حق سب سے زیادہ ہے ــــ اس نظارہ سے محروم رہے۔ اسی خیال سے جب میری برات گھر پہونچ گئی تو میں نے اپنا سہرا اُتار کر نہایت احتیاط کے ساتھ رکھ دیا اور سب کو تنبیہ کر دی کہ اس کا ایک پھول بھی ضایع نہ ہو، کیونکہ میں جانتا تھا کہ رات کے دس بجے تک اس کو سر پر لپیٹے رہنا کسی قدر دقت طلب ہے۔

نمائش سے واپس آکر میں نے شادی کی پوشاک — جس کو اتار کر کھونٹی پر لٹکا دیا تھا — دوبارہ پہن لی۔ اور اسی شان کے ساتھ سر پر سہرا باندھ لیا۔ میں چاہتا تھا کہ سہیل بین ایک بار نظر اٹھا کر مجھے دولھا بنا ہوا دیکھ لے اور اس کے بعد فوراً ہی میں اس پر تکلف لباس کو اتار کر دوسرا جوڑا پہن لوں۔ مثلاً کوٹ اور پتلون کو لیجئے جس کو ہندوستانی محض نمائش کے طور پر زیب تن کرتے ہیں اور اس کو پہنکر آرام کے ساتھ بستر استراحت پر دراز نہیں ہو سکتے۔

مجھ کو پہلے سے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ تسنیم کے مطالعہ کا کمرہ میرے لئے حجلۂ عروسی بنا دیا گیا ہے۔ جس کے اندر بائیں جانب لکھنے کی میز اور چند کرسیاں پڑی رہتی تھیں اور دائیں طرف ایک عمدہ مسہری بچھی تھی۔ ہم دونوں کو وہ رات اسی پر گذارنی تھی۔ کیونکہ بیرسٹر صاحب نے یورپ جانے کی جلدی میں اپنی صاحبزادی کو جہیز کے تحت میں ایک چیز بھی نہیں دی تھی، البتہ چھ ہزار روپے نقد پیش کرنے کا وعدہ کر لیا تھا۔ میں دل میں خوش تھا کہ اکٹھی رقم مل جائے گی اور اس سے اپنے رہنے کے لئے ایک معقول مکان خرید لیا جائے گا۔

---

ساڑھے دس بجے کے قریب میں نے دروازے پر لٹکنے والے پردے کو جنبش دی اور تسنیم کے مطالعہ کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ غیر ارادی طور پر میری نظریں دائیں جانب یعنی مسہری کی طرف اٹھ گئیں۔

میری اس وقت کی دلی کیفیت کا اندازہ لگانا قارئین کے لئے مشکل ہے اور ان کیفیات کو الفاظ کا جامہ پہنانا میرے لئے قطعی محال۔ مجھے یقین تھا کہ سہیل بین مجھ سے ایک بار گفتگو کر لینے کے باوجود شرم و حیا کی دیوی بنی بیٹھی ہو گی۔ اس کا سر جھکا ہو گا، نظریں نیچی ہوں گی۔ البتہ کان خفیف سے خفیف آواز کو سننے کے لئے تیار ہوں گے۔ مگر میرے توقعات کی پامالی ہو گئی۔ جب میں نے دیکھا کہ مسہری بالکل خالی ہے اور بستر پر ایک شکن بھی نہیں ہے۔ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ اس تاریخ میں کسی نے چادر پر قدم تک نہیں رکھا۔

کمرے میں لیمپ روشن تھا اور دیوار پر ایک سایہ پڑ رہا تھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ ایک عورت میز کے قریب کرسی پر بیٹھی ہے۔ اس کی پشت میری طرف تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ وہ میری آمد سے بالکل بے خبر ہے۔ وہ اپنے خیالات میں حد درجہ محو تھی۔ میں اس کے قریب گیا۔ میز پر کسی شاعر کا دیوان رکھا تھا اور سہیل بین کسی دقیق شعر کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے کہا۔

"جانِ من! آج کی رات........"

وہ چونک پڑی اور میرا فقرہ ناتمام رہ گیا۔

"اُف" آخر اس نے کہا "میں اپنے خیالات میں کس قدر مستغرق تھی کہ آپ کے آنے کی مطلق خبر نہ ہوئی"

میں "ذرا مجھے بھی تو معلوم ہو کہ آپ کن خیالات میں محو تھیں؟"

وہ "اس کا جواب بعد میں دیا جائے گا۔ پہلے مجھے یہ بتائیں کہ کمرے میں داخل ہونے کی اجازت آپ نے کس سے حاصل کی؟"

میں "مجھے اور اجازت حاصل کرنے کی ضرورت۔ بندہ اکمال ہے"

وہ "کیوں کیا ہوا؟ آخر آپ ہیں کون؟"

میں "میں کون ہوں؟ واللہ آپ کی اس سادگی پر میری ہزاروں جانیں نثار ہیں"

وہ "اچھا آپ شاعر بھی ہیں، جس کی موت دنیائے تخیل میں لاکھوں بار واقع ہوتی ہے، مگر جنازہ ایک مرتبہ بھی نہیں اُٹھتا"

میں "جنازہ کس طرح اُٹھے۔ جب کہ آپ جیسی روح پرور ہستیوں کا اعجازِ مسیحائی مرنے کے بعد فوراً ہی دوبارہ زندہ کر دیتا ہے"

وہ "دیکھئے، دیکھئے۔ آپ اس قسم کی بے تکلفی صرف شمیم صاحب کے ساتھ کر سکتے ہیں۔ جو شاید آپ کے بھی دوست ہوں گے۔ میرے ساتھ گفتگو کرتے وقت آپ کو موجودہ ایٹی کیٹ (Etiquette) کا خیال رکھنا پڑے گا، اور اگر گستاخی معاف ہو تو میں یہ کہنے کے لئے بھی مجبور ہوں کہ مداخلتِ بے جا کا مرتکب ہونا آپ کی سب سے پہلی غلطی ہے۔ اور اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ آپ آدابِ مجلس سے قطعی ناواقف ہیں"

میں "بجا ارشاد ہوا۔ لیکن خیر اب آپ کی صحبت میں رہ کر آدابِ مجلس سے واقف ہو جاؤں گا"

وہ "وہ کس طرح؟"

میں "آپ کو خود معلوم ہو جائے گا"

وہ "یقیناً آپ نہایت عجیب آدمی ہیں"

میں "مگر آپ سے زیادہ عجیب نہیں"

وہ "اچھا مزید گفتگو سے قبل آپ خود اپنا تعارف کرائیں تاکہ میں یہ معلوم کر لوں کہ میرے قیمتی لمحات کا خون کس کی تیغِ ستم سے ہو رہا ہے"

اس بات پر مجھے شک ہوا کہ شاید کسی قسم کی غلط فہمی ہو گئی ہے۔ اس لئے میں نے دریافت کیا۔

میں "اس کا جواب دینے سے قبل یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ میں آپ کی گفتگو کو سنجیدگی پر محمول کر دوں

یا ظرافتِ طبع پر؟"

وہ "میں نے اب تک جو کچھ کہا ہے۔ نہایت متانت سے کہا ہے۔ ورنہ غالباً آپ کی گفتگو سے ظرافت کی بو آرہی ہے؟"

میں "کیا درحقیقت آپ مجھ سے ناواقف ہیں؟"

وہ "کتنا مہمل سوال ہے۔ اگر واقفیت ہوتی تو تعارف کرانے کی کیا ضرورت تھی؟"

میں "خواب میں دیکھ رہا ہوں یا آپ؟"

وہ "نہیں ہم دونوں عالمِ بیداری میں ہیں"

میں "آخر کیا ماجرا ہے؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا"

وہ "یہ آپ کی عقلِ سلیم کا قصور ہے"

میں "کیا آپ سہیل یمن نہیں ہیں؟ اور کیا آپ کے مضامین آنسہ کمال کے نام سے شایع نہیں ہوتے؟"

وہ "جی ہاں! میرے مضامین بھی مختلف رسائل میں شایع ہوتے ہیں ——— اچھا اب میں سمجھ گئی۔ آپ شاید کسی رسالے کے مدیر ہیں اور مضمون طلب کرنے کی غرض سے تشریف لائے ہیں"

میں "جی ہاں۔ مگر معمولی مضمون نہیں، بلکہ ایک مکمل کتابِ محبت، جس کا موضوع خود آپ کی ذات سے متعلق ہو جس کے ہر صفحہ پر آپ کے حسن وجمال کی تصویر اور آپ کے غمزہ و انداز کے نقش ونگار بہترین استعارہ وتشبیہ کے ساتھ نہایت مرصع الفاظ میں پیش کئے گئے ہوں"

وہ "شاید آپ کو جنون ہوگیا ہے"

میں "جی ہاں! مگر جنونِ عشق جس کی دوا صرف آپ کے پاس ہے"

وہ "آپ اپنے حواس کا صدقہ دیں"

میں "حواس کا صدقہ کہاں سے دوں۔ میں خود زکوٰۃِ حسن طلب کرنے کے لئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں"

وہ "زکوٰۃ طلب کرنی ہے تو سائل کی صورت بنائیے"

میں "سائل کی صورت بنا لینا آسان ہے۔ میں تو آپ کے آستانۂ ناز پر جبینِ نیاز رکھنے کے لئے آیا ہوں"

وہ "نہیں! آپ کے سرِ شوریدہ سے میرے آستانہ کی توہین ہوگی"

میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی، رات کے بارہ بج چکے تھے

میں نے صرف ایک بار خیال کیا تھا کہ شاید مجھے غلط فہمی ہوگئی ہے۔ مگر بعد میں یہ شک بالکل رفع ہوگیا۔ اور اگرچہ اس کی گفتگو سے ——— جس کے اندر سنجیدہ ظرافت کے تمام جوہر نمایاں تھے ——— مجھ کو انتہائی مسرت حاصل ہو رہی تھی۔ مگر ہر چیز کی ایک انتہا ہوتی ہے، اور مذاق بھی جب حد سے تجاوز کر جائے تو برا معلوم ہونے لگتا ہے۔

اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ اب اس سلسلۂ کلام کو منقطع کر دیا جائے۔

میں اپنی جگہ سے اُٹھا اور اپنے بازو سہیل بہن کی گردن میں حمائل کر دئے اور کہا "میری جان! اس موضوع کو چھوڑ کر کوئی عملی پہلو اختیار کرنا چاہیئے۔ آؤ مسہری پر آرام کریں اور ایک دوسرے کے بادۂ شباب سے جامِ حیات لبریز کر کے نوش کریں"

شاید میرے الفاظ اچھی طرح ادا بھی نہیں ہوتے تھے کہ وہ میرے آغوش سے نکل کر الگ کھڑی ہوگئی۔ غصہ کے مارے اس کا تمام جسم کانپ رہا تھا۔ اس نے کسی قدر کرخت لہجہ میں کہا "آپ نہایت نامعقول آدمی ہیں۔ میں اس دست درازی کو ہرگز برداشت نہیں کرسکتی۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ اگر اس وقت میں شور وغل مچا کر آپ کو گرفتار کرا دوں تو عمدِ عصمت دری کے جُرم میں آپ کو کتنی سزا ملے گی؟"

میں نے اپنے لب و لہجہ کو بدستور قائم رکھا اور کہا:

"جی ہاں! سرکارِ عشق سے فرمان صادر ہوگا کہ شبِ فراق کی سختیاں جھیلوں اور نالۂ نیم شبی سے تمام محلے والوں کو بیدار کر دیا کروں"

اس کا غصہ اور بھی تیز ہوگیا۔ اُس نے بگڑ کر کہا:

"اچھا میں حکم دیتی ہوں کہ آپ فوراً اس کمرے کے باہر تشریف لے جائیں ورنہ ابھی بھائی شمیم کو بلا کر آپ کی گُدی نپوا دوں گی"

---

غضب خدا کا اس وقت میری سمجھ میں آیا کہ یہ خاتون شمیم کی کوئی بہن ہیں۔ اور میں نے غلطی سے انکو سہیل بہن سمجھ لیا۔ میری بیوی کسی دوسرے کمرے میں ہوگی اور مجھے غلط اطلاع دی گئی کہ میرے لئے مطالعہ کا کمرہ مخصوص کیا گیا ہے۔ اگرچہ گفتگو کے دوران میں مجھے دو ایک جگہ شُبہ ہوا تھا کہ شاید یہ سہیل بہن نہیں ہے اور میں کسی غیر لڑکی سے ہمکلام ہوں۔ مگر پھر اس خیال سے کہ سنجیدہ ظرافت اپنے معراجِ کمال پر ہے۔ میں خاموش ہوگیا۔ علاوہ ازیں اس کے خد و خال اور اندازِ گفتگو بھی اسی آنسہ کمال سے مشابہ تھا جس کے ساتھ میری ملاقات بیرسٹر صاحب کی کوٹھی پر ہوئی تھی۔ اس لئے شک کا رفع ہو جانا ظاہر تھا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ انتہائی تصنع سے کام لیکر بالکل ناواقفیت ظاہر کرنا چاہتی ہے تاکہ میں کچھ دیر اضطراب میں رہوں اور وہ میری اس حالت سے لطف اندوز ہوں، مگر میرا قیاس غلط نکلا۔ وہ سہیل بہن نہیں تھی۔

اب سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں تھا کہ اپنی گستاخی کی معافی مانگ کر کمرے کے باہر چلا جاؤں، مجھے سب سے زیادہ اس بات کی فکر تھی کہ شمیم کو ان واقعات کا علم نہ ہو ورنہ دوستی میں فرق آجائے گا۔ لہذا میں نے کہا "میری محترم خاتون! مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے آپ پریشان ہوئیں۔ میں اپنی گستاخیوں کی معافی طلب کرتا ہوں۔ مجھے معاف کر دو۔ تاہم میں یقین دلاتا ہوں کہ ان تمام واقعات کی بنیاد

غلط فہمی ہے۔ میں نے ارادتاً ایسا نہیں کیا۔"

یہ الفاظ ختم کر کے میں دروازے کی طرف مڑا اور کمرے کے باہر نکل جانے کے لئے قدم اُٹھایا ہی تھا کہ اس خاتون نے مجھ کو روک لیا۔ اس کے چہرے پر تبسم رقص کر رہا تھا۔ اس نے زبان سے کوئی لفظ کہے بغیر ایک پرچہ میرے ہاتھ میں دیدیا۔ اور خود کرسی پر بیٹھ کر مسکرانے لگی۔ میں حیران تھا کہ آخر یہ کیا اسرار ہے، ابھی چند لمحے پیشتر یہ عورت غیظ و غضب سے آتش زیر پا تھی یا اب یہ حال ہے کہ ہنسی کے مارے لوٹی جا رہی ہے۔
میں نے اس پرچہ کو کھول کر پڑھنا شروع کیا۔ لکھا تھا۔

"میرے عزیز دوست! یہ پرچہ تم کو ایسی حالت میں ملے گا، جبکہ غصہ کے باعث تم اپنے جامہ سے باہر ہو گے یا بصورت دیگر بحرِ انفعال میں غرق اپنے آپ کو ملامت کر رہے ہو گے لیکن مجھے یقین ہے کہ اس پرچے کو پڑھنے کے بعد تمہارا پارہ اور بھی زیادہ تیز ہو جائے گا۔ بے شک ہمارا مذاق حدِ اعتدال سے تجاوز کر گیا اور ہم خود نادم ہیں۔ تم جس قدر غصہ کرو کم ہے۔ مگر میں واسطہ دلاتا ہوں تم کو اس دیرینہ دوستی کا جو عرصہ دراز سے ہم دونوں کے درمیان قائم ہے کہ براہِ کرم صبح ہونے تک اپنے جذبات پر قابو رکھنا۔

شاید تم یہ سُنکر متعجب ہو گے کہ جس ہستی کا تعارف ہیلن یا آنسہ کمال کے نام سے کرایا گیا ہے وہ دنیائے فلم کا مشہور و معروف ایکٹر ماسٹر بال ہے۔ تم کو بخوبی معلوم ہے کہ اس ایکٹر کو زنانہ بھیس بدل کر پارٹ کرنے میں یدِطولیٰ حاصل ہے۔ تم نے اس کے خاموش فلم دیکھے ہیں اور کچھ عرصہ سے بولتے فلم بھی دیکھ رہے ہو۔ تم اس سے ملنے کی آرزو رکھتے تھے اور آج وہ تمہاری نظر کے سامنے ہے، مگر اس طرح کہ شاید تم اس سے نفرت کرنے لگے ہو گے۔

میں یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ میری تحریک اور نذیر وغیرہ کی تائید سے اس نے یہ سوانگ بھرا ہے۔ تمہاری شادی کسی سے نہیں ہوئی اور جس طرح اب سے چند سال پیشتر تم مجرد تھے اسی طرح اب بھی غیر شادی شدہ ہو۔ قاضی نے تمہارے نکاح کا خطبہ ضرور پڑھا مگر دو ہم جنسوں کے درمیان رشتہ کا قائم ہونا نہ صرف ناجائز بلکہ مضحکہ خیز بھی ہے۔

جس شخص کا تعارف بیرسٹر کی حیثیت سے کرایا تھا وہ ساگر فلم کمپنی کے ڈائرکٹر ہیں، اور اُن کی تمام نقل و حرکت ہماری فرمائش کے مطابق تھی۔ وہ میرے بڑے بھائی مرحوم کے بہت گہرے دوست تھے اور آج کل میرے کرمفرما ہیں۔ میں نے ان کو ایک ایسی تمثیل کرنے کے لئے راضی کر لیا تھا۔ جس کے اصل افراد اس وقت زندہ ہیں۔ اب تم یہ سوال کرو گے کہ آخر یہ مذاق کیوں کیا گیا؟ سو اس کا مختصر جواب یہ ہو سکتا ہے کہ مذاق محض مذاق کی وجہ سے ہوتا ہے اور اگر اس کا کوئی منطقی سبب ہو تو وہ مذاق نہیں ہے۔ البتہ ہمارا مقصد یہ ضرور تھا کہ تمہارے

دل میں شادی کی آرزو پیدا کر دیں۔

مجھ کو اس موقع پر اتنا طویل پرچہ لکھنا نہیں چاہیئے تھا مگر محض اس لئے یہ تمام واقعات قلمبند کر دئے تاکہ صبح کو جب ہماری ملاقات ہو تو مفصل بیان کی ضرورت نہ رہے اور تم نہایت خندہ پیشانی سے ملو۔"

تمہارا
شمیم

میری حالت ناقابلِ بیان تھی۔ کبھی اس عورت نما مرد کو دیکھتا اور کبھی ان واقعات پر غور کرتا جن کا انکشاف اس پرچے سے ہوا تھا۔ یقین نہ آتا تھا کہ اب تک جو کچھ ہوا ہے وہ محض مذاق تھا۔ آخر کافی دیر خاموش رہنے کے بعد میں نے اس طلسم سکوت کو توڑا۔

میں "تم ماسٹر جمال ہو یا انسہ کمال۔ مجھے اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ لیکن میں درخواست کرتا ہوں کہ تھوڑی دیر صداقت سے کام لیکر مجھے یہ بتا دو کہ واقعات کی اصل نوعیت کیا ہے۔ اگر تمہارے پارٹ کا کچھ حصہ ابھی باقی ہے، تو میری خاطر اس کو نظرانداز کر دو۔ مجھے اس سے زیادہ فریب دینے کی کوشش نہ کرنا۔"

وہ "اس پرچے کو جو آپ کے ہاتھ میں ہے، اس مزاحیہ تمثیل کا پردۂ اختتامیہ سمجھئے۔ اس لئے اگر میں کہوں کہ شمیم نے جو کچھ تحریر کیا ہے حرف بحرف صحیح ہے تو آپ کو چاہیئے کہ اس بات کو تسلیم کرنے میں ہرگز شک و شبہ کو گنجایش نہ دیں۔"

میں "بہت خوب! لیکن کیا آپ نے یہ سوانگ بھرنے سے پیشتر اچھی طرح سوچ لیا تھا کہ آپ ایک بڑے جرم کا ارتکاب کر رہے ہیں۔"

وہ "جی نہیں! اس کی ذمہ داری کمپنی کے ڈائرکٹر پر عائد ہو سکتی ہے، جس کے اشارے پر میری تمام نقل و حرکت کا انحصار تھا۔ مجھے تو خوشی ہے کہ میں نے ایک ماہرِ فن کی حیثیت سے اپنا پارٹ نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے۔"

میں کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ ماسٹر جمال نے یہ کہکر کہ "رات بہت آگئی ہے اب آرام کرنا چاہیئے" مجھے روک لیا۔ اس نے اپنا زنانہ لباس اتارنا شروع کیا۔ نقلی بال سر سے علیحدہ کر دئے اور ایک مصنوعی جھلی جو چہرے پر لگا رکھی تھی اتار کر میز پر ڈالدی۔ اب میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے کے نقش و نگار کسقدر بھدے ہیں۔ وہ ایک کریہہ المنظر آدمی معلوم ہوتا تھا۔

---

وہ لحاف کھول کر مسہری پر لیٹ گیا اور شاید تھوڑی دیر میں اس کو نیند آگئی۔ درانحالیکہ میں اپنے خیالات میں محو کرسی پر بیٹھا رہا اور تمام رات آنکھوں میں کاٹ دی۔ میں نے تمام واقعات پر خوب غور کیا

اور آخر اس نتیجہ پر پہونچا کہ اظہارِ ناراضگی بے سود ہے۔ کبھی ایسا نہ ہو کہ یہ مزاحیہ تمثیل ایک المیہ رومان میں تبدیل ہو جائے۔ اب ٹھنڈے دل سے یہ سوچنے کی ضرورت تھی کہ آیندہ واقعات کو کس سانچے میں ڈھالا جائے تاکہ میرے رشتہ داروں کو اس حقیقت کا علم نہ ہو۔ ورنہ جو لوگ میری شادی میں شریک نہیں ہوئے ان کو ایک اچھا موقع مل جائے گا اور وہ طرح طرح سے مجھ کو چھیڑیں گے اور مذاق اڑائیں گے۔

بہت دیر دماغ سوزی کرنے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ صبح کو جب سب دوستوں سے ملوں تو دو باتیں جو میرے ذہن میں آگئی تھیں تیتم کے سامنے پیش کر دوں اور اس سے صاف کہدوں کہ اپنی مرضی کے مطابق ان دونوں میں سے ایک بات منتخب کر لو جو تم کو زیادہ مناسب معلوم ہو۔

صبح پانچ بجے کے قریب ماسٹر جمال کی آنکھ کھل گئی۔ وہ فوراً اٹھا اور ایک بکس نکال کر جس کو پہلے سے کمرے میں چھپا رکھا تھا اپنا بھیس تبدیل کرنا شروع کر دیا۔ مشکل سے آدھ گھنٹہ لگا ہوگا کہ وہ دوبارہ ایک حسین عورت کے لباس میں میری نظر کے سامنے جلوہ گر تھا۔ اس نے مسکرا کر پوچھا:۔

وہ:۔ "کیا آپ ایک لمحے کے لئے نہیں سوئے اور تمام رات جاگتے رہے؟"

میں:۔ "جی ہاں! تفکرات نے سونے نہیں دیا۔ خیر ان باتوں کو چھوڑو اور مجھے یہ بتاؤ کہ مادی چیزوں سے لباس اور نقش و نگار میں تبدیلی پیدا کر لینا تو آسان ہے۔ مگر تم اپنے جذبات میں کس طرح تغیر پیدا کر لیتے ہو۔ تمہارا لب و لہجہ، چال ڈھال اور عادت و اطوار بالکل نسوانی معلوم ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ میں نے پہلی ملاقات میں محسوس کیا تھا کہ بار بار تم پر شرم و حیا کے جذبات طاری ہو رہے تھے اور آج بھی تمہاری یہی حالت تھی۔ کبھی غصہ آتا تھا اور کبھی مسکراتے تھے۔ آخر یہ کس طرح ممکن ہے؟"

وہ:۔ "نہایت معمولی بات ہے۔ گذشتہ بارہ سال سے عورت کے بھیس میں کام کر رہا ہوں۔ اس لئے اگر نسوانی صفات میری خصلت میں پیدا ہو گئیں تو تعجب کا اظہار بے جا ہے۔ اور چونکہ مجھے سینکڑوں ڈرامے حفظ ہیں اس لئے تقریباً ہر موضوع پر دلچسپ مکالمہ تیار کر لینا میرے لئے کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ رہا تغیرِ جذبات کی بابت، سو آپ باور کریں یا نہ کریں مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ صنفِ نازک کے تمام جذبات محض مصنوعی ہوتے ہیں۔ اور خواہ وہ کتنی ہی سنجیدہ اور متین کیوں نہ ہو جائے مگر پھر بھی اس میں تصنع اور بناوٹ کو ضرور دخل ہوتا ہے۔ وہ حسبِ ضرورت اپنے چہرے پر رنج و غم، مسرت و انبساط، شرم و حیا اور غیظ و غضب کے جذبات طاری کر سکتی ہے، اور مرد اُن جذبات کو حقیقی تصور کر کے اپنی شخصیت کو تباہ کر لیتے ہیں۔ اسی طرح میرے جذبات کو بھی حقیقت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ میرے اندر تمام نسوانی صفات پیدا ہو گئی ہیں۔ مگر ان تمام باتوں کے باوجود ایک کسر اب بھی باقی ہے۔ یعنی میں کسی طرح اپنے جسم میں ایسی تبدیلی پیدا نہیں کر سکا جس سے بچے جننے شروع کر دوں۔"

جمال اپنے اس آخری جملے پر کھل کھلا کر ہنس پڑا اور ابھی اس کے قہقہہ کی آخری گونج فضا میں باقی

ہی تھی کہ دروازے پر دستک سُنائی دی۔ جمال جھپٹ کر مسہری پر چلا گیا اور دُلہنوں کی طرح گھونگھٹ نکال کر بیٹھ گیا۔ میں نے ایک آہ سرد کھینچکر دروازہ کھولا اور دروازے سے باہر نکل گیا۔

عورتیں دُلہن کا منھ دیکھنے اندر آنا چاہتی تھیں۔

---

ساڑھے سات بجے شمیم وغیرہ سے مُلاقات ہوئی پشیمانی ان کے چہرے سے ظاہر ہورہی تھی۔ وہ اظہارِ ندامت کرنا چاہتے تھے مگر میں نے ان کو روک دیا اور شمیم کو مخاطب کر کے کہا۔

"شمیم! اس حماقت کے سب سے زیادہ ذمہ دار تم ہو۔ کیونکہ یہ تحریک تمہاری تھی۔ لہذا اس کی سزا بھی تم کو ہی ملنی چاہیے۔ تمہارے سامنے دو باتیں پیش کرتا ہوں اُن میں سے ایک کو پسند کرلو سکتے۔ یا تو میری آتشِ انتقام کو برداشت کرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ یا اپنی چھوٹی ہمشیرہ کو اس طرح میرے عقد میں دیدو کہ میرے رشتہ داروں کو مطلق خبر نہ ہو اور بات بن جائے۔ بولو تم کس بات کو ترجیح دوگے؟"

شمیم حیران تھا کہ کیا جواب دے۔ کیونکہ اُس کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ میں اس قسم کی تحریک پیش کروں گا۔ باقی دوست احباب بھی سکتہ کے عالم میں تھے۔ لیکن یہ خاموشی زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔

میں "شمیم! جلدی کرو۔ اپنے فیصلہ انقطاعی سے مجھ کو مطلع کرو، تاکہ میں اس کی تیاری شروع کردوں — ایک زبردست انتقام — یا تقریب نکاح"

شمیم "تمہاری دونوں باتیں نہایت عجیب ہیں۔ پہلی صورت تو کسی طرح ممکن نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ اس قدر دیرینہ دوستی کو یوں منقطع کردیا جائے۔ رہا شادی کے متعلق، سو تم جانتے ہو کہ میری بہن کی منگنی قرار پا چکی ہے۔ اگرچہ یہ ضرور ہے کہ ہمارے والدین کا انتقال ہوگیا، وہ میرے پاس رہتی ہے۔ اس وقت میں ہی اس کا وارث ہوں اور یہ میری مرضی پر منحصر ہے کہ جہاں چاہوں اس کی شادی کردوں مگر ایسی حالت میں جبکہ اس کی نسبت ہوچکی ہے۔ میں بہت جلد اس کی قسمت کا فیصلہ نہیں کرسکتا۔ کیا تم مجھکو چند دن کی مہلت نہیں دوگے؟"

میں "ہرگز نہیں۔ کل غروب آفتاب سے قبل اس کو میری منکوحہ بیوی بنادو، ورنہ تم میری عادت سے واقف ہو۔ میرے اور تمہارے درمیان زندگی اور موت کا سوال ہے۔ اس کومیڈی کے بعد ٹریجڈی کا شروع ہونا تمہاری مرضی پر منحصر ہے"۔

اب باقی دوستوں نے بھی جواب تک خاموش تھے، بولنا شروع کردیا۔ وہ میری طرفداری کرتے ہوئے شمیم کو سمجھا رہے تھے کہ شادی کی تقریب عمل میں آجائے تو بہتر ہے۔ مبادا یہ دوستی

دشمنی میں تبدیل ہو جائے۔

عام بات ہے کہ جب انسان پر چاروں طرف سے زور پڑے تو وہ بھی مجبور ہو جاتا ہے اور پنچوں کے قول کے مطابق "وہی" ہی تسلیم کر لیتا ہے۔ چنانچہ جب تمام دوست میری حمایت کرنے لگے تو شمیم نے بھی اقرار کر لیا کہ کل شام اپنی بہن کو تمہارے نکاح میں دیدونگا۔

اب ضرورت اس بات کی تھی کہ کسی طرح یہ راز فاش نہ ہو۔ چنانچہ اسی روز میں نے دہلی چلنے کی تیاری شروع کر دی۔ اور ادھر ان فرضی بیرسٹر صاحب کی طرف سے ایک پیغام والدہ صاحبہ کے نام بھجوایا کہ چونکہ میں ایک ہفتہ کے بعد یورپ جا رہا ہوں اس لئے میری آرزو ہے کہ ان سات دنوں میں میری لڑکی مجھ سے جدا نہ ہو۔ اس کے بعد وہ آپ کی ملکیت ہے اور یقیناً آپ کے پاس رہے گی۔ لہذا آج اس کو اپنے ہمراہ دہلی نہ لے جائیں۔ بلکہ میرے ہی غریب خانے پر رہنے دیں اور اس قلیل مدت کے بعد بلالیں۔"

والدہ صاحبہ اس کو منظور کرنے کے لئے تیار نہیں تھیں۔ مگر میرے کہنے سنے سے وہ راضی ہو گئیں اور روانگی کی تیاری شروع کر دی۔

ریل پر لاریوں کو ترجیح دی۔ اس لئے دو گاڑیوں کا انتظام کر لیا گیا۔ سہ پہر کے قریب اپنے شہر پہونچ گئے۔ ان دوستوں اور رشتہ داروں نے جو شادی میں شریک نہیں ہوئے تھے، رسمی مبارکباد پیش کی اور میں نے نہایت خندہ پیشانی سے ان کی ہمدردی کا شکریہ ادا کیا۔ میں بظاہر مسرور نظر آ رہا تھا مگر دل کی حقیقت خدا ہی کو معلوم تھی۔

---

خدا خدا کر کے درمیانی رات بسر کی اور دوسرے روز اماں جان سے یہ بہانا کر کے کہ سب دوستوں کے ساتھ پانچ چار روز کے لئے شکار کھیلنے جا رہا ہوں، سیدھا میرٹھ روانہ ہو گیا۔ چونکہ شادی کی تقریب نہایت پوشیدہ طور پر عمل میں لانی ضروری تھی، اس لئے نہ کسی کو مدعو کیا اور نہ کوئی خاص جشن [illegible]

بعد نماز مغرب قاضی جی تشریف لائے اور دو بول پڑھ کر چلتے بنے۔ نکاح کے کاغذ میں زوجہ کا نام وہی سہیل بین لکھا گیا۔ حالانکہ شمیم کی بہن کا نام اختر سلطان تھا۔ یہ تبدیلی ارادتاً کرائی گئی۔ کیونکہ سب رشتہ داروں کو معلوم ہو چکا تھا کہ میری بیوی کا نام سہیل بین ہے۔ آیندہ کے لئے بھی شمیم کو تاکید کر دی کہ اپنی بہن کو کبھی بھول کر بھی اختر سلطان کے نام سے یاد نہ کرنا ورنہ تمام راز فاش ہو جائے گا۔ بطور گواہ دستخط کرنے کے لئے اس دفعہ بھی دوست موجود تھے۔ لہذا کسی رشتہ دار کی چنداں ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

رات کو ساڑھے دس بجے دوبارہ مطالعہ کے کمرے میں جانا پڑا جو حسبِ سابقہ میرے لئے حجلۂ عروسی بنا ہوا تھا مگر کسی قدر تغیر کے ساتھ۔ وہ رات بجائے مبہم اور بے سروپا مکالمہ کے نہایت پُر لطف گفتگو میں بسر ہوئی۔ اختر سلطان الموسومہ بہ سہیلِ یمن میرے آغوش میں تھی اور میں موسمِ بہار کے بھونرے کی طرح اس کے گلابی لبوں سے رس چوس رہا تھا۔

چار روز نہایت مزے کے ساتھ گذارے اور اس کے بعد دہلی چلا گیا۔ ساتویں دن سہیلِ یمن بھی پہلی بار وداع ہوکر اپنی سسرال میں آگئی۔ اور کسی پر وہ راز منکشف نہ ہوا۔ صرف ایک روز والدہ نے سرسری طور پر کہا کہ "تمہاری دُلہن کی شکل شمیم کی بہن سے بہت کچھ ملتی جُلتی ہے۔" اور میں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ "ہاں اکثر لوگوں کی شکل وصورت اور ناک نقشے میں مشابہت پائی جاتی ہے، یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔"

میری شادی کو دو سال ہوگئے اور میرے رشتہ دار حتی کہ خاص میری والدہ اس حقیقت سے ناواقف ہیں کہ میرا نکاح بجائے اتوار کے منگل کے دن ہوا تھا، اور یہ کہ جس عورت نما مرد کو رونمائی میں روپے پیش کئے گئے تھے وہ اب بھی ساگر فلم کمپنی میں کھیل کرتا ہے اور یہ کہ میری بیوی کا نام شادی سے قبل کچھ اور تھا۔

اگر خلوت میں یہ واقعات کبھی یاد آجاتے ہیں یا سینما میں ساگر فلم کمپنی کا کوئی فلم دیکھتے ہیں تو میں اور اختر خوب ہنستے ہیں کیونکہ اس کو بھی ان تمام باتوں کا علم ہے۔

اپنی شادی کے واقعات سے جو نتیجہ میں نے اخذ کیا وہ یہ ہے کہ انسان صرف ایک اصول کا پابند ہو اور وہ اصول یہ ہے کہ:۔

"ہم کسی اصول کے پابند نہ ہوں۔"

فضل حق قریشی دہلوی

# نوٹ

اگر پہلی دفعہ کی شادی میں فضل حق صاحب قریشی کو ان کے دوستوں نے فریب میں مبتلا رکھا تھا تو ادارۂ ساقی یہ کہنے پر مجبور ہے کہ دوسری دفعہ کی شادی کا اقرار کرنے میں وہ خود اپنی ذات کو دُھوکا دے رہے ہیں۔ کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ وہ اب بھی اسی طرح مجرّد ہیں جیسے اپنی مفروضہ شادیوں سے قبل انفرادی زندگی بسر کر رہے تھے۔

"شاھد"

# نجمہ نوری

## ماں کی ممتا کے متعلق ایک دلدوز تمثیل

از جناب نصار ناصری۔ بی۔ اے۔

## افراد

ظہیر الزماں ........... ایک عالی خاندان جوڈیشل آفیسر

سہیل ........... ظہیر کا دوست

ڈاکٹر فضل ........... بروسا کا نامور سرجن، ظہیر کا دوست

شہباز ........... ایک مکار وکیل، خفیہ مشن کا بانی

قاسم بک ........... شہباز کا ساتھی۔

فاروق ........... شہباز وکیل کا سابق محرر خفیہ مشن کا ممبر

سعید الزماں ........... ظہیر الزماں کا ہونہار بیٹا

نجمہ ........... ظہیر الزماں کی بیوی اور سعید الزماں کی ماں

نرگس ........... ظہیر الزماں کی خادمہ

ہوٹل کے ملازم سیشن جج۔ پولیس افسر وغیرہ

مقام ........... بروسا۔ ایشیائے کوچک

زمانہ ........... ۱۹۱۰ء ۱۹۲۷ء

# مجلس اوّل

## پہلا منظر

(برسا۔ دسمبر ۱۹۱۱ء کی ایک ٹھٹھرتی ہوئی صبح۔ ظہیر الزماں سب جج کی کوٹھی۔ لکھنے کا کمرہ خوبصورتی کے ساتھ آراستہ ہے۔ داہنی طرف دو دروازے ہیں۔ اور بائیں طرف ایک۔ کمرے کے وسط میں ایک لکھنے کی میز لگی ہے جس پر کتابوں اور کاغذات کا ایک بے ترتیب انبار لگا ہوا ہے۔ میز کے دائیں اور بائیں جانب خوشنما کرسیاں رکھی ہیں اور اس طرف ایک بڑی کرسی پر ظہیر بیٹھا نہایت انہماک سے کچھ لکھ رہا ہے۔ ظہیر کی عمر مشکل سے بتیس برس کی ہوگی لیکن بجائے شگفتگی اور بشاشت کے اس کے چہرہ سے اضمحلال اور تھکن کے آثار نمایاں ہیں۔

نرگس، ظہیر کی نوعمر، وفادار خادمہ جس کے لبوں پر ہر وقت ایک مسکراہٹ رقص کرتی رہتی ہے، آہستہ سے دروازہ کھول کر داخل ہوتی ہے۔ ظہیر اپنے کام میں غرق ہے۔ کچھ دیر کے بعد وہ کسی کی موجودگی محسوس کرتا ہے اور دروازے کی طرف نظر اٹھاتا ہے۔ نرگس مودبانہ طریقہ پر جھک جاتی ہے اور نہایت نرم و شیریں لہجہ میں ہم کلام ہوتی ہے۔

**ظہیر** "کیا ہے نرگس؟"

**نرگس**۔ "سرکار! ڈاکٹر فضل عظیم صاحب آئے ہیں"

**ظہیر** "اچھا! یہیں بلا لو" (نرگس جاتی ہے)

(ڈاکٹر فضل عظیم۔ ایم۔ بی۔ ایس۔ برسا کے نامور سرجن۔ ظہیر کے پُرخلوص دوست۔ ہاتھ میں بیگ لئے داخل ہوتے ہیں)

**ظہیر** (گرم جوشی سے استقبال کرتے ہوئے) "آؤ بھئی فضل! میں تو تمہارا انتظار ہی کر رہا تھا"

**ڈاکٹر فضل**۔ (ہاتھ ملاتے ہوئے) "کہو بھائی! سعید کی اب کیسی طبیعت ہے؟"

**ظہیر**۔ الحمدللہ! رات نہایت آرام سے کٹی۔ صبح ہوتے ایک دورہ پھر ہوا تھا لیکن تمہاری دوا پلانے سے سکون ہوگیا۔ ابھی ذرا کی ذرا آنکھ لگی ہے" (کرسی کی طرف اشارہ کرتا ہے) "بیٹھو!" (ڈاکٹر فضل کرسی پر بیٹھ جاتا ہے اور انجکشن کا سامان تیار کرنے لگتا ہے۔ ظہیر لکھنے میں مصروف ہے۔ کچھ دیر کے بعد ڈاکٹر فضل کرسی سے پشت لگا کر بیٹھ جاتا ہے اور ظہیر کو بغور دیکھتا ہے پھر اٹھ کر ظہیر کے قریب آتا ہے اور اس کے دونوں شانوں کو ایک انداز شفقت سے پکڑ کر آہستہ آہستہ ہلاتے ہوئے یوں گویا ہوتا ہے)

**ڈاکٹر فضل**۔ "ظہیر! تم کیوں اپنے ساتھ ظلم کر رہے ہو"

**ظہیر**۔ (چونک کر) "میں اپنے ساتھ ظلم کر رہا ہوں! اس سے تمہارا کیا مطلب؟"

**ڈاکٹر فضل**۔ "تم اپنے آپ کو تباہی کی حد تک پہنچا چکے ہو۔ تعجب ہے کہ تم نے تین دن سے ایک لمحہ کیلئے بھی آنکھ نہیں جھپکائی تم کو معلوم ہے اس وقت تم کو

بخار رہتا ہے!"

ظہیر (بے پرواہی کی ہنسی ہنستے ہوئے) "ہاں تھکن کی وجہ سے معمولی حرارت ہوگئی ہوگی"۔

ڈاکٹر "دوست ۔۔۔ نہیں! تم دماغی کام بہت زیادہ کرتے ہو اور ہر وقت تفکرات میں غرق رہتے ہو نتیجہ ظاہر ہے تم کو فوراً اس کا علاج کرنا چاہئے"۔

ظہیر (مسکراتے ہوئے) "کس قسم کا علاج"؟

ڈاکٹر (ظہیر کی بائیں جانب آتے ہوئے) "روزانہ علی الصبح کم از کم دو میل تک ٹہلا کرو......"

ظہیر "لیکن......!"

ڈاکٹر "۔۔۔۔ روزانہ ٹھنڈے پانی سے نہایا کرو اور خوب کھایا کرو"

ظہیر (ہنستے ہوئے) "معاف کیجئے جناب! میں آپ کے تجویز کردہ نسخہ پر عمل نہیں کرسکتا!"

ڈاکٹر "تو آخری ترکیب یہ ہے کہ شادی کرلو ۔۔۔۔!"

(ظہیر کچھ متوحش سا ہوتا ہے)

ڈاکٹر "گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ آخر ایک دفعہ پہلے بھی شادی کرچکے ہو ۔۔۔ ایک اور سہی۔ تنہائی کی زندگی بسر کرنا تمہارے لئے مضر ہے۔ کسی خوش مذاق اور ہنس مکھ لڑکی سے شادی کرلو۔ تمہارا علاج صرف اس کی برق پاش مسکراہٹ ہے۔ [illegible] کی زندگی پھر سدھر جائیگی اور سعید کی بھی اچھی طرح نگہداشت [illegible]!"

(ظہیر کے چہرہ سے گھبراہٹ ظاہر ہوتی ہے۔ ایک منٹ تک وہ خاموش رہتا ہے۔ آخر ہمت کرکے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں بولتا ہے)

ظہیر۔ (کرسی کی پشت سے سہارا لیکر) "عزیز دوست! مجھے افسوس ہے کہ میں نے تم کو ابتک غلط فہمی میں رکھا اور صحیح واقعہ تم سے چھپایا ۔۔۔ اب میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ تم کو حقیقت سے آگاہ کردوں۔ سنو! میری بیوی زندہ ہے ۔۔۔ !!!"

ڈاکٹر (چونک کر) "ہیں! کیا نجمہ زندہ ہے"؟

ظہیر "ہاں! تین برس تک وہ نہایت خوش اسلوبی سے ازدواجی زندگی کے فرائض انجام دیتی رہتی ۔۔۔ لیکن اب ۔ اب اس نے مجھے برباد کردیا ۔۔۔ میری زندگی تباہ کردی ۔۔۔ (آہ سرد کے ساتھ) ہائے افسوس! مجھکو تنہا چھوڑ کر وہ اپنے عاشق کے ساتھ فرار ہوگئی ۔۔۔ ایک دن میں غیر متوقع طور پر گھر آیا اور دونوں کو دیکھا ۔۔۔ اُف رات کی بھیانک تاریکی میں وہ ایک دوسرے سے ہم آغوش تھے ۔۔۔ مجھے دیکھکر وہ فرار ہوگئے ۔۔۔ کاش میں ان کو قتل کرسکتا! (ایک منٹ خاموش رہنے کے بعد بھرائی ہوئی آواز میں) میں نے کئی مرتبہ ارادہ کیا کہ تم کو اپنے دردِ دل سے آگاہ کردوں لیکن موقع نہ ملا ۔۔۔ عزیز دوست! میری بدنصیبی کا تم اندازہ نہیں کرسکتے"۔

ڈاکٹر فضل "تو کیا ۔۔۔ تو کیا تم کو ابھی تک نجمہ سے محبت ہے"؟

ظہیر (دردناک لہجہ میں) "اُف! مجھے اس سے عشق تھا عشق! وہ میری روح تھی ۔۔۔ اس کی جدائی میں میرا جگر پاش پاش ہے۔ میری حالت ناقابل بیان ہے میں یقیناً اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالتا۔ لیکن بچے کا خیال مانع رہا"۔

ڈاکٹر "متفکر نہ ہو ۔۔۔ نجمہ کبھی نہ کبھی ضرور واپس آئے گی"۔

(نرگس بائیں طرف کے دروازے سے داخل ہوتی ہے)

نرگس "سرکار ننھے میاں جاگ اٹھے!"

(ڈاکٹر اپنا سامان لیتا ہوا ظہیر کے ساتھ بائیں طرف کے دروازہ سے چلا جاتا ہے۔ نرگس بھی انہی کے پیچھے جاتی ہے۔ ایک دم سے دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آتی ہے نرگس "شاید سہیل صاحب آئے ہونگے" کہتی ہوئی دائیں طرف کے

دروازہ کی طرف دوڑتی ہے اور ایک حسین تبسم کے ساتھ دروازہ کھولتی ہے — اُس کی مسکراہٹ ایک دم سے استعجاب اور خوف کی ایک ہلکی سی چیخ میں تبدیل ہو جاتی ہے — دروازہ سے ایک اندوہناک لہجہ میں "نرگس!" کی آواز آتی ہے اور نرگس خوف اور حیرت سے "خانم!" کہتی ہے مگر ساکت ہے — ایک نوجوان عورت نرگس کے بازوؤں میں آپڑتی ہے — نجمہ کا غمگین چہرہ زبانِ حال سے اسکے رنج و محن کی داستان کہہ رہا ہے۔ رخساروں کی سُرخی زائل ہو چکی ہے آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہیں نرگس آہستہ سے اپنی مالکہ کا سر اُٹھاتی ہے)

نجمہ (درد بھری آواز میں) "میرا بچہ! — میرا سعید! اب کیسا ہے؟"

نرگس: "خانم! دو ہفتے سے ننھے میاں سخت بیمار تھے مگر اب خدا کا فضل ہے۔ ۔ ۔ ۔"

نجمہ: "مَیں نے کل ہی سُنا — نرگس میں اپنے بچے کو ضرور دیکھوں گی۔"

نرگس: "اس وقت سرکار اور ڈاکٹر فضل عظیم اُنکے پاس ہیں۔"

نجمہ: "آہ — !"

نرگس: "خانم! اب سے دور ننھے میاں اس قدر سخت بیمار تھے کہ اُن کے بچنے کی کوئی امید نہ تھی۔"

(نجمہ ایک کرسی پر گر پڑتی ہے)

نرگس: "۔ ۔ مگر اب کسی قسم کا خدشہ نہیں ہے اور ڈاکٹر فضل عظیم کہتے ہیں کہ وہ ہفتہ عشرہ میں بالکل تندرست ہو جائینگے۔"

(نجمہ کی نظر اچانک میز پر رکھی ہوئی سعید کی ایک تصویر پر پڑتی ہے۔ وہ جھپٹ کر اُسے اُٹھا لیتی ہے اور دیوانہ وار اُسے چومنے لگتی ہے۔)

نجمہ: "میرے بچے! میرے لال!! (اس کی ہچکی بندھ جاتی ہے اور تصویر اُس آنسوؤں سے تر ہو جاتی ہے) — بیٹا کبھی ہمیں بھی یاد کیا۔ اپنی امی کو پہچانو گے یا نہیں — بولو چندا! — اُف! میرا کلیجہ پھٹا جاتا ہے" (اس پر غش کی سی کیفیت طاری ہوتی ہے تصویر اُس کے ہاتھ سے گر پڑتی ہے نرگس اپنے دامن سے نجمہ کی پیشانی پونچھتی ہے اور اُسی سے ہوا دیتی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد نجمہ ہوشیار ہوتی ہے)۔

نجمہ (حالتِ اضطراری میں) "ظہیر مجھے کیا کیا نہ کہینگے۔ خیر کچھ پرواہ نہیں — کوئی مضائقہ نہیں۔ میں اُن کی لعنت و ملامت کا مطلق خیال نہ کرونگی اگر وہ میری خطا معاف کر دے اور صرف اتنی اجازت دیدے کہ میں اپنے بچے کے ساتھ رہ سکوں! لیکن۔ اگر — اگر انھوں نے مجھسے ملنے سے انکار کر دیا تو — تو پھر — اللہ! میرا کیا حشر ہوگا! — نرگس! نرگس!" (ایک دردناک چیخ کے ساتھ وہ نجمہ کے شانے پر سر رکھکر زور زور سے رونے لگتی ہے)

نرگس (تسلی آمیز لہجہ میں) "خانم! خانم! ذرا جی کو سنبھالو۔ میری سنو! کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ تم سرکار کو خط کے ذریعہ تمام حالات سے مطلع کرو — سرکار کو تمہارے آنے کی بالکل توقع نہیں اور تم جانتی ہو وہ کس قدر تند مزاج ہیں۔"

نجمہ: میں کئی بار لکھ چکی ہوں۔ اب تک خدا گواہ ہے میں ہزاروں خط لکھ چکی ہوں لیکن اُنھوں نے کسی ایک کا بھی جواب نہیں دیا — (ایک نئے جوش کے ساتھ) نرگس! میں ظہیر سے ضرور ملوں گی۔ چاہے جو کچھ بھی ہو۔ بغیر میری داستان سُنے وہ مجھے ہرگز نہیں نکال سکتے،

آخر کبھی تو مجھ سے الفت رکھتے تھے کہ اب اتنے بدل گئے کہ میری بپتا بھی نہ سنیں گے۔ میں ضرور اُن سے ملوں گی۔ نرگس کیا کبھی وہ میرا ذکر کرتے تھے؟"

**نرگس**۔ "کبھی نہیں۔"

**نجمہ**۔ "(استعجاب کے لہجہ میں) بالکل نہیں؟"

**نرگس**۔ "جی نہیں" (گردن ہلاتی ہے)

(نجمہ کا جوش پھر ٹھنڈا ہو جاتا ہے اور وہ کُرسی سے پشت لگا کر کچھ دیر خاموش بیٹھ جاتی ہے)

**نجمہ** (چونک کر) "نرگس! تجھے کچھ یاد ہے۔ جب میں چلی گئی تھی تو سرکار کیا کہتے تھے؟"

**نرگس**۔ (آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اور ہاتھ مٹکا مٹکا کر) خانم! سرکار کی عجیب حالت تھی بالکل خدانخواستہ دیوانے معلوم ہوتے تھے۔ اپنے کمرے میں کئی دن تک بند رہے ایک دن باہر گئے اور شام تک نہیں آئے میں اکثر دروازے سے کان لگا لگا کر سنتی تھی تو مجھے سوائے ہچکیوں اور ٹھنڈے ٹھنڈے سانسوں کے کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔ ایک دن تو مجھ سے نہ رہا گیا اور میں اُن کے حکم کے خلاف کمرے میں چلی ہی گئی دیکھتی کیا ہوں کہ سرکار آتشدان کے قریب کرسی رکھے بیٹھے ہیں۔ زار و قطار رو رہے ہیں اور آپ کی تصویریں اور خط پھاڑ پھاڑ کر جلا رہے ہیں (نجمہ نہایت غور سے سنتی ہے لمبے لمبے آنسو اُس کے زرد رخساروں پر بہتے ہیں)

. . . ننھے میاں کے خیال نے اُن کو زندہ رکھا نہیں تو خدا جانے وہ کیا کچھ نہ کر بیٹھتے۔ ننھے میاں سے اُنہیں اس قدر محبت ہے کہ پہلے پہل تو رات دن اُنہی کے پاس بیٹھے رہتے تھے کھانے کا ہوش نہ پینے کا ہر وقت اُنہی کی رکھوالی کیا کرتے تھے اب کئی دن سے دفتر کا کام بہت زیادہ کر رہے ہیں۔"

**نجمہ**۔ (تحکمانہ لہجہ میں) "نرگس! میں اُن سے ضرور ملونگی۔ جاؤ اور سرکار سے کہدو کہ ایک خاتون اُن سے ملنے آئی ہے۔ میرا نام مت لینا۔ . . ."

**نرگس**۔ "لیکن۔ خانم! . . "

**نجمہ**۔ "اللہ! اُف! زمانہ کیسا بدل گیا — نرگس! کیا تجھے میرے اوپر رحم نہیں آتا . . . . . ."

(نرگس فوراً بائیں طرف کے دروازے سے چلی جاتی ہے۔ نجمہ سر سے لیکر پاؤں تک تھرتھر کانپ رہی ہے۔ اس کا دل دھڑک رہا ہے۔ اپنے آپ کو بہتیرا سنبھالتی ہے بہتیرا بن بن کے بیٹھتی ہے مگر اُس کی حالت بد سے بدتر ہو جاتی ہے۔ منہ پر ہوائیاں اُڑ رہی ہیں)

**نجمہ**۔ (تنہا) "اُف — اللہ! — اُن سے رحم کی اُمید خیال خام ہے بھلا ایسا آدمی جس نے عمر بھر اپنی بیوی کو بیوی نہ سمجھا ہو کیسے اتنے بڑے گناہ کو معاف کر دیگا۔ اللہ! اب تو ہی ہے —!!"

(سعید کی تصویر کو اُٹھاتی ہے اور بار بار اس کو اپنے سینے سے لگاتی ہے) "سعید! میرے لال! میں صرف تیری وجہ سے یہاں آئی ہوں ورنہ شاید اس گھر میں دوبارہ قدم۔"

(بائیں طرف کا دروازہ ایک دم سے کھلتا ہے اور ظہیر نجمہ کی طرف دیکھتا ہے ایکدم سے اُس کا چہرہ متغیر ہو جاتا ہے اُس کی نظریں نجمہ پر گڑ جاتی ہیں۔ نجمہ سر سے پاؤں تک کانپ رہی ہے)

**ظہیر** (کرخت لہجے میں) "— تم —" (نجمہ کھڑی ہو جاتی ہے اور ظہیر کی طرف بڑھنا چاہتی ہے لیکن ٹھٹک کر رہجاتی ہے)

**نجمہ**۔ "ہاں — میں — میں!" (اس کی آواز تھراتی ہے)

**ظہیر**۔ "اس گھر سے نکل جاؤ" (اُس کے قریب آتا ہے)

**نجمہ**۔ "ظہیر! — م — م — میں . . . . ."

ظہیر (تحکمانہ لہجہ میں) "اس گھر سے فوراً نکل جاؤ"

نجمہ "ظہیر! ذرا سنو! ــــ ہوں"

ظہیر "سُنا نہیں تم نے"

نجمہ (ملتجیانہ انداز میں اس کے قریب آتی ہے) "ہاں ہاں! میں ضرور جاؤنگی۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ میں فوراً چلی جاؤنگی۔ لیکن ذرا ــــ صرف ایک لمحے کے لئے۔ تم سنو.....!"

ظہیر (تیزی سے مُڑتے ہوئے) "کہو! کیا کہنا ہے ــــ کہہ چکو جلدی سے"

نجمہ (زمین پر اپنے گھٹنے ٹیکتے ہوئے دونوں ہاتھ اُٹھاکر) "ظہیر! للہ! مجھے معاف کردو ــــ میں....!"

ظہیر (چونک کر) "کیا ــــ ؟؟"

نجمہ "مجھے معاف کردو۔ ظہیر میں....."

ظہیر (تیزی سے نجمہ کے بالکل قریب آتے ہوئے۔ انتہائی غصہ کی حالت میں) "تمہیں معاف کردوں! معاف کردوں! (ایک طنز آمیز قہقہہ لگاتا ہے) دو سال تک تمہیں معافی کا خیال نہیں آیا۔ اب معافی مانگنے آئی ہو۔ کامل دو برس تک تم ایک دوسرے شخص کی "زینتِ آغوش" بنی رہیں اور اب میں تمہیں معاف کردوں! تم....."

نجمہ (گڑگڑاتے ہوئے) "ظہیر! للہ! سعید کے صدقے میں ــ"

ظہیر "خبردار جو آئندہ تم نے سعید کا نام لیا۔ تمہیں کوئی حق نہیں کہ اُس کا ذکر بھی کرو۔ تمہارا اُس سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ میرا اور صرف میرا ہے۔ جب تم اپنے عاشق زار کے ساتھ فرار ہوگئی تھیں اُس وقت تمہیں اُس کا خیال نہیں آیا"

نجمہ (پر زور لہجہ میں) "میں احمق تھی۔ میں پاگل تھی۔ میں نے تمہیں دغا دی! اپنے بچے کو چھوڑ دیا! اُس گھر کو چھوڑ دیا جس میں مجھے ہر قسم کی آسائش حاصل تھی۔ اور میں "اس" کے ساتھ چلی گئی یہ سمجھکر کہ وہ شاید مجھے ایک مسرت کی دنیا میں لیجائیگا میں یقیناً پاگل تھی۔ لیکن ــــ خدا ــــ لا (اس کی ہچکی بندھ جاتی ہے) "ظہیر! ظہیر! (دوڑکر اُس کے قدموں سے لپٹ جاتی ہے) یہ واقعہ ہے کہ میں دیوانی ہوگئی تھی۔ میں.....!"

ظہیر "واقعہ! ــــ ہوں! ــ کیا تم واقعہ معلوم کرنا پسند کروگی۔ سنو۔ تم عزت کی زندگی بسر کرتے کرتے تھک گئیں تھیں نجمہ! تم ایک پاک اور مقدس ماں نہیں بننا چاہتی تھی۔ تم نے میری محبت کو ٹھکرادیا۔ اور ایک کمینہ کا دم بھرنے لگیں ــــ یہ ہے واقعہ! (ایک سیکنڈ تک وہ خاموش رہتا ہے) اور میں تمہاری پرستش کیا کرتا تھا۔ اور تم بھی ــــ شاید تمہیں یاد ہو تم نے کئی بار اپنی محبت کا اظہار کیا تھا"

نجمہ (جوش کے ساتھ) "یقیناً مجھے تم سے عشق تھا اور ہے۔ ہم نے ایک دوسرے کو اچھی طرح پہچانا نہیں تھا صرف یہی وجہ تھی ــ اور یہ سب کچھ میری غلطی ہے ــ تم مجھ سے محبت کرتے تھے لیکن میں اس واقعہ سے قطعی بے بہرہ تھی۔ نہ تم نے کبھی اس کا اظہار کیا ــ تم نے مجھے بجائے "شریک حیات" کے صرف "شریک خانہ" سمجھا۔ تم مجھ سے مہربانی سے پیش آتے تھے لیکن کبھی اپنے دردِ و غم میں مجھے شریک نہیں کیا۔ تم نے کبھی میرے دل کی کیفیات کا اندازہ نہیں لگایا اور اسی وجہ سے اکثر یہ ہوتا تھا کہ تمہارے ساتھ ہوتے ہوئے بھی میں اپنے آپ کو تنہا سمجھتی تھی ــ مجھے تم سے عشق تھا لیکن میں تمہاری ہر وقت کی سنجیدگی سے خائف رہتی تھی ــ میں چاہتی تھی کہ میں ہنسوں اور تم بھی میرے ساتھ ہنسو۔ میں چاہتی تھی کہ میں خوش رہوں اور تم بھی میرے ساتھ خوش رہو۔ میں چاہتی تھی کہ میں تمہارے اور تم میرے عشق میں فنا ہوکر رہ جاؤ۔ لیکن تم نے کبھی اس کی پروا نہیں کی تمہیں صرف اپنے کام سے سروکار تھا۔ تمہارے جذبات کا نمذاق

دولت تک محدود تھے اور میں ــــ میرے دل میں ارمانوں کا ایک طوفان تھا حسرتوں کی ایک دنیا تھی لیکن تمہیں کبھی اس کا احساس نہوا۔ آہ ظہیر! مجھے معاف کر دو!"

(ظہیر اپنا سر پکڑ کر ایک کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

نجمہ۔ ...... "میں تسلیم کرتی ہوں کہ یہ سب کچھ میری ہی خطا تھی۔ لیکن اگر تم چاہتے تو میری مدد کر سکتے تھے۔ تم نے مجھ سے محبت کرنے اور میری عزت کرنے کی قسم کھائی تھی۔ لیکن کیا تم نے کبھی اپنے فرائض کا خیال بھی کیا ــ تم نے کبھی محسوس کیا کہ میں تمہاری بیوی ہوں اور ہر اس چیز کی حقدار ہوں جس کی کہ ایک بیوی ہو سکتی ہے۔ تم نے کبھی یہ خیال نہیں کیا کہ میں بھی ایک روح رکھتی ہوں جو تڑپتی ہے ہم جلیسی یگانگت اور موسیقی کے لئے ــ تم ہی ملعون نعیم کو پہلی مرتبہ گھر میں لائے اور تمہیں نے مجھے ترغیب دی کہ میں اس سے محبت کروں۔ تم نے مجھے اجازت دی کہ میں ہر وقت اس کے ساتھ رہوں اور تم کو مقدموں اور مشغلوں میں غرق رہنے دوں ــــ رفتہ رفتہ میری توجہ اس کی طرف مبذول ہوتی گئی۔ وہ مجھ سے ہمدردی کرتا تھا اور ہمیشہ مجھکو خوش رکھنے کی کوشش کرتا تھا اور تم دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے کام میں غرق تھے ــــ اگر تم چاہتے تو مجھے بچا سکتے تھے۔ تمہاری ذرا سی توجہ۔ ایک "دعوت محبت"۔ صحیح احساس کے چند لمحے مجھے اس گناہ سے بچا سکتے جس کی طرف میں کھنچی چلی جا رہی تھی شاید اگر تم مجھے اپنا سچا رفیق سمجھتے تو یہ دن نہ آتا میں نے تم سے مدد کی درخواست کی لیکن تم نے میری درخواست کو رد کر دیا۔ تمہیں یاد ہوگا ایک دن میں نے تم سے تھیٹر چلنے کو کہا۔ لیکن تم نہیں گئے اور یہی کہا کہ "نعیم کو ساتھ لیجاؤ"ــــ ظہیر! ظہیر! تم ہی نے مجھے اپنے ہاتھوں سے گناہ کے غار میں دھکیل دیا ــــ تم اگر میرا گلا گھونٹ دیتے تو یہ اس سے بہتر تھا ــــ للہ! مجھے معاف کر دو!"

ظہیر۔ "نہیں ہرگز نہیں! نجمہ تمہیں جانا پڑے گا!"

نجمہ۔ "میں کہاں جاؤں۔ سوائے اس گھر کے میرا کہیں ٹھکانا نہیں!"

ظہیر۔ "جاؤ اپنے اسی عاشق زار کے پاس جاؤ!"

نجمہ۔ "وہ مر چکا!"

ظہیر۔ (جوش میں کرسی سے اٹھتے ہوئے) "جبھی تم یہاں آئی ہو ــــ اور میں عنقریب شکست کھانیوالا تھا!"

نجمہ۔ "نہیں، میں تم سے ......!"

ظہیر۔ "اس کے مرنے کے بعد ہی میرا خیال آیا!"

نجمہ۔ "ظہیر! مجھے تم سے ہمیشہ سے محبت ہے اور ہمیشہ رہے گی ــ للہ! مجھے معاف کر دو!"

ظہیر۔ "اس گھر سے فوراً نکل جاؤ"

نجمہ (روتے ہوئے) "مجھے اپنے بچے کو دیکھنے دو"

ظہیر۔ "وہ سمجھتا ہے کہ اس کی ماں مر چکی!"

نجمہ۔ (دوڑ کر اس کی ٹانگوں سے لپٹ جاتی ہے) "ظہیر! ظہیر! خدا کے لئے یہ نہ کہو۔ تم کبھی تو مجھ سے محبت کرتے تھے۔ للہ! سعید کو یہ نہ بتاؤ کہ میں مر چکی ہوں ــــ یہ ناممکن ہے! میں تمہاری بیوی ہوں اور اس کی ماں!"

ظہیر۔ "میری اور اس کی زندگی سے اب تمہارا کوئی تعلق نہیں!"

نجمہ۔ "آہ! ــ اے خدا! میری مدد کر ــ ظہیر! رحم کرو ــــ میں توبہ کی زندگی......!"

ظہیر۔ (نجمہ کو پکڑ کر دھکیلتا ہے) "نکل جاؤ اس گھر سے!"

**نجمہ۔** بیٹھ! میرے بچے کو مجھ سے مت چھینو۔ مجھے صرف ایک نظر دیکھنے دو۔ میں ایک لفظ بھی نہ بولوں گی۔ مجھے دور ہی سے دکھا دو ...... !"

**ظہیر۔** (اس کو دروازہ میں سے دھکیلتے ہوئے) "نکل جاؤ یہاں سے!"

**نجمہ کی آواز۔** ظہیر! — رحم! سید! میرا بچہ — میرا بچہ — اللہ تو — ...."

(ظہیر زور سے دروازہ بند کر دیتا ہے اور نجمہ کے آخری الفاظ فنا ہو جاتے ہیں۔)

**پردہ**

## دوسرا منظر

(ظہیر کا ڈرائنگ روم۔ دائیں بائیں دو دروازے ہیں۔ بائیں طرف کا ایک دروازہ ظہیر کے ہکلنے کے کمرے میں کھلتا ہے اور دوسرا سونے کے کمرے میں۔ دائیں طرف کے دونوں دروازے باہر پائیں باغ میں کھلتے ہیں۔ کمرے کے وسط میں ایک چھوٹی سی میز رکھی ہوئی ہے جس پر سگار کا بکس اور ایش ٹرے رکھی ہوئی ہے۔ میز کے چاروں طرف خوشنما صوفے پڑے ہیں۔ فرش پر ایرانی قالین بچھا ہے)

**نرگس** (دائیں طرف کے دروازے سے داخل ہوتی ہے اور اسی طرف رُخ کرکے) "آیئے سہیل صاحب! تشریف رکھئے۔ میں ابھی سرکار کو خبر کرتی ہوں" (سہیل دراز قد مضبوط جسم خوش پوش ہنس مکھ انسان ظہیر کا پرانا دوست داخل ہوتا ہے اور ایک صوفے پر بیٹھ جاتا ہے۔ نرگس بائیں طرف کے دروازے سے چلی جاتی ہے۔ ظہیر اسی دروازے سے داخل ہوتا ہے)

**ظہیر۔** آخاہ! او ملعون انسان تو ابھی زندہ ہے"!

(دوڑ کر سہیل کے پاس جاتا ہے اور اس سے ہاتھ ملاتا ہے)

**سہیل** (گرمجوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے) "آپ کی دعا ہے!"

(دونوں زور زور سے ہنستے ہیں)

**سہیل** (ظہیر کے دونوں شانوں پر ہاتھ رکھکر) "ذرا ٹھہریئے! میں آپ کے بشرے کا جائزہ لینا چاہتا ہوں" (ایک تمسخر آمیز انداز میں کئی مرتبہ ظہیر کو سر سے پاؤں تک دیکھتا ہے) ہوں — زندگی نے تمہیں یا تم نے زندگی کو بُری طرح استعمال کیا ہے! (ظہیر ہنستا ہے) عمر بتاؤں — ؟ چالیس!"

**ظہیر** (سہیل کو دھکا دیکر صوفے پر بٹھاتے ہوئے) "ہشت! صرف تیس اور دو یعنی ۳۲۔ سمجھے۔ ؟"

**سہیل** (سگار نکال کر سلگاتا ہے) "ہرگز نہیں۔ تم بکتے ہو۔ چالیس سے تم کسی طرح کم نہیں"

(ایک سگار ظہیر کو پیش کرتا ہے اور دیا سلائی جلاتا ہے)

**ظہیر۔** (ہاتھ سے شکریہ کا سلام کرتے ہوئے) "اچھا یہ بتاؤ! تم تین سال تک کہاں مارے مارے پھرتے رہے"

**سہیل۔** "ارے کیا پوچھتے ہو یار! تمام جہان کا چکر لگایا گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا۔ مفصل کیفیت پھر انشاء اللہ سناؤں گا"

**ظہیر۔** "تم رات کو تو کم از کم ضرور میرے ساتھ ہو گے"

**سہیل۔** "یقیناً! اور ناشتہ بھی تمہارے ساتھ اڑاؤں گا!"

**ظہیر۔** "ناشتہ تم میرے ساتھ نہ کر سکو گے۔ تمہیں دیر میں اٹھنے کی عادت ہے اور مجھے سویرے ہی عدالت جانا پڑتا ہے۔"

**سہیل۔** "ہاں خوب یاد آیا۔ تمہاری کامیابی پر مبارکباد پیش کرتا ہوں"

**ظہیر۔** اوہ! شکریہ!"

سہیل (کش لگاتے ہوئے) "اور سناؤ ــــ زندگی کیسی کٹ رہی ہے۔ نجمہ کا کیا حال ہے تم جیسے خبیث کے ساتھ رہتے رہتے اب تو وہ تمام شوخی اور شرارت بھول چکی ہوگی۔ مجھے یاد ہے میں اُسے "نجمہ نوری" کہا کرتا تھا (ظہیر کا چہرہ ایک دم سے متغیر ہو جاتا ہے سہیل اس تبدیلی کو محسوس کرتا ہے) کیوں ــــ کیا ہوا ظہیر!"

ظہیر: "کچھ نہیں۔ میرا بچہ مرتے مرتے بچا ہے۔ طویل پریشانی سے میرے اعصاب ذرا کمزور ہو گئے... "

سہیل: "اب کیسی طبیعت ہے؟"

ظہیر: "اب تو حالت رو بہ صحت ہے۔"

سہیل: "کیا نام ہے؟"

ظہیر: "سعید الزماں۔"

سہیل: "خوب اور عمر کیا ہوگی؟"

ظہیر: "پانچ سال کا ہے!"

سہیل: "تب تو پورا انسان ہے میں اُسے ضرور دیکھونگا۔"

ظہیر: "ضرور۔ لیکن صبح کو۔"

سہیل: "خیر صبح کو سہی ــــ تم نجمہ نوری کو ابھی میری آمد کی اطلاع نہ کرنا۔ میں اُس سے اچانک ملنا چاہتا ہوں"

ظہیر: "تم اُس سے نہیں مل سکتے"

سہیل: "کیوں؟ کیا وہ کہیں گئی ہوئی ہے؟"

ظہیر: "ہاں! ــــ ہمیشہ کے لئے!"

سہیل (حیرت سے) "کیا مطلب ــــ؟"

ظہیر: "دو سال ہوئے ــــ وہ مجھے چھوڑ کر ــــ اپنے عاشق کے ساتھ فرار ہو گئی۔"

سہیل (سر نیچا کر کے) "افسوس!"

ظہیر: "تمہیں اُس پر رحم آتا ہوگا؟"

سہیل: "ہاں ــــ کیوں نہ آئے؟"

ظہیر: "اور ــــ اور میری حالت قابل رحم نہیں ــــ میں ــــ جو ــــ اُس کی پرستش کیا کرتا تھا اور ــــ جس کی زندگی اُس نے تباہ کر دی۔ تم اندازہ نہیں لگا سکتے یہ دو برس میں نے کس طرح کاٹے۔ حسد اور انتقام کی آگ نے مجھے جلا کر سیاہ کر دیا۔ گذشتہ ایام عشرت کو یاد کر کے میرا خون اونٹتا ہے۔

(ظہیر اپنی جیب سے رومال نکالتا ہے اور بہت دیر تک دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھکے رہتا ہے) میں نے اُسے دوبارہ بھی دیکھا ــــ!"

سہیل: "کب ــــ؟"

ظہیر: "ایک ہفتہ ہوا وہ مجھ سے معافی مانگنے آئی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ میں اُسے دوبارہ اپنے گھر میں رکھ لوں ..."

سہیل: "اور تم نے کیا کہا ــــ؟"

ظہیر: "میں نے قطعی انکار کر دیا اور اُس کو اپنے گھر سے نکال دیا۔"

سہیل: "کیا گھر سے نکال دیا۔"

ظہیر: "ہاں!"

سہیل: "(وثوق کے ساتھ) ظہیر ــــ! تم نے سخت غلطی کی۔ بغیر یہ جانے ہوئے کہ وہ کہاں جائے گی۔ کہاں رہیگی کیا کریگی تم نے اُس کو گھر سے نکال دیا۔ اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو یہ جان لو کہ تمہیں انجام کار افسوس کرنا پڑے گا ــــ"

ظہیر: "سہیل۔ مجھے تعجب ہے تم اُس کی طرفداری کرتے ہو۔ ذرا میری بھی تو سنو۔ میں جانتا ہوں کہ اُس کو مجھ سے محبت تھی۔ اور اسی محبت کی وجہ سے میں نے اس سے شادی کی لیکن محبت اُس کے دل میں ایک ایسا جذبہ تھا جو ایک سال کے بعد فنا ہو گیا ــــ ایک سال تک میں بہشت میں تھا۔ اور تمام دنیا پر ترس کھایا کرتا تھا کہ وہ میری

طرح خوش نہیں تھی۔ ایک سال بعد سعید پیدا ہوا۔ اور ہماری مسرت میں دوگنا اضافہ ہو گیا — میں دفتر کا کام بھی گھر ہی پر کرنے لگا اس لئے کہ میں ایک لمحے کے لئے بھی اُس کی جُدائی گوارا نہیں کر سکتا تھا۔ اُن میں پاگل تھا میں مجنوں تھا۔ میری خوشی اور میری مسرت اس عارضی زندگی کے لئے بہت زیادہ مکمل تھی۔ اور اسی وجہ سے زمانہ نے اُس کو مجھ سے چھین لیا — کچھ عرصہ بعد ترقی کی آرزو اور اقبال کی تمنا نے مجھے آن گھیرا۔ میں ہر وقت اور ہر لحظہ اسی خیال میں محو رہنے لگا۔ نجمہ اور سعید دونوں میرے دماغ سے نکل گئے اور میں اپنی تمام ترقوتوں کے ساتھ اپنے کام میں غرق ہو گیا۔ نعیم میرے چچا کا بیٹا انہیں ایام میں پیرس سے واپس آیا — بظاہر وہ نہایت شریف ملنسار معصوم اور خلیق معلوم ہوتا تھا۔ میں نے اُس پر اعتماد کیا اور نجمہ کا دل بہلانے کے لئے اُس سے گاہے ماہے آنے کی درخواست کی۔ وہ آتا رہا اور مجھے نجمہ کی طرف سے اطمینان ہو گیا۔ دن و رات میں اپنے کام میں مصروف رہنے لگا — میں اندھا تھا۔ میں بیوقوف تھا۔ ایک رات مجھے کسی ضروری کام کی وجہ سے رات بھر گھر سے غیر حاضر رہنا تھا میں نے نجمہ سے کہا اور تیار ہو کر روانہ ہو گیا۔ اتفاق سے میرا کام جلد ہی ختم ہو گیا اور میں — آہ! خلاف توقع یہاں آ گیا — میں نے کیا دیکھا — خدا تمکو اُس صدمے سے محفوظ رکھے جو مجھے اُس وقت ہوا۔ میں نے دیکھا کہ وہ دونوں ہم آغوش تھے — مجھے دیکھتے ہی وہ فرار ہو گئے اور میں افسوس اپنا ریوالور تلاش کرنے میں رُک گیا میں نے انتہائی غیض و غضب کے عالم میں تمام شہر کا چکر لگایا۔ لیکن ان کا کہیں پتہ نہ لگا۔ دوسرے دن میں نے شہر کے تمام ہوٹل، تمام ریسٹورنٹ اور تمام تماشہ گاہیں دیکھ ڈالیں لیکن اُن کا کہیں بھی سراغ نہ لگا۔ اسکا تیسرے دن پھر میں اُنکی تلاش میں روانہ ہونیوالا تھا کہ نرگس گود میں بچہ کو لئے ہوئے میرے سامنے آئی — سہیل! سہیل! اُس وقت مجھے احساس ہوا کہ میں نے کس چیز کو کھو دیا — میں نے نرگس کو کمرے سے باہر نکال دیا اور اندر سے قفل لگا کر خوب رویا۔ کئی مرتبہ میں نے ریوالور اُٹھایا اور خودکشی کرنے کا ارادہ کیا لیکن بچے کے خیال نے مجھے باز رکھا۔ آخر کار میں نے ارادہ کر لیا کہ میری زندگی چاہے جیسی بے رنگ اور پھیکی گذرے لیکن میں زندہ رہونگا بچے کی خاطر اور اس خیال کے ساتھ ہی میں نے ریوالور کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھینک دیا اور نجمہ کے تمام خط اور تصویریں جلا کر خاک کر دیں — اس کے بعد میں دوبارہ عملی زندگی میں کود پڑا اور اپنی محنت اور جانفشانی سے اس اعزاز اور اقبال کو حاصل کیا جو آج تم دیکھتے ہو — اب بتاؤ ہم دونوں میں سے کون زیادہ قابل رحم ہے؟"

(دو تین منٹ خاموشی رہتی ہے)

**سہیل۔** "ظہیر! میری طرف سے تم کبھی ہمدردی کی توقع نہ رکھو۔ تم جانتے ہو کہ تمہاری ہر تکلیف اور تمہارے ہر درد کو میں اپنا درد سمجھتا ہوں۔ لیکن میں اس سانحہ کو دوسرے زاویہ نگاہ سے دیکھتا ہوں — تمہارا بیان سُننے سے پہلے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ نجمہ کا جرم بہت بڑا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اُس کو بہت کافی سزا مل چکی ہے اور اب وہ اپنے کئے پر پچھتاتی ہے۔ . . ."

**ظہیر۔** "لیکن میں اب اُس کو اپنے گھر میں نہیں رکھ سکتا۔"

**سہیل۔** "وہ تمہاری بیوی ہے اور تم اُس کے ذمہ دار ہو۔"

**ظہیر۔** "میں اُس کا ذمہ دار ہوں؟"

**سہیل۔** "ہاں تم اُس کے ذمہ دار ہو — کون جانتا ہے

کہ اب وہ کس قسم کی زندگی بسر کرے گی"

**ظہیر۔** "سہیل! تم کیا کہہ رہے ہو۔ نجمہ نے مجھے اور میرے گھر کو تباہ کر دیا اور تم اب بھی اُسی کی طرفداری کر رہے ہو — کیا میرے کچھ حقوق نہیں ہیں؟"

**سہیل۔** "تمہارے حقوق! (ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ) ہوں! کیا تم سمجھتے ہو کہ اپنے بچہ کی ماں کو اس طرح گھر سے نکال دینا تمہارے حقوق میں ہی تھا۔ ؟ کم از کم تمہارا ضمیر تو روشن ہونا چاہئے عزیز دوست! تم اپنے حقوق کا تو اس شد و مد کے ساتھ خیال رکھتے ہو لیکن کیا کبھی اپنے فرائض پر بھی غور کیا۔؟ نجمہ جوان بھی اور نادان — کیا تم نے اُس کی پوری طرح نگہداشت کی — تمہارے ہی بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خود تم نے اُس کو ایک غیر شخص کا گرویدہ ہو جانے کا موقع دیا — کبھی تم نے اس کے دل کی کیفیات کا مطالعہ کیا؟ تم اُس سے مسرت حاصل کرنے کی توقع رکھتے تھے لیکن کبھی تم نے بھی اُس کی مسرت کا خیال کیا؟ تم نے اُس کو اپنے گھر سے نکال دیا اور اب کہتے ہو کہ تمہیں اُس سے محبت تھی . . . . ."

**ظہیر۔** "خدا بہتر جانتا ہے مجھے اُس سے عشق تھا۔"

**سہیل۔** "تم غلط کہتے ہو۔ تمہیں اُس سے قطعی محبت نہیں تھی — صحیح محبت حقارت اور جذبہ انتقام سے زیادہ قوی الاثر ہوتی ہے — محبت محبوب کے ہر عیب کو خوبی سے بدل دیتی ہے — تمکو نجمہ سے صحیح محبت نہیں تھی تم اُس کے حسن اور اُس کے جسم کے پرستار تھے۔ لیکن اُس کی شخصیت کا تم پر کوئی اثر نہیں تھا۔ تمہارا ذہن جذبہ محبت سے خالی تھا اور تم اُس کی ہر کمزوری کو محسوس کر لیتے تھے — یہ چیزیں اصول محبت کے منافی ہیں" (ظہیر کے چہرہ پر غصہ اور بےچینی کے آثار ظاہر ہوتے تھے) "سنو ظہیر! نجمہ تمہارے بچہ کی ماں ہے تم نے اُن دونوں کو جدا کرنے میں سخت غلطی کی۔ بجائے اس کے کہ تم اس کی مدد کرتے تم نے اس کو گھر سے نکال دیا! اگر تم چاہتے تو اُس کو ایک "خطرناک مستقبل" سے محفوظ رکھ سکتے تھے۔ لیکن تم نے خود اپنے ہاتھوں سے اُس کو گناہ کے تاریک غار میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دھکیل دیا۔ — اُس نے نادانی سے ایک گناہ کا ارتکاب کیا لیکن بعد میں اپنے کئے پر پچھتائی۔ باوجود اس کے تم نے اُس کی معافی کی درخواست کو رد کر دیا۔ گویا اس کو "گناہ اور اس کی مزدوری موت" کے سپرد کر دیا . . . !"

**ظہیر۔** (بیتابی سے) "نہیں۔ نہیں!"

**سہیل۔** (پر زور لہجہ میں) "یقیناً! تم نے اس پر قطعی غور نہیں کیا کہ وہ اب کس قسم کی زندگی بسر کریگی! اور اس کا کون ذمہ دار ہوگا — اور میں سمجھتا ہوں کہ تم شاید اب تک اپنے آپکو ایک باعزت انسان ایک لائق شوہر اور ایک قابل باپ سمجھتے ہوگے — ظہیر! بخدا! اگر تم اپنے فرائض کو انجام دینے میں کوتاہی کروگے تو میں اس نجمہ بیت کو اپنے ذمہ لیتا ہوں ؟

**ظہیر۔** (گھبرا کر) "اس سے تمہارا کیا مطلب؟"

**سہیل۔** "یعنی یہ کہ نجمہ اب بجائے تمہارے میرے گھر میں نیک نامی کی زندگی بسر کریگی۔ میں اس کی نگہداشت، اُس کی بہبودی اور اس کی خوشی کے لئے اپنی زندگی وقف کر دونگا — اور اس کے عوض میں اُس سے کچھ نہ چاہونگا!!"

**ظہیر۔** (حالت اضطراری میں) "بتاؤ میں کیا کروں — مجھے کیا کرنا چاہئے؟"

**سہیل** (کھڑے ہوتے ہوئے) "کیا کرنا چاہئے! — میں نجمہ کی تلاش کرنے جا رہا ہوں! تم میرے ساتھ چلتے ہو؟"

(ظہیر ہاتھ پھیلا کر سہیل کی طرف بڑھتا ہے۔ سہیل اُس

سے ہاتھ ملاتا ہے ایک لمحے تک دونوں ساکت رہتے ہیں پھر داہنی طرف کے دروازہ سے نکل جاتے ہیں)

پردہ

## تیسرا منظر

(ظہیر کا لکھنے کا کمرہ۔ ظہیر بیٹھا لکھ رہا ہے۔ داہنی طرف کا دروازہ ایک دم سے کھلتا ہے اور ڈاکٹر فضل عظیم گھبرایا ہوا داخل ہوتا ہے)

**ڈاکٹر فضل** (گھبراہٹ کے لہجہ میں) "ظہیر! کیا یہ صحیح ہے کہ نجمہ کی لاش ایک کنوئیں سے برآمد ہوئی! میں نے ابھی اخبار میں پڑھا"

**ظہیر** (ایک دم سے چونک پڑتا ہے پھر قلم ہاتھ سے رکھ کر) "ہاں! یہ واقعہ ہے! مگر کیا یہ خبر اخبار میں درج تھی"

**ڈاکٹر فضل** "ہاں! میں نے آج ہی انگوار ٹائمز میں پڑھا ہے — مگر بتاؤ تو کیا تم نے نعش کو اچھی طرح دیکھا بھی تھا"

**ظہیر** (مردہ لہجہ میں) ہاں میں نے اور سہیل نے خوب اچھی طرح دیکھا تھا۔ نعش بالکل سڑ گئی تھی چہرہ قطعی نہیں پہچانا جاتا تھا۔ مگر جوتے نجمہ کے تھے اس کے علاوہ اس کی انگوٹھی بھی تھی جو میں نے خود نجمہ کو دی تھی۔ کپڑے بھی میں نے پہچان لئے تھے۔ نعش سوائے نجمہ کے اور کسی کی ہو نہیں سکتی"

**ڈاکٹر فضل** (افسوس ناک لہجے میں) "افسوس! اخبار میں چھپ جانے کی وجہ سے تمہاری بدنامی ضرور ہوگی"

**ظہیر** "خیر۔ مجھے بدنامی کا اتنا خیال نہیں جتنا مجھے اس سانحے کا رنج ہے۔ کیا بتاؤں دوست! میں کچھ کر نہیں سکتا۔ اگر سعید کا خیال مانع نہ ہوتا تو میں بھی خودکشی کر لیتا — آہ! نجمہ کی موت کا باعث صرف میں ہوں۔ اُف میں نے ہی اُسے قتل کیا — اگر میں — میں کچھ بھی شعور سے کام لیتا تو آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا — میرا ضمیر مجھے ہر لمحے ملامت کرتا ہے — کاش میں نجمہ کی اُس شرمناک حرکت کے معاملے میں درگذر سے کام لیتا اور اُس کو دوبارہ اپنے ہاں رکھ لیتا! — نجمہ کا خون میری گردن پر ہے — او خدا! مجھے معاف کر دے — میں بیوقوف تھا۔ میں نادان تھا — مجھے اپنے افعال کا انجام معلوم نہیں تھا — آہ! میں ضمیر کی لعنت کو کیسے برداشت کر سکتا ہوں۔ کاش ...... !"

**ڈاکٹر فضل** "خیر! ظہیر صبر کرو قسمت کا لکھا پورا ہونا تھا سو ہو کر رہا۔ تمہاری اس میں کوئی خطا نہیں۔ اللہ سب کچھ جانتا ہے وہ تمہیں ضرور معاف کریگا ......"

**ظہیر** "اگر سہیل صرف ایک دن پہلے آجاتے تو شاید ہم نجمہ کو بچا سکتے — مگر تقدیر! ہم نے سارے ایشیائے کوچک کو چھان مارا۔ لیکن کہیں اُسکا پتہ نہ چلا۔ ہار کر پولیس میں خبر کی۔ کل ایک کنوئیں سے نعش برآمد ہوئی۔ چونکہ اور کوئی نعش کا دعویدار نہ تھا۔ اس لئے پولیس نے مجھے طلب کیا۔ اور نعش فی الواقع نجمہ کی نکلی — میں نے اور سہیل نے خوب اچھی طرح پہچان لیا — آہ! — ! اللہ معاف کرنے والا ہے!"

**ڈاکٹر فضل** "تم نے دفن کہاں کروایا؟"

**ظہیر** "مرشد والے مقبرے کے احاطے میں ......"

**ڈاکٹر فضل** "میں اس کی قبر پر جانا چاہتا ہوں — اگر تمہارا کچھ ہرج نہ ہو تو ذرا میرے ساتھ چلے چلو!"

**ظہیر** "چلو ضرور چلو — میں ہر روز صبح و شام اُس کی قبر پر جاتا ہوں اور اُس کی روح سے معافی مانگتا ہوں — جو چیز میں اُسے نہ دے سکا آج خود اُس سے مانگتا ہوں۔ آہ —! آؤ چلو"

(دونوں دائیں طرف کے دروازے سے نکل جاتے ہیں)

(وقفہ)

# مجلس دوم

## پہلا منظر

(سیدوستا اکتوبر ۱۹۴۲ء کمال ہوٹل کمرہ نمبر ۲۳ دائیں طرف ایک دروازہ بائیں طرف دوسرا دروازہ جو ڈریسنگ روم میں کھلتا ہے سامنے کے رخ دیوار سے ملحق ایک بڑی مسہری بچھی ہے بائیں طرف ایک چھوٹی میز اور اس کے قریب دو کرسیاں پڑی ہیں فرش پر ایک معمولی سی دری بچھی ہے دائیں طرف کے دروازے سے ہوٹل کا مینجر اور اس کے پیچھے ایک مزدور ٹرنک اُٹھائے داخل ہوتا ہے نجمہ اور فاروق داخل ہوتے ہیں نجمہ بمشکل پہچانی جا سکتی ہے۔ اس کے بال پریشان ہیں مرجھائے ہوئے چہرہ پر وحشت برس رہی ہے۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے ہیں بات بات پر مجنونانہ طریقے سے ہنستی ہے۔ فاروق ایک کریہ المنظر لمبے قامت انسان)

**مینجر** "جناب! کمال ہوٹل میں آپ کو اس سے بہتر کمرہ نہیں مل سکتا۔ دیکھئے اس کمرہ کے برابر ہی ڈریسنگ روم بھی ہے"

**فاروق** "خیر جو کچھ بھی ہو ہمیں کچھ زیادہ دن تو یہاں نہیں رہنا"

(نجمہ خواہ مخواہ ہنستی ہے اور ایک کرسی پر بیٹھ جاتی ہے)

**فاروق** (مینجر کو مخاطب کر کے) "مسٹر! کیا کوئی صاحب کبھی ہم فاروق کو تو پوچھتے ہوئے نہیں آئے تھے؟"

**مینجر** "ہاں ہاں! ابھی دو گھنٹے ہوئے ایک صاحب آئے تھے اور اپنا کارڈ چھوڑ گئے ہیں ابھی آپ کو دفتر سے کارڈ لا کر دیتا ہوں ــــ اور کوئی خدمت؟"

**نجمہ** (چونک کر) "ایک بوتل سنتھی اور ایک ٹین سگریٹ"

**فاروق** "ہمارا باقی اسباب ڈرائنگ روم میں رکھوا دو ـــ بس شکریہ"

(مینجر جاتا ہے مزدور سفری سامان، سوٹ کیس، ہولڈ آل، ٹفن باسکٹ وغیرہ لا لا کر ڈریسنگ روم میں رکھتا ہے مینجر دوبارہ داخل ہوتا ہے)

**مینجر** (ایک کشتی میں کارڈ پیش کرتے ہوئے) "لیجئے جناب!"

**فاروق** (کارڈ لے کر پڑھتا ہے) ایم شہباز (مینجر سے) "اب اگر یہ صاحب آئیں تو ان کو یہاں لے آنا" (مینجر چلا جاتا ہے)

**نجمہ** (دیوانہ وار ہنستے ہوئے) "بہر صورت یہ جہاز سے تو بہتر ہی ہے"

**فاروق** (جلدی جلدی اپنی جیبیں خالی کرتا ہے اور میز پر مختلف چیزیں رکھتا ہے جن میں ایک پستول بھی ہے) "ہاں! کم از کم تمہیں تو یہاں آنے کی ضرور خوشی ہو رہی ہوگی"

**نجمہ** "اس سرزمین پر آج سترہ برس کے بعد قدم رکھ رہی ہوں"

**فاروق** "مجھے یقین ہے کہ تم یہاں زیادہ تبدیلی نہ پاؤگی"

**نجمہ** "میں کسی چیز میں تبدیلی نہیں پاتی سوائے اپنے آپ میں ـــ میں سوچ رہی ہوں کہ جب میں یہاں سے گئی تھی تو کیا تھی اور آج سترہ برس کے بعد جب یہاں آئی ہوں تو کیا ہوں ....."

**فاروق** (ڈریسنگ روم میں جاتے ہوئے) "اگر تمہیں اس خیال سے تکلیف ہوتی ہے تو اس کو بھلانے کی کوشش کرو"

**نجمہ** "یقیناً یہی بہترین طریقہ ہے ـــ بیس برس گذرے

میں جوان تھی اور حسین ......"

**فاروق** (ڈریسنگ روم میں سے بولتا ہے) "اب بھی تم بجلی کی روشنی میں کچھ کم حسین نہیں معلوم ہوتیں"

**نجمہ** "...... میرا شوہر تھا اور ایک بچہ — آہ! — اب میں اکیلی ہوں اور میرا کوئی ....."

**فاروق** کی آواز "میرے وجود خاکی کو آپ نے قطعی طور سے فراموش کر دیا"

**نجمہ** "حکومت میں آج بیوقوف نہیں بننا چاہتی"

**فاروق** کی آواز "تو یہ کہیے کہ آج آپ کے مزاج درست ہیں"

**نجمہ** "زندگی سے مجھے نفرت ہو گئی ہے"

**فاروق** (لباس تبدیل کرنے کے بعد باہر آتا ہے اور نجمہ کی پشت پر آہستہ سے ہاتھ مارتے ہوئے کہتا ہے) "خانم! ہمت کرو — میں جانتا ہوں کہ تم ایک امیر عورت تھیں لیکن اب نہیں ہو تمہیں پرواہ نہیں کرنی چاہئے ہر شخص کی زندگی میں نشیب و فراز ہوتے ہیں — مجھے دیکھو میں ایک وکیل کا کلرک تھا لیکن اب کچھ بھی نہیں انسان کو اپنی تقدیر پر صابر رہنا چاہئے — جیسا وقت پڑے گذار دو اور جتنا روپیہ ملے خرچ کر ڈالو۔ خانم یہی میرا ایمان ہے روپیہ ہی ایک ایسی چیز ہے جس کا انسان کو خیال رکھنا چاہئے!"

**نجمہ** "تم روپے کی خاطر ہر ایک کام کرنے کے لئے تیار رہو یہ میں جانتی ہوں ....."

(ہوٹل کا ملازم اسنتھی اور سگریٹ لیکر آتا ہے اور دونوں چیزوں کو میز پر رکھکر چلا جاتا ہے)

**فاروق** (بے صبری سے ہاتھ ملتے ہوئے) "پلواؤ لپک کر ایک گلاس پلواؤ"

(نجمہ دو گلاس تیار کرتی ہے ایک گلاس فاروق اٹھاتا ہے اور دوسرا نجمہ، دونوں اپنے اپنے گلاسوں کو برابر لاتے ہیں اور پھر پی جاتے ہیں۔)

**فاروق** "سگریٹ پلواؤ" (نجمہ ٹین کھول کر ایک سگریٹ فاروق کو دیتی ہے اور ایک خود جلاتی ہے)

**نجمہ** (اطمینان کا سانس لیتے ہوئے) "اب بتاؤ تمہارا یہاں کب تک قیام کرنے کا ارادہ ہے"

**فاروق** (سگریٹ کا کش لیتے ہوئے) "یہ سب کچھ شہباز پر مبنی ہے — دیکھو وہ کیا کہتا ہے"

**نجمہ** "یہ شہباز کون ہیں؟"

**فاروق**۔ "ایک وکیل ہے میں اسی کا کلرک تھا"

**نجمہ** "کس قسم کا آدمی ہے"

**فاروق** "اوہ! شیطان سے زیادہ عقلمند ہے تمام جہان کے قوانین اس کو ازبر ہیں میں نے اسی سے اپنا یہاں تک آنے کا کرایہ منگوایا تھا وہ لومڑی سے زیادہ مکار ہے اور اس کو میری یقیناً ضرورت ہوگی ورنہ کیوں ایک ہزار قرش خرچ کرتا ......"

(دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آتی ہے فاروق بڑھکر دروازہ کھولتا ہے شہباز اور اس کا ساتھی قاسم داخل ہوتے ہیں)

**شہباز** (ہنستے ہوئے) "آہاہ! فاروق ......"

**فاروق** (سرگرمجوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے) "مسٹر شہباز! — واللہ آپ تو خوب بقول شخصے موٹے تازے ہو گئے ہیں"

**شہباز** (قہقہہ لگاتے ہوئے) "ہاں بھئی الغرض مرد معقول — موٹے آدمیوں میں رازداری کی زیادہ صلاحیت ہے ....."

(شہباز اچانک نجمہ کو دیکھتا ہے اور مودبانہ طریقہ پر

جھکتا ہے قاسم اس کی پیروی کرتا ہے)

**فاروق** (تعارف کراتے ہوئے) "بیرسٹر شریک حیات۔ گذشتہ چھ مہینے سے"

(شہباز اور قاسم دوبارہ جھکتے ہیں نجمہ سر ہلاتی ہے پھر بیٹھتی اور سگریٹ میں محو ہو جاتی ہے)

**فاروق** (قاسم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) "آپکی تعریف"

**شہباز** "ایم قاسم، میرے پر خلوص دوست اور شریک کار"

**فاروق** (قاسم سے ہاتھ ملاتے ہوئے) "آپ سے نیاز حاصل کرکے بہت خوشی ہوئی — تشریف رکھیے"

(تینوں بیٹھ جاتے ہیں)

**فاروق** (شہباز کو مخاطب کرتے ہوئے) "سب سے پہلے مجھے آپکے ارسال کردہ ایکہزار قرض کا شکریہ ادا کرنا چاہیے"

**شہباز** (مسکراتے ہوئے) "ہاں جب تمہارا خط آیا تو میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ زمانہ تمہاری موافقت نہیں کر رہا چنانچہ تمہاری مدد کرنی اپنا فرض سمجھا — تھا زیادہ تر اس وجہ سے کہ مجھے تم سے ایک بہت ضروری کام بھی لینا"

**فاروق** "وہ کیا؟"

**شہباز** "سنو میں نے وکالت چھوڑ کر اب قوم کی خدمت کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے"

**فاروق** (ہنستے ہوئے) "میں اس قابل رشک ترقی پر مبارکباد پیش کرتا ہوں"

**شہباز** "اعتماد پیدا کرنے کا ایک ہی ذریعہ ہو سکتا ہے"

**قاسم** "یقیناً! اور اس زمانہ میں اعتماد حاصل کرنے کی بہت ضرورت ہے — آج ہم دیکھتے ہیں کہ نہ بزرگ چھوٹوں کا لحاظ رکھتے ہیں اور نہ چھوٹے بزرگوں کا ادب"

**شہباز** "میں ایک خاص قسم کا کاروبار بھی کر رہا ہوں"

**فاروق** "کس قسم کا کاروبار؟"

**شہباز** "خفیہ مشن!"

**فاروق** "یعنی"

**شہباز** "ہم لوگ زیادہ تر بنی نوع انسان کی کمزوریوں اور غلطیوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں"

**نجمہ** (اٹھتے ہوئے) "مجھے آپ لوگ معاف کرینگے میں ذرا نیچے جاتی ہوں"

(شہباز اور قاسم کھڑے ہو جاتے ہیں نجمہ جاتی ہے)

**فاروق** "نہایت نیک کاروبار ہے لیکن کیا آپ کو اس میں کافی آمدنی ہو جاتی ہے"

**شہباز** "کافی! صاحبزادے اگر ایک پالیسی بھی کامیاب ہو جائے تو وارے نیارے ہو جاتے ہیں"

**فاروق** "لیکن آخر کس طرح!"

**شہباز** "تمہیں سب کچھ رفتہ رفتہ معلوم ہو جائے گا پہلے تم ہمارے شریک بنجاؤ تنخواہ کے علاوہ تم کو کل منافع پر دس فیصدی کمیشن بھی ملے گی"

**فاروق** "میں پوری طاقت سے آپکے ساتھ ہوں"

**قاسم** "طاقت کی اتنی ضرورت نہیں جتنی مکاری کی"

**شہباز** "ہمارا کاروبار زیادہ تر اُن لوگوں سے متعلق ہے جو اپنی ظاہری یا باطنی زندگی کے باعث سماج کو بدنام کرتے ہیں"

(فاروق ایک خفیف مسکراہٹ سے شہباز کی داد دیتا ہے)

**شہباز** "ذرا خیال کرو کتنی شرم کی بات ہے اس صوبہ کی ایک سربرآوردہ ہستی نے اپنی بیوی کا مہر دبا رکھا ہے"

**فاروق** "وہ کون ہے؟"

**شہباز** "آہستہ آہستہ تمہیں تمام حالات سے آگاہ کر دیا جائیگا — خیر! یہ بتاؤ تم نے شادی تو نہیں کی میرا مطلب نکاح

سے ہے۔"

فاروق "نہیں صاحب! بھلا اتنی بڑی غلطی مجھ سے ہو سکتی ہے؟"

قاسم۔ "تو لطف آجائیگا۔"

شہباز "عورت خانہ داری کیلئے ایک نعمت ہے لیکن کارِ بازی دنیا وہ......" (کھانستا ہے)

قاسم "یہ حقیقت ہے ـــ یہ خاتون ہے بہت نستعلیق اور ایک حد تک حسین بھی ـــ"

فاروق۔ "میں اس سے دمشق میں ملا تھا اور اسیوقت سے یہ میرے ساتھ ہے ویسے تو اس میں کوئی عیب نہیں ہے مگر ہر وقت شراب، ایتھر، مورفائن اور افیلن میں دھت رہتی ہے اور کہتی ہے میں اپنے آپ کو فراموش کر دینا چاہتی ہوں عالی نسب ہے اور کہتی ہے میرا شوہر ایک معزز آدمی تھا"

شہباز۔ "واقعی وہ بروسلز میں سب جج تھا۔ اس عورت نے اس کے ساتھ بیوفائی کی اور اُس نے اسے نکالدیا۔"

قاسم۔ "اُف ـــ اُف۔ اس بدکار زمانہ میں مجسٹریٹوں اور ججوں کے اخلاق بھی درست نہیں......!"

فاروق۔ "جب میں اس سے ملا تو وہ یہاں آنے کے لئے تڑپ رہی تھی لیکن ایک کوڑی بھی پاس نہیں تھی میں از راہ ترحم اُس کو اپنے ساتھ لے آیا۔ دوسرے یہ کہ میں اتنی بڑی مسافت تنہا کیسے طے کرسکتا تھا.......!" (ہنستا ہے)

شہباز۔ "کیا اُس نے تمہیں اپنے متعلق اور کچھ بھی بتایا؟"

فاروق۔ "ہاں نشہ میں وہ بہت کچھ بکتی رہتی تھی کبھی اپنے مرجانے کی دعائیں مانگتی تھی اور کبھی اپنے بچہ کو دیکھنے کی لیکن اپنے شوہر سے وہ قطعی نفرت کرتی تھی۔"

شہباز۔ "اچھا بھئی سنو! اُس کا خاوند آج سے سترہ برس پہلے سب جج تھا تو آج کیا وہ ہائیکورٹ کا جج نہ ہو گا۔"

قاسم "یقیناً! ـــ شاید اُس نے اب پنشن لے لی ہو!"

شہباز۔ "اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ وہ ایک قابل رشک عہدہ پر فائز ہے تو کیا وہ یہ پسند کرے گا کہ اُس کی بیوی بازاروں میں پھرتی پھرے؟ ـــ ہرگز نہیں ـــ وہ یقیناً ہر قسم کی قربانی کرنے کو تیار ہو گا۔"

قاسم "بھئی کیا بات کہی ہے تم نے۔ دیکھا فاروق صاحب! یہ ہے قوم کی سچی رہنمائی.....!"

شہباز۔ "کیا تم اُس کے خاوند کا نام جانتے ہو؟"

فاروق "نہیں! اس نے کبھی نہیں بتایا۔"

شہباز۔ "خیر کوئی مضائقہ نہیں اس کا پتہ لگانا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔"

قاسم۔ "بالکل بچوں کا کھیل.....!"

فاروق۔ "لیکن اسی کو تلاش کرنے سے ہمیں فائدہ؟"

شہباز۔ "ارے میاں تم بھی نرے گاؤدی ہو۔ اپنی بیوی کو بغیر طلاق کے اور بغیر مہر ادا کئے گھر سے نکال دینا کوئی جرم ہی نہیں ہوا کیا؟"

فاروق۔ "اوہو! اب میں سمجھا۔ واللہ لطف آجائیگا"

(نجمہ داخل ہوتی ہے اور آتے ہی ابسنتھ کا ایک گلاس پیتی ہے اور مجنونانہ حرکتیں کرتی ہوئی ڈریسنگ روم میں داخل ہو جاتی ہے)

شہباز (رازدارانہ لہجے میں) "اب تم میرے ساتھ چلو۔ میں تم کو اور بہت سے ضروری امور اچھی طرح سے سمجھا دونگا۔ اُس کے بعد تم یہاں آنا اور آہستہ سے)

کوشش کرنا کہ تم خانم سے کوئی خط وغیرہ حاصل کر لو اور پھر اپنی مہم پر روانہ ہو جانا — تنخواہ اور دس فیصدی کمیشن سمجھے — !"

فاروق گرمجوشی سے ہاتھ ملاتا ہے سب کھڑے ہو جاتے ہیں۔ فاروق ڈریسنگ روم کے قریب جاکر "خانم! میں ذرا ان لوگوں کے ساتھ ایک ضروری کام کو جا رہا ہوں۔ ابھی آدھ گھنٹہ میں واپس آتا ہوں۔"

**نجمہ** کی آواز (قہقہہ لگاتے ہوئے) "ضرور!" (سب چلے جاتے ہیں)

**پردہ**

## دوسرا منظر

(کمال ہوٹل کا نمبر ۲۲ نجمہ پلنگ پر بیٹھی پرانے گھسے ہوئے تاشوں سے "تنہائی" کا کھیل کھیل رہی ہے ایک چھوٹی میز اس کے پلنگ کے قریب رکھی ہوئی ہے اور اس پر ابسنتھی کی بوتل اور ایک گلاس رکھا ہوا ہے نجمہ بار بار اس میں سے ایک گھونٹ پیتی ہے ہوٹل کی ملازمہ گلشن داخل ہوتی ہے)

**گلشن**: "خانم معاف کیجیے گا میں مخل ہوئی۔ لیکن یہ مداخلت ناگزیر ہے (رائٹنگ پیپر اور پنسل پیش کرتی ہے) — ازراہ عنایت آپ دونوں صاحبوں کے نام مستقل پتہ اور یہاں آنے کا سبب لکھ دیجیے۔"

**نجمہ** (وحشیانہ طور پر زور سے ہنستے ہوئے رائٹنگ پیپر اور پنسل گلشن کے ہاتھ سے چھین لیتی ہے اور جلدی جلدی لکھ کر پیپر اور پنسل گلشن کو واپس کرتی ہے اور فوراً ہی ابسنتھی کا گلاس منہ سے لگا لیتی ہے۔ گلشن تاش کی طرف غور سے دیکھتی ہے)

**نجمہ** (ہنستے ہوئے) "کیا ہے گلشن؟"

**گلشن**: "خانم کیا آپ تاش کے ذریعہ فال نکالنا جانتی ہیں؟"

**نجمہ** (ہنستے ہوئے) "اوہ! میں ماہر ہوں ماہر!"

**گلشن** (دلچسپی کے ساتھ) "تو کیا آپ نے کبھی اپنے متعلق فال نکالی ہے؟"

**نجمہ** (سنجیدگی سے) "ہاں! ہاں! کئی مرتبہ — لیکن ہمیشہ موت میری موت! اور بہت جلد — !!!"

(گلشن حیرت زدہ ہو جاتی ہے)

**نجمہ**: "ہمیشہ یہی فال نکلتی ہے کہ میں بہت جلد مر جاؤں گی لیکن اپنی موت سے پہلے اُن دو ہستیوں سے ضرور ملونگی جن میں سے ایک کو میں بہت عزیز رکھتی ہوں اور دوسرے سے نفرت کرتی ہوں۔"

**گلشن**: "تو خانم کیا آپ اس فال کی قائل ہیں؟"

**نجمہ** (گلشن کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے) "لیکن تم تو شاید اس کی قائل نہیں ہو.....!"

**گلشن**: "نہیں میں کچھ کچھ قائل ہوں"

**نجمہ** (وحشیانہ طریقہ پر قہقہہ لگاتی ہے اور پھر گلاس منہ سے لگا لیتی ہے)

**گلشن** (غیر معمولی بے تکلفی سے) "خانم یہ آپ ابسنتھی پی رہی ہیں کیا؟"

**نجمہ** "ہاں! — ہاں!"

**گلشن**: "اس میں سے تو بہت بدبو آتی ہے نہ معلوم آپ اسے کیوں پسند کرتی ہیں — آخر آپ کو اس سے کیا فائدہ ہوتا ہے؟"

**نجمہ** "فائدہ! (زور سے ہنستی ہے۔) ارے! ایک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے آیا سمجھ میں! — ایک گونہ بیخودی! — بیخودی! — بیخودی!!!"

(گلشن حیرت سے نجمہ کی اس وحشت کو دیکھتی ہے)

**نجمہ** (سنجیدگی سے) "اچھا تم کس چیز کی فال نکلوانی چاہتی ہو؟"

**گلشن** (دلچسپی کے ساتھ) "واہ یہ اگر میں نے بتا دیا تو آپ کی فال کس کام کی — میں ہر چیز کی فال نکلوانی چاہتی ہوں" (مسکراتی ہے)

**نجمہ** (پر زور لہجہ میں) "اچھا — اچھا! تم مجھے کچھ نہ بتاؤ میں سب کچھ ابھی معلوم کر لونگی"۔

(نجمہ کھڑی ہو جاتی ہے اور تاش کے پتوں کو پلنگ پر عجیب طریقہ سے پھیلا دیتی ہے۔ کچھ پتوں کو کھول کر دیکھتی ہے) "تمہاری شادی ہو چکی ہے!"

**گلشن** "ہاں"

**نجمہ** "تمہارا ایک بچہ ہے!"

**گلشن** "ہاں!"

**نجمہ** "تمہیں اپنے شوہر سے محبت نہیں ہے!"

**گلشن** "بالکل! بالکل نہیں!"

**نجمہ** "تم عنقریب اپنے شوہر کو چھوڑ کر ایک دوسرے شخص کے ساتھ جس کو تم اپنا عاشق سمجھتی ہو فرار ہونا چاہتی ہو......"

**گلشن** "قطعی! آپ نے سب باتیں بالکل ٹھیک بتائیں"

(نجمہ تاش کو سمیٹ کر میز پر رکھتی ہے اور گلاس منہ سے لگاتی ہے)

**نجمہ** (نئے جوش کے ساتھ) "اری لڑکی تو کیوں دیوانی ہوئی ہے — میری بات یاد رکھ تو ضرور اپنے کئے پر پچھتائے گی۔ اگر تجھے اپنے شوہر سے محبت نہیں ہے تو نہ سہی لیکن خبردار ایسی غلطی کبھی مت کیجیو کہ اس کو چھوڑ کر اپنے بیوقوف عاشق کے ساتھ فرار ہو جائے۔ ۔ ۔"

**گلشن** "نہیں! نہیں! عثمان بہت عقلمند ہے اور میں آج ہی رات کو اس کے ساتھ چلی جاؤں گی"

**نجمہ** (نصیحت آمیز لہجہ میں) "دیکھ تجھے پچھتانا پڑے گا"

**گلشن** "نہیں خانم! ایسا کبھی نہیں ہو سکتا عثمان کو میری پرچھائیں سے عشق ہے — سچا عشق!"

**نجمہ** "ہوں!! ہوگا۔ لیکن کچھ عرصہ تک — اس کے بعد وہ تجھکو چھوڑ دے گا اور پھر تو دربدر پھرتی پھرے گی۔ بیشمار عاشق پیدا ہونگے اور سب ایک ایک کر کے رخصت ہو جائیں گے — اور پھر تو دیکھے گی کہ کتوں کی سی زندگی کس کو کہتے ہیں۔ میں جانتی ہوں — یہ میرا تجربہ ہے!!!"

**گلشن** (تعجب سے) "کیا آپ بھی میری طرح...!"

**نجمہ** "ہاں! میں، شاید تیری ہی عمر کی ہونگی جب میں — آج سے سترہ برس پہلے — اپنے شوہر اور اپنے بچہ کو چھوڑ کر اپنے ایک عاشق کے ساتھ فرار ہوئی تھی۔ مجھے اپنے شوہر سے نفرت ہے شوہر! ہوں! — ظالم! بیدرد! بے رحم! وحشی! درندہ!... لیکن میرا بچہ! اوہ! میں اس کو دیکھنے کے لئے تڑپ رہی ہوں۔ اب تو وہ ماشاءاللہ — جوان ہوگا۔ اگلے مہینے سے اپنے بائیسویں سال میں لگ جائے گا — میں اس پر ناز کیوں نہ کروں میرا بچہ ہے — دن رات مجھے اسی کا خیال رہتا ہے — مجھے یقین ہے کہ میں اس سے ضرور ملونگی — لیکن آہ! میں اس کو گلے سے نہیں لگا سکونگی میں اس کو دیکھوں گی — دور سے مگر اس کو پیار

نہیں کر سکوں گی —— وہ یہ نہیں جانے گا کہ میں ایک ماں ہوں۔ وہ سمجھتا ہے کہ اُس کی ماں برسوں ہوئے مر چکی —— اوہ! سعید! میرا بچہ! ——!"

(اُس کی ہچکی بندھ جاتی ہے)

گلشن: "(متوحش ہو کر) "خانم! رنج نہ کرو۔"

نجمہ (چونک کر) "رنج نہ کروں؟ تو کیا خوش ہوں؟ ہنسوں؟ —— تو کیا سمجھتی ہے میں سترہ سال تک کہاں کہاں رہی؟ —— یہ فاروق گیا ہوا آدمی ہے جس کی میں بیوی بنی ہوں اس سے پہلے دس بیہودہ آدمی میری محبت کا دم بھر چکے اور مجھے چھوڑ چھوڑ کر فرار ہو چکے ہیں۔ سُنا تو نے ان سترہ سالوں میں میں نے دنیا جہان کی خاک چھان ڈالی دمشق، بغداد، بصرہ، انگورہ، دیاربکر، اڈانا، حلب، آبنائے باسفورس پھر سمندر پار اور خدا معلوم کہاں کہاں کی ٹھوکریں کھائیں —— اور تو بھی اب وہی بننے والی ہے جو میں بن چکی ہوں سمجھی! یہ تیری خوبصورتی کچھ دن میں غائب ہو جائے گی اور پھر لوگ تیری طرف حقارت سے دیکھیں گے۔ مرد بہت جلد تھک جاتے ہیں۔ سُنا؟ جہاں تیرا رنگ روغن غائب ہوا اور تیرے عاشقوں نے تجھ سے کنارہ کرنا شروع کیا۔"

گلشن: "لیکن مجھے یقین ہے کہ عثمان مجھے کبھی نہیں چھوڑے گا۔"

نجمہ (غصہ سے) جا! دفعان ہو! بیوقوف لڑکی۔ نکل جا اس کمرہ سے —— جا! اپنا منہ کالا کر!

(گلشن ڈرتی ہوئی جاتی ہے۔ نجمہ ابسنتھ کی بوتل سے لگاتی ہے اور ایک دو گھونٹ پیکر بوتل میز پر رکھتی ہے اور پھر جلدی سے ایک سگریٹ سلگا کر زور سے ہنستی ہے۔ خاموش ہو جاتی ہے۔ تھوڑی دیر غور کرتی ہے اور پھر ہنسنا شروع کر دیتی ہے۔ فاروق داخل ہوتا ہے نجمہ ایک دم سے سنجیدہ ہو جاتی ہے)

فاروق (لاپرواہی کے ساتھ فرش پر اپنا ہیٹ پٹختا ہے اور ایک کرسی گھسیٹ کر نجمہ کے قریب ہو بیٹھتا ہے) "یہ شہباز بڑا لائق آدمی ہے ....!"

نجمہ: "اچھا؟ کہو تمہارے لئے اُس نے کچھ کیا؟"

فاروق: "ہاں اس نے مجھے اپنے دفتر میں رکھ لیا۔"

نجمہ۔ "کیسا دفتر؟ وہ کیا کام کرتا ہے؟"

فاروق۔ "ہر ایک کام (ہنستا ہے) آدمی ہے بہت ہی قابل۔ اُس نے تمہیں دیکھتے ہی مجھ سے کہا کہ "خانم عالی خاندان معلوم ہوتی ہے"

نجمہ (دلچسپی سے) "کیا واقعی؟"

فاروق: "ہاں —— ہاں!"

نجمہ: "تم نے یہ تو نہیں بتا دیا کہ میں کون ہوں؟"

فاروق: "نہیں کچھ زیادہ نہیں بتایا۔ صرف اتنا کہا کہ اور وہ بھی بطور راز کے کہ تم ایک بڑے افسر کی بیٹی تھیں اور تمہارے والد نے تیس ہزار قرض کے عوض تمہاری شادی ایک دوسرے اعلیٰ افسر کر دی تھی تمہارا شوہر نالائق نکلا اور تمہاری پوری طرح نگہداشت نہیں کی۔ تم اُس سے لڑ کر چلی آئیں۔ بس۔"

نجمہ "بہت خوب! (دوسرا سگریٹ جلاتی ہے)"

فاروق "لیکن یہ تیس ہزار قرض مہر کا لطیفہ خوب رہا کیوں" (ہنستا ہے)

نجمہ۔ لطیفہ کیا معنی؟ مجھے تو اس میں کوئی ہنسی کا پہلو

بات نہیں نظر آتی۔ تیس ہزار نہ سہی چوبیس ہزار تو میرا مہر تھا ہی ــــ!"

فاروق: "کیا کہا چوبیس ہزار مہر"

نجمہ: "ہاں! ہاں! چوبیس ہزار!"

فاروق: "تو وہ روپیہ کہاں ہے؟"

نجمہ: "کیا مطلب؟"

فاروق: "کیا تمہارے شوہر نے نہیں دیا؟"

نجمہ: "نہیں"

فاروق: "(بناوٹی حیرت سے) تو تمہارا یہ مطلب ہے کہ تمہیں گھر سے نکالتے وقت تمہارے شوہر نے تمہارا مہر ادا نہیں کیا؟"

نجمہ: "نہیں!"

فاروق: "ابھی تم جیسی بیوقوف عورت بھی میں نے دنیا کے پردے پر نہیں دیکھی۔ . . . !"

نجمہ: "لیکن تمہیں اس سے کیا تعلق؟ ــــ آخر تم ہو کون اس قسم کی چہ میگوئیاں کرنیوالے؟"

فاروق: "نہیں! نہیں! مطلب یہ ہے کہ تمہیں اپنا مہر طلب کرنا چاہیے۔ یہی شہباز نے بھی کہا تھا۔"

نجمہ: "شہباز کون ہوتے ہیں میرے معاملہ میں بولنے والے"

فاروق: (سگریٹ جلاتا ہے) "اُس نے تمہاری ہی بہتری کے لئے کہا تھا۔ جب میں نے بتایا کہ تمہارا مہر تیس ہزار قرض تھا تو اُس نے یہی کہا کہ مہر تمہیں ضرور طلب کرنا چاہیئے۔"

نجمہ: "لیکن میں طلب نہیں کرتی۔"

فاروق: "آخر کیوں۔ کیوں نہیں؟"

نجمہ: "اس لئے کہ میری مرضی!"

فاروق: "خوب! لیکن مہر تو ضرور طلب کرنا چاہیئے۔"

نجمہ: (جوش میں) "میں گلی کوچوں میں بھیک مانگتی پھرونگی، میں قیدخانہ میں پھانسی پر لٹک جاؤنگی۔ لیکن اُس شخص کے آگے کبھی ہاتھ نہ پھیلاؤنگی۔"

فاروق: (دلجمعی سے) "ہاں! ہاں! یہ بالکل درست ہے اگر انسان میں غیرت نہ ہو تو حیوانات سے بدتر ہے لیکن تم کسی دوسرے شخص کو اپنا مختار بنا سکتی ہو۔ . . . تم مجھے صرف ایک خط دیدو اور دیکھو میں کتنی جلدی اور ہوشیاری سے اس کام کو سرانجام کرتا ہوں!"

نجمہ: "اُس سے پہلے کہ میرے بچہ کو یہ معلوم ہو کہ میں زندہ ہوں میں مرجانا پسند کرونگی۔ . . . !"

فاروق: "لیکن اس کو کانوں کان بھی خبر نہ ہوگی"

نجمہ: ". . . . . میں چاہتی ہوں کہ وہ جب کبھی مجھے یاد کرے تو مردہ سمجھکر ہی اُس کے لئے صرف ایک بھولی بسری ہوئی یاد بنجانا چاہتی ہوں ــــ وہ کبھی بھی یہ نہ جانے گا کہ اُس کی ماں اس طرح گناہ کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ کبھی نہیں۔ کبھی نہیں۔ میں مرجاؤنگی (دیوانہ وار چیختی ہے اور بالآخر روتی ہے)"

فاروق: (تسلی آمیز لہجہ میں) "خیر تم پریشان نہ ہو۔ اُس کو ذرا بھی علم نہ ہوگا۔ میں صرف تمہارے شوہر سے ملونگا۔"

نجمہ: (حواس بجا کرتے ہوئے) "بس چپ رہو۔ میں اسکے متعلق اور کچھ نہیں سننا چاہتی۔"

فاروق: (ہنستا ہے) "خانم! ذرا غور کرو۔ ہمیں روپے کی سخت ضرورت ہے چوبیس ہزار قرض مفت ہاتھ آتے ہیں۔ واللہ! دنیا بہشت بنجائے گی۔"

نجمہ: "بکو مت!"

فاروق: (سنجیدگی سے) "خانم ذرا تمیز سے بات کرو۔ اس قسم کی بدتہذیبی کو میں برداشت نہیں کر سکتا ــــ سنو! میں آخری

مرتبہ تم سے پوچھتا ہوں کیا تم اپنے شوہر کے نام ایک خط لکھدو گی یا نہیں ؟

**نجمہ** "ہرگز نہیں !"

**فاروق** "خیر کچھ پروا نہیں !" (ڈریسنگ روم میں داخل ہوتا ہے نجمہ دوسرا سگریٹ جلاتی ہے)

**نجمہ** "تم کیا کر رہے ہو ؟"

**فاروق** "کپڑے بدل رہا ہوں "

**نجمہ** "کہاں جانا ہے ؟"

**فاروق** "ظہیر زماں سے تمہارا پھر لینے ۔ ! !" (لباس تبدیل کرکے باہر آتا ہے)

**نجمہ** (دوڑ کر فاروق سے لپٹ جاتی ہے) "تم نہیں جاسکتے !"

**فاروق** (نجمہ کو جھٹکا دیتے ہوئے) "مجھے کون روک سکتا ہے ؟"

**نجمہ** "میں ! میں !"

**فاروق** (نجمہ کو زبردستی اپنے سے الگ کرتا ہے اور پلنگ پر دھکا دیتا ہے) "عورت کیوں دیوانی ہوئی ہے" (جھک کر اپنا ہیٹ اٹھاتا ہے نجمہ فوراً میز پر رکھے ہوئے ریوالور کو اٹھا کر اپنی پشت کے پیچھے چھپا لیتی ہے)

**نجمہ** "دیکھو ! اس ارادہ سے باز رہو ورنہ تمہیں پچھتانا پڑے گا !"

**فاروق** (دروازہ کی طرف بڑھتا ہے) "مجھے کوئی نہیں روک سکتا !"

**نجمہ** (فاروق کے سامنے آتے ہوئے) "دیکھو تمہیں پچھتانا پڑے گا !"

**فاروق** (نجمہ کو دھکا دیتے ہوئے) "بکو مت !"

(نجمہ فائر کرتی ہے۔ فاروق کھڑے قدسے گر پڑتا ہے اور تھوڑی دیر تڑپنے کے بعد ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ ہوٹل کے تمام ملازم اور منیجر داخل ہوتے ہیں "پکڑو ! بھاگنے مت دینا" "خون ! قتل ! پولیس" "دوڑو جلدی پولیس" کی صداؤں کا شور برپا ہوتا ہے۔

**نجمہ** (ریوالور کو پلنگ پر پھینکتے ہوئے) "کوئی جلدی نہیں ہے ۔ میں بھاگونگی نہیں !"

(پردہ)

# تیسرا منظر

(ظہیر کا ڈرائنگ روم ۔ دائیں طرف کے دروازے سے شہباز قاسم اور نرگس داخل ہوتی ہیں)

**نرگس** "آپ لوگ تشریف رکھیں ۔ سرکار ذرا غسل کر رہے ہیں میں ابھی اُن کو جا کر آپ کا کارڈ دیدونگی "

(بائیں طرف دروازے سے چلی جاتی ہے)

(شہباز اور قاسم بیٹھ جاتے ہیں)

**شہباز** (قاسم سے) "فاروق کی بے وقت موت کا بہت افسوس ہے ۔ بیچارا بہت کام کا آدمی تھا ۔ ۔ ۔ ۔ "

**شہباز** "ہاں ! ہمارے مشن کے کام کا آدمی تھا دیکھو آتے ہی پچیس ہزار کی گرانمایہ پالیسی کا وعدہ کیا اب تو معاملہ بالکل صاف نظر آتا ہے بس آخری وار باقی ہے سوابھی پورا ہوا جاتا ہے "

**قاسم** "کہتے تو ٹھیک ہو ۔ اب اُس کے مرنے کا افسوس بیکار ہے ۔ ایک بات اور ہے اس

کے مرنے سے جہاں نقصان ہوئے وہاں ایک
فائدہ بھی ہوا۔ دس فی صدی کمیشن صاف بچ گیا!"

شہباز۔ "ہاں صاحب! یہ فائدہ تو بڑا پکا فائدہ ہے — اور بھی اگر سچ پوچھو تو اس معاملہ کو کھوج نکالنا بھی کوئی آسان کام نہیں تھا۔ آج کمبخت تین ہفتے کے بعد یہاں کا پتہ معلوم ہوا.....!"

قاسم۔ "سچ کہتے ہو ایسے نازک معاملے میں کوئی اٹکل سے کام تھوڑا ہی چل سکتا ہے۔ یہ ہماری ہی ہمت تھی جو کوئی اور سری کا ہوتا تو اینک چکراتا ہی رہتا!"

شہباز۔ "اب اس میں تو کوئی شبہ کی گنجائش ہی نہیں کہ فاروق کی فائنہ ظہیر کی بیوی ہے — ہاں خوب یاد آیا ایک عجیب بات اور سناؤں ملزمہ کی طرف سے صفائی کا وکیل سعیدالزماں یعنی ظہیر کا لڑکا ہی مقرر ہوا ہے —!"

قاسم۔ "اس نے وکالت کا امتحان پاس کر لیا کیا؟"

شہباز۔ "ہاں ہاں ابھی اس کو پاس کئے ہوئے ایک برس ہونے آیا۔ مگر یہ اس کا پہلا مقدمہ ہے — ایک پرلطف بات اور بھی ہے سیشن جج کے اور ظہیر کے خاص تعلقات ہیں سعید بھی اُن کے ہاں آتا جاتا ہے اُن کی لڑکی نعیمہ پر نہیں سعید صاحب عاشق ہو بیٹھے ہیں — شادی ہونی ہوائی ہے لیکن لڑکی کے باپ نے ایک پرلطف شرط لگا دی اور وہ یہ کہ اگر سعید اپنے پہلے مقدمہ میں جیت گیا تو شادی ہو جائے گی ورنہ نہیں۔ اور پہلا مقدمہ یہی ہے کتنے عجیب اتفاقات ہیں۔ لڑکا ماں کی طرف سے وکیل ہے۔ لیکن یہ نہیں جانتا کہ میری ماں ہے سیشن جج صاحب یہ نہیں جانتے کہ ملزمہ اُنکی ہونیوالی سمدھن ہے اور ظہیر جو جیوری کے ممبر تھے نہیں جانتے ہیں کہ وہ انکی بیوی ہے —! (ہنستا ہے)

قاسم۔ "بھئی واللہ! عجیب اتفاق ہیں" (دونوں ہنستے ہیں۔ بائیں طرف کا دروازہ کھلتا ہے اور ظہیر داخل ہوتا ہے۔ شہباز اور قاسم کھڑے ہو جاتے ہیں)

ظہیر۔ (دونوں سے ہاتھ ملاتے ہوئے) "تشریف رکھئے (تینوں بیٹھتے ہیں) فرمایئے آپ حضرات نے کیسے تکلیف فرمائی؟"

شہباز۔ (کھانسنے کے بعد) "کیا میں ظہیر الزماں صاحب سے ہمکلام ہوں؟"

ظہیر۔ "جی ہاں! میرا نام ظہیر ہے — آپ کا اسم گرامی!"

شہباز۔ "مجھے شہباز بیگ کہتے ہیں۔ یہ میرے دوست قاسم بیگ ہیں" (قاسم کی طرف اشارہ کرتا ہے)

ظہیر۔ "خوب۔ فرمایئے میرے لائق کوئی کار خدمت!"

شہباز۔ (گلا صاف کرتے ہوئے) "جی ہاں ایک نازک معاملہ میں آپ سے ذرا۔ کچھ گفتگو کرنی تھی جس کا تعلق آپ کی ذاتِ خاص سے ہے!"

ظہیر۔ (چونک کر) "یعنی؟"

شہباز۔ "جناب عرض یہ ہے کہ — کہ آپ جانتے ہیں کہ ہر انسان کے کچھ نہ کچھ راز ضرور ہوتے ہیں اور ایسا کوئی انسان نہیں جس نے اپنی عمر میں کوئی نہ کوئی غلطی نہ کی ہو"

ظہیر۔ "جی ہاں ایک حد تک درست ہے۔ لیکن ذرا وضاحت سے بیان کیجئے۔"

شہباز۔ "آج سے بیس سال پہلے آپ نے ایک عالی نسب لڑکی سے شادی کی تھی — چوبیس ہزار قرش کے عوض!"

ظہیر۔ "جی ہاں! لیکن ان سوالات سے آخر آپ کا کیا مقصد"

شہباز۔ "کوئی خاص مطلب نہیں — غرض یہ ہے کہ خانگی معاملات میں زن و شو کے درمیان نا اتفاقی ہو جانی کوئی نرالی بات نہیں ہے....!"

ظہیر (بے چین ہو کر) "مجھے تعجب ہے آپ لگ باوجود میری درخواست کے اس معمے کو دور کیوں نہیں کرتے آخر تم کو مجھ سے گفتگو کرنے سے کیا غرض ہے؟"

شہباز۔ "بہت بہتر میں اب بہت اختصار سے کام لیتا ہوں — عرض یہ ہے کہ — کہ آپ کی ازدواجی زندگی غیر معمولی طور سے ناخوشگوار ثابت ہوئی اور آپ نے اپنی منکوحہ کی بدچلنی سے تنگ آ کر ایک دن اُن کو گھر سے نکال دیا......"

ظہیر (گھبرا کر) "تمہیں اس کا علم کیسے ہوا؟"

شہباز "تو پھر یہ درست ہے نا — بہت خوب — تو عرض یہ ہے کہ آپ کے گھر سے چلے جانے کے بعد بہت دور دراز کے سفر کئے۔ اور سینکڑوں مصائب کا سامنا کیا......"

ظہیر (بے چین ہو کر) "سفر کئے — !! تم کیا بک رہے ہو۔ اُس کے ایک ہی ہفتے کے بعد تو اس کا انتقال ہو گیا اور وہ مرشد والے قبرستان میں دفن ہے"

شہباز۔ "مجھے تمام واقعات کا علم ہو گیا ہے آپ ذرا اطمینان فرمائیں — وہ نعش جس کو آپ نے مرشد والے قبرستان میں دفن کروا دیا ہے ایک طوائف کی نعش ہے جسنے خدا معلوم کس سبب سے کنوئیں میں ڈوب کر خودکشی کر لی تھی — اور آپ کی بیوی ابھی خدا کے فضل سے زندہ ہیں — !!!"

ظہیر (چونک کر) "کیا کہا! زندہ ہیں!"

شہباز "یقیناً۔ جناب!!"

ظہیر "کیا تم سچ کہتے ہو؟"

شہباز۔ "عرض یہ ہے کہ آپ خود غور کر سکتے ہیں کہ مجھے یہ تمام واقعات کس طرح معلوم ہو سکتے تھے اُن کے سفر کے حالات اور آپ کا نام و پتہ سب اُنہی کی زبانی معلوم ہوا"

ظہیر "کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ زندہ ہیں"

شہباز "یقین کیا معنی صاحب! میں اُن سے کئی بار مل بھی چکا ہوں اور انھوں نے مجھے اپنا وکیل مقرر کیا ہے"

ظہیر۔ "اچھا بتاؤ وہ کہاں ہیں میں اُن سے ابھی جا کر ملتا ہوں"

شہباز "معاف کیجئے گا جناب! عرض یہ ہے — کہ موکلہ نے پتہ بتانے کی اجازت نہیں دی اتنا میں ضرور بتائے دیتا ہوں کہ وہ اس ملک میں ہیں لیکن آجکل ذرا......" (کھنکارتا ہے)

ظہیر "ذرا کیا —؟"

شہباز "بہت مصیبت میں ہے کوڑی کوڑی کو محتاج ہے"

ظہیر "اچھا اگر میں تمہیں کچھ دوں تو تم اُن تک پہنچا دو گے؟"

شہباز۔ "میں اسی لئے حاضر ہوا تھا۔ میری موکلہ نے مجھے آپ کے پاس بھیجا تھا اور اپنا مہر طلب کیا تھا"

ظہیر "مہر! لیکن میں نے تو اُن کو طلاق نہیں دی! نہ میں کبھی ایسا کر سکتا ہوں — معلوم ہوتا ہے مفلسی نے نجمہ پر بُرا اثر کیا۔ افسوس! بہر حال: میں کچھ رقم آپ کو دیتا ہوں آپ وہ لیجا کر اُن کو دیدیجئے گا۔ میں ابھی حاضر ہوتا ہوں" (بائیں طرف کے دروازہ سے جاتا ہے)

قاسم "لو استاد! مہر وہر تو خاک میں مل گیا"

شہباز۔ "ہاں بھئی۔ یہ تو بہت بُرا ہوا۔ نان و نفقہ کا دعویٰ ہو سکتا ہے لیکن کمبخت فاروق ہی مر گیا"

قاسم "خیر بھائی بھاگتے کی لنگوٹی ہی سہی"

(ظہیر گھبرایا ہوا داخل ہوتا ہے)

ظہیر (نوٹ دیتے ہوئے) "یہ لیجئے فی الحال میں اتنی کا بندوبست کر سکا۔ پانچ سو کے نوٹ ہیں — کیا آپ کسی

طرح بھی مجھے اُن کا پتہ نہیں بتا سکتے"۔
شہباز: "غرض یہ ہے کہ — آپ جانتے ہیں کہ میں تو اپنی موکلہ کی ہدایات پر عمل کرتا ہوں اگر افسوس نے اجازت دیدی تو مجھے کیا انکار ہوگا"۔
ظہیر (ایک نوٹ اور دیتے ہوئے) "یہ لیجئے ایک سو کا نوٹ آپ کی خدمت میں حاضر ہے — مزدوری ہرگز نہیں بلکہ محض شکریہ کے طور پر — اگر آپ نجمہ کو ایک مرتبہ مجھ سے ملوا سکیں تو میں — بہر حال! حسب مقدور آپ کی خدمت کرنے کو تیار رہوں — بہر حال! آپ اس کو تو قبول کریں —"
شہباز۔ (نوٹ لیتے ہوئے) "ارے صاحب! اس کی کیا ضرورت تھی۔ میں آپ کا خادم ہوں — میں آپ سے پھر کب ملوں"؟
ظہیر: "جب اور جس وقت آپکا جی چاہے!"
شہباز: "تو اب اجازت دیجئے"۔
ظہیر: "میں آپ کا بہت ممنون ہوں"۔
(شہباز اور قاسم ظہیر سے ہاتھ ملا کر رخصت ہوجاتے ہیں)
ظہیر: (دیوانہ وار) "نجمہ! — نجمہ!! — اللہ! مجھے معاف کردو — میں قصوروار ہوں۔ اپنے کئے پر نادم ہوں" (مجنونانہ طور پر تمام کمرے میں ناچتا ہے۔ سہیل داخل ہوتا ہے)
سہیل: "خدا کے لئے ظہیر! تمہیں کیا ہوگیا ہے!"
ظہیر (دوڑ کر سہیل سے لپٹتے ہوئے) "نجمہ زندہ ہے — نجمہ زندہ ہے!!!"
سہیل: "نہیں — کیا نجمہ زندہ ہے تمہیں کیسے معلوم ہوا!"
ظہیر: "ابھی ابھی دو شخص آئے تھے۔ اُس نے انہیں میرے پاس بھیجا تھا۔ میں عنقریب اُس سے ملونگا — اہاہاہا!"
سہیل: "واقعی"!
ظہیر (وحشیانہ طور پر سہیل سے لپٹ کر زور زور سے ہنستا ہے سہیل بھی ہنستا ہے بائیں طرف کے دروازہ سے ایک خوشرو نوجوان بلند قامت، کسرتی جسم، ہاتھ میں کاغذ لئے ہنستا ہوا داخل ہوتا ہے)
نوجوان: "ابا جان خیر تو ہے۔ آخر آپ لوگوں کو ہو کیا گیا ہے"
ظہیر (سہیل کو چھوڑ کر نوجوان سے لپٹ جاتا ہے) "سعید! سعید! بیٹا — !!!"
سعید: "آخر کیا بات ہے جو آپ لوگوں نے اس قدر شور مچا رکھا ہے میں اپنی تقریر یاد کر رہا تھا....."
ظہیر (والہانہ) "بات! بات!! بیٹا بڑی حیرت انگیز بات ہے — اہاہاہا!!! — وقت آنے دو تمہیں سب کچھ معلوم ہوجائے گا"۔
سہیل: "جاؤ بیٹا سعید! تم اپنی تقریر یاد کرو۔ خدا کرے تمہیں کامیابی حاصل ہو اور پھر تم نعیمہ کے ساتھ جلد سے شادی کر لو — !!!"
(تینوں زور زور سے ہنستے ہیں)

## مجلس سوم
### پہلا منظر

بروسا۔ عدالت کا کمرہ سامنے کے رُخ ایک بلند پلیٹ فارم پر چوبی ریلنگ کے پیچھے ہے اُس سے ذرا بلند نشین جج

کی کرسی ہے۔ جیوری کے ارکان میں ڈاکٹر فضل بھی شامل ہیں جیوری بنچ کی دائیں طرف ملزم کا کٹہرا ہے جس میں نجمہ نڈھال ہوئی ایک کرسی پر بیٹھی ہے۔ اس کے قریب ہی سعید الزماں وکیل کی حیثیت سے کھڑا ہے۔ بائیں طرف گواہوں کی مخصوص جگہ ہے اس کے قریب سرکاری وکیل اپنے ڈسک پر بیٹھا ہے۔ اِدھر اُدھر گیلری ہے جس میں نرگس ظہیر شہباز، سہیل، نعیمہ، سعید الزماں کی منظورِ نظر اور بہت سے متعلق لوگ تماش بینوں کی حیثیت سے بیٹھے ہیں۔ جیوری بنچ کے سامنے متعدد اہلکار اور محرر وغیرہ بیٹھے ہیں۔ ایک کلرک قرارداد پڑھ رہا ہے۔

**کلرک** ...... "مسز فاروق! پر الزام لگایا گیا ہے کہ انھوں نے بتاریخ ۲ اکتوبر ۱۹۲۷ء بوقت ۴ بجے شام بمقام کمال ہوٹل کمرہ نمبر ۳۲ اپنے ساتھی یا شوہر مسمّی فاروق کی جان پر حملہ کیا جو زیر دفعہ نمبر ۲۹۹ تعزیرات ارتکاب قتل عمد ہوا ......"

**جج**۔ مسز فاروق! تم کو قرارداد جرم سنا دی گئی کیا تم اس سے انکار کرنا چاہتی ہو کہ تم نے اپنے ساتھی یا اپنے شوہر مسمّی فاروق کو جان سے نہیں مارا۔ یا تم تسلیم کرتی ہو کہ تم سے یہ جرم سرزد ہوا؟"

(نجمہ خاموش ہے)

**جج**: مسز فاروق! تم بولنے سے انکار کرتی ہو — میں تمہیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ تمہارا خاموش رہنا تمہارے لیے اور مضر ثابت ہوگا — میں تمہارے ہی فائدہ کے لیے کہتا ہوں — بولو —!!"

(نجمہ خاموش ہے)

**جج**۔ "پہلے گواہ کو بلاؤ"

نجمہ (ظہیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سعید سے رازدارانہ طور پر پوچھتی ہے) "یہ شخص کون ہے؟"

سعید (نہایت نرمی سے) "ان کا نام ظہیر الزماں ہے۔ شاید آپ نہیں جانتیں یہیں کے رہنے والے ہیں" (نجمہ کا چہرہ ایک وہم سے متغیر ہو جاتا ہے)..... "کیوں خانم! کیا آپ کچھ تشویش محسوس کر رہی ہیں" (نجمہ ہاتھوں کے اشارہ سے اطمینان کا اظہار کرتی ہے)...."خانم! اللہ آپ اس خاموشی کو چھوڑیئے — یہ سکوت آپ کے لیے بہت مضر ثابت ہوگا....."

(انسپکٹر ریاض بحیثیت پہلے گواہ کی حیثیت سے داخل ہوتے ہیں)

**کلرک**: "انسپکٹر صاحب! آپ کی رپورٹ گرفتاری اور چالان وغیرہ سے تمام حالات معلوم ہو گئے فی الحال آپ سے ایک سوال کرنا ہے — کیا ملزمہ نے دورانِ گرفتاری میں آپ سے کچھ بیان کیا؟"

**انسپکٹر ریاض**: "میں نے اُس سے بہت کچھ گفتگو کی اور یہ بھی پوچھا کہ فاروق کو قتل کرنے کا سبب کیا تھا مگر ملزمہ نے سوائے اس کے کچھ نہیں بتایا کہ "میں نہیں چاہتی تھی فاروق میرے لڑکے کو اپنے کسی فعل سے بدنام کرے میں نے اُسے کئی مرتبہ باز رکھا لیکن وہ نہیں مانا چنانچہ میں نے اپنے لڑکے اور اپنے شوہر کے نام و نمود کو قائم رکھنے کے لیے اُسے مار ڈالا"۔ اس سے زیادہ اُس نے مجھے کچھ نہیں بتایا"

**کلرک**۔ (سعید سے) "وکیل صاحب! کیا آپ انسپکٹر صاحب سے کچھ سوال کرنا چاہتے ہیں؟"

**سعید**: "نہیں"

**کلرک**: (نجمہ سے) "مسز فاروق! کیا آپ انسپکٹر صاحب سے کچھ سوال کرنا چاہتی ہیں؟"

**نجمہ** (نجمہ خاموش رہتی ہے۔ انسپکٹر ریاض سرکاری وکیل کے ڈسک کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں)

**جج۔** تو دوسرے گواہ کو طلب کیا جائے۔"

(ہوٹل کا منیجر داخل ہوتا ہے)

**کلرک۔** "تمہارا نام، ولدیت، سکونت، پیشہ؟"

**منیجر۔** "نورالدین ولد شمس الدین ساکن پروسا، پیشہ منیجر کمال ہوٹل!"

**کلرک۔** "کہو! میں خدا کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ جو کچھ میں بیان کرونگا وہ بالکل سچ اور صحیح ہوگا؟"

**منیجر۔** "یقیناً!"

**کلرک۔** پوری بات کہو "میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں کہ میں جو کچھ بیان کرونگا وہ بالکل سچ اور صحیح ہوگا"

**منیجر۔** "میں خدا کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ جو کچھ میں بیان کرونگا وہ بالکل سچ اور صحیح ہوگا!"

**کلرک۔** "تم اس مقدمہ کے متعلق کیا جانتے ہو مفصل بیان کرو۔"

**منیجر۔** (کھنکارتا ہے) بتاریخ ۵ اکتوبر ۱۹۳۲ء یہ عورت ایک مرد کے ساتھ میرے ہوٹل میں آئی۔ میں نے کمرہ نمبر ۳۲ جو اس وقت خالی تھا ان کو کرایہ پر دے دیا۔ انکے ساتھ کچھ سفری سامان تھا جو ڈرائینگ روم میں رکھدیا گیا۔ پھر اس عورت نے آبسنتھی اور سگریٹ لانے کو کہا۔۔۔۔"

**کلرک۔** "ابسنتھی کون پیتا تھا؟"

**منیجر۔** "دونوں پیتے تھے۔ مگر یہ عورت زیادہ پیتی تھی دو دن میں اس نے ۹ بوتلیں ختم کیں"

**کلرک۔** "اس عورت کی کیسی حالت رہتی تھی؟"

**منیجر۔** "کیسی حالت!!"

**کلرک۔** "وہ خوش رہتی تھی یا غمگین"

**منیجر۔** "وہ عام طور پر گھبرائی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔"

**کلرک۔** "اچھا۔ آگے چلو۔ پھر کیا ہوا؟"

**منیجر۔** "رات بھر کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوئی۔ دوسرے دن شام کو میں ایک دوسرے کمرہ میں تھا کہ ایک دم سے مجھے فائر کی آواز آئی میں گھبرا کر باہر نکلا لوگوں سے معلوم ہوا کہ کمرہ نمبر ۳۲ میں خون ہوگیا۔ جلدی سے وہاں گیا تو دیکھا کہ ایم۔ فاروق فرش پر مرا پڑا تھا اور یہ عورت ہاتھ میں ریوالور لئے کھڑی تھی۔ اس نے ریوالور پلنگ پر پھینکدیا۔ اور میں نے فوراً ایک ملازم کو پولیس میں اطلاع کے لئے بھیجا۔۔۔۔"

**کلرک۔** "اس عورت نے تم سے کچھ کہا؟"

**منیجر۔** "نہیں بس یہ کہا تھا کہ کوئی جلدی نہیں ہے میں بھاگوں گی نہیں۔ پھر پولیس آگئی اور اس کو گرفتار کر کے لے گئی۔"

**کلرک۔** "بس؟"

**منیجر۔** "بس"

**کلرک۔** "مسٹر فاروق آپ کو اس گواہ سے کوئی سوال کرنا ہے؟"

**مجرمہ** (خاموش رہتی ہے)

**کلرک** (سعید سے) "کیوں وکیل صاحب آپ کو اس گواہ سے کچھ پوچھنا ہے؟"

**سعید۔** "گواہ نے ابھی بیان کیا ہے کہ میری موکلہ ابسنتھی پیتی تھی میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کیا وہ ارتکاب جرم سے پہلے نشہ کی حالت میں تھی۔۔؟"

**جج** (منیجر سے) "تم نے سنا؟"

**منیجر۔** "وہ ہر وقت نشہ کی حالت میں رہتی تھی۔"

**کلرک۔** "اور کوئی سوال؟"

**سعید۔** "نہیں۔"

**کلرک مجسٹریٹ کو بیٹھو** کہنے پر سرکاری وکیل کے ڈسک کے قریب ایک بینچ پر بیٹھ جاتا ہے)

**جج۔** (نجمہ سے) مسز فاروق! میں تم سے آخری مرتبہ کہتا ہوں کہ اپنے فائدہ کو مد نظر رکھتے ہوئے تمہیں بولنا چاہئے گواہوں کے بیان سے ہمیں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ تم نے فاروق کو اس وجہ سے مارا کہ اُس کا کوئی فعل تمہارے کسی محبوب کے ننگ و ناموس کا باعث ہوتا ۔۔ اب تم صرف یہ بتا دو کہ اُس کا فعل کیا تھا؟ اور یہ کہ تمہارا محبوب کون ہے۔ اگر ان دونوں باتوں کا تم نے جواب دیدیا تو جیوری کو کسی نتیجہ پر پہونچنے میں مدد ملے گی۔ اور ممکن ہے اس طرح تمہارے بچاؤ کی کوئی صورت نکل آئے ۔۔ بولو ۔۔!" (نجمہ بدستور خاموش رہتی ہے)

**جج سرکاری وکیل!"**

**سرکاری وکیل** (کھڑا ہوتا ہے اور صاف کاروباری لہجہ میں) معزز ممبرانِ جیوری! مجھے کچھ زیادہ نہیں کہنا۔ مقدمہ صاف ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ملزمہ ہی نے فاروق کو قتل کیا ۔۔ لیکن آخر یہ عورت کون ہے ۔۔؟ اس کا اصل نام کیا ہے ۔۔؟ وہ کہاں کی رہنے والی ہے اور کہاں سے آئی ہے ہم بالکل نہیں جانتے۔ گرفتاری کے وقت سے اس وقت تک وہ قطعی خاموش ہے پولیس نے بیان لیتے وقت اپنا سر تک پیٹ لیا۔ لیکن اُس نے ایک لفظ تک زبان سے نہ نکالا اور یہاں بھی آپ لوگ دیکھ چکے ہیں کہ کس بدتہذیبی کے ساتھ وہ عدالت کے احکام کی مدافعت کرتی رہی ہے۔ معزز حضرات قتل کرنے کے چند محرک و سبب ہوتے ہیں۔ روپیہ کا لالچ، محبت یا تعشق، حسد یا انتقام اور انہی چند وجوہ سے قاتل کا توازنِ دماغ قائم نہیں رہتا اور ان میں سے کسی وحشیانہ جذبہ کے ماتحت وہ قتل جیسی مذموم حرکت کر بیٹھتا ہے ۔۔ اگر ان تمام اسبابِ قتل پر غور کیا جائے تو فیصلہ کے وقت انصاف کے ساتھ قاتل کے حق میں کچھ نہ کچھ رحم بھی شامل ہو جاتا ہے اس لئے کہ یہ تمام جذبات فطرتِ انسانی سے تعلق ہیں لیکن اس جرم کے متعلق کوئی عذر پیش نہیں کیا جا سکتا جس کے ارتکاب کا ارادہ یا سبب ملزمہ نہ بتائے بایں وجہ ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ ملزمہ نے فاروق کو بغیر معقول سبب یا وجہ کے قتل کیا۔ میں بذاتِ خاص ملزمہ کی اس مکارانہ خاموشی سے بدظن ہوں۔ میں آپ حضرات کو جتائے دیتا ہوں کہ اس معاملہ میں ملزمہ پر رحم کرنا سوسائٹی کے ساتھ ظلم کرنا ہے ایسے مجرم پر کیا رحم کیا جا سکتا ہے جو اپنے کئے پر نادم نہ ہو اور توبہ کا ایک لفظ بھی اپنی زبان سے نہ نکالے ۔۔ ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ ملزمہ ہے کون ۔۔؟ ۵، اکتوبر کو ایک مرد اور ایک عورت کمال ہوٹل میں داخل ہوتے ہیں مرد وہ شخص ہے جو اس سے پہلے دو مرتبہ سزا پا چکا ہے ظاہر ہے کہ ایسے مرد کا تعلق کس قسم کی عورت سے ہوگا؟ دوسرے دن شام کو عورت مرد کو قتل کر دیتی ہے معاملہ بالکل صاف ہے اور عورت کا قاتل ہونا ظاہر شہادت سے تمام حالات آپ لوگوں پر روشن ہو چکے ہونگے اس لئے میں گواہوں کے بیان سے کوئی نتیجہ نہیں نکالنا چاہتا نہ یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ ملزمہ کی اخلاقی حالت پر بحث کروں ملزمہ کا ایک سزا یافتہ کے ساتھ رہنا اور ہر وقت نشہ میں رہنا اور بالآخر قتل جیسے مذموم جرم کا ارتکاب کرنا اس کی اخلاقی حالت پر کافی روشنی ڈالتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ لوگ انصاف کو ہاتھ سے نہ جانے دینگے میں زیادہ وقت نہیں لینا چاہتا اور اب اپنے عزیز دوست سعید الزماں کو موقع دیتا ہوں کہ وہ ایک قاتلہ کو بے گناہ ثابت کرنیکی

کوشش کریں......"

(سرکاری وکیل بیٹھ جاتا ہے۔ نجمہ سعید الزماں کا نام سُنتے ہی بے ہوش سی ہو جاتی ہے اُس کا سر کٹہرے سے لگ جاتا ہے اور اُس کے منہ سے بیساختہ ایک آہ نکل جاتی ہے۔ ظہیر سہیل کے کان میں کچھ کہتا ہے سہیل کا چہرہ ایک دم سے متغیر ہو جاتا ہے۔ مجمع کو چیرتا ہوا وہ ملزم کے کٹہرے کے قریب پہنچتا ہے اور نہایت نرم و شیریں لہجہ میں نجمہ سے گفتگو کرتا ہے۔")

سہیل: "خانم! کیا آپ کی طبیعت ناساز ہے — اگر آپ چاہیں تو عدالت برخاست ہو سکتی ہے...."

نجمہ (چونک کر) نہیں۔ میں ٹھیک ہوں میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے۔"

جج: "وکیل صفائی —!!"

— (عدالت میں سناٹا سا چھا جاتا ہے۔ سعید کھڑا ہوتا ہے اس کا چہرہ خوف سے زرد ہے وہ اپنے والد کی طرف نگاہ اُٹھاتا ہے اس کے بعد اُس کی نگاہ ملزمہ پر پڑتی ہیں وہ بار بار اپنے دماغ پر زور ڈالتا ہے لیکن اُس کو اپنی تقریر یاد نہیں آتی۔ وہ اپنی جیب سے رومال نکال کر پسینہ خشک کرتا ہے اور بڑی مشقت سے شکستہ الفاظ میں یوں گویا ہوتا ہے)

سعید: معزز ممبران جیوری — میں اُن جذبات کو جو اس وقت میرے دل میں موجزن ہیں چھپانے کی کوشش نہیں کر سکتا — لیکن — لیکن میں یہ ظاہر کر دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ — اپنی تمام عمر میں میں نے اس سے زیادہ دل شکستہ اور بیکس عورت نہیں دیکھی — میرا دل اس خوف سے ٹکڑے ٹکڑے ہوا جاتا ہے کہ میں اپنے فرائض حسن و خوبی کے ساتھ انجام نہ دے سکونگا" — (ایک عالمِ پریشانی میں وہ چاروں طرف دیکھتا ہے پھر جیب سے رومال نکال کر پسینہ خشک کرتا ہے) .... "معزز حضرات وہ تمام دلائل اور وہ تمام مستحکم ثبوت جو میں نے اپنی تقریر میں جانفشانی کے ساتھ جمع کئے تھے میرے دماغ سے یکقلم محو ہو گئے ہیں خدا معلوم کیوں کر دل اس عورت کی طرف کھنچا جا رہا ہے — (سر کو مودبانہ طریقہ پر خم کرتے ہوئے) میں عدالت سے اس کمزوری کی معافی چاہتا ہوں لیکن ساتھ ہی ساتھ میں عدالت سے درخواست کرونگا کہ وہ صرف ایک لمحہ کے لئے اس عورت کی حالت کو ملاحظہ کرے میری بڑی سے بڑی تقریر بھی اسکے ایک آنسو کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس کی شکستہ حالت دلوں کو برما دیتی ہے سخت سے سخت دل انسان بھی اس وقت اس کی بیکسی پر ترس کھائیگا — کیا یہ حالت کسی خاص روحانی صدمہ کا پتہ نہیں دیتی؟ کیا اس کی بے کسی اس امر کو ظاہر نہیں کرتی کہ اس کے پاک اور معصوم جذبات کو انتہائی بیدردی کے ساتھ پامال کیا گیا ہے —؟ (اچانک اس کی نظریں نعیمہ کے چہرہ پر پڑتی ہیں۔ نعیمہ کا ساکت چہرہ اس کو ایک خاموش پیغام دیتا ہوا معلوم ہوتا ہے اس کی آواز بلند ہوتی جاتی ہے اور وہ ایک نئے جوش کے ساتھ اپنی تقریر جاری رکھتا ہے) — میں پُر زور طریقہ پر عدالت کی توجہ اس طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ کوئی نہ کوئی اسرار اس عورت کے ساتھ وابستہ ہے — (وقفہ کے بعد) یہ عورت کون ہے؟ — کہاں سے آئی؟ — اس نے اپنے ساتھی کو کیوں قتل کیا؟ — ہم اس سے لاعلم محض ہیں۔ صرف وہی ان سربستہ رازوں کی مالک ہے۔ اور صرف وہی اُن کو ظاہر کر سکتی ہے لیکن نہیں کرتی۔ کیوں؟ — کیا اس لئے کہ عدالت کو دھوکہ دے؟

— نہیں ہرگز نہیں اگر عدالت کو دھوکہ دینا اُس کا مقصد ہوتا تو کسی طرح خاموش نہ رہتی وہ اپنے آپ کو معصوم ثابت کرنے کیلئے جھوٹ بول سکتی ہے اپنے ساتھی کے قتل کرنے کے عذر میں وہ بہت سی قابلِ سماعت وجوہ پیش کر سکتی ہے وہ یہ ثابت کر سکتی ہے کہ فاروق اُسکی جان کا طالب تھا اور حفاظت خود اختیاری کے طور پر اُس نے اُس کو ہلاک کر دیا۔ وہ یہ ثابت کر سکتی ہے کہ اس فعل کے ارتکاب سے پہلے اُس پر جذبۂ دیوانگی طاری تھا۔ اور اُس کے تحت یہ فعلِ شنیعہ سرزد ہوا۔ یہ اور اس قسم کے ہزاروں دلائل پیش کئے جاسکتے ہیں، اور کوئی اُن کو غلط ثابت نہیں کر سکتا اس لئے کہ وقوعہ سے پیشتر نہ کسی نے ان کی گفتگو سُنی اور نہ کسی نے اُن کے تعلقات کو غائر نظر سے دیکھا لیکن مجھے فخر ہے کہ میری موکلہ ان تمام چیزوں سے بالاتر ہے جو کچھ اُس نے کیا بقید ہوش کیا اور اپنے فعل کے نتائج بھگتنے کے لئے مستعد ہی اُس نے قانون کی دستبرد سے بچنے کی کوئی کوشش نہیں کی — "کوئی جلدی نہیں ہے میں بھاگنے کی ہرگز کوشش نہ کرونگی" یہ تھے وہ الفاظ جو ملزمہ نے ہوٹل کے مینجر سے کہے انسپکٹر ریاض نے ابھی آپ لوگوں کے سامنے بیان کیا کہ جب اُنھوں نے ملزمہ سے قتل کرنے کی وجہ دریافت کی تو اُس نے صرف اس قدر کہا "کہ میں نے فاروق کو اس وجہ سے مارا کہ میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ اپنی کسی شرمناک حرکت سے میرے محبوب کو نُک پہنچائے۔"

معزز حضرات! بس اسی فقرہ سے ہم کو ملزمہ کے راز کا کچھ کچھ پتہ چلتا ہے۔ فاروق وہ ہستی تھی جو اس عدالت عالیہ سے دو مرتبہ سزا پاچکا تھا اور جس کی ذات سے ہر قسم کے جرم کا امکان تھا ملزمہ نے اُس کو مار ڈالا اس وجہ سے کہ وہ سمجھتی تھی کہ اُس کو مار دینا ہی صرف ایک ایسا طریقہ تھا جس سے وہ فاروق کو اپنے محبوب کی ذات پر قابلِ نفرین اور شرمناک حملہ کرنے سے روک سکتی۔ کیا یہ دلیل کافی نہیں —؟

"یہ عورت! یہ بیکس و کھیاری —! جو اخلاق سے اس قدر گری ہوئی نظر آتی ہے کہ نیک اور پارسا عورتیں اپنے باعصمت دامنوں کو اس کے ناپاک جسم سے بچائیں گی اپنے دل میں محبت کے قابلِ احترام جذبات رکھتی ہے۔ اپنے محبوب کی عزت خوشی اور نام و نمود کا اس کو اپنی جان سے زیادہ خیال ہے — ایک دن اُس کو ایک ایسی ہستی نظر آتی ہے جو اُس کے محبوب کی عزت اور نام و نمود کو برباد کرنے کی فکر میں ہے وہ اس کو فوراً ہلاک کر دیتی ہے —! بغیر پس و پیش کے — کیا وہ حق بجانب نہیں —؟ (اس کی آواز میں جوش پیدا ہو جاتا ہے) محبت اور صرف محبت کے مقدس جذبہ نے اُس کو آج ملزم بنا دیا۔ لیکن آخر اس کا کون ہے —؟ کیا وہ اس کا باپ ہے جسکو دنیا آنکھوں پر بٹھاتی ہے —؟ کیا وہ اس کا شوہر ہے جس کے ساتھ اُس نے دغا کی اور جس کو اُس نے چھوڑ دیا۔ کیا وہ اس کا اکلوتا بیٹا ہے جو اُس کے متعلق کچھ نہیں جانتا اور بے ماں کے ایک خوشگوار زندگی بسر کرتا ہے — ہم کچھ نہیں جانتے لیکن اس قسم کا کوئی نہ کوئی رازِ محبت ضرور ہے جس نے میری موکلہ کو موت کے آغوش تک پہونچا دیا ہے۔ میری موکلہ کو اپنی زندگی کی پروا نہیں۔ اور اپنے محبوب کی خاطر اپنی جان قربان کر دینے کے لئے آمادہ ہے اور اسی وجہ سے وہ خاموش ہے۔ وہ جانتی ہے کہ اپنے محبوب کا نام

لینا بھی اُس کی عزّت و آبرو پر ایک سیاہ داغ ہوگا۔"

"معزز حضرات! ایک عورت جو ایسے پاکیزہ خیالات کی حامل ہو کیا ایک کمینی فطرت ہوسکتی ہے ؟ میں عدالت کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ عورت کوئی معمولی عورت نہیں پولیس نے زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے لیکن وہ اس عورت کے متعلق کچھ بھی دریافت نہ کرسکی۔ اس کی نیک چلنی کا سب سے بڑا اور اہم ثبوت تو یہی ہے کہ یہ جرم اس کا پہلا جرم ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو پولیس ضرور اس کا پتہ لگا لیتی ــــ اس میں شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں کہ اس عورت کی تباہی کا ذمہ دار ایک مرد ہے ــ اگر کوئی شخص اخلاق سے گر جائے تو وہ خود اتنا ملامت کا مستحق نہیں جتنی کہ وہ ہستی کہ جس نے اُس کو گرایا یا گرنے دیا۔"

"میں دعویٰ سے کہونگا کہ اس عورت کی بربادی کا ذمہ دار ضرور ایک مرد ہے۔ اس نے اس عورت کی قدر نہ کی اور اس کے ساتھ بُرا سلوک کیا۔ یا تو وہ اس عورت کا عاشق ہے جس کو عزّت اور ایمانداری چھو نہیں گئی اور یا اس عورت کا خاوند ہے جس میں شرافت اور عالی ہمتی نام کو نہیں اور جس کی فطرت رحم و عفو، چشم پوشی اور درگذری کے سے پاک اور قابلِ احترام جذبات سے مبّرا ہے۔ اُس نے اس عورت کو پہلی خطا کرنے پر گھر سے نکال دیا۔ گویا گناہ کے تاریک غار میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دھکیل دیا۔"

"انسان کے بنائے ہوئے قانون اُس شخص کو کوئی سزا نہیں دے سکتے' لیکن وہ قادرِ مطلق جو سب کا والی و وارث ہو دیکھتا ہے اور خوب اچھی طرح جانتا ہے کہ اس عورت کی تباہی کا باعث وہی شخص ہے کیا عدالت یہ خیال کرتی ہے کہ قدرت اس کا انتقام نہ لے گی؟"

"اُس شخص نے اس عورت کے ساتھ وہ کیا جس کا نتیجہ آج عدالت خود دیکھتی ہے۔ لیکن وہی اور صرف وہی شخص اس کا ذمہ دار ہے وہ یقیناً عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتا ہوگا اور تمام اُس کی عزّت کرتے ہونگے۔ لیکن ازلی منصف کے روبرو اُس شخص کی وہی حالت ہوگی جو آج میری موکلہ کی ہے۔"

اُس قانون سے زیادہ عالی مرتبہ قانون یعنی اخلاقی قانون کی رو سے میں آپ لوگوں سے درخواست کرونگا کہ اس عورت کی حالت پر رحم کیا جائے۔ جس کی تباہی کا ذمہ دار ایک کمینہ۔ خود غرض۔ وحشی۔ انسان ہے (وہ تھوڑی دیر کے لئے ٹھہر تا ہے وہ جانتا ہے کہ اُس نے اپنی تیار کردہ تقریر کا ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ لیکن وہ وہ برجستہ فقرے اُس کی زبان سے ادا ہوئے جن کا اُسکو سان گمان بھی نہ تھا۔ اُس نے اپنے چاروں طرف نظر کی اور دیکھا کہ جج سمیت سب کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔)

"عالی حضرات! میں آپ کے روشن ضمیروں سے اپیل کرتا ہوں کہ آپ لوگ ذرا اس عورت کی حالت پر غور کریں۔ کیا وہ بذاتِ خاص اس فعل کی ذمہ دار ہوسکتی ہے؟ کیا وہ سزا کی مستوجب ہے۔ اس لئے کہ اس نے اُس شخص کا خاتمہ کیا۔ جو اُس کے محبوب کی ذات کو نقصان پہنچانا چاہتا تھا۔ کیا یہ عورت سزا کی مستوجب ہے اسلئے کہ اُس نے آخر دم تک نہایت دلیری سے خاموش رہ کر اپنے محبوب کی عزت کا پاس کیا؟ نہیں ہرگز نہیں ــ !!!"

"میں شرمندہ ہوں کہ میں اُن جذبات کا اظہار بطریق احسن نکرونگا جو اس وقت مجھ پر غالب ہیں میں اپنے ضمیر کی پیروی کرتے ہوئے ایمانداری سے یہ کہونگا۔ کہ یہ عورت ہرگز ہرگز قابلِ سزا نہیں" (سعید بیٹھ جاتا ہے)

عدالت کے کمرہ میں مکمل سناٹا کہیں کہیں سے ہچکیوں کی آواز بھی آتی ہے جج کھڑا ہوتا ہے اور جیوری کو مخاطب کرنا چاہتا ہے کہ کمال ہوٹل کا منیجر ایک دم سے گھبرا کر اٹھتا ہے اور شش و پنج میں یوں گویا ہوتا ہے)

**منیجر:** "عالی جناب!"

**جج:** "کیا ہے تم کیا چاہتے ہو؟ — کیا تمہیں کچھ اور بیان کرنا ہے"؟

**منیجر:** "جی ہاں"

**جج:** "بیان کرو"

**منیجر:** (شہباز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) "عالی حضرت! یہ شخص فاروق کے آنے سے پہلے اس کو پوچھتا ہوا آیا تھا اور پھر اس کے سامنے بھی ایک مرتبہ آیا تھا اس کے ساتھ ایک اور شخص بھی تھا۔ فاروق ان دونوں کے ساتھ باہر گیا تھا اور کوئی دو گھنٹے کے بعد واپس آیا اور آنے کے کوئی آدھ گھنٹہ کے بعد مارا گیا...."؟

**جج:** اوہو! یہ تو بڑی ضروری بات ہے — تم نے پہلے سے کیوں نہ بیان کیا"؟

**منیجر:** "عالی حضرت! میں بھول گیا تھا۔ اس وقت اس شخص کو دیکھتے ہی یاد آیا....!"

**جج:** "اس کے علاوہ اور کچھ کہنا ہے"؟

**منیجر:** "جی نہیں اور کچھ نہیں...."

**جج:** اچھا بیٹھو! کورٹ صاحب! آپ ان لوگوں کو طلب کیجئے — مجھے مجاز ہے کہ بغیر سمن وغیرہ کے میں انکا بیان لے سکوں"

(شہباز ہراسانی کے عالم میں چاروں طرف دیکھتا ہے۔ کورٹ انسپکٹر شہباز کو ساتھ لاکر گواہوں کے کٹہرے میں کھڑا کر دیتا ہے)

**کلرک:** "تمہارا نام۔ ولدیت۔ سکونت۔ پیشہ"

**شہباز:** "میرزا شہباز بیگ ولد میرزا عباس بیگ ساکن ۶۲ کلائیو اسٹریٹ بمبئی پیشہ وکالت!"

**کلرک:** "کہو میں خدا کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ جو کچھ میں بیان کرونگا وہ بالکل سچ اور صحیح ہوگا"

**شہباز:** (مسکراتے ہوئے) "میں خدا کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ جو کچھ میں بیان کرونگا وہ بالکل سچ اور صحیح ہوگا"

**کلرک:** "تم اس مقدمہ کے متعلق کیا جانتے ہو مفصل بیان کرو"

**شہباز:** "میں اسکے متعلق کچھ نہیں جانتا قطعی نہیں...."

**کلرک:** "کیا تم فاروق کو جانتے تھے"؟

**شہباز:** "ہاں! میں اسکو برسوں سے جانتا تھا۔ وہ عرصہ ہوا میرا محرر بھی تھا — میری نوکری چھوڑنے کے بعد وہ خدا معلوم کہاں کہاں مارا پھرتا رہا۔ ایک ہفتہ ہوا اس کا ایک خط دمشق سے میرے پاس آیا تھا۔ جس میں اس نے دوبارہ ملازمت کی درخواست کی تھی۔ مجھے ایک آدمی کی ضرورت بھی تھی۔ اس لئے میں نے اُسے بلا لیا۔ جب وہ آگیا تو میں اُس سے ملنے گیا تھا۔ بس اس کے علاوہ میں کچھ نہیں جانتا"

(منیجر فوراً شہباز کو پہچان لیتا ہے وہ اُس کے تمام بیان کو غور سے سن رہا ہے اور اسکے چہرہ پر رنگ ایک آتا ہے اور ایک جاتا ہے)

**کلرک:** "تم نے فاروق کے ساتھ کس قسم کی گفتگو کی تھی"؟

شہباز:"میں نے اس کو اپنے دفتر کے کام کے متعلق مختلف امور سمجھائے تھے۔"

کلرک:"تمہارا دوسرا ساتھی کون تھا؟"

شہباز:"قاسم بیگ! اُس کا کل ہی انتقال ہوگیا!"

کلرک:"تمہیں اس قتل کے متعلق کچھ معلوم ہے"

شہباز:"قطعی نہیں۔"

کلرک:"تم اس ملزمہ کو جانتے ہو۔؟"

شہباز۔(غور سے نجمہ کی طرف دیکھتے ہوئے)"میں نے اس کو فاروق کے ساتھ دیکھا تھا۔ لیکن میں یہ نہیں جانتا یہ عورت کون ہے۔۔۔۔۔"

نجمہ (غصہ کی حالت میں ایک دم سے کھڑی ہوجاتی ہے اُس کا اضمحلال یکقلم سوقوف ہوجاتا ہے اُس کی آنکھیں چمکنے لگتی ہیں وہ اپنا ایک ہاتھ شہباز کی طرف اُٹھاتی ہے اور تیز آواز سے کرخت لہجہ میں بولتی ہے)"کمینے میں تمہیں جانتی ہوں — تمہیں نے مجھسے قتل کروایا۔۔۔۔"

— (کمرہ عدالت میں حیرت واستعجاب کی ایک برقی رو دوڑجاتی ہے کچھ لوگ گھبرا کر کھڑے ہوجاتے ہیں۔)

شہباز (لڑکھڑاتے ہوئے)"میں — میں۔۔۔"

نجمہ (جوشیلے لہجے میں)"ہاں! تم ہی — تم — ! تم نے کس طرح یہ پتہ لگایا کہ میں شادی شدہ ہوں اور میرے شوہر نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے۔— تم ہی نے فاروق کو بہکا کر آمادہ کرلیا کہ وہ میرے شوہر سے ملکر میرا مہر طلب کرے۔۔۔۔"

شہباز۔(حواس جمع کرتے ہوئے) جناب والا یہ عورت پاگل ہے۔۔۔۔۔"

نجمہ:"ہاں! میں پاگل تھی — ! جب ہی تو میں نے تمہیں زندہ رہنے دیا۔ اگر پاگل نہ ہوتی تو تمہارا بھی خاتمہ کردیتی — میں نے فاروق کی منت کی' خوشامد کی سب کچھ کیا لیکن وہ باز نہ آیا اور مجکو اور میرے لڑکے کو اور میرے شوہر کو بدنام کرنے پر تُلا رہا اس لئے میں نے اُسے مار ڈالا —!"

(نجمہ نڈھال ہوکر کُرسی پر گر پڑتی ہے سعید اُس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے اور تسلی دیتا ہے۔)

جج:"انسپکٹر ریاض! شہباز بیگ کا چال چلن مشتبہ معلوم ہوتا ہے ان کو حراست میں رکھکر تفتیش کی جائے اور کل معلومات بہم پہنچا کر ہمارے روبرو پیش کیا جائے۔"

انسپکٹر ریاض:"جو ارشاد عالی!" (شہباز کو گواہوں کی بینچ پر بٹھا دیتا ہے۔)

جج (نجمہ سے)"مسز فاروق! تمہیں اور کچھ کہنا ہے؟ کل واقعہ بتا دو سچ سچ۔۔۔۔"

نجمہ:"میرا وکیل سب کچھ کہہ چکا ہے اس سے زیادہ میں اور کچھ نہیں کہنا چاہتی — میں عمر بھر اس کا احسان نہ بھولوں گی — اُس نے جو کچھ کہا بالکل ٹھیک — کہا۔ میں خود اتنی ذلیل نہیں تھی۔ ایک بزدل' کم ہمت انسان نے میری زندگی تباہ کی — میں تسلیم کرتی ہوں کہ میں اُسکی قصوروار تھی لیکن میں اپنے کئے پر پچھتائی اور اُس سے طرح طرح سے معافی مانگی۔ لیکن — لیکن اُس نے قطعی پروا نہیں کی اور مجھے اپنے گھر سے نکال دیا — اس لئے کہ بازاروں میں پڑی پھروں — مجھکو! اپنی بیوی اور اپنے بچے کی ماں کو —!!! خیر یہ اُسی کی بدولت ہے کہ میں نے ہزاروں مرتبہ اپنے آپ کو بیچا —! یہ اُسی کی بدولت ہے کہ میں نے شراب پینی شروع کردی — یہ اُسی کی بدولت ہے کہ میں آج ایک قاتلہ کی حیثیت سے اس عدالت میں حاضر ہوں — دنیا مجھ پر ہنستی ہے اور میں روتی ہوں آہ! میرا دل روتا ہے۔ خیر اب مجھے اس کی بھی پروا نہیں

(بقیہ مضمون برصفحہ ۳۱۲)

# سلاطین آصفیہ کی اردو شاعری

از جناب نصیر الدین ہاشمی، ریسرچ اسکالر، حیدرآباد (دکن)

نواب میر قمرالدین خاں آصف جاہ اول نے ۱۱۳۶ھ میں سلطنت آصفیہ کی بنیاد قائم فرمائی آپ کے بعد آپ کی اولاد مسند دکن پر جلوہ گر ہوئی آج آپ کے سلسلہ کے دسویں حکمراں اعلیٰحضرت سلطان العلوم نواب میر عثمان علی خاں بہادر خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ مسند حکومت پر متمکن ہیں۔ حکمرانوں کی فہرست حسب ذیل ہو۔

| | | |
|---|---|---|
| (۱) آصفجاہ اول | سنہ ۱۱۳۶ھ | سنہ ۱۱۶۱ھ |
| (۲) نواب ناصر جنگ | سنہ ۱۱۶۱ھ | سنہ ۱۱۶۴ھ |
| (۳) نواب مظفر جنگ | سنہ ۱۱۶۴ھ | سنہ ۱۱۶۴ھ |
| (۴) نواب صلابت جنگ | سنہ ۱۱۶۴ھ | سنہ ۱۱۷۵ھ |
| (۵) نواب میر نظام علی خاں آصفجاہ ثانی | سنہ ۱۱۷۵ھ | سنہ ۱۲۱۸ھ |
| (۶) نواب سکندر جاہ آصفجاہ ثالث | سنہ ۱۲۱۸ھ | سنہ ۱۲۴۴ھ |
| (۷) نواب ناصر الدولہ آصفجاہ رابع | سنہ ۱۲۴۴ھ | سنہ ۱۲۵۰ھ |
| (۸) نواب افضل الدولہ آصفجاہ خامس | سنہ | سنہ ۱۲۸۵ھ |
| (۹) نواب میر محبوب علیخاں بہادر غفران مکان آصفجاہ | سنہ ۱۲۸۵ھ | سنہ ۱۳۲۹ھ |
| (۱۰) نواب میر عثمان علیخاں بہادر سلطان العلوم آصفجاہ | سنہ ۱۳۲۹ھ | سنہ |

ان میں سے آصف جاہ اول و ناصر جنگ اور نواب میر محبوب علی خاں جہاں قلمرو آصفیہ کے فرمانروا تھے وہاں اقلیم سخن کی بھی فرمانروائی کرتے تھے، علیٰ ہذا اعلیٰحضرت سلطان العلوم نواب میر عثمان علیخاں بہادر کے قبضہ میں نہ صرف عنان حکومت دکن ہو بلکہ ملک سخن کی تاجداری بھی آپ کے سر ہو۔

آصف جاہ اول بڑے علم دوست اور خود بھی ذی علم تھے۔ آپ کا دربار علما و فضلا کا ملجا و ماویٰ تھا۔ دہلی کے علما و فضلا اور شعرا آپ کے زمانہ میں اورنگ آباد میں جمع ہو گئے تھے۔ مولانا آزاد بلگرامی، ولی اور سراج جیسے شعرا آپ کے زمانہ میں اورنگ آباد میں موجود تھے آپ کو شعر و شاعری کا بڑا ذوق تھا۔ مرزا عبدالقادر بیدل سے تلمذ حاصل تھا۔ پہلے شاکر تخلص کرتے تھے اس کے بعد آصف قرار دیا، آپ کا فارسی کلام موجود ہے جس سے آپ کی قادر الکلامی کی تصدیق ہوتی ہے۔ آپ نے اردو میں بھی طبع آزمائی کی ہے خواجہ عنایت اللہ فتوت اپنے تذکرہ[۱] میں لکھتا ہے:

"عمدہ امرائے عظیم الشان ...... ...... نظام الملک فتح جنگ استفادہ سخن از مرزا عبدالقادر بیدل

---

[۱] یہ تذکرہ ۱۱۵۸ھ میں مرتب ہوا ہے ہنوز شائع نہیں ہوا ہے۔ اس پر تفصیل سے مضمون لکھا ہے۔

جنت منزل است۔ دیوانہا مدون دارد در تمام عمر خود کہ بہی مضمون ہندی تسخیر خاطر گردیدہ و بحسب اتفاق ملسان در بیان سرزدہ انخلص آصف وشاکر"

| | |
|---|---|
| مجھ دل کی گلی بیچ دعا کی پینی ہے | کالی نہ کہو کوئی میرے دلبر کو حسد سے |

اردو میں آپ کا یہی ایک شعر ہے اس لئے آپ کی اردو شاعری کے متعلق کوئی رائے نہیں دیجا سکتی مگر فارسی شاعری سے اس امر کا بخوبی ثبوت ملتا ہے کہ آپ اپنے عہد کے باکمال شاعر تھے،

آپ کے فرزند نواب ناصر جنگ جہاں حکومت اور جہانبانی میں آپ کے جانشین ہوئے وہاں شعر و سخن میں بھی وارث ہوئے آپ ایک پرگو شاعر تھے چھ ہزار بیت کا دیوان مرتب فرمایا تھا۔ یہ دیوان فارسی ہے کبھی کبھی اردو میں بھی آپ نے طبع آزمائی کی ہے آپ کی شاعری کے متعلق لالہ لچھمی نرائن شفیق کہتا ہے:۔

"ناصر تخلص طبع موزوں مے داشت۔ دیوان اشعار فارسیش سیر ضخامت قریب شش ہزار بیت از دستخط خاص بنظر رسید معنی تلاش عالی نمودہ است۔ مے گویند کہ تصویر را خوب مے کشید و کبت را نہایت استواری مے گفت و در علم موسیقی وسنگیت علم استادی مے افراخت۔ وزبان سنسکرت نہ نیکو وجہ مے شناخت۔ احوالش مستغنی از توصیف قلم قطع السان است وگاہی فکر ریختہ ہم مے کرد اما کمتر گفتہ"
(چمنستان شعراء)

اسی طرح فتوت اپنے تذکرہ میں لکھتا ہے:۔

"درت التاج اورنگ......... نظام الدولہ ناصر جنگ بہادر رئیس ملک دکن بود شربت شہادت چشید و بعنایت الہی در سلک کمترین بندہا منظوران است کہ ملا کریمہ در ہندی مے فرمود"

آپ کے دربار کے متعدد امرائے نامدار شاعر تھے جن کا اردو کلام اب تک موجود ہے ان میں سے صارم۔ محرم۔ ایمار۔ یار حمید۔ شفیق۔ عارف۔ عزلت وغیرہ چند ہیں

ناصر کا حسب ذیل کلام فتوت اور شفیق نے پیش کیا ہے:۔

| | |
|---|---|
| نین تیرے شکار کرتے ہیں | دل ہمارا فگار کرتے ہیں |
| خوب روجب سنگار کرتے ہیں | آرسی پر بہار کرتے ہیں |
| کسی بیداد سوں چمن میں آج | پھول سارے پکار کرتے ہیں |
| اہل دل گریۂ ندامت سیں | سیر ابر بہار کرتے ہیں |
| چشم بد در خوش نین سارے | اپنے ناصر کو پیار کرتے ہیں[1] |

| | |
|---|---|
| یا خورشید جہاں تھا مجھے معلوم نہ تھا | ذرے ذرے میں عیاں تھا مجھے معلوم نہ تھا |

[1] ریاض حسنی تذکرہ فتوت



نصیر الدین ہاشمی

Jam'a Press, Jama Masjid Delhi.

مجھے بہاری گلے والا گویا خوش نہیں آتا
کھٹکتا ہے کلیجے میں دو ہی باریک سُر[لہ] والا

---

اس کلام سے واضح ہوسکتا ہے کہ آپ کا کلام سادگی اور صفائی کے لحاظ سے قابل تعریف تھا اور معنوی اعتبار سے بھی کس قدر پرلطف اور پراثر ہے خصوصاً یہ شعر اہل دل گریہ ندامت سے سیراب بہار کرتے ہیں ۔ موسم خزاں میں بہار کی کیفیت پیدا کرتی ہے ۔

اس سلسلہ کی تیسری کڑی مرحوم حضور نواب میر محبوب علیخاں بہادر غفران مکان ہیں آپ کو اردو شاعری سے خاص شغف تھا ۔ بلبل ہندوستان نواب مرزا داغ کو آپ کی استادی کا فخر حاصل تھا آپ نے ان کو گرانقدر مشاہرہ کے ساتھ فصیح الملک کا خطاب مرحمت فرمایا تھا داغ کی طرح امیر مینائی بھی اسی زمانہ میں حیدرآباد آئے تھے ۔ ان کے علاوہ دہلی اور لکھنؤ کے قابل شعراء کا حیدرآباد میں سنگم ہوگیا تھا ۔ کیونکہ لکھنؤ کی تباہی کے باعث جب وہاں کے اہل کمال منتشر ہوئے تو وہ رامپور ہوتے ہوئے حیدرآباد آنے لگے ۔ ہندوستان کے مشہور یگانۂ آفاق مرثیہ نویس انیس اور ان کے قابل جانشین ہرسال محرم میں یہاں آتے اور اپنے جانسوز مرثیے سنا کر مجلس عزا کو گرماتے اور سامعین کو اشکبار کرتے تھے ۔

مرحوم حضور کی قدردانی اور ذوق سخن کے باعث حیدرآباد میں شعر و شاعری کا بڑا چرچا ہوگیا تھا دربار کے کئی امراء نامور شاعر تھے جو ملک سخن سے اپنے کلام کی داد لیتے تھے ۔

آپ نے آصف اپنا تخلص قرار دیا تھا آپ کی عاشقانہ اور دلکش غزلیات میں استاد داغ کا رنگ صاف نظر آتا ہے ۔ ایسی مشق بہم پہنچائی تھی کہ آپ کی غزل داغ کی ٹکر کی ہوتی تھی اور لطف زبان ترکیب کی خوبی ۔ فصاحت مضمون ۔ محاورات روزمرہ ہر پہلو سے دل کش صاف ہے ۔ آپ کے کلام میں جہاں داغ کی طرح رنگین سلاست اور سادگی پائی جاتی ہے وہیں اس میں شاہانہ رعب و داب بھی نظر آتا ہے ۔ ذیل میں آپ کے کلام کا مختصر سا انتخاب پیش کیا جاتا ہے :-

فاتحہ پڑھتے ہوئے اس نے سمیٹے دامن — جیب میرا دست ہوس تیرے با حسر نکلا
دل کہیں خاک میں کیا میری دفن ہیں ظالم — حرف انکار زباں سے ترے کیونکر نکلا
واہ کیا لطف ہوا وصل کی شب ان کے قریب — غیر سے وعدہ کا کاغذ سر بستر نکلا

---

واہ اے شان کریمی ترے صدقے قرباں — جس گنہگار کو دیکھا وہ گنہگار نہ تھا
لیجئے غیر سے دو دن بھی نباہی نہ گئی — آپ کے ذہن میں آصف تو وفادار نہ تھا

---

لائے تھے وہ رقیبوں کو میرے مزار پر — اڑ کر غبار سامنے دیوار ہوگیا

لہ چمنستان شعراء

خوں تک دل کا نہ چھوڑا رکتے ہی سینہ پہ ہات　　واہ واہ دزد حنا کیا ہاتھ کا چالاک تھا

---

کرکے وہ تیغ زنی مجھ پہ ہوا چیں بجبیں　　یعنی میں قتل بھی کرنے کے سزاوار نہ تھا
اسکے جانے سے مجھے موت نہ آئی آصف　　ایسی رسوائی سے جینا تجھے درکار نہ تھا

---

آصف کا ہو یہ قول سنیں صاحب غیرت　　احسان نہ لے ہمت مردانہ کسی کا

---

وصل میں تلخ بھی دشنام مزا دیتے ہیں　　کوسنے والوں کو ہم دل سے دعا دیتے ہیں
ایسے لوگوں میں نہیں ہم جو کہیں اور نکریں　　مرد جو کہتے ہیں وہ کرکے دکھا دیتے ہیں
ان حسینوں سے کوئی خون کا دعویٰ نہ کرے　　خوں بہا دیتے نہیں خون بہا دیتے ہیں

---

رہے ہر دم میں ہر دم یاد تیری　　جدھر دیکھوں ادھر بس تو ہی تو ہو
مقابل یوں ملے جب حسن کی داد　　ادھر یوسف ادھر بے پردہ تو ہو

---

یہ کافر حسیں ایک جا جمع ہونگے　　جہنم میں بھی ایک طرح کا مزا ہے

---

یہ امتحاں تو دیکھو وہ مجھ سے پوچھتے ہیں　　پسند ہو تمہیں اس شہر میں ادا کس کی

---

بیتاب دل کے ہاتھ سے ہو میری لاش بھی　　اندر مزار کے کبھی باہر مزار کے

---

یہ شب وصل ان کو حسرت ہے　　شام ہوتے ہی کیوں سحر نہ ہوئی

---

تری تیغ جب ہم علم دیکھتے ہیں　　وہیں سر کو اپنے قلم دیکھتے ہیں

---

جو کامیاب نہ ہو کوئی یہ نصیب اس کا　　نہیں قبول کی آصف نے التجا کس کی

---

کبھی نہ دب کے ملیں گے ہم ان سے آئی آصف　　وہ شاہ حسن سہی شہر یار ہم بھی ہیں

ایک آپ کی پوری غزل پیش کی جاتی ہے:۔

یہ دل آشنا اور وہ ناآشنا ہے    بھلوں سے بھلا اور بُروں سے بُرا ہے
نہیں ہے اگر تو ہمارا تو کیا ہے    زمانہ میں کوئی کسی کا ہوا ہے
پیو بھی پلاؤ بھی اس کا مزہ ہے    یہ شیشہ دھرا ہے یہ ساغر دھرا ہے
کریں بت کدہ عبث قصد کعبہ    یہاں بھی خدا ہے وہاں بھی خدا ہے
کہاں جائے انسان ان سے نکل کر    زمیں فتنہ گر ہے فلک فتنہ زا ہے
یہ کافر حسیں اک جگہ جمع ہونگے    جہنم میں بھی اک طرح کا مزا ہے
بہت دور ہے منزل رہ دست ایدل    جو یہ طے ہوئی پھر خدا ہی خدا ہے

ہمارے بھی ہو امتحاں میں یہ آصف
لگانا ہی دل کا سراسر خطا ہے

اس مختصر انتخاب سے آپ کی غزل کا رنگ بخوبی واضح ہو سکتا ہے اور ہاں اس بیان کی تائید ہو سکتی ہے جو ہم نے آپ کے کلام کے متعلق ظاہر کی ہے۔

غزلیات کی طرح آپ کی اخلاقی نظمیں بھی مشہور ہیں، رعایا کے مختلف فرقوں وغیرہ کے سپاس ناموں کے جواب میں آپ نے اپنی سالگرہ کے موقع پر نہایت عمدہ نظمیں اکثر و بیشتر سنائی ہیں جو تعلیم۔ فوج۔ اصلاح فوج۔ وفاداری۔ کارگزاری۔ محنت۔ دیانتداری۔ علم۔ عمل وغیرہ مختلف امور پر لکھی گئیں ہیں بعض کا نمونہ پیش ہے۔

علم کی قدر کرو قدر کرو قدر کرو    تمکو اللہ نے بخشی ہے اگر طبع سلیم
سمجھو سمجھو وہ نکات اور وہ اسرار رموز    دیکھو دیکھو وہ کتب جو ہیں جدید اور قدیم
علم ہے اسکی دوا اور دوا بھی اکسیر    کہ جہالت بھی ہے منجملہ امراض سقیم
طالب علم ذکی اور ہو استاد شفیق    کیوں پسندیدہ نہو ایسی تعلم تعلیم
فہم و دانش کی ترقی کا یہی باعث ہے    علم کی وجہ سے تھے حضرت لقماں بھی حکیم
قابل صحبت شاہان و سلاطین ہے وہی    عزت اسکی ہے جو کہلائے زمانہ میں فہیم
دین و دنیا میں جو پھیلی تو اسی کی خوشبو    مشک از فر کی نہ عنبر سارا کی شمیم
ایسی دولت کیلئے کوشش و محنت ہے ضرور    گرچہ تقدیر عطا جس کو کرے رب کریم

یہ جو آصف نے کہا غور سے اسکو سمجھو
علم وہ شے ہے کہ اللہ کا ہے نام علیم

ایک دوسرا قطعہ جو فوج کے متعلق ہے اسکے تئیس شعر ہیں بعض اشعار ملاحظہ ہوں

اے جان نثار فوج ظفر موج شکریہ
جوہر ہیں تم میں صورت شمشیر آبدار

رخ رخ سے مرد مرد کی مردانگی عیاں
رگ رگ سے فرد فرد کی جرأت ہے آشکار

ایسے سپاہیوں کی سپاہی کو قدر ہے
تعریف کیوں نہ آئے مرے لب پہ بار بار

فن سپہگری مری میراث جد کی ہے
اس ہی میں میرا نام ہے اس سے ہے افتخار

عزت تمہاری ہے وہ میری عین آبرو
رکھا مرے بزرگوں نے تم کو بصد وقار

---

طاعت کے بعد جو ہے اطاعت کا پابند
دنیا و دیں میں وہ نہ کبھی ہوگا شرمسار

ماتحت مانے حاکم اعلےٰ کے حکم کو
یوں اہل روزگار کی ہو طرز روزگار

---

اس کو بھی ہو یقین عنایت اسی طرح
سرکار کو ہے جیسے سپاہی کا اعتبار

---

ایک اور قطعہ جو وکلا کے ایڈریس کے جواب میں کہا گیا تھا اس کے اکیس شعر ہیں ان میں سے بعض ملاحظہ ہوں

ہے لاکھ لاکھ شکر کہ سنتا ہوں میں تمام
لب وا نہیں کسی کی شکایت کے واسطے

بیکار میں نہیں ہوں کہ سرگرم کار ہوں
بہبودی و فلاح رعیت کے واسطے

رہتی ہے نیک و بد پہ نظر میری رات دن
آنکھیں خدا نے دی ہیں بصارت کیواسطے

بگڑے جو ہو تو لاؤں اُسے راہ راست پر
میری زباں ہے پند و نصیحت کے واسطے

دریا بھی ایک قطرہ ہے کان گہر تو کیا
اہل سخا و صاحب ہمت کے واسطے

---

واجب ہے صبر و شکر و قناعت شریف کو
لازم دیانت اہل شرافت کے واسطے

انسان ہر ایک حال میں ہو مستقل مزاج
ہر روز کا عسرت و عشرت کے واسطے

دولت تو یہ بڑی ہے کہ مجھ کو خیال ہے
آسودگی کا اہل قدامت کے واسطے

جنت یہاں بھی ہے اگر افعال ہوں درست
انسان خواستگار ہے جنت کے واسطے

اس قطعہ کا آخری شعر خصوصیت سے قابل ملاحظہ ہے،

آصف کو جان و مال سے اپنے نہیں دریغ
گر کام آئے خلق کی راحت کیواسطے

---

بعض دیگر قطعات کے شعر ملاحظہ ہوں :-

ہنر ور سے ہے سلطنت کا نمود　　　ہنر ہی سے ہوتی ہے نام آوری

---

تمہاری طرف سے وفاداریاں　　　ہماری طرف سے کرم گستری

---

صورت نکہت پریشان کہوں　　　اپنی حد سے کوئی نکل کے چلے
کہیں ایسا نہ ہو لگے ٹھوکر　　　چاہیئے آدمی سنبھل کے چلے

---

شریفوں کا شیوہ دیانت ہے بیشک　　　بغیر اسکے بدنام ہو اہلکاری

---

قلم کیا علم کیا اگر مشق ہوگی　　　نہ ہوگی طبیعت کسی فن میں عاری

---

نیک نامی بھی عجیب چیز ہے اس دنیا میں　　　نام مشہور ہوا ناموروں کا کیا کیا

---

اس تفصیل کے بعد اب ہم اس سلسلہ کی چوتھی کڑی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

ہمارے موجودہ اعلیحضرت سلطان العلوم نواب میر عثمان علی خاں بہادر خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ بھی زبردست اور بلند پایہ شاعر ہیں۔ اردو کی ترقی اور اسکو ترقی یافتہ زبانوں کے ہم پایہ بنانے میں جو کوششیں آپ کے عہد مسنت مہد میں ہوئیں اور ہو رہی ہیں وہ تاریخ اردو میں آب زر سے لکھی جائیں گی۔

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ اردو کو ادبی عزت سب سے پہلے دکن ہی نے بخشی تھی، جب کہ صدیوں بعد بھی شمال میں ریختہ کا کوئی دیوان مرتب ہونے پایا تھا، اور نہ اردو تحریری صورت میں آئی تھی گولکنڈہ اور بیجاپور کے دربار کو نو سنجان اردو اپنی گل افشانی سے لالہ زار بنائے ہوئے تھے مجالس عزا کو مرثیہ گو اپنی نوحہ خوانی سے گرماتے تھے اسی طرح اب بھی اس کی تکمیل وارتقا کی امید دکن ہی سے وابستہ نظر آتی ہے، جامعہ عثمانیہ کا قیام جس کا مقصد اردو زبان میں اعلیٰ علوم وفنون کی تعلیم دینا ہے، اس سے آئندہ حیدرآباد تمام دنیا میں علم وحکمت کا ایک اہم اور عظیم الشان مرکز ہو جائیگا۔

اعلیحضرت کا کلام لطافت نظام بلندی مضمون وحدت خیال خوبی بندش ولطف زبان کے لحاظ سے بے نظیر ہے اور بہر شاہانہ رفعت و رعب وداب سے چار چاند لگ گئے ہیں جس طرح آپ نظم ونسق سلطنت میں سرآمد روزگار ہیں، اسی طرح آپ کا ادبی ذوق اور شعر وسخن کا شوق معاصر حکمرانوں میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے امیر مینائی مرحوم کے قابل جانشین جلیل آپ کے درباری شاعر ہیں۔ جن کو فصاحت جنگ کے خطاب سے ممتاز فرمایا گیا ہے۔

آپ کی غزل اور سلام اردو کے سخت سے سخت نقادوں کی نظر میں بھی اہمیت رکھتے ہیں اور ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ آپ کا کلام تعریف سے مستغنی اور ستائش سے اعلیٰ و ارفع ہے بفحوائے کلام الملوک ملوک الکلام :-

انتہا جور و ستم کی ستم ایجاد بھی ہے ۔۔۔ خاک عشاق کی پامال بھی برباد بھی ہے
ہمہ تن گوش ہیں گل نغمۂ بلبل کے لئے ۔۔۔ سننے والا کوئی آہ دل ناشاد بھی ہے
حلقۂ دام علائق میں نہیں کوئی اسیر ۔۔۔ گلشن دہر میں طائر کوئی آزاد بھی ہے
ظلم ہو جو ہو سب کچھ ہے گوارا ہم کو ۔۔۔ تو جو سفاک تو دل خوگر بیداد بھی ہے
کھینچی ہے خامۂ قدرت نے وہ صورت تیری ۔۔۔ دنگ مانی بھی ہے حیرت زدہ بہزاد بھی ہے
درد و غم راز ہیں عشق چھپاؤں کیونکر ۔۔۔ چشم خونبار بھی ہے لب فریاد بھی ہے
ایسے گلشن میں کہاں چین میسر عثماںؔ ۔۔۔ جس میں گلچیں بھی ہے صیاد بھی جلاد بھی ہے

---

نہاں نظر سے ہوا روئے یار مشکل ہے ۔۔۔ اب اپنے دل پہ ہمیں اختیار مشکل ہے
کسی کے غمزہ و انداز ناز نے دل پر ۔۔۔ کئے وہ ظلم کہ جن کا شمار مشکل ہے
ہزار بار تمہیں آزما کے دیکھ لیا ۔۔۔ تمہارے وعدوں کا اب اعتبار مشکل ہے
نگاہ ناز اک آفت ہے مرغ جاں کے لئے ۔۔۔ یہ تیر وہ ہے کہ جس سے فرار مشکل ہے
غم رقیب میں تم کو نہ خاک اڑانی تھی ۔۔۔ ہمارے دل سے یہ جائے غبار مشکل ہے
میں اس چمن کا ہوں مرغ ترانہ سنج جہاں ۔۔۔ ترا گذر بھی نسیم بہار مشکل ہے

پڑی ہے بادہ کشی کی جو چاٹ اے عثماںؔ
بہار گل میں یہ جائے ہزار مشکل ہے

---

سماں تو جلوہ نما ہے گل و گلزار بھی ہے ۔۔۔ کاسۂ زر بھی ہے اور بادۂ گلنار بھی ہے
عشق و غم دونوں توام ہیں جو چمن عالم میں ۔۔۔ گل کے پہلو میں کھٹکتا ہوا اک خار بھی ہے
کفر و اسلام کی ہستی کا پتہ دیتا ہے ۔۔۔ ساتھ تسبیح کے جو رشتۂ زنار بھی ہے
صوت دلکش ہے یہاں قلقل مینا کا جواب ۔۔۔ جام کا دور بھی ہے نغمۂ مزمار بھی ہے
زر بکف غنچہ ہے گل مست صبا عطر فروش ۔۔۔ ابر ہے سایہ فگن اور گہربار بھی ہے
جام بدست ادھر نرگس شہلائے نگار ۔۔۔ جام بردوش ادھر طرۂ طرار بھی ہے

آج ہے داخل مسجد پئے طاعت عثماںؔ
ساتھ زہاد کے اک رند قدح خوار بھی ہے

آئینہ ہوتے اگر خوبیٔ تقدیر سے ہم | روبرو ان کے پہنچتے کسی تدبیر سے ہم
خونِ ناحق سے ہمارے ہو پشیماں قاتل | مطلب اس بات کا سمجھے خمِ شمشیر سے ہم
یار کا وصل مقدر میں لکھا ہے کہ نہیں | پوچھتے ملتے اگر کاتبِ تقدیر سے ہم
فتنے اُٹھ اُٹھ کے یہ کہتے ہیں دمِ آہ و فغاں | تنگ آئے ہیں بہت نالۂ شبگیر سے ہم
ایک طومار ہے افسانۂ کاکل عثماں | باز آئے تیری اس پیچ کی تقریر سے ہم

---

بخت و اقبال کی تائید سے ہم اے عثماں | روضۂ شاہِ زمن شام و سحر دیکھتے ہیں

---

زمینِ شعر میں ہم دامِ فکر سے عثماں | شکارِ طائرِ مضموں کا کرکے لاتے ہیں

---

درمیانِ دو عدم میں تھی جو ہستی اپنی | خاک میں مل گئے ہم خاک سے پیدا ہو کر

---

گل و ریحان و سنبل سب خزاں میں ہو گئے رخصت
مگر بلبل کے لب پر رہ گئی آہ و فغاں باقی

---

سراغ آخر کو مل ہی جائے گا یارانِ رفتہ کا | غنیمت ہے کہ ہے اب تک نشانِ کارواں باقی
زبانِ شمع سے سنتا ہوں قصہ سوزِ الفت کا | شبِ آخر ہو چکی لیکن ابھی داستاں باقی

---

اسلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:—

یہ کرنا عرض اے بادِ صبا سبطِ پیمبر سے | کہ غم میں آپ کے اربابِ دل دیدۂ تر سے
کہو اشک و فغاں سے ذکر ہوتا ہے شہیدوں کا | گرجتا ہو جیسے گرجے برستا ہو جیسے برسے
خدا کی شان یک قطرہ نہ پہونچا حلق تک تشنہ کے | مگر دریائے تیغ کا پانی کہ اونچا ہو گیا سر سے
جو دل کے سخت ہیں وہ بھی غمِ شہ میں گریاں ہیں | عجب تاثیر ہے پانی نکل آتا ہے پتھر سے
مے حبِ نبی میں رات دن ہم مست رہتے ہیں | نہ خم سے ہے غرض ہم کو نہ شیشے سے نہ ساغر سے
قیامت ہو گی برپا اور میدانِ قیامت میں | اٹھیں گے ہم جو آنسو پونچھتے دامانِ محشر سے

وہ ہیں اشکِ عزا ہے بدولت جنکی اے عثماں
چھلکایا ساقیٔ کوثر نے ہمکو جامِ کوثر سے

خنجر ماتم سرور کا اثر دیکھیں تو — کسقدر روتے ہیں خوں دیدہ تر دیکھیں تو

چاک ہر نسخۂ اکسیر ہوس کر دینگے — خاصیت خاک شفا کی وہ اگر دیکھیں تو

رفقا صبح سے کرتے تھے یہ آپس میں کلام — کون ہوشہ کے لئے سینہ سپر دیکھیں تو

رو رہے شاہ جو دیکھا یہ خط صغرا میں — کاش حالت میری آپ ایک نظر دیکھیں تو

جنگ کی پیاس میں لاکھوں سے جنہیں گھیرے ہو — خلف ساقی کوثر کا جگر دیکھیں تو

بیچے تولک کے کہتے تھے یہ زینب کے پسر — کون کرتا ہے قلم شمر کا سر دیکھیں تو

مدح شبیر میں کیا رنگ سخن ہے عثمان
میرے اشعار ذرا اہل ہنر دیکھیں تو

---

اس مختصر انتخاب سے آپ کے کلام کا اندازہ ہو سکتا ہے عشق رسول اور حب اہلبیت میں ڈوبا ہوا کلام اپنا آپ نظیر ہے۔ یقین ہے کہ سلاطین آصفیہ کی اردو شاعری کا حال اس سے واضح ہو جائے گا۔ فقط

(نصیر الدین ہاشمی)

---

# اخوان الشیاطین

اور

# دیگر افسانے

علامہ مُضحک دہلوی کے معرکۃ الآرا سائنٹفک افسانوں کا مجموعہ چھپ کر تیار ہوگیا ہے۔

"اخوان الشیاطین" [illegible] سا ہنگامہ خیز اور خون میں پیچ و تاب پیدا کرنے والا طویل افسانہ بھی اس مجموعہ میں شامل ہے "[illegible] روح مبتلا" [illegible] میں دیکھئے کہ موجودہ سائنس کی ایجادات ارتکاب جرم میں کس ذہنیت کے ساتھ استعمال کی جاتی ہیں اور اُن کے کیسے خوفناک و لرزہ خیز نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ انسانی خون کس بے دردی سے بہایا جاتا ہے اور پھر دیکھئے کہ قدرت کا زبردست ہاتھ کے بدولت کس طرح ظالم اپنے کیفر کردار کو پہنچتا ہے۔ سات بے انتہا جاذب توجہ مضامین اس کتاب میں شامل ہیں۔

ضخامت ۳۵۲ صفحات قیمت ایک روپیہ چار آنے (عہ) علاوہ محصول ڈاک۔

ملنے کا پتہ

ساقی بکڈپو دہلی

# ساقی! یہ نیا سال مبارک ہو تجھے

## رُباعیات

از جناب سید محمد اسمٰعیل رسا ہمدانی گیاوی ٹرپل ایم۔اے (گولڈ میڈلسٹ) ایڈووکیٹ گیا

(۱)

پھر جاہ پھر اقبال مُبارک ہو تجھے — پھر عیش کی ہر فال مُبارک ہو تجھے
میکش ترے آباد رہیں شاد رہیں — ساقی! یہ نیا سال مُبارک ہو تجھے

(۲)

ساقی! تری پُر کیف جوانی ہوگی — ہر بزم میں اب تیری کہانی ہوگی
یہ ساغرِ گلرنگ یہ بادہ یہ بہار — شاہد ہیں یہ سب کہ شادمانی ہوگی

(۳)

ہر ماہ جو ہو آ کے مُلاقی ساقی — ارمان رہے دل میں نہ باقی ساقی
جلوہ ہے ترا رُوح فزا مستی خیز — کیوں لب پہ نہ ہر بار ہو ساقی ساقی

(۴)

تا حشر رہے یہ سرو ساماں ساقی — ہے بادہ کشوں پہ ترا احساں ساقی
دیتا ہے مئے ناب سے ساغر بھر کر — سو جاں سے نہ کیوں ہوں ترے قرباں ساقی


بہشت
زمین یونان
سمندر
پردۂ ظلمات

# آفرینش کائنات

از حضرت آرزو جلیلی۔ ایم۔ ایس سی۔ ریسرچ اسکالر

قدیم یونانیوں کو تخیل کی بلند پروازی میں بہت لطف ملتا تھا اور وہ واقعی تخیل کے ذریعہ مظاہر قدرت کی حقیقت کو نئے نئے انداز سے بیان کرتے تھے۔ یونانی علم الاساطیر کا مطالعہ حد سے زیادہ دلچسپ ہے۔ زمین، چاند، سورج اور ستاروں کی پیدائش کے متعلق عجیب و غریب رومانی افسانے موجود ہیں۔ یونانیوں کا خیال تھا کہ کائنات ایک کھوکھلا کرہ ہے جس کے مرکز پر زمین ایک گول تختی کی طرح اٹکی ہوئی ہے اور یونان اس تختی کے مرکز پر ہے۔ زمین کے نیچے اندھیرا غار ہے جس میں گناہگار اپنے اعمال کی سزا پاتے ہیں۔ زمین کے اوپر چاند، سورج اور ستارے روشن ہیں اور اس حصہ کا نام بہشت ہے۔

اس مضمون کے ساتھ جو نقشہ ہے اُس میں یونانیوں کے مندرجہ بالا تخیل کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

دیوتاؤں کا فرض یہ دیکھنا تھا کہ چاند اور سورج زمین پر روشنی ڈالنے میں کوتاہی نہ کریں۔ اور تارے قندیلوں کی طرح شام کو سقف آسمان میں لٹکا دئے جائیں اور صبح کے وقت اُتار لئے جائیں۔

دُنیا اپنی موجودہ صورت میں آنے سے قبل مٹی، پانی، ہوا، گرمی اور سردی کا بے ترتیب مجموعہ تھی۔ اور اس پر ہیولیٰ حکمران تھا۔ ہیولیٰ کو "شہنشاہ ظلمات" نے تخت سے اُتار دیا اور کچھ دنوں تک اُسی کی بادشاہت رہی۔ پھر "روشنی" اور "دن" نے سلطنت کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لی۔ یہ دونوں بہت خوش سلیقہ تھے۔ اُنہوں نے "زمین" اور "آسمان" کو چُن کر علیحدہ کیا اور آتشیں حصہ کو فضا میں پھینک دیا جس سے ستارے اور سیارے چھٹک پڑے۔ زمین منجمد کر دی گئی اور اُس کے گرد پانی کا ایک خوفناک چشمہ بہا دیا گیا جس سے سمندروں کی پیدائش ہوئی۔

کچھ عرصہ کے بعد بہشت کے مالک یورانس نے اپنی طاقت کا اندازہ کرتے ہوئے "روز روشن" سے عصائے سلطنت چھین لیا۔ اور نئی کائنات کا پہلا فرمانروا ہوگیا۔ اس کے بعد "عشق" کی پیدائش ہوئی اور زمین نے خوش ہوکر اپنی وادیوں کو وسیع کر دیا۔ سبزہ زار اگ آئے، دریاؤں اور جھیلوں کے مقامات مقرر ہو گئے۔ فرطِ خوشی سے سطحِ زمین میں لرزہ پیدا ہوا اور پودے باہر نکل آئے۔ پہاڑیاں سرسبز ہوگئیں اور وادیاں خوشنما پھولوں سے آراستہ۔ آسمان نے زمین کی طرف اور زمین نے ارمان بھرے آسمان کی طرف دیکھا اور دونوں میں عشق پیدا ہوگیا۔ زمین آسمان کی دولھن بن گئی۔

یورانس نے اپنی حکومت کو مستحکم کرنے اور اپنا اقتدار بڑھانے کے لئے سائیکلاپس[1] کو "پردہ ظلمات" میں ڈھکیل کر گرا دیا۔ زمین اس پر خفا ہوئی اور اس نے ٹائیٹنز[2] کو ابھارا کہ وہ باپ سے بغاوت کریں اور اپنے بھائیوں کو قعرِ ظلمت سے نکال لائیں۔ مگر کسی کی ہمت نہ ہوئی سوائے کیوان[3] کے جس نے ایک تیغ لنداسہ لے کر باپ کو دھمکی دی اور اس طرح بھائیوں کو آزاد کرا لیا۔ اس کے بعد کیوان نے خود تخت پر قبضہ کر کے ریا کو اپنی ملکہ بنالیا۔ اُس کے جتنے بچے ہوتے تھے سب کو نگل جاتا تھا تاکہ اُن میں سے کوئی جوان ہو کر تخت پر قبضہ نہ کرے۔ جب برجیس[4] پیدا ہوا تو ریا نے کیوان کو خبر نہ ہونے دی۔ اُس نے برجیس کو جزیرۂ کریٹ میں بھیجدیا، یہاں اس لڑکے کی پرورش دودھ اور شہد پر ہونے لگی۔ برجیس کو چھپا کر رکھنا بہت ضروری تھا۔ کیونکہ ٹائیٹنز بتدریج بہت طاقتور ہوتے جارہے تھے اور ممکن تھا کہ وہ کیوان سے سلطنت چھین لینے کی کوشش کرتے۔ کچھ زمانے کے بعد برجیس کی بکری اور کھلائیاں آسمان میں ستارے بنا کر رکھدی گئیں، کیونکہ برجیس کی پرورش ان ہی کے ذریعہ ہوئی تھی۔ بعض روایتوں کے مطابق کھلائیوں کو برج ثور میں جگہ ملی اور بکری کو عیوق[5] کی آغوش میں۔ خیر یہ تو جملۂ معترضہ تھا۔ جب ٹائیٹنز کو یہ معلوم ہوا کہ کیوان کے گھر میں لڑکا پیدا ہوا تھا اور وہ کہیں چھپا کر رکھ دیا گیا تھا تو انہوں نے خوفناک چیخ لگاتے ہوئے اولمپس[6] پر حملہ کر دیا۔ برجیس نے جیسے ہی اس ہنگامہ کی آواز سنی فوراً اپنے باپ کی مدد کو پہونچ گیا اور ٹائیٹنز کو مار بھگایا۔ اس کے بعد اس نے سلطنت پر قبضہ کر لیا اور کیوان کے سنہرے محل میں رہنے لگا جو پہاڑ کی چوٹی پر تھا۔

نظامِ سلطنت کو درست کرنے کے بعد برجیس نے ایک عرق سے اپنے بھائیوں اور بہنوں کو دوبارہ زندہ کیا[7]۔ تب اُس نے پلوتو اور نیپچون[8] کو اپنے دربار میں بلایا۔ اول الذکر کو اس نے "پردۂ ظلمات" کا بادشاہ بنادیا اور سمندر کی حکومت موخر الذکر کے حوالے کر دی۔ برجیس کڑکے گراتا تھا اور بجلیاں چمکاتا تھا۔ پلوتو کے پاس ایک ٹوپی تھی جس کو پہن کر وہ دوسروں کی نظروں سے چھپ جاتا تھا اور اس طرح وہ جہاں چاہتا آزادی سے جا سکتا تھا۔ نیپچون سمندر میں تلاطم برپا کر دیتا اور پھر جب چاہتا تین نوک والے بھالے سے سمندر کو ساکن کر دیتا۔

ٹائیٹنز کو طرح طرح کی سزائیں دی گئیں۔ بعض تو "پردۂ ظلمات" میں اپنے بھائیوں (یعنی یورانس کے لڑکے) کے ساتھ قید کر دئے گئے۔ اور بعض دیوتاؤں کے خدمت گزار بنا دئے گئے۔ اطلاس جو ان میں سب سے زیادہ لانبا تھا، اُس کو زمین کے مغربی کنارے پر کھڑا کر کے "گنبدِ گردوں" اُس کے سر پہ

---

[1] ایک آنکھ والے قوی ہیکل دیو۔ [2] بارہ عظیم الجسامت دیو۔ [3] پاسبانِ حرم ہفتم، زحل۔ [4] قاضیِ فلک۔ اس کو ہرمزد اور مشتری بھی کہتے ہیں۔ [5] رقیبِ ثریا۔ [6] یونان میں ایک پہاڑ کا نام جس پر دیوتاؤں کا قیام رہا کرتا تھا۔ [7] وہی بھائی اور بہن جنہیں اُن کا باپ کیوان کھا گیا تھا۔ [8] برجیس کے دو بھائی۔ ان کو بھی ریا نے کہیں چھپا کر رکھ دیا تھا۔

رکھ دیا گیا تاکہ وہ اسی طرح ہمیشہ آسمان کو سنبھالے رہے۔ افریقہ میں کوہِ اطلاس کے نام سے مشہور ہے۔

جب زمین کو اپنے پوتے برجیس کی ان کارروائیوں کی خبر ملی تو اس نے یورانس کے بیٹوں کو برجیس سے جنگ کرنے کے لئے آمادہ کیا۔ دس سال تک یہ جنگ قائم رہی۔ برجیس نے سو ہاتھوں والے دیو کو اپنی مدد کے لئے بلایا۔ یہ دیو اپنے کل ہاتھوں سے بیک وقت دشمن پر پتھر کی چٹانیں پھینکتے تھے۔ سائیکلاپس کڑکا تیار کرتے تھے اور برجیس ان کڑکوں کو غنیم کی فوج پر گراتا تھا۔ کوہِ پیلیان اور اولیمپس کے درمیان کوہِ اوسا تھا۔ برجیس کے دشمنوں نے اس پہاڑ کو اکھاڑ کر پیلیان پر رکھدیا اور کوشش کی کہ آخری حملہ میں اولیمپس کو پاش پاش کر دیں۔ مگر برجیس نے کڑکا گرا کر اوسا کو پیلیان پر سے لڑھکا دیا اور ہزاروں دیو اس کے نیچے دب کر مر گئے۔ ایک خوفناک دھماکہ ہوا کہ کائنات میں زلزلہ پیدا ہو گیا۔

صرف ایک ہیبتناک دیو طوفان بھاگ نکلا جس نے غصہ میں آکر ایک پہاڑ کو جڑ سے اکھاڑ کر برجیس کی فوج پر پھینک دیا۔ لیکن برجیس نے اولیمپس سے طوفان پر ایک کڑکا مارا جس کی ضرب سے طوفان سمندر میں جا گرا۔ وہاں دیوتاؤں نے اس کو برجیس کی بجلیوں اور کڑکوں سے خوب مارا اور پھر جزیرہ صقلیہ کو اس کے جسم پر رکھ دیا۔ اس جزیرہ کا دو تہائی حصہ اس کے ہاتھوں پر تھا اور ایک تہائی حصہ پاؤں پر۔ اس کا منہ کوہِ ایٹنا کے نیچے دبا دیا گیا۔ کوہِ ایٹنا میں ایک سوراخ ہو گیا جس کے ذریعے طوفان سانس لیا کرتا تھا۔ اس کے سانس سے آگ کے شعلے اور انگارے نکلتے تھے۵۱۔

اس جنگِ عظیم کے بعد برجیس امن و امان سے حکومت کرنے لگا۔ دیوتاؤں میں اُسکی ہستی بہت بڑی تھی۔ وہ دیوتاؤں اور انسانوں کا بادشاہ تھا۔ وہ بجلیاں گراتا تھا۔ ستارے اُس کے اشارے پر گردش کرتے تھے۔ رعد اسی کے حکم سے گرجتا تھا۔ گویا نظامِ کائنات کا واحد مالک وہی تھا۔

زمین کو گناہ اور جرائم سے پاک کرنے کیلئے دیوتاؤں نے سیلاب اور آتشزدگی کو پیدا کیا تھا۔ مگر جب انسان گناہوں کی طرف زیادہ راغب ہونے لگا اور باہمی نزاع اور رقابت جنگی بڑھ گئی تو دیوتاؤں نے مایوس ہو کر دنیا سے کنارہ کشی اختیار کی اور آسمان پر جا کر ستارے بن گئے۔ برجیس (مشتری) بھی انہی ستاروں میں شامل ہے۔ وہ بہت روشن ستارہ ہے اور آسانی سے دیکھا جا سکتا ہے۔ برجیس آخری دیوتا تھا۔ اس کے بعد سے اولیمپس کا تخت خالی پڑا رہتا ہے۔

برجیس کو آخری دیوتا سمجھنے کی وجہ یہ تھی کہ جب تعلیم زیادہ ہوئی اور زمانہ نے ترقی کی تو علم الاساطیر پر لوگوں کا اعتقاد کم ہو گیا، اور وہ "دیومالا" کے قصوں کو فرضی سمجھنے لگے۔ "دیومالا" کے لکھنے والے بھی باقی نہ رہے، کیونکہ اب لوگوں کی توجہ بیانِ حقیقت، طرزِ معاشرت، تعلیم اور مذہب کی طرف مبذول ہو گئی تھی۔ پھر بھی کائنات کی ابتدائی تاریخ کا جو تخیلی خاکہ قدیم یونانیوں نے کھینچا ہے وہ بیحد دلچسپ اور معنی خیز ہے۔

آرزو جلیلی

۵۱ کوہِ آتش فشاں کی پیدائش کا تخیلی نظریہ ملاحظہ ہو!

# تو کہاں ہے؟

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں
بلبل چہ گفت گل چہ شنید و صبا چہ کرد؟

بہار آئی ہے۔ بارش نے جل تھل ایک کر ڈالے۔ چمن میں اتفاق سے میرا بھی گذر ہوا — آہ — کیا بتاؤں — کہ بہار نے یہاں کیا سماں باندھا ہے۔ وہی چمن — جو کچھ روز قبل خزاں سے فرسودہ ہوگیا تھا — آج — چوتھی کی دلہن کی طرح آراستہ ہو۔ باغ کا پتہ پتہ ناک چوٹی گرفتار ہو۔ درخت اکڑ اکڑ کر جھوم رہے ہیں۔ ان سے کیا پوچھوں کہ "تو کہاں ہے؟" وہ تو آپے سے باہر ہیں — ! پھول — تو پھولوں نہیں سماتے۔ انہیں کون منہ لگائے — غنچہ — تو ابھی بے زبان ہو — اسکے منہ سے دودھ کی بو بھی نہیں گئی — سبزہ —؟ ارے وہ تو بیگانہ — اس سے پوچھوں بھی کیا؟ اور مانا پوچھا بھی — تو اس سے جواب کی کیا امید —؟ اسے کیا پڑی ہو کہ وہ مجھ جیسی متجسس، متلاشی، خانہ بدوش ہستیوں سے کلام ہی کرے! صبا و نسیم — تو اٹھکھیلیوں میں اتنی سرشار ہیں کہ انہیں تو بس — اپنی ہی پڑی ہو! انہیں تو صرف ٹھٹھول کرنا آتا ہے —!! آہ — میں اب کہاں جاؤں — کس سے پوچھوں کہ — تو کہاں ہو؟

سنا کہ تیری معرفت کا جلوہ پتہ پتہ سے عیاں ہوتا ہو — مانا کہ یہ صحیح ہے۔ تو پھر؟ تیرا کوئی خاص رنگ بھی تو نہیں —! پتوں میں تو نے سبز پوشاک پہن لی ہو۔ پھولوں میں تو میں کیا تمیز کروں — یہاں تو کوئی رنگ ایسا نہیں جو پھولوں سے بچا ہو — قوس و قزح کی رنگینی، بادل کی سُرمئی، سفید و سُرخ رنگت، برق کی سنہری بیقرار لکیریں۔ بتا — ان سب میں تجھے کہاں تلاش کروں؟

بہار آتے ہی دنیا کا کونہ کونہ جاذب نظر بن جاتا ہو اور شاید اسی زمانہ میں تجھے تلاش کرتے ہیں چڑیاں کس آزادی سے چہچہا رہی ہیں۔ کوئل چیخ چیخ کر بیزار ہوگئی اور اب تھک کر کہیں جا پڑی ہو — رنگ برنگ کی تتلیاں تیرے سربستہ راز کو ایک گل سے دوسرے گل میں منتشر کر رہی ہیں۔ اور اس طرح چپ چاپ کہ کوئی تیسرا نہ سن سکے۔ سوسن نے باوجود ہزار زبان مشہور ہونیکے گونگوں کا گڑ کھا لیا ہو۔ نرگس تو صرف ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہتی ہے۔ لالہ کا سینہ تو داغوں سے چھلنی ہے — قمری کو سرو کے کھڑے قد کی بلائیں لینے سے ہی فرصت نہیں۔ چکور — چاند کی تمنائے دید میں۔ دن کی گھڑیاں گن رہی ہے — پپیہے نے "پی کہاں" کی رٹ سے سارے چمن کو سر پر اٹھا لیا ہے۔ دریا کی سطح پر موجوں کی یہ تڑپ دیکھ کر کبھی یہ خیال دامنگیر ہوتا ہو کہ شاید اسی میں تو نہاں ہو، تجھے یہیں کسی طرح دیکھ لوں — آہ — میں کب تک اس سنسار میں تجھے ڈھونڈوں — کہاں کہاں ڈھونڈوں

ہم تکتے ہوئے زمانے کے
کام ایسا سکھا دیا تو نے

ج نقوی

# طوفانِ نوح

(از ناخدائے سخن تاج الشعراء فصیح العصر حضرت نوح ناروی)

جائے گو جائے فصل گل آئے گو آئے ہر برس
ہم غم زدوں کے واسطے جیسے چمن ویسے قفس

رخصت ہوا بیمار غم بالیں سے اٹھے ہم نفس
تدبیر تو کرتے ہیں سب تقدیر پر کس کا ہے بس

محشر میں اس نے درد سے گر پوچھ کچھ بیداد کی
آیا ہوں میں فریاد کو فریاد رس فریاد رس

جن کی نگاہوں میں نہیں کچھ امتیاز کفر و دیں
مسجد کا گنبد دیکھ کر دیکھیں وہ مندر کا کلس

قطع منازل میں کروں تو کس سہارے پر کروں
مفقود اہل کارواں مسدود آواز جرس

ممکن نہیں میں چھوٹ سکوں دام وفا و عشق سے
باندھے گئے سب دست و پا جکڑی گئی ایک ایک نس

تو اور دعوی عشق کا یہ بھی خدا کی شان ہے
منصور بننے کے لئے دل چاہئے اے بوالہوس

کہنے کو ہے سارا جہاں سچے فدائی ہیں کہاں
دس میں نہ نکلے گا کوئی دس لاکھ میں نکلیں گے دس

جائے بہار آئے خزاں اس کا تردد کچھ نہیں
ہیں لالہ و گل سے سوا مجھ کو چمن کے خار و خس

طول غم و آزار نے ناشاد و مضطر کر دیا
ہے اک گھنٹہ ایک دن ہے اک مہینہ اک برس

کم بخت مرنے کے لئے صیاد کے گھر آئے ہیں
دیکھیں گے اب کیا سیر گل چھٹ کر اسیران قفس

پہنچے سر عرش بریں امید تو ایسی نہیں
ہاتھوں ہی تک محدود ہے میری دعا کی دسترس

رہتے ہیں دور اے برہمن ان مفت کے جھگڑوں سے ہم
کیا پاپ کیا الفت میں پن کیا دوستی میں حساجس

سو بار دے کے جام و خم ساقی نے بے خود کر دیا
اس کا تقاضا تھا کہ پی میری گذارش تھی کہ بس

اے خضر آئے لطف کیا مشرب الگ مسلک جدا
مرنے کی حسرت مجھ کو ہے تم کو ہے جینے کی ہوس

ان کے علاوہ کون ہے میرے قریں کوئی نہیں
یا دردِ ہجر آفتیں یا آرزوئیں پیش و پس

جام و سبو کا ذکر کیا بہتا پھرے خود میکدہ
اے ابر رحمت ٹوٹ کر اتنا برس اتنا برس

کیا ابتدا کیا انتہا جو آئے گا وہ جائے گا
دنیائے فانی کچھ نہیں اللہ بس باقی ہوس

عہد شباب اب آگیا بچپن کے دن جاتے رہے
بربادیٔ عشاق پر اپنی کمر مضبوط کس

کب تک یہ سیل اشک غم کب تک یہ طوفاں خیزیاں
دنیا فنا ہو جائے گی اے نوح بس اے نوح بس

# دولت کے پجاری

(از جناب محشر عابدی بی اے)

اننتا گوہا، بدقسمتی سے اس وقت پیدا ہوا جب قسمت کی ساحرہ دیوی کھڑی مسکرا رہی تھی اور اسکی اس مسکراہٹ میں — اس تبسم تباہ کن میں گوہا خاندان کی بربادیوں کے آثار نمایاں نظر آرہے تھے۔ ایک وہ زمانہ تھا جب گوہا خاندان آس پاس کے مقامات میں اپنی خاندانی عظمت اور امارت کی وجہ سے بہت مشہور تھا۔ لیکن اننتا کے دادا نے، جسے مختلف قسم کی تجارتوں سے انتہائی دلچسپی تھی، اپنا زیادہ وقت اور روپیہ سوداگری میں ضائع کر دیا تھا۔ اس لئے اس خاندان کی وقعت پہلے سے بہت زیادہ گھٹ گئی تھی۔ اسکا باپ ادینا ناتھ اس کے برعکس بہت بخیل تھا۔ اگر وہ اپنی کسی ضرورت کو صرف آٹھ آنے میں پورا کر سکتا تھا تو وہ اسکے لئے ہرگز ایک روپیہ خرچ نہ کرتا۔ خواہ ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے۔ لیکن اس کا یہ بخل کھوئی ہوئی عظمت اور برباد شدہ دولت واپس لانے میں بے سود ثابت ہوا۔ جب اننتا سیانا ہوا تو اسے معلوم ہوا کہ اس کا سارا اثاثہ صرف ایک کہنہ اور بوسیدہ مکان، چند بیگھے زمین اور ایک نسلی امتیاز و عظمت پر مشتمل ہے۔

اننتا کی ماں کو اس نازل شدہ افلاس و نکبت سے سخت صدمہ پہنچا تھا۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ یہ گھر نوکروں اور ملازموں سے بھرا رہتا تھا۔ لیکن افسوس اب اس گھر میں قبرستان کی سی خاموشی حکمراں رہتی تھی۔ اور اب نہ صرف اس کو بچے کی دیکھ بھال کرنی پڑتی بلکہ گھر کا سارا کاروبار اسی کے ذمہ تھا۔ اسکا سکون دماغ مدت ہوئی کہ رخصت ہو چکا تھا۔ اس نے حتی الامکان اس امر کی بھی کوشش کی کہ اپنے شوہر کو اس سکوت بے پناہ میں شامل کر لے۔ لیکن وہ ایسا نرم دل آدمی نہ تھا کہ آسانی سے مغلوب ہو جاتا۔ وہ صرف ہنس دیتا اور کہتا "میری پیاری بیوی۔ ابھی تو تم اس بچے کو کھلانے کے لئے ناک بھویں سکوڑتی ہو۔ مگر آئندہ چل کر بہت خوش ہوگی، یہی لڑکا ہماری قسمت کی اچھی دیوی کو ہمارے گھر میں بلا کر لائیگا۔ کیا تم نے اسکا جنم پترا نہیں دیکھا؟ اگر ہم حسب منشا اسکی پرورش کر سکیں تو انشاءاللہ آئندہ چل کر ہماری ساری تکلیفوں اور مصیبتوں کا خاتمہ ہو جائیگا"۔

دونوں میاں بیوی نے اپنی ساری محبت اور محنت اننتا کی پرورش میں صرف کر دی۔ ماں نے اپنے بچے کھچے زیورات فروخت کر ڈالے۔ اور باپ نے گھر بھی رہن رکھ دیا۔ اس طرح جو روپیہ فراہم ہوا اسکے بھروسہ پر اننتا ایک قصبہ میں بھیج دیا گیا۔ تاکہ وہاں رہ کر تعلیم حاصل کرے۔ اسکو شروع ہی سے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ اسکی زندگی سے والدین کی کیسی کیسی توقعات اور آرزوئیں وابستہ ہیں۔ یقیناً اسے اپنے گھر کی اس عسرت اور افلاس کو رفع کرنا ہے اور پرانی کوٹھی کی جگہ ایک نیا مکان تعمیر کرنا ہے۔ اس کے علاوہ ماں کے تمام زیوروں کی قیمت ادا کرنی ہے اسکا معاوضہ اس صورت میں ادا ہو کہ اس کے لئے اتنے زیورات بنائے جتنے وہ پہن سکے۔ اسکا دماغ دولت کمانے کے خیالات سے معمور ہو گیا اور اس خیال سے اس نے اپنی زندگی کا ایک لمحہ بھی رائگاں نہیں جانے دیا۔ وہ جب کبھی طویل تعطیلات میں گھر آتا تو ماں سے اسی موضوع پر گفتگو کیا کرتا۔ "جونہی کہ تم بی اے پاس کر لوگے۔ میں تمہاری شادی کی تیاری کر دونگی"۔ اس کی ماں کہتی۔ "تم دیکھنا کہ میں کیسی لڑکی ڈھونڈ کے لاتی ہوں، جو شخص ایک مکان کی آرائش کے لئے فرنیچر ایک



صندوق بھر کر زیورات اور ایک تھیلی بھر کر روپیہ دیگا۔ اسکی لڑکی سے میرے بیٹے کی شادی ہوگی۔ اور کسی کو اس پر نظر ڈالنے کی بھی جرأت نہ ہوگی"

بیٹا یہ سن کر متبسم اور مسرور ہوجاتا۔ اور کہنے لگتا "اماں جان۔ آپ کے بیٹے کے لئے یہ سب کون دیگا۔ آجکل طلسان (گریجوئیٹ) کی کوئی قدر نہیں ہے۔ کلکتہ کی گلیوں میں سینکڑوں مارے مارے پھرتے ہیں"۔ "ہاں یہ سب صحیح ہے۔" ماں نے جواب دیا "لیکن کوئی تمہاری طرح عالی خاندان نہیں ہے۔ اس گاؤں میں ایک لڑکا دس ہزار روپوں کے برابر ہے۔ اس گھر میں بہو بھی اس سے کم جہیز لیکر نہیں آئی۔ کیا تم کو نہیں معلوم کہ میرا باپ کیسے تباہ ہوا! بس صرف میری شادی کی وجہ سے لیکن آجتک کسی نے اسے رنج کرتے نہیں دیکھا۔ اس نے اپنے شایان شان شادی کی تھی"

امنتا کو اپنی ماں کی باتوں پر کامل اعتقاد تھا اس لئے رفتہ رفتہ وہ اپنے آپ کو ایک قیمتی جائداد تصور کرنے لگا۔ خدا خدا کرکے وہ بی۔ اے بھی پاس ہوگیا۔ اسکی ماں نے مشاطہ مقرر کی کہ وہ کہیں کوئی اچھی اور "دولتمند" لڑکی تلاش کرے اسکے بعد دوسری باتوں کی طرف توجہ کیجائے۔

کلکتہ میں کبھی دولہنوں کا قحط نہیں ہوتا یہاں جس بات کی بھی تمنا کرو۔ جلد یا دیر سے ضرور پوری ہوجاتی ہے۔ اس لحاظ سے دولتمند باپ بھی اکثر مقامات میں موجود تھے۔

آخرکار ایک جگہ بات چیت ٹھہری لڑکی قبول صورت اور خاندانی تھی۔ وہ کس قدر تعلیمیافتہ بھی اور اسکی عمر بھی تقریباً چودہ برس کی تھی۔ "اگر وہ لوگ کہتے ہیں کہ اسکی عمر صرف چودہ برس کی ہے" امنتا کی ماں نے کہا۔ "تو کم سے کم اسکی عمر سولہ یا سترہ برس کی خیال کرنی چاہیے۔ تو وہ سیانی ہے مگر میں سوچتی ہوں کہ کہیں وہ بدسلیقہ تو نہیں ہے؟ کیا خبر ہے کہ میرے اور میرے بیٹے میں اجنبیت پیدا کردے؟"

"ڈرو نہیں" ادینا ناتھ نے کہا "ہمارے خاندان میں آجتک کوئی زن مرید نہیں ہوا۔ اگر وہ میرے شرائط منظور کرلیں تو مجھے لڑکی کی عمر میں اعتراض نہ ہوگا"

لڑکی کے والدین نے جملہ شرطیں منظور کرلیں۔ یہ سن کر مہالکشمی خوشی سے پھولی نہ سمائی۔ شادی کا مقررہ دن پہاڑ کے برابر معلوم ہونے لگا وہ چاہتی تھی کہ شادی کا دن آج ہی آجائے تو اچھا ہے، مگر چونکہ یہ امر اسکی قدرت سے بعید تھا۔ اسی لئے وہ دن بھر طرح طرح کے خواب دیکھا کرتی تھی۔ اس نے اپنے زیوروں کی ایک فہرست تیار کی کہ جیسے ہی جہیز اسکے قبضہ میں آئیگا وہ سنار کو اس فہرست کے مطابق زیور گڑھوانا شروع کردیگی اسکے شوہر نے سب کچھ سچ سچ کہدیا تھا۔ اسکا بیٹا درحقیقت خاندان کی گذشتہ عظمت میں از سر نو روح پھونکنے والا تھا۔ لڑکی کے باپ نے پانچ ہزار نقد۔ اور پانچہزار کے دیگر تحفے اور زیورات اور جہیز دینے کا وعدہ کرلیا تھا۔ چونکہ والدین کی یہ ایک اکیلی ہی بیٹی تھی، اس لئے ان کو ہر سال تہوار کے موقعوں پر نئے نئے تحائف ملنے کا بھی امکان پیدا ہوگیا تھا لیکن یہ مقولہ سچ ہے کہ "من درچہ خیالم و فلک درچہ خیال" کیونکہ حالات مہالکشمی کی خواہش اور خواب کی تعبیر نہیں آئے ادینا ناتھ شادی کے روز برات لیکر دولہن کے گھر گیا۔ مہالکشمی گھر ہی میں رہی تاکہ خواتین مہمانوں کی خاطر تواضع کرے اور دولہن کے استقبال کے انتظامات کرے۔ وہ اپنے تمام ہمسایوں کو یہ دکھانا چاہتی تھی کہ اس گئی گذری حالت میں بھی وہ شایان شان انتظام کرسکتی ہے۔

آج اننتا دلہن کو لے کر گھر آنیوالا تھا۔ سارا گھر مہمانوں اور رشتہ داروں سے کھچا کھچ بھرا تھا اور مہالکشمی ہر طرف نظر دوڑا رہی تھی، اسکی آواز چلاتے چلاتے بیٹھ گئی تھی، اسکے جذبات مسرت کی فراوانیاں دامن تخیل میں نہ سما سکتی تھیں پھاٹک پر نوبت اور شادیانے بج رہے تھے، مہالکشمی کے اپنے خاندان کے لوگوں میں سے صرف اسکی بھاوج اپنے بچے کو لے کر آئی تھی، اس کی بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ دونوں نند بھاوج ایک جگہ بیٹھ کر خوب خوب باتیں کرتی رہیں "میں کہتی ہوں" بھاوج نے کہا "کہ کیا یہ سچ ہے کہ دلہن خوبصورت نہیں ہے؟" مہالکشمی فوراً بول اٹھی "تم سے کس نے ایسی جھوٹی باتیں لگائی ہیں؟ کیا اس نے جا کر اپنی آنکھوں سے دلہن کو دیکھا ہے!" "افواہیں عموماً یونہی پھیل جاتی ہیں" بھاوج نے کہا "تم کو اس سے ناراض نہ ہونا چاہیئے، جب لوگوں نے یہ سنا ہوگا کہ نقد رقم اور جہیز وغیرہ بہت زیادہ مل رہا ہے تو یہ رائے قائم کر لی کہ لڑکی میں کوئی نقص ضرور ہوگا"

لیکن یہ سنکر مہالکشمی اور آگ بگولہ ہو گئی "انہیں ایسا خیال قائم کرنے کی جرات کیسے ہوئی!" اس نے ہانپتے ہوئے کہا "کیا یہ ابنیا ایسا گیا گذرا ہے کہ کوئی اسکے لئے دس ہزار نہیں دے سکتا؟ کیا اس گاؤں میں کوئی اور خاندان ہمارے خاندان کے برابر ہے، اس گھر میں تو ایسی ایسی خوبصورت لڑکیاں بیاہ کر آئی ہیں کہ بس دیکھا کرو اور ایسے ایسے جہیز لائی ہیں کہ رانیوں کے سوا اور کسی کو نصیب نہ ہوا ہوگا۔ اس وقت پھر ان بوڑھی ڈائنوں نے کچھ نہ دیکھا؟ وہ مارے حسد کے مری جا رہی ہیں یہ سچ بات تو یہ ہے"

اس موقع پر شادیانے زور شور سے بجنے لگے اور نند بھاوج کی یہ گفتگو یہیں ختم ہو گئی اور ہر شخص نوشہ کو دیکھنے کے لئے دوڑنے لگا۔

ہر قسم کے رسوم اور رواج کی تکمیل کے ساتھ دلہن کا استقبال کرنے میں مہالکشمی کو اس بات کا موقع نہ ملا کہ وہ شوہر سے کچھ پوچھتی۔ دلہن خوبصورت تو نہ تھی لیکن اتنی بدصورت بھی نہ تھی کہ دیکھ کر نفرت پیدا ہو۔ اننتا کا چہرہ بہت اترا ہوا نظر آ رہا تھا۔ مہالکشمی نے سوچا کہ وہ دلہن کو دیکھ کر غمگین ہے، اور یہ سوچکر ہنس پڑی۔ آخر ایک عورت کب تک اپنے آپ کو خوبصورت بنائے رکھ سکتی ہے؟ جب وہ ایک دفعہ ماں بنگئی تو پھر حسن ایک خواب کی طرح غائب ہو جائیگا۔ اسکے لئے خود اسکی مثال موجود ہے،

جب مہمان اور رشتہ دار رخصت ہو گئے۔ تو مہالکشمی کو فرصت ملی۔ وہ اپنی خوابگاہ میں گئی وہاں اس نے دیکھا کہ اس کا شوہر لیٹا ہوا ہے، اور اسکے چہرے پر بدشگونی کے خوفناک آثار ہویدا ہیں۔ ایک آنیوالی مصیبت کے خیال سے اسکا دل دھڑکنے لگا، وہ جھپٹ کر اسکے پاس پہنچی۔ اور پوچھنے لگی "کیا بات ہے جو تم یوں منہ لپیٹے پڑے ہو۔؟"

"مجھے امید ہے کہ اگر میں تم سے حقیقت حال بیان کردوں تو تم ناراض نہ ہوگی" ادینا تھ بولا "میرے خیال سے اپنی بیوقوفی کو ہمسایوں پر ظاہر کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اسکو ہماری ہی حد تک رہنا چاہیئے"

اب مہالکشمی کا اضطراب قابو سے باہر ہو گیا۔ "پہلے مجھ سے کہو، تو بتاؤ کیا ہوا!" وہ بولی "مجھے جہیز کا روپیہ نہیں ملا" ادینا تھ نے جواب دیا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے مہالکشمی کے دماغ میں غصہ کی چنگاری بھڑک اٹھی، اور وہ بیساختہ شرر فشاں ہوئی "تو پھر تم اس دلہن کو گھر میں کیوں لائے۔ کیا تم اپنے لڑکے کو اکیلا واپس نہ لا سکتے تھے؟"

"نہیں میں نہ لا سکتا تھا" ادینا تھ بولا "دلہن کا باپ بیمار تھا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور رو کر کہا کہ تین مہینے کے اندر وہ موقوف

رقم ادا کردیگا۔ اگر وہ نہ ادا کریگا تو اسے اپنی لڑکی واپس لے لینی پڑیگی۔ اور ہم اپنے بیٹے کی شادی کہیں اور کردینگے۔ اس قسم کے عہد و پیمان کے بعد میرے لئے اور کیا چارہ تھا کہ اسکو منظور کرلوں۔ یونہی چلے آنے میں بڑی ندامت اور ذلت کا سامنا ہوتا۔ ہمکو اپنے خاندانی اعزاز کا بھی لحاظ کرنا پڑتا ہے۔ اسکے علاوہ والدین نے بھی وعدہ کرلیا ہے۔ رہے زیور وغیرہ تو وہ سب ٹھیک ہیں"۔

اس قسم کی گفتگو سے مہالکشمی کو تسکین نہیں ہوئی۔ "مجھے ان زیوروں کی فکر نہیں ہے وہ ہیں تو ہوا کریں۔ تمہارے بیٹے کی دلہن کے جسم پر زیوروں کی چمک دمک دیکھ کر مجھے کوئی مسرت نہ ہوگی میں نے تو اپنے تمام زیورات بچے کی تعلیم کی خاطر فروخت کردیئے اور یہ آسرا لگائے بیٹھی تھی کہ وہ آئندہ ان کا معاوضہ مجھے ضرور دیگا۔ لیکن تم کیسے بیوقوف ہو! مجھے معلوم ہوتا ہے کہ میں پھانسی پر چڑھ رہی ہوں۔ میں صبح ہوتے ہی اس دغاباز کی بیٹی کو ٹھوکر مار کر گھر سے باہر نکال دونگی"۔

ادیناتھ بیوی کے اس غیظ و غضب کو دیکھ کر سراسیمہ ہوگیا۔ "جلدی کیا ہے؟" اس نے کہا "اگر وہ تین مہینے میں ادا نہ کریں گے تو تمہارا جو چاہے کرنا۔ مگر چونکہ میں وعدہ کرچکا ہوں اس لئے اب مجھے اسکی پابندی کرنا ضروری ہے"۔

"کیا انہوں نے اپنا وعدہ پورا کیا؟" مہالکشمی نے بپھری ہوئی شیرنی کی طرح کہا۔ "لوگوں نے ہمیشہ ہم ہی سے تہذیب و اخلاق کا درس لیا ہے"۔ ادیناتھ نے جواب دیا۔ "ہم نے کبھی دوسروں سے کوئی بات نہیں سیکھی"۔

مہالکشمی بہت بگڑی بہت جھنجلائی۔ بہت غصہ ہوئی۔ مگر شوہر کی خواہش کے مقابلہ میں شکست کھائی۔ دلہن کا استقبال بھی کسی نہ کسی طرح ہوگیا تھا۔ اور اب لڑکی نے اپنی موجودہ حالت کو بھی اچھی طرح سمجھ لیا لیکن قسمت پر بھروسہ کرنے کے سوا اور کیا ہوسکتا تھا۔ اس نے شادی کے بعد اپنے والد کو متعدد افسوسناک خطوط تحریر کئے جن میں اس نے یہ درخواست کی تھی کہ وہ جلد سے جلد اپنا وعدہ ایفا کردیں اور روپیہ ادا کردیں ورنہ خود اس کو آئندہ بے انتہا مصائب اور تکالیف کا شکار بننا پڑے گا۔

لیکن مصائب کا شکار ہونا عموماً لڑکیوں کا پیدائشی حق ہوتا ہے۔ اور اس سے یہ نئی نویلی دلہن بھی اپنی جان نہ بچا سکی۔ اننتا اس سے محبت آمیز سلوک نہ کرتا تھا۔ ہم وہ اسکی طرف سے بالکل بے پروا بھی نہ تھا اور بیرحمی کا برتاؤ بھی نہ کرتا تھا۔ وہ اکثر اوقات جب اسکی طبیعت میں ترنگ اٹھتی لالتا سے مہر و محبت کی گفتگو بھی کرتا۔ اس لئے لالتا کو اس سے عداوت ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی البتہ اسکی خوشدامن اسکے لئے خطرات اور افکار کا سرچشمہ تھی اس کے زہریلے طعن و تشنیع غریب لڑکی کے دل پر تیر کی طرح جا کر لگتے تھے اور وہ سوائے رونے اور اشک فشانی کے اور کچھ نہ کرسکتی تھی۔ جیسے ایک بلبل جو صیاد کے قفس میں بند ہوتی ہے اور صیاد کے مظالم کی تاب نہ لاکر پھڑپھڑاتی ہے تاکہ قفس سے نکل جائے اور نہیں نکل سکتی اور اس آزادی کی کوشش میں اسکے پر نچ جاتے ہیں اور وہ تیلیوں سے سر ٹکرا ٹکرا کر زخمی ہوجاتی ہے اور کچھ نہیں کرسکتی ——— اسی طرح لالتا بھی اسکی گھر کی فضاؤں میں مقید تھی اور پھڑپھڑا رہی تھی۔ اسے اپنے خسر سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ کیونکہ وہ اسے کبھی بھولے سے بھی دکھائی نہ دیتا تھا۔ وہ بھی اس لڑکی کی طرف سے بہت بددل ہوگیا تھا جسکی صاف وجہ یہ تھی کہ اسکے اعلیٰ خاندان میں ایک معقول فیس ادا کئے بغیر داخل ہوگئی تھی اور درحقیقت وہ لالتا کو ہرگز اپنی بہو نہ سمجھتا تھا اس لئے وہ شروع ہی سے اسکی طرف سے بہت مستغنی اور نافرمان رہا۔

لیکن واقعات صرف یہیں تک پہنچکر ختم نہیں ہوگئے۔ بلکہ طوالت پذیر ہوتے گئے۔ تین مہینے گذر گئے اور رقم ادا نہ

ہوئی اسکی بجائے یہ خبریں گوش گذار ہونے لگیں کہ لالتا کا باپ قریب المرگ ہو رہا ہے اس نے وعدہ کیا کہ اگر وہ زندہ رہا تو آئندہ سال ضرور ادا کر دیگا۔ اس نے یہ خواہش بھی ظاہر کی کہ وہ لالتا کو گھر بھیجدیں کیونکہ وہ اپنی بیٹی کو دیکھنے کے لئے بہت بیچین ہے۔

ان غمناک خبروں کا اس معزز اور شریف خاندان پر کوئی اثر نہ ہوا۔

"جھوٹا دغاباز ــــ!" مہالکشمی نے انتہائی ذلت سے چلاکر کہا۔ "وہ اپنی بیٹی کو عمر بھر کے لئے لیجائے ہمکو نہ چاہیے" اور وہ اس بات کے لئے بھی تیار تھی کہ ایک لکڑی سے مارتی ہوئی اپنی نئی بہو کو دروازہ سے باہر کردے لیکن شوہر کی خاندانی عظمت اور امارت کے خیال سے وہ رک گئی۔ اننتا نے اس بارہ میں "ہاں" یا "نہیں" کچھ نہ کہا۔ وہ ایک شریف طبیعت لڑکا تھا اور والدین کے احکام کے خلاف نہ کر سکتا تھا جب اسکی بیوی رخصت ہونے لگی۔ تو اننتا اس سے بیحد متاثر ہوا لیکن خسر کے جھوٹے وعدہ کے خیال سے یہ اثرات فوراً معدوم ہوگئے۔

اننتا کو بیوی کی جدائی نے بہت زیادہ پریشان نہ رکھا کیونکہ چند ہی روز کے بعد نئی دلہن گھر میں رونق افروز ہوئی اور اس کے دل سے غبار اور تفکرات کے دھندلے بادل صاف کردیئے اسکا نام سوشیلا تھا۔ وہ لالتا سے بہت زیادہ خوبصورت تھی، اننتا کی قدر و قیمت اب "شادی کے بازار" میں اس لئے گھٹ گئی تھی کہ وہ کنوارا نہ تھا۔ تاہم اسکے خاندان کی عظمت اور شرافت نے اسکی قیمت میں اضافہ کر دیا۔ اسکا دوسرا خسر اصولی آدمی تھا، چنانچہ اس نے جو وعدہ کیا اسکے خلاف کوئی بات نہیں ہوئی۔ مہالکشمی نے اپنی مرضی کے مطابق اپنے لئے زیورات خریدے اور ابتدا ہی سے سوشیلا سے محبت کرنے لگی۔ گو لڑکی ایک بہت معمولی گھرانے سے آئی تھی لیکن اسکی تربیت اچھی ہوئی تھی۔ وہ اپنی ساس کو ایک دیوی کی طرح احترام کی نظروں سے دیکھتی تھی اس لئے دن بہت اطمینان سے گذرنے لگے رہے۔

اننتا اپنے والد کے دوستوں کی سفارش سے کسی بنک میں ایک اچھی خدمت پر مامور ہوگیا۔ وہ ایک فضول خرچ آدمی نہ تھا اس لئے روپیہ آزادی سے بھی صرف نہ کرتا تھا چونکہ اسکے والدین ابھی زندہ تھے۔ اس لئے وہ بیوی کو کلکتہ نہ لا سکتا تھا، البتہ یہ ضرور تھا کہ ہر ہفتہ کے آخیر میں وہ گھر آجاتا اور وہاں تھوڑا وقت بیوی کی ہم جلیسی میں بھی گذارا کرتا۔ باقی ایام وہ ایک ہوٹل میں بسر کرتا تھا۔

کسی نے لالتا کی خبر نہ لی۔ اور وہ بھی اپنی طرف خاموش رہی۔ البتہ ان لوگوں کو کسی سے یہ خبر معلوم ہوگئی کہ لالتا کا باپ مرگیا۔

اکثر اوقات اننتا کی آنکھوں میں ایک نرم لطیف چہرہ اور دو سیاہ غزالی آنکھیں سما جاتیں لیکن فوراً غائب ہوجاتیں۔

اسکی دوسری بیوی سوشیلا یقیناً اسکے لئے خوش نصیب ثابت ہوئی۔ اور خاندان کی عظمت اور امارت میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ مہالکشمی کو ایک صندوق بھر کر زیورات مل گئے اور اسکے کہنہ اور شکستہ حال مکان کی بھی نئے سرے سے تعمیر کیگئی جس سے وہ نیا معلوم ہونے لگا اور گھر میں پہلے کی طرح ملازم اور خادمائیں بھی چہل پہل کرتی ہوئی نظر آنے لگیں۔ اب مہالکشمی کو صرف یہی ایک کام رہ گیا تھا کہ وہ اپنی ہمسایوں کی باتیں سنا کریں اور ان پر نکتہ چینی کیا کریں، اور اس لئے انکی چرب زبانی اور غیر محدود فرصت سے ہر شخص مبہوت نظر آتا تھا۔

اننتا جب دفتر سے واپس آتا تو ہمیشہ اپنی ماں کو ایک پنچایت کی صدارت کرتا ہوا پاتا۔ صدر نشین کو اس بات کی پروا نہ تھی کہ آیا حاضرین جلسہ اسکی طرف توجہ کرتے ہیں یا نہیں، وہ اپنی سمجھ کے مطابق الٹی سیدھی ہاں اور نہیں کہکے اپنی تسکین کر لیتے تھے۔

اننتا کبھی اپنا وقت اور روپیہ ضائع نہ کرنا چاہتا تھا۔ لیکن وہ اپنی ماں سے اس بارہ میں کچھ نہ کہہ سکتا تھا کیونکہ وہ ڈرتا تھا کہ کہیں وہ اس سے ناراض نہ ہو جائے لیکن اس منظر کو روزانہ دیکھتے دیکھتے وہ کچھ بیزار سا ہو گیا۔ اور آخرکار اس نے ایک دفعہ کہا "اماجان کیا ان عورتوں کو کوئی اور کام نہیں ہے؟ میں جب آتا ہوں ان کو یونہی منطق بگھارتے پاتا ہوں۔ اور اس سے آپ کا قیمتی وقت ضائع ہوتا ہے"

مہالکشمی نے ایک لمبی چوڑی جمائی لی اور کہا "پیارے بیٹے مجھے اسکے سوا اور کام ہی کیا ہے میرے کوئی پوتا بھی تو نہیں جسکو کھلایا کروں اور لئے لئے گھر بھر میں پھروں تم ہی بس میرے ایک بیٹے ہو اور اب تمہاری شادی کو تین برس گذر چکے ہیں۔ لیکن بچے کی کوئی امید نظر نہیں آتی"

اننتا کو یہ احساس کسی قدر ستا رہا تھا ماں کی باتوں نے اسکے اس احساس میں اضافہ کر دیا اور اس طرح اسکے اضطراب قلب میں بھی زیادتی ہو گئی۔ سوشیلا نے اس روز شام کو اپنے شوہر کی اس افسردگی کو محسوس کیا۔ اور اپنی دلربا باتوں سے اسکو رفع کرنا چاہا۔ مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہوئی۔

اننتا کلکتہ آنیکے بعد بھی ماں کے الفاظ کو نہ بھولا۔ اس نے ایک حقیقت کا اظہار کیا تھا۔ کیا وہ اپنی ساری عمر میں ایک بچے کا بھی باپ نہ بنے گا؟ آہ اگر ایسا ہوا تو اس سے زیادہ بدبختی اور کیا ہو سکتی ہے۔ اس شریف اور عالی خاندان کا یہیں خاتمہ ہو جائیگا۔ کیا یہ اس خطا کی سرزنش اُسے دیجا رہی ہے کہ اس نے اپنی معصوم بیوی کو گھر سے نکال باہر کیا۔ اگر کہیں سوشیلا بانجھ ہی رہی تو یقیناً اسے دوسری شادی کرنی پڑیگی۔ غریب سوشیلا۔ آہ یہ غریب لڑکیاں کس قدر بدقسمت نکلیں! معلوم ہوتا ہے کہ انکی تخلیق محض مصائب و تکالیف برداشت کرنے کے لئے کی گئی ہے، حالانکہ بہت سی حالتوں میں ان بیچاریوں کا کوئی قصور نہیں ہوتا۔

لیکن سوشیلا ابھی جوان ہے، اس نے سوچا۔ ابھی وہ چند سال اور انتظار کر سکتا ہے۔ اور اگر اسکے والدین اجازت دیں گے تو وہ کسی ماہر خاتون ڈاکٹر کو بلا کر اس سے مشورہ کریگا اور اگر اس نے کسی قسم کے علاج کے لئے کہا تو وہ ضرور اس پر عمل کریگا۔ کیا وہ للتا کو پھر واپس نہ لا سکتا تھا؟ مگر اسکی موجودہ بیوی ایک سوکن کے ساتھ رہنا ہرگز گوارا نہ کریگی۔ اس کے باوجود اسکی مرضی اور ارادے کے خلاف ایک سوکن کے آنیکی بہت کچھ توقع کیجا سکتی ہے۔ اس لئے ایک چھوٹی ہوئی بیوی ایک نئی بیوی سے بہتر ثابت ہوگی اور وہ ضرور للتا کا پتہ لگائیگا کہ آیا وہ زندہ ہے؟ اور ہے تو کہاں رہتی ہے؟

ان خیالات کا کسی سے اظہار کرنا اس نے مناسب نہ سمجھا لیکن سوشیلا ایک فہیم لڑکی تھی اور وہ شوہر کی حالت اور ارادوں کو فوراً ہی سمجھ گئی کہ دال میں کالا ضرور ہے۔ ورنہ اسکے متفکر رہنے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ مگر اسکی وجہ کوئی ایسی زیادہ مشکل نہ تھی کہ اسکی عقل کی رسائی وہاں تک نہ ہو سکتی۔ کیونکہ اننتا تو خاموش رہتا تھا۔ مگر اسکی ماں سے چپ نہ رہا جاتا۔ اسکی مایوسی دن بدن بڑھتی جا رہی تھی۔ اور اس فکر میں اس نے سینکڑوں گنڈے اور تعویذ جمع کئے تھے۔ اور ان سے غریب سوشیلا کو بیل کی طرح لاد دیا تھا۔ ان امور سے سوشیلا اور زیادہ کبیدہ خاطر رہنے لگی۔

اتفاق سے اوینا تھ بیمار پڑ گیا۔ اور اس طرح چند دنوں کے لئے سوشیلا کی طرف کسی نے بھی زیادہ توجہ نہ کی۔ اننتا نے ایک مہینہ کی رخصت لی۔ اور باپ کی تیمارداری کی خاطر گھر میں آ کر رہنے لگا۔ کیونکہ دوا علاج کرنے والا اور کوئی مرد موجود نہیں تھا۔

جس قصبہ میں وہ سکونت پذیر تھے وہ اس قدر بڑا اور مہذب تھا کہ اس میں تمام ضروریات کی چیزوں کے علاوہ ایک

مدرسہ، ایک شفاخانہ اور ایک ڈاکٹر بھی تھا۔ ڈاکٹر بلایا گیا۔ پہلے تو دینا ناتھ کو کچھ افاقہ ہونے لگا پھر علالت کا سخت دورہ پڑا۔ یہ بھی ٹل گیا۔ اس کی حالت کسی قدر سنبھل گئی، اور یہ حالت تقریباً ایک ہفتہ تک قائم رہی۔

ایک روز ڈاکٹر نے اننتا کو علیحدہ بلا کر اسکے کان میں کہا "اننتا بابو مجھے تم سے ایک ضروری بات کہنی ہے۔ وہ یہ کہ تمہارے والد ایک ضعیف آدمی ہیں۔ اور وہ روز بروز کمزور ہوتے چلے جا رہے ہیں اور میں یہ بھی نہیں کہتا کہ وہ یہاں ٹھہرے رہے تو اچھے نہ ہونگے لیکن ضعیف آدمیوں کے علاج میں زیادہ حفاظت اور دور اندیشی سے کام لیا جائے تو بہتر ہوگا اگر ان کو کلکتہ لیجانا چاہتے ہو تو ابھی لیجاؤ کیونکہ اگر تم نے دیر کی تو شاید پھر ان کو لے جانا محال ہو جائے۔"

یہ سن کر اننتا کا دل بیٹھنے لگا۔ اور حالانکہ ڈاکٹر نے اصل واقعہ کہنے سے بہت گریز کیا لیکن وہ سمجھ گیا کہ اسکے والد کی حالت نازک ہوتی جا رہی ہے۔ خود ڈاکٹر کو اپنی تشخیص پر یقین نہیں ہو رہا تھا۔ اننتا نے فوراً کلکتہ اپنے ایک دوست کو تار دیا کہ اسکے لئے ایک کرایہ کا گھر لے رکھے۔ اور خود اسٹیشن گیا تاکہ ڈبہ کا ایک حصہ اپنے لئے محفوظ کرالے۔ کیونکہ سب لوگوں کو کلکتہ جانا تھا، مہالکشمی نے اپنے شوہر کے ساتھ جانے پر زور دیا اور چونکہ سوشیلا بھی تنہا نہ رہ سکتی تھی۔ اس لئے اس نے بھی رخت سفر باندھنا شروع کر دیا اور یہ بھی خیال کیا جا رہا تھا کہ تیمارداری میں اسکی ضرورت پڑیگی۔

خوش قسمتی سے اننتا کو گاڑی محفوظ کرانے اور سامان جلد لانے میں کامیابی ہوگئی اور وہ بیمار باپ کو ایک پالکی میں لٹا کر اسٹیشن کی طرف روانہ ہوا، سامان ایک بیل گاڑی میں ساتھ تھا۔ اس وقت بھی اننتا اس کثیر رقم کا خیال کئے بغیر نہ رہ سکتا تھا جو اسے والد کی علالت کے سلسلہ میں خرچ کرنی پڑ رہی تھی۔

بہرکیف سب بخیریت تمام کلکتہ پہنچ گئے۔ اور دینا ناتھ کا علاج شروع ہوگیا لیکن اس کا آخری وقت آچکا تھا اس لئے چند روز کے بعد وہ خاندانی شرافت و عظمت اور تمکنت اور تمام عہد و پیمان کو چھوڑ کر دنیا سے چل بسا۔ مرنے سے قبل وہ اپنی اس بدبختی کا اکثر اظہار کرتا تھا کہ اس نے اپنے ایک پوتے کی بھی صورت نہ دیکھی سوشیلا کا دل ان تباہ کن واقعات کے خیال سے بیحد زخمی ہوگیا۔

مہالکشمی کے نالہ و بکا نے سارا گھر سر پر اٹھا لیا شوہر کی اس جدائی سے اسکو کسی بات میں سکون نہ ملتا تھا۔ دنیا اس کی نظروں میں تاریک ہوگئی تھی۔

"اماں جان اب ہم کو اپنے گھر چلنا چاہیئے" اننتا نے کہا "یہاں زیادہ ٹھہرنے سے کوئی فائدہ نہیں" مہالکشمی نے سختی سے مخالفت کی "میں اب اس گھر کی صورت نہ دیکھونگی" اس نے روتے ہوئے کہا حرامزادی بدنصیب بلیو کا دل اب ٹھنڈا پڑ گیا ہوگا انہیں تو انکی مراد مل گئی آہ جب انہوں نے مجھے زیوروں سے لدا ہوا دیکھا تو انکے سینے پر حسد کے مارے سانپ لوٹنے لگے۔ اب مجھے وہ بیوہ دیکھ کر مطمئن ہو جائیں گی میں انہیں یہ اطمینان نصیب ہوتے نہیں دیکھنا چاہتی"۔

"مگر اماں جان! گھر تباہ ہو جائیگا۔ خدا کے لئے نادانی کی باتیں نہ کریئے۔ ہم یقیناً باپ سے جدا ہوگئے ہیں۔ اور بہت بدقسمت ہیں لیکن ہم کو صبر و شکر سے کام لینا چاہیئے ہر چیز کو اسکی حالت پر چھوڑ دینے سے تو کام نہیں چل سکتا" اننتا نے کہا۔

مہالکشمی اس جواب سے کسی قدر خاموش ہوتے ہوئے بولی "میرے پیارے تم میرے لئے سب کچھ ہو۔ مجھے ایک

اور مال وجائداد کی ضرورت نہیں ہے بس تمہاری زندگی ہی میرے لئے سکون اور اطمینان کا باعث ہے اب میں کس کے لئے جا کر مال وجائداد کی دیکھ بھال کروں! تمہارے کوئی اولاد نہیں ہے اور جب ہم سب مر جائینگے تو ہمارے لٹیرے اور شریر رشتہ دار ہر چیز پر اپنا قبضہ کر لیں گے ہمیں ان کے لئے جائداد اور مال کی حفاظت نہ کرنی چاہیئے۔ بلا سے ہر چیز تباہ و برباد ہو جائے۔

یہ سن کر انتا کے دل پر ایک چوٹ سی لگی۔ جو کچھ اسکی ماں نے کہا لفظ بہ لفظ سچ تھا وہ کس کے لئے روپیہ جمع کر رہا ہے اور متمول بن رہا ہے۔ اسکا گھر بغیر اولاد کے ایک کھنڈر سے بھی بدتر معلوم ہوتا ہے

"پھر آپ نے کیا طے کیا ہے؟ ہمکو واپس چلنا پڑیگا یا یہیں رہنا ہوگا؟" سوشیلا نے رات کو پوچھا۔ "اماں جان واپس جانیکی سخت مخالف ہیں"، انتا نے جواب دیا "لیکن کم از کم ہمکو "چہلم" کی رسم پوری کرنے کے لئے ضرور جانا چاہیئے۔ پھر اگر وہ واپس آنے کو کہیں گی تو ہم ساتھ لیتے آئینگے۔ ایسا کرنے سے یہ بھی فائدہ ہوگا کہ میں تمہیں کسی تجربہ کار ڈاکٹر کو دکھا کر اس سے مشورہ لے سکونگا"

"کیوں؟ کیا اس لئے کہ میرے کوئی اولاد نہیں ہے۔ سوشیلا نے غمگین ہو کر پوچھا۔

"یہ ہنسی کی بات نہیں ہے" انتا نے سنجیدگی سے کہا "میں اپنے والدین کا اکیلا بیٹا ہوں۔ اگر میرے کوئی اولاد نہ ہوئی تو میری نسل ختم ہو جائیگی اور ایک شخص کے لئے اس سے زیادہ بدقسمتی اور کیا ہو سکتی ہے۔ ہمارا خاندان گاؤں بھر میں سب سے زیادہ قدیم اور شریف ہے۔"

ایک ماہر ڈاکٹر میرے لئے کیا کر سکتا ہے!" اس کی بیوی نے کہا "مجھے یقین نہیں آتا کہ اب میں کبھی ایک 'ماں' بن سکونگی بہتر ہے کہ تم دوسری شادی کر لو۔"

اس نے اس جملہ کو کسی قدر تبسم اور کسی قدر اضطراب کے ساتھ ادا کیا۔ وہ یہ جاننا چاہتی تھی کہ آئندہ انتا کا کیا ارادہ ہے لیکن یہ جملہ کہہ کر اسے فوراً ہی پچھتانا پڑا کیونکہ انتا کے چہرہ پر ایسے آثار ہویدا ہو گئے جس سے اس کے اضطراب میں ایک گونہ اضافہ ہو گیا۔

"اگر قسمت میں یہی لکھا ہے تو پھر مجھے دوسری شادی کرنی پڑیگی" انتا بولا۔ سوشیلا کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا انتا کا دل افکار و اضطراب کا محشرستان بنا ہوا تھا۔ والد کے انتقال کے بعد لالتا کو بھی اسکی موت کی خبر ایک پیغامبر کے ذریعہ بھیجی گئی تھی لیکن پیغامبر خط لے کر واپس آ گیا اور اس نے بیان کیا کہ وہ خاندان وہاں سے کہیں اور منتقل ہو چکا ہے اور ان کا گھر مسمار اور ویران پڑا ہے۔ پرانے لوگ مر کھپ گئے اور ان کی اولاد ملازمت کی جستجو میں معلوم نہیں کہاں کہاں جا بسی۔ کسی کو یہ معلوم نہیں کہ لالتا کہاں ہے اور آیا زندہ ہے یا مر گئی۔

انتا یہ سن کر غمگین ہوا۔ اگر وہ لالتا کو واپس لے آتا تو اس سے ضرور اُسے فائدہ پہنچتا۔ اگر وہ تیسری شادی کرے تو یقیناً سوسائٹی میں اسکی توہین اور تحقیر ہوگی۔ کوئی شخص اسکی خانگی ضروریات پر نظر نہ دوڑائیگا بلکہ ہر شخص بہ بانگ دہل اس کی اس حرکت پر لعنت ملامت کریگا اور ایک اچھی دلہن کا انتخاب کرنا بھی بڑا دشوار کام ہوگا۔ کوئی شخص ایسے کو اپنی لڑکی دینا پسند نہ کریگا جو دو بیویوں کا شوہر ہو۔ اسکی شرافت اس معاملہ میں اسکا ساتھ نہ دیگی۔ صرف ایسی ہی ایک لڑکی اس کو مل سکے گی جو سب کی نظروں سے اتر چکی ہو اور اسکے لئے یہ قطعی ناقابل برداشت ہوگا کہ سوشیلا کی سی لڑکی کے ساتھ رہنے کے بعد ایک غیر موزوں بیوی کے ساتھ زندگی بسر کرے

اسکے علاوہ غریب سوشیلا کا کیا حال ہوگا؟ ممکن ہے کہ وہ اپنے افکار و آلام سے مغلوب ہوکر کوئی غیر متوقع حرکت کر بیٹھے اگر وہ صرف لالتا کو واپس لا سکتا تو یقیناً اسکی تمام پریشانیاں یکلخت معدوم ہو جائیں اس طرح خود اسکے ضمیر کی تسکین ہو جاتی اور ہر چھوٹے بڑے کے سر دا... انکلتی اور خود سوشیلا اسکی اس بات کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتی کیونکہ بہر کیف لالتا کا مرتبہ اس سے بلند تھا۔ سوشیلا کے والدین نے یہ جانتے ہوئے کہ اسکی ایک بیوی موجود ہے۔ سوشیلا کی شادی اس کے ساتھ کی تھی اس لئے انہیں بھی اعتراض کا کوئی موقع نہ ملتا۔ گو لالتا حسن کی دیوی نہ کہلائی جا سکتی تھی۔ تاہم وہ ایک بھولی اور دلنشین لڑکی تھی اور شاید وہ اسکی اور دونوں بیویوں کو ساتھ ساتھ رہنے کی ترغیب دلاتی۔ لیکن لالتا کا کہیں پتہ نہ چلا۔ ایک مرتبہ وہ جس گھر سے ذلت اور حقارت کے ساتھ نکالی گئی تھی آج اسی گھر کے دروازے اسکو "خوش آمدید" کہنے کی تمنا میں چشم براہ تھے۔ پھر بھی واپس نہ آئی۔ شاید ہندوستان کے کروڑہا انسانوں میں وہ گم ہو چکی تھی۔

اننتا اپنے والد کی رسم تعزیت ادا کرنے کی غرض سے اپنے گاؤں گیا اسکے بعد ماں اور بیوی کو لیکر کلکتہ واپس آ گیا۔ زمانہ یونہی گذرتا رہا اننتا سوشیلا کے علاج کی طرف سے ایک لمحہ کو بھی بے پروا نہیں رہا اور اسکی ماں مہالکشمی بھی تعویذ اور گنڈوں کی تلاش سے کبھی نہ تھکتی تھی کیونکہ اسے امید تھی کہ ان تعویذوں اور فتیلوں سے اسکا بانجھ پن دور ہو جائے گا لیکن سوشیلا خود دن بدن نا امید ہوتی گئی

تاہم وہ ابھی بالکل جوان تھی اسلئے اننتا نے ابھی دامن امید کو ہاتھ سے نہ چھوڑا تھا۔ وہ ابھی دو تین سال اور انتظار کرنے کو تیار تھا۔ اسکے بعد بھی اگر ناکامی ہوئی تو وہ سوشیلا سے درخواست کریگا کہ حالات کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے اسے دوسری شادی کرنے کی اجازت دے اور وہ کبھی اسکی طرف سے غافل نہ رہیگا۔ وہ پہلے کی طرح گھر کی مالکہ بن کر رہیگی۔ نئی دلہن کا مرتبہ اس سے کم ہوگا۔

مہالکشمی کی صحت بھی روز بروز خراب ہوتی جا رہی تھی وہ متعدد امراض کا شکار بن گئی تھی لیکن باینہمہ وہ کسی ڈاکٹر کا علاج کرنا پسند نہ کرتی تھی۔ دن اسی پریشانی میں گذرتے رہے۔

یکایک ایک روز اسکی حالت بہت تشویشناک ہو گئی۔ اننتا بنک چلا گیا تھا اور نوکر بھی اپنے گھر جا چکا تھا جسکی شام سے پہلے واپس آنیکی امید نہ تھی۔ اب گھر میں مریضہ کے علاوہ گنتی کے دو آدمی رہ گئے تھے۔ ایک بوڑھی خادمہ دوسری مبہوت اور مضطرب سوشیلا۔

سوشیلا اپنی خوشدامن کی اس نازک حالت سے اس قدر متاثر ہوئی کہ تھر تھر کانپنے لگی "بڑی بی ذرا جا کر کسی کو بلا لاؤ" سوشیلا نے خادمہ سے کہا "تاکہ میں اپنے شوہر کو بنک سے بلوا لوں" "دیوی جی میں کسے بلا لاؤں؟" خادمہ نے جواب دیا۔ "اس وقت کوئی بھی گھر پر نہ ہوگا۔ سب لوگ اپنے اپنے کام پر چلے گئے ہیں"

"پھر اب ہم کیا کریں؟" سوشیلا گھبرا کر بولی۔

"سنو دیوی جی" بوڑھی خادمہ نے کہا "یہاں سڑک کے کنارے ایک خاتون ڈاکٹر کا گھر ہے وہ بہت مشہور ہے کہو تو اسے بلا لاؤں"

"اچھا تو جا دوڑ کر بلا لا" سوشیلا نے اطمینان کے سانس لیتے ہوئے کہا۔ "اسکی فیس دیدی جائے گی"۔

بوڑھی خادمہ دوڑتی ہوئی خاتون ڈاکٹر کے پاس گئی اور تقریباً نصف گھنٹہ میں اسے لیکر واپس آئی۔ خاتون ڈاکٹر کا لباس سنجیدہ اور صوفیانہ تھا اور بوڑھی خادمہ اس کا بیگ لئے ہوئے تھی۔

خاتون ڈاکٹر نے سوشیلا کو دیکھ کر پوچھا "کہئے کون بیمار ہے۔ آپ کی خادمہ نے کچھ نہیں بتایا" "اندر کمرے میں تشریف لائیے" سوشیلا بولی "میری ساس صاحبہ علیل ہیں"۔

خاتون ڈاکٹر اندر گئی۔ مہالکشمی نے کوئی اعتراض اس لئے نہیں کیا کہ وہ ایک عورت تھی اور بالکل جوان تھی وہ بظاہر منس مکھ اور نیک فطرت معلوم ہوتی تھی۔ اس نے مریضہ کو توجہ سے دیکھا اور پھر چند استفسارات بھی کئے۔ اس کے بعد اس نے خادمہ کو اپنے گھر بھیجکر کچھ دوائیں منگائیں وہ ایک گھنٹہ تک ٹھیری رہی اور جب مہالکشمی کی حالت قدرے اطمینان بخش ہوگئی تو وہ چلی گئی اس نے سوشیلا سے تاکیداً یہ بھی کہا کہ اگر مہالکشمی کی طبیعت خدا ناکردہ پھر تشویشناک ہوجائے تو فوراً اسے بلوا بھیجے۔ اور اگر وہ خود گھر پر نہ بھی ہوگی تو دو اور نرسیں ہیں جو اسکی امداد کو آجائیں گی۔ سوشیلا نے کہا جو نہی اسکا شوہر بنک سے واپس آئیگا اس کی فیس بھیجدی جائیگی۔

خاتون ڈاکٹر ہنس پڑی اور بولی "آپ کو اس کا خیال نہ کرنا چاہیے ایسی جلدی نہیں ہے" یہ کہکر وہ چلی گئی۔

سوشیلا اپنی ساس کے پاس آئی وہ بہت بیچین ہو رہی تھی "اننتا کب آئیگا" اس نے باربار پوچھنا شروع کیا۔ خوش قسمتی سے اس روز اننتا دفتر سے جلد ہی واپس آگیا۔ سوشیلا دوڑتی ہوئی اسکے پاس پہنچی اور بولی "خدا کا شکر ہے کہ آج آپ جلد واپس آگئے اسوقت تک بڑی پریشانی کے عالم میں تھی۔ اماں جان کی حالت بہت خراب ہوگئی تھی لیکن خدا نے اپنا رحم کیا جو انکی طبیعت سنبھل گئی۔ بوڑھی ایک خاتون ڈاکٹر کو بلالائی تھی۔ جس نے بیحد ہمدردی کا اظہار کیا آئیے چلکر دیکھئے وہ آپ کے لئے بیچین ہیں میں نے ابھی خاتون ڈاکٹر کو اسکی فیس بھی نہیں دی"۔

اننتا خود بھی کچھ مضمحل سا ہو رہا تھا۔ اس نے جلد واپس آگیا تھا لیکن وہ یہ سن کر اپنا اضمحلال اور سستی بھول گیا اور ماں کے پاس گیا "تو بیٹا تم آگئے" مہالکشمی نے کہا "لیکن اس وقت کچھ مضمحل معلوم ہوتے ہو؟" "اماں جان میرا کچھ خیال نہ کیجئے۔ مجھے یہ معلوم ہوا کہ آپ بہت علیل ہوگئی تھیں کیا اب بھی آپ کو یقین نہیں آتا کہ بیماری کا علاج نہ کرنے سے کیا نقصان ہوتا ہے" اننتا نے کہا۔

"میں بوڑھی ہوں۔ میرے بیٹے" مہالکشمی بولی "اور اب زیادہ نہیں جی سکتی۔ اور اگر میں تمہارے سامنے ہی مر جاؤں تو بیٹے آپ کو بہت خوش نصیب سمجھونگی"۔

"بہتر ہے کہ اب یہ خاتون ڈاکٹر آپ کا علاج مستقل طور پر کرے" اننتا بولا "کیونکہ آپ اور کسی کو اپنے پاس آنیکی اجازت نہیں دیتیں۔ وہ قریب ہی رہتی ہے اور جب ضرورت پڑیگی بلائی جاسکتی ہے"۔

"بہت بہتر ہے" ماں نے جواب دیا "لڑکی بہت شریف معلوم ہوتی ہے اسکو دیکھ کر مجھے کسی کی یاد آتی ہے"

اننتا ماں کے کمرہ سے چلا آیا "میں اس وقت کچھ نہ کھاؤنگا" اس نے سوشیلا سے کہا۔ مجھے اس وقت حرارت محسوس ہو رہی ہے میں ذرا جاکر سو جاؤنگا"۔

"او میرے پرماتما"۔ سوشیلا نے آہ سرد بھرتے ہوئے کہا "مصیبت کبھی اکیلی نہیں آتی۔ تم دونوں بیمار ہوگئے میں تنہا تم

دونوں کی کس طرح دیکھ بھال کرونگی۔؟"

"قسمت کی تحریروں پر رلئے زنی کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔" اننتا بولا "لوگ مذاق کے طور پر اراد تاً بیمار نہیں ہوجاتے تم کو کسی نہ کسی طرح کرنا ہی پڑیگا۔؟"

اسکی حرارت رفتہ رفتہ بڑھتی گئی۔ اور یہ معلوم ہونے لگا کہ کل تک بخار نہ اتریگا غریب سوشیلا اس وقت بیحد مضطرب تھی، وہ حیران تھی کہ کسے دیکھے اور کسے نہ دیکھے اسکا دل ذرا بھی نہ چاہتا تھا کہ اپنے شوہر سے ایک لمحہ کے لئے جدا ہو۔ اگر وہ اپنی ساس کو تنہا خادمہ کی نگرانی میں چھوڑتی تو وہ یقیناً برہم ہو جاتیں۔

اننتا نے اسکی بے چینی کا احساس کرتے ہوئے کہا اس وقت ہمکو کفایت شعاری کا خیال نہ کرنا چاہیئے اپنی خاتون ڈاکٹر کو بلا کر اس سے کہو کہ ایک نرس والدہ کے لئے مقرر کردے۔ خادمہ بالکل بیکار ہے اور اس پر غصہ ہونے میں والدہ پر کوئی الزام نہیں لگا سکتا۔" سوشیلا نے خاتون ڈاکٹر مس کماری کو بلوا بھیجا جب وہ آئی تو سوشیلا نے اس سے ایک نرس کو بھیجنے کی درخواست کی اور پھر جلد ہی اپنے شوہر کے پاس چلی گئی۔ کیونکہ اننتا ایک لمحہ بھی تنہا رہنا پسند نہ کرتا تھا۔ خاتون ڈاکٹر جاکر مہالکشمی کے بستر پر بیٹھ گئی۔

"ادھر آؤ میری بیٹی" بوڑھی خاتون نے کہا۔ "مجھے تم پہلی نظر میں بہت اچھی معلوم ہوئی تھیں۔ تمہارا کیا نام ہے؟ میں تم کو ڈاکٹرنی کہہ کر مخاطب نہیں کر سکتی کیا میں مخاطب کر سکتی ہوں؟"

"میرا نام مس کماری ہے" خاتون ڈاکٹر نے جواب دیا۔

"کیا تمہاری شادی ہوچکی ہے؟" مریضہ نے دریافت کیا۔ "ہا نہیں؟ میرا خیال ہے تم اپنے کاروبار میں بہت منہمک رہتی ہو تم نے اس عمر میں عینک کیوں لگا رکھی ہے؟ کیا تمہاری نگاہ بہت کمزور ہے؟"

"ہاں یہی وجہ ہے" لڑکی نے جواب دیا۔ "آج آپ کا مزاج کیسا ہے؟" سوشیلا پھر اندر داخل ہوئی۔ "اننتا کی طبیعت کیسی ہے" بوڑھی خاتون نے استفسار کیا۔

"بخار پھر زیادہ ہوگیا ہے" سوشیلا نے رنجیدگی سے جواب دیا۔

"کیا بخار روزانہ بہت تیز ہو جایا کرتا ہے؟" خاتون ڈاکٹر نے پوچھا۔

"ہاں" سوشیلا بولی۔ "بہت سی دوائیں پی چکے ہیں لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔"

"بہتر ہے کہ تبدیل آب و ہوا کے لئے کہیں چلے جایئے۔" لڑکی نے نصیحتاً کہا "اس مرض کا علاج یہی ہے ان کو یہاں نہ رہنا چاہیئے۔ پھر وہ مہالکشمی سے مخاطب ہوکر بولی "یہ آپ کے لئے بھی مفید ثابت ہوگا۔"

"مجھے اپنی صحت کی ذرا بھی فکر نہیں ہے میری بیٹی" وہ بولی "مگر جب سے میرا بیٹا علیل ہوا ہے۔ میرا خون پانی ہوا جاتا ہے اگر میں اسکے سامنے ہی دنیا سے سدھار جاؤں تو بڑی خوش قسمتی کی بات ہے میرا صرف یہی ایک بیٹا ہے۔"

بوڑھی خادمہ اندر داخل ہوئی اور اس نے خاتون ڈاکٹر سے کہا "ایک چھوٹا بچہ آپ کو بلا رہا ہے۔"

خاتون ڈاکٹر جلدی سے کھڑی ہوگئی اور بولی میں اب جاتی ہوں کل صبح نرس کو بھیج دونگی۔"

"یہ لڑکا کون ہے" مہالکشمی نے دریافت کیا۔ "تم نے کہا کہ تمہاری شادی ابھی نہیں ہوئی ہے۔"

جوان خاتون اس استفسار سے کسی قدر پریشان سی ہوگئی۔ اور پھر بولی "ہاں۔ اس لڑکے کو میں نے پال لیا ہے" اور یہ کہہ کر بعجلت وہاں سے روانہ ہوگئی۔

"ان لڑکیوں پر کبھی اعتماد نہ کرنا چاہیئے" مہالکشمی نے منہ بناتے ہوئے کہا "تم نہیں جانتیں کہ یہ باطن میں کیسی ہوتی ہیں"

انتنا کی حالت میں کوئی اطمینان بخش تغیر نمودار نہ ہوا۔ ڈاکٹر نے بھی تبدیلِ آب و ہوا کی رائے دیدی۔

انتنا کا دل ٹوٹ گیا اور اسے پوری طرح معلوم ہوگیا کہ وہ کیا بیمار ہے اور اب اسکی صحت کی کوئی توقع نہ تھی حتیٰ کہ آنیوالی موت کا خوف بھی اس کے لئے اس قدر روح فرسا نہ تھا جتنا بے اولاد مرنیکا خیال۔ اور یہ خیال کبھی اسکے دماغ سے محو نہ ہوتا تھا۔

جب وہ لیٹا ہوا کچھ سوچ رہا تھا تو سوشیلا آئی "اماں جان مجھ سے فرما رہی تھیں کہ میں آپ کو ان کے کمرہ میں پہلوں اس کمرہ میں اس کمرہ سے زیادہ وحشت ہے۔ وہاں ہیں۔ وہ اب حرکت کر سکتی ہیں لیکن آپ تو بالکل فراش ہیں"

انتنا نے اب کسی بات پر بھی اعتراض کرنا ترک کر دیا تھا چنانچہ وہ بولا "بہت بہتر ہے چلو"

وہ دو ولی کو بلا کر سامان ادھر سے ادھر رکھوا دیا گیا۔ اور انتنا کو بھی دوسرے کمرے میں منتقل کر دیا گیا دوسرے دن سوشیلا انتنا کے لئے کھانا پکا رہی تھی اور انتنا بستر پر پڑا ہوا ان ایام کو یاد کر رہا تھا جو اس نے اس دنیا میں صرف کئے تھے۔ اب اسکی بیماری اور جوان بیوی کی دیکھ بھال کون کریگا۔

یکایک اسے قدموں کی چاپ سنائی دی اور وہ آواز کی طرف دیکھنے لگا کیا یہ کوئی خیالی پیکر تھا جسے وہ دیکھ رہا تھا۔

ایک لڑکی اندر داخل ہوتے ہی وہ بستر پر پڑے ہوئے انسان کو دیکھ کر غیر معمولی طور پر جھجکی

"کیا آپ کی والدہ یہاں نہیں؟" اس نے گھبرائے ہوئے انداز سے پوچھا۔

"جی ہاں" انتنا نے جواب دیا "کل شام سے ہم نے اپنی جگہ تبدیل کر دی ہے لیکن آپ کون ہیں؟ آپ لکشمی دیوی تو نہیں ہیں؟ یا یہ محض میرا ایک خیال ہے"

لڑکی نے لیکن عینک آنکھوں سے اتار لی جس سے اسکی آنکھیں چھپی ہوئی تھیں "لکشمی کسی زمانہ میں میں اس نام سے موسوم کی جاتی تھی" لڑکی نے جواب دیا "لیکن اب میں مس کماری اور ایک خاتون ڈاکٹر ہوں کہئے آپکی والدہ کہاں ہیں مجھے ان کو دیکھنا ہے"

"تعجب ہے کہ والدہ نے تم کو نہیں پہچانا" انتنا بولا "حالانکہ وہ تم کو روزانہ دیکھتی رہیں"

"وہ مجھے کیسے پہچانتیں؟" مس کماری نے کہا "کیا انہوں نے کبھی میرے چہرہ کو نظر بھر کر دیکھا تھا؟ شاید ایک مرتبہ انہوں نے مجھے دیکھا تھا جب میں نے پہلی بار آپ کے دولت کدہ میں قدم رکھا تھا اسکے بعد وہ ہمیشہ مجھکو کوستی رہیں میرا چہرہ ہمیشہ گھونگٹ میں چھپا رہتا تھا اسکے علاوہ اب اس واقعہ کو دس برس گذر چکے ہیں۔ لوگوں کی شکل و صورت میں زمین آسمان کا فرق ہو جاتا ہے۔ پھر یہ عینک بھی پہچاننے میں حائل ہوتی ہے۔

یکایک ایک چھوٹا لڑکا دوڑتا ہوا کمرہ میں داخل ہوگیا "اماں جان آپ کتنی پریشان ہیں" اس نے کہا "دیکھئے آپ نے تو اپنی گھڑی پر چادر ڈالدی"

مس کماری نے تھیلی اسکے ہاتھ سے چھین لی "تم ایک چھوٹے شریر لڑکے ہو" وہ بولی "تم کو یہاں آنیکو کس نے کہا تھا۔ نکل جاؤ یہاں سے"

"اُسے یہیں رہنے دو" انتا نے ممتنی انداز سے کہا "میں اسے دل بھر کر دیکھنا چاہتا ہوں۔ لالتا یہ کس کا بچہ ہے؟"

لالتا نے کھڑکی سے سڑک کی جانب دیکھا اور کوئی جواب نہ دیا۔

انتا بستر سے اُٹھ کر اسکے پاس جا پہونچا "تم نے اسکو اتنے دنوں تک کیوں چھپا رکھا؟" اس نے کہا "کیا تم کو معلوم نہیں کہ صرف ایک بچہ کی آرزو میں میری ساری زندگی تباہ ہو گئی۔ میں اطمینان سے مر بھی نہیں سکتا۔

"لیکن آپ نے دوسرے کی زندگی تباہ کر دینے کا خیال کبھی نہیں کیا" لالتا نے جواب دیا۔

"مجھے اپنے اس گناہ کی کافی سزا مل چکی ہے" انتا نے جواب دیا "اب خدا کے لئے رحم کرو اور میرے گھر میں واپس آجاؤ اور مجھے میرا بچہ دیدو"

لالتا کا چہرہ یہ سن کر سرخ ہو گیا "یہ تم سے کس نے کہا کہ یہ تمہارا بچہ ہے" وہ بولی "یہ ایک یتیم ہے جسکی پرورش میں نے خیرات سے کی ہے"

"تم جھوٹ بول رہی ہو" انتا نے جوش محبت سے بھرائی ہوئی آواز میں کہا

"ممکن ہے" لالتا نے جواب دیا "لیکن آپ کے پاس اسکا کیا ثبوت ہے؟"

یہ کہکر وہ اپنے لڑکے کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے دروازہ کی طرف بڑھی انتا سے یہ منظر دیکھا نہ جا سکتا تھا۔ وہ اپنی تمام طاقت کے ساتھ بڑھا اور لالتا کی ساری کا ایک پلو تھام لیا۔

(ترجمہ بہ تصرف)

# جرائم اور جاسوسی

از جناب اسمٰعیل احمد مینائی نسیم

(۱)

"دنیا کا سب سے پہلا جاسوس کون شخص تھا؟ کس آدمی کے سر سب سے پہلے جاسوسی کے ابتدائی اصول قائم کرنے اور ان سے نامعلوم اور پیچیدہ واقعات حل کرنے میں مدد لینے کا سہرا ہے۔ مہذب دنیا کے قریب قریب تمام ممالک میں متعدد اشخاص خود سے یہ سوال کر چکے ہونگے لیکن مجھے یقین ہے کہ صرف معدودے چند اسکا جواب معلوم کرنے میں کامیاب ہوتے ہونگے۔

تلاش و تجسس کا جذبہ معمولی واقعات سے اہم نتائج تک پہونچنے کی عادت، ذرا ذرا سی باتوں کو نظر انداز نہ کرنیکی تعلیم اتنی ہی قدیم چیزیں ہیں جتنا خود انسان ہے۔ تمام احساسات ریا نیا اسی وقت وجود میں آئے جب انسان ودیعت ہوا۔ اسی لئے علم جاسوسی جو بہت بڑی حد تک احساسات کی لطافت پر منحصر ہے اتنا کہنہ ہے جتنا آدمی۔

جانوروں میں تجسس کی خصلت کا وجود اور بیشتر سے ہے کیونکہ موجودہ تحقیقات کی رو سے انسانیت حیوانیت کے بعد وجود پذیر ہوئی۔ حیوان گو واقعات سے نتائج اس درجہ لطافت و تکمیل تک اخذ نہیں کر سکتا جس حد تک انسان۔ اور نہ وہ اجتماع خیالات پر قادر ہے لیکن اس میں ذرا سا بھی شبہ نہیں کہ آج بھی حیوان کا احساس اور اسکی تشخیصی قوتیں انسان سے بہت بلند اور برتر ہیں۔ ہر اس شخص کو جسے علم جاسوسی سے دلچسپی ہے اور جس نے جاسوسی ناولوں اور افسانوں کا مطالعہ کیا ہے ان کتوں کے وجود کا علم بخوبی ہوگا۔ جو (Blood-hounds) کے نام سے مشہور ہیں اور جو مجرم کی جائے قیام کا پتہ صرف اسکے لباس یا استعمال کی کوئی شے سونگھ کر لگا لیتے ہیں۔ بادی النظر میں انکی اس خصوصیت کے مظاہروں کے واقعات ناقابل یقین معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اگر ہمکو یہ معلوم ہو کہ حیوان کے حواس خمسہ انسان کے حواس خمسہ سے زیادہ تیز اور لطیف ہوتے ہیں اور یہ کہ حیوانوں میں ان پانچوں حسوں کے علاوہ ایک چھٹا حس اور بھی موجود ہے۔ جسکا نام ابھی تک کوئی تجویز نہیں ہوا ہے اور جسکا وجود اب تک فقط چند خاص انسانوں میں پایا گیا ہے تو ان (Blood-hounds) کے بعید از عقل و قیاس کارناموں کا فوراً یقین آجاتا ہے

انسان کی آفرینش کے متعلق گوناگوں نظریے اور مختلف عقاید ہیں۔ مغربی ممالک کے لوگوں کا عموماً یہ خیال ہے کہ انسان بندر کی آخری ارتقائی شکل ہے۔ انہیں مغربی ممالک میں بعض قومیں ایسی ہیں جنکا عقیدہ ہو کہ مچھلی کی ارتقائی ترقی سے انسان ظہور میں آیا ہے۔ مشرق میں البتہ اب تک یہی یقین ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے اسی صورت میں پیدا کیا تھا جس میں وہ آج موجود ہے بہرحال انسان کے ارتقا Evolution کی بابت کچھ بھی عقائد ہوں لیکن یہ یقینی امر ہے کہ ابتدا میں انسان بہت وحشیانہ اور حیوان نما زندگی بسر کرتا تھا، وہ غاروں میں رہتا تھا پتوں اور درختوں کی چھالوں سے اپنا تن ڈھانکتا تھا کچا گوشت اور خام پھل اسکی خوراک تھے اور اس میں وہی درندگی کی خصلتیں اور حیوانیت کے عادات پائے جاتے تھے جو جانوروں میں موجود ہیں۔ ان تمام باتوں کا لازمی نتیجہ تھا کہ اسکے حواس خمسہ بھی موجودہ انسان کے حواس خمسہ سے زیادہ تیز اور ذی حس تھے۔ کیونکہ وہ انسان کی نسبت حیوان

سے قریب تر تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ جس آسانی اور سرعت سے وہ جرائم کا پتہ چلا لیتا تھا آج باوجود ہزاروں سائنٹفک آلات کی مدد کے ناممکن ہے۔ ذرا دیر کے لئے اپنے دماغ میں اس وقت کا تصور کر لیجئے جب انسان اس حالت میں تھا ایک نیم برہنہ وحشی شکار سے واپس آتا ہے اور دیکھتا ہے کہ اسکے غار سے تیر و کمان کا ایک گٹھا غائب ہے۔ فوراً وہ غار کی بند اور گھٹی ہوئی ہوا کو سونگھتا ہے تاکہ چور کی بو اگر غار میں باقی ہو تو اپنی تیز اور عجیب و غریب قوت شامہ سے اسکا پتہ چلالے۔ اس میں کامیابی نہ ہونے پر وہ چاروں ہاتھ پیروں پر چلکر زمین کے نشان کو غور سے دیکھتا ہے کہ اگر چور کا نقش قدم یا کوئی دوسرا امتیازی نشان موجود ہو تو اس سے چور کا نام و نشان معلوم کرنے کی کوشش کرے دفعتاً اسے پاؤں کے انگوٹھے کا ایک نشان ملتا ہے جس سے یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ انگوٹھا کبھی کسی وجہ سے ٹوٹ گیا تھا۔ بس تفتیش ختم ہو گئی وہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ اسے اب معلوم ہو گیا ہے کہ چور کون ہے۔ چور وہ "لنگڑا" ہے جو نزدیک ایک غار میں رہتا ہے۔ چپکے چپکے وہ اس غار تک جاتا ہے جہاں "لنگڑا" اور اسکی جھگڑالو بیوی رہتے ہیں۔ یہ دیکھ کر کہ دونوں میاں بیوی گھر میں موجود ہیں وہ غار کے قریب ہی کہیں چھپ جاتا ہے اور ان کے جانے کا منتظر رہتا ہے شام ہو جاتی ہے لیکن لنگڑا باہر نہیں نکلتا۔ رات گذر جاتی ہے اور پوشیدہ شخص اب بھی تاک لگائے بیٹھا رہتا ہے۔ سحر کو لنگڑا دیکھتا بھالتا غار سے باہر آتا ہے۔ ادھر اُدھر دیکھتا ہے۔ پھر اپنی بیوی کو آواز دیتا ہے جو ایک بنڈل بغل میں دبائے باہر آتی ہے اور دونوں خاموشی سے جنگل میں غائب ہو جاتے ہیں تو یہ شخص ان کے غار میں جاتا ہے اور غار کی تلاشی لیتا ہے۔ تلاش کرنے میں اسے اپنے ایک تیر کی ٹوٹی ہوئی نوک ملتی ہے جو شاید بنڈل باندھنے میں گر گئی تھی۔ وہ فوراً چوری کی اطلاع قبیلے کے سرداروں کو کر دیتا ہے اور تلاشی کے تمام واقعات اور ثبوت میں ٹوٹی ہوئی تیر کی نوک ان کے سامنے پیش کرتا ہے۔ "لنگڑے" کا واپسی پر جو حشر ہوا ہوگا وہ ہم خود دل میں سوچ سکتے ہیں

بعینہٖ ایسا ہی طریقہ امریکہ کے ہنڈیول Red Indians کا تھا جب قبیلے کی کوئی دوشیزہ یا گھوڑا غائب ہو جاتا تھا تو وہ اسی طرح اسکی تلاش شروع کرتے تھے۔ تھوڑی دیر کے لئے فرض کر لیجئے کہ گھوڑے کے سموں کے نشانات سے جو نرم زمین پر تھے یہ پتہ چلتا تھا کہ چھ سوار قبیلے کی قیام گاہ تک آئے تھے۔ اور وہاں سے خیموں تک چاروں ہاتھوں پیروں پر چلکر پہونچے تھے ایک جگہ ایک خیمہ کے نزدیک زمین پر ہرن کی کھال کے جوتے کا نشان تھا جسکی وضع سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا کہ وہ ایک خاص قبیلے کے کسی شخص کے پیر میں تھا فی الفور اسی قبیلے کی جائے قیام کی طرف تلاش شروع کی جاتی تھی۔ شکستہ شاخوں دبی ہوئی بیلوں اور دبی ہوئی گھاس وغیرہ سے انہیں آسانی سے معلوم ہو جاتا تھا کہ چور کدھر گئے ہیں، اور مجرموں کو سزا دینے کے لئے اسی وقت ایک فوجی دستہ روانہ کر دیا جاتا تھا۔

اس طرح جاسوسی کی بنیاد پڑی اور اس طریقہ سے اس علم کے ابتدائی اصول قائم کئے گئے۔ موجودہ اصول ان سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ نشانات۔ دھبے۔ قدموں یا انگلیوں کے نشان۔ اسی قسم کی اور معمولی اشیا جنکو بجز ان لوگوں کے جو اس نوع کی اشیا دیکھنے کے عادی ہوں اور تیار رہوں یہی چیزیں ہوتی ہیں جو جاسوس کو مجرم تک پہنچاتی ہیں۔ قالین پہ سگرٹ کی راکھ اب بہت کارآمد سراغ ثابت ہونے لگی ہے۔ اگر وہ راکھ ترکی یا مصری تمباکو کی ہے تو ملزم کی بابت امیر ہونیکا اور امیرانہ مذاق کا قیاس کیا جا سکتا ہے۔ برخلاف اسکے اگر راکھ معمولی تمباکو کی ہے تو مجرم کی غربت اور غریبانہ وضع ظاہر ہوتی ہے۔

مشرق میں ابتدائے تمدن و تہذیب ہی سے خفیف خفیف باتوں کا خیال رکھنا ذرا ذرا سے نشانات کا دیکھنا بھالنا

معمولی معمولی واقعات سے اہم نتائج اخذ کرنا بہت قدر و وقعت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ ایک شخص صادق کی بابت قصہ مشہور ہے کہ ایک دن سہ پہر کو بغداد کے ایک باغ میں چہل قدمی کر رہا تھا دفعتاً اس نے دیکھا کہ ملکہ کا خاص افسر اور چند سپاہی بدحواس پریشان حال ادہر ادہر دوڑ رہے ہیں۔ صادق کو دیکھ کر وہ اسکے پاس آئے اور افسر نے اس سے پوچھا "میاں جوان تم نے ملکہ کی کتیا تو نہیں دیکھی؟"

"آپ ایک اسپینل کتیا کے متلاشی ہیں جس کے حال ہی میں بچے ہوئے ہیں" صادق نے کہا۔

"ہاں۔ ہاں" افسر نے جواب دیا۔

"اور کتیا چھوٹی سی تھی اور اسکا اگلا بایاں پیر لنگ کرتا تھا اور اس کے کان بہت لمبے تھے" صادق نے پھر کہا۔

"ٹھیک بالکل ٹھیک اللہ کا شکر ہے کہ اسکا پتہ چل گیا۔ وہ کس طرف گئی ہے" افسر نے پوچھا۔

"میں نے نہ کتیا دیکھی اور نہ مجھے اس سے پیشتر یہ علم تھا کہ ملکہ کے پاس کوئی کتیا پلی ہوئی ہے"۔

اس افسر کو صادق کی بات کا کسی طرح یقین نہ آیا اور اسے کتیا چرانے کے الزام میں گرفتار کر لیا۔ جب صادق قاضی کے سامنے پیش ہوا تو اس نے کہا کہ باغ میں چہل قدمی کرتے ہوئے میں نے ایک چھوٹے جانور کے قدموں کے نشان زمین پر دیکھے تھے ان کو دیکھ کر یہ سمجھ لینا بالکل سہل تھا کہ وہ ایک کتے کے ہیں۔ انکی بناوٹ اور چند دوسری معلومات کی بنا پر اس نے یہ بھی پہچان لیا تھا کہ کتا قوم کا اسپینل ہے۔ راستے میں جگہ جگہ مٹی کے ڈھیر تھے جن پر ہو کر کتیا گذری تھی ان ڈھیروں پر قدموں کے نشانات کے وسط میں ایک چھوٹی سی نالی تھی جس سے اسنے یہ اخذ کر لیا تھا کہ کتیا ابھی تک اپنے پلّوں کو دودہ پلا رہی ہے کیونکہ تھن اتنے لٹک رہے تھے کہ انکی نوک زمین سے مس ہوتی رہی۔ قدموں کے نشانات کے باہر بھی دونوں طرف دو نالیاں تھیں جن سے اس نے یہ قیاس کیا تھا کہ کتیا کے کان بہت لمبے ہیں۔ کیونکہ کتیا کے چلنے میں وہ برابر زمین پر گھسٹتے رہے۔ قدموں کے نشانات میں اگلے بائیں پیر کا نشان اور نشانوں کی نسبت کم نمایاں تھا جس سے اسے یہ پتہ چلا کہ اس پیر سے کتیا لنگڑاتی ہے"۔ قاضی نے صادق کو رہا کر دیا۔

چند دن بعد پھر ایک روز وہ اسی باغ میں ٹہل رہا تھا کہ بادشاہ کے اصطبل کا داروغہ اسکے پاس آیا

"میں ایک گھوڑے کی تلاش میں سرگرداں ہوں" داروغہ نے کہا۔

"ہاں مجھے معلوم ہے اور میں یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ شاہی اصطبل میں اس سے اچھا جانور نہیں ہے اٹھارہ بالشت وہ اونچا ہے۔ اسکی دُم ایک گز سے زیادہ لمبی ہے۔ اسکے سم بہت چھوٹے ہیں اور ان میں چاندی کے نعل لگے ہیں" صادق نے جواب دیا، "تم نے اس گھوڑے کو کس سمت جاتے دیکھا تھا"، داروغہ نے خوشی سے پوچھا۔

"سمت تو درکنار میں نے گھوڑے ہی کو نہیں دیکھا" صادق نے جواب دیا۔

صادق کو گرفتار کر کے بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا اور بادشاہ کے سوال پر اسنے بتایا کہ باغ میں چہل قدمی کے دوران میں اس نے ایک گھوڑے کے سموں کے نشان دیکھے تھے سموں کے نشانوں کے درمیان فاصلہ اتنا مناسب اور دلفریب تھا کہ اسے فوراً یہ اندازہ ہو گیا کہ بجز ایک اعلیٰ درجے کے عرب گھوڑے کے کسی اور گھوڑے کے سموں کے نشان نہیں ہو سکتے جس سڑک

پر گھوڑا گذرا تھا وہ سات فٹ عریض تھی لیکن سڑک کے دونوں جانب جھاڑیاں اور مٹی سموں کے نشان سے تین تین فٹ تک منتشر تھی جس سے اس نے یہ اخذ کیا تھا کہ اس گھوڑے کی دُم کم از کم ایک گز لمبی ہے۔ جن درختوں کے نیچے ہو کر وہ گذرا تھا ان کی شاخیں پانچ فٹ کی بلندی تک ٹوٹی ہوئی ملی تھیں جس سے اس نے یہ قیاس کیا تھا کہ گھوڑا کم سے کم اٹھارہ بالشت اونچا ہے اور جہاں جہاں اسکے قدم پتھروں پر پڑے تھے وہاں چاندی کے ذرات موجود تھے۔ اس سے یہ امر واضح تھا کہ اسکے نعل چاندی کے ہیں۔

بادشاہ کو صادق کی یہ صفت مشاہدہ اس قدر پسند آئی کہ اس نے صادق کو اپنی پولس کا اعلیٰ افسر بنا دیا۔

زمانہ حال کا جاسوس بھی اسی طرح موقعۂ جرم کا معائنہ کر کے نتائج اخذ کرتا ہے اور اندازہ لگا لیتا ہے کہ اسے فلاں وضع اور فلاں صورت کے آدمی کی تلاش کرنا چاہیئے۔ گو موجودہ جاسوسوں کے حواس خمسہ اتنے ذی حس نہیں ہوتے کہ ان کی ابتدائے آفرینش کے آدمی سے مناسبت کیجا سکے لیکن انکی اس کمی کو موجودہ آلہ جات تفتیش جرائم پورا کر دیتے ہیں۔ آج جاسوسی کا ہر [illegible] اپنی مدد کے لئے ہزاروں ماہرین، سینکڑوں ڈاکٹر اور کیمیا داں طلب کر سکتا ہے جنکے عجیب وغریب آلات حیرت انگیز نتائج تک تفتیش کو پہنچا دیتے ہیں۔ ان میں سے ایک شمع بالائے بنفشی Ultra-voolet Lamp ہے جسے جادوگر کہنا زیادہ مناسب ہوگا اسکی روشنی میں ہر چیز منظر Flourescent ہو جاتی ہے ایک درجن کاغذ کے ٹکڑے جو بظاہر بالکل سادہ اور سفید معلوم ہوتے ہیں اس لیمپ کی روشنی میں مختلف رنگ اختیار کر لیتے ہیں اسکی روشنی میں دنیا کی ہر شئے اپنا امتیازی رنگ بالکل واضح کر دیتی ہے۔ جو کاغذات طاقتور خوردبین کے نیچے بھی کسی قسم کی تحریر کے نشان نہیں ظاہر کرتے اسکی روشنی میں ایسے ہو جاتے ہیں جیسے چند بالکل واضح اور خوشخط لکھی ہوئی تحریریں۔ اس لیمپ کے علاوہ اور بہت سے آلہ جات ہیں مثلاً پیچیدہ اور دقیق خورد عکسالے Micro-cameras اور طیف نما Spectroscopes جنکی قیمتیں کروڑوں روپیہ ہیں اور جنکی مدد سے جاسوس سنگین سے سنگین اور مبہم سے مبہم جرائم کا پتہ لگا لیتا ہے۔

دُنیا کے ہر بڑے مرکز جاسوسی میں لاکھوں نقشے موجود ہیں جن میں ان سب کے جنہوں نے ایک بار بھی قانون شکنی کی ہے نام بالتصاویر۔ نشانات۔ حلیے وغیرہ موجود رہتے ہیں۔ پیرس کے شوریٹ Surete میں ستر لاکھ ایسے نقشے موجود ہیں کوئی شخص جا کر ایک نام۔ یا ایک نشان یا ایک تصویر پیش کر دے۔ اور پانچ منٹ کے اندر اندر ایک درجن نقشے مطلوبہ شخص کے نام عادات۔ حلیے وغیرہ کے متعلق اسکے سامنے پیش کر دیے جائیں گے جن کے ذریعہ سے وہ مطلوبہ شخص سے اتنی اچھی طرح واقف ہو جائیگا گو زندگی بھر اسکی ہمراہی میں رہا ہے۔

ان تمام ترقیوں کو دیکھتے ہوئے یہ خیال وثوق سے کیا جا سکتا ہے کہ رفتہ رفتہ وہ وقت آ رہا ہے اور دور نہیں ہے جب ڈاکو، رہزن، لٹیرے وغیرہ جرائم کے ارتکاب سے بالکل باز رہا کریں گے۔ کیونکہ وہ خود اپنی آنکھوں سے یہ دیکھتے ہونگے کہ کوئی جرم خواہ کیسا ہی دقیق کیوں نہ ہو۔ ہمیشہ نامعلوم نہیں رہتا کبھی نہ کبھی پکڑا ہی جاتا ہے اور سائنس کی موجودہ حد درجہ سریع ترقی سے یہ کی جاتی ہے کہ تھوڑے ہی عرصہ میں وہ وقفہ کبھی نہ کبھی بہت مختصر رہ جائیگا۔

دنیا میں اس وقت بہت سے ایسے لوگ موجود ہیں جنہوں نے اپنی زندگی مجرموں کی ذہنیت Psychology

ان کے طریقہ ہائے کار کی جانچ پڑتال کیلئے وقف کردی ہے۔ فرانس کے الفریڈ کارڈ جو شہر لاک ہومز کا نامہ نمونہ ہیں ایسے آدمیوں کی ایک مثال ہیں۔ لاطینی ایک مثل ہے "کوئی شخص اخود اپنے ملک میں پیغمبر نہیں ہے" اسلئے یہ بالکل فطرتی ہے کہ جو سبق سر آرتھر کونن ڈائل نے سکھایا تھا بجز انگلستان کے باقی تمام ممالک اس سے مستفید ہوں۔ اب ہر ملک میں جاسوسوں کو مختلف سگرٹوں اور ان کی راکھ میں تفریق کرنا، مختلف مخصوص ملک کی مٹی اور ان کے رنگوں میں امتیاز کرنا۔ ان سب چیزوں کی تعلیم دیجاتی ہے۔ یہ سب اصول شرلاک ہومز کے کارناموں میں پہلے سے مذکور تھے۔

اب تک لوگوں کا یہ خیال تھا کہ جاسوسی کے راز اور جرائم کی تفتیش کے ذرائع پوشیدہ رکھنا چاہئیں لیکن اب اس نظریے میں تبدیلی ہوتی جاتی ہے۔ اب زیادہ تر اصحاب کی رائے یہ ہے اور بہت صحیح ہے کہ مجرموں کے دل میں اس خوف کا وجود کہ اسکے جرم کا علم جاسوس کو ہوجانا یقینی ہے جرم کے ارتکاب کے لئے زیادہ بہتر روک ہے بہ نسبت سزا کے اس خوف کے جو نسبتاً غیر معین بھی ہے اور غیر یقینی بھی۔ ہر مجرم کو یہ غلط فہمی ہوا کرتی ہے کہ وہ جاسوسوں سے زیادہ چالاک ہے اور ان سے زیادہ عقلمند۔ اس لئے وہ جرم کا ارتکاب بغیر کسی خطرے کے احساس کے کرتا ہے لیکن اگر اسے یقین ہو جائے کہ کسی جرم کی بابت بھی جاسوسوں کو دھوکہ دینا ناممکن العمل ہے۔ اور یہ اسکا امکان ہی نہیں ہے کہ کوئی جرم نامعلوم رہ سکے تو وہ کبھی سچائی اور ایمانداری کا راستہ چھوڑنے کی ہمت نہ کریگا۔

# انسانی عقل کی گمراہی

(از جناب منظور حسین صاحب ماہر القادری)

انسانی فطرت میں غور و فکر، اکتشاف و تحقیق کا جس قدر مادہ موجود ہے۔ کائنات کی کوئی دوسری نوع مخلوق اس کا عشر عشیر بھی نہیں رکھتی۔ اکتشاف و تحقیق کی حدیں تو کلیۃً دنیائے انسانیت ہی کے چند ابھرے ہوئے نقوش ہیں جو بنتے بگڑتے رہتے ہیں دیگر مخلوقات کی رسائی یہاں تک نہ ہوئی اور نہ ہونیکی توقع کیونکہ جن جذبات کے تحت اکتشاف و تحقیق کا احساس پیدا ہوتا ہے ان کا وجود صرف ہستی انسان ہی میں پایا جاتا ہے لیکن موجودہ تحقیقات نے اس چیز کو ضرور ثابت کر دیا ہے کہ حیوانات مطلق اور نباتات میں بھی غور و فکر قوت موجود ہے۔ اور وہ بھی اپنی مستقبل کی تباہی کے خیال سے ضرور متاثر و متالم ہوتے ہیں حیوانات مطلق کو چھوڑیئے ان میں تو پھر بھی شعور مجہول اور قوت ناقص پایا ہی جاتا ہے۔ نباتات کو دیکھئے کہ اُن کی عروق میں بھی آپکی رگوں کی طرح جذبات مسرت و غم سے ایک ہیجان پیدا ہو جاتا ہے۔ چھوئی موئی کا پودا صرف چھونے سے مضمحل ہو جاتا ہے۔ حالانکہ ہوا کے تیز جھونکوں میں اس کی نازک شاخیں خوشی سے جھومتی رہتی ہیں۔ بات یہ ہے کہ چھوئی موئی کے احساسات کو ہوا کے تیز جھونکے خوشگوار معلوم ہوتے ہیں۔ اور انسانی جسم کی خفیف ترین کشش و صل بھی اسکے جذبات کو مجروح کر دیتی ہے۔ آپ مسرت کے ساتھ اسکو چھوتے ہیں۔ وہ چیں بجبیں ہو کر اضمحلال سراپا اور افسردگی مجسم بن جاتی ہے۔ دوسری طرف گلاب کی پتیوں کو آپ جس قدر چاہے ٹہوکے دیجئے لیکن آپ ایک خفیف سی لرزش بھی محسوس نہ کرینگے۔ آپ کہیں گے ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اسکا جواب یہ ہے کہ جس طرح انسانی طبائع میں اختلاف و مغایرت ہے کہ ایک شخص معمولی حادثہ سے غیر معمولی طور پر متاثر ہو جاتا ہے۔ دوسرے آدمی کے دل میں بڑے سے بڑے واقعہ سے بھی کوئی حرکت پیدا نہیں ہوتی اسی طرح قادر مطلق نے نباتات کے خواص میں بھی اختلافات کی برقی لہر دوڑا دی ہے لیکن ان تمام باتوں کو تسلیم کرنیکے باوجود اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑیگا کہ اکتشاف و تحقیق کا عنصر حیوانات مطلق اور نباتات و جمادات میں قطعاً معدوم ہے۔ میرا مطلب اس طویل تمہید سے یہ ہے کہ تاثرات غم و الم۔ جذبات درد و مسرت۔ احساسات۔ سود و زیاں کا پایا جانا انسان کے لئے وجہ امتیاز نہیں ہے بلکہ اکتشاف و تحقیق کا جذبہ انسانی سطح کو دیگر مخلوقات سے بلند کر دیتا ہے۔ اکتشاف و تحقیق دو ایسی جامع صفات ہیں جو تمدن و تہذیب۔ معاشرت۔ علوم و فنون سب کی تحدید و ترجمانی کرتی ہیں۔ ماکولات مشروبات ملبوسات اور دیگر آسائش حیات کی دلآویزیاں سب اکتشاف و تحقیق ہی کی بدولت منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئی ہیں۔ انسان نے اپنے ابتدائی دور حیات میں زندگی کی ضروریات سے متعلق اشیاء کے اکتشافات کئے ایک حد تک اس کو اس جد و جہد میں کامیابی حاصل ہو گئی لیکن پھر بھی اسکے ذوق جستجو اور جذبہ تحقیق نے نچلا نہ بیٹھنے دیا۔ اور اسکے ذہن میں اجرام فلکی کی نسبت ہزاروں خیالات و تصورات پیدا ہوئے۔ اور انسان کی بے چین فطرت نے جب تک شکوک و شبہات کا ازالہ نہ کر لیا۔ انسان کو اطمینان و سکون کی سانس نہ لینے دی۔ علم ہیئت (Astronomy) اسی جذبہ کی تخلیق کا ایک عکس ہے۔

چونکہ درس و تدریس اور تدوین و ترتیب کتب عام نہیں ہوئی تھی لہذا ابتدا میں صرف علمی مذاکروں اور ادبی مباحثوں پر

چاند، سورج، ستاروں اور کہکشاں کی ہئیتوں پر قیاس آرائیاں کی جاتی تھیں۔ بطلیموس نے جب دُنیا کا جغرافیہ مرتب کیا تو اس کو طبیعی جغرافیہ (Physical Geography) کے سلسلہ میں اجرام فلکی کی نسبت بھی خیال آرائی کرنا پڑی۔ اسکے ساتھ ہی اُس نے کرۂ زمین کو ساکن بتایا۔ لہٰذا سکون ارض دنیائے مغرب کا عقیدہ ہو گیا جس طرح انسانی عقل و فراست کے فلک بوس مینارے گرتے رہتے ہیں اور قدرت انسانی زعم و نخوت کے بتوں کو پاش پاش کرتی رہتی ہے اسی طرح نظام بطلیموس کے بطلان کے لئے گلیلیو۔ Galileo پیدا ہوا جس نے زمین کو متحرک ثابت کیا۔ اگرچہ ابتدا میں اس جدید نظریہ کو قبولیت عام حاصل نہیں ہوئی لیکن بعد میں جا کر گلیلیو کی تحقیقات کی تلوار نے نظام بطلیموس کی رگ جان کو قطع کر دیا اسکے بعد کوپرنکس (Copernicus) نے ان نقوش میں جدید تحقیقات کا رنگ بھر دیا اور علم ہیئت ایک مستقل فن بن گیا اور اب تو سیاروں کی عمر، رفتار، باہمی تناسب، فصل و حرارت وغیرہ پر بھی کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسکا بھی انکشاف ہو چکا ہے کہ اس نظام شمسی کے آفتاب کے علاوہ اور بھی سینکڑوں آفتاب ہیں۔ اس پر بھی ہیئت والوں کا اتفاق ہے کہ مریخ ــ Jupiter اور زحل Saturn تمام تاروں سے قدیم ہیں (واللہ اعلم بالصواب)

میں پہلے بتا چکا ہوں کہ انسان کی فطرت میں انکشاف و تحقیق کا مادہ ممزوج کیا گیا ہے اور یہی انسان کی امتیازی شان ہے جو دوسری نوع مخلوق سے اُس کو علیحدہ کرتی ہے۔ لیکن اپنی ہستی سے غافل انسان محض اپنی عقل و فراست کے بل بوتے پر موج ہوا اور سطح آب پر عمارتیں بنانا چاہتا ہے۔ ہر دور میں اسی جذبۂ انانیت کے ظہور کے بعد انسانی عقل نے زبردست ٹھوکر کھائی ہے۔ آج بھی اسی ناپاک ذہنیت کا مظاہرہ دُنیا کے سامنے کیا جا رہا ہے۔

جدید تحقیقات نے اس کو ثابت کر دیا ہے کہ ہر کرہ اپنی حرارت تدریجاً زائل کرتا رہتا ہے اور ایک وہ زمانہ آتا ہے کہ حرارت معتدل ہو جاتی ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ اُس کرہ کی فضا میں قابلیت حیات پیدا ہو جاتی ہے کرۂ ارض اپنے ابتدائی دور میں ایک آتشیں کرہ تھا رفتہ رفتہ اسکی حرارت زائل ہوتی رہی اور اعتدال حرارت کے بعد قابلیت حیات پیدا ہو گئی جس نے جانداروں کی ایک وسیع دنیا کی شکل اختیار کر لی لیکن کرۂ ارض کی حرارت بدستور زوال پذیر ہے اور ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ یہ کرہ اس قدر بارد (Cold) ہو جائیگا کہ قابلیت حیات پھر زائل ہو جائیگی کہ انتہائی حدت و برودت دونوں قاتل حیات ہیں۔ ممکن ہے کہ ایک غیر معین مدت تک یہ کرہ نظام شمسی میں اپنی ہستی قائم رکھ سکے مگر یہ وقت زمین کی موت کا ہوگا۔ اسی طرح عطارد نے بھی اپنی گرمی کو بہت کچھ زائل کر دیا ہے اور ممکن ہے کہ کسی زمانہ میں جا کر اس میں بھی حیات کی قابلیت پیدا ہو جائے۔ چاند کے متعلق بھی تحقیقات جدیدہ سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ اس کرہ میں اپنی ذاتی روشنی اور حرارت باقی نہیں رہی۔ آفتاب کی منعکس روشنی سے وہ چمکتا ہے۔ اور آفتاب ہی کی شعاعیں اُس سے ٹکرا کر پلٹتی ہیں اور زمین پر آ کر روشنی پھیلاتی ہیں۔ اس چیز کو خود محققین نے ثابت کیا ہے لیکن باوجود ادعائے علم و تحقیق کے کس درجہ عجیب مآل اندیشی واقع ہوا ہے کہ وہ آگ کے شراروں میں پانی کے دھارے تلاش کرتا ہے۔ یخ بستہ چٹانوں میں آتش سیال کا مشاہدہ کرنا چاہتا ہے جس چیز کو وہ خود ناکارہ و منتشر سمجھ چکا ہے اسی کو کارآمد اور بصورت مرکز دیکھنا چاہتا ہے۔ بات یہ ہے کہ انکشاف و تحقیق میں جب اُس کو کامیابی ہونے لگتی ہے تو اسکا دماغ کبر و غرور سے لبریز ہو جاتا ہے اور خلاق دو جہاں کی قدرت و تائید کو یک قلم بھلا کر اپنی قدرت پر بھروسہ

کرتا ہے۔ یہی تخیل دہریت ولا مذہبیت کی اساس ہے۔ آج یورپ اسقدر انکشافات و تحقیقات کے بعد بھی تاریکی و جہالت کے گوشہ میں پڑا ہوا ہے اور خدا وندا کی قدرت سے منحرف ہو کر اسکی عقل قدم قدم پر ٹھوکر کھا رہی ہے جس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ یورپ کے مکتشفین اور علماء ہیئت کے متوالے چاند تک پہنچنے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں اور چاند کی بسنے والی دنیا سے متعارف ہونے کے لئے ان کا ذوقِ تنوع بےچین ہے۔ حالانکہ خود ہی اس بات کو ثابت کیا جا چکا ہے کہ چاند میں حرارت باقی نہیں رہی ان غرور و نخوت کے پتلوں سے کوئی پوچھے کہ جب چاند میں حرارت ہی باقی نہیں رہی تو اُس میں قابلیت حیات کا پایا جانا ممکن ہے۔ پھر وہاں جاندار مخلوق کس طرح رہ سکتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ کسی دور میں ضرور چاند معتدل حرارت کا کرہ ہوگا اور اس وقت جاندار وہاں آباد ہونگے لیکن زوال حرارت کے بعد حیات موت سے بدل گئی اور چاند کی جاندار آبادی فنا ہو گئی۔ انکشاف بڑی چیز نہیں ہے لیکن قدرت کے تمام اسرار کس طرح بے نقاب ہو سکتے ہیں کائنات کا ہر ذرہ ایک مستقل دُنیا ہے اور اسی کے وجود کا اگر تجربہ و تحقیق کی جائے تو انسان کی عمریں صرف ہو جائیں اسی نظام اسرار سے گھبرا کر تو نیوٹن (Newton) جیسا متبحر فلسفی پکار اٹھا تھا کہ ہم ابھی سمندر کے کنارے گھونگے (Sea shell) چُن رہے ہیں حضرت حافظ شیرازی قدس اللہ سرہ نے ایک شعر میں نظام قدرت۔ اسرار کائنات۔ اور انسانی تحقیق و جستجو پر روشنی ڈالی؟ جو اپنی جگہ باوجود مختصر الفاظ کے ایک بسیط مقالہ ہے، ہر مغرب کے مکتشف اور ریسرچ (Research) کے شیدائی کو چاہیے کہ وہ اس شعر کا ضرور مطالعہ کرے تاکہ اس کو معلوم ہو کہ آج سے سینکڑوں سال قبل مشرق (جسکو کرہ جہالت کہا جاتا ہے) کے ایک شاعر نے کائنات کا کس قدر غایر نظروں سے مطالعہ کیا تھا

حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو — کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت این معما را

# بھابی جان

جناب فضل حق قریشی کے بارہ مزاحیہ مضامین کا ہنسانے والا مجموعہ زیر طبع ہے۔ جن حضرات نے اِس سلسلہ کے مضامین مختلف رسائل میں ملاحظہ فرمائے ہیں اُن کے اصرار پر اِسی سلسلہ کے چند اور مضامین لکھکر یہ دلکش مجموعہ شائع کیا جا رہا ہے۔

ضخامت اور قیمت کا اعلان ساقی کی آیندہ اشاعت میں کیا جائیگا۔

یہ کتاب ہر بک ڈپو سے مل سکے گی۔

# اخوان الشیاطین

## اور

# دیگر افسانے

جناب افضل حسین چشتی (علامہ مضحک دہلوی) کے سائنٹفک افسانے ساقی کی گذشتہ اشاعتوں میں شائع ہوکر بیحد مقبول ہوچکے ہیں خصوصاً "اخوان الشیاطین" جو اپنی طرز کا زبانِ اردو میں پہلا افسانہ ہے شائقین ادب کے اصرار سے اسی نوع کے چند اور افسانے بھی صاحب مضمون سے لکھوا کر اس مجموعہ میں شامل کئے گئے ہیں قوت ارادی تنویم۔ نقل افکار اور سائنس کی بے شمار کرشمہ سازیوں کو ارتکاب جرائم میں کس بے دردی کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے۔ حصول جاہ و ثروت کیلئے انسانی خون کس سفاکی سے بہایا جاتا ہے یہ اور اسی قسم کے لرزہ خیز واقعات افسانوں کے پیرایہ بیان کئے گئے ہیں تاکہ معمولی قابلیت رکھنے والے بھی اس متمدن زمانہ کے خوفناک جرائم اور ترقی یافتہ ذہنیتوں کی بہیمانہ خونریزی کے طریقوں سے واقف ہوجائیں عمل تنویم سے نقل ارواح عمل جراحی سے انقلاب ذہنیت قوت ارادی کے مہلک نتائج مقیاس البرق کی جانسوز برقی لہریں دل ہلا دینے والے واقعات کی اگر آپ تصویر دیکھنا چاہتے ہیں تو اخوان الشیاطین اور دیگر افسانے کی ایک جلد طلب کیجئے اس مجموعہ میں سائنٹفک افسانوں کے علاوہ دو ایسے مزاحیہ مضامین بھی ہیں جنکو پڑھکر آپ ہنستے ہنستے لوٹ جائینگے ایک بہت دلچسپ رومانی تمثیل بھی شامل ہے طرز تحریر اس قدر پرلطف اور زبان اس درجہ شستہ و رفتہ ہے کہ ہر ہر فقرہ دل میں کھب جاتا ہے ضخامت ۲۵۶ صفحات کتابت و طباعت اعلیٰ درجہ کی قیمت صرف عہ علاوہ محصولڈاک۔

**ملنے کا پتہ۔ ساقی بک ڈپو دہلی**

مزاحیہ ادب کا شہ پارہ

بیان کا شاہکار

# ویمپائر

## مُصنفہ مُصورِ ظرافت جناب مرزا عظیم بیگ چغتائی بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی (علیگ)

یعنی

## ایک پاکباز لڑکی کی آبرو ریزی کی خوفناک کہانی خود اُسی کی زبانی!

(بارہ باب کا ایک مختصر ناول)

اگر آپ دیکھنا چاہتے ہیں کہ پاکبازی کیا ہے، نسوانی شرم و حیا کیا ہے، نسوانی وقار کس کو کہتے ہیں۔ اور اگر آپ دیکھنا چاہتے ہیں کہ حیوانیت کیا ہے، سوسائٹی کے درندے کس قدر خونی ہیں، خباثت کیا چیز ہے، شیطنت کیا ہے، متضاد جذبات کا تصادم کیسے ہوتا ہے، جبر و تشدد و ظلم اور سفاکی، بیدردی کی تفسیر کیا ہے، خونی کون ہے، خوک مجسم کون ہے، ضمیر کی سیاہی کیا ہے، تا ابدگی کیا چیز ہے تو ادب لطیف کے شہ پارہ یعنی ویمپائر کو دیکھئے۔

دیکھئے کہ کس طرح ایک بُزدل لومڑی مصیبت میں شیر ہو جاتی ہے، دیکھئے کہ کس طرح ظالم ایک معصوم کو روند ڈالتا ہے، کس طرح سیاہی روشنی پر غالب آ جاتی ہے یعنی کس طرح ظالم ایک معصوم کو مٹی میں ملا دیتا ہے، رگڑ ڈالتا ہے پامال کر دیتا ہے، تباہ و برباد کر دیتا ہے، کس طرح ایک پھول کو توڑ کر گندگی کے جنازہ پر ڈالتے ہیں۔ ڈرامہ کی طرح تفصیل آنکھوں کے سامنے آجائیگی۔

پھر دیکھئے کہ دنیا کا ہولناک ترین اور خوفناک اور خبیث ترین کونسا جرم ہے۔ دیکھئے کہ مجرم کس طرح شاداں ہے اور ساتھ ہی دیکھئے کہ مظلومہ کا کیا حال ہے۔ دماغی کیفیت مابعد، تفکرات و تاثرات، افشائے راز کا دھڑکا، اُمید و بیم کی حالت اور پھر قدرت کاملہ کا اٹل قانون یعنی افشائے راز۔ بعد افشائے راز طوفان خیز اور خوفناک واقعات، دماغی اور روحی تکلیفیں، جانگسل واقعات انکا خوفناک تسلسل، ہولناک انجام، قصہ مختصر یہ کہ تمام چیزیں اس عمدگی سے بیان کی گئی ہیں کہ انکی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ ہر باب ایک تکلیف کا نقش چھوڑتا جائیگا اور سب سب کچھ ملکر ایک پُر شکوہ مگر نہایت ہی عبرتناک، نہایت ہی مکروہ، نہایت ہی ہولناک اور خونی ٹریجڈی ہو جائیگی۔ ایسی جانگسل ٹریجڈی کہ آپ کہنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ مصنف نے اپنے مشہور ٹریجک فسانہ بہار ای کا خواب کا تمام زور اس خوفناک ٹریجڈی میں بھر دیا ہے لیکن جب آپ اس ٹریجڈی کے اختتام پر پہونچیں گے اور یہ سمجھیں گے کہ اب ٹریجڈی شباب پر آگئی اور خوفناک حصہ کچھ دور نہیں تو مصنف کا زور قلم ایک عجیب و غریب پلاٹ آفرینی سے ایکدم سے دو سطروں میں ایسی پھولوں کی بارش کر دیگا کہ آپ اُچھل پڑینگے کہ مزاحیہ نگاری اسکو کہتے ہیں۔ کتاب کا سرورق رنگین آرٹ کا بہترین نمونہ فوٹو بلاک کا ہے۔ اندر چار رنگین اور سادہ آرٹ کی تصویریں جنمیں سے دو خود مصنف کے ہاتھ کی ہیں۔ کتاب کی جلد نہایت ہی خوبصورت اور مضبوط، کاغذ بہترین دبیز اور چکنا۔ کراؤن سائز، لائبریری ایڈیشن قیمت صرف دو روپیہ علاوہ محصول ڈاک۔

نوٹ:۔ کتاب میں کمال یہ دکھایا ہے کہ باوجودیکہ اسقدر نازک اور قابلِ اعتراض پلاٹ ہے مگر اس خوبی سے مصنف نے کتاب ختم کی ہے کہ شروع سے آخیر تک دلچسپیوں کیساتھ ساتھ نہ صرف ادب لطیف کا دریا بہہ رہا ہے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پاکبازی اور حیاداری کا طوفان پھٹ پڑا ہے اور کتاب ایسی ہے کہ ہر چھوٹا بڑا حتیٰ کہ لڑکیاں اور عورتیں تک پڑھ سکیں اور عبرت بھی حاصل کریں۔ ملنے کا پتہ ساقی بکڈپو۔ دہلی۔

# حیاتِ محمودؔ

یعنی

## حیاتِ خواجہ عماد الدّین محمود گاواں

از جناب اسعد حسین الاشرفی الدھلوی

## انتساب

راقم تعمیر اپنے اس مضمونِ حقیر کو حضرت خواجہ عماد الدین محمود گاواں علیہ رحمۃ اللہ الرحمٰن کی روحِ پُر فتوح سے منسوب کرتا ہے تاکہ واضح ہو کہ اس مردِ بزرگ و ہستی سترگ کی حیاتِ نیکو صفات بعد ممات بھی قائم ہے اور صدہا سال گزر جانے کے بعد بھی مرگِ ناگہانیِ جسمانی اُس کی زندگانی روحانی کو کچھ نقصان نہ پہنچا سکی۔

اس خواجۂ نیک نام کا نامِ نیک بقائے دوام کے دفتروں اور شہرتِ عام کے رجسٹروں میں چڑھا ہوا ہے کہ نہیں مٹا اور نہیں مٹنے کا اس کی دستارِ افتخار کا طرّہ طلاکار وابستۂ دامنِ روزگار ہے کہ رات دن چاند سورج کی گنگا جمنی کرنوں کی طرح چمک رہا ہے اور چمکتا رہے گا۔

اسعد حسین الاشرفی

ہندوستان کے نہایت مشہور و مستند مورخ محمد قاسم فرشتہ نے تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ خواجہ عماد الدین محمود گاواں بادشاہانِ رشت کی اولاد میں تھا۔ اُس کے مورثِ اعلیٰ شاہانِ گیلان کے سلکِ وزرا میں منسلک تھے اُن میں سے ایک شخص اپنے بختِ رسا کی بدولت دولتِ رشت کی بادشاہی پر فائز ہو کر صاحبِ خطبہ ہوا تھا۔ بروایت حاجی محمد قندھاری اُس کے خاندان میں حکومتِ رشت کا سلسلہ شاہ طہماسپ صفوی بادشاہِ ایران کے عہد تک قائم تھا مگر طہماسپ کے عروج کے زمانہ میں وہ سلطنت منقرض ہو گئی۔

ہم نے متعدد فارسی، اردو اور انگریزی کتب تواریخ کی ورق گردانی کی مگر خواجہ گاواں کی تاریخ ولادت کا کہیں پتہ نہیں لگا۔ البتہ اُس کے حالات کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اُس نے ۸۰۸ھ کے قریب قصبۂ گاواں میں اقلیم عدم سے ملکِ وجود میں قدم رکھا۔ ایامِ طفولیت بمصروفیت حصولِ علم و حصولِ کمال اپنے وطن میں گزارے۔ جب فارغ التحصیل ہو کر مدرسہ سے نکلا تو وہ ایک عالمِ باعمل اور فاضلِ اجل تھا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اُس کے گلدستۂ کمالات کی

---

۱؎ تاریخ میں یہ شخص خواجہ گاواں کے نام سے مشہور ہے ہم نے بھی اس کو خواجہ گاواں یا خواجہ لکھا ہے ۲؎ یہ مقام نیملو کے قریب ہے جہاں حضرت مولانا محی الدین شیخ عبد القادر صاحب جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا مزار مبارک ہے ۳؎ اس موضع کا نام اصلی قاوان ہے مگر گاواں کے نام سے مشہور ہے اور گیلان کے پاس ہے۔

خوشبو نکہتِ گل کی طرح گلشن عالم میں پھیل گئی اور ممالک دور دراز سے تشنہ کامان علوم و فنون اُس کے چشمۂ فیض سے مستفیض ہونیکی غرض سے آآکر اس کے درِ دولت پر جمع ہونے لگے اُس کے ابنائے جنس کو اُس کی روزافزوں عزت و شہرت دیکھکر حسد پیدا ہوا اور وہ اُس کے درپئے آزار رہنے لگے نیز وہ لوگ جو اُس کے آبا و اجداد کی سلطنت پر حکمرانی کر رہے تھے اُس کی جماعت کی بڑھتی ہوئی تعداد دیکھکر خائف ہوئے کہ مبادا وہ اتنا قوی ہوجائے کہ اُس کے ذریعہ سے خواجہ گاواں اپنی سلطنت مغصوبہ کو اُن سے واپس لے لے۔ اس وجہ سے وہ اس کی بیخکنی کی تدبیریں کیا کرتے تھے جس سے اکثر اوقات اُس کی جان خطرہ میں رہتی تھی۔ خواجہ گاواں اہلِ وطن کی مخالفت سے پریشان ہوگیا تو اُس کی والدہ نے جو ایک بڑے بزرگ مشائخ کے خاندان سے تھی اس کو غیر ممالک میں جاکر تجارت کرنے کی صلاح دی اور کہا کہ اس طریق سے زیادہ وقت وطن کے باہر اور دشمنوں سے دور گزرے گا۔

خواجہ گاواں جب وطن سے چلا تو بادشاہانِ عراق و خراسان نے اپنے اپنے ہاں کے منصب وزارت اس کو پیش کئے مگر اُس نے اپنے عُلوِ ہمت سے اُن کو منظور نہ کیا اور بسلسلہ تجارت دنیا کے بڑے حصہ کا سفر کیا۔ اس سیر و سیاحت کے دوران میں اُس کو بڑے بڑے علماء و فضلاء و فقرا اور مشائخ سے ملنے اور اُنکے فیضِ صحبت سے برکت اندوز ہونیکا موقعہ ملا۔

اُس زمانہ میں جنوب ہند کی سلطنت بہمنی خوب عروج پر تھی۔ اُس کی قدردانی کے سبب سے دکن علم و فن کا منبع و مخزن بنا ہوا تھا۔ ولایات بعیدہ سے اربابِ کمال کھنچے چلے آتے تھے اُس کی دارالسلطنت احمدآباد بیدر[1] میں ایک بڑے بزرگ درویش جناب شاہ محب اللہ صاحب رحمت اللہ علیہ رہتے تھے۔ جن کی خانقاہ مصدر خاص و عام اور مرجعِ انام بنی ہوئی تھی دور دور سے لوگ انکی زیارت کو آتے تھے خواجہ گاواں نے ۸۵۱ھ (۱۴۴۶ء) میں جبکہ وہ اپنے سفرِ حیات کی تینتالیس منزلیں طے کرچکا تھا شاہ محب اللہ صاحب کی زیارت اور دکن میں جاکر تجارت کرنے کا قصد کیا بہت سا بیش قیمت سامان لیکر براہ سمندر بندر دابل[2] میں آیا اور وہاں سے بیدر پہنچا۔ اُس وقت سلطنت بہمنی کا دسواں بادشاہ علاؤالدین شاہ ثانی سریرآرائے مملکت تھا۔ خواجہ گاواں نے بہت سے گراں بہا تحفے اُس کی نذر کئے۔ بادشاہ اور اُس کے امراء نے خواجہ گاواں سے اس کے مال کا ایک معتدبہٖ حصہ خرید لیا باقی جو کچھ بچا وہ شہر میں فروخت ہوگیا جس سے اُس کو منافع کثیر حاصل ہوا۔ دکن کی سیر اور شاہ محب اللہ صاحب کی زیارت سے فارغ ہوکر خواجہ گاواں نے ارادہ کیا کہ دلی جاکر وہاں کے صوفیائے کرام اور مشائخ عظام کی

---

[1] ۸۲۴ھ (۱۴۲۱ء) میں سلطنت بہمنی کا نواں بادشاہ احمد شاہ اول شکار کھیلتا ہوا قلعہ بیدر کے نواح میں پہنچا وہاں ایک لومڑی پر کُتّے کو چھوڑا۔ اُس نے سختی کے ساتھ مقابلہ کرکے کُتّے کو زخمی کردیا بادشاہ نے اس غیر معمولی بہادری کو وہاں کی آب و ہوا کا اثر سمجھا اور ایک شہر اُس جگہ آباد کرکے اُس کا نام احمدآباد رکھا اور اپنے دارالسلطنت کو گلبرگہ سے وہاں منتقل کردیا یہ مقام ریاست حیدرآباد کے ایک ضلع کا صدر اور چھوٹا سا بارونق شہر ہے یہاں جست پر چاندی کا کام بہت خوبصورت ہوتا ہے جو بدری کام کے نام سے مشہور ہے۔ [2] یہ بندرگاہ دکن کے مغربی ساحل پر جلد گولہ کے قریب ہے جو اس زمانہ میں بہت بارونق بندر تھی ہندوستان کی بحری تجارت اسی کے ذریعہ سے ہوتی تھی۔

قدمبوسی کرے۔ مگر سلطان علاؤالدین اُس کی قابلیت سے ایسا متاثر ہوا تھا کہ اُس کو جانے نہیں دیا۔ اور بہ اصرار بسیار اپنے پاس رہنے پر رضامند کرکے اسے اپنے اعیان و اکابر میں شامل کر لیا۔

۸۶۳ھ میں بادشاہ کے پاؤں میں پھوڑا نکلا جس کی وجہ سے اُس کو ایسی تکلیف ہوئی کہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گیا۔ بہت روز تک محل سے باہر نہیں نکلا۔ اس عرصہ میں اُس کے مرنے کی خبر مشہور ہوئی تو اُس کے بہنوئی جلال خاں حاکم نلگنڈہ نے چند امراء کے ساتھ ساز باز کرکے اپنے لڑکے سکندر خاں کو اُن کی جگہ تخت نشین کرنا چاہا اور ملک تلنگانہ پر قبضہ کر لیا۔ بادشاہ نے اسی تکلیف کی حالت میں فراہمی لشکر کا حکم دیا۔ جب جلال خاں کو معلوم ہوا کہ علاؤالدین زندہ ہے تو وہ بہت پریشان ہوا۔ مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ اب سوائے اس کے چارہ نہیں تھا کہ یا تو مطیع ہو جائے یا جنگ کرے اطاعت میں جان کا خوف تھا مجبوراً جنگ کو ترجیح دینی پڑی اِذَا ابْتُلِيتُمْ بِبَلِيَّتَيْنِ فَاخْتَارُوا أَهْوَنَهُمَا[1] جلال خاں خود تو تلنگانہ پر قابض رہا اور سکندر خاں کو ماہور کی طرف روانہ کیا تاکہ اگر بادشاہ سکندر خاں سے جنگ کرنے کی غرض سے وہاں جائے تو یہ تلنگانہ میں سے نکل کر ملک میں شورش برپا کرے اور بادشاہ کے عقب میں رہ کر اس کی رسد کو لوٹتا رہے اور اگر وہ اس کی طرف آئے تو سکندر خاں یہی کارروائی کرے۔ سکندر خاں نے ماہور میں جا کر بہت سا لشکر جمع کیا اور بادشاہ کے مقابلے کے واسطے آمادہ ہو گیا۔ نیز محمود شاہ خلجی والیٔ مالوہ کو لکھا کہ علاؤالدین کا انتقال ہو گیا مگر امراء نے براہ بدنیتی و خود غرضی اُس کی وفات کو مخفی رکھا ہے اگر آپ ایسے وقت میں اس طرف تشریف لائیں تو بہت آسانی کے ساتھ تلنگانہ اور برار پر آپ کا تسلط ہو سکتا ہے اس پیغام کے پہنچتے ہی محمود شاہ بہت سی فوج لیکر برار کی طرف روانہ ہوا اور راستہ میں سے مبارک خاں حاکم خاندیس کو بھی ساتھ لے لیا۔

علاؤالدین گو چلنے پھرنے سے معذور تھا۔ اور پھوڑے کے سبب سے بہت تکلیف تھی مگر وہ ہمت شاہانہ کو کام میں لا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ خواجہ گاواں کو منصب ہزاری پر سرفراز کرکے جلال خاں کے دفعیہ کے واسطے مامور کیا۔ سوبیدار برار کو مبارک خاں کے روکنے کا حکم بھیجا اور قاسم بیگ صف شکن سر لشکر دولت آباد کو پانچ کوس اپنے آگے رکھکر خود پالکی میں محمود شاہ کے مقابلے کو روانہ ہوا جب محمود شاہ کو معلوم ہوا کہ علاؤالدین زندہ ہے اور بڑے لاؤ لشکر کے ساتھ اس سے جنگ کرنیکو آ رہا ہے تو وہ اپنے ایک امیر سکندر خاں کو سکندر خاں کی مدد کے واسطے چھوڑ کر خود مالوہ کو واپس چلا گیا۔ اور اس کو ہدایت کر گیا کہ اگر سکندر خاں علاؤالدین سے صلح کرنی چاہے تو اسے گرفتار کر لیا جائے سکندر خان کو بھی اس کی خبر لگ گئی وہ اپنے دو ہزار افغان اور راجپوت سوار اور سب لشکر لیکر وہاں سے نلگنڈے کو چل دیا یہاں خواجہ گاواں نے جلال خان کے اوپر پے در پے حملے کرکے اُس کو پریشان کر رکھا تھا آخرکار وہ خواجہ گاواں کے حملوں کی تاب نہ لا کر قلعہ نلگنڈے میں محصور ہو گیا جب سکندر خاں یہاں پہنچا تو اپنے باپ کو حصاری پایا بہر چند کوشش کی کہ محاصرے کو توڑ کر قلعہ میں گھس جائے مگر کامیابی نہ ہوئی خواجہ گاواں نے کچھ فوج محاصرہ پر چھوڑ کر بقیہ فوج

---

[1] جب تم دو مصیبتوں میں مبتلا ہو تو اُن دونوں میں سے بہلتر کو اختیار کرو ۱۲ [2] برار اور تلنگانہ کے مابین جو ملک ہے اُس کو ماہور کہتے ہیں ۱۲

سے سکندر خاں کا مقابلہ کیا اور اُس کو متواتر شکستیں دیکر وہاں سے بھگا دیا اور محصورین کو ایسا تنگ کیا کہ جلال خان اور سکندر خاں دونوں باپ بیٹے اطاعت کرنے پر مجبور ہوگئے۔ خواجہ گاواں دلیکر علاؤالدین کی خدمتمیں حاضر ہوا دونوں نے بادشاہ سے معافی مانگی بادشاہ نے اُس کی سفارش سے معاف کرکے نلگنڈہ پھر اُنہیں کی جاگیرمیں دے دیا۔ بادشاہ خواجہ گاواں کی اس کارگذاری سے بہت خوش ہوا۔

علاؤالدین بائیس برس بادشاہت کرنے کے بعد جب بہت سخت بیمار ہوا اور اُمید زیست منقطع ہوگئی تو امرا کی خواہش کے خلاف اُس نے اپنے بڑے لڑکے شہزادہ ہمایوں شاہ کو ولیعہد مقرر کیا اور اس کو اپنے پاس بلاکر نصیحت و وصیت کی علاؤالدین کی وفات سے پہلے ہی بہت سے امرا ہمایوں کے خوف سے بھاگ گئے کیونکہ وہ بہت سخت گیر اور جابر تھا۔ تاریخ میں وہ ہمایوں شاہ ظالم کے نام سے مشہور رہے۔

جب ۸۶۲ھ میں علاؤالدین شاہ بہمنی کا انتقال ہوا تو چند اُمرا نے ہمایوں شاہ ظالم کے خوف سے اُس کے چھوٹے بھائی حسن خاں کو بادشاہ بنایا۔ ہمایوں شاہ اپنے پھوپھا جلال خاں حاکم نلگنڈہ اور اُس کے لڑکے سکندر خاں کی امداد سے حسن خاں کو شکست دیکر خود تخت نشین ہوا۔ اور اپنے باپ کی وصیت کے مطابق خواجہ گاواں کو ملک التجار[1] کا خطاب دے کر وکیل شاہی اور طرفدار بیجاپور مقرر کیا اور ملک شاہ کو جو شاہان چنگیزیا کی اولاد میں تھا خواجہ جہاں کا خطاب دیکر حکومت تلنگانہ پر مامور کیا۔ اور نظام الملک غوری کے بھتیجے کو نظام الملک کا خطاب دیکر تلنگانہ میں جاگیر دی۔ سکندر خان نے جب دیکھا کہ سب بڑے بڑے مناصب اور جاگیریں تقسیم ہوگئیں اور اُسے کچھ نہیں ملا تو اس کو بہت رنج ہوا کیونکہ اُس نے حصول سلطنت میں بادشاہ کی امداد کی تھی اس سبب سے اُس کو بڑی بڑی امیدیں تھیں اور یقین تھا کہ تلنگانہ کی سرشکری اُسے ملے گی اس طرح مایوس ہوکر وہ بادشاہ کی اجازت کے بغیر اپنے باپ جلال خاں کے پاس نلگنڈہ چلا گیا اور وہاں پہنچکر علم بغاوت بلند کیا۔ ہمایوں شاہ نے خاں جہاں سرلشکر برار کو اُس کی سرکوبی کے واسطے بھیجا مگر سکندر خاں نے اُس کو شکست دی۔ اس کے بعد ہمایوں شاہ خود بہت سی فوج لیکر اس کے دفعیہ کی غرض سے روانہ ہوا۔ اور نلگنڈہ جاکر اُس کو قلعہ میں محصور کر لیا بادشاہ کو یہ خیال تھا کہ اب وہ مرعوب ہوکر مطیع ہو جائے گا۔ مگر اس کے برعکس اُس نے لشکر شاہی پر شب خون مارا۔ سکندر خاں بہت جنگجو اور دلیر آدمی تھا۔ اس کے پاس راجپوتوں۔ دکھنیوں اور افغانوں کی گو مختصر مگر بڑی بہادر فوج تھی۔ اس وجہ سے بادشاہ نے بجائے سختی کے نرمی سے کام نکالنا چاہا اور اُس کو لکھا کہ یہ بہت بدنامی اور روسیاہی کی بات ہے کہ تم جیسا بہادر اور وفادار سپاہی اپنے آقا کے خلاف جنگ کرے میں تمہارا قصور معاف کرتا ہوں

[1] دولت بہمنی کے نویں بادشاہ احمد شاہ بہمنی نے ۸۲۵ھ میں یہ خطاب خلف حسن بصری کو دیا تھا جو ایک بڑا دولتمند تاجر تھا اس نے احمد شاہ کو حصول سلطنت میں بہت مدد دی تھی بعد ازاں یہ خطاب تاجر و غیر تاجر سب کو ملنے لگا اور بہت معزز خطاب خیال کیا جاتا تھا ایک دفعہ امیر عبدالرحمن خاں مرحوم بادشاہ کابل نے بھی ایک عہدہ دار کو یہ خطاب دیا تھا۔ ۱۲

اور قلعہ دولت آباد[*] مع مضافات کے تمہاری جاگیر میں دیتا ہوں۔ جنگ سے باز آؤ۔ سکندر خاں کو اپنے لشکر پر بہت ناز تھا۔ اس نے جواب دیا کہ آپ احمد شاہ بہمنی کے پوتے اور میں نواسہ ہوں ہم دونوں سلطنت میں برابر کے حصہ دار ہیں۔ مجھے دولت آباد نہیں چاہئے ملکانہ دیجئے ورنہ میرے اور آپ کے درمیان تلوار فیصلہ کرے گی۔ ہمایوں شاہ کو سکندر خاں کے اس گستاخانہ جواب اور برابری کے دعویٰ پر بڑا غصہ آیا اور وہ جنگ کے واسطے آمادہ ہوگیا قلعہ میں رسد کا سامان کافی نہ تھا اس وجہ سے سکندر خاں نے بجائے محصور ہونے کے باہر نکلکر لڑنا مناسب سمجھا اور اپنی مختصر سی جمعیت کے ساتھ بادشاہ کے سامنے آیا صبح سے تیسرے پہر تک شدید جنگ ہوتی رہی نہایت سخت آویزش ہوئی بڑی گھمسان کی لڑائی ہو رہی تھی دونوں پلے برابر تھے کہ قریب شام خواجہ گاواں نے میمنہ میں سے اور خواجہ جہاں ترک نے میسرہ میں سے نکلکر سکندر خاں کے اوپر ایسے حملے کئے کہ اس کے پاؤں ڈگمگا گئے اسی وقت بادشاہ نے خاص سکندر خاں پر یورش کی اور ایک مست ہاتھی کو اس پر ریل دیا جس نے اس کو سونڈ میں پکڑ کر دے مارا سکندر خاں کو شکست ہوئی۔ بعدہ خواجہ گاواں اور خواجہ جہاں کی کوشش سے جلال خاں بھی گرفتار ہوگیا۔ اس کامیابی کے بعد جس میں بڑا حصہ خواجہ گاواں کی مساعی جمیلہ کا تھا بادشاہ کی نظر میں اس کی عزت و قوت بہت زیادہ ہوگئی۔

۸۶۵ھ (۱۴۶۱ء) میں ہمایوں شاہ ایسا سخت بیمار رہا کہ بچنے کی توقع نہ رہی۔ زندگی سے مایوس ہو کر اس نے اپنے بڑے لڑکے نظام شاہ کو جس کی عمر اس وقت آٹھ برس کی تھی اور خواجہ جہاں ترک اور خواجہ گاواں کو طلب کیا۔ شہزادہ کو ولیعہد مقرر کر کے اُن کے سپرد کیا۔ خواجہ جہاں کو وکیل شاہی اور خواجہ گاواں کو وزیر مقرر کر کے اُن کو وصیت کی کہ میرے بعد اس کو تخت نشین کرنا اور سلطنت کا کوئی کام اس کی ماں کے مشورے کے بغیر نہ کرنا۔ یہ وصیت بادشاہ کے حق میں ایسا موثر علاج ثابت ہوئی کہ وہ چند روز میں تندرست ہوگیا۔ مگر زندوں کی فہرست سے اُس کا نام قلمزد ہو چکا تھا اس وجہ سے اس واقعہ کے تھوڑے عرصہ کے بعد خدام حرم نے جو اُس کے ظلم و ستم سے عاجز آگئے تھے اور اس کے مرنے کی دعائیں مانگا کرتے تھے شہاب خاں خواجہ سرا داروغہ محلات کی سازش سے اسکے مار ڈالنے کی تجویز کی ایک کنیز نے اس مشورے کے مطابق ایک دن رات کو جبکہ بادشاہ اپنی آرام گاہ میں آرام کر رہا تھا۔ ایک ڈنڈا ایسے زور سے اُس کے سر میں مارا کہ وہ سویا کا سویا رہ گیا۔ یہ واقعہ شوال ۸۶۵ھ (۱۴۶۱ء) کا ہے۔

ہمایوں شاہ کے بعد اُس کی وصیت کے مطابق نظام شاہ تخت نشین ہوا اور اُس کی والدہ نرگس بی

[*] ہندوؤں کی حکومت کے زمانہ میں اس کو دیوگرہ کہتے تھے مگر فارسی کی تاریخوں میں دیوگیر لکھا ہے۔ سلطان محمد تغلق نے ۷۲۸ھ (۱۳۲۷ء) میں دلی سے یہاں لاکر آباد کیا تھا اور دولت آباد نام رکھکر ہندوستان کا دارالسلطنت مقرر کیا تھا اُس وقت سے اسکو دولت آباد کہتے ہیں۔ سلطان علاؤالدین خلجی نے ۶۹۴ھ (۱۲۹۴ء) میں اس مقام کو ہندوؤں سے فتح کیا تھا عرصہ تک مسلمانوں کے قبضہ میں رہا بعدہ فرانسیسی پھر مرہٹے اس پر قابض رہے اب پھر مسلمانوں کے قبضہ میں ہے یعنی ریاست حیدر آباد سے تعلق رکھتا ہے جس وقت اس کا نام دولت آباد رکھا گیا تھا۔ اس وقت فی الواقع یہ اس نام کا مستحق تھا مگر اب تو ایک معمولی قصبہ ہے اس کا موجودہ قلعہ سلطان محمد تغلق کا بنایا ہوا ہے جو ایک پہاڑی پر ایک خوشنما عمارت ہے ۱۲

المخاطب بہ مخدومۂ جہاں[1] اُس کی نگران مقرر ہوئی۔ یہ خاتون بہت دانشمند اور عاقلہ تھی۔ ہمایوں شاہ ظالم جیسے جابر وتندخو آدمی کی سخت گیریوں نے اُس کو بہت تجربہ کار اور چست وچالاک بنا دیا تھا۔ مخدومہ جہاں نے خواجہ جہاں ترک کو وکیل السلطنت وطرفدار تلنگانہ اور خواجہ گاواں کو وزیر کل وجملۃ الملک اور طرفدار بیجاپور مقرر کرکے اُن کی امداد سے کار بار حکومت انجام دینا شروع کیا۔ بغیر اُنکی صلاح کے کوئی کام نہیں کرتی تھی اور سوائے انکے اور کسی سے مشورہ نہیں لیتی تھی یہ دونوں امیر ملک میں بہت بارسوخ وبااثر تھے۔ اور دونوں باہم قریب قریب برابر کی طاقت وحیثیت رکھتے تھے۔ ایک دوسرے کو دبا نہیں سکتا تھا اس وجہ سے یہ اندیشہ نہیں تھا کہ بادشاہ کی خورد سالگی اور مخدومہ جہاں کی زنانہ کمزوری سے فائدہ اُٹھا کر اُن میں سے کوئی تاج وتخت کو نقصان پہنچائیگا۔

مخدومۂ جہاں پردہ کی پابند تھی پردے میں بیٹھکر سلطنت کا انتظام کرتی تھی اُس نے اپنی ایک خواص خاص کو جس کا نام ماہ بانو تھا اپنا عرض بیگی مقرر کر رکھا تھا۔ دونوں امیر اُس کی وساطت سے اپنے کاغذات پیش کرکے حکم حاصل کرتے تھے بادشاہ کو روزانہ تخت[2] فیروزہ پر بٹھا کر اجلاس کرتے تھے دائیں طرف خواجہ جہاں ترک بیٹھتا تھا۔ اور بائیں جانب خواجہ گاواں اور پیچھے پردے میں مخدومۂ جہاں سب مل جلکر سلطنت کا کام کرتے تھے۔ بادشاہانِ قرب وجوار کو جب یہ معلوم ہوا کہ مملکت بہمنی میں ایک طفل صغیر مالک تاج وسریر ہوا ہے اور سلطنت کا کار بار ایک خاتون پردہ نشین کے دستِ نزاکت شعار میں ہے تو اُن کو مرض جوع الارض کا دورہ اُٹھا یہ بیماری عموماً سب بادشاہوں کو ہوا کرتی ہے۔

ہفت اقلیم ار بگیرد پادشاہ ٭ ہمچناں در بندِ اقلیمِ دگر ٭

۸۶۶ھ (۱۴۶۲ء) میں رایانِ اُڑیا و اُڑیسہ نے زمینداران تلنگانہ کو اپنے ساتھ ملا کر ایک جمعیت کثیر کے ہمراہ سلطنت بہمنی پر حملہ کر دیا۔ راجمندری کے رستے سے اُس کے اندر گھس آئے اور لوٹ مار کرتے ہوئے کولاس تک پہنچے۔ مخدومۂ جہاں، خواجہ جہاں ترک اور خواجہ گاواں کو معہ چالیس ہزار سوار کو لیکر اُن کو روکنے کے واسطے چلی بیدر سے دس کوس کے فاصلہ پر مقابلہ ہوا جنگ شدیدہ کے بعد غنیم کو شکست ہوئی اور اُس نے خواجہ گاواں کے توسل سے مخدومۂ جہاں سے بمنت معافی

---

ع۱ بادشاہ کی پہلی بیوی کو جو خاندان بہمنی سے ہوتی تھی مخدومۂ جہاں کا خطاب ہوتا تھا۔ جو اولاد اس کے بطن سے ہوتی تھی وہی تاج وتخت کی وارث بھی جاتی تھی ع۲ بیٹھکر بادشاہ کی خدمت میں کاغذات پیش کرنیوالا عہدہ دار ع۳ تلنگانہ [illegible] نے فیروز شاہ تغلق بادشاہ دہلی کے واسطے یہ تخت بنوایا تھا جو سلطنت بہمنی کے دوسرے بادشاہ محمد شاہ اول کا ہمعصر تھا جب ۷۶۷ھ میں محمد شاہ کی اس راجہ سے جنگ ہوئی تو راجہ کو شکست ہوئی اور اس نے تاوان جنگ میں تین سو ہاتھی دو سو گھوڑے تیرہ لاکھ ہن یعنی ساڑھے اٹھاون لاکھ روپیہ بادشاہ کو دیا اور یہ تخت اُس کی نذر کیا۔ تخت تین گز لمبا ڈھائی گز چوڑا نہایت خوبصورت آبنوس کی لکڑی کا بنا ہوا تھا جو سونے میں مستغرق اور جواہر بے بہا سے مرصع تھا۔ اور اس ترکیب سے بنایا گیا تھا کہ تختے علیحدہ ہو کر صندوق کی صورت میں تبدیل ہو جاتا تھا چونکہ اُس کی پوشش آسمانی رنگ کی تھی اس وجہ سے محمد شاہ نے اُس کا نام تخت فیروزہ رکھا تھا بادشاہ نے اپنا خاندانی تخت خزانہ میں رکھوا دیا تھا اور اسی پر اجلاس کیا کرتا تھا۔ اس وقت سے اختتام سلطنت تک بہمنی کے سب بادشاہ اسی پر جلوس کرتے رہے۔

مانگی اور پانچ لاکھ ٹنگہ[1] طلائی تاوان جنگ دیکر اپنا پیچھا چھڑایا۔

اس واقعہ کے تھوڑے عرصہ کے بعد سلطان محمود شاہ خلجی والئے مالوہ نے تسخیر دولت بہمنی کی غرض سے دکن کا رخ کیا۔ اس کی آمد کی خبر سنکر رایان اڑیسہ اڑیسہ اور زمینداران تلنگانہ سلطنت بہمنی میں غارت گری کرنے لگے۔ خواجہ جہاں ترک اور خواجہ گاواں نے کل ممالک بہمنی کے لشکر کو طلب کیا خزانہ کا منہ کھول دیا۔ لاکھوں روپیہ فوج میں تقسیم کیا۔ دونوں سردار بہت سا لشکر لیکر نظام شاہ کے ساتھ محمود شاہ کی مدافعت کے واسطے روانہ ہوئے موضع قند ھار کے قریب مقابلہ ہوا خواجہ جہاں ترک مع نظام شاہ اور سکندر خاں ترکی غلام کے جو نظام شاہ کا کوکہ تھا گیارہ ہزار سوار اور سو ہاتھی لیکر قلب میں قائم ہوا خواجہ گاواں اور نظام الملک دس دس ہزار سوار کے ساتھ میمنہ پر اور میسرہ پر متمکن ہوئے محمود شاہ خلجی خود قلب میں کھڑا ہوا۔ اُس کا لڑکا غیاث الدین میمنہ پر اور مہابت خاں حاکم چندیری و ظہیر الملک میسرہ پر سامنا ہوتے ہی سب سے پہلے خواجہ گاواں نے دشمن کے میسرہ پر ایسا شدید حملہ کیا کہ مہابت خاں اور ظہیر الملک کا لشکر تہ و بالا ہو گیا اور وہ دونوں لڑتے ہوئے مارے گئے۔ دوسری طرف نظام الملک نے شہزادہ غیاث الدین کو شکست دی اُس کے ہاتھ سے شہزادے کی آنکھ میں ایسی شدید ضرب آئی کہ وہ گھوڑے سے گر پڑا مگر اس کے ہمراہی اُس کو اٹھا کر لے گئے محمود شاہ کے میمنہ و میسرہ دونوں بازو پریشان ہو گئے۔ سامنے سے خواجہ جہاں ترک نے محمود شاہ پر حملہ کیا قریب تھا کہ اُس کے پاؤں اُکھڑ جائیں مگر اُس نے نظام شاہ کے ہاتھی کو سامنے سے آتا دیکھکر فیل میر ایسا تاک کر مارا کہ وہ اُس کے مستک میں نصف کے قریب غرق ہو گیا۔ ہاتھی بہت بگڑا۔ سکندر خاں جو اس وقت نظام شاہ کے ساتھ تھا اُس کو چاہئے تھا کہ فوراً محمود شاہ پر حملہ کر دے مگر بجائے اس کے وہ معلوم نہیں غلطی سے یا خواجہ جہاں کی مخالفت کے سبب سے بادشاہ کو اپنے ہاتھی پر بٹھا کر لشکر کے باہر نکال لایا اور اُس کو پیچھے لیجا کر کھڑا ہو گیا اپنی فوج کو لڑنے کا حکم نہیں دیا۔ سپاہ نے جب بادشاہ کو مقام جنگ پر نہ دیکھا تو اس خیال سے کہ بادشاہ بھاگ گیا یا مارا گیا اُس کے پاؤں اُکھڑ گئے اور بے تحاشا میدان سے رو بہ گریز رکھا۔ خواجہ گاواں بھی بے ترتیبی سے بھاگا۔ مگر خواجہ جہاں ترک نہایت ترتیب کے ساتھ اپنے لشکر کو واپس لایا۔ سکندر خاں کے سبب سے یہ فتح مبدل بہ شکست ہو گئی۔ فوج ہزیمت خوردہ نے بیدر میں آکر دم لیا۔ خواجہ جہاں نے بیدر پہنچکر سکندر خاں کو قید کر دیا۔ اُس کو مخدومہ جہاں سے ابھی اس کی شرارت کے حالات کہنے کا موقعہ نہیں ملا تھا کہ ترکی غلاموں نے ملکہ مخدومہ جہاں سے خواجہ جہاں کی شکایت کی اور عرض کیا کہ سکندر خاں نے براہ خیر خواہی اپنی جان خطرہ میں ڈال کر بادشاہ کو خطرے سے بچایا۔ اس کا صلہ اس کو یہ ملا کہ خواجہ جہاں نے اُس کو قید کر دیا۔ علاوہ اس کے اور بہت سی برائیاں خواجہ جہاں کی کیں اور مخدومہ جہاں کو اُس کی طرف سے خوب بھر دیا۔ مخدومہ جہاں نے اُن کو جواب دیا کہ اس وقت مصلحت خاموش رہنے میں ہے میں آئندہ اس کی تلافی کر دونگی۔ خواجہ جہاں کو جب یہ حال معلوم ہوا تو اُس نے سکندر خاں کو رہا کر کے مخدومہ جہاں سے معافی مانگی۔ مگر طبعیتیں دونوں کی ایک دوسرے سے کشیدہ ہو گئیں۔ غمازوں نے اس کشیدگی میں اور بھی اضافہ کر دیا شخصی حکومتوں میں جہاں لگائی بجھائی کرنے والوں کی خوب دال گلتی ہے اکثر انعام کے مستحقین کو سزا اور سزا کے سزاواروں کو انعام ملتے ہیں۔ اس وقت خواجہ جہاں ترک ہی ایک ایسا شخص تھا جس نے ایسے

[1] ایک سونے کا سکہ تھا جو آجکل کے انگریزی ساڑھے چار روپیہ کے برابر ہوتا تھا اسی کو ہن بھی کہتے تھے۔

پُرآشوب زمانے میں دولت بہمنی کی کشتی حیات کو ورطۂ ہلاکت میں پھنسنے سے بچا رکھا تھا۔

جب محمود شاہ خلجی کو مخدومہ جہاں اور خواجہ جہاں کی رنجش کا حال معلوم ہوا تو وہ بیدر کو روانہ ہوا یہاں چغلخوروں نے مخدومہ جہاں کو یقین دلا رکھا تھا کہ یہ شکست خواجہ جہاں کی وجہ سے ہوئی ہے اس سبب سے اُس نے خواجہ گاواں کی صلاح سے ملو خاں دکنی کو بیدر کی حفاظت پر مامور کیا اور خود نظام شاہ کو لیکر خواجہ گاواں کے ساتھ قلعہ فیروزآباد کو چلی گئی محمود شاہ خلجی نے بیدر پہنچکر اُس کو گھیر لیا اور سولہ سترہ روز محاصرہ کرکے شہر کو فتح کر لیا۔ بیدر، بیٹر، دولت آباد اور برار وغیرہ سب اُس کے قبضہ میں آگئے۔ لوگوں کو یقین ہو گیا کہ بس اب سلطنت بہمنی کا خاتمہ ہے۔

جس وقت محمود شاہ خلجی تسخیر ملکت بہمنی کے قصد سے دکن کی طرف روانہ ہوا تھا اُس وقت مخدومہ جہاں کے مشورے سے خواجہ محمود گاواں نے سلطان محمود شاہ بادشاہ گجرات سے مدد طلب کی تھی اور لکھا تھا کہ اگر محمود شاہ خلجی اپنے ارادوں میں کامیاب ہو گیا تو دولت بہمنی کے بعد اُس کی نظر حرص گجرات پر پڑے گی آیئے ہم دونوں مل کر اُس کا مقابلہ کریں۔ محمود شاہ گجراتی بھی جانتا تھا کہ محمود شاہ خلجی نے دکن کو فتح کر لیا تو گجرات کو بھی اُس کے ہاتھ سے ایک دن روز بد دیکھنا پڑے گا۔ اس وجہ سے وہ اَسّی ہزار سوار لیکر مخدومہ جہاں کی امداد کے واسطے آیا اور نذربار میں مقیم ہوا۔ خواجہ جہاں ترک محمود شاہ خلجی کے خلاف جنگ میں مصروف تھا اس وجہ سے مخدومہ جہاں نے خواجہ گاواں کو اُس کے استقبال کے واسطے بھیجا۔ محمود شاہ گجراتی نے بیس ہزار سوار سے اس کی مدد کی اس کو دیکھ کر بیس ہزار سوار دکنی اور خواجہ گاواں کی کوشش سے جمع ہو گئے۔ محمود شاہ گجراتی اور خواجہ گاواں اپنی اپنی فوجیں لیکر محمود شاہ خلجی کے مقابلے کو روانہ ہوئے اس کے پاس کل تیس ہزار سوار تھے۔ دوسرے اُس کا ملک وہاں سے دُور تھا رسد و کمک [illegible] کی کوئی سبیل نہ تھی اور دکن پر ابھی اس کا کافی تسلط نہیں ہوا تھا ان وجوہ سے اُس نے یہی مناسب سمجھا کہ کسی طرح اس نرغے سے صحیح سلامت نکل جائے بعض اوقات بچکر بھاگ جانا بھی فتح کے برابر ہوتا ہے محمود شاہ خلجی دشمن کے پہنچنے سے پہلے ہی بیدر سے چلدیا اور براہ برار واپس جانے کے ارادے سے مانڈو کی طرف روانہ ہوا۔ خواجہ گاواں نے اُس کے خط مراجعت کو منقطع کرنے کی غرض سے دس ہزار سوار جرار و آزمودہ کار و تیز رفتار بصورت یلغار جانب برار بھیجے اور خود تیس ہزار سوار کے ساتھ بیڑ و قندھار کے جوار میں سلطان مانڈو سے برسر پیکار رہا جس کے ذریعہ سے محمود شاہ خلجی کو مدد پہنچ رہی تھی۔ اس تدبیر سے مالوے والوں کی رسد بند ہو کر ان کی نوبت بہ فاقہ پہنچی۔ محمود شاہ خلجی نے مجبور ہو کر اپنے ہاتھیوں کو اندھا کیا اور بھاری بھاری سامان و توپخانہ وغیرہ بیکار کرکے وہیں چھوڑا۔ اس طرح ہلکا پھلکا ہو کر بجائے برار کے گونڈوانہ کا رستہ لیا اور بہزار دقت و خرابی اپنے ملک میں پہنچا۔

۲۹ر جنوری سنہ ۱۴۶۳ء میں نظام شاہ کا عین شادی کی حالت میں جبکہ وہ دولھا بنا ہوا تھا یکایک انتقال ہو گیا تو اُس کا چھوٹا بھائی محمد شاہ نو سال کی عمر میں اُس کی جگہ بادشاہ ہوا۔ مخدومہ جہاں خواجہ جہاں اور خواجہ گاواں بدستور اپنا اپنا کام کرتے رہے افضل الفضلا صدر جہاں شوستری بادشاہ کا اتالیق مقرر ہوا جس نے اُس کو نہایت اعلیٰ درجہ کی تعلیم دی خواجہ گاواں نے بھی اُس کی تربیت میں بہت کوشش کی اسی وجہ سے شاہان بہمنی میں سوائے فیروز شاہ کے جو اس خاندان کا پانچواں تاجدار تھا اور کوئی بادشاہ محمد شاہ کے برابر لائق فائق نہیں ہوا۔

اسوقت خواجہ جہاں کا ہیبت و عروج تھا وہ ساری سلطنت پر حاوی ہو رہا تھا جو جی چاہتا کرتا۔ کسی کو اُس کے سامنے مجالِ مزدم نہیں تھی سب بڑے بڑے عہدے اپنے آدمیوں سے پر کر رکھے تھے خواجہ گاواں کو اپنا حریف سمجھکر ہمیشہ بیرونی و سرحدی خدمات پر مامور رکھتا تھا کہ وہ دار السلطنت سے دور ہے بعض اوقات اُس سے ایسی حرکات بھی ظہور میں آ جاتی تھیں جن سے یہ اندیشہ ہوتا تھا کہ مبادا بادشاہ کو برطرف کر کے خود تخت سلطنت کو دبا بیٹھے۔ اُس کے اِس رسوخ بے پایاں کے سبب سے اکثر ارکان حکومت اُس کے خلاف ہو گئے تھے مخدومۂ جہاں نے یہ دیکھکر کہ اُس کی بادشاہت کا خاتمہ ہوا چاہتا ہے اور اُس کے فرزند کی زندگی خطرے میں ہے نظام الملک کے مشورے سے اُس کے دفعیہ کا قصد کیا۔

ایک روز [illegible] میں خواجہ جہاں اپنے دستور کے مطابق کام کرنے کے واسطے دربار میں آیا تو دیکھا کہ خلاف معمول نظام الملک مع اپنے چند سپاہیوں کے وہاں موجود ہے یہ دیکھ کر اُس کا ماتھا ٹھنکا اور سمجھا کہ آج ضرور دال میں کچھ کالا ہے مگر اب کیا ہو سکتا تھا وقت ہاتھ سے نکل چکا تھا ناچار اپنے کار منصبی میں مصروف ہو گیا اتنے میں دو اُمرا دیکھنا بیگمات محل کے اندر سے آئیں اور بادشاہ سے کہا۔ "جو کچھ کرنا ہے جلدی کیجئے" یہ سنکر بادشاہ نے خواجہ جہاں کی طرف اشارہ کر کے نظام الملک کو حکم دیا کہ اس نمک حرام کو ابھی قتل کرو یہ غدار ہے اُس نے وہیں برسرِ دربار تلوار کے ایک وار میں اس کا کام تمام کر دیا بعد ازیں مخدومۂ جہاں نے خواجہ گاواں کو خواجہ جہاں کا خطاب دیا اور منصب امیر الامرائی پر مامور کر کے عہدۂ وکالت شاہی اس کے سپرد کیا [illegible] میں مخدومۂ جہاں نے محمد شاہ کی شادی چودہ برس کی عمر میں کر دی اور کل اختیارات اُس کے سپرد کر کے خود اُن سے دست کش ہو گئی۔

ایک شخص یوسف خاں ترک کہ خطاب عادل خاں سے ممتاز اور عہدہ بالفعدی پر سرفراز تھا اُس پر خواجہ گاواں

عہ نرسلدار دلی ماہ ۲ اسکی اصلیت کے متعلق مختلف روایتیں ہیں جنمیں سے ایک یہ ہے کہ وہ سلاطین عثمانیہ کے خاندان سے تھا [illegible] میں پیدا ہوا تھا [illegible] میں یوسف کے باپ سلطان مراد کا انتقال ہوا تو اس کی جگہ اُس کا بڑا لڑکا سلطان محمد تخت نشین ہوا جو یوسف کا سوتیلا بھائی تھا سلطان محمد نے اس خیال سے کہ کوئی دعویدار سلطنت باقی نہ رہے یوسف کے قتل کا حکم دیدیا اس وقت یوسف کی عمر سات برس کی تھی۔ وہ جلاد اس ننھی سی جان کے جان لینے کے واسطے محلسرائے شاہی میں آئے یوسف کی ماں نے جلادوں سے کہا کہ آج اپنے ارادے کو ملتوی رکھو کل پورا کر لینا اور اُنکو کچھ دلا کر رضامند کر لیا رات کو بادشاہ بیگم نے خواجہ علاؤالدین گرجستانی کو جو ایک ایرانی تاجر تھا اور ان ایام میں [illegible] آیا ہوا تھا خفیہ طور پر بلوایا یہ شخص بردہ فروشی بھی کرتا تھا بادشاہ بیگم نے اُس سے ایک غلام گرجستانی خریدا جو یوسف کا ہم عمر تھا اور اتفاقاً اُس کی صورت سے [illegible] تھا تاجر کو بہت سا روپیہ دے کر یوسف کو اُس کے حوالے کیا اور کہا کہ اس کو اپنے غلاموں میں ملا کر لے جاؤ اور اچھی طرح پرورش کرو میں تم کو اس کا معاوضہ [illegible] دوں گی سوداگر یوسف کو اپنے غلاموں میں شامل کر کے لے گیا اس طرح غلام بنکر یوسف اپنے بھائی کے ہاتھ سے بچ نکلا۔ اور ان لوگوں نے یوسف کی جگہ اُس گرجی غلام کا کام تمام کر دیا خواجہ علاؤالدین تاجر یوسف کو لیکر اپنے وطن میں آیا یہاں بہت اچھی طرح اس کی تعلیم و تربیت کی یوسف کی ماں اسکو ہمیشہ خرچ بھیجا کرتی اور سوغاتیں بھیجتی رہتی تھی جب یوسف کچھ جوان ہوا اور ساوہ میں جہاں تاجر رہتا تھا لوگوں کو اُس کی اصلیت کا علم ہونے لگا تو وہ [illegible] میں اُس تاجر کے ساتھ ہندوستان آیا اور خواجہ گاواں سے جس سے اس کی شناسائی تھی یوسف کا سارا حال کہا کہ اُس کو آپ کی خدمت میں پیش کیا خواجہ گاواں نے اُس کو غلام شاہی میں داخل کرا دیا اور ہمیشہ اُس کی مدد کرتا رہا یوسف بھی اُس کا فرماں بردار و خدمت گذار رہا خواجہ گاواں نے اُس کو اپنا متبنٰی کر لیا اور اُس کی عنایت و مہربانی سے یوسف ترقی کرتے کرتے صوبہ دولت آباد کا صوبہ دار ہو گیا بادشاہ بھی خواجہ گاواں کی وجہ سے اس پر بہت مہربانی کرتا تھا محمد شاہ نے اس کو عادل خاں کا خطاب دیا تھا خواجہ کی وفات کے بعد (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ)

اس قدر مہربان تھا کہ اُس نے یوسف خاں کو اپنا بیٹا بنا لیا تھا جب ۸۸۶ھ میں یوسف عادل خاں قلعہ کھرلہ کی فتح سے واپس آیا جو محمود شاہ خلجی بادشاہ مالوہ کی مملکت میں تھا تو بادشاہ اُس سے بہت خوش ہوا۔ خواجہ گاواں نے بادشاہ کو خوش دیکھ کر دربار میں یوسف عادل خاں کو ملک حسن نظام الملک بحری سے بالاتر مقام پر جگہ دی۔ ملک حسن کو یہ بات بہت ناگوار معلوم ہوئی مگر اُس وقت کچھ کہنے کا موقع نہیں تھا خون کا سا گھونٹ پی کر خاموش ہو رہا اور خواجہ گاواں کی طرف سے اُس کے دل میں دشمنی پیدا ہو گئی۔ اس وقت سلطنت بہمنی میں دو فریق تھے ایک ملکیوں کا دوسرا غیر ملکیوں کا۔ گروہ ملکی میں دکھنی اور حبشی تھے یہ حبشی عرصہ دراز سے دکن میں رہتے تھے یہاں کئی پشتیں ان کی گزر چکی تھیں اور دکھنیوں کے ساتھ مخلوط ہو گئے تھے فریق غیر ملکی میں ترک ایرانی اور عرب وغیرہ تھے دونوں میں باہم مخالفت تھی مگر جماعت ملکی عداوت میں زیادہ شدید تھی کیونکہ وہ اپنے آپ کو دکن کی دولت کا اصلی حقدار سمجھتی تھی ملکیوں کا سرغنہ ملک حسن نظام الملک بحری اور غیر ملکیوں کا خواجہ گاواں تھا۔ یہ ملکی و غیر ملکی کا مناقشہ دکن میں سلطنت بہمنی کے زمانہ سے چلا آتا ہے جو اب بھی موجود ہے۔

۸۸۸ھ میں راے اُڑیا فوت ہو گیا اُس کی سلطنت کی بابت اُس کے پسر متبنیٰ منگل راے اور برادر عمزاد ہمبر راے کے درمیان جھگڑا ہوا منگل راے نے تخت نشین ہو کر ہمبر کو ملک سے بھگا دیا اُس نے محمد شاہ سے استدعا کی کہ اگر میرا ملک موروثی مجکو دلا دیا جائے تو میں ہمیشہ دولت بہمنی کا مطیع رہ کر باقاعدہ خراج ادا کرتا رہوں گا۔ بادشاہ نے خواجہ گاواں سے مشورہ کرکے اُس کی صلاح کے موافق ملک حسن بحری کو نظام الملک کا خطاب دیکر ہمبر کی امداد کے واسطے

---

(بقیہ حاشیہ ماقبل) اُس کی جگہ بیجاپور کا سرلشکر یعنی طرفدار مقرر ہوا اور محمد شاہ کے انتقال کے بعد جب سلطنت بہمنی کمزور ہو گئی تو یوسف عادل خاں نے ۸۹۵ھ میں عادل شاہ کا خطاب اختیار کرکے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا اُس کے خطاب عادل شاہ کے سبب سے اس کی حکومت سلطنت عادل شاہی کے نام سے مشہور رہی ۱۲

عہ ملک حسن نظام الملک بحری کی اصلیت یہ ہے کہ وہ ایک برہمن کا لڑکا تھا اُس کا نام تیما بھٹ اور اس کے باپ کا نام بہریو تھا اس کا دادا موضع پاتری میں پٹواری تھا جو ملک برار میں دریائے گوداوری کے قریب ہے جب برار میں قحط پڑا تو اس کا خاندان وہاں سے ترک سکونت کرکے بیجانگر میں آباد ہو گیا ۸۲۶ھ میں سلطنت بہمنی کے نویں بادشاہ سلطان احمد شاہ اول نے بیجانگر کے راجہ دیو راے پر چڑھائی کی اور اس کو شکست دی تو گرفتاران جنگ کے زمرے میں تیما بھٹ بھی جو اس وقت کم عمر تھا بادشاہ کے سامنے پیش ہوا بادشاہ نے اُس کے حلیے سے معلوم کیا کہ وہ ہونہار ہے اور غلامان شاہی میں داخل کرکے ملک حسن نام رکھا شہزادوں کے ساتھ اس کی تعلیم و تربیت ہونے لگی محمد شاہ کے بچپن کے زمانہ میں ملک حسن زیادہ تر اس کے پاس رہتا تھا اور وہ اس کے باپ بہریو کے نام کی مناسبت سے اُس کو بحری کہتا تھا اس وجہ سے اس کا نام بحری مشہور ہو گیا تھا جب محمد شاہ اپنے بھائی نظام شاہ کے بعد بادشاہ ہوا اور جوان ہو کر سلطنت کا کاروبار انجام دینے لگا تو ملک حسن بحری کو لفظ بحری کی مناسبت سے اپنے خاص بحری (پرندشکاری) کا نگران مقرر کرکے عہدہ توشس بیگی (میر شکار) پر مامور کیا۔ اس عہدہ کے سبب سے ملک حسن سیر و شکار وغیرہ میں بادشاہ کے ساتھ رہتا تھا اُس کا تقرب بادشاہ کے ساتھ بہت زیادہ ہو گیا بادشاہ نے ملک حسن کی خدمات سے خوش ہو کر اس کو منصب ہزاری پر سرفراز کیا اور نقارہ و ماہی مراتب عطا کرکے اُس کی عزت افزائی کی اسی طرح ترقی کرتے کرتے ملک حسن خطاب نظام الملک سے سرفراز ہو کر سلطنت کا ایک بارسوخ امیر اور وزیر بن گیا ۱۲

...داد کیا۔ ملک حسن نے منگل رائے کو شکست دیکر بہیر کو اس کی جگہ راستے اڑیا بنایا۔ پھر راجمندری و کونڈبیر کو فتح کیا اور بہت سا مال غنیمت لیکر واپس آیا خواجہ گاواں نے سفارش کرکے اس کو بادشاہ سے خلعت[1] خاصہ دلایا اور تلنگانہ کا سرلشکر مقرر کرا دیا جب ملک حسن تلنگانہ پہنچا تو اُس نے اپنے علاقہ میں سوائے ملکیوں کے اور کسیکو جاگیردار نہ رکھا خواجہ گاواں کو اُس کی طرف سے آثار مخالفت معلوم ہوئے تو وہ ہمیشہ اُس سے ہوشیار رہنے لگا اور ملک حسن کے بیٹے ملک احمد کو جو تلنگانہ میں جاگیردار تھا تلنگانہ سے تبدیل کرکے بادشاہ سے کسی دوسری جگہ جاگیر دلوادی مگر ملک حسن نے محمد شاہ سے عرض معروض کرکے ملک احمد کو پھر اپنے ماتحت کرا لیا۔

محمود شاہ خلجی کے حملے کے وقت ۸۶۶ھ میں ایک مرہٹہ سردار نے سلطنت بہمنی کے قلعہ ہائے دیراکھیڑا وانتور پر قبضہ کر لیا تھا محمد شاہ بادشاہ نے یوسف عادلخاں کو دولت آباد کا سرلشکر مقرر کرکے حکم دیا کہ یہ دونوں قلعے واپس لیے جائیں۔ یوسف عادلخاں نے جنگ رائے مرہٹہ والے دیراکھیڑا سے جنگ کرکے اس کو شکست دی اور دیراکھیڑا وانتور کو فتح کرکے ان پر قبضہ کرلیا۔ اسی سلسلے میں راجہ لانجی سے بھی جنگ ہوئی اُس کو بھی شکست دی اور اس کا ملک بوعدۂ ادائے خراج اُسی کو واپس دیدیا گیا۔

ان جنگوں سے فارغ ہوکر یوسف عادلخاں بہت سے مال غنیمت کے ساتھ بیدر واپس آیا تو بادشاہ اُس سے بہت خوش ہوا اور کہا کہ جس شخص کا باپ خواجہ گاواں جیسا مرد شائستہ ہو اس سے ایسی ہی خدمات بالشّائستہ ظہور پذیر ہونی چاہئیں پھر خواجہ گاواں سے مخاطب ہوکر کہا یوسف عادل خاں کو ہماری طرف سے ایک ہفتہ اپنے پاس مہمان رکھو۔ خواجہ گاواں نے زمین خدمت کو بوسہ دے کر عرض کیا کہ یہ بات بغیر حضور کی شرکت کے ممکن نہیں ہے بادشاہ نے کہا کہ ضیافت مشترک میں کچھ لطف نہیں ہے۔ اول یوسف عادل خاں کی دعوت کرو۔ بعد ازاں ہمکو اپنے گھر لیجا کر ایک ہفتہ ہماری دعوت کرنا۔ خواجہ گاواں نے زمین اخلاص پر سر رکھکر بادشاہ کو دعا دی اور یوسف عادل خاں کو اپنے گھر لیجا کر اس کی دعوت کی اور اس کی مدد سے بادشاہ کی مہمانداری کا سامان کیا۔ اور اپنے مکان کو ایسا آراستہ کیا کہ وہ رشک نگار خانہ چین بن گیا پھر بادشاہ کو اپنے گھر لاکر آٹھ روز مہمان رکھا۔ اُس کی ضیافت میں بے انتہا تکلف کیا اور اُس کی خدمت میں ایسی بیش قیمت نذر گزرانی جس میں ہفت اقلیم کے بے بہا تحفے شامل تھے ایسے کہ اس سے قبل کبھی کسی نے دکن میں نہیں دیکھے تھے منجملہ اُسکے پچاس طبق طلائی معہ سرپوش مرصع کے اتنے بڑے بڑے تھے کہ ہرایک میں ایک مسلّم گوسپند بریاں آجاے، سو ظروف چینی ایسے نایاب کہ بادشاہوں کے ہاں بھی نہ نکلیں سو غلام چرکسی و حبشی و دکھنی کہ اکثر ان میں سے ماہر علم موسیقی اور تعلیم یافتہ تھے۔ سو گھوڑے عربی و تازی و عراقی مزید براں اپنے جملہ نقد و جنس اور سامان کی فہرست بادشاہ کی خدمت میں پیش کرکے عرض کیا کہ یہ سب کچھ حضور کی بدولت ہے اور حضور کا ہی ہے۔ جس کو حکم ہو اُس کو دیدوں بادشاہ نے اُس کے خلوص اور حسن خلق سے خوش ہوکر کہا کہ یہ سب ہم نے قبول کیا اور پھر تم کو ہی بخشدیا۔ آخری دن سب شاہزادگان و امرا و اراکین کو بھی اُن کے حسب حیثیت اپنے اچھے ہدیئے دیئے اس کے بعد بادشاہ کی نظر میں خواجہ گاواں کی عزت

[1] سلطنت بہمنی میں چار صوبے تھے ہر صوبہ پر ایک صوبیدار مقرر تھا خلعت صرف صوبیدار کو یا اُس سے بڑے درجہ کے آدمی کو ملتا تھا اور بہت معزز خیال کیا جاتا تھا۔

حد سے زیادہ ہوگئی جس کی وجہ سے دکھنیوں کا فریق اُس سے بے حد حسد کرنے لگا۔

۱۴۶۹ء میں محمد شاہ نے ولایات جنیر، چاکنہ، دابل، بائیں اور چیول وغیرہ کا لشکر فراہم کیا اور خواجہ گاواں کو اس کی سپہ سالاری پر مقرر کر کے کوکن[1] کی تسخیر، ملک التجار خلف حسن بصری کا انتقام[2] لینے اور بحری ڈاکوؤں کا استیصال کرنے کی غرض سے مامور کیا جو سمندر میں لوٹ مار کر کے حاجیوں اور سوداگروں کو نقصان پہنچایا کرتے تھے ایک اٹیلین مورخ مسمی پلنی نے لکھا ہے کہ اہل روما کی تجارت مشرق ہند اُن کے ہاتھ سے خطرہ میں رہتی تھی۔

جب رایان کوکن نے خواجہ گاواں کے آنے کی خبر سُنی تو باہم اتحاد کر کے اُس سے جنگ کرنے کا قصد کیا۔ راجہ کھیلنا اور راجہ سنگیسر نے آگے بڑھ کر گھاٹ یعنی اُس درے کو مسدود کر دیا جس میں سے گذر کر ملک کوکن کو رستہ جاتا ہے مگر خواجہ گاواں نے کوشش کر کے اُس پر قبضہ کر لیا لیکن وہاں کا گنجان جنگل اور پہاڑی علاقہ ایسا دشوار گذار ہے کہ سواروں کی فوج اُس میں بالکل کام نہیں دے سکتی چنانچہ مسٹر گرانٹ ڈف مولف تاریخ مرہٹا نے لکھا ہے کہ اس سرزمین کی قدرتی ساخت نے اُس کو فوج کے واسطے ایسا ناقابل گذر بنا دیا ہے کہ اس باب میں دنیا کی کوئی جگہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ خواجہ گاواں نے صرف پیادوں کی فوج اپنے پاس رکھی اور سواروں کو بیکار سمجھ کر بیدر کو واپس کر دیا۔

سعید خاں گیلانی نے وزیر الدین علی کو جو اُس کے رشتہ دار تھے لشکر جنیر و دابل پر اور اپنے غلام خوش قدم کو لشکر کلبرگہ پر سردار مقرر کیا۔ قلعہ کھیلنا کا محاصرہ کر کے اس کے گرد و نواح کے جنگل کو کاٹ کر اور جلا جلا صاف کر دیا۔ پانچ مہینے تک محاصرہ کو جاری رکھا۔ محصورین تنگ آگئے اگر چند روز اور محاصرہ قائم رہتا تو قلعہ مفتوح ہو جاتا۔ مگر برسات شروع ہوگئی۔ اِن پہاڑوں میں بارش کا موسم بہت تکلیف دہ ہوتا ہے خواجہ گاواں کو مجبوراً محاصرہ اُٹھانا پڑا اور وہاں سے ہٹ کر کولاپور چلا آیا۔ مگر اس خیال سے کہ دشمن تعاقب نہ کرے، درے کے منہ پر دس ہزار فوج تعینات کر دی برسات کے ختم ہونے کے بعد پھر کھیلنا پہنچا اور بسعی بلیغ اُس کو فتح کر لیا مگر اس میں اتنا وقت لگا کہ پھر موسم برشکال آگیا۔ خواجہ گاواں نے ایک معقول تعداد فوج دکھنی کی جو وہاں کے موسم کی سختی برداشت کر سکتی تھی ممالک مفتوحہ کے ضبط اور انتظام کے واسطے وہیں چھوڑی اور خود پہاڑ سے نیچے آکر برسات گزاری۔ اب کے بارش کے اختتام پر سنگیسر جا کر اُس کو فتح کیا اور خلف حسن بصری کا اچھی طرح انتقام لیا اس کے بعد بندر گوا[3] کا رُخ کیا جو اس وقت سلطنت بیجا نگر کے قبضہ میں تھا۔ خواجہ گاواں نے ایک بیڑا

---

[1] دکن کے مشرق و مغرب میں دونوں طرف شمالاً جنوباً لمبے لمبے سلسلہ ہائے کوہ ہیں جو سمندر سے ملے ہوئے عین ساحل پر واقع نہیں ہیں بلکہ اُنکے اور سمندر کے درمیان زمین ہے جو مشرقی ساحل پر جو زمین ہے وہ کرناٹک کے نام سے موسوم اور قریباً تین سو میل چوڑی ہے اور مغربی ساحل کی جو زمین ہے وہ کوکن کہلاتی ہے اور قریباً چالیس میل چوڑی ہے ان پہاڑوں میں درے ہیں جن میں سے کرناٹک اور کوکن کو رستہ جاتا ہے اس سبب سے یہ پہاڑ مشرقی گھاٹ و مغربی گھاٹ کے نام سے مشہور ہیں۔

[2] محمد شاہ کے دادا سلطان علاؤالدین شاہ ثانی نے ۸۵۸ھ میں خلف حسن بصری کو تسخیر کوکن کے واسطے مامور کیا تھا اُس نے وہاں پہنچکر ایک مرہٹا مختار کو جس کا نام سرکنہ تھا شکست دے کر گرفتار کر لیا۔ وہ اس کو دھوکہ دیکر راجہ سنگیسر کے علاقہ میں لے گیا اور ایک گھنے جنگل میں اُس کو لیجا کر پھنسا دیا کہ وہاں سے اُسکو نکلنا دشوار ہوگیا۔ پھر راجہ سنگیسر کو اس کی آمد کی اطلاع کر دی جس نے چپکے سے رات کو آ کر اُس کو معہ اُس کے ہمراہیوں کے قتل کر ڈالا۔

[3] دکن کے مغربی ساحل پر ایک مشہور بندرگاہ ہے جو آجکل اہل پرتگال کے قبضہ میں ہے ۱۲

جس میں ایک سو بیس جہاز تھے سمندر کی طرف سے حملہ کرنے کے واسطے بھیجا اور خود خشکی کی طرف سے حملہ آور ہوا اور قبل اس کے کہ بیجانگر سے کوئی مدافعت کے واسطے آسکے اس کو فتح کر لیا اور بحری ڈاکوؤں کا ایسا انسداد کیا کہ انہیں سر اٹھانے کی طاقت نہ رہی۔

خواجہ گاواں نے ملک کوکن کو تمام و کمال مسخر کر کے وہاں اچھی طرح تسلط بٹھا لیا تو تین سال کے بعد خزائن و غنائم سے خوب لدپھند کر بیدر واپس آیا۔ محمد شاہ نے اس کی بہت تعظیم و تکریم کی۔ اس کے غلام خوش قدم کو خطاب کشور خاں سے سرفراز کر کے گوندواں، کولاپور اور قلعہ گوا اس کی جاگیر میں دیا۔ زین الدین علی، سعید خاں گیلانی اور دیگر سرداران فوج کو جو اس مہم میں اس کے ساتھ گئے تھے بڑی بڑی جاگیریں عطا کیں اور خواجہ گاواں کی مزید عزت افزائی کی غرض سے بادشاہ مع اپنی والدہ مخدومہ جہاں کے اس کے گھر جا کر ایک ہفتہ مہمان رہا اور خلعت خاصہ اس کو عنایت کیا۔ مخدومہ جہاں نے اس کو اپنا بھائی بنایا۔ خواجہ گاواں کے خطاب میں اضافہ کر کے حکم دیا کہ آئندہ سے خواجہ کا نام کاغذات سرکاری میں اس طرح لکھا جایا کرے۔ حضرت مجلس کریم، سید عظیم، ہمایون اعظم، صاحب السیف والقلم، مخدوم جہانیاں، معتمد درگاہ شاہان، آصف نشان، امیر الامرا، ملک نائب مخدوم ملک التجار محمود گاواں المخاطب بہ خواجہ جہاں۔

ایک ہفتہ کے بعد جب بادشاہ واپس گیا تو خواجہ گاواں نے اپنے خلوت خانے میں جا کر پوشاک فاخرہ و نفیس اتار ڈالی اور زمین پر سجدے میں گر کر نہایت عاجزی کے ساتھ گریہ و زاری کی۔ اتنا رویا کہ ہچکی بندھ گئی، زمین آنسوؤں سے تر ہو گئی اور آنکھیں سوج گئیں۔ پھر کمرے میں سے بہ لباس درویشانہ باہر نکلا۔ اور بیدر کے علماء و فضلاء و فقراء و سادات کو طلب کر کے اپنا کل ساز و سامان، سب نقد و جنس جملہ زر و جواہر سوائے کتب خانہ و اسپ و فیل وغیرہ لوازمہ امارت کے ان کو تقسیم کر دیا اور کہا الحمد للہ اب نفس سرکش کے ہاتھ نجات ملی اور اس کے وسوسہ سے رہائی پائی۔ علماء میں سے ایک شخص ملا شمس الدین محمد نے جو جرجان کا رہنے والا اور خواجہ کا مصاحب تھا خواجہ سے پوچھا کہ اس میں کیا مصلحت ہے کہ آپ نے اپنا سب کچھ دے دیا مگر کتابیں اور ہاتھی گھوڑے وغیرہ رکھ لئے۔ اس نے جواب دیا کہ مخدومہ جہاں نے مجھے اپنا بھائی بنایا اور سلطان نے میری اتنی عزت افزائی کی کہ میرا نفس مغرور ہو کر مجھ سے سرکشی کرنے لگا۔ اس قدر رعونت اور خود پسندی میرے دماغ میں سمائی کہ اس کے ہجوم سے میں پریشان ہو گیا اور اپنے نفس سے متوجہ ہو کر اس کو زجر و توبیخ کرنے لگا۔ سلطان سے بات کرنی بند کر دی جس نے میری بے چینی کو دیکھ کر پوچھا کیا حال ہے۔ میں نے کہا درد دل و خفقان معلوم ہوتا ہے۔ اس نے اس کو عارضۂ جسمانی سمجھ کر مجھ کو آرام کرنے کی ہدایت کی اور اپنے محل سرائے کو چلا گیا۔ اس وجہ سے میں نے جمیع اسباب تجمل کو کہ سبب عجب و غرور ہے علیحدہ کر دیا۔ مگر کتابیں اس وجہ سے نہیں دیں کہ وہ طالبان علوم کے واسطے وقف ہیں جو میرے مدرسہ میں پڑھتے ہیں۔ یہ میری ملکیت نہیں ہیں۔ اسپ و فیل وغیرہ سامان ریاست بادشاہ کا ہے چند روز کے واسطے عاریۃً میرے پاس ہے پھر اسی کی سرکار میں چلا جائیگا۔ اس کے بعد خواجہ نے کبھی قیمتی اور پر تکلف لباس نہیں پہنا ہمیشہ معمولی اور سادے کپڑے پہنتا رہا۔

[illegible] میں بیجانگر کے راجہ اچت رائے نے بندر گوا کو جسے خواجہ گاواں نے تسخیر کوکن کے وقت فتح کیا تھا واپس لینے کا قصد کیا اور اس کی سازش سے بلگام کے راجہ پرکیتہ رائے نے گوا پر چڑھائی کی راجہ بیجانگر حاکم بنکاپور کو بہت سی فوج دیکر اسکی مدد کو بھیجا محمد شاہ خود مع خواجہ گاواں کے راجہ بلگام کی مدافعت کو روانہ ہوا۔ جب بادشاہی لشکر بلگام پہنچا تو پرکیتہ رائے خود میں طاقت مقاومت نہ دیکھ کر قلعہ میں محصور ہوگیا جو چونے اور پتھر کا بہت مضبوط بنا ہوا تھا اس کے گرد خندق عمیق اور پر آب اور دوہری فصیل تھی کہ اڑہائی ہفت چند ستھے بادشاہ نے لشکر کے نقابوں کو حکم دیا کہ اگر اپنی سلامتی چاہتے ہو تو دو ہفتہ کے اندر قلعہ کے بروج و فصیل کو گرا کر فوج کے اندر جانیکا رستہ پیدا کرو اور خواجہ گاواں سے کہا کہ کھائی کا بھرنا تمہارا کام ہے جس وقت دیوار گرے خندق پٹ چکی تاکہ لشکر بلا تاخیر و توقف قلعہ کے اندر داخل ہوسکے خواجہ گاواں دن بھر پتھر مٹی اور لکڑیاں ڈلوا کر اس کو پاٹنے کی کوشش کرتا مگر قلعہ والے رات کو سب نکال کر لیجاتے آخر کار خواجہ گاواں نے ایک پوا اس طرح بنوائی کہ اہل قلعہ خندق تک نہ پہونچ سکیں اور نقب کار وں کو حکم دیا کہ خندق کے نیچے سے دیوار قلعہ تک نقب لگائیں جب نقب لگائی جا چکی تو حسب الحکم خواجہ گاواں فصیل میں سرنگ لگا کر اس کو بارود سے مملو کر دیا گیا۔ اس عرصہ میں خندق بھی پُر ہو چکی تھی یہ پہلا ہی موقعہ تھا کہ دکن میں سرنگ سے کام لیا گیا۔ اس سے قبل وہاں کوئی اس کو جانتا ہی نہیں تھا جب سب انتظام مکمل ہو چکے تو محمد شاہ کو اطلاع دی گئی۔ فوج حملے کے واسطے تیار ہو کر اُس مقام پر جمع ہوئی جہاں کھائی پاٹی گئی تھی اور بادشاہ بھی آیا سرنگ کے شتابے میں آگ لگائی گئی۔ آناً فاناً ایک سخت دھماکے ساتھ کئی گز لمبی دیوار گر پڑی۔ خندق کے پر آب ہونے کے سبب سے راجہ کو یہ خیال تھا کہ نقب حصار تک نہیں پہونچ سکتی اس وجہ سے وہ مطمئن تھا جب فصیل میں ایک بڑا اشکاف نظر آیا تو پہلے اہل قلعہ پریشان ہوئے مگر پھر ہمت کر کے سب اُس رخنہ کے سامنے آکر سینہ سپر ہوگئے محمد شاہ نے حصار کا بیرونی حصہ فتح کر لیا اتنے میں ایک آدمی بہ لباس معمولی قلعہ میں سے نکل کر محمد شاہ کے لشکر میں آیا اور کہا کہ میں پرکیتہ رائے کا ایلچی ہوں اس نے مجھے کچھ پیغام دیکر بھیجا ہے جو میں خود بادشاہ سے کہونگا جب بادشاہ کی خدمت میں باریاب ہوا تو جبین نیاز کو زمین پر رکھکر اور دستار کو گردن میں ڈال کر دست بستہ عرض کیا کہ میں ہی پرکیتہ ہوں اپنے قصور کی معافی کو حاضر خدمت ہوا ہوں اب خواہ حضور چھوڑیں خواہ ماریں۔ زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو۔ بادشاہ نے اُس کو امان دی اور اپنے امراء میں شامل کر لیا قلعہ بلگام خواجہ گاواں کی جاگیر میں دیدیا گیا۔ اس کے بعد محمد شاہ کی مہربانی خواجہ گاواں پر اور بھی زیادہ ہوگئی۔ بادشاہ واپسی میں چند روز بیجاپور میں مقیم رہا جو خواجہ گاواں کی جاگیر میں تھا۔ اور وہاں اُس کا مہمان رہا۔ خواجہ گاواں نے یہاں ایک باغ بنوایا تھا جس میں درخت اونچے اونچے اور گھنے اس کثرت سے تھے جو اوپر جا کر آپس میں مل گئے تھے اُن کے نیچے ایک صاف ستھرا قطعہ زمین تھا سایہ ایسا گہرا تھا کہ کہیں آفتاب کی ایک شعاع بھی نہیں پڑتی تھی اسی وجہ سے وہ کالے باغ کے نام سے مشہور تھا بادشاہ نے اس باغ کو بہت پسند کیا جب تک بیجاپور میں ٹھیرا دن کا بیشتر حصہ اس میں گذارا۔

---

باقی باقی

# منحوس گھڑی

## از ایوان ٹرجینف۔ مترجمہ جناب تنویر قریشی

(۱)

دوستو! لو اب میں تمہاری خواہش کے موافق تمہیں اپنی اوائل زندگی کا ایک واقعہ سناتا ہوں جو ممکن ہے تمہیں عجیب و غریب معلوم ہو۔ مگر اس کی صداقت میں کسی قسم کا شبہ نہیں کیا جا سکتا۔

ہمارا خاندان کُل چار افراد پر مشتمل تھا۔ پھوپھی، والد، میں اور عمزاد بھائی۔ والدہ کا مجھے خیال نہیں۔ وہ میرے ہوش سنبھالنے سے قبل دنیا سے رخصت ہو چکی تھیں۔ میرے والد پر اُن کی بڑی وفات کا... میں اکلوتا لڑکا تھا۔ وہ ایک ناسیانہ انداز کے دبلے پتلے خاموش طبیعت آدمی تھے۔ کاروباری حیثیت سے وہ قانون پیشہ تھے اور گاؤں بھر میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ہمارا قصبہ ایک تیز رو ندی کے کنارے آباد تھا جس کے پتھریلے ساحل سے چھوٹی چھوٹی موجیں ہمیشہ دست و گریباں رہتیں۔

گھر کا انتظام میری پھوپھی کے سپرد تھا۔ والد اپنی ماہانہ آمدنی اُن کے ہاتھ میں رکھ دیتے اور وہ اسی میں کفایت کر کے سارا مہینہ کسی نہ کسی طرح گزار دیتیں۔ پھوپھی جو ایک عمر رسیدہ بیوہ تھیں بڑی عابدہ اور صالحہ تھیں۔ لیکن اس کے برعکس مزاج کی بڑی تیز اور غصہ ور تھیں یہاں تک کہ والد بھی ذرا ان سے ڈرتے تھے۔ پھر کس کی مجال تھی جو ان سے آنکھ ملانے کی جرأت کرتا۔ یہی حاکمانہ عادت رفتہ رفتہ ترقی کر کے انکی طبیعت ثانی بن چکی تھی مگر ابھی تو مجھے اپنے عمزاد بھائی سے تعارف کرانا باقی ہے۔

میرے والد کے بھائی ڈیگر نامی شہر کے ایک مشہور سیاسی لیڈر تھے جنھیں ۱۸۹۰ء میں ان کی سیاسی سرگرمیوں کے عوض سائبیریا کی جلاوطنی کا حکم سنایا گیا تھا۔ ان کا لڑکا ڈیوڈ اب ہمارے ساتھ رہتا تھا۔ اس کی ماں کا بھی انتقال ہو چکا تھا۔ وہ مجھ سے تین چار سال بڑا تھا۔ لیکن اس کی مرعوب کن شخصیت سے متاثر ہو کر میں اس طرح اس کی عزت و اطاعت کرتا تھا گویا وہ میرا ہم عمر و ہم جلیس نہیں بلکہ کوئی بزرگ ہے جس کی تعظیم مجھ پر واجب و لازم ہے۔ وہ عادت ... کے اعتبار سے ایک سمجھدار اور سنجیدہ نوجوان تھا۔ اور شکل و شمائل میں نہایت حسین خوبرو اور قوی الجثہ۔ اسکے ... بال نیلی آنکھیں ستواں ناک اور موزوں ہونٹ اس کی شخصیت کو ابھارنے میں خاص طور پر مدد دیتی تھیں۔ ... نہ معلوم کس وجہ سے میری پھوپھی کبھی اُس سے خوش نہ رہتی تھیں۔ اور والد بھی اس سے زیادہ گفتگو نہ کرتے تھے۔ افواہ تھی ... میرے والد اپنے بھائی کی بروقت امداد سے پہلو تہی نہ کرتے تو ان کے جلاوطن ہونے کی نوبت ہی نہیں آتی۔

میں اور ڈیوڈ ایک ہی مدرسہ میں تعلیم پاتے تھے اور جماعت کے کل لڑکوں سے پیش پیش رہتے بلکہ میں ڈیوڈ سے ... حافظہ میں کچھ بڑھا ہوا تھا۔ میرا حافظہ بلا کا تھا۔ لیکن۔ جیسا کہ آپ سب کو تجربہ ہو چکا ہوگا۔ لڑکے صرف تعلیمی تعلق کو

خاطر میں نہیں لاتے بلکہ ایک قسم کی حسد و رشک آمیز نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ انکے نزدیک تعظیم و تکریم کا مستحق وہ سمجھا جاتا ہے جو کھیل کود اور قوت جسمانی کے مظاہروں میں سب کا لیڈر اور رہنما ہو۔

(۲)

میرا نام — اوہ میں اپنا نام ہی بتانا بھول گیا۔ مگر آپ سب جانتے ہی تو ہیں — خیر کہہ دیتا ہوں۔ میرا نام الکسی ہے۔ میں چونکہ سترہ تاریخ کو پیدا ہوا تھا۔ اس لیئے اس دن کے ولی کے نام پر میرا نام رکھا گیا۔ میرا روحانی باپ ایک شخص اناستاسی اناستاسیوچ بنا۔ لوگ اسے ناستاسی یا ناستاسیوچ کے نام سے پکارتے تھے۔ وہ ایک مکار اور چالاک شخص تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ اسے خزانہ کی ملازمت سے تغلب و تصرف کے الزام میں علیحدہ کر دیا گیا تھا۔ وہ میرے والد کے کاروبار میں شریک تھا صورت شکل کے لحاظ سے وہ ایک بھدا سا موٹا لمبا شحیم آدمی تھا۔ اسکی ناک اُلو اور چہرہ لومڑی جیسا تھا۔ اس کی آنکھیں ہمیشہ گردش میں رہتیں۔ اور بار بار ناک اس طرح چڑھاتا کہ ابرو پر شکن پڑ جاتے گویا اُسے کوئی بدبو محسوس ہو رہی ہے۔ وہ بغیر ایڑی کے جوتے پہنتا تھا اور روزانہ چہرہ اور بالوں پر پوڈر کا استعمال کرتا۔ جو ذرا تہذیب یافتہ ہونے کی علامت تھی۔ وہ گاؤں والوں کے تعجب پر اس کی توجیہ یوں کرتا کہ اپنے کاروبار کے سلسلہ میں اسے امرا اور رؤسا اور کئی جنرلوں سے ملاقات کرنی پڑتی ہے اس لئے وہ احتیاط ضرور عمل میں لایا کرتا ہے۔

ہاں۔ تو میری تیرہویں سالگرہ آپہونچی۔ اس روز ناستاسی ہمارے گھر آیا۔ اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ "میں نے اب تک تمہیں کوئی تحفہ نہیں دیا۔ الکسی۔ مگر خیر اس کی تلافی ایک بہترین تحفہ سے کرتا ہوں۔ دیکھو یہ کیسی عمدہ چیز ہے۔"

اس نے اپنی جیب سے ایک چاندی کی گھڑی نکالی جس کی پشت پر پچیکاری میں ایک خوبصورت گلاب کا پھول کھدا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ایک پتلی زنجیر بھی تھی۔ میں مارے خوشی کے جامہ کے باہر ہو گیا۔ اور پھوپھی اپنی پوری قوت سے چیخ اٹھیں "بوسہ دو بیوقوف۔ بچے۔ اپنے روحانی باپ کے ہاتھ کو بوسہ دو۔ جس نے تمہیں ایسا عمدہ تحفہ دیا۔" میں نے اظہار شکرگزاری کے طور پر بوسہ دیا۔ اور میری خالہ نے بڑبڑانا شروع کیا۔

"ناستاسی تم بچے کو بگاڑ دیتے ہو۔ ایسی عمدہ گھڑی ایک بچہ کو۔ وہ اس کی حفاظت کیسے کر سکتا ہے!" میرے والد آئے۔ گھڑی دیکھی۔ اور ناستاسی کا شکریہ ادا کیا۔ اور اسے اپنے ساتھ اپنے کمرہ مطالعہ میں لے گئے۔ جہاں سے مجھے والد کی آواز یہ کہتی سنائی دی۔

"نہیں۔ اس طرح کام نہیں چلے گا۔ جناب سنتے ہو۔۔۔۔" مگر میں نچلا نہ بیٹھ سکا میں گھڑی ہاتھ میں لئے ڈیوڈ کو دکھانے دوڑا۔

ڈیوڈ نے گھڑی لی۔ اسے کھولا۔ اور غور سے اسے دیکھنا شروع کیا۔ اس کا رجحان زیادہ تر مشنری کی طرف مائل تھا تاکہ خراب گھڑیاں اور کھلونے توڑ پھوڑ کر اس نے کچھ مہارت بھی حاصل کی تھی اور اسکے پاس کچھ اوزار بھی تھے

(۳)

ڈیوڈ نے گھڑی کا ڈھکنا بند کیا۔ پھول دیکھا۔ اور زیر لب کچھ کہنے لگا۔ وہ عادتاً باتونی نہ تھا۔ بلکہ ضرورتاً بھی کم اور آہستہ گفتگو کرتا تھا۔

"اوہ.... نہیں یہ ملی کہاں؟" اس نے پوچھا۔

میں نے ناستاسی کی جانب سے سالگرہ کے تحفہ کا حال بیان کیا۔

ڈیوڈ نے اپنی سبزی مائل چھوٹی آنکھیں میری طرف پھیریں۔

"کون ناستاسی؟ کیا ناستاسی ناستاسیوچ؟"

"ہاں۔ وہی۔"

ڈیوڈ نے گھڑی میز پر رکھدی۔ اور بغیر کچھ کہے باہر جانے لگا۔

"کیا گھڑی تمہیں پسند نہیں؟"

"کیوں نہیں؟ لیکن اگر تمہارے بجائے میں ہوتا تو ناستاسی کا کوئی تحفہ قبول نہیں کرتا۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ وہ ایک قابل نفرت انسان ہے اور ایسوں کا احسان نہ لینا چاہئے۔"

ڈیوڈ اپنے مخصوص طنزیہ انداز سے متبسم ہوا۔ یہ بھی اس کی عادت تھی کہ کبھی قہقہہ نہ لگاتا تھا۔ وہ زور سے ہنسنے کو انسانی کمزوری سے تعبیر کرتا تھا۔

ڈیوڈ کے الفاظ۔ اور اس سے بڑھکر اس کے مسکرانے سے مجھے بڑا رنج ہوا۔

"وہ دل میں مجھے حقیر جانتا ہے۔" میں نے خیال کیا۔ "اگر وہ میری جگہ ہوتا تو ناستاسی کا تحفہ نہ لیتا۔ اب میں کیا کروں؟ گھڑی واپس دیدوں؟ ناممکن!"

میں نے ڈیوڈ کو روک کر اس سے مشورہ طلب کیا۔ مگر وہ یہ کہکر خاموش ہوگیا کہ جو تمہارے جی میں آئے کرو۔

مجھے یاد ہے کہ میں رات بھر جاگتا رہا۔ مضطرب اور غیر مطمئن۔ مگر کسی فیصلہ پر نہ پہنچ سکا۔ گھڑی دیدوں — ؟ میں نے اسے تکیہ کے برابر رکھدیا تھا۔ آہ اس کی ٹک ٹک کیسی دل خوش کن تھی.... مگر صرف اس گھڑی کی وجہ سے ڈیوڈ کی نظروں میں ذلیل ہونا۔ یہ بھی مجھے گوارہ نہ تھا۔ آخر ش صبح کے قریب میں نے اپنے دل میں مصمم ارادہ کرلیا۔ اس کے بعد میں ... دیا۔ تاہم اس کے سوا چارہ نہ تھا۔ سویرے جوں ہی میری آنکھ کھلی۔ میں کوٹ پہنکر باہر نکلا۔ اور سڑک پر ٹہلنے لگا۔ میں نے ارادہ کرلیا تھا کہ سب سے پہلے جو شخص بھی مجھے نظر آئے گا اسے میں گھڑی دیدوں گا۔

(۴)

مجھے زیادہ دیر منتظر نہ رہنا پڑا۔ ایک لڑکا جس کی عمر کوئی دس بارہ سال ہوگی لنگڑاتا ہوا آرہا تھا۔ اس کے سر سے پا تک جابجا سے پھٹے اور پیوند لگے ہوئے تھے۔ وہ اکثر ہمارے گھر کے سامنے آوارہ گردی کرتا نظر آیا کرتا تھا۔ میں فوراً اس کی طرف دوڑا۔ اور جیب سے گھڑی نکال کر اس کی طرف بڑھائی۔

لڑکے نے گول گول آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ اور ڈر کر پیچھے ہٹنے لگا۔

"گھڑی لے لو!" میں نے آہستہ سے کہا۔ "اسے بیچ کر اپنی ضرورت کی چیزیں خرید لینا۔ یہ میری ذاتی ہے میری سالگرہ کا تحفہ ہے۔ اور میں بخوشی تمہیں دیتا ہوں" میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ اور گھڑی اس کے ہچکچاتے ہوئے ہاتھ میں دیکر تیزی سے گھر واپس ہوا۔ ڈیوڈ ابھی اُٹھا تھا۔ اور منہ ہاتھ دھونے سے فارغ ہو کر کپڑے پہنکر بالوں میں کنگھی کر رہا تھا۔

"ڈیوڈ! ڈیوڈ! جانتے ہو میں نے کیا کیا؟ گھڑی دیدی"۔ میں نے مطمئن مگر سرسری انداز سے کہا۔

ڈیوڈ۔ اسی طرح بال جماتا رہا۔

"ہاں۔ ایک بھکاری لڑکے کو دیدی! وہ بیچکر اپنے مفید مطلب کوئی چیز اس سے خرید سکتا ہے!"

میں رُک گیا۔ دیکھوں کہ ڈیوڈ کس حد تک میرے بیان سے متاثر ہوا ہے۔

"بہت اچھا کیا۔ خیرات بڑی اچھی چیز ہے!" اس نے پڑھائی کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ "لیکن اگر پوچھیں کہ گھڑی کہاں ہے تو؟"

"کہدونگا کہ کھو گئی!"

اس کے بعد ہمارے درمیان گھڑی کا کوئی ذکر نہوا۔ لیکن میرا دل مجھ سے کہہ رہا تھا کہ میری اس حرکت سے وہ نہ صرف خوش ہے بلکہ میری اس اخلاقی جرأت سے متعجب بھی۔

(۵)

دو دن اسی طرح گزر گئے۔ مگر گھر میں گھڑی کا کوئی ذکر نہ ہوا۔ میرے والد اپنے کاروبار میں اتنے منہمک تھے کہ انہیں اس ذرا سی چیز کی طرف توجہ دینے کی فرصت نہ تھی۔ دوسری طرف گو ڈیوڈ زبان سے کچھ نہ کہتا تھا۔ مگر میں ایسا محسوس کرتا تھا کہ وہ مجھے تعریفی نظروں سے دیکھ رہا ہے ایک دو مرتبہ اس نے تذکرۃً اشارہ کیا کہ اسے مجھ سے اس قدر جرأت کر جانے کی توقع نہ تھی۔ اس میں شک نہیں کہ کبھی کبھی جب گھڑی کی خوبصورتی یا وقت دیکھنے کی ضرورت اور اہمیت کا خیال آجاتا تو مجھے ملال ہوتا۔ اور پھر انہی دنوں میری جماعت کے ایک طالب علم ڈاکٹر کے فرزند کو اس کی دادی نے ایک گھڑی پیتل کے ڈھکنے کی تحفتاً دی تھی۔ وہ بار بار ایک غرور سے مدرسہ میں اسے جیب سے نکال کر وقت دیکھا کرتا اور شیخی بگھارتا۔

کاش میری گھڑی ہوتی۔ پھر مدرسہ کے اُستادوں میں بھی میرا جواب نہ نکل سکتا طالب علم تو کجا۔ بالآخر میں نے اس بھکاری لڑکے کی ایک دن تلاش شروع کی۔ اور وہ دوسرے آوارہ لڑکوں کے ساتھ ایک قبرستان میں کھیلتا مل گیا۔ میں نے اسے پاس بلا کر کہا کہ گھر والے مجھ پر گھڑی دیدینے کی وجہ سے خفا ہیں۔ اور اگر وہ گھڑی واپس دیدے تو بجائے اس کے میں اسے ایک روپیہ دینے کو تیار ہوں۔ کیونکہ اس سے زیادہ خود میرے پاس بھی نہیں تھا۔

مگر اس لڑکے نے روتی آواز میں جواب دیا کہ اس کے والد نے گھڑی دیکھکر اوس پر چوری کا الزام لگایا اور

اس سے چھین لی ہے۔ اور اسے مارتا رہتا ہے۔ تاکہ وہ اس شخص کا پتہ بتائے جس کے پاس سے اس نے گھڑی چرائی ہے۔

"تمہارے باپ کا نام کیا ہے؟"

"ترانی مچ"

"اور تم رہتے کہاں ہو! مجھے اپنے باپ کے پاس لے چلو۔"

میں اس کے ساتھ اس کے گھر گیا۔ وہ ایک غلیظ جھونپڑی میں رہتے تھے۔ میں نے ترانی مچ کو سب معاملہ سمجھایا جس نے اپنے بچے کے کردار سے مطمئن ہو کر پہلے تو میرے روپل کے معاوضہ سے انکار کرتے ہوئے گھڑی دے دی۔ پھر جانے کس خیال سے دور جانے کے بعد مجھے پکار کر روبل مانگا۔ اور اسے جیب میں ڈال کر ایک ڈانٹ کے ساتھ مجھے اور اپنے بچے کو گھر سے بھگا دیا۔ اور میں اسی طرح دوڑتا ہوئے گھر کی طرف روانہ ہوا۔

(۶)

میں نے گھڑی فوری جذبہ سے متاثر ہو کر حاصل تو کرلی۔ مگر پھر بھی مجھے اطمینان نہیں ہوا اسے اب ڈیوڈ کی نظر سے چھپانا ضروری تھا۔ میری اور اس کی الماری مشترک تھی۔ اور میں گھڑی اس میں رکھ نہ سکتا تھا۔ اس لئے میں کئی دن اسے الماری کے اوپر کبھی آتشدان کے پیچھے کبھی میز کے نیچے چھپا دیتا۔ لیکن اس کے باوجود میں ڈیوڈ کو دھوکہ دینے میں کامیاب نہ ہوسکا۔

ایک دن میں ڈیوڈ کی غیر حاضری میں فرش کے چوبی تختے کے نیچے سے گھڑی نکال کر اپنے فلالین کے دستانے سے اس کے نقری ڈھکنے کو صاف کر رہا تھا کہ دفعتہً وہ آگیا۔

میں ششدر رہ گیا۔ اور گھڑی میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور میرا چہرہ شرم سے سُرخ ہو گیا۔

ڈیوڈ مسکرانے لگا۔ "مجھے معلوم ہے۔ تم گھبراتے کیوں ہو، میں نے اسی دن دیکھ لیا تھا۔ جس روز تم اسے واپس لائے۔ میں رونے لگا۔ ڈیوڈ نے شانوں کو جنبش دی۔ گھڑی تمہاری ہے اور اس کی نسبت تم جو جی چاہے کر سکتے ہو میں تمہیں مجبور تو نہیں کرتا کسی کام کے لئے۔" یہ بیرحم الفاظ کہتے ہوئے وہ چلا گیا۔

آہ میں ڈیوڈ کی نظروں میں کس قدر ذلیل اور کمینہ تھا۔

اب مجھے کیا کرنا چاہئے؟

میں سوچنے لگا۔ آخر کار مجھے ایک خیال آیا اور میں نے گھڑی اپنے خدمتگار لڑکے یوشکا کو یہ کہکر دی کہ اگر وہ اسے قبول نہ کرے گا تو میں اسے پاش پاش کر کے کنوئیں میں ڈالدونگا۔

ڈیوڈ پڑھ رہا تھا میں نے اسے یہ قصہ سُنایا۔ وہ مسکرا کر کہنے لگا "گھڑی تمہاری ہے۔ اور جو تمہارا جی چاہے کرو۔" مگر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس کی نفرت میں کسی حد تک کمی ہو چکی تھی۔

ہاں ناسپاسی، میرے روحانی والد کا تحفہ میرے لئے کس قدر تشویش کا موجب بنگیا تھا۔

کئی دن گذر گئے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دن یہ خبر ہمارے گاؤں میں پہونچی کہ روس کے شہنشاہ پال کا انتقال ہو گیا ہے۔ اور اس کے بجائے الگزنڈر تخت نشین ہوا ہے اس خبر سے میرے والد اور ڈیوڈ بھی خوش ہوئے کیونکہ ایک

شہنشاہ کے بعد دوسرے بادشاہ عموماً جلاوطنوں کو واپسی کا حکم دیدیتے ہیں۔

ہمارے مدرسہ کو چھٹیاں مل گئیں۔ ڈیوڈ اور میں اب یہ حساب لگایا کرتے کہ کتنے ہفتوں اور کتنے دنوں میں چچا وکٹر آ جائینگے، انہیں کس طرح خط لکھنا چاہیئے۔ کیسے ملنے جانا چاہیئے۔ وہ ماسکو میں رہینگے۔ تو ہم دونوں بھی وہیں جا بسینگے۔ وہ غریبوں کے لئے مدرسہ بنائینگے۔ ہم بھی اسی میں پڑھیں گے۔

گھڑی کا قصہ ظاہر ہے کہ ان ضروری امور کی وجہ ہمارے ذہنوں سے بالکل محو ہو چکا تھا۔ اور علاوہ ازیں ڈیوڈ کے لئے اور کچھ نئے افکار بھی پیدا ہو چکے تھے۔ جن کا میں آئندہ ذکر کرونگا۔ مگر ہماری قسمت میں ابھی گھڑی کے کھیل کو بہت کچھ دخل تھا۔

(۷)

"ایک صبح ناشتہ سے فارغ ہو کر میں اور ڈیوڈ بڑی کھڑکی کی چوکھٹ پر بیٹھے چچا کی نسبت قیاس آرائی کر رہے تھے، باہر ماہ اپریل کا سورج گرمیاں دکھا رہا تھا کہ دفعتاً اندر سے پھوپھی اپنی تیز باریک آواز سے مجھے پکارتی ہوئی باہر آئیں "چل بیوقوف بچے جا الّو بدمعاش۔ ناستاسی نے تیری بدمعاشی کا پتہ لگایا ہے۔ فوراً چل تجھے تیرے ابا کمرے میں بلاتے ہیں"

میں پھوپھی کے پیچھے کمرے میں داخل ہوا۔ والد پریشان و مضطرب کمرے میں ٹہل رہے تھے اور ایک گوشے میں ناستاسی اپنے قابل نفرت انداز سے ناک سکوڑے ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔

"کیا تم نے اپنی گھڑی یوشکا کو دی تھی؟" والد نے مجھ پر جھک کر غصہ سے پوچھا۔ میں نے یوشکا کی طرف دیکھا جو ایک طرف دبکا کھڑا تھا۔

"ادھر دیکھ کر جواب دو" اور اس کے ساتھ ہی ایک تھپڑ سے میری تواضع ہوئی "اور تو نے اسے قبول کیسے کیا؟ اور کیا تھا تو میرے پاس کیوں نہ لایا؟ یہ بھی کیوں؟ بدمعاش لونڈے"

اور یوشکا مارے صدمہ سے رونے لگا۔

واقعہ یہ تھا کہ گھڑی ساز کی دوکان میں گھڑی دیکھ کر جہاں یوشکا نے فروخت کی تھی، ناستاسی نے اسے تعجب سے خرید لیا تھا اور والد کو لا کر دکھا دی۔

اس کے بعد والد کو کھانسی کا ایک زبردست دورہ ہوا۔ جس سے وہ کچھ عرصہ سے علیل تھے۔ "یہ شریر بیوقوف اس قابل نہیں ہے کہ گھڑی رکھ سکے۔ بھائی پرافری میں اسے اب ناستاسی سے لیکر ایسے شخص کو دونگی جسے اس کی سخت ضرورت ہے۔ اور وہ عمر بھر تمہیں دعائیں دیتا رہے گا" پھوپھی نے کہا۔

"کسے دوگی۔ ہرسانف لوکیچ کو۔ خیر جسے چاہے دو۔ بھاڑ میں جھونکو"

ہرسانف ہمارے مدرسہ کا معلم اور پھوپھی کا دوست تھا۔ کبھی کبھی پھوپھی سے ملنے یا اس کی دعوت پر چار یا شام کے کھانے میں شرکت کے لئے وہ ہمارے یہاں آجایا کرتا تھا۔ میرے اُستادوں میں وہ بدترین تھا اور مجھے اُس سے سخت خلقی نفرت تھی اور وہ بھی گاہے ماہے سبق یاد نہ کرنے پر مجھے مارا کرتا تھا۔

میری گھڑی وہ لگائیگا۔

میں ڈرائنگ روم سے نکل کر دوڑتا ہوا اپنے بستر پر گر پڑا۔ میرے گال تھپڑ کے صدمے سے نیلے ہو رہے تھے اور میرا دل تہتک کے غصہ اور انتقام کی آگ سے پھنکا جا رہا تھا

نہیں میں ہرگز ہرانعت کو گھڑی نہ لگانے دونگا!

مگر کیسے؟

آخر کار میں نے پھوپھی کے پاس سے گھڑی چرانے کی نیت کر لی۔

(۸)

خوش قسمتی سے ان دنوں ہمارا ملازم رخصت پر باہر گیا ہوا تھا۔ اور پھوپھی سوتے وقت اپنے کمرہ کو اندر سے مقفل کرنے کی عادی نہ تھیں۔ مگر سوال یہ تھا کہ گھڑی رات کو وہ کہاں رکھیں گی۔ وہ شام تک اسے اپنی جیب ہی میں رکھے رہیں۔ بلکہ ایک سے زائد مرتبہ دیکھنے کے لئے جیب سے باہر نکالا۔ مگر شب میں وہ کہاں چھپائی جائیگی۔

ڈھونڈھ نکالنا ہی تو میرا اصلی کام تھا۔

اس ہونے والے جرم کے خیال پر خوشی خوف اور دلیری سے میرا دل بھر جاتا اور فرط جوش سے میں کانپنے لگتا۔ اور میری پیشانی پر بل پڑ جاتے۔ اس وقت میں خطرناک بن رہا تھا۔۔۔ میں ڈیوڈ سے دور دور رہا۔ اسے اس کا شبہ تک نہ ہونے دینا چاہتے۔۔۔ میں تنہا کام کروں گا اور میں اکیلا ہی اس کی پاداش میں جوابدہ ہونگا!

آہستہ آہستہ سورج غروب ہوتا گیا۔ اور شام کے بعد آخرش رات آ ہی گئی۔ رات کے کھانے پر والد جو اپنی سختی اور سرزنش پر منفعل نظر آتے تھے۔ میرے ساتھ بہت مہربانی سے پیش آئے لیکن میں خاموش رہا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ میرے جذبات مجھ پر غالب ہو کر میرے عزم کی جھلک نہ دکھا دیں۔ دوسرے کہیں انکی مہربانیوں سے میرے انتقام کی آگ ٹھنڈی نہ ہو جائے۔

میں بہت جلد سونے چلا گیا۔ اور بستر پر آنکھیں بند کئے لیٹا رہا۔ تاکہ دیکھنے والے مجھے سوتا سمجھیں۔ اور کسی کو میرے ارادہ کا علم نہ ہو۔ خلاف امید اس روز بڑی رات گئے تک گھر کے لوگ جاگتے رہے اور سڑک پر سے گاڑیاں اور رہ رہ شور کرتے ہوئے گذرتے رہے۔ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ رات بھر یہ لوگ یوں ہی جاگتے رہیں گے۔

آخر کار مکان پر سکوت طاری ہوا۔ میں اٹھنے ہی والا تھا کہ کچھ آواز آئی اور پھر میں لیٹ گیا۔ پھر سکوت چھا گیا۔ میں نے رضائی الٹ دی۔ اور ننگے پاؤں فرش پر کھڑا ہو گیا۔۔۔ ایک قدم۔۔ دوسرا۔۔۔ میں دبے پاؤں بڑھتا گیا۔ کمرہ طعام سے گزر کر آخر میں پھوپھی کے شب خوابی کے کمرے کے پاس پہنچا۔ دروازہ کھولنے میں آہٹ ہوئی مگر کوئی بیدار نہ ہوا۔ کونے میں مجسمۂ مقدس کے آگے ایک چھوٹا چراغ جل رہا تھا۔ پھوپھی دروازے کی طرف منہ کئے کنٹوپ اوڑھے خراٹے لے رہی تھیں۔ بازو کی میز پر پھوپھی کے سونے کے وقت کی دوا کا شیشہ اور پانی کے گلاس کے درمیان گھڑی رکھی تھی۔

ایک منٹ بعد میں اپنے کمرہ میں تھا۔ پسینہ میں شرابور، مگر مسرور۔ میں نے ڈیوڈ کو جگایا۔ اور پورا قصہ کہہ سنایا۔

ہم دونوں اپنے کوٹ میں ملبوس ہوئے اور بائیں باغ کی طرف چلے۔ ایک اونچے سیب کے درخت کے نیچے ایک گہرے گڑھے میں گھڑی کو دفن کردیا گیا۔ جو ڈیوڈ کے بڑے چاقو کی مدد سے نرم زمین میں کھودا گیا تھا۔ میرے سوتیلے باپ کا نفرت زدہ تحفہ ہمیشہ کے لئے چھپا دیا گیا تھا۔ ہم نے گڑھے میں مٹی بھردی۔ اوپر کچھ کوڑا کرکٹ ڈال دیا اور مسرور و مفتخر۔ سب کی نظروں سے پوشیدہ پھر مکان میں داخل ہوئے اور کوٹ اتار کر پلنگ پر دراز ہوئے اور سوگئے — آہ کیسی گہری اور مسرت بخش نیند!

(۹)

دوسرے روز صبح "مدد۔ مدد۔ چور" کی چیخوں کے ساتھ ہماری آنکھ کھلی۔ ہم دوڑ کر پھوپھی کے کمرے میں داخل ہوئے۔ "گھڑی یہاں میز پر تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور اب غائب ہے۔ آخر اسے کس نے لیا — میرے کمرے سے"۔ وہ چلا چلا کر ہر شخص کو پریشان کر رہی تھی۔ ہم کو اس کی امید ہی تھی اور اس کے لئے تیار بھی تھے۔ لیکن توقعات کے برخلاف ہم سے ایک لفظ پوچھا نہ گیا۔ ملازموں کو البتہ مارا پیٹا گیا۔ تھانے بھجوانے کی دھمکی دی گئی۔ والد بھی ابتدا میں بہت غصہ ہوئے مگر پھر خاموش ہوگئے

دوپہر کے وقت ڈرائنگ روم میں جب پھوپھی ایک ملازم پر جرح کر رہی تھیں۔ تو یا زو کے کمرۂ مطالعہ میں سے دفعتاً والد نکل پڑے اور الٹا پھوپھی کو ڈانٹ دیا کہ ایک گھڑی کے لئے خوامخواہ سب کو پریشان کیا جارہا ہے۔ ان کی طبیعت خراب ہے۔ گھر میں شور نہ مچایا جائے۔ اور پھر وہ کسی کی زبان سے گھڑی کا نام سنیں گے تو اسے گھر سے نکال دینگے۔

مگر میری پھوپھی کا غم و غصہ کم نہ ہوا۔ جب کوئی ملازم انہیں تنہائی میں ملجاتا تو کبھی وہ اسے دھمکانے لگتیں اور کبھی لالچ دیتیں۔ یہاں تک کہ ایک دفعہ اُن کو میرا خیال آیا۔ انھوں نے ٹرانکولی ٹائن کو میری سراغ رسانی پر مامور کیا (ٹرانکولی ٹائن اسی ہر سالفٹ کا خاندانی نام تھا جسے گھڑی دیجانے والی تھی)۔

ادھر میں نے ڈیوڈ سے استمداد طلب کی۔ ڈیوڈ مدرسہ بھر کے لڑکوں کا لیڈر تھا۔ اس نے اپنی فوج کے ساتھ انکولی ٹائن کو اتنا دق کرنا شروع کیا کہ اسے بالآخر ہمارا پیچھا چھوڑنا ہی پڑا۔

مگر یہاں۔ دوستو!۔ یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ گھڑی کی کہانی ختم ہوگئی۔ نہیں بلکہ گذشتہ واقعات تو تمہید تھے اصل واقعہ اب شروع ہوتا ہے۔ جسکے سلسلہ کو مربوط اور جاری رکھنے اور ایک نئے کردار سے تعارف کرانے کے لئے ہمیں ذرا کچھ پچھلے واقعات پر نظر ڈالنی چاہئے۔

(۱۰)

عدالت کے ایک وظیفہ یاب محرر لائکن سے میرے والد کی کسی زمانے میں گہری دوستی تھی۔ وہ ایک شرمیلی طبیعت کا لنگڑا آدمی تھا۔ وہ عموماً مشیر قانونی اور مختار بھی بن جاتا تھا معمولی سے مقدموں میں۔ مگر چونکہ نہ وہ دلکش صورت کا مالک تھا اور نہ اس میں خود اعتمادی اور چرب زبانی کا وصف تھا۔ اس لئے مقدمات بڑی مشکل سے دستیاب ہوتے تھے چنانچہ وہ میرے والد کا شریک بن گیا۔ اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ دوستی ہمیشہ قائم رہے گی۔ مگر نہ جانے

پھر کیوں لاکن سے اَن بَن ہو گئی۔ والد کا قول تھا کہ اس کی دھوکہ بازی نے والد کے دل کو بہت صدمہ پہونچایا۔ اور انھوں نے نہ صرف شرکت ہی توڑ دی بلکہ اپنے خانگی تعلقات بھی منقطع کر لیئے۔ اور اسے ہمارے گھر آنے جانے سے منع کر دیا بعد میں لاکن نے بے حد معافی چاہی۔ مگر والد کا غصہ کم نہ ہوا۔

یہ میرے قصہ کی ابتدا سے دو سال قبل کا واقعہ ہے۔ اس کے بعد والد نے ناسامی کو شرکت میں لیا تھا۔ اس افتراق کے بعد لاکن کی حالت بگڑنی شروع ہوئی۔ اس کی بیوی جو ایک زمانے سے بیمار چلی آتی تھی قریب المرگ ہو گئی؛ خود اس پر فالج کا حملہ ہوا۔ اس کی چھوٹی بیٹی کے سر پر یکایک شہد کا ایک چھتہ گر پڑا۔ جس پر مکھیاں موجود تھیں۔ جس کے خوف سے وہ ہمیشہ کے لیے گونگی بن گئی غرض دن بدن وہ قعر مذلت میں گرتا گیا۔

اب وہ ایک غلیظ چھوٹے سے مکان میں رہتا تھا۔ جو ہمارے گھر سے قریب ہی تھا۔ اس کی بڑی بیٹی رئیسہ اسکے ساتھ رہتی اور گھر بار کا سارا انتظام کرتی تھی اور یہ رئیسہ ہی ہے جسے اس قصہ کی ہیروئن سمجھنا چاہیے۔ اور جس کا میں ناظرین سے تعارف کرانا چاہتا تھا۔

اس کی عمر تیرہ اور چودہ سال کے درمیان تھی اور وہ بحیثیت مجموعی حسین سے زیادہ دلکش تھی۔ اس کے ہونٹ ایسے تھے جیسے اس نے ابھی جامنیں کھائی ہیں۔ اور اسی لیے ہم سب اسے "سیاہ لب" پکارا کرتے تھے جب تک دونوں خاندانوں میں لڑائی نہ تھی تو وہ اکثر ہمارے گھر آیا کرتی تھی مگر جب والد نے تعلقات قطع کر لئے تو اس کا آنا بھی بند ہو گیا تاہم اس کی ڈیوڈ کی دوستی جو ابتدا ہی سے گہری تھی۔ اب بھی اسی طرح قائم تھی؛ وہ پائیں باغ کے، احاطہ کی مہندی کی باڑھ کے پاس آپس میں ملتے اور رئیسہ اپنی خانگی معاملات میں ڈیوڈ کا مشورہ حاصل کرتی۔ دونوں عموماً بڑی دیر تک گفتگو میں مشغول رہتے تھے۔

رئیسہ کے والد کا مرض کچھ عجیب تھا۔ وہ گفتگو بھی اچھی طرح نہ کر سکتا تھا۔ بڑی مشکل کے بعد ہکلاتے ہکلاتے وہ اپنا مطلب ادا کر سکتا۔ کہنا کچھ چاہتا اور زبان سے کچھ اور نکل جاتا۔ اس کی باتیں سمجھنا کسی اجنبی کے لئے آسان نہ تھا، اس کی بیوی بھی چراغ سحری تھی۔ اب ان سب کی ضروریات کے لئے روپیہ کہاں سے آئے۔ یہ سوال رئیسہ کے حل کرنے کے لئے باقی رہ گیا۔ اور رئیسہ ڈیوڈ کے توسط اور مشورہ سے گھر کی غیر ضروری چیزیں علحدہ کر کے اپنا کام چلاتی تھی۔

(۱۱)

مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ کی گفتگو کے وقت اتفاقاً میں موجود تھا۔ اسی روز رئیسہ کی ماں کا انتقال ہوا تھا۔ "باورچن کفن اور تابوت کا انتظام کرنے گئی ہے۔ مگر کہیں روپیہ وہ اپنی شراب پر ختم نہ کر دے اور والد کہتے ہیں" مجھے بھی برباد کر دو!! برباد کرنے کے معنی دفن کرنے کے ہیں"۔ رئیسہ نے کہا۔

"تم اپنا بھی خیال رکھو رونے دھونے سے کیا فائدہ؟"

"مجھے رونے کی فرصت کب ہے؟"

رئیسہ جاتے جاتے پلٹ پڑی۔

"زرد شال کو بیچنا ہے۔ مگر صراف دام کم دے رہا ہے۔ اور تجہیز و تکفین کے لئے مزید روپیہ کی ضرورت ہے"۔
"شال مجھے دیدو میں بیچکر لادوں گا۔ مگر دیکھو اسراف سے کام نہ لینا"۔
ایک مرتبہ یوں باتیں ہوتی تھیں۔
"وہ ہسپتال کے ڈاکٹر نے ایک دوا پلانے کے لئے لکھدی ہے۔ جو دواخانہ میں نہیں مل سکتی۔ اور پیسے ایں نہیں۔
ہمارا کاشتکار کچھ اپنا حصہ اور ایک بط لایا تھا گاؤں کے باقیدار سے وصول کرکے۔ مگر وہ بھی ایک قرضدار اٹھا کے لے گیا"۔
"کیا بط لے گیا؟"
"نہیں بط کیا لے جاتا۔ کہنے لگا وہ بوڑھی ہے۔ نہ انڈہ دینے کے قابل نہ اس کا گوشت اچھا۔ اس لئے انڈہ ہی لیگیا"۔
"مگر اسے کیا حق تھا لے جانے کا"۔
"حق چاہے ہو یا نہ ہو مگر لے گیا ضرور"
اور آج جبکہ میں نے کاٹ کباڑ کے صندوق میں ہاتھ ڈالا تو جانتے ہو مجھے کیا ملا"۔ اس نے رومال کھول کر ایک بجری دوربین نکالی۔ جس کا چمڑہ جابجا سے پھٹ گیا تھا۔ "انگلستان کی بنی ہوئی ہے"۔ ڈیوڈ نے اسے آنکھوں سے لگاتے ہوئے کہا۔ "اور شیشہ اچھی حالت میں ہے"۔
"میں نے والد کو دکھلایا تو اُنھوں نے کہا کہ بیچ دے۔ اب ہمیں اس کی ضرورت کیا"۔ رئیسہ نے کہا۔
"ہمیں آئینہ تو نصیب نہیں۔ دوربین لیکر کیا کریں"۔
اور رئیسہ دفعتاً قہقہہ لگا کر ہنسنے لگی۔ اپنی بدقسمتی پر۔ طنز و طعن سے پُر قہقہہ اس کی چھوٹی بہن نے جو اس کا ہاتھ پکڑے کھڑی تھی اس کے بدن کا ارتعاش محسوس کیا اور خوفزدہ چہرہ بنا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔
"مت رو۔ بچی"، رئیسہ نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا "وہ ہمیشہ ایسا ہی کیا کرتی ہے۔ خوفزدہ ہو کر" اس نے ڈیوڈ سے کہا۔
لڑکی خاموش ہوگئی۔ اور رئیسہ جانے لگی۔
"دیکھو تو۔ مجھے یہ دوربین بہت پسند ہے۔ آخر تم اسے فروخت کرو گی۔ مجھے دے دو۔ دس روبل میں بآسانی سے بک سکے گی۔ مگر میرے پاس پندرہ کوپک ہی ہیں۔ جو فی الحال دوا کے لئے کافی ہونگے"۔
"نہیں! روپیہ کی ضرورت نہیں۔ اگر تم لینا چاہتے ہو۔ تو یوں ہی لے لو"۔
"نہیں میں یوں تو نہ لونگا۔ اگر تمہارا جی نہ چاہے ۔۔"
"تو پھر میں روپیہ تم سے نہ لونگی۔ ہاں ایک شکل ہے۔ دوربین میں تمہیں تحفتاً دیتی ہوں۔ اور تم مجھے پندرہ کوپک قرض دو۔ پھر میں واپس کردونگی"۔
"قرض ورض نہیں۔ خیر۔ تمہاری مرضی"۔

(۱۲)

ذیل میں ایک اور گفتگو کا حال بیان کرتا ہوں۔ رئیسہ ہمیشہ سے زیادہ متفکر و ملول معلوم ہو رہی تھی۔

"روٹی پر باقی کو پک صرف ہوئے" اس نے اپنا سر باڑہ کی مہندی کی ایک شاخ پر رکھتے ہوئے کہا۔ لوگ کیا لوٹتے ہیں۔ اور میری سلائی کی اجرت ابھی تک نہیں ملی"

"کس سے اُجرت ملنی ہے؟"

"وہ موٹی سی تاجر کی بیوی۔ جو فصیل کے در سے رہتی ہے"

"دیگی ضرور مگر وقت پر ملجائے۔ تو کتنا کام نکلتا اور پھر والد کی حالت زیادہ خراب ہے۔ اچھا ڈیوڈ۔ حالت کے ہجے کیا ہیں؟"

"کیسی حالت؟"

"جیسی بھی ہو۔ مثلاً والد کی حالت"

"ہ۔ ا۔ زبر ہا ل۔ ت۔ زبر لت۔ ہالت"

"نہیں۔ ح۔ ا۔ زبر حا" میں نے کہا۔

خیر ح ہی سے لکھو۔ مطلب تو دل کی بات بیان کرنے سے ہے۔ اور ڈیوڈ نے ایک عجیب معنی خیز انداز سے ریئسہ کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرہ پر شرم کی سرخی دوڑ گئی۔

"اوہ۔ دیکھو۔ چڑیل ادھر آ رہی ہے" ریئسہ پھوپھی کو چڑیل کہا کرتی تھی۔ اور وہ دوڑتی ہوئی چلی گئی۔

"ڈیوڈ مجھ سے ریئسہ کا تذکرہ بہت کم کیا کرتا تھا۔ اور خصوصیت سے آجکل جبکہ اسے اپنے والد کی جلاوطنی کی منسوخی کے حکم کی اطلاع مل چکی تھی۔ وہ سوائے اپنے والد کے کسی اور چیز کا خیال تک نہ کر سکتا تھا۔

"وہ بڑے رحم دل۔ خوش مزاج آدمی ہیں۔ بہادر اور شجیع بھی۔ اور بڑے طاقتور۔ اب تو وہ بوڑھے ہو گئے ہونگے۔ ان کے بال ایسے ہی سُرخ ہیں۔ جیسے میرے" وہ مجھ سے اپنے والد کا حلیہ بیان کرتا۔

"ہم ماسکو میں جا رہینگے۔ والد کو کوئی بڑا عہدہ ملے گا۔ پھر میری شادی ہو گی"

"تمہاری شادی؟"

"ہاں اور کس کی؟"

"کس سے کرو گے؟"

"کس سے؟ بیوقوف" ڈیوڈ ہنسا "ریئسہ سے"

"ریئسہ سے؟ نہیں۔ تم دل لگی کرتے ہو"

جب میں تنہا رہ گیا۔ تو میں سوچنے لگا۔ ڈیوڈ ریئسہ سے شادی کرے گا! اور ریئسہ کی تصویر میری نگاہوں کے روبرو آ گئی۔ وہی کالے اونی لباس میں ملبوس۔ مگر اب وہ مجھے حسین معلوم ہو رہی تھی۔

(۱۳)

ڈیوڈ کے والد ابھی آئے نہ تھے۔ اور ڈیوڈ بھی آجکل کچھ پریشان سا نظر آتا تھا۔ وہ گھر سے اکثر غیر حاضر رہتا۔

لائکن کی حالت ابتر تھی۔ میں نے رئیسہ کو اس دوران میں پہچانا نہ تھا۔ ہاں کبھی کبھی دور سے وہ سڑک کے اس طرف جاتی نظر آجاتی۔ اپنے مخصوص سبکروی کے ساتھ دونوں ہاتھ سینے پر رکھے ہوئے۔ اس کی سیاہ چالاک آنکھیں وارگھن ابروؤں کے نیچے پوشیدہ رہتیں۔ اور اس کے شیریں چہرہ پر تفکر کے آثار پائے جاتے۔

میری پھوپھی ہمیشہ کی طرح گھڑی کے خبط میں مبتلا تھیں ایک روز عادتاً میں اس مخصوص سیب کے درخت کے قریب سے گزرنے لگا۔ جس کے نیچے ہم نے گھڑی دفن کی تھی مگر سطح میں مجھے کچھ تبدیلی محسوس ہوئی۔ ہم نے جو نشانیاں رکھی تھیں وہ غائب تھیں۔ کیا کسی کو ہمارا راز معلوم ہوگیا۔ اور اس نے گھڑی نکال لی؟"

اس کے دوسرے دن میں علی الصباح ڈیوڈ کے بڑے چاقو سے مسلح ہوکر پائیں باغ پہونچا۔ اور تقریباً ایک گز گڑھا کھود ڈالا۔ مگر گھڑی وہاں نہ تھی۔

کسی نے اسے نکال لیا تھا۔ مگر وہ ڈیوڈ کے سوا اور کون ہوسکتا تھا؟ اس کے سوا اور کسی کو اس پوشیدہ مقام کا حال معلوم نہ تھا۔

میں نے گڑھا بھر دیا۔ اور بغموم گھر واپس ہوا مجھے سخت رنج ہوا۔ اگر ڈیوڈ کو اپنے لئے یا اپنی ہونے والی بیوی کی امداد کے لئے گھڑی کی ضرورت تھی تو وہ بے تکلف مجھ سے مانگ لیتا۔ کیا میں اس سے انکار کرتا؟ یہ چوری کرنا کیا ضرور تھا؟

میں نے عمداً اس روز ڈیوڈ سے سردمہری کا برتاؤ کیا۔ مگر ڈیوڈ اس قسم کا آدمی نہ تھا جو ایسی خفیف باتوں کو خاطر میں لاتا۔ میں نے مبہم الفاظ میں کنایتاً کہا بھی۔ مگر ڈیوڈ ان کو سمجھتا معلوم نہ ہوتا تھا۔ پھر میں نے صاف صاف کہا کہ وہ لوگ کس قدر ذلیل اور کمینے ہیں۔ جو دوستی کے مقدس پردہ میں دھوکا و فریب سے کام کرتے ہیں۔ گویا اس قسم کی حرکتوں کا ہمیشہ چھپا رہنا ممکن بھی ہے؟ اور جب میں نے آخری الفاظ کا اعادہ کیا۔ تو میں نے ایک نفرت آمیز قہقہہ لگایا۔

مگر ڈیوڈ کے کان پر جوں نہ رینگی۔ بالآخر میں نے کہا کہ گھڑی جسے ہم تم دفن کرچکے تھے۔ اب چابی ختم ہونے کی وجہ سے بند ہوگئی ہوگی۔ کسی روز دیکھنا چاہئے۔

"مجھے اتنی فرصت نہیں — کہ فضول خیال میں وقت خراب کروں" ڈیوڈ نے اس کا جواب دیا۔ اس وقت تو مجھے اس کا یہ جواب گستاخانہ اور ڈھٹائی پر مبنی نظر آیا۔ مگر اس کے بعد ایک واقعہ سے اصل حقیقت کا انکشاف ہوا ڈیوڈ کی عدیم الفرصتی کا بھی۔ اور گھڑی کے چور کا بھی۔

(۱۴)

ایک روز میں باغ سے واپس ہو رہا تھا۔ ایک کونے میں ملازم واسلی اور خادمہ کے رہنے کی جھونپڑی واقع تھی۔ واسلی زور دار قہقہہ لگا کر بلند آواز سے کچھ کہہ رہا تھا۔ غالباً وہ اس وقت نشہ میں تھا۔ حالانکہ میں چھپ کر باتیں سننے کو ایک اخلاقی گناہ سمجھتا تھا مگر ایک لفظ میرے کان میں ایسا پڑا کہ میں ٹھٹک گیا۔

"اور ہمارے ہونہار صاحبزادے اسے درخت کے نیچے دفن کر رہے تھے۔ بس ان کا جانا ہی تھا کہ میں نے

کھود کر دیکھا کہ وہ خوب صورت چاندی کی گھڑی تھی۔"

"پھر تم نے کیا کیا؟" خادمہ کہنے لگی۔

"کیا کیا؟ ہے وہ۔ دیکھو۔ اب کے جب فوج آ کر گاؤں میں ٹھہرے گی تو کسی سپاہی کے ہاتھ فروخت کر دونگا۔"

میں شرمندہ ہو گیا۔ اف میں ڈیوڈ کی نسبت کیسی خطرناک غلط فہمی میں مبتلا تھا۔

میں نے بہترین طریقہ یہی خیال کیا کہ ڈیوڈ کے آگے اپنے مفصل شبہات بیان کر کے اس سے معافی مانگوں اور گھڑی کی چوری کا واقعہ کہہ سناؤں۔

ڈیوڈ مکان میں موجود نہ تھا میں بے تابی سے اس کا منتظر رہا۔ مگر شام ہو گئی اور وہ نہ آیا آخر کار رات کے کھانے سے کچھ پہلے وہ وارد ہوا۔ اور سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اور میں بھی اس کے پیچھے پیچھے کمرے میں داخل ہوا۔

"ڈیوڈ۔ میں بے انتہا شرمسار ہوں"

میں کہتے کہتے رک گیا۔ اس کے چہرہ سے غصہ ٹپک رہا تھا۔ نجانے کس وجہ سے۔ اس کا منہ سرخ بن رہا تھا۔ اور تیوری چڑھی ہوئی تھی۔

"کیوں؟ کس لئے؟" اس نے اسی سخت لہجہ میں پوچھا۔

"میں نے ایک روز باغ میں سیب کے درخت کے نیچے کھود کر دیکھا تھا۔ مگر گھڑی نہ نکلی۔ اس سے مجھے خیال ہوا کہ —

مگر میں اس وقت اس درجہ منفعل ہوں کہ بیان نہیں کر سکتا۔"

ڈیوڈ بغیر جواب دیئے اس طرح گھورتا رہا۔

"پھر آج جب میں باغ سے آ رہا تھا تو میں نے واسلی کو کہتے سنا کہ گھڑی اس نے چرائی ہے۔ وہ ہمیں اس کے دفن کرتے وقت چھپ کر دیکھ رہا تھا۔ اور خادمہ سے کہہ رہا تھا۔"

"چور۔ بدمعاش!" اس کا غصہ میرے قیاس سے بہت زائد تھا۔ شاید اسی وجہ سے وہ زیادہ افروختہ ہو کہ وہ پہلے ہی سے کچھ رنجیدہ تھا۔

"میں اس سے گھڑی نکلواؤں گا۔ یوں تھوڑے ہی چھوڑ دونگا۔ ابھی سب لوگوں کے سو جانے کے بعد۔"

اس وقت ڈیوڈ کے غیظ و غضب دیکھ کر میں ششدر رہ گیا۔ مجھے واسلی کی بدبختی پر افسوس ہونے لگا۔

(۱۵)

رات کی خاموشی طاری ہو گئی۔ اور میں ڈیوڈ کے پیچھے پیچھے مکان سے باہر نکلا۔ پہلے ہم واسلی کی جھونپڑی کی طرف گئے۔ ڈیوڈ نے واسلی کو آواز دی اور اسے ساتھ آنیکا اشارہ کیا۔ وہ بادل ناخواستہ ڈیوڈ کے پیچھے باغ میں اسی سیب کے درخت کے نیچے آئے۔

"واسلی" ڈیوڈ نے ایسی آواز میں کہا جو خوفناک عزم و استقلال کا پتہ دیتی تھی۔ "اسے فوراً واپس دیدو۔ میں جانتا ہوں کہ وہ تمہارے پاس اس وقت موجود ہے۔"

واسلی خوفزدہ ہوا مگر فوراً ہی جرأت کر کے کہنے لگا۔

"کونسی گھڑی؟ میں نہیں جانتا آپ کس گھڑی کا ذکر کر رہے ہیں۔ میاں خدا آپ کو سلامت رکھے میں نے کوئی گھڑی نہیں لی۔"

"جھوٹ نہ بولو۔ میں جانتا ہوں کہ تم نے لی ہے اور تمہارے پاس موجود ہے۔"

"میرے پاس کوئی گھڑی نہیں۔"

"پھر تم کل دوپہر میں خادمہ سے ۔ ۔ ۔ ۔" میں نے کہنا چاہا۔ مگر ڈیوڈ نے روک دیا۔ "واسلی۔ میں کہتا ہوں گھڑی دیدو۔"

اس نے دہمکانے والے لہجہ میں کہا۔ واسلی نے پرغرور گستاخانہ طریقہ سے انکار کیا۔

ڈیوڈ اپنے مدمقابل سے قد میں ایک فٹ کم تھا۔ مگر اس نے واسلی کے واسکوٹ کا گلا پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ اور جیب سے ہاتھ نکال کر جس میں اس نے اپنا چاقو رکھ لیا تھا، کھلا ہوا چاقو نکلا۔ اور اسے واسلی کے پیٹ پر رکھ دیا۔

"گھڑی دیدو۔"

واسلی کانپنے لگا۔

"ہاں میں نے مذاق سے کہا تھا ۔ ۔ ۔ گھڑی میں نے صرف دل لگی اور آپ کو ذرا پریشان کرکے دیدینے کے لئے نکالی تھی۔۔ اس وقت میرے پاس نہیں۔ صندوق میں ہے ۔ ۔ ۔ ۔"

"فوراً لاؤ۔"

واسلی دوڑتا ہوا گیا۔ اور جب واپس ہوا تو گھڑی اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے اس کی پتلی زنجیر کہربا کی ایک پرانی مگر عمدہ اور خوبصورت زنجیر سے بدلائی تھی۔ مگر گھبراہٹ میں وہ اسے نکالنا تک بھول گیا تھا۔

"اگر کسی سے کہا تو یاد رکھنا ۔ ۔ ۔ ۔"

مگر واسلی نے ڈیوڈ کی بھینچی ہوئی مٹھی کو ہوا میں ہلتے ہوئے نہ دیکھا اور الٹے پاؤں واپس ہو گیا۔

(۱۶)

"اب اس منحوس گھڑی کا کیا کریں؟ ڈیوڈ سے میں نے دوسرے روز صبح کے ناشتہ کے بعد پوچھا۔"

"واقعی کیا کیا جائے؟" ڈیوڈ بھی حیران تھا۔

"اس سے تو بہتر تھا واسلی ہی کے پاس رہنے دیتے ۔۔"

ہرگز نہیں۔ اس بدمعاش کے پاس۔" ڈیوڈ نے بات کاٹ کر کہا۔

ہم دونوں گھڑی کو گھورتے رہے اور سوچ میں پڑ گئے۔ پھیکے زرد رنگ کی کہربا کی زنجیر ڈیوڈ کے ہاتھ سے باہر نکل کر لٹک رہی تھی۔ اور گھڑی بے قاعدگی کے ساتھ غیر مساوی وقفوں سے ٹک ٹک کر رہی تھی۔

"کیا ہم اسے پھر دفن کر دیں؟ کسی اور جگہ یا آتشدان میں جھونک دیں۔"

میں نے آخر کار کہا۔ "اور اگر لاکن کو دیدیں تو ۔۔"

نہیں۔ سیموکے سیلاب زدوں کی امداد کے لئے چندہ فراہم کرنے کے لئے آج جلسہ ہوا ہے۔ جس میں چچا بھی گئے ہوئے ہیں۔ وہ روپیہ کے علاوہ دوسری چیزیں بھی قبول کرتے ہونگے۔ انہیں کیوں نہ دیدو؟" ڈیوڈ نے رائے دی

"مگر اس کے ساتھ خط لکھنا پڑے گا۔ اور اس سے بات پھوٹ جائیگی" میں نے اعتراضاً کہا "گمنام ہی نہیجدو۔ خالی سگار کے ڈبہ میں بند کرکے۔ نہ تحریر نہ خط" ڈیوڈ نے کہا

دفعتاً گھر میں کچھ شور وغل کی آواز بلند ہوئی۔ ایسا معلوم ہونے لگا کہ بہت سے لوگ ہمارے کمرے کی طرف آرہے ہیں۔ ہم دونوں بھونچکے رہ گئے۔ اور ایک دوسرے کی طرف حیرانی سے دیکھنے لگے اتنے میں کسی کی غراہٹ جیسی آواز آئی "گھڑی گھڑی" یہ ٹرنکوئی کا تن تھا۔

"واسلی نے ہمیں دھوکا دیا اور پھوپھی کو خبر پہنچا دی" ڈیوڈ نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ اور گھڑی کو جیب میں رکھنے لگا۔ اتنے میں پھوپھی ٹرانکوئی تائن۔ واسلی یوشکا۔ اور والد دروازہ کھول کر داخل ہوئے۔ والد سب سے آگے تھے۔ "بدمعاشو۔ تم نے تمہاری چوری پکڑلی"

گھڑی کی زنجیر ڈیوڈ کی جیب سے باہر لٹک رہی تھی۔

"اِدھر دو گھڑی مجھے" والد چیخے۔

مگر ڈیوڈ بغیر ایک لفظ زبان سے نکالے کھڑکی کی طرف دوڑا۔ دہلیز پر چڑھا باہر کود گیا اور دوڑنے لگا۔

"پکڑو گرفتار کرلو۔ چور کو" والد کھڑکی سے جھک کر پکارنے لگے۔ اور سب ملازم وغیرہ دروازہ سے باہر کی طرف دوڑے۔ والد بھی پلٹے اور تیزی سے باہر نکل گئے" اس گھبراہٹ میں کسی نے مجھے نہ دیکھا تھا۔

اپنے لیڈر ڈیوڈ کی ہر بات کی تقلید کا عادی ہونے کی وجہ سے میں بھی کھڑکی میں سے کودا اور دوڑنے لگا۔

ہم ننگے سر سڑک پر دوڑے جارہے تھے" ڈیوڈ آگے اور میں چند قدم پیچھے اور میرے پیچھے ہمارے تعاقب کرنے والے غل مچاتے ہوئے آرہے تھے۔

(۱۶)

اس واقعہ کو گذرے کئی سال ہوئے۔ مگر اب بھی جو اس پر غور کرتا ہوں تو ایک تو ڈیوڈ کا غصہ جو اسے واسلی پر آیا تھا۔ اور دوسرے والد کا غصہ جو گھڑی کے نام سے بیزار تھے۔ اور ہمارے سامنے اس کا ذکر نکالنے کی ممانعت کر چکے تھے۔ اس کا کوئی موزوں سبب سمجھ میں نہیں آتا اور میں تسلیم کرنے پہ مجبور ہو جاتا ہوں کہ اس معاملہ میں کوئی پر اسرار غیبی ہاتھ کام کر رہا تھا۔ . . . ہمارا خیال غلط ثابت ہوا۔ واسلی نے چغلی نہ کھائی تھی وہ بیچارہ خود ڈیوڈ کے خوف سے مرا جاتا تھا بلکہ یوشکا نے ڈیوڈ کے ہاتھ میں اتفاقاً گھڑی دیکھ لی تھی۔ اور چونکہ پہلے اسی گھڑی کے معاملہ میں پھوپھی یا والد کو خبر نہ دینے پر پٹا تھا۔ اس لئے فوراً پھوپھی سے کہدیا۔

ہم سڑک پر بدحواس ایک دوسرے کے پیچھے دوڑنے لگے۔ ڈیوڈ گھڑی کی زنجیر پکڑے اپنے سر کے اوپر چکر دے رہا تھا۔

"ٹھہرو۔ ٹھہرو" لوگ ہمارے تعاقب میں چلاتے ہوئے آرہے تھے میں نے ڈیوڈ کو ایک گلی میں مڑتے ہوئے دیکھکر چیختے ہوئے پوچھا "کدھر؟" "ندی کی طرف" اس نے کہا اور دوڑتا چلا گیا۔ آخر کار ندی ہمارے سامنے تھی۔ دلدل کا ڈھلوان۔ اور ایک طرف لکڑی کا بنا ہوا پل جس پر سے سامان کے چھکڑے گذر رہے تھے اور ایک سپاہی باڑہ سے ٹیک لگائے۔ کھڑا تھا۔ ڈیوڈ کو دیکھکر سپاہی نے روکنا چاہا۔ مگر وہ دوسری طرف ہو گیا اور سپاہی ایک چھکڑے سے ٹکراتے ٹکراتے بچا اب ڈیوڈ کٹہرے پر جھکا۔ کوئی چیز سفید سی ہوا

میں جھلکیں نظر آئی۔ پھر ـــــ دفعتاً ڈیوڈ پھسل پڑا۔ سر نیچے اور پاؤں اوپر۔ اور ہوا میں ایک قوس بناتا ہوا۔ ایک عظیم دھماکے کے ساتھ ندی میں گر پڑا۔

میں ڈیوڈ سے چند قدم پیچھے تھا۔ یہ دیکھکر میرے منہ سے ایک خوفناک چیخ نکل پڑی۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھاگیا۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ کسی چیز سے مجھے ٹھوکر لگی اور سخت زمین پر ٹکرانے سے میرے سر کو بہت چوٹ آئی۔ پھر میں غالباً بے ہوش ہوگیا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں نے دیکھا کہ ایک ہجوم میرے اطراف میں جمع ہے۔ میں ایک خالی بوری پر جس کے دونوں کونے دو آدمی تھامے ہوئے چل رہے تھے لیٹا ہوا ہوں۔ اور سب لوگ میرے ساتھ چل رہے ہیں۔ میں نے دیکھنا چاہا کہ ڈیوڈ کہاں ہے اسے بھی میری طرح دو آدمی اُٹھائے میرے آگے آگے لئے جا رہے تھے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ایک شخص جس کا لباس بھیگا ہوا تھا جو غالباً اسے ندی سے نکالنے والا تھا چل رہا تھا۔ جو چلتے چلتے ڈیوڈ کو دور سے گرتے ہوئے دیکھکر دوڑنے اور اسی طرح کپڑے پہنے ہوئے کود پڑنے پھر گہرائی میں غوطہ لگاکر ڈیوڈ کو سر کے بال پکڑکر کھینچنے اور صرف ایک ہاتھ سے پیرتے ہوئے کنارے تک لے آنے کا مفصل حال فخریہ لہجہ میں بیان کر رہا تھا۔

ـــــ آخرش ہم گھر پہنچ گئے۔

(۱۸)

ڈیوڈ ابھی بے ہوش تھا۔ اس کے لئے گاؤں کا ڈاکٹر طلب کیا گیا۔ والد نے اپنے سامنے ہم دونوں کے کپڑے اُتروائے مجھے دوسرا لباس پہنایا گیا اور ڈیوڈ کو ایک کمبل میں لپیٹ دیا گیا۔ میرے سر پر جہاں گرنے سے چوٹ آئی اور کچھ خون نکلا تھا۔ پلاسٹر لگایا گیا۔ اور والد اس شخص کی ضیافت کے لئے ڈرائنگ روم میں گئے جس نے ڈیوڈ کو مرنے سے بچایا تھا۔

ڈاکٹر صاحب آئے اُس وقت تک ڈیوڈ کو ہوش آچکا تھا۔ انھوں نے کوئی دوا ڈیوڈ کو پلائی اور چلے گئے۔ میں جو اب تک ڈیوڈ کے بے تحاشہ ندی میں کود پڑنے کی وجہ سمجھ نہ سکا تھا۔ ڈیوڈ سے اس کا سبب دریافت کیا۔

"میں عمداً نہیں کودا" ڈیوڈ نے کراہتے ہوئے کہا "بلکہ میرا پیر پھسل گیا ـــ کیا تم نے رئیسہ کو دیکھا ہے؟" اس نے دفعتاً کہا

"نہیں۔ مگر ـــ شاید اب مجھے یاد پڑتا ہے کہ وہ پل کے کنارے پر کھڑی تھی . . . . ہاں۔ ہاں . . . سیاہ لباس . . . سر پر زرد رومال۔ ہاں وہ رئیسہ ہی تھی"

"اُس کے بعد پھر ـــ ؟"

"مجھے کچھ خیال نہیں۔ میں بھی گر کر بیہوش ہوگیا تھا۔ لیکن گرنے سے قبل میں نے ایک تیز بھراتی ہوئی چیخ سنی تھی۔ غالباً وہ رئیسہ ہی کی تھی"

"بھائی۔ میرے عزیز بھائی۔ ایک کام میرا کرو تم فوراً لائکن کے گھر جاؤ۔ اور رئیسہ سے ملکر کہدو کہ میں اچھا ہوں تشویش کی کوئی بات نہیں"

ڈیوڈ نے دونوں ہاتھ ملتجیانہ انداز سے پھیلائے میں نے ٹوپی اُٹھائی اور سب کی نظروں سے بچکر کھڑکی کی راہ سے باہر نکل گیا۔

اس منظر سے کچے مکان کے آگے جس میں لائکن رہا کرتا تھا ایک چھوٹا سا افتادہ قطعۂ زمین پھیلا ہوا تھا۔ جس میں خود رو پودے اُگ رہے تھے۔ اس کے اطراف ایک شکستہ دیوار تھی۔ دروازہ کی پہلی سیڑھی پر رئیسہ اپنے خوبصورت چہرے کو دونوں ہتھیلیوں کا سہارا دیئے سیاہ لباس میں ملبوس، خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔ پاس ہی اس کی گونگی بہن کھیل رہی تھی۔ اور لائکن بوسیدہ اور غلیظ کپڑے پہنے سامنے ٹہل رہا تھا۔ میرے قدموں کی آہٹ سنکر وہ ٹھہر گیا۔ اور پھر دفعتاً میرے قریب آ کر لرزتی اور تھرتھراتی ہوئی آواز میں جلدی سے کہنا شروع کیا۔ چو — چو — چو!" میں ششدر رہ گیا میں نے اسے ایک عرصہ سے نہ دیکھا تھا۔ اب اسے پہچاننا ہی مشکل تھا۔ بھورے سفید مائل بال۔ افسردہ آنکھیں خمیدہ جسم۔ اور سُرخ جُھرّیوں سے بھرا ہوا چہرہ! اف! وہ کتنا بدل گیا تھا۔

"چو — چو" اس نے ہکلاتے ہوئے بڑی کوشش کے بعد کہا۔ "دیکھو۔ داسنیا۔ یہاں۔ چو۔ سنتے ہو۔ جیت پر" لائکن جانتا تھا کہ وہ دل کی بات بیان نہیں کر رہا ہے۔ اس لئے زیادہ تر کوشش سمجھانے کی کرتا جاتا تھا رئیسہ اس طرح خاموش کچھ دور ایک پودے کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔

"خدا حافظ۔ ہیروں کے تاجر... خدا حافظ۔ خدا حافظ" لائکن نے کئی مرتبہ دہرایا۔ میرا سر چکرا رہا تھا۔
"اس کا مطلب کیا ہے؟" میں نے ایک بوڑھی عورت کو پوچھا جو پاس کے ہی اپنے مکان کی کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی
"لوگ کہتے ہیں کہ کوئی شخص ڈوب مرا ہے۔ رئیسہ اتفاقاً یہ منظر دیکھ کر خوفزدہ ہوگئی ہے اور وہاں سے آکر اب تک اسیطرح بیٹھی ہے۔ گویا گونگی اور بہری ہوگئی ہے۔ ایک بت کی طرح۔"
"رئیسہ تمہاری کیا حالت ہے؟" میں نے اس کے پاس جا کر پوچھا۔ مگر وہ اسی طرح خاموش دوسری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ تھاما۔ رئیسہ ڈیوڈ زندہ ہے اس وقت صحیح سلامت گھر میں موجود ہے۔ اسے ندی سے نکالا گیا ہے"
رئیسہ نے کئی مرتبہ آنکھیں جھپکائیں اور میری طرف دیکھا۔ "ڈیوڈ... زندہ" وہ چیخی۔ اور غزالِ رمیدہ کی مانند چھلانگیں مارکر دوڑنے لگی۔ وہ ہمارے گھر کی طرف جارہی تھی مجھے مجبوراً اس کے پیچھے چلنا پڑا۔

(۱۹)

داسلی، یعقوبی اور ٹرانکوی نائن ڈرائنگ روم میں جمع تھے۔ مگر رئیسہ ان کو دیکھ کر بھی نہ رکی اور سیدھی دوڑتی ہوئی ڈیوڈ کے کمرے میں چلی گئی۔

"اوہ..... ڈے..... وڈ..." وہ اس کی گردن پر گر گئی اور روتے ہوئے کہنے لگی۔

"ہاں۔ رئیسہ" ڈیوڈ آہستہ سے کہہ رہا تھا۔

"یہ کیا حماقت ہے ڈیوڈ؟" میرے والد دروازے میں کھڑے ہوئے غصہ سے کہہ رہے تھے۔ "اور رئیسہ تو نے یہاں آنے کی جرات کیسے کی۔ فوراً یہاں سے چلی جا۔ ورنہ...."

"چچا۔" ڈیوڈ یکایک اپنے بستر پر بیٹھکر کہنے لگا۔ "آپ رئیسہ کو کچھ نہ کہیں وہ از خود چلی جائیگی۔"

"نکل باہر یہاں سے بے حیا... اور تو بھی بڑا رئیسہ کی سفارش کرنے والا آیا۔"

"اس کی بے عزتی نہ کیجئے چچا۔"

"خاموش۔ زبان بند کرو"

"میری منگیتر کی ہتک نہ کیجئے"

"منگیتر، ہونے والی بیوی ۔ ۔ ۔ ۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔ ۔ ۔ ۔"

"ہو۔ ہو۔ ہو۔ ہو۔" دروازے کے پیچھے سے میری پھوپھی کی آواز بازگشت گونج اٹھی۔

"بھائیو۔ ۔ ۔ شریف عیسائیو!"

ہم سب گھومے ۔ ۔ ۔ ۔ اسی کیف لباس اور رحم انگیز حالت میں لائکن دروازے میں بھوت کی طرح کھڑا تھا۔

"خدا" اس نے آسمان کی طرف خمیدہ اور کانپتی ہوئی انگلی اٹھا کر بچوں کی طرح کہا۔

"رئیسہ کے لئے ۔ ۔ ۔ خدا پاک کر دے ۔ ۔ ۔ ۔"

رئیسہ نے بغیر ایک لفظ زبان سے نکالے درمیانی فاصلہ طے کر کے اپنے والد کے ہاتھ کو تھام لیا اور اس کے کوٹ کے بٹن لگانے لگی۔

"بھائی۔ آؤ ۔ ۔ ۔ چو۔۔۔ دوستو" وہ دل کا مطلب اپنی مفلوج اور لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے ادا کرنے کی کوشش کر رہا تھا "صلیب مقدس ۔ ۔ ۔ ۔ دونوں نے لیا ۔ ۔ ۔ اس نے (اس نے والد کی طرف اشارہ کر کے کہا) بھی چرایا ۔ ۔ ۔ میں بھی ۔ ۔ ۔ ۔" آخر کار وہ اپنا مطلب ادا کرنے میں کسی حد تک کامیاب ہوا۔ اور کونے میں سلگو ہوئے مجسمہ مقدس کے آگے جو چراغ جل رہا تھا اس کے سامنے دوزانو ہو گیا۔

"ہم پر رحم کر ۔ ۔ ۔ خدا ۔ ۔ ۔ مجھ پر ۔ ۔ ۔ اوخدا ۔ مجھ پر اوخدا ۔ ۔ ۔" وہ کہنے لگا۔

والد نے اپنی نظر ایک لمحہ کے لئے بھی لائکن کے چہرے سے نہ ہٹائی تھی۔ اچانک انھوں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ ڈھانک لیا اور کمرے سے باہر جانے لگے۔

پھوپھی بھی انکے پیچھے جانے لگیں مگر والد نے بھرائی ہوئی آواز میں انہیں گفتگو سے منع کر دیا۔

"بابا چلو!" رئیسہ نے یہ کہکر اس دردناک سکوت کو توڑا "ڈیوڈ خدا حافظ"

"میں کل آؤنگا" ڈیوڈ نے کہا۔ اور دیوار کی جانب منہ کر کے لیٹ گیا۔

بڑی دیر کے بعد میں کمرہ سے باہر نکلا میں والد سے پٹنے کے خوف سے چھپا رہا تھا لیکن میرے شکوک باطل ثابت ہوئے۔ انھوں نے مجھے دیکھا بھی مگر کچھ نہ کہا۔ وہ بے انتہا غمگین اور اداس معلوم ہو رہے تھے۔

## (۲۰)

دوسری صبح ڈیوڈ بھلا چنگا اٹھ بیٹھا گویا کوئی واقعہ گذرا ہی نہ تھا۔ اس روز دو اہم تبدیلیاں ظہور میں آئیں ایک تو صبح کو لائکن کا انتقال ہو گیا۔ اور دوسرے شام کے وقت ڈیوڈ کے والد "چچا دیگر" وارد ہوئے۔ انھوں نے اپنے آنے کی اطلاع نہ دی تھی۔ اس لئے والد اور پھوپھی اچانک انکو اپنے سامنے دیکھکر ششدر رہ گئے۔ اور ڈیوڈ خوشی کی ایک چیخ کے ساتھ ان سے لپٹ گیا۔

مگر تعجب خیز بات یہ تھی کہ والد اور پھوپھی کے ساتھ ان کا سلوک سرد مہری کا تھا چونکہ مکان میں کوئی اور خالی کمرہ نہ تھا اس لئے والد نے ان کی شب باشی کا انتظام میرے اور ڈیوڈ کے مشترکہ کمرے میں کیا۔ مگر مجھے اپنے کمرے میں سلا لیا۔ رات میں دو ایک مرتبہ جب میں بیدار ہوا تو میں نے ڈیوڈ کے کمرے سے آہستہ لہجہ میں باتوں کی آواز سنی۔ غالباً وہ اپنے والد سے بڑی رات گئے تک گفتگو میں مشغول تھا

صبح کے ناشتہ کے بعد چچا۔ ڈیوڈ کے ساتھ لاکمن کے مراسم تجہیز و تکفین میں شریک ہونے کے لئے گئے اس روز خلاف معمول میری پھوپھی بھی کچھ خاموش سی تھیں۔ اور والد صبح ہی سے اپنے کمرہ مطالعہ میں بند تھے۔ تھوڑی دیر بعد والد مجھے بھی اپنے ساتھ لیکر لاکمن کی نماز جنازہ میں شریک ہوئے۔

قبر کے پاس رئیسہ دفعتاً پھوٹ پڑی اور ہچکیاں لے لے کر رونے لگی مگر ڈیوڈ کے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے تسکین دینے لگے۔ غالباً ڈیوڈ نے اس کے سامنے رئیسہ کا تذکرہ کر دیا تھا۔

اُسی روز دوپہر میں چچا نے والد کے سامنے یہ ارادہ ظاہر کیا کہ انکا مقصد کل ہی ڈیوڈ کو ساتھ لیکر یاسکو جا رہنے کا ہے۔ والد نے کمزور سی کوشش کی کہ ان کو اس ارادہ سے باز رکھیں مگر وہ اپنے ارادہ پر سختی سے قائم رہے میں قدرتاً بہت رنجیدہ ہوا کہ میرا قدیم اور بچپن کا ساتھی مجھ سے دور ہو رہا ہے اور میں نے چچا کو ڈیوڈ کے یہیں چھوڑ جانے کے لئے کہا۔ مگر انھوں نے مسکرا کر مجھے جواب دیا۔

"تمہیں بھی چند دن بعد وہیں بلا لونگا!"

دوسرے روز چچا رخصت ہوئے مگر تعجب اور سخت حیرت یہ ہے کہ وہ نہ صرف تنہا ڈیوڈ ہی کو اپنے ساتھ لے گئے بلکہ رئیسہ اور اُس کی چھوٹی بہن کو بھی . . . . ۔

پھوپھی نے جب یہ سنا تو انھوں نے فوراً چچا کو کافر کا خطاب دیا اور آخیر زندگی تک یہی کہتی رہیں۔ والد اس پر بھی بالکل خاموش مگر اب میں تنہا رہ گیا — اس وسیع کائنات میں بالکل تنہا۔

(۲۱)

اس طرح گھڑی کی کہانی ختم ہوئی —

پانچ برس بعد ڈیوڈ نے رئیسہ سے شادی کر لی اور ۱۸۱۲ء میں کپتان کی حیثیت سے بوروڈنو کے میدان جنگ میں شیوارڈنسکی کے قلعہ کو دشمن کے حملہ سے بچاتے ہوئے مارا گیا۔

اس واقعہ کو کئی سال کا عرصہ گذرا اور اس دوران میں کئی گھڑیاں میرے قبضہ میں آئیں اور نکل گئیں اور اسوقت میرے پاس تین ریبل کی ایک قیمتی سونے کی گھڑی موجود ہے جو ایک سونے کی زنجیر کے ساتھ آویزاں ہے لیکن میرے لکھنے کی میز کی پوشیدہ دراز میں چھپی ہوئی ایک اور گھڑی ہے جاندی کی اسکی پشت پر ایک گلاب کا پھول بنا ہوا ہے یہ میں نے ایک پرانے سامان فروخت کرنیوالے یہودی سے خریدی تھی۔ اس مماثلت سے متاثر ہو کر جو اسے اس گھڑی سے حاصل تھی جس کا قصہ میں آپ کو سنا آیا ہوں اور جب کبھی میں تنہا ہوتا ہوں تو اس گھڑی کو اسکے پوشیدہ مقام سے نکالتا ہوں اسے دیکھکر لڑکپن کے زرین عہد کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتی ہے اور اس عزیز دوست اور ساتھی کی بھی — جو مجھ سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ گیا۔

# اندھی کھلونے بنانیوالی

از جناب محمد نقی دہلوی

کالیبہ پامر اور اُس کی اندھی بیٹی ایک چھوٹے سے بوسیدہ مکان میں رہا کرتے تھے۔ وہ کھلونے بنایا کرتے تھے اُن کا مکان اس قدر مختصر تھا کہ ایک پھاؤڑے سے ریزہ ریزہ کرکے سر س کرف ڈیکنش کھلونے والے جن کا یہ کام کیا کرتے تھے ان کی کوٹھی کے ایک کونے میں ڈال دیا جائے تو پتہ نہ چلے۔

کالیبہ نے اپنی بیٹی کو ایک مسحور فضا میں پرورش کیا تھا۔ جو اس کی پدرانہ شفقت سے محض اسی کے لئے ترتیب دی گئی تھی۔ برتھ کو مطلق معلوم نہ تھا کہ ہمارے مکان کی چھت شق ہو رہی ہے۔ اس کا پلستر اُکھڑ اُکھڑ کر جھڑ رہا ہے۔ لکڑی کا تمام کام بوسیدہ ہوگیا ہے ہر چیز پرانی۔ فرسودہ اور غربت زدہ ہے۔ اُس کو اس کا بھی علم نہ تھا کہ میرا باپ سفید بالوں والا جھکا ہوا بوڑھا ہے اور جس کا ہم کام کرتے ہیں وہ ایک سنگ دل درندہ صفت کام لینے والا انسان ہے۔ وہ یہ خیال کرتی تھی کہ ہماری رہائش گاہ ایک چھوٹا سا مضبوط اور خوبصورت مکان ہے جو ہمارے مالک کے قیمتی تحفوں سے بھرا پڑا ہے۔ میرا باپ ایک خوش وضع و خوش لباس تنومند انسان ہے۔ اور میرا مالک ایک خوش مزاج شریف ایک خوبصورت نوجوان اور ایک "رحمت کا فرشتہ" کھلونے فروش ہے۔ یہ سب کالیبہ کی کوشش کا نتیجہ تھا۔ چونکہ برتھ ابھی بچہ ہی تھی اس لئے اُس نے اپنی بے پناہ محبت اور جذبات ترحم سے متاثر ہو کر یہ مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ وہ جس طرح بھی ممکن ہوا اس "محروم بصارت" کو دل برداشتہ نہ ہونے دیگا۔ اور جہاں تک اُس سے بن پڑے گا اُس کو خوش و خرم رکھے گا۔ چنانچہ وہ خوش تھی اور ہر چیز کو اپنی باپ کی آنکھوں سے دیکھا کرتی تھی۔

اُن کا یہ گھر بھی عجیب و غریب گھر تھا۔ جو اُنکے رہنے کا کمرہ تھا وہی ان کا کارخانہ۔ جو اُنکے آرام کرنے سونے کی کوٹھری تھی وہی ان کا گودام۔ اس کے چاروں طرف لکڑی کی الماریاں لگیں ہوئیں تھیں۔ جن میں ہر قسم و ہر سائز کے گڑیا کے گھر۔ گڑیوں کا فرنیچر۔ اور ایک ایک آنہ والی بازاری گڑیوں سے لیکر بڑی بڑی قیمتی مومی صنعت کی بہترین گڑیاں رکھی ہوئی تھیں۔ نیز بھڑکیلی اور چمکدار ساز و سامان کی کافی مقدار رکھی ہوئی تھی جس سے یہ اندھی لڑکی گڑیوں کا لباس بنایا کرتی تھی۔ اور وہ اس وقت ایک بڑی گڑیا کا فراک تیار کرنے میں مصروف تھی اور اس کا باپ ایک گڑیا کے گھر پر روغن پھیر رہا تھا۔

"اباکل رات کو تم اپنا بڑا کوٹ پہنے ہوئے بارش میں باہر تھے نا؟" برتھ نے کہا کالیبہ نے اپنے موٹے ٹاٹ کے کوٹ پر جو الگنی پر سوکھنے کے لئے لٹکایا گیا تھا نظر ڈالتے ہوئے کہا: "ہاں چاندا رات کو میرا خوبصورت نیا بڑا کوٹ بھیگ گیا۔" برتھ نے کہا ابا جب تم نے یہ کوٹ خریدا تھا تو مجھے بہت خوشی ہوئی تھی۔"

اندھی لڑکی نے فرطِ مسرت سے تالیاں بجاتے ہوئے کہا۔ ایک اچھے درزی۔ پورے فیشن ایبل درزی کے

ہاتھ کا تیار کیا ہوا نیلا چمکدار بٹنوں والا کوٹ میرے پیارے ابا کے لئے کیسا موزوں ہوگا؟

آہ جب کوئی چیز میرے خوبصورت باپ کے لئے اُس کے مسکراتے ہوئے چہرہ کے لئے۔ اس کے کالے کالے بالوں کے لئے۔ اُس کے مناسب خدوخال کے لئے موزوں ہوتی ہے تو مجھے کتنی خوشی ہوتی ہے!"

ہائے اگر غریب برتھ اپنے باپ کے پھٹے ہوئے کپڑے جھکا ہوا قد، جھریوں والا چہرہ اور رنجیدہ حالت میں اس گندے اور غلیظ کمرہ میں کام کرتے ہوئے دیکھتی تو اس کے معصوم دل کو کس قدر تکلیف پہنچے۔

کالیب نے ایک دل سوز گیت شروع کیا جس میں اُس دلفریب نام کا ذکر تھا جس نے اُس کو اب تک اس عسرت کی زندگی گذارنے پر مجبور کیا تھا۔ "کیا تم گا رہے ہو؟" مسٹر ٹیکلٹن نے اپنے سر کو دروازہ کے اندر کرتے ہوئے کہا "میں تم کو گانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ تم گانے کے ساتھ کام بھی کر سکتے ہو مگر میں کام کے اوقات میں تم کو گانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔" کالیب نے اپنی بیٹی کے کان میں کہا۔ "دیکھتی ہو ماسٹر مجھ سے کیسی چھیڑ کر رہے ہیں؟" "پھر کیوں کی صورت میں ہنسی مذاق" اندھی لڑکی نے گردن کو ہلایا۔ اور مسٹر ٹیکلٹن کے کشیدہ ہاتھ کو نہایت عقیدت سے بوسہ دیا۔ کھلونے فروش نے اپنے ہاتھ کو بری طرح گھسیٹ کر بڑبڑاتے ہوئے کہا "کیسا احمقانہ فعل ہے" "میں آپ کے اس چھوٹے سے درخت کے لئے ننھے سے خوبصورت درخت کے لئے نہایت ممنون ہوں" برتھ نے اپنے ہاتھ میں گلاب کا ایک شگفتہ پودہ لیتے ہوئے کہا۔ چونکہ کالیب نے یہ بتایا تھا کہ یہ ہمارے مالک کا تحفہ ہے۔ حالانکہ اُس نے خود دو تین وقت بھوکا رہ کر یہ خرید کیا تھا مسٹر ٹیکلٹن نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ "برتھ کا دماغ خراب ہو گیا یہ کیسی احمقانہ باتیں کرنے لگی ہے"۔ اور کالیب کو چند ہدایات دیکر رخصت کے اخلاقی الفاظ کے بغیر روانہ ہو گیا۔ جب دروازہ بند ہو گیا تو کالیب نے کہا کہ "دیکھا تو نے ماسٹر ہم سے کیسی پیاری اور انوکھی ہنسی کرتے ہیں۔ اور تشکر و امتنان کے الفاظ سننے سے کیسے بھاگتے ہیں"۔ برتھ نے خود اپنے آپ سے کس قدر شکوہ کے ساتھ کہا۔ "وہ ہمیشہ ایسا ہی کرتے ہیں وہ ہمیشہ اپنے فیاضانہ اور محبت بھرے تحائف کا شکریہ ادا کرنا ہی نہیں چاہتے۔ جب وہ آتے ہیں تو مجھ کو اپنی خوش مزاجی اور زندہ دلی سے باغ باغ کر جاتے ہیں"۔ کالیب نے برتھ کو اس کی محبت میں اس کامیابی کے ساتھ دھوکا دیا کہ مسٹر ٹیکلٹن کے طرز عمل کو بالکل برعکس کر دیا اس کے ہر قول و فعل کو سراسر شریفانہ بنا دیا حتیٰ کہ برتھ کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ وہ ہماری خبر گیری اور دلجوئی میں ہر ممکن توجہ صرف کرتا ہے۔ اور وہ ایک قابل پرستش ہستی ہے۔ رفتہ رفتہ برتھ اس کی محبت کا دم بھرنے لگی۔ لیکن حقیقتاً برتھ اپنے مالک سے محبت نہیں کرتی تھی بلکہ اس ہستی سے محبت کرتی تھی جو اُس نے اپنے مالک سے وابستہ و متعلق اپنے تصور میں بنا رکھی تھی اور وہ اپنے معصوم محبت کے عقیدہ سے مسرور تھی۔ کہ ایک واقعہ دل سوز و جگر پاش واقعہ پیش آیا۔ برتھ کو معلوم ہوا کہ مسٹر ٹیکلٹن کی شادی ہو رہی ہے اس کے خرمن جذبات پر بجلی گر گئی اس کو اس روح فرسا خبر سے جو تکلیف اور روحی اذیت پہنچی وہ اپنے باپ سے اس کو کسی طرح نہ چھپا سکی۔ کالیب کو جب حقیقت کا احساس ہوا تو اُس کے اوسان خطا ہو گئے۔ اس نے کہا "مجھ سے بڑا ظلم ہو گیا۔ میں نے اپنی دل و جان کو محض آخر میں دل شکستہ کرنے کے لئے اتنے عرصہ تک کیوں دھوکا دیتا رہا۔ ہائے میں نے سمجھے کیا ہو گیا تھا" میں نے ظلم کیا ہے اور ناقابل تلافی ظلم" بوڑھا اپنے آپ کو برابر الزام دیتا رہا جب تک اس کی یہ سمجھ میں نہ آیا کہ اب مجھ کو

کیا کرنا چاہئے اور اس قلبی اذیت کا جو اس کی خود پیدا کردہ ہے کس طرح خاتمہ کرنا چاہئے آخر کار وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ اصلی حالات کا انکشاف بہت ضروری ہے۔

کالیبہ نے کہا " برتھ میرے دل میں کچھ باتیں ہیں دل سوز دل گداز باتیں ہیں میں تم کو ان سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔ اگرچہ میں نے تمہارے ساتھ سخت ظلم کیا ہے مگر تم ان کو ٹھنڈے دل سے سنو"

برتھ نے اپنے "بے بصر چہرہ" کو اس کی طرف متوجہ کرتے ہوئے چلا کر کہا " آپ نے میرے ساتھ ظلم کیا ہے؟"

اس کے یہی معنی ہیں میری بچی اس سے میری یہی مراد ہے۔ ہائے کل تک مجھے اس کا احساس بھی نہ تھا۔ میری معصوم اکلوتی۔ میری پیاری، اندھی بیٹی جن آنکھوں پر تو نے بھروسہ کیا تھا۔ وہ تیرے لئے جھوٹی۔ مکار دغاباز اور فریبی ثابت ہوئیں، یہ دنیا جس میں تو رہتی ہے ایسی نہیں ہے جیسی کہ میں نے اس کو تیرے سامنے پیش کیا ہے۔ یہ تو محض میری "رنگ آمیزی" ہے جن چیزوں سے تیرے احساسات کو تکلیف پہونچنے کا احتمال تھا میں نے ان کو یکقلم برطرف کر دیا اور جو چیزیں تیری خوشی کا باعث تھیں میں نے وہ ایجاد کرلیں اُن ہی کے تخیلات نے تاثرات نے تجھے گھیر لیا۔

گویا جان جاندار چیزیں تخیلات نہیں ہیں اگر تی اور تم انکو کسیطرح تبدیل نہیں کرسکتے میری بچی میں نے ایسا ہی کیا۔ خدا مجھے معاف کرے میں نے ایسا ہی کیا برتھ جس شخص کی آج شادی ہو رہی ہے وہ ہر نوع اور ہر صورت سے اس کے بالکل برعکس ہے جیسا میں نے اس کو تیرے سامنے ظاہر کیا ہے اس کی صورت اور سیرت دونوں بھیانک ہیں وہ ہمارے لئے ایسا ہی سخت اور بے رحم حاکم ہے جیسا کوئی ہوسکتا ہے"

برتھ نے کہا " اے خدا انہوں نے مجھے اندھا کیوں کیا ہائے میں اور میرا باپ کیسے بے یار و مددگار ہیں" غریب کالیبہ نے اپنی گردن کو جھکایا۔ برتھ نے کہا "ابا اب مجھے بتاؤ کہ ہمارا گھر کیسا ہے" "برتھ ایک حقیر جگہ۔ حقیر اور ناقابل رہائش جگہ البتہ وہ ہوا اور موسم سے اس طرح محفوظ رکھتا ہے جس طرح میرا موٹے ٹاٹ کا کوٹ"

"اور وہ بیش قیمت تحائف جو میری ادنیٰ سی خواہش پر ہم پہنچائے جاتے تھے وہ ـــ" برتھ نے کہا۔ کالیبہ نے کوئی جواب نہیں دیا "میں سمجھ گئی میں سمجھ گئی" برتھ نے کہا۔ اب میں تمہاری طرف دیکھ رہی ہوں اپنے پیارے محبت کرنے والے باپ کی طرف مجھکو بتاؤ وہ کیسے ہیں" "ایک بوڑھا آدمی، نحیف و خمیدہ۔ سفید بالوں والا۔ رنج و غم اور محنت شاقہ سے خستہ حال۔ ایک ناتوا احمق اور فریبی بوڑھا"

اندھی لڑکی نے اپنے آپ کو باپ کے شانوں پر ڈال دیا۔ اور اس کے سفید سر کو اپنے بازوؤں میں لیکر کہا "یہ میری بصارت ہے یہ میری بصارت عود کر آئی میں اندھی تھی مگر اب مجھے دکھائی دے رہا ہے میں نے اس وقت تک اپنے اصلی باپ کو نہیں دیکھا تھا میں سمجھتی ہوں کہ یہ ناتواں بوڑھا ہی خوش وضع خوبصورت اور تنومند باپ ہے جس نے مجھے ایسے پیار محبت سے رکھا۔ ایسی جاں نثاری سے پرورش کیا میرے پیارے باپ تمہارے سر پر وہ سفید بال نہیں جن کو میں اپنے خدا کی حمد و ثنا کے وقت بھول جاؤ" کالیبہ نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا وہ تنومند خوش وضع نیلے کوٹ والا باپ کہاں گیا میری بچی" "نہیں۔ پیارے باپ وہ نہیں گیا کوئی چیز نہیں گئی۔ وہ چیزیں جن سے مجھے محبت تھی جنکو

میں پیار کیا کرتی تھی اور جن کے ساتھ مجھے عقیدت تھی میرے اس فلاکت زدہ بوڑھے باپ میں سب موجود ہیں۔ اور پہلے سے بھی زیادہ۔ میں پہلے بھی خوش و خرم اور سیر چشم تھی مگر اب یہ معلوم کرکے کہ تم کیسے ہوا اور بھی زیادہ صابر و مسرور ہوں۔ ابا میں اب اندھی نہیں رہی۔

نقی

# ریزۂ مینا

## بنامِ شاہدِ نازک خیالاں

اللہ میاں کی بنائی ہوئی اور رسول اللہ کی پھیلائی ہوئی "ملت" میں کون ایسا مرد ہے جو احکام کی پابندی نہ کرے اور اگر نہیں کرتا تو کون ایسا دبلے سے دبلا اور چھوٹی سے چھوٹی داڑھی والا مولوی ہے جو سینہ تان تان کر اور داڑھی پر ہاتھ پھیر پھیر کر اس شخص پر ارتداد کا فتویٰ عاید نہیں کرتا پھر بتائیے اسلاف کی بنائی ہوئی اور آپ کی پھیلائی ہوئی ملت ادبی پر عمل نہ کرنے والا کیوں موردِ عتاب نہ ہو۔

ہم جیسے ساقی کے معاون خصوصی اس وقت ہمارا فرض ادبی تھا کہ زیادہ نہیں تو کم از کم دو عدد چوکس مضامین سالنامہ کی تقریب پر پیش کرتے۔ مگر آہ دیکھئے ہماری کوتاہ عملی کے ہم اس موقعہ پر حرف غلط کی طرح غائب۔ پھر کیا وجہ ہے آپ موچھوں پر تاؤ دیکر اظہار ناراضگی نہ کریں آنکھیں نکال نکال کر نہ دھمکائیں زانو پر ہاتھ مار مار کر الزام نہ عاید نہ کریں اور ہم ہیں ع سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے نہ کہیں۔ واللہ ثم باللہ۔ کہئے اور خوب کہئے اور جب غصہ ٹھنڈا ہوجائے تو دو باتیں بطریق اعتذار نہ سہی محض عذرِ گناہ بدتر از گناہ ہی سمجھکر سن لیجئے ع شاید کہ نہیں بیضہ برآرد پر و بال۔

بھائیو! غور کرنے کی بات ہے اللہ اور رسول والی ملتِ بیضا میں جہاں عاملین کیلئے سخت تاکید عمل ہے وہاں قاصرین کے لئے "ایام آخر" جیسی صدہا مراعات بھی ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ آپ کی ملت ادبی میں۔ خیر بی ہنو آخر یہ کیوں سمجھ لیا جائے کہ ہم بھی مسٹر بلند شہری کی طرح ہمیشہ صفِ ادب سے غائب رہا کرینگے۔ ان کو صیغۂ واحد غائب کی گردان ازبر ہوگئی ہوگی یہیں تک غنیمت تھا مگر انھوں نے تو صیغہ جمع غائب کی بھی گردان کر ڈالی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مدیر اعزازی اور رسالہ دونوں غائب۔ اول تو ہم کو صرف و نحو پر اتنا باعمل عبور ہی نہیں اور پھر ہم نے غائب کے صیغوں کی بہ نسبت "حاضر" کے صیغوں پر زیادہ بقول شخصیکہ "ریاض" کیا ہے۔

ہم بکار سرکار قیصر ہند (On His Majesty's Service) ہونے کی حیثیت سے عدیم الفرصتی اور "حیران بودن" کا اعتذار بھی نہیں پیش کرسکتے کہ جاڑے کے موسم میں جب دو غزلہ اور سہ غزلہ اشعار کی طرح اس وقت فرصت کی دو منزلہ اور سہ منزلہ راتیں ہم پہنچ گئی ہیں اور خدا کے فضل سے یابوئے تخیل کو گرمانے اور مصروف جولانی کرنے کے لئے دن رات میں کئی پیالی چا اور کئی من روئی کی توفیق علی اللہ میاں نے خوب دی ہے تو یہ عذر غلط ہے یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی ہم مضمون نہ لکھ سکے۔ ہاں صاف بات یہ ہے کہ مضمون قلم برداشتہ لکھنے یا کاوش کے ساتھ اور وہ مضمون جواہر ریزے ہوں یا سنگریزے ہمیشہ نتیجہ ہوگا اس دماغی کاوش کا جو مضمون نگار کو کبھی کبھی عارض ہوجایا کرتی ہے یعنی مضامین کے جراثیم دماغ میں پیدا ہوکر جب کسی مرد خدا کے دماغ میں کھلبلی پیدا کرتے ہیں تو وہ

غریب شیاف قلم کے ذریعہ ان کو صفحۂ قرطاس پر خارج کرتا ہے اور اس مسہل دماغ ہو جانے سے اسے چین پڑ جاتا ہے۔ ہم اس حقیقت سے کب انکار کر سکتے ہیں کہ اس خارش دماغی کا دورہ ہم پر نہیں پڑا اور ہم مبتلائے فکر نہیں ہوئے فرق یہی ہے کہ مسہل دماغ نہ ہو سکا اور ہم گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل (حسرتا واصعیبتا) کہ جس وقت یابوئے تخیل نے کھونٹے سے تھل کر مشام دماغ پر ٹاپیں مارنی شروع ہی کی تھیں کہ عجب سانحہ پیش آ گیا یعنی آبگینۂ دل کو ارتقا کی ایک لات لگی اور وہ چور چور ہو گیا پھر کیا تھا معلوم ہوا کہ بحر قلزم اُبل آیا۔ بحر الکاہل میں طغیانی آئی اور اس جوار بھاٹے کا یہ اثر ہوا کہ فرش دماغ پر تمام کیچڑ اور دلدل ہو گئی۔ اور یابوئے تخیل اس میں پھنس کر رہ گیا۔ سارا مواد مضمون غریب کی پیٹھ پر لدا رہ گیا اور ساقی کا کاروانِ ادب تیار و مرتب ہو گیا اور ہم سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائیگا جب لاد چلے گا بنجارا۔

آپ تو ہماری غیر حاضری پر بجائے عذرِ معقول سننے اور ہمدردی کرنے کے ہم پر غصہ کرینگے، اور ہم کس سے کہیں۔ کس سے فریاد کریں اس حسن سلوک کا جو بھائی ڈارون نے چلتے چلاتے ہم سے کیا۔ کس کا مضمون اور کس کا کچھ سب نذرِ آتش ہو گیا۔ اب ہم ہیں اور مسئلہ ارتقا کی آخری کڑی اور بس۔ ... بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ سامان نکلا۔

اللہ رے معراج کمال اس حقیر ناچیز کیڑے کی جو بشکل "نقطۂ حیات" اول اول عالم لاہوت سے طرف عالم وجود کے آیا اور پھر اس پر فطرت کی کارستانیاں کہ دن رات اس کو مسلا اور رگڑا پھر کیا ہوا اس نقطۂ حقیر کا حشر۔ ذرا اس ستم ظریفی کو ملاحظہ کیجئے کہ یہی حقیر الجسم نقطۂ حیات ... پسوے پل پل کے بھینسا ہوا۔ اتنی قلابازیاں کھائیں اور ہر قلابازی پر صورت گذشتہ کے مقابل میں "نادر" ہی بنتا اور سنورتا رہا۔ آہ کیا ہی اچھا ہوتا کہ جب یہ نقطۂ حیات آخری قلابازی پر بھینس ہی بنکر رہ جاتا کم از کم اس دنیا کو دودھ دہی کا آرام رہتا۔ اور ہاں خوب یاد آیا صرف دودھ دہی ہی نہیں بلکہ خالص گھی میسر آتا اور کوکو جم سے نجات ابدی حاصل ہوتی۔ صفحۂ عالم پر دودھ کی نہریں، اور سمندر بہتے جن میں مکھن کے "برف تودہ" ہوتے اور اس دنیا کو۔ اس معمورۂ کلاں کو ہم "شیرستان" کہہ کہہ کر فخر کیا کرتے۔ مگر آہ ان مقدرات کو کیا کہیے کہ "شامت اعمال ما صورت نادر ون گرفت" اس نقطۂ حیات کو ڈارون صاحب نے جوش ارتقا میں ایک ایسی الوداعی "لات" ——— Parting Kick رسید کی کہ بچاری دنیا "بوزنستان" ہو گئی۔ پھر فرمائیے کہ اب صفحۂ دنیا پر ہر سانس لینے والے انسان کیلئے اس سے زیادہ اور کیا مصیبت ہو سکتی ہے۔ کہ وہ "بندر سے بنا ہے"۔

آپ سالنامہ نکالئے یا اور مخصوص نمبروں کی اشاعت کیجئے۔ مضمون کون لکھے اور کس کے لئے یہاں ہر وقت "بوزنیت" کی کوفت ہڈی پسلی ایک کئے دیتی ہے اور آپ کو "رسالہ بازی" کی لگی ہے پہلے اس بوزنستان کو چھوڑ کر ایسی دنیا میں چلئے جہاں انسانوں کی بستی ہو تو البتہ وہاں دو دو باتیں کہنے سننے کا مزا ہے یقین جانئے کہ جس وقت ساقی کے سالنامہ کے لئے مضمون لکھنے کا ارادہ کیا اسی وقت ع بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانئے کیا یاد آیا۔ ایک ہوک سی کلیجہ میں اُٹھی اور جس طرح ایک ہوس کی ساری محنت تاؤ کھانے کے بعد "سعی لا حاصل" ہو کر رہ جاتی ہے بالکل اسی طرح ہماری ساری تخیل بھی یوں ہو کر رہ گئی ٭

بتانا ایسی دنیا بھی کہیں رہنے کے قابل ہے — جہاں انسان بننے کا شرف بندر کو حاصل ہے

اب چونکہ ساقی کا سالنامہ مرتب ہو چکا ہے اس لئے التماس ہے کہ ہمارا یہ شعر علی الاستفسار شائع کر دیجئے تاکہ پنچایت اس کا فیصلہ کر دے اور ہمیں اطمینان سے مضمون لکھنے کا موقع ملے۔

آپ کا مضحک

میں نے کہا "خس کم جہاں پاک!" ڈاکٹر نے کہا "......خرفت!!" اور شاہ نے کہا "کیا خوب آدمی ہے خدا مغفرت کرے!!!"

ہیملٹ کے جانے کے بعد بہت دیر تک اس مسئلہ پر گفتگو ہوتی رہی۔ اگر شاہ واقعی لڑکی ہوجائیں۔ تو کیا ہوگا؟ ہم دونوں نے انہیں خوب بنایا۔ فاضل کی عدم موجودگی پر افسوس کیا۔ مذاق مذاق میں شاہ کے ہونے والے جانباز عاشقوں کی ایک طویل فہرست مرتب کر ڈالی۔ ڈاکٹر اور ہیملٹ کی آئندہ رقیبانہ چشمک اور سخت دشمنی کا دلچسپ منظر کھینچا۔ ہیملٹ کے زوردار عشقیہ خطوط "پیاری شاہ بیگم کے نام"۔ اُن کی گرفتاری ہیروئین کے چچا مجسٹریٹ صاحب کا غیظ و غضب۔ ہیملٹ کی گرفتاری وغیرہ۔ اور آخری باب اس دلچسپ طربیہ ناول کا یہ تھا۔ کہ ہیملٹ کو جیل خانہ نصیب ہوتا ہے۔ اور ڈاکٹر کو بھی جیل جانا!

غرض یہ مذاق ایک گھنٹہ تک ہوتا رہا۔ میرا کمرہ (جو اندنوں چھوٹا موٹا ہسپتال معلوم ہورہا تھا) دیوارِ قہقہہ بنا ہوا تھا۔ شاہ کا شرمانا لجانا۔ ڈاکٹر کا بات بات پر اُنہیں گلے لگانے کی آمادگی ظاہر کرنا۔ اور میرا دعائیں مانگنا۔ کہ خدا ہماری یہ خواہش پوری کرے اور اسکو عملی جامہ پہنا دیکھنے کے لئے جلد از جلد مجھے صحت کلی عطا فرمائے وغیرہ وغیرہ۔ غرض اُسی رات وہ وہ قہقہوں کے بم اُڑے ہیں۔ کہ میرا گلا بیٹھ گیا۔ آخر میں ڈاکٹر نے سچے دل سے منت مانی کہ اگر شاہ سچ مچ لڑکی ہو جائیں۔ تو میں ساٹھ فقیروں کو کھانا کھلا دوں گا۔ اور حضرت یوسف صاحب و حضرت شریف صاحب قبلہ کی درگاہ پر پھولوں کی چادر چڑھاؤں گا۔ اور پانچ روپے کی مٹھائی فاتحہ دلا کر تقسیم کروں گا۔ اور یہ کروں گا۔ اور وہ کروں گا۔

گیارہ بج رہے تھے۔ جب شاہ اور ڈاکٹر مجھے دوا پلانے کے بعد کل صبح پھر مزاج پُرسی کو آنے کا وعدہ کرکے رخصت ہوئے۔

میں اپنے جُوں جُوں کرنے والے پلنگ پر کروٹ بدلکر سوچنے لگا۔ راتیں میری آج کل سخت پریشانی اور بے خوابی کے عالم میں کٹتی تھیں۔ لیکن آج غور و فکر کے گھوڑے دوڑانے کو کافی مواد فراہم ہوگیا تھا۔ مذاق کو رخصت کرکے میں ٹھنڈے دل سے سوچنے لگا۔ کیا یہ ممکن ہے؟ کیا ایک لڑکی لڑکا ہوسکتا ہے؟ یا کیا ایک لڑکا لڑکی ہوسکتا ہے یا ہوسکتی ہے؟ کیا شاہ عورت ہوسکتے ہیں؟ کیا یہ خدا کی قدرت سے بعید ہے؟ ......اس میں شک نہیں کہ شاہ میں نسائیت بہت پائی جاتی ہے۔ اکثر اوقات نسوانی حرکات ان سے سرزد ہوجاتے ہیں۔ وہ کئی دفعہ اسٹیج پر عورت کا پارٹ نہایت کامیابی سے کرچکے ہیں اور ایک دفعہ اسی کی بدولت سخت مصیبت[1] میں پھنس بھی چکے ہیں۔ بے ضرر ہونے کے باعث نوجوان لڑکیوں کی صحبت اور سوسائٹی میں اُنہیں بلا خوف وخطر خوش آمدید کہا جاتا ہے...... اچھا اگر خوش قسمتی یا بدقسمتی سے وہ عورت ہوجائیں۔ تب کیا ہوگا؟ میں اپنا دل ٹٹولنے لگا۔ کیا میری دس سالہ زندگی اس کے بعد بھی قائم رہ سکے گی؟ خواہ!

[1] ملاحظہ ہو میرا مضمون "تماشے پر تماشہ!" جو "ساقی" کے ظریف نمبر ۱۹۳۱ء میں شائع ہوکر مجھے کافی "بدنام" کرچکا ہے!......(ن)

کبھی نہیں۔ وہ مجھ سے پردہ کرنے لگیں گی اب مجھے بالکل بھول جائینگی ...... سُنا ہو کہ وہ کسی تعلیم یافتہ لڑکی کی محبّت میں مبتلا ہیں۔ اور اُس سے شادی کرنے کی فکر میں ہیں۔ اچھا بالفرض ان کی محبوبہ سے شادی ہوجانیکے بعد اگر وہ یکایک لڑکی ہو جائیں تو اُس وقت کیا ہوگا؟ خیال ہی سے رونگٹے کھڑے ہونے لگے ......!

ارے لاحول ولا! میں بھی کیا احمق ہوں! فضول خیالات دل میں آرہے ہیں ...... کیا یہ ممکن ہے؟ اس وقت لڑکی ہونے کے بعد کیا وہ مجھے چاہیں گی؟ نہیں نہیں! آہ! ان کے چچا صاحب ان کا بیاہ کسی دوسرے کے ساتھ کر دیں گے۔ اور شاہ مجھے اپنے دل سے نکال کر پھینک دیں گے۔ سینے میں کسی عورت کے دو دل نہیں ہوتے ...... تھو تھو! بیکار۔ میرا دماغ بیماری کی وجہ سے ماؤف ہوگیا ہے۔ کیا بیکار خیالات ہیں۔ ناممکن! ...... کیا یہ ہوسکتا ہے کہ "شاہ بیگم" کسی دوسرے سے شادی کرنا پسند نہ کریں اور انکار کر دیں اور مجھ سے رشتۂ ازدواج منسلک کرنا چاہیں؟ کیا ہندوستانی لڑکی کو اس کا حق حاصل ہے؟ کیا ہندوستانی ماں باپ یا سرپرست اتنے سمجھدار ہیں کہ اس کو گوارا کریں؟ کیا ......؟ کمزوری کی وجہ سے مجھے چکّر سا آنے لگا۔ چراغ کی بتی عجیب طرح میری کمزور آنکھوں کے آگے ناچنے لگی۔ ایسا معلوم ہوا غنودگی طاری ہو رہی ہے اور پھر مجھے معلوم نہیں کیا ہوا؟

---

ایک روز کا ذکر ہے۔ میں بھائی چغتائی کی ننھی منّی کتاب "تعویذ" پڑھ رہا تھا۔ مجھے اس کا احساس ہو رہا تھا کہ میں اب صحت مند ہو چلا ہوں اور دُنیا واقعی رہنے کے قابل جگہ ہے۔ کتاب کے مزے لے رہا تھا۔ کہ اتنے میں فاضل حسبِ معمول گھر سے دس گز کے فاصلہ سے آوازیں دیتا اور گڑبڑ کرتا ہوا آدھمکا۔ چہرہ مارے جوش کے لال انگارا ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں زبردست چمک پیدا ہو گئی تھی۔

"اماں۔ کچھ سُنا تم نے؟ کچھ سُنا بھی؟" اُس نے پکار کر پوچھا۔

"کیا؟ کیا؟" میں نے کہا۔ "میں نے کچھ نہیں سُنا۔"

"ارے یار۔ تُو حیدر آباد میں رہتا ہے۔ یا کہیں اور؟ ایسا عظیم الشان واقعہ ہو جائے۔ اور تو ابتک بے خبر ہے"

میں نے بے صبری سے پوچھا۔ "کچھ کہے گا بھی۔ یا یونہی فضول بکواس کرتا جائیگا؟ آخر ہوا کیا؟ —— تیری بیوی نے بچّہ دیا؟"

کہنے لگا۔ "نہیں! لیکن سارے خاندان میں سنسنی پھیل گئی ہے کھلبلی مچی ہوئی ہے۔ ہُلّڑ مچنا باقی رہ گیا ہے۔ جس کو دیکھو کانا پھوسی میں مصروف ہے ہر طرف کھُسر پھُسر سے بلا کا شور ہو رہا ہے!"

"یار اب تُو بہکیگا بھی۔ یا ایک آدھ چانٹا رسید کروں؟" میں نے کتاب پھینک کر کہا۔ "یوں کب تک ترسائیگا؟ ہوا کیا؟ آخر ہوا کیا؟ بول بھئی بول! میں ہمہ تن گوش ہوں۔"

ہنسکر بولا۔ "ہوتا ہوتا کیا؟ میں یونہی مذاق کر رہا تھا تجھ سے۔ کوئی خاص بات نہیں۔"

میں نے جھنجھلا کر کہا "ہٹ تیری دغابازی کی! تو اپنی ان چالوں اور چالاکیوں سے کب باز آئیگا؟........ اچھا یہ کونسا نیا سگریٹ ہے؟"

میں نے سگریٹ سلگا کر کتاب اٹھالی۔ اور پڑھنے لگا۔ تھوڑی دیر تو فاضل کرسی پر بے چینی سے پہلو بدلتا اور سگریٹ دھنکتا رہا۔ پھر بولا "کوئی خاص بات نہیں۔ کیوں آ گئے نا چکر میں؟ میں صرف تمہیں آزمانا چاہتا تھا۔ پریشان کرکے۔ اہاہاہا!"

میں نے ڈانٹ کر کہا "اب دماغ مت چاٹ بھئی۔ ذرا پڑھنے دے"

کرسی سے اٹھکر کہنے لگا۔ "اچھا لو میں جاتا ہوں۔ مطالعہ میں خلل ہو رہا ہے۔ عظیم بیگ کی کتاب ہے؟ کیسی ہے؟........ اب تو چلدیا۔ خدا حافظ!"

اور ہاتھ ملانے کے بعد گلی میں جاکر بائیسکل ہاتھ میں لی اور کھڑکی کے سامنے کھڑے ہوکر پکارا "میں رخصت ہوتا ہوں اب صرف تم سے یہ کہنے آیا تھا۔ کہ........ شاہ لڑکی ہوگیا! خدا حافظ!"

میں کرسی پر سے تقریباً گر پڑا۔ اور سنبھل کر اُٹھتے ہی اس طرح باہر بھاگا۔ جیسے کوئی مریض خواب میں بھاگتا ہوگا! بڑی مشکل سے فاضل ہاتھ لگا۔ ایک سیکنڈ کی دیر اور ہوتی۔ تو موذی فرار ہوگیا ہوتا۔ پہلے تو دو تین گھونسے میں نے اُس کے رسید کئے اور پھر حال دریافت کیا۔ کہنے لگا "شاہ واقعی لڑکی ہوگئی ہے۔ یا یوں کہو ہو رہی ہے"

میں نے ہنسکر کہا۔ "ابے تو جھوٹ بول رہا ہے۔ اب تیری کسی بات کا یقین نہیں آتا۔ یقیناً تو مذاق کر رہا ہے"

سنجیدہ صورت بناکر بولا۔ "اب تم مذاق سمجھو تو اس کا کیا علاج؟........ نہیں یار یہ واقعہ ہے۔ سب گھر میں حیران و پریشان ہیں۔ کہ کیا ہوا۔ ہوا یہ کہ پرسوں رات کو شاہ سوئے اچھے خاصے۔ صبح کو اٹھکر کیا دیکھتے ہیں........ کیا دیکھتے ہیں کہ........ کان لاؤ اپنا ادھر۔ دیوار ہم گوش دارد!........ ہاں ہاں! جھوٹ نہیں۔ کچھ شبہ ہوا۔ اور غریب ڈر گیا کہ یا اللہ یہ کیا ہوگیا۔ ڈرتے ڈرتے اُس نے راز میں چچا جان سے کہدیا......"

میں نے فٹ نوٹ کے طور پر بڑھایا۔ "اچھا کیا۔ انہوں نے ایسے موقعوں پر شرم کو بالائے طاق رکھدینا چاہئے۔ ہاں تو انہوں نے مجسٹریٹ صاحب سے کہدیا۔"

کہنے لگا۔ "ہاں۔ جھٹ سے انھوں نے بڑے بڑے ڈاکٹروں کو بُلوایا۔ نارمن واکر اور کرنل فرینکلن اور ہارٹ وغیرہ آئے۔ انھوں نے باضابطہ طبی معائنہ کیا۔ اور مشوروں کے بعد کہنے لگے کہ......"

"مشوروں کے بعد کہنے لگے کہ........؟"

"مشوروں کے بعد کہنے لگے کہ یہ نوجوان جلدی جلدی منازل طے کر رہا ہے اور عورت ہو رہا ہے اور دو ایک روز کے اندر اندر ایک نہایت حسین لڑکی بن جائے گا۔ چچا جان نے ہزار کوشش کی کہ علاج اور اپریشن کیا جائے تاکہ آنے والی بلا یعنی نسوانیت دفع ہو جائے۔ پر ڈاکٹروں نے صاف کہدیا کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ کوئی انسانی قوت اس نوجوان کو عورت بننے سے روک نہیں سکتی۔ اُن کا کہنا یہ ہے کہ لڑکے میں پہلے سے صلاحیت

لڑکی بننے کی موجود تھی۔ اور اب وہ یقیناً لڑکی ہو جائیگا۔ بلکہ اب تک پون سے زیادہ لڑکی میں تبدیل ہو چکا ہے"

دفعتاً مجھ پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ دیدے پھاڑ کر فاضل کا چہرہ گھورنے لگا۔ شاہ، پیارا شاہ عورت ہو گیا یا ہو گئی! یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا جس بات کا ذکر ہم لوگ مذاق مذاق میں کر رہے تھے۔ وہ آخر ہو کر ہی رہی۔ ڈاکٹر صاحب سُنیں گے تو کیا کہیں گے؟ ہیملٹ کو معلوم ہو تو اس کا کیا حال ہو! غرض یہ اور ان کے علاوہ بہت سے اور خیالات بجلی کی سُرعت سے میرے دماغ میں آ رہے تھے۔

ہم نے ایکدم سے چونک کر پوچھا" اور کچھ معلوم ہوا۔ شاہ کا کیا حال ہے؟"

فاضل کے متبسم چہرہ پر یکبارگی غم کے بادل گھر آئے۔ اُس نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا "جب سے ڈاکٹروں کا یہ منحوس فیصلہ سُنا ہے۔ بس رو رہا ہے اور رو رو کر اپنی جان کھو رہا ہے۔ کل سے کھایا پیا کچھ نہیں اور رُقیہ سے معلوم ہوا۔ کہ اس کی اب یہی تمنا ہے کہ کچھ کھا کر سو رہے۔"

میرے دل پر ایک چوٹ سی لگی۔ ایسا معلوم ہوا کہ سینہ پھٹ پڑیگا۔

فاضل نے سلسلہ جاری رکھا "...... کسی کی مانتا نہیں۔ لاکھ لاکھ سمجھایا منایا۔ رُقیہ اور صمدانی نے منت سماجت کی غمزدہ چچا جان جھوٹ مُوٹ غصّہ ہوئے۔ میں اور شفاعت اسے راضی کرنے گئے۔ مگر وہ ہم لوگوں کے سامنے ہونے ........"

یا اللہ! یہ کیا ہو گیا! تین چار دن کے اندر کیا ہو گیا؟ کیسی ناقابلِ بیان اور ناقابلِ برداشت تبدیلی ہو گئی! مجھے خود یوں محسوس ہونے لگا۔ گویا میں عورت ہو رہا ہوں! گویا زمین میں کرسی سمیت دھنستا چلا جا رہا ہوں۔ فطرت کی یہ کیا ستم ظریفی ہے۔ کہ بائیس سال تک تو ایک انسان کو مرد بنائے رکھا۔ اور پھر ایکدم سے اس کے تمام مردانہ جذبات چھین لئے اور اُسے زنانہ حربے عطا کر دئے! گویا پیاسے کے مُنہ تک پانی کا کٹورا لے گئے اور پھر فوراً ہاتھ کھینچ لیا...... اور پھر عنقریب اُس کی شادی شبیر میں سے ہونیوالی تھی۔ خدایا!...... اگر ایسا ہی عورتوں کی آبادی میں اضافہ مقصود تھا تو شاہ کو اوّل ہی لڑکی پیدا کیا ہوتا.......

فاضل کچھ دیر خاموش رہا۔ اُس کی طبعی خوش مزاجی نے آہستہ آہستہ غم کی گھٹا کو دُور کر دیا مسکرا کر کہنے لگا "خیر جو ہوا سو ہوا۔ خدا کو یہی منظور تھا۔ افسوس کرنے سے کیا فائدہ؟ مشیت ایزدی میں کیا چارہ؟..... ہاں تو اب شاہ کو روزانہ بلا ناغہ ڈاڑھی مونچھ کے صفائے کی ضرورت محسوس نہ ہوگی۔ اللہ میاں نے اسے ہمیشہ کے لئے اُسترے اور حجام سے بے نیاز کر دیا۔ خدا تعالےٰ بھی کتنا قدرت والا ہے! بقول فقیروں کے

ع مالک ہے نام تیرا اے بے نیاز مالک!"

میں نے رُکتے رُکتے پوچھا۔ "اور بال —— شاہ کے بال؟"

فاضل نے جواب دیا "شاہ کے بال اب آہستہ آہستہ بڑھتے جائینگے اور —— خدایا! چوٹی کی صورت اختیار کر جائیں گے۔ مارِ گیسو کا پھر کیا کہنا؟ ناگ ہوں گے دو ناگ۔ ابھی سے یہ مصرعہ میرے وردِ زبان ہوا جا رہا ہے

کہ ع سانپ لہرا رہے ہیں دریا میں!"

اگر ہیملٹ میں یہ خصوصیت ہے کہ وہ ہنستوں کو رُلاتا ہے۔ تو فاضل کو روتوں کو ہنسانا آتا ہے۔ اور خوب آتا ہے۔ اس کی خوش مذاقی اور شوخ مزاجی ایک متعدی چیز ہے۔ چنانچہ میں مسکرا کر بولا "مگر فاضل میری یہ رائے ہے کہ "شاہ اب بھی لیڈیوں کی طرح بال کٹواتے رہیں۔ تو اچھا ہے۔ تاکہ حیات رفتہ کی کچھ نہ کچھ یاد تازہ ہوتی رہے۔ کیوں تمہارا کیا خیال ہے؟"

فاضل نے سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے ہاتھ ہلا کر کہا۔ "اونہوں! اونہوں اس میں ایک خرابی ہے' وہ یہ کہ ان کی سنہری زلفوں کی شان میں شعر کہنے کا رستہ بالکل بند ہو جائیگا۔ اور ہماری ان نئی سالی صاحبہ کی شوخی، شرارت دل لگی، مذاق وغیرہ کے سلسلہ میں یہ شعر گانے کا تو موقع ہی نہیں ملیگا۔ کہ ؎

ذرا اُن کی شوخی تو دیکھنا لئے زلف خم شدہ ہاتھ میں ✤ میرے پیچھے آکے دبے دبے مجھے "سانپ" کہہ کے ڈرا دیا!

اس پر قہقہہ بلند ہونا ایک لازمی امر تھا۔ میں بے تابانہ ہو کر بولا "واللہ فاضل۔ اب تمہیں ایک تازہ بتازہ سالی ستانے اور ٹھٹھا مذاق کرنے کو مل گئی تم نے بھی اس سلسلہ میں کتنے درجے طے کئے ہیں! راہِ سلوک کے درجوں سے بھی بڑھ گئے پہلے شاہ تمہارے شناسا تھے۔ پھر دوست ہوئے۔ اور پھر سالے ہوئے...... اور اب سالی! اسی کو اہلِ خیال انقلاب لاجواب کہیں گے"۔

فاضل ایک ختم ہونے والے سگریٹ سے دوسرا سگریٹ سلگانے لگا اور پھر بولا "ہوں ہوں! بہ سوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجی ست!"

"مگر فاضل" میں نے سنجیدگی سے کہا "مگر خیال تو کرو۔ اس غریب کے جذبات و احساسات اب کیا ہوں گے؟"

ظالم ہنستے ہوئے کہنے لگا "اس کی حیثیت تو اس وقت ایک ڈبل ریڈ کے ہارمونیم کی ہے!"

"یار تم بڑے سخت دل ہو" میں نے ہنسکر سرزنش کے طور پر کہا "تمہارے سینہ میں دل نہیں معلوم ہوتا، خیال تو کرو۔ اس وقت شاہ کے نہیں شاہ بیگم کے صیغے...... اچھا اس کا نام کیا رکھا گیا ہے؟"

"اب تک تو کچھ نہیں" اُس نے چونک کر کہا "ارے نام کی تبدیلی بھی ایک نہایت اہم بات ہے مگر پریشانی اور حیرانی میں کسی کو اس کا خیال تک نہیں آیا — یار اب تو پھر سے شاہ کا عقیقہ ہونا چاہیئے۔ بکرے ذبح ہوں۔ تباشے تقسیم ہوں۔ اور تقریب تسمیہ خوانی دوبارہ ہو۔ اور شاہ کا نام رکھا جائے۔ نور النساء بیگم قریشی بی۔ اے۔ چچا جان کے آگے میں یہ تحریک پیش کروں گا۔ بڑی ضروری بات یاد دلائی تم نے"۔

میں نے کچھ سوچ کر کہا "فاضل ایک اور نہایت اہم مسئلہ رہ گیا ہے۔ بلکہ وہ سب سے زیادہ اہم اور سنجیدہ مسئلہ ہے"۔

"وہ کیا؟ وہ کیا؟" فاضل نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

"شاہ بیگم کی شادی!" میں نے اختصار کے ساتھ کہا۔

فاضل فرطِ حیرت و مسرت سے ہوا میں اچھل پڑا۔ ایک فٹ کرسی پر سے اچھل پڑا۔ (میں نے یہ ایک فٹ اندازہ پر لکھ دیا ہے۔ ممکن ہے ڈیڑھ فٹ ہو۔ کیوں کہ میں نے اس وقت ٹیپ لیکر ناپا نہیں تھا!) غالباً وہ اپنے آپ کو بُرا بھلا کہہ رہا تھا۔ کہ یہ لاجواب خیال اس کو پہلے کیوں نہ سوجھا۔

"شادی! شاہ کی شادی!" اس نے بے اختیار ہو کر پکارا۔ "یار اللہ قسم! تنخواہ زیادہ ہوتی۔ تو میں کر لیتا۔ اسلام میں چار بیویاں جائز ہیں۔ اس قدر خوبصورت (اور لائق) لڑکا لڑکی بار بار تھوڑی ملتی ہے۔ اور پھر چچیری سالی۔"

"مگر فاضل! شاہ بچارے کی شادی عنقریب ہونے والی تھی۔" میں نے یادہ ہانی کے طور پر کہا "خیال تو کرو۔ اُس شیریں کا کیا حال ہوگا۔ جس کا شاہ شوہر ہونے والا تھا۔ اس کی تمام اُمیدوں پر پانی پھر گیا۔ اور پھر شاہ کو جب شیریں کا خیال آتا ہوگا۔ تو کیسا اُس کے سینے پر سانپ لوٹتا ہوگا۔"

"ہاں بھئی! تم ٹھیک کہتے ہو۔ مگر تم نے یہ نہ سوچا کہ اگر شاہ شیریں سے شادی کرنے کے بعد اس سانحہ کا شکار ہوتے تو اس وقت کیا ہوتا! بولو کیا ہوتا؟"

میں آخر کیا بولتا؟ اس خوفناک خیال سے رونگٹے کھڑے ہونے لگے۔ واقعی اُس وقت ہونے کے بجائے اگر شاہ شادی کے بعد عورت ہو جاتے تو اُس وقت کیا ہوتا؟ سمجھ میں نہیں آیا۔ کہ اس کے لئے خدا سے شکوہ کروں یا شکر ادا کروں!

فاضل نے کہا "...... خیر جانے دو ان افیونی باتوں کو۔ اور ہونے والی باتوں کی فکر کرو۔ کہ اب شاہ کی شادی کس سے ہوگی!"

میں نے کہا "سب سے پہلے تم کو معلوم ہے، ہیملٹ اُمیدوار ہوں گے۔ تم دیکھنا میری یہ بات پیشنگوئی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اِس کے بعد ڈاکٹر ہیں اور پھر شاہ کے دیگر بے شمار دوست، مداح اور ملاقاتی۔ تم دیکھنا سب کے سب معلوم ہونے پر مجسٹریٹ صاحب کے پاس شادی کی شاندار درخواستیں نہ بھیجیں تو میرا نام ......"

بات کاٹ کر کہنے لگا۔ "یہ سب کچھ تو سہی۔ مگر سب سے زیادہ حقوق میرے خیال میں تمہارے ہیں۔"

میں یہی بات اُس کی زبان سے کہلوانا چاہتا تھا۔ ایک ووٹ میرے حق میں دینے والا ابھی سے فراہم ہو گیا۔ اور پھر میں نے سوچا یہ ووٹر بعد میں کنویسر کی خدمات میری طرف سے انجام بھی دیگا۔ مگر پھر ایک مایوس خیال دل میں آیا اور دل ڈوبنے لگا۔

میں نے بے پروائی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ "مگر یہ بھی ممکن ہے کہ شاہ اب ہرگز شادی نہ کریں اور ساری عمر ناکتخدا رہنا پسند کریں۔ آج کل تعلیم یافتہ لڑکیوں میں ازدواج کے خلاف زبردست پروپیگنڈا جاری ہے۔"

"لیکن یہ ناممکن ہے۔" فاضل سر ہلا کر بولا۔ "سراسر ناممکن ہے۔ کب تک آخر کب تک؟ عورت بننے کا یہ غم چند دنوں تک رہیگا۔ اس کے بعد جب نسوانی جذبات کا دریا سینہ میں موجزن ہوگا۔ تب ...... تب؟ ......

اس کے علاوہ رشتہ دار اور خصوصاً چچا جان وغیرہ کب راضی ہوں گے۔ کہ ان کی بھتیجی، ہاں جیتی بھتیجی ایک راہبہ

کی زندگی بسر کرے؟ ایک ہندوستانی لڑکی کی یہ خطا کبھی معاف نہیں ہو سکتی کہ......"

اس کے بعد میں نے نہیں سُنا۔ کہ وہ کیا کیا کہہ گیا۔ میں سوچ میں پڑ گیا تھا۔ اور دیر تک سوچتا رہا۔

"کیوں ہے نا؟" فاضل کی آواز کان میں آئی۔

"کیا چیز؟"

"یہی کہ ڈاکٹر اور ہیملٹ کو یہ شاہکار خبر سنانا چاہیئے۔ اب وہیں جا رہا ہوں۔ پھر تازہ بتازہ نو بنو خبریں لیکر آؤں گا۔ کل یا پرسوں۔ خدا حافظ!"

ہاں ضرور وہاں کے حالات معلوم کرتے رہنا۔ میرا اب وہاں جانا بھی عجیب غریب معلوم ہوگا۔ اللہ میاں بھی عجیب ستم ظریف واقع ہوئے ہیں!"

فاضل بائیسکل پر سوار ہوکر رخصت ہوا۔ اور میں سوچنے لگا ـــــ سوچتا رہا۔

(۲)

کئی دن گذر گئے۔ اس اثنا میں کوئی بھی خبر وہاں کی مجھے نہ ملی۔ اور مجھے شاہ کے گھر جانے ہوئے تکلف محسوس ہونے لگا۔ اخبارات میں اس محیرالعقول واقعہ کا ذکر چھپتا رہا۔ مجسٹریٹ صاحب سے رپورٹروں اور نمائندوں کی ملاقاتوں کا حال نہایت جلی حروف میں شائع ہوا تھا۔ اور عجیب غریب عنوانات قائم کئے گئے تھے۔

دو روز بعد ڈاکٹر اور ہیملٹ اس خبر کو سُن کر دوڑے دوڑے میرے پاس آئے۔ ہیملٹ کی حالت عجیب ہوگئی تھی۔ رات کو نہ سونے کی وجہ سے آنکھوں میں حلقے پڑ گئے تھے۔ رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ ڈاڑھی بے تحاشا بڑھ آئی تھی۔ سر کے بال پریشان تھے۔ کچھ دُبلے بھی ہو گئے تھے۔ غرض چہرے سے مریض معلوم ہو رہے تھے۔ اور خدوخال سے ایک عاشق!

ڈاکٹر مارے جوش کے بے حال تھے۔ بار بار سرد آہیں بھرنا۔ اور طرح طرح سے اپنی حیرت واستعجاب کا اظہار کرنا۔ اور گذشتہ رنگین صحبتوں کو یاد کر کرکے افسوس کرنا۔ اور "شاہ بیگم" کا شادی کے تذکرہ پر خاموشی اختیار کر لینا ـــــ ان سب باتوں کو دیکھکر میں فیصلہ نہ کرسکا۔ کہ وہ اس انقلاب پر رنجیدہ ہیں یا خوش!

بہت دیر تک خیال آرائیاں ہوتی رہیں۔ ہیملٹ نے بولنے کی قسم کھائی تھی۔ ڈاکٹر نے ہنسنے کی۔ اور میں نے ہنسنے اور رونے دونوں کی!...... کچھ دیر بعد دونوں رخصت ہوتے۔

اُسی روز شام کو فاضل اور شفاعت دونوں آئے۔ میں نے دل میں کہا۔ دیکھو تو کیا خبر لائے ہیں؟ "شاہ کا کیا حال ہے؟ غریب کو ساڑی چولی اور چوڑیاں پہنا چکے یا نہیں؟ اور کون کون سے زیورات اس بدنصیب پر لادے گئے ہیں؟"

شفاعت کا چہرہ اُس وقت اچھا خاصا اخبار کا کالم بنا ہوا تھا۔ معلومات سے پُر! "لو بھئی مبارک!"

اُس نے علیک سلیک کے بغیر آتے ہی کہا "نوشابہ تم کو مبارک! کھلاؤ مٹھائی!"

نوشابہ! کانوں کو یہ نام کیسا بھلا معلوم ہونے لگا! کیا پیارا نام ہے! نوشابہ! اس میں موسیقی ہے۔ حلاوت ہی شیرینی ہے۔ شعریت ہے۔ بے اختیار اس شخص کے لئے دل سے دعا نکلی۔ جس نے یہ لاجواب نام تجویز کیا ہوگا۔ کہاں شاہ اور کہاں نوشابہ!

فاضل یوں گویا ہوا۔ "شفاعت نہیں معلوم یہ شخص اس پیکرِ حُسن و رعنائی کو اب دیکھکر کیا کہے گا اور کیا کرے گا۔ میرے خیال میں سبحان اللہ! کا نعرہ مارکر بیہوش ہوکر گر پڑیگا!"

"واقعی واقعی" شفاعت نے میری پیٹھ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا "میں نے جب شاہ کو، ارے لاحول ولا! نوشابہ کو دیکھا، چُھپ کر چوری سے، تو نہ معلوم میرے مُنہ سے خوشی کی چیخ کیوں نہ نکل گئی؟ میں پہلے پہل صمدانی کو دیکھکر بھی اتنا وارفتہ نہ ہوا تھا۔ چشمِ بد دور! کیا لڑکی نکلی ہے یار! گھر روشن ہوگیا ہے.........اور ہاں۔ نوشابہ نے تمہیں سلام کہا ہے!"

ایسا معلوم ہوا۔ گویا دل نے سینے میں ایک زبردست قلابازی کھائی ہے اور دفعتًا پھر مجھے بخار چڑھ آیا ہے اس خیال سے کہ بیہوش ہوکر نہ گر پڑوں۔ بستر پر جاکر لیٹ گیا۔ میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں! میں نے کچھ جواب نہ دیا۔ تو فاضل کہنے لگا "کیوں کیا بات ہے؟ وعلیکم السلام کیوں نہیں کہلواتے؟ اس میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے کی کیا بات ہے؟"

میری نظروں کے سامنے گذشتہ ایام اور صحبتوں کے نقشے پھر رہے تھے۔ سینے پر سانپ لوٹ رہے تھے اور میں بستر پر۔ قدرت کے کرشمے بھی عجیب ہوتے ہیں۔!

شفاعت نے پان کی ڈبیہ نکال کر پان کھایا۔ اور کہا "صمدانی کے ابا کو نوشابہ کی شادی کی بڑی فکر پڑگئی ہے" میں نے بے قابو ہوکر پوچھا "کیا ابھی سے؟"

"کیا کریں؟" شفاعت نے جواب دیا "ہمارے خسر صاحب پریشان ہوگئے ہیں ان کے پاس اَنگنت خطوط اور شادی کی درخواستیں معہ تصویروں کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی آرہی ہیں۔ روزانہ ڈاک سے کوئی نہ کوئی درخواست ضرور آتی ہے۔ خسر صاحب تنگ آگئے ہیں۔ اب بتاؤ۔ کریں تو کیا کریں؟"

مجھے بالکل تعجب نہ ہوا۔ میں سمجھے ہوئے تھا کہ یہ ضرور ہوکر رہے گا۔ بلکہ مجھے سخت حیرت ہوتی۔ اگر یہ نہ ہوتا۔ فاضل نے جلدی سے ہنسکر کہا "خطوط کی وہ بھرمار ہورہی ہے کہ خدا کی پناہ۔ توبہ ہی بھلی! اُمیدواروں کی یہ حالت ہے۔ جیسے دفتر کی کسی خالی جایئداد کا اشتہار دیکھکر ہوتی ہے۔ ان میں سے اکثر ایم۔ اے اور بی۔ اے پاس جنٹلمین ہیں اور ہر نوجوان اپنے خط میں دست بستہ استدعا پیش کرتا ہے کہ مجھے شرفِ دامادی بخشئے۔ اب یہ اشتہار اخبارات میں دینے کی ضرورت پیش آئی ہے اور بڑی طرح پیش آئی ہے۔ کہ:۔

# "شادی کی عدم ضرورت!"

ایک مشین اور تعلیم یافتہ بی۔اے پاس لڑکی (جو پہلے لڑکا تھا) کے لئے شریف خاندان تعلیم یافتہ نوجوان کی درخواستوں اور تصویروں کی ضرورت نہیں ہے۔ اور بالکل نہیں ہے۔ لہذا کوئی صاحب اس اعلان کے بعد خط یا تصویر ارسال کرنے کی گستاخی نہ کریں۔ بصورت عدم تعمیل حسب ضابطہ ضروری کارروائی عمل میں آئے گی۔ بلکہ فوجداری ہوجائے گی۔ اور کوئی عذر مسموع نہ ہوگا۔ آج بتاریخ ۱۵ اکتوبر میرے دستخط اور مہر عدالت کے ساتھ جاری کیا گیا۔ فقط۔

(مہر دستخط) مرزا شجاعت مجسٹریٹ"

اس پرسب نے ایک فلک شگاف قہقہہ سر کیا۔ شفاعت اور فاضل دونوں قہقہہ مار کر ہنسنے میں ڈگری یافتہ ہیں۔ اور میں نے بھی اس وقت ثابت کر دیا کہ یقیناً میں بھی یہ اعزازی ڈگری حاصل کرنے کے بالکل قابل ہوں۔ سوچنے لگا کہ کیا میں اس سے پیشتر اس قدر ہنسا ہوں۔

فاضل قہقہوں کے درمیان کہہ رہا تھا "گھر کیا ہے۔ اچھا خاصہ پوسٹ آفس ہو آج کل میں اور شفاعت اور صمدانی لوکا کی خدمات انجام دے رہے ہیں"

میں نے دبی آواز سے کہا "آخر مجسٹریٹ صاحب نے کیا فیصلہ کیا؟"

"فیصلہ؟ فیصلہ کیا کرتے؟" شفاعت نے کہا۔ "ابھی خطوط چھانٹنے سے فرصت کہاں ملی ہے؟ بہت سے ایسے اُمیدوار درخواست گذار تھے جو کافی تعلیم یافتہ نہ تھے یا بدصورت تھے۔ یا نجیب الطرفین نہ تھے۔ ان سب کے خطوط اور تصاویر کو صمدانی نے بلا پس و پیش ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔ اور......"

فاضل کہنے لگا "اب آٹھ دس ہی طلبگار باقی رہ گئے ہیں۔ اور ہیملٹ اور ڈاکٹر کے نام بھی اس معرکتہ آلارا فہرست میں موجود ہیں"

"اور فیصلہ کس طرح کیا جائیگا؟" میں نے اپنے آپ کو سنبھال کر پوچھا۔

"مجسٹریٹ صاحب جج ہیں" فاضل نے شفاعت کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ہاں ہاں" شفاعت سر ہلا کر بولا "سب کچھ اُن کی مرضی پر منحصر ہے۔ اور ہماری خواشدامن صاحبہ کی..... مگر ہم لوگ تمہاری طرفداری کریں گے۔ صمدانی تو بڑے شد و مد سے تمہارے حق میں کنوسیں کرنے لگی ہے طرح طرح سے مجبور کر رہی ہے"

خوشی کے جذبے سے میری حالت غیر ہونے لگی۔ مگر میں بھی ایک ہی ریاکار ہوں۔ ایسے موقعہ پر مکاری اور ریاکاری کی سخت ضرورت ہے۔ میں نے آواز پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "واہ! میں کہاں اور مجسٹریٹ صاحب کی بیٹی کی تمنا کہاں؟ جب تک وہ شاہ تھے ہماری اُن کی دوستی تھی۔ مگر اب ...... وہ نوشابہ میں سان گمان

کرنے کی کوشش ایسی ہے........"

"مگر صمدانی سے معلوم ہوا ہے!" شفاعت نے حیرت سے میرا منہ تکتے ہوئے کہا۔"صمدانی سے معلوم ہوا ہے کہ نوشابہ کے دل میں تمہارے سوا کسی کے لئے جگہ نہیں۔ تمہارے لئے سخت بیقرار ہے وہ دن میں کئی کئی بار تمہیں ........"

میں اس سے آگے کچھ نہ سن سکا۔ کانوں میں عجیب قسم کی گونج سنائی دینے لگی۔ ہاتھ پاؤں میں رعشہ سا پیدا ہوا۔ چہرے پر سرخی دوڑ گئی ہوگی۔ مگر بہت جلد میں سنبھل گیا۔

"اچھا اب چلا رہے!" فاضل سگریٹ پھینک کر کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔"ایسے قنوطی نہ بنو۔ تم تو نوشابہ کے انتخاب ہو۔ یہی تمہاری کامیابی کی خاص ضمانت ہے۔ مجھے تم پر رہ رہ کر رشک آرہا ہے!"

شفاعت پان کی ڈبیہ جیب میں رکھتے ہوئے اٹھا۔"تمہارا خط اور تصویر نہ آنا ہی تمہارے لئے بہت مفید ہوا ہے اس کا کافی اثر پڑنے لگا ہے۔ صمدانی کے ابا پر۔ تم کو تو وہ خوب جانتے ہیں۔ سمجھدار اور نہایت سنجیدہ آدمی سمجھتے ہیں۔ اب دیکھو کیا ہوتا ہے۔ مگر جہاں تک میرا خیال ہے۔ صمدانی خسر صاحب کو رضامند کرکے ہی رہیگی۔"

فاضل نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھکر آسمان کی طرف اپنی شوخ آنکھیں اٹھائیں۔ بولا۔"آج سے نماز شروع کردو بیٹا۔ تہجد اور اشراق کی نمازیں تک مت چھوڑو۔ اور دعا کرو۔ سجدے میں گر پڑو۔ خدا کامیابی دینے والا ہے!"

شفاعت نے ہنسکر کہا۔"اچھا اب رخصت ہوتے ہیں۔ کل شام تم فاضل کے مکان پر آؤ۔ صمدانی تم سے مل کر گفتگو کرنا چاہتی ہے۔ اچھا؟"

"ہاں ہاں۔ کل ضرور آؤ۔ بھولنا مت۔ ہم تمہارا انتظار کریں گے۔ شام کے پانچ بجے۔ نوٹ۔ وقت کی پابندی لازمی ہے۔" فاضل نے ہاتھ ملا کر کہا۔"خدا حافظ!"

دونوں کے جانے کے بعد میں بستر پر لیٹ کر سوچنے لگا۔ کیا میں اتنا خوش نصیب ہوں؟ کیا واقعی نوشابہ بیچاری کے دل میں اب میرے لئے کچھ جگہ ہے؟ نہیں نہیں۔ یہ ناممکن ہے۔ میرا اسکا میل نہیں۔ وہ گریجویٹ ہے اور میں انڈر گریجویٹ۔ وہ مجسٹریٹ کی بھتیجی ہے۔ اور میں ایک معمولی خاندان کا فرد...... کیا میرے رشتہ دار اور بالخصوص والدہ صاحبہ اس رشتہ پر راضی ہو سکتی ہیں؟ کیا مجسٹریٹ صاحب اتنے زیادہ امیدواروں پر مجھے ترجیح دیں گے؟ مجھ میں ایسے کیا سرخاب کے پر لگے ہیں؟...... نوشابہ مجھے چاہتی ہے تو اس سے کیا؟ ہندوستان میں شادی کے معاملے میں لڑکی سے رائے نہیں لی جاتی اور مجسٹریٹ صاحب پکے ہندوستانی ہیں!...... خدایا! تو نے مجھے کاہیکو پیدا کیا......

(۳)

دوسرے روز شام کو میں بہت پس وپیش کے بعد فاضل کے گھر پہونچا۔ سب میرا انتظار کر رہے تھے۔ ا

مارے خوشی کے سب کا بُرا حال ہو رہا تھا۔

مجھے فوراً معلوم کرایا گیا کہ نوشابہ کی اور میری دونوں کی قسمت کا فیصلہ ہو چکا ہے!

مجسٹریٹ نے دس بارہ چنیدہ اُمیدواروں کے ناموں کی چٹھیاں لکھ کر لاٹری اُٹھائی تھی۔ اور کسی کے کہنے سننے کی پرواہ نہ کرکے ایک بچّے کو حکم دیدیا کہ آنکھ بیچ کر ایک چٹھی اُٹھا لو۔ جٹ پر دیکھا تو میرا نام تھا۔

یہ خبر سُنکر میرا دل سینے کے انتہائی اتھاہ گہرائیوں سے اس طور پر اُبھر آیا کہ پھر کبھی ڈوبنے کا نام نہ لیگا۔

فاضل نے میری پیٹھ ٹھونک کر کہا۔ "واللہ تم بڑے نصیبے والے ہو۔ اب کھلاؤ مٹھائی۔ بلاؤ بعد میں کھائینگے شادی کے روز۔ اب تو فوراً ........ اور ہاں اس ہیملٹ کے بچّے کے باپ کو اسم نویسی واپس کر دی گئی ہے۔ اور لکھدیا ہے۔ کہ ہمیں آپ کا پیغام منظور نہیں۔ آپ کا یعنی آپ بیٹے کا۔ اس کا قد تو دیکھو۔ واللہ! ایسے کا موٗ ہوتا ہے۔ پھر صورت شکل ماشاء اللہ بلکہ استغفر اللہ اچھا ہیملٹ ہے ہیملٹ کا شوربہ! ...."

"مگر ہمارے خُسر صاحب کو یہ لاٹری کی خوب سُوجھی تھی" شفاعت نے بیوی پڑھا کر کہا "عجیب غریب طریقہ نکالا دولھا کے انتخاب کا۔ شادی کے معاملہ میں اِس قسم کا فیصلہ آج تک دیکھا نہ سُنا۔ اسکو بالکل ہی تجارتی اہمیت دیدی......"

فاضل نے بات کاٹ کر مجھ سے کہا۔ "ہاں ہاں ہندوستانیت و مغربیت کا اس سے بہتر امتزاج آپکو اور کہیں نہیں مل سکتا۔ مگر کچھ بھی ہو۔ فیصلہ تو تمہارے حق میں ہوا۔ ذرا سوچو تو سہی۔ اگر دوسرے نام کی چٹھی نکلتی۔ تب.........؟"

میں نے سوچا۔ واقعی اِس طریقۂ انتخاب سے میرا نام نہ نکلتا۔ اس وقت میں کیا کرتا؟ اگر بالفرض ہیملٹ کا نام نکلتا.........؟؟؟

فاضل کہہ رہا تھا۔ "تم کو شاید نہیں معلوم؟ روزانہ ہیملٹ عشقیہ خطوط نوشابہ کو لکھ رہا ہے گو ہم لوگ خطوط پڑھکر پھاڑکر پھینک دیتے ہیں۔ مگر بیٹا کو تسلی ہوگی کہ کم از کم نوشابہ اس کے خطوط تو پڑھتی ہے۔ جواب نہ دے تو کیا ہوا؟ ـــــ اور ڈاکٹر کی نسبت سُنا گیا ہے اور با وثوق ذرائع سے سُنا گیا ہے کہ وہ ہر جمعرات درگاہ پر جاتے ہیں۔ اور گڑگڑا گڑگڑا کر دعائیں مانگتے ہیں۔ مدد کہتے ہیں کہ انہوں نے ایک عرضی لکھکر درگاہ پر لٹکادی کہ میری شادی نوشابہ سے کرا دیجئے تو میں ساٹھ فقیروں کو کھانا کپڑا دوں گا۔ اور ساٹھ غلام آزاد کردوں گا۔ اور ساٹھ........"

شفاعت نے مسکرا کر بات کاٹی۔ "ڈاکٹر بہرحال ہیملٹ سے بہتر ہے۔ اور......."

پردے کے پیچھے سے آواز آئی۔ "اور کچھ سُنا آپ نے؟" صمد آپی نے کہا۔ "ہیملٹ روزانہ ہمارے گھر کے چکر کاٹتا ہے میں کھڑکی میں سے کئی بار اسے دیکھ چکی ہوں۔ شاید اس خیال میں ہوں گے جناب کہ نوشابہ کی ایک آدھ جھلک نظر آجائے۔ مجھے اس سے سخت نفرت ہے جی۔ تم کچھ بھی بولو۔ میرا اس کا سامنا کبھی ہو جائے

تو سچ کہتی ہوں) - وہ وہ کوسوں گی اُسے۔ کہ یاد ہی کریگا۔ اور عمر بھر یاد رکھیگا.......“

ہیملٹ نوشابہ بیچاری کے گھر کے چکر کاٹتا ہے! یہ خیال آتے ہی میری نظروں میں وہ سماں پھرنے لگا جبکہ ہیملٹ راتوں کو وقت بے وقت اپنے بورڈنگ سے شاہ کے مکان کو جاتا اور نہ ملنے پر گھر کے چبوترے پر رومال بچھا کر بیٹھ جاتا تھا۔ اور یہ مصرع اُس کے وردِ زبان ہوتا تھا ع ”بورڈنگِ ماغریباں کوئے تو“

غرض اسی طرح بہت دیر تک میں قسم قسم کے خیالات میں غوطے لگاتا رہا۔ اور فاضل اور شفاعت اور صمدانی (پس پردہ سے) باتیں اور دل لگی مذاق کرتے رہے۔ رہ رہ کر مجھے خیال آرہا تھا کہ کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں ........ کیا واقعی میں اتنا خوش قسمت ہوں ”آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے“ والا مضمون تھا۔

اتنے میں اندر سے پان آئے۔ ڈبیہ کھولکر میں نے پان لینا چاہا۔ مگر پان کے علاوہ وہاں کچھ اور تھا۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں اور دھک دھک کرتے ہوئے دل کے ساتھ میں نے پیارا پیارا خط دونوں کی نظر بچاکر اُٹھالیا۔ اور جیب میں رکھ لیا۔ نوشابہ نے مجھے خط بھیجا ہے! میں گھر پہونچکر عزیز از دل و جان نوشابہ کا خط پڑھنے اور اس کا جواب دینے کے لئے بیچین ہونے لگا۔ بے اختیار میری شکر گذار نظریں پردے کی طرف اُٹھ گئیں۔ جس کے پیچھے پیا میر صمدانی براج رہی تھی۔

آواز آئی۔ ”پان تو آپ نے لیا ہی نہیں“

میں نے پان لے کر مُنہ میں رکھ لیا۔ دفعتاً مجھے ایسا معلوم ہوا گویا دھکتا ہوا انگارہ میں لے رکھ لیا ہو میرے مُنہ بنانے پر فاضل اور شفاعت دونوں نے میری طرف حیرت سے دیکھا۔ اور اندر سے دو نازک قہقہوں نے میرے جلے ہوئے مُنہ کا خیر مقدم کیا۔ خیر پر صمدانی نے ابھی سے میری سالی ہونے کا ثبوت پہونچا دیا۔ اور پان والا فرسودہ مذاق کیا تھا۔ میں اِدھر کلّی پہ کلّی کر رہا تھا اور اُدھر سب مجھے خوب خوب بنا رہے تھے۔

آخر میں نے ”سسیاتے“ ہوئے کہا۔ ”اچھا ٹھیرو صمدانی چوتھی تک ٹھیرو۔ اُس رات کو میں تمہاری بُری گت نہ بناؤں۔ تو نوشابہ کا ہونیوالا شوہر نہیں“

صمدانی کی ہنستی ہوئی آواز آئی۔ ”جی! آپ کس زعم میں ہیں؟ یہ ہمارا ہی طفیل ہے۔ جو آپ کو یہ دن دیکھنا نصیب ہوا ہے۔ ورنہ میں اب بھی آپ کی یہ نسبت تڑوا سکتی ہوں۔ کیوں ہے نا فاضل بھائی؟“

”ہاں ہاں ضرور تڑوا دو“ فاضل نے مزاحاً کہا۔ ”اور مجھ سے نوشابہ کی شادی کروا دو۔ تمہارا بہت مجھ پہ احسان ہوگا! رقیہ اس کا کوئی خیال نہ کریگی۔ اگر ناگوار خاطر ہو تو میں رقیہ بیگم کو طلاق دے سکتا ہوں اور پھر معاف کرا سکتا ہوں“

رقیہ کی ہلکی ہنسی کی آواز میرے کانوں میں آئی۔ صمدانی کہنے لگی۔ آپ کی عورت تو دیکھا چاہیئے ایک کو سنبھالنا ہی دشوار ہے۔ اب دوسری کرنے چلے ہیں (مجھ سے) آپ چُپ بیٹھے ہیں۔ ذرا ان کی خبر تو لیجئے۔“

---

لہ یہ ایجاد بندہ ہے (اگرچہ گندہ کہنے کا یہ موقع نہیں!) مطلب آپ سمجھ گئے ہوں گے۔

میری رگِ حمیت جوش میں آئی۔ میں نے ہنستے ہوئے ڈانٹ کر کہا "مسخرا ہے۔ اس بدنیت کے کون منہ لگے!"

(۴)

گھر پہونچ کر میں نے وہ حسین خط نکالا۔ اس میں سے ایک تصویر بھی نکلی۔ میرے دل کی مالکہ کی خوبصورت تصویر۔ میں دیر تک اُس کو دیکھتا رہا۔ دیکھتا رہا آنکھوں اور دل سے لگاتا رہا اور چومتا رہا، اور دیوانوں کی طرح اس سے بے معنی باتیں کرتا رہا۔ گویا وہ میرے سامنے بیٹھی ہے۔ آہ! یہی وہ نوشابہ ہے جس نے میرے دل کی نگری میں ایک ہلچل مچا رکھی ہے۔ دیکھو! وہ کیسے غمگین انداز میں میری طرف دیکھ رہی ہے! ہجر و فراق کی ماری ہوئی بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں میں سارا رنج و غم کھچکر آگیا ہے۔ نظروں سے بلا کا اظہارِ اُلفت ہو رہا تھا۔ اور آہ! یہ کالی کالی ساڑی! نوشابہ کے رنج والم کے واسطے کتنی اچھی بیک گراونڈ کا کام دے رہی ہے۔ اور اُس کے حُسن و جمال کو بے حساب چار چاند لگا رہی ہے۔ یہ وفا کی پتلی! ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کسی کا ماتم کر رہی ہے۔ جیسے کوئی بیوہ اپنے متوفی شوہر کا سوگ مناتی ہے۔ مگر یہ بیوہ نہیں۔ اس کی نازک کلائی کی چوڑیاں اسکی شاہد ہیں! —— تصویر کے نیچے نوشابہ پیاری کے پیارے خط میں (وہ خط جسکو میں بخوبی پہچانتا تھا) انگریزی میں لکھا تھا "تمہاری ہمیشہ نوشابہ!" —— تصویر کے بعد میں نے خط پڑھا۔ خط طویل تھا۔ اور خوشی کے آنسوؤں کا حامل۔ ہر جگہ میری محبوبہ نے مجھے "ڈیر" اور "ڈارلنگ" سے خطاب کیا تھا۔ خط چونکہ انگریزی میں لکھا ہوا تھا۔ اس لئے نوشابہ نے (جو کبھی "شاہ" کی شخصیت کی حامل تھی) کہیں بھی تذکیر و تانیث کی غلطی نہیں کی تھی! اس لحاظ سے میں اردو پر انگریزی کو ترجیح دینے پر مجبور ہو گیا! افسوس ہے کہ خط میں یہاں نقل نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ وہ بالکل پرائیویٹ ہے۔ اس سے متعلق جو کچھ معلومات میں نے آپ کو بہم پہونچائی ہیں۔ وہی کافی سے زیادہ ہیں۔

میں نے اس خط کا جواب نہایت زوردار الفاظ میں دیا۔ اور ساری شاعری ختم کر دی۔ اور اس کا بالکل خیال نہ کیا۔ کہ آئیندہ بھی مجھے منسوبہ کے نام خط لکھنے پڑیں گے۔

کئی دن گذر گئے۔ نوشابہ کے فراق میں نہ دن کو چین تھا۔ اور نہ رات کو نیند۔ نوشابہ کا پیارا خط بار بار پڑھنا، اور تصویر دیکھنا، یہی میرا بیکاری کا مشغلہ تھا۔ اس اثنا میں کئی ایک خطوط ہجر کے نئے نئے مضامین سے پُر صمدانی کی معرفت آئے اور گئے۔

اس دوران میں نامراد ہیملٹ اور بدنصیب ڈاکٹر سے ملاقات نہ ہوئی۔ لیکن اتنا مجھے معلوم ہوا کہ ہیملٹ کوشاں تھے۔ اور ڈاکٹر سخت علیل۔ گویا ایک کو پانچوں گھی میں ہونے کی توقع تھی۔ تو دوسرے کے سر پر برف کی تھیلی!

(۵)

میری شادی نوشابہ سے ہو گئی۔

اگرچہ والدہ صاحبہ اور دیگر بزرگِ خاندان اس رشتہ سے ناراض تھے۔ لیکن ہماری ضد پر سب کو آخر سرِ تسلیم جھکانا پڑا۔ اُن کی ناپسندیدگی اور ناراضگی کی وجوہ بھی عجیب و غریب تھیں۔ جن میں سے سب سے بڑی یہ تھی۔ کہ میری منسوبہ پہلے لڑکا تھی!

میرا نکاح پُرانے رسوم کے برخلاف عصرانہ (ایٹ ہوم) پر ہوا۔ ہمارے چچا سسر صاحب کی یہی خواہش تھی۔ گو اس پر بھی ہمارے لوگوں نے اعتراض کیا لیکن مرضیٔ "دُولہا" از ہمہ اولیٰ!

نکاح کے بعد وقفہ کے دوران میں فاضل نے تہنیت میں ایک چیز سُنائی۔ جو حمد کی حمد تھی۔ اور سہرے کا سہرا۔ اور پھر مذاقیہ۔ بقول اس کے "رات کو یہ چند اشعار چلتے پھرتے، اُٹھتے بیٹھتے ہوگئے تھے"! مسخرے نے اپنا مزاحیہ سہرا (جس میں میری بیوی کی تبدیلی وصف کی طرف پُرلطف اشارے تھے) نہایت سنجیدہ صورت بنا کر اس طور پر پڑھ ڈالا کہ احباب ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہوگئے۔ اور میں ــــ میرے اوپر گھڑوں پانی پڑ رہا تھا۔ مطلع عرض کیا تھا ؎

تعریف اُس خدا کی جس نے دولہا بنایا ⁂ کیسی دُلہن بنائی اور کیا سے کیا بنایا

---

دُلہن کو گھر لے آئے۔ تمام راستہ میں موٹر میں خیالات میں ڈوبا رہا۔ واللہ! کیا انقلاب ہے! محوِ حیرت ہوں کہ دُنیا کیا سے کیا ہوگئی۔ یہ لڑکی جو آج میری بیوی بنی ہے۔ وہ کبھی زمانہ میں، ایک خوش رو لڑکا تھی۔ اور میری دوست (اس خیال سے مجھے بڑی ہنسی آئی) ....... کیسی حسین اور سلیقہ مند ہے میری دُلہن! اسکی بدولت بہت جلد میرا گھر رشکِ فردوس بن جائیگا۔ میں اپنی بیگم کی تعریف و توصیف گھر گھر کرتا پھروں گا۔ اُسے سیر سپاٹے اور سینما تھیٹر کو ساتھ لے جاؤں گا۔ اور کُھلے بندوں پھراؤں گا۔ میری بیوی گریجویٹ ہے۔ وہ بہت جلد کسی مدرسۂ نسواں کی صدر معلمہ ہو جائے گی۔ خود کمائے گی اور مجھے کھلائے گی۔ فرصت کے وقت مجھے کتابیں اور اخبار و رسائل پڑھکر سنائیگی اور بیوی کے علاوہ میری سکرٹری کی خدمت بھی انجام دیگی۔ اور میرے مضامین کے مسودے صاف کریگی۔

....... آہ! اُس شیریں کا کیا حال ہوگا؟ شیریں کی شادی شاہ سے ہونیوالی تھی۔ یعنی اُس نوجوان سے جو اب میری خوش قسمتی اور اُسکی بدقسمتی سے میری بیوی بن گیا ہے یا بن گئی ہے! شیریں کے دل کا حال اُسی سے پوچھا چاہیئے۔ اور انشاءاللہ میں اپنی بیوی سے پوچھوں گا کہ شیریں کے بارے میں اب اُسکے جذبات و احساسات کیا ہیں! اور یہ کہ ہماری سالہا سال کی دوستی اب جو ازدواجی تعلقات پر منتج ہوئی ہے۔ اس کی نسبت اُسکا کیا خیال ہے؟ ....... میں اپنی بیوی کو بالکل آپ ٹو ڈیٹ اور فیشن ایبل بنا دوں گا۔ چاہے میرے خاندان والے اس پر احتجاج کیوں نہ کریں۔ لیکن میری بیوی ضرور کلبوں اور ٹی پارٹیوں میں جائے گی۔ اور وفادار ہندوستانی بیوی کی طرح ہر جگہ میری تعریف و ستائش میں رطب اللسان رہے گی۔ لیکن میری آزادی ہرگز نہ چھینیگی۔ اور

اپنی آزادی نہ کھو بیٹھیگی۔ گھر کا سارا کاروبار اور بچوں کی دیکھ بھال ......!

(۶)

میں حجلۂ عروسی میں داخل ہوا۔ جسم و روح کو معطر کرنیوالا ایک خوشبو کا بھبکا میرے دماغ میں پہونچا۔ اندر قدم رکھتے ہی میں نے یوں محسوس کیا۔ گویا میں ایک دوسری ہی دُنیا میں پہنچ گیا ہوں۔ میری آنکھیں فوراً اس پلنگ کی طرف اُٹھ گئیں جو مجھے جہیز میں ملا تھا۔ اس پر ایک لال لال سورت پڑی تھی۔

میں نے شرارتاً کہا۔ "آداب عرض ہے۔ شاہ صاحب! مزاج تو اچھے ہیں آپ کے؟"

جیسا کہ مجھے یقین تھا۔ کوئی جواب نہ ملا۔ میں نے ہنستے ہوئے شیروانی اُتارتے ہوئے کہا "کیوں جناب آپ جواب کیوں نہیں دیتے؟ بہت دنوں کے بعد آپ سے شرف نیاز حاصل ہوا شاہ صاحب! آپ تو بالکل ہی عید کا چاند ہو گئے تھے جناب!"

جواب ندارد۔ اب میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "نوشابہ پیاری!"

ایک خفیف سی حرکت کے ساتھ ایک نہایت مہین سی آواز آئی "جی؟"

آواز کیا تھی ایک برقی لہر تھی جو میرے تن بدن میں دوڑ گئی بے تاب ہو کر میں بڑھا کہ اُسے سینے سے لگا لوں۔ "میری پیاری نوشابہ۔ آجاؤ میرے گلے سے لگ جاؤ۔ اب اپنے عاشق شوہر سے شرم کاہے کی؟ اب ہم یک جان یک قالب ہیں۔ ...... آؤ ملکر بیٹھیں اور باتیں کرکے اپنے ..... اپنے دل کی بھڑاس نکالیں .... تم ...... تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں ......"

اور میں نے دھڑکتے ہوئے دل اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے وہ لال اوڑھنی ہٹانی چاہی مگر اس خونِ دل کی طرح سُرخ گٹھڑی میں سکڑنے کے آثار نمودار ہوئے۔

ایک مسکراتی ہوئی باریک آواز نے کہا۔ "ہٹئے! ہٹئے!! نہیں تو میں چیخوں گا!!"

میرے دل کو ایک دھکا سا لگا۔ میں نے جھٹ تصحیح کرتے ہوئے کہا۔ "چیخوں گا! نہیں نہیں! چیخوں گی کہو۔ چیخوں گی! نوشابہ تم میری بیوی ہو!"

لیکن میں نے دل میں کہا۔ ابھی اسے عورت بنے کے مہینے گذرے ہیں۔ سالہا سال کی عادت جاتے جاتے جائیگی۔ تذکیر و تانیث کا جھگڑا زیادہ اہم نہیں۔ ہمارے نزدیک زبان ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔

میں اُسے گُدگُدانے کی خاطر مٹھوں نے لگا۔ ہاتھ پاؤں میں رعشہ پیدا ہو گیا تھا۔ سانس تیز تیز چلنے لگا تھا۔ "نوشابہ! نوشابہ پیاری!" میرے منہ سے سرگوشیوں میں خود بخود نکل رہا تھا۔ "فراق کا زمانہ گذر چکا ہے دو محبت کے مارے آج ملے ہیں ......"

اور میں ہاتھ بڑھا کر ..........................

..................... افسوس کہ تیھر سے یہ عبارت اُڑ گئی!! .....................

.......آہ! فلک ناہنجار کو میری خوش بختی ایک آنکھ نہ بھائی۔ عشرت دو روزہ بھی میرے حق میں نہ لکھی تھی۔ ہائے اب میں کیا کروں؟ دیکھئے ڈاکٹر کب آتا ہے؟..... یا اللہ! یہ تو نے کیا کر دیا؟....... اب میں خاندان کی لعن طعن کیسے سن سکوں گا؟ اُن کی پھبتیاں اور آوازے کس طرح برداشت کر سکوں گا؟....... خدایا؟ تو ہی میری عزت اب بچانے والا ہے۔ ایک گنہگار پر رحم کر۔ میں نے، میری بیوی نے کونسا قصور کیا تھا جس کی پاداش میں تو نے یہ بلا بھیجی....... آہ!

ڈاکٹر آیا۔ اور ایک لیڈی ڈاکٹر کو ساتھ لایا۔ بہت دیر تک تخلیہ میں دونوں نے میری بیوی کا معائنہ کیا۔ اور میں باہر گویا انگاروں پر لوٹ رہا تھا۔ اللہ میرے! یہ ایک ایک منٹ میرے لئے ایک قرن معلوم ہو رہا ہے...... اگر خدانخواستہ شیطان کے کان بہرے ادہی ہوا جس کا مجھے خدشہ ہے۔ تو....... خدایا! میں کیسے زندہ رہوں گا؟ میں تو.......،

چچا، سر مجسٹریٹ صاحب معہ شفاعت، فاضل، صمدانی وغیرہ کے آئے۔ سب کے سب مبہوت تھے۔ اور طرح طرح کے سوالات مجھ سے کر رہے تھے۔ میرا ماؤف دماغ بھلا ان کے صحیح جوابات کیا دیتا! مجھ پر گویا نزع کا عالم طاری تھا۔ بات برابر زبان سے نہیں نکل رہی تھی۔

ڈاکٹرنی کمرے سے باہر نکلی۔ سب اُس کی طرف لپکے۔ مگر وہ میری طرف آئی۔ اور مجھے ایک طرف لیجا کر عجیب انداز میں میری طرف گھورنے لگی۔

"میڈم! خدا کے لئے کہیئے۔ یہ میری زندگی اور موت کا سوال ہے۔" میں نے روئی آواز میں کہا۔ "کہیئے کہیئے! میرے تمام شبہات بے بنیاد ہیں......."

اُس نے سرگوشی کے لہجہ میں کہا۔ "مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔"

مجھے ایسا معلوم ہوا۔ جیسے میں زمین میں دھنستا چلا جا رہا ہوں۔ میں نے کرسی کو سہارے کے لئے پکڑ کر پکارا۔ "نہیں نہیں! آپ کا یہ مطلب نہیں۔"

وہ بولی۔ "افسوس کہ مجھے آپ کو بدترین خبر سنانا پڑتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے۔ آپ کی بیگم صاحبہ شادی سے پہلے مرد تھیں اور بعد میں عورت ہوئیں۔"

مجھے غش سا آنے لگا۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ یا اللہ! یہ روز بد دکھانے سے پہلے تو نے مجھے کا ہیکو اُٹھا نہ لیا؟

لیڈی ڈاکٹر کی آواز آئی۔ "....... اس میں کسی کو کیا دخل ہے؟ نیچر کے آگے سائنس دھری رہ جاتی ہے۔ خدا کے کام عجیب ہوتے ہیں...... آپ کی بیگم صاحبہ میں پھر مردانگی بتدریج عود کر رہی ہے۔ اور کیا عجب کہ چند دنوں کے اندر وہ پھر ایک نوجوان میں تبدیل ہو جائیں......."

"مگر میڈم!" میں نے کسی نہ کسی طرح کہنے کی کوشش کی۔ "میڈم! کچھ کیجئے! خدا کے لئے کچھ کیجئے! میں آپ کا زر خرید غلام ہو جاؤں گا...... لے لیجئے۔ میرا سب کچھ لے لیجئے مگر کچھ کیجئے۔ آپریشن......."

بات کاٹ کر کہنے لگی "ہم تو کچھ نہیں کر سکتے۔ لیکن آپ اپنی تسلی کے لئے کسی دوسرے بڑے ڈاکٹر کو بلا کر دکھایئے۔ شاید وہ کچھ کر سکے۔ مگر ہم کو افسوس ہے کہ......"

میں وہاں زیادہ ٹھہرنے کے لئے نہیں ٹھیرا۔ پاگل کی طرح وہاں سے یوں بھاگا جیسے کوئی خواب میں بھاگتا ہو۔ اور موٹر میں بیٹھ کر چیخا۔ "نارمن واکر!" موٹر فراٹے بھر رہی تھی۔ اور میں اس میں اس طرح بیٹھا تھا گویا کانٹوں پر بیٹھا ہوں۔ خدا کرے ڈاکٹر نارمن واکر مل جائیں۔ اور میری بیوی کا علاج یا اپریشن کر کے میری جان بچالیں۔ میں ان کی منت سماجت کروں گا۔ خوشامد کروں گا۔ ہاتھ جوڑ کر کہوں گا۔ پاؤں پڑوں گا کہ کسی طرح وہ اس بلا کو ٹال دیں۔ اور للہ فطرت کی اس ڈبل ستم ظریفی کا شکار میری بیوی کو (اور بالواسطہ مجھے) ہونے سے بچالیں......"

## نوٹ

شاہد نازک خیال! یہ عجیب و غریب افسانہ میں نے یہاں تک لکھا ہی تھا۔ کہ آپ کا تار کا خط آج یہ خبر وحشت اثر لایا۔ کہ "نزع کی سی کیفیت طاری ہے مضمون بھیجکر اس مصیبت سے چھڑاؤ" مجھے آپ کے حال پر واللہ بڑا رحم آیا۔ عجیب اتفاق ہے۔ کہ افسانہ کا ہیرو بھی گویا جانکنی کے عالم میں ہے۔ اور آپ بھی! اب میرے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں کہ افسانہ جوں کا توں بھیجدوں۔ خدا کرے کہ یہ نسخہ نزع کی کیفیت دور کرنے میں مجرب ثابت ہو!

دیگر یہ کہ یہ افسانہ میری عنقریب شائع ہونے والی کتاب "صمدانی" کا ایک باب ہے اس لئے جو صاحب اس قابلِ اعتراض افسانہ کو مکمل دیکھنا چاہتے ہوں وہ کتاب پڑھیں۔ ("خریدیں" میں نہیں کہتا!) جس کی نسبت یہاں ستم ظریفوں نے یہ مشہور کیا ہے کہ مجھے اس تصنیف پر نوبل پرائز ملنے کی توقع ہے!! مگر میں ببانگِ دہل یہ اعلان کرنا چاہتا ہوں۔ کہ یہ محض پروپیگنڈا ہے۔ خدا مجھے نظرِ بد سے بچائے!

آخر میں میری طرف سے یہ پیام پہونچا دو کہ ناظرینِ "ساقی" میں سے ہر فرد اس افسانہ کو اپنے سے منسوب کرلے تو میں بیحد ممنون ہوں گا!

ناکارہ (حیدرآبادی)

---

مجھے اُس سے نفرت ہے۔ دلی نفرت! میرا ایک بیٹا ہے۔ ایک ایسا بیٹا جو مجھے نہیں جانتا۔ اس لئے کہ میں جس وقت اُس کے گھر سے نکلی ہوں تو وہ صرف پانچ برس کا تھا۔ مجھے اپنے بیٹے سے عشق ہے لیکن اُس کو اسکی خبر نہیں وہ سمجھتا ہے کہ اس کی ماں مرچکی —۔ میرے متعلق اُس کے دل میں صرف ایک مبہم سی خوشگوار یاد باقی ہوگی۔ آہ! — میرے گنہگار دل سے اُس کے لئے ہر وقت دعائیں نکلتی رہتی ہیں خدا کرے وہ ہمیشہ تک امن و چین کی زندگی . . . . .“ (اُس کی ہچکی بندھ جاتی ہے اور اُس کا سر خود بخود کٹہرے سے لگ جاتا ہے۔ سعید آہستہ سے اُس کے شانے کو تھپکتا ہے عدالت میں ایک سناٹا چھایا ہوا ہے سب کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں کچھ دیر تک مکمل خاموشی رہتی ہے اُس کے بعد جج کھڑا ہوتا ہے)

جج (جیوری کو مخاطب کرکے) ”ممبران جیوری! میں آپ لوگوں سے درخواست کرونگا کہ آپ لوگ جیوری روم میں جاکر ملزمہ کے متعلق کوئی خاص فیصلہ کریں —— عدالت اُٹھتی ہے . . . . !“

(جیوری کے ممبر بائیں طرف کے دروازے سے دوسرے کمرے میں چلے جاتے ہیں۔ کورٹ انسپکٹر نجمہ کو ساتھ لیکر دائیں طرف کے دروازے سے دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہے انسپکٹر ریاض شہباز بیگ کو ساتھ لیکر دائیں طرف کے بڑے دروازے سے نکل جاتا ہے ہوٹل کا منیجر بھی اُنکے ساتھ چلا جاتا ہے باقی تمام لوگ اسی بڑے دروازے سے نکل جاتے ہیں۔ گیلری میں صرف نرگس اور نعیمہ باقی رہجاتی ہیں وہ بھی آہستہ آہستہ نیچے اُترکر بڑے دروازے سے نکل جاتی ہیں۔ ظہیر جج کے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ سہیل دوڑکر گرمجوشی سے ہاتھ ملاتا ہے)

سہیل ”شاباش سعید! تم نے کمال کردیا —!“

سعید ”کمال! میں سمجھتا ہوں کہ میں کچھ نہ کہہ سکا“

سہیل ”یقین مانو! مجھ سمیت سب کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے“

سعید (مسکراتے ہوئے) ”واللہ میں خوش ہوں کہ آپ میری ہمت افزائی کرتے ہیں“

سہیل ”میں ہمت افزائی نہیں کررہا۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تقریر نہایت کامیاب رہی۔ ایسی صورت میں جبکہ موکل کے حالات نہ معلوم ہوں۔ کوئی کیا کرسکتا ہے لیکن تم نے فرضی مثالوں سے خوب نتیجے نکالے —— !“

سعید۔ (خوش ہوتے ہوئے) ”— آپ نے دیکھا ابا میاں کی آنکھ سے بھی آنسو جاری تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایسے سخت دل انسان کو رُلا دینا یقیناً کامیابی ہے — میں خود بھی اتنا گھبرا گیا تھا کہ میں بیان نہیں کرسکتا۔ اور ہاں میں نے جو کچھ کہا محض الہام کے طور پر۔ اپنے آپ میری زبان سے نئے نئے الفاظ نکل رہے تھے۔ واللہ اپنی تیار کردہ تقریر کا ایک لفظ بھی یاد نہیں آیا۔ خواہمخواہ میرا دل اُسکی طرف کھنچا جارہا تھا۔ میرا جی چاہتا تھا۔ کہ اُس سے لپٹ جاؤں — عجب حماقت آمیز خیال تھا ذرا غور کیجئے ایک وکیل کا اپنے موکلوں سے لپٹ جانا کہاں کی عقلمندی ہے۔ واللہ عالم! کس قسم کی کشش تھی! — اُس نے ایک مرتبہ میرا ہاتھ بڑی شفقت سے دبایا۔ خیر! خدا کا شکر ہے کہ جیوں توں کرکے میں نے کچھ نہ کچھ کہہ ہی دیا۔ خدا کرے میری محنت ٹھکانے لگے ——“

(ظہیر۔ جج کے کمرے سے باہر نکلتا ہے سعید دوڑکر اُس سے

ہاتھ ملاتا ہے ظہیر کا چہرہ حزن و ملال کا مرقع ہے)
ظہیر۔ (ایک بناوٹی مسکراہٹ کے ساتھ) "شاباش! سعید۔ میں تم کو مبارکباد دیتا ہوں۔ تمہاری تقریر نہایت کامیاب رہی"۔
سعید (خوشی کے لہجے میں) "اوہ! شکریہ ۔ ۔ ۔ ۔"
سہیل (سعید سے) "سعید! جاؤ نعیمہ تمہارا انتظار کر رہی ہوگی" (سعید بھاگتا ہوا بڑے دروازے سے نکل جاتا ہے)
سہیل (ظہیر کے قریب آتے ہوئے) "تم نے اُس کو پہچان لیا یقیناً نجمہ نوری ہے ۔ ۔ ۔ ۔!"
ظہیر۔ "اس میں کیا کلام ہے۔ نجمہ کے سوا کوئی نہیں ــــ آہ! اُس کی کیا حالت ہوگی ــــ اور یہ سب کچھ میرا ہی کیا دھرا ہے ــــ نجمہ! ــــ نجمہ!" (وہ اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیتا ہے تھوڑی دیر تک خاموش رہتی ہے)
سہیل۔ (ظہیر کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے) "تم گھبراؤ نہیں ــــ اب یہ بتاؤ کہ آئندہ کیا کرنا چاہیے"!
ظہیر (اپنا چہرہ رومال سے پونچھتے ہوئے) "تم ہی بتاؤ کیا کرنا چاہیے"!
سہیل "میرا خیال یہ ہے کہ ــــ سنو! اگر وہ مجرم قرار دی گئی تو تم چپ رہو۔ بالکل خاموش! جو کچھ نتیجہ نکلے نکلنے دو ــــ اُس کو یقیناً پھانسی ہو جائیگی اور سعید کو معلوم بھی نہ ہوگا کہ وہ کون تھی اور اگر اس کو بری کر دیا گیا تو پھر تمہیں سعید کو بتانا پڑے گا ــــ اور پھر گذشتہ سترہ برس کو قطعی طور سے بھلا دینا پڑے گا ــــ سمجھے؟"
ظہیر "لیکن میں سعید کو اسی وقت ساری باتیں کیسے بتا سکونگا ــــ وہ مجھے کیا سمجھے گا؟ ــــ آہ! ــــ"
(زور سے ایک گھنٹی بجتی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ عدالت شروع ہوتی ہے)

ظہیر "لو! وہ عدالت شروع بھی ہو گئی ــــ اے خدا میں کیا کروں!"
سہیل "گھبراؤ نہیں دوست خدا بہتری ہی کریگا"!
(تمام لوگ دوبارہ داخل ہوتے ہیں اور اپنی اپنی جگہ بیٹھ جاتے ہیں جیوری کے ممبران اور جج داخل ہوتے ہیں۔ لوگ کھڑے ہو جاتے ہیں سعید کا چہرہ خوف سے زرد ہے جج کھڑا ہوتا ہے مکمل خاموشی حکمران ہے)
جج "ممبران جیوری! میں آپ سے درخواست کروں گا۔ آپ لوگ اپنا متفقہ فیصلہ سنائیں"۔
جیوری کا صدر۔ (ایک ضعیف العمر انسان کھڑا ہوتا ہے اپنی عزت کا لحاظ کرتے ہوئے اور اپنے ضمیر کی پیروی کرتے ہوئے ممبران جیوری نے یہ فیصلہ کیا ہے ــــ نہیں! مسز فاروق بے گناہ ہے"!
(عدالت کا کمرہ ایک دم سے تالیوں، تحسین و آفرین کے نعروں اور خوشی کے قہقہوں سے پر ہو جاتا ہے اپنی اپنی جگہ سب خوش ہیں بمشکل لوگوں کو خاموش کیا جاتا ہے)
جج "کورٹ انسپکٹر ملزمہ کو حاضر کیا جائے"!
(دائیں طرف کا دروازہ کھلتا ہے اور نجمہ نڈھال ہوئی داخل ہوتی ہے۔ اس کا چہرہ اعصاب کی کمزوری کے باعث سفید ہو رہا ہے۔ بے حد کمزور معلوم ہوتی ہے)
جج "کورٹ انسپکٹر ملزمہ کو جیوری کا فیصلہ سناؤ"۔
کورٹ انسپکٹر۔ "جیوری کا فیصلہ یہ ہے "نہیں! مسز فاروق بے گناہ ہے"!
(نجمہ ایک دم سے چونک پڑتی ہے اور جوش میں کٹہرے سے باہر نکلنا چاہتی ہے اور ایک خوفناک چیخ سے مشابہ آواز میں بولتی ہے)

نجمہ۔ "نہیں۔ نہیں، نہیں — میں مرنا چاہتی ہوں مجھے مرجانے دو — میں مرنا چاہتی ہوں — !!!"

جج۔ "عدالت برخاست ہوتی ہے! کورٹ انسپکٹر، غیر متعلق لوگوں کو باہر نکال دو۔" (کمرہ میں سوائے ظہیر، سعید، سہیل، ڈاکٹر فضل اور جج کے تمام لوگ باہر نکل جاتے ہیں)

نجمہ (غصہ کی حالت میں بدستور چیختی جاتی ہے) "میں مرونگی — مجھے مرجانے دو — پھانسی — آہ!...

... (ایک دم سے وہ بیہوش ہوجاتی ہے۔)

جج۔ "میرے کمرے میں لے چلو — فوراً — !" (سب کے سب ملکر اس کو دائیں طرف کے دروازہ سے لے جاتے ہیں)

**پردہ**

## دوسرا منظر

(عدالت کا کمرہ بائیں طرف کے دروازے سے سعید اور ظہیر باہر نکلتے ہیں۔ ظہیر کا چہرہ خوف اور پریشانی سے زرد ہے۔ سعید کے چہرے پر حیرت اور استعجاب کے آثار پائے جاتے ہیں۔ ظہیر انتہائی کبیدگی کے عالم میں ایک کرسی پر گر پڑتا ہے۔ سعید اس کے قریب آتے ہوئے تسلی آمیز لہجہ میں بولتا ہے۔)

سعید۔ "ابا جان! آپ کی کیسی طبیعت ہے؟"

ظہیر (جیب سے رومال نکال کر آنسو خشک کرتے ہوئے) سعید! مجھے تم سے ایک ایسی بات کہنی ہے جس کا بمشکل یقین کیا جا سکتا ہے — میں جانتا ہوں تم میری عزت کرتے ہو اور شاید محبت بھی — لیکن جو کچھ میں تم سے کہنے والا ہوں اس کو سنتے ہی تم مجھ سے نفرت کرنے لگو گے اور — اور شاید تمہیں تعجب ہوگا کہ تم جیسے ہونہار اور شریف النسل لڑکے کا باپ ایسا کمینہ، ذلیل اور وحشی انسان ہو سکتا ہے لیکن یہ واقعہ ہے کہ مجھ جیسا خود پرست انسان . . . . . ."

سعید۔ (بے چین ہوکر) "ابا جان! آپ کو کیا ہوگیا ہے؟"

ظہیر۔ (حواس مجتمع کرتے ہوئے) "سنو! تمہاری ماں زندہ ہے . . . . . . !"

سعید۔ (چونک پڑتا ہے کچھ دیر خاموشی رہتی ہے پھر ظہیر بولتا ہے)

ظہیر۔ . . . . "تمہاری عمر مشکل سے ایک برس کی ہوگی جب وہ اپنے ایک عاشق کے ساتھ فرار ہوگئی تھی — اور اس کا ذمہ دار میں تھا میں نے ہی اس کو اتنا موقع دیا — تین برس کے بعد وہ واپس آئی اور — اور مجھ سے گڑگڑا گڑگڑا کر معافی مانگی — اس نے میرے قدموں پر سر رکھکر رحم کی درخواست کی — اس نے مجھے سمجھایا کہ اس کی بدنامی میری بدنامی تھی — لیکن میں نے اسے ٹھکرا دیا۔ اور اس کو اپنے گھر سے نکال دیا گویا ہمیشہ کے لئے گناہ کے سپرد کر دیا..."

(ظہیر کی حالت غیر ہو جاتی ہے اور روتے روتے ہچکی بندھ جاتی ہے)

سعید۔ (شکستہ لہجہ میں) "آہ — اب اللہ کیا۔ کیا انجام ہوا . . . . . . !"

ظہیر (بائیں طرف کے دروازے کی طرف اشارا کرتے ہوئے) انجام — !! وہ عورت — ! تمہاری ہو کر

— وہی تمہاری ماں ہے!!!"

(سعید "اماں" کہتا ہوا بائیں طرف کے دروازے کی طرف بڑھتا ہے۔ اسی دروازے سے ڈاکٹر فضل نکلتا ہے اور سعید کو روکتا ہے)

ڈاکٹر:- ابھی ٹھہرو! اس کی حالت نازک ہے ممکن ہے اس کے قلب کی حرکت بند ہو جائے تھوڑی دیر بعد چلے جانا۔"

پردہ

## تیسرا منظر

(نجمہ کا کمرہ۔ دائیں طرف ایک دروازہ ہے چاروں طرف صوفے پڑے ہیں۔ ایک کونے میں مختصر سی میز رکھی ہوئی ہے جس پر ادویات کی کچھ شیشیاں رکھی ہوئی ہیں۔ ایک گلاس بھی رکھا ہے۔ نجمہ کوچ پر بے ہوش پڑی ہے۔ ڈاکٹر فضل اور سہیل ہوش میں لانے کی تدابیر کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر فضل بار بار نبض دیکھتا ہے اور دوا پلاتا ہے۔ نجمہ کو یکبارگی ہوش آتا ہے)

نجمہ:- (گھبرا کر چاروں طرف دیکھتے ہوئے) "میں کہاں ہوں؟"

سہیل:- "نجمہ کے کمرے میں — خانم!"

(ڈاکٹر فضل الگ ہٹ کر کھڑا ہو جاتا ہے سہیل نجمہ کے قریب آ کر نرمی سے بولتا ہے)

سہیل:- "نجمہ — !!!"

نجمہ:- (چونک کر) "تم کون ہو — تم نے میرا نام کیسے جانا؟"

سہیل:- "کیا تم مجھے بھول گئیں! پہچانو میں کون ہوں؟"

نجمہ (غور سے دیکھتے ہوئے) "ٹھہرو — ! نہیں میں تم کو نہیں جانتی!"

سہیل (نجمہ کے بالکل قریب آ کر اس کے کان میں کہتا ہے) "نجمہ نوری — !!!"

نجمہ (مسرور ہو کر) "سہیل! سہیل — !! تم ہو!! — شکر خدا کا کوئی تو میرا جاننے والا ملا سہیل! سہیل!!

(وہ اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیتی ہے اور زور زور سے دباتی ہے)

نجمہ:- "سہیل! کیا تم مجھ سے مل کر خوش ہوئے؟ کیا میری حالتِ قابلِ رحم نہیں ہے؟"

سہیل:- "اب تم بیوقوفی کی باتیں چھوڑ دو — ہمیں سب کچھ بھلا دینا چاہئے۔ نجمہ نوری یہ سب کچھ ایک خواب تھا اور اب ہم سب اس سے بیدار ہو چکے۔ ہم کو خدا نے پھر ایک دوسرے سے ملا دیا اور ہم پھر ہنسی خوشی زندگی بسر کرینگے....."

نجمہ:- "سعید کہاں ہے؟ کیا اُسے معلوم ہے....؟"

سہیل:- "وہ اور ظہیر دونوں باہر ہیں۔ ابھی تک شاید اسے کچھ بھی معلوم نہیں لیکن......"

نجمہ:- "میں اس سے ملنا نہیں چاہتی۔ آہ! کس منہ سے ملوں اس کی ماں قاتلہ! اُف...."

سہیل:- "نجمہ نوری! خدا کے لئے رونا دھونا چھوڑ دو تمہیں خوش ہونا چاہئے کہ تم دوبارہ اپنے عزیزوں سے آ ملیں۔ تمہیں سب کچھ بھلا دینا چاہئے آؤ میں تم کو سعید کے ایک دوست سے ملاؤں (وہ ڈاکٹر فضل کو بلاتا ہے۔ ڈاکٹر

آملہ ہے) یہ ڈاکٹر فضل عظیم ہیں۔ انھوں نے ہی تمہارے بچہ کا علاج کیا اور فی الحقیقت اُسے مرتے مرتے بچایا

(نجمہ گرمجوشی سے ہاتھ ملاتی ہے)

نجمہ۔ ڈاکٹر صاحب! میں آپ کا کس طرح شکریہ ادا کروں!"

ڈاکٹر۔ خانم۔ شکریہ کی ضرورت نہیں۔ یہ میرا فرض تھا"

(دروازہ کھلتا ہے اور نرگس "خانم" کہتی ہوئی دوڑ کر نجمہ سے لپٹ جاتی ہے۔ نجمہ کی زبان سے "نرگس!" نکلتا ہے اور خادمہ اور مالکہ دونوں خوب روتے ہیں نجمہ پر غشی کی سی کیفیت طاری ہونے لگتی ہے۔ ڈاکٹر ایک خوراک دوا کی پلاتا ہے۔)

نجمہ۔ ڈاکٹر صاحب! میں سمجھتی ہوں کہ میرا وقت آپہنچا ہے"

ڈاکٹر۔ خانم! فضول باتیں مت کیجئے۔ آپ ابھی تندرست ہوجائیں گی۔ صرف قلب اور اعصاب کی کمزوری باقی ہے"

نجمہ۔ ظہیر کہاں ہیں؟ اب تو اُنکے کلیجہ میں ٹھنڈک پڑگئی ہوگی اُنکی بیوی قاتلہ بن چکی۔۔۔!"

سہیل۔ "نجمہ نوری! تم بے سروپا خیال آرائیاں مت کرو۔ مجھ سے پوچھو اس غریب کی کیا حالت تھی غصہ میں وہ ایک بیوقوفی کی حرکت کر بیٹھا تھا۔ مگر آج تک اپنے کئے پہ پچھتاتا ہے اور بُری طرح اپنے آپ کو کوستا ہے۔ میں نے اور اُس نے تمہاری تلاش میں سر سے کنوئیں کھود ڈالے مگر تمہارا کہیں پتہ نہ لگا۔ دوسرے ہی دن ایک کنوئیں سے ایک نعش برآمد ہوئی۔ اُس کے جوتے اور انگوٹھی بالکل تمہاری سی تھی ہم نے یہ سمجھا کہ وہ تمہاری ہی نعش تھی لاچار صبر کرکے بیٹھ رہے مگر ظہیر کی یہ حالت تھی۔ کہ ہر روز صبح و شام قبر پہ جایا کرتا تھا اور رو رو کر معافی مانگا کرتا تھا۔ اب تمہیں سب کچھ بھلا دینا چاہئے میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ ظہیر نے اگر تم سے زیادہ نہیں تو تمہارے برابر ضرور پریشانیاں اُٹھائی ہیں اب ۔۔۔ اب خدا نے بقول شخصے دن پھیر دیئے ہیں اور تم کو خوش۔۔۔۔۔"

(دائیں طرف کا دروازہ ایک دم سے کھلتا ہے اور سعید گھبرایا ہوا داخل ہوتا ہے۔ ڈاکٹر فوراً سعید کو ایک طرف لیجاکر اُس کے کان میں کچھ کہتا ہے سعید ہاتھ سے سمجھانے کا کچھ اشارہ کرتا ہے۔ اس کے بعد نجمہ کے قریب آتا ہے)

سعید۔ "خانم! اب آپ کی کیسی طبیعت ہے؟"

نجمہ۔ "آپ کی عنایت کا شکریہ۔ میری طبیعت کا آپ کیا حال پوچھتے ہیں۔ میں تو خدا سے چاہتی ہوں کہ کل کی مرتی آج مرجاؤں۔۔۔"

سعید (اپنے جوش کو دباتے ہوئے) "خانم! آخر آپ اس قدر ہراساں کیوں ہیں انسان کو ذرا ہمت سے کام لینا چاہئے خیر! اس ذکر کو چھوڑیئے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مجھے آپ سے دلی ہمدردی ہے میں نے تہیہ کرلیا تھا کہ میں اس مقدمہ کو جیت کے رہونگا لیکن آپ نے مجھے واقعات سے قطعی لاعلم رکھا پھر بھی میں نے اندازہ سے کام لیا اور فرضی مثالوں سے نتیجے اخذ کرنے شروع کئے۔ یہ محض اتفاق تھا کہ میری فرضی مثالیں بالکل سچ نکلیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ عدالت میں جتنے بھی آدمی تھے سب کی آنکھ سے آنسو جاری تھے ـــ خدا کا شکر ہے میں بالآخر کامیاب ہوا۔ اور اب آپ آزاد ہیں اور اپنے اُس لڑکے سے مل سکتی جس سے آپ کو عشق ہے۔۔۔"

نجمہ (خوشی کے آنسو روتی ہے اور مسکراتے ہوئے یہ کہتی ہے) "اور فرض کرو کہ میں اُس لڑکے سے نہ ملوں تو۔۔؟"

سعید (جوش میں) تو وہ لڑکا آپ کے پاس خود حاضر ہوگا اور۔۔۔" (اُس کی آواز بھرا جاتی ہے اور وہ دیوانہ وار "اماں" کہکر نجمہ سے لپٹ جاتا ہے ماں بیٹے دونوں دیر

تک روتے رہتے ہیں۔ نجمہ بار بار اُس کے رخسار اور پیشانی کو چومتی ہے اور ہر دفعہ ایک نئے جوش کے ساتھ اُس کو گلے لگاتی ہے —— تھوڑی دیر کے بعد)

سعید:- "اماں! خدا کا شکر ہے کہ میں آج اس ماں سے مل رہا ہوں جس کو میں عرصہ ہوا مردہ سمجھتا تھا ——"

نجمہ۔ "ہاں بیٹا! خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے مگر تم کو یہ بھی معلوم ہے کہ میں کانگہ ہوں"۔

سعید (بے چینی سے) "اماں! خدا کے واسطے اس ذکر کو چھوڑیئے جو کچھ گذر چکا ہے اُس کو بھلا دینا چاہیئے۔ اب ہم ہنسی خوشی زندگی بسر کرینگے —— اماں! کیا آپ ابا جان سے نہ ملیں گی؟

نجمہ:- "جاؤ بیٹا اُن کو لاؤ —— آہ! میرا دل بیٹھا جاتا ہے۔ میں اُن سے ضرور ملونگی" (سعید دوڑتا ہوا دروازے سے باہر نکل جاتا ہے۔ نجمہ نڈھال ہو کر صوفے پر گر پڑتی ہے اس کا جسم کانپنے لگتا ہے۔ ہاتھ پاؤں میں تشنج پیدا ہو جاتا ہے ڈاکٹر فضل اُس کو خوراک پلانا چاہتے ہیں وہ ہاتھ سے گلاس کو پرے کر دیتی ہے نرگس اور سہیل اُس کے قریب آتے ہیں اور ہراسانی کے عالم میں اُس کے زرد چہرہ کی طرف غور سے دیکھتے ہیں۔ ظہیر اور سعید داخل ہوتے ہیں سعید "اماں" "اماں"! کہتا ہوا نجمہ سے لپٹ جاتا ہے نجمہ اس کی پیشانی پر ایک طویل بوسہ دیتی ہے اور ڈھیر ہو کر پڑ جاتی ہے۔ ڈاکٹر نبض دیکھتا ہے اور بالآخر سر نیچا کر کے کھڑا ہو جاتا ہے ظہیر بے قرار ہو کر نجمہ سے لپٹ جاتا ہے باپ اور بیٹے بہت دیر تک روتے رہتے ہیں۔ پھر سہیل اور ڈاکٹر فضل دونوں کو کھڑا کرتے ہیں اور تسلی دیتے ہیں۔

پردہ اختتامیہ

# جُرعات

جلد | ساقی دہلی - بابت مارچ سنہ ۱۹۲۳ء | نمبر ۳

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# نگاہِ اوّلین

سالنامہ ساقی کے بارے میں مُلک کے مشہور انشا پرداز حضرت ایم۔ اسلم نے جو اظہارِ خیال فرمایا ہے، اس کا اقتباس ذیل میں اِس خیال سے درج کیا جاتا ہے کہ یہ "تحسینِ سخن شناس" ہے، اِسی سے سالنامہ کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے :-

"...... سالنامہ کے متعلق صرف اس قدر عرض کر سکتا ہوں کہ سالنامہ بالکل ایسا ہی ہے جیسی کہ توقع تھی۔ اور جیسے کہ میں پہلے بھی ایک بار کہہ چُکا ہوں، میری دلی تمنا ہے کہ جو حضرات سالنامے نکالتے ہیں وہ "ساقی" کو مشعلِ راہ بنائیں۔ ساقی نے رسائل کی دُنیا میں جو ادبی مثال قائم کی ہے وہ قابلِ صد ستایش ہے۔ اور ایڈیٹر صاحبان کے لئے قابلِ تقلید اور سب سے زیادہ قابلِ ستایش اور تقلید ساقی کی "جرأت"، "صاف گوئی" اور "سلامت روی" ہے۔ جو میرے خیال میں اس وقت تک کسی رسالے کو میسر نہیں۔ رہا تصاویر کا معاملہ، تو ساقی کے سالنامہ کی تصاویر بھی بالکل ایسی ہی ہیں جیسی کہ ایک ادبی رسالے میں ہونی چاہیئے۔ گو میں اس بات کا قائل نہیں کہ بے ضرورت تصاویر ہی کسی ادبی رسالے کی زینت کا باعث ہو سکتی ہیں۔ رسالے کی شان اور اس کا امتیاز تو مضامین قائم کرتے ہیں اور اس بارے میں ساقی کا سالنامہ قابلِ رشک ہے۔ مبارکباد قبول فرمائیے ......"

**نجمہ نوری:** اِس عنوان سے سالنامہ ساقی میں جناب انصار ناصری دہلوی کا ایک ڈرامہ شایع ہوا تھا، ہمیں یہ دیکھ کر بہت مسرت ہوئی کہ یہ ڈرامہ اس قدر پسند کیا گیا کہ علاوہ بے شمار تعریفی خطوط کے اکثر ایمیچور ڈرامیٹک کلبوں نے اِسے اسٹیج کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اِس سلسلہ میں "دی ایمیچور ڈرامیٹک ایسوسی ایشن" دہلی نے نہایت سرگرمی سے اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنایا۔ اور نہایت خوبی اور کامیابی کے ساتھ "نجمہ نوری" کو پبلک کے سامنے پیش کر کے خراجِ تحسین حاصل کیا۔ اس قابلِ رشک مقبولیت پر ہم مصنف کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں۔ شائقین کے اصرار پر یہ ڈرامہ کتابی صورت میں بھی شایع کر دیا گیا ہے۔

**صمدانی:** جناب ناکارہ حیدرآبادی نے ہمیں یہ اطلاع دی ہے کہ چند ناگزیر واقعات کی بنا پر اُن کی کتاب "صمدانی" کی اشاعت کم از کم تین ماہ کے لئے ملتوی کر دی گئی ہے۔ چونکہ اِس کتاب کے بارے میں اعلان کیا جا چکا تھا کہ جنوری کے آخری ہفتے میں تیار ہو جائیگی اس لئے التوائے اشاعت کا اعلان بھی ضروری سمجھا گیا تاکہ قارئین ساقی کو انتظار کی زحمت نہ اُٹھانی پڑے۔



کیوپڈ

Calcutta Art Press, Delhi

# خطرہ ہائے دل

(از جناب خان بہادر میر ناصر علی صاحب دہلوی)

دل کے خطرے گو اشاعت کے لائق نہیں۔ مگر یہ سمجھنا کہ کوئی آدمی ان سے خالی ہو میری سمجھ سے باہر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ میری سمجھ بہت بڑی نہیں۔ مگر معمولی سمجھ سے کم سمجھنے میں مجھے شرم آتی ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ وہ خدائے لایزال جس کی نظر میں امیر و فقیر، دانا اور نادان، آقا و غلام، عالم و جاہل سب برابر ہیں۔ سب کی پیدائش ایک سی اور قوت بھی ایک سی اور سب کو یہ ساری نعمتیں مفت اور برابر عطا کرے۔ اپنے پہچاننے کی قوت میں میرے ساتھ میرا قصور سرزد ہونے سے پہلے دریغ کرتا۔ وہ تو حی لایموت ہے دنیا میں بیجان اور فنا ہونے والی چیزیں بھی ہر حال میں یکساں پیش آتی ہیں۔ چراغ محل میں ہو یا جھونپڑی میں، شمع مزار پر ہو یا بزم جاناں میں، روشنی میں کہیں کمی نہ دیکھے گا۔ پانی ہمیشہ نیچے کو جائیگا اور کوا دیر کو۔ مجھے اندیشہ نہیں کہ اسنے مجھے اپنے سمجھنے کی قوت دی اور آپ کو نہ دی۔ آپ کو دی اور مجھے نہ دی۔ یہ بات اور ہے کہ چراغ کو آپ ڈھانک کر نہ رکھیں اور شمع کو ہوا سے نہ بچائیں۔ ایسے اسباب کا نام میری سمجھ میں خطرہ ہائے دل ہے۔ کہ اگر خاطر نشان بھی ہو تو بھی دلجمعی کی شکایت رہجاتی ہے۔

صوفیائے کرام اور اولیاء اللہ کی بڑی تعریف یہ سمجھی جاتی تھی کہ مریدوں کے دلوں میں جو خطرہ پیدا ہو وہ مرشد سے چھپ نہ سکے سمجھ جائے اور اسی وقت اسکا علاج ہو جائے۔ عوام کے نزدیک خطرہ کا دل میں زیادہ ٹھہرنا ضعف عقائد میں داخل ہے۔ یہاں مجھے عقائد مذہبی کی طرف سے خطروں کا ذکر منظور نہیں۔ اکیلے بیٹھے بیٹھے کبھی کبھی انسان کے دل میں جو بے تکے خیال آجاتے ہیں ان کا ذکر کرنے کو جی چاہتا ہے۔

یہ مضمون معمولی مضامین سے ذرا مشکل ہے گو جھوٹ بولنا اچھا نہیں۔ مگر سچ بولنا بھی ہنسی کھیل نہیں ۔؎

تھمتے ہی تھمینگے اشک ناصح
رونا ہے یہ کچھ ہنسی نہیں ہے

مگر جس طرح جگ بیتی سے آپ بیتی میں تکلف کی ضرورت نہیں اور انسان کو اپنا ہی حال زیادہ معلوم ہوتا ہے اسی طرح ہر شخص اپنے دل سے پوچھ سکتا ہے کہ میرے دل میں کیا کیا خطرے گذرتے ہیں۔ گو منہ سے نکالے یا نہ نکالے۔

انسان کو گو اپنا بچپن یاد نہیں رہتا۔ مگر اوروں کو دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ چشم جاناں کی طرح جو بیمار بھی کہلاتی ہے اور شوخ بھی ہوتی ہے۔ بچے معصوم بھی سمجھے جاتے ہیں اور شریر بھی ہوتے ہیں۔ بچوں سے زیادہ کوئی ڈرنے والا میں نے نہیں دیکھا اور وہی سانپ کا پھن پکڑ لینے میں ذرا تامل نہیں کرتے۔ پرائی چیز بغیر منع کئے اپنی سمجھتے ہیں اور دوست دشمن کے بہکانے میں آجاتے ہیں۔ یہ پہلا نمونہ بے سمجھے ہوئے خوف و رجا کا ہے۔

انسان کو جب عقل آتی ہے تو ہر بات میں دلیل و حجت پر زور دیتا ہے جو بات عقل سے ثابت نہیں یا نہ سمجھ سکے ضد کر کے اسکے پیچھے پڑ جاتا ہے۔ کوئی مسئلہ آپ زبان سے نکالئے۔ سننے والے کے منہ سے چھوٹتے ہی یہی نکلیگا

کیجئے شکایت کیجئے ۔ اور جسقدر انسان آج کل کے موافق اپنے تئیں تعلیم یافتہ سمجھتا ہے ۔ اتنے ہی زور سے چیختا ہے ۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کوئی بات طے ہو کر نہیں ہوتی اور ایک کے بعد دوسرے کی تردید ہوتی چلی جاتی ہو ۔ یہاں تک کہ بعد تو اور اپنی بات بھی سمجھ میں نہیں آتی آخر کون آپ اپنی سنتے ہیں نہ میری ۔

عالم اسباب میں کبھی انسان کے ذہن میں آتا ہے کہ اسکا انتظام ایسے کے دست قدرت میں ہے جسکا کوئی کام مصلحت سے خالی نہیں ۔ یہ تب تک ہو جب تک کہ دوسروں کو مصیبت میں گرفتار دیکھتا ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے مصلحت سے خالی نہیں ۔ جب اپنے اوپر مصیبت آتی ہے یہ بات ذہن سے نکلجاتی ہے اور بے اختیار زبان سے نکلجاتا ہو کہ معلوم نہیں کہ خدا کو کیا منظور ہے ؟ دوسروں کو سمجھاتا تھا کہ جو کچھ ہوا اس میں مصلحت ہوگی ۔ اپنی مصیبت میں کہتا ہے کہ دیکھئے اللہ میاں کی کیا مرضی ہے ! آخر کو یہ خطرہ پیدا ہوتا ہے کہ دنیا میں آرام کا نام نہیں ۔ جہاں تک غور کیجئے برائی زیادہ ہو ۔ عالم اسباب میں برائی کہاں سے آئی کہ اسیکا دور دورہ نظر آتا ہو ۔ حالانکہ اس کا بنانیوالا نیک ہو اور نیکی پر قادر ہو ۔

اس خیال کے ساتھ ذہن میں آتا ہو کہ دنیا نیک اعمال کا نام ہے ۔ بندگان خدا کی خدمت بڑی نعمت ہو ۔ یہ بات اسلئے جلدی سمجھ میں آجاتی ہے کہ اس میں در پردہ اپنی ہی عظمت ہے ۔ مصیبت زدہ کی ہمدردی کو جی اسلئے چاہتا ہے کہ خدا نے ہمیں مصیبت سے بچا رکھا ہو ۔ اندھے پر رحم آتا ہے کہ خدا نے ہمیں آنکھیں دے رکھی ہیں ۔ اپاہج پر ترس آتا ہے کہ ہم میں چلنے پھرنے کی طاقت ہے ۔ لیکن جب ابنائے زماں کی طرف سے شکایتیں سننے میں آتی ہیں تو اُسی کے ساتھ بھونک کر بیٹھے جی اکتا جاتا ہے ۔ بچوں کے گھروندوں کی طرح یہ نقش یکے بعد دیگرے مٹتے چلے جاتے ہیں ۔ دل میں یہ خطرہ پیدا ہوتا ہے کہ عالم اسباب میں جب نفسی نفسی کا شور ہے تو نقارخانہ میں طوطی کی آواز کون سنتا ہو ؟ ابنائے زماں پر جان دینا اپنی ” ننھی سی جان کا زیاں کرنا ہے ۔ پرائے شگون کیلئے ناک کٹوانی ہے ۔

عالم اسباب کی ترقی و اصلاح میں دیکھا کہ جس قدر ظاہری دولت و عظمت بڑی اسی قدر مکر و فریب شرارت و چالاکی کا بول بالا ہوا ۔ جس قدر سامان عیش زیادہ ہوا اسی قدر انسان روتا ہوا نظر آیا ۔ اہل کمال محتاج اور جاہل و آوارہ اکثر خوشحال دیکھے ۔

اتفاق سے میں بہت ہی معمولی عقل کا آدمی ہوں ۔ آسمان و زمین کے قلابے ملانے مجھے نہیں آتے ۔ کسی نے مجھ سے کہا کہ سبب تیری ہی عقل کا قصور ہو جو دل میں ایسے خطرے پیدا ہوتے ہیں ۔ مگر جب میرے پاس وہی مختصر سی عقل ہو جو خدا نے مجھے دی تو اس سے زیادہ سمجھنے کی قوت کہاں سے لاؤں ؟ جو ہاتھ پاؤں کہ خدا نے مجھے دئے ہیں انہیں سے کام لے سکتا ہوں ۔ پرائے ہاتھ پاؤں سے مجھے کیا فائدہ ؟

لیکن نہیں ۔ اپنی عقل سے زیادہ بھی سمجھنے کا ارادہ کر رہا ہوں ۔ مرنیکے بعد عاقبت ضرور ۔ روح غیر فانی ہے ۔ مرنیکا خوف جاتا رہا تو روح کے غیر فانی ہونے میں کیا شک ہے ؟ اگر روح غیر فانی ہے تو مرنیکے نام سے میرا دل کیوں کانپتا ہے ؟

یہ پرانی باتیں ہیں ۔ ان کو جانے دیجئے ۔ تیرہ سو برس سے دنیا میں اسلام جاری ہے ۔ یہ ترمیم طلب کیوں بنا ! مانا ہو ؟ یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ بغیر نماز روزہ حج زکوٰۃ مومن سہی مگر پالیٹکس کے بغیر بیکار ہے ؟ اپنے حقوق پہلے پھر کسی اور کے !

پرانی لٹریچر فضول۔ نئی چاہیئے۔ عورتوں کے لئے پردہ نشینی کی رسم اچھی نہیں، جب تک پردہ ہے ہندوستان کے مسلمان ترقی نہیں کرسکتے آمدنی ہو یا نہ ہو خرچ اخراجات ضرور ہ، کتابیں لکھی جاری ہیں کہ اگلے عقلمند نہ تھے۔ سائنس کے بغیر کوئی دکھ درد مٹ نہیں سکتا جسطرح کہ جب کوئی جل جائے اور آپ اُسے یہ کہہ کر سمجھائیں کہ از روے سائنس حرارت محض حرکت کا نام ہے۔ سوزش کچھ چیز نہیں۔ میں کنوئیں میں گر پڑوں اور آپ اوپر سے فرمائیں کہ اچھا ہوا کہ اسکی تہ کو تو پہونچ گئے غرض عجیب عجیب ملکی اور قومی خیالات پیدا ہو رہے ہیں۔ جنکا نتیجہ یہ ہے کہ کہیں گالیاں پڑ رہی ہیں۔ کہیں پیٹھ ٹھونکی جارہی ہے۔ ایک نقش بنتا ہے دوسرا بگڑتا ہو۔ کوئی صورت قرار نہیں پاتی۔ جس طرح نٹ کی نئی حرکت ایک دفعہ اچھی معلوم ہوتی ہو پھر اُس میں لطف نہیں آتا جب تک کوئی بات تازہ رہی اسکا شوق رہا پھر طبیعت سے اتر جاتی ہے۔ لیکن بھائی پرانی باتوں کیلئے تحقیق و علم چاہیئے۔ نئی کیلئے ذہانت۔ دل کے خطروں کے لئے نہ اسکی ضرورت ہے نہ اُسکی۔

جوانی میں جب میں انگریزی پڑھتا تھا اور ڈارون و پروفیسر ہکسلی اور اسپنسر کے سوا کسی کا قائل نہ تھا۔ میرے دل میں بہت خطرے پیدا ہوئے۔ ایک دن ان کا ذکر والد ماجد قبلہ سے آیا۔ اور ہوتا تو کفر کا فتویٰ دیدیتا۔ آپ نے فرمایا کہ اسلام میں بڑی خوبی یہ ہے کہ پروردگار نیکی کا ثواب تو اسی وقت دیدیتا ہے جسوقت کہ دلمیں نیکی کا خیال پیدا ہو اور خطرہ ہائے دل گو اچھے نہ ہوں مگر جب تک قوت سے فعل میں نہ آئیں کچھ اثر پیدا نہیں کرتے۔ نیکی کا عوض تو اُسیوقت بُرائی کی سزا جب تک کہ عمل میں نہ آئے نہیں دیجاتی کمال رحم ہے اگر خطروں کا علاج اسلام میں بہت آسان رکھا ہو کہ

لاحول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم ط

# جگر پارے

ازحضرت جگرمرادآبادی



میرا جو حال ہو سو ہو برقِ نظر گرائے جا
میں یوں ہی نالہ کش رہوں تو یونہی مُسکرائے جا

دل کے ہر ایک گوشہ میں آگ سی اک لگائے جا
مُطربِ آتشیں نوا، ہاں اسی دُھن میں گائے جا

لحظہ بہ لحظہ دم بدم جلوہ بجلوہ آئے جا
تشنۂ حُسنِ ذات ہوں تشنہ لبی بڑھائے جا

پی سکوں آج جس قدر، عذر نہ کر پلائے جا
مست نظر کا واسطہ، مست نظر بنائے جا

قہر سے ہو کہ لطف سے ہو گا کبھی تو رُو برو
اس کا جہاں پتہ چلے، شور وہیں مچائے جا

ایک تری ہر اِک نگاہ جانِ بہار و موجِ مے
سامنے میرے آئے جا مست مجھے بنائے جا

عشق تو مطمئن نہ رکھ حُسن کے اعتماد پر
وہ تجھے آزما چکا۔ تو اُسے آزمائے جا

(مُرسلہ مسعود قریشی)

# دُنیا کی سب سے پہلی کہانی!

جب خدا نے دُنیا کے پلوٹھے بیٹے آدم، اور دنیا کی پلوٹھی بیٹی حوا کی نافرمانی دیکھی۔ تو اُسے رنج ہُوا اور اُس نے ان دونوں گنہگاروں کو باغ عدن کے بہشت سے باہر نکال دیا۔

آدم اور حوا، دونوں اپنے چاروں طرف دیکھتے تھے، اور اپنی حماقت پر افسوس کی ٹھنڈی آہیں بھرتے تھے۔ وہ شعر و نغمہ کی سرزمین، وہ رنگ و بو کی دُنیا، وہ چاندنی میں بھیگی ہوئی روشیں، وہ پھولوں کا موسم، وہ سُرور کی ہوا، وہ سرد و شیریں پانی، وہ میٹھے میٹھے پھل۔ یہ سب کچھ کہاں تھا۔ یہ شام کے بڑھتے ہوئے تاریک سایوں کے درمیان رُلے ہوئے گلوں اور رنج کے بار تلے دبے ہوئے دلوں کیساتھ آدم اور حوا ایک کھردرے پتھر پر بیٹھے تھے اور ان کے آنسو کانٹوں کے بیج کی شکل میں اُگنے کے لئے زمین کی مٹی پر گر رہے تھے۔

اور یہ پہلا موقعہ تھا جب شام کے نیلے آسمان نے دُنیا میں کسی کو روتے دیکھا۔ اتنے میں حوا اپنی جگہ سے اُٹھی، اور آدم کے قریب جاکر اسکے پہلو میں بیٹھ گئی۔ اسکے بعد اُسنے آدم کے اُداس چہرے کو محبت سے پکڑکر، اسکے گھٹنوں پر سے اُٹھایا۔ اور اسے اپنی چھاتی سے لگا لیا۔ آدم کے بہتے ہوئے آنسو اسکی آنکھوں میں خشک ہو گئے۔ ایسی ٹھنڈک باغِ عدن کے کسی پھول، کسی پتے، کسی کیسلے میں بھی نہ تھی۔

لیکن حوا کی آنکھوں میں ابھی تک گرم آنسو اور اسکے ہونٹوں پر ابھی تک سرد آہیں تھیں۔ تب آدم نے اپنی مردانہ اُنگلیاں اسکے سیاہ لمبے لمبے ریشمیں بالوں میں پھیر کر اپنی ہنستی ہوئی آنکھیں اسکی روتی ہوئی آنکھوں میں ڈال دیں، اور دُنیا کے پہلے اشتیاق سے اسکا غنچہ دہن چوم لیا، حوا کا قلق اسکے ہونٹوں پر منجمد ہو گیا۔ ایسی مٹھاس باغ عدن کے دودھ اور شہد اور آبِ حیات کسی شے میں بھی نہ تھی۔

اب وہ دونوں مرد اور عورت نہ تھے، عاشق اور معشوق تھے۔ چاروں طرف رات کی تاریکیاں پھیل رہی تھیں اور درمیاں میں محبت کے دو چراغ جل رہے تھے۔ چاروں طرف رات کا سناٹا چھایا ہوا تھا اور درمیان میں محبت کے دو پُر شباب نغمے گونج رہے تھے۔

اور یہ پہلا موقعہ تھا جب رات کے کالے آسمان نے زمین پر محبت کی کلیوں کو شگفتہ ہوتے دیکھا۔

# The Influence of the Conflict Between Classicism and Romanticism on Urdu Poetry

# اُردو شاعری پر کلاسیت و رومانیت کی جنگ کا اثر

از جناب محمد حسین ادیب ایم۔ اے۔ بی۔ ای۔ ڈی

(گذشتہ سے پیوستہ)

ایک قابلِ ذکر امر یہ بھی ہے کہ فصاحت و بلاغت کے قدیم اصول کے مطابق طرزِ ادا اور اسلوبِ بیان میں یہ حد تک یکسانیت پائی جاتی ہے۔ جملوں کی ساخت، ترکیب، تناسب اور الفاظ کی بندش اور محل و قوع کے متعلق قواعد و ضوابط مقرر ہیں جن کی تمام ادیب اور شاعر پابندی کرتے تھے۔ زینتِ کلام کے لئے وہ ایک ہی قسم کے صنائع و بدائع بھی استعمال کرتے تھے۔ اس لئے سب کا کلام ایک ہی رنگ میں ڈوبا ہوتا تھا چنانچہ اٹھارھویں صدی عیسوی کے یورپی ادیبوں کے رشحاتِ قلم و نتائجِ فکر کا باہمی مقابلہ و موازنہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی عبارتیں ایک دوسرے سے ویسی ہی ملتی جلتی ہیں جیسے "مرغ کا ایک انڈا دوسرے انڈے سے یا مٹر کا ایک دانہ دوسرے دانے سے" انگریزی شاعروں کے بہ نسبت فرانسیسی شعرا کے کلام میں یکسانیت زیادہ نمایاں ہے کیونکہ فرانسیسی زبان میں انگریزی زبان سے زیادہ لوچ، گھلاوٹ، شیرینی، صفائی اور روانی پائی جاتی ہے۔ زبان جتنی زیادہ ستھری، شستہ، مہذب اور مکمل ہوگی اتنی ہی زیادہ اس میں اصول و قوانین کی پیروی کی صلاحیت پائی جائے گی۔ تاہم انفرادی اسلوبِ بیان میں شخصیت کی جھلکیاں ضرور نظر آتی ہیں۔ جس طرح دو آدمیوں کی صورت شکل ایک دوسرے سے نہیں ملتی اسی طرح ان کی طبیعتیں بھی جداگانہ ہوتی ہیں۔ اگرچہ قدیم فصاحت و بلاغت کے اصول مقرر و معین تھے تاہم اختلافِ طبائع کی بنا پر ایک ہی قسم کے قواعد و ضوابط کی پیروی کرنے پر بھی دو ادیبوں کے اسالیبِ بیان میں تباین و تفاوت پایا جاتا ہے۔ لیکن یہ اسلوبی فرق اس قدر باریک اور نازک ہوتے ہیں کہ بغیر خوردبینی معائنہ کے ان کا پتہ چلانا مشکل ہے۔ کلاسی ادیبوں اور شاعروں کے کلام میں صرف باریک بین و تربیت یافتہ نقاد ہی امتیاز کر سکتے ہیں۔ کلاسی دبستان میں فصاحت و بلاغت کے مقررہ اصول کی پیروی اور زبان کی لطافت و روانی، شستگی و صفائی اور صحت و دلکشی کا بہت لحاظ کیا جاتا ہے۔ اس کے علی الرغم رومانی دبستان کے حامی قواعد و ضوابط کی زیادہ پرواہ نہیں کرتے۔ ان کا ذریعۂ اظہار تحاورِ روز مرہ عام بول چال کی زبان ہوتی ہے۔ معمولی زبان اور ادنیٰ مضمون میں اثر و دلآویزی کا پیدا کرنا ہر کس و ناکس کا کام نہیں ۔۔۔ ہر ۔۔۔ کا رشتہ ۔۔۔ اردو کا توسن فکر بھی اپاہج ثابت ہوا ہے۔ رومانیت کے

زبردست حامی ورڈس ورتھ نے اپنے مشہور "دیباچہ" میں بڑے شد و مد کے ساتھ بیان کیا ہے کہ پوئٹک ڈکشن یعنی مخصوص شاعرانہ اسلوب بیان بالکل غیر ضروری اور مہمل چیز ہے۔ شاعر کو چاہیئے کہ ادنیٰ طبقہ کے لوگوں کے خیالات و جذبات کو انہیں کی بول چال میں بیان کرنے کی کوشش کرے کیونکہ یہی طریقہ فطری ہے۔ اعلیٰ طبقہ کے لوگوں کے نہ صرف نظام معاشرت و طریقہ رہائش میں بلکہ ان کے خیالات و جذبات، اندازِ تکلم اور طرزِ گفتگو میں بھی تصنع و تکلف پایا جاتا ہے۔ مولانا حالی نے بھی اپنے "مقدمہ" میں ورڈس ورتھ کی ہمنوائی کی ہے۔ مولانا کا ارشاد ہے کہ شعر کو لفظاً و معناً دونوں حیثیتوں سے نیچر یعنی فطرت و عادت کے مطابق ہونا چاہیئے۔ لفظاً نیچر کے موافق ہونے سے یہ غرض ہے کہ شعر کے الفاظ اور ان کی ترکیب و بندش تا بمقدور اس زبان کی معمولی بول چال کے مطابق ہو اور معناً فطرت کے مطابق ہونے سے یہ مطلب ہے کہ شعر میں ایسی باتیں بیان کی جائیں جیسی عام لوگوں کی زندگی میں ہمیشہ پیش آیا کرتی ہیں۔ ورڈس ورتھ اور حالی دونوں نے اپنی اپنی شاعری میں اپنے مجوزات و مفکورات کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش بھی کی لیکن دنیا جانتی ہے کہ دونوں کو ناکامیوں کا منھ دیکھنا پڑا۔ چنانچہ کالرج، میترس، میتھیو آرنلڈ، والٹر پیٹر، لاول اور لفکا ڈیو ہیرن جیسے زبردست ماہرین فن کا خیال ہے کہ ورڈس ورتھ اپنے نظریہ پر عامل نہ ہو سکا۔ اس کی وہی نظمیں بلند پایہ سمجھی جاتی ہیں جن میں اس نے اعلیٰ جذبات اور لطیف خیالات کی ترجمانی کی ہے اور اپنے تخئیل کو آزادانہ پرواز کا موقع دیا ہے اور جن کی زبان اور پیرایہ بیان بھی مرصع، مکلف، مزین اور ترنم خیز ہے۔ اور جس کلام میں اس نے ادنیٰ طبقہ کی معاشرت کی تصویر سیدھی سادی زبان میں کھینچنے کی کوشش کی ہے وہ بالکل روکھا پھیکا اور بے مزہ ہے۔ مولانا حالی کے متعلق بھی ارباب نظر کی یہی رائے ہے۔ ان کے وہی اشعار دل میں کھبنے والے اور جادو کا اثر رکھنے والے ہیں جو قدیم شاعرانہ انداز میں لکھے گئے ہیں اور تشبیہات و تلمیحات سے آراستہ ہیں۔ برخلاف اس کے انگریزی خیالات کے زیر اثر انہوں نے جن اشعار میں زندگی کے معمولی معمولی واقعات روزمرہ کی بول چال میں ظاہر کئے ہیں وہ بالکل پھیکے اور بے اثر ہیں۔ غرض کہ جس مہم کو ورڈس ورتھ اور حالی جیسے اکابر رجال سر نہ کر سکے اس کا نام نہاد علمبرداران حریت کے ہاتھوں سر ہونا ناممکن ہے۔

بہرکیف رومانی تحریک کی سب سے بڑی خوبی یہ بیان کی جاتی ہے کہ وہ انفرادیت کو نمایاں اور شخصیت کو اجاگر کرتی ہے۔ تہذیب و تمدن کا یہی اقتضا ہے۔ تمدن کی ترقی کی رفتار اجتماعیت سے انفرادیت کی جانب ہے۔ کلاسی دبستان پر یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ وہاں طرز ادا اور اسلوب بیان کی یکسانیت انفرادیت کو ابھرنے کا موقع نہیں دیتی۔ ادبی لطافت و نفاست، معنوی حسن و جمال اور صوری آرائش و شائستگی کے ہنگامہ اور زور و شور میں شاعر کی شخصیت گم ہو جاتی ہے۔ غرض کہ کلاسیکل اسکول میں شاعروں کے ذاتی جوہر کھلنے نہیں پاتے۔ کیونکہ سب کا کلام ایک ہی رنگ میں ڈوبا ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے رومانی دبستان میں ہر شاعر کو جدت و ندرت کے اظہار کا موقع ملتا ہے جس سے اس کے ذاتی اوصاف ابھرتے ہیں اور اس کی شخصیت جلا پاتی ہے۔ لیکن اردو شاعری کا یہ معجزہ ہے کہ جن سخنوران کامل نے قدیم نحوی و عروضی قوانین کا انتہائی احترام کیا ہے اور پرانی ڈگر سے ایک قدم بھی نہیں ہٹے ہیں ان کی انفرادیت

شخصیت کو دوبانے کے بجائے ابھار اُجاگر کرتی آئی ہے۔ ہمارے باکمال شعرا نے شاعری کے مقررہ حدود کو بغیر توڑے ہوئے حیرت انگیز طریقہ پر اپنی جودت طبع کا اظہار کیا ہے۔ یہاں ہر بڑے شاعر کا طرز علیحدہ اور رنگ جداگانہ ہے، جس کی وپہچانت کے لئے نہ غور دبینی معائنہ کی ضرورت ہے اور نہ کسی مخصوص تنقیدی تربیت کی۔ میر وسودا، درد وجرأت، سوز و نظیر، انشار و مصحفی، ناسخ و آتش، نصیر و ذوق، مومن و غالب، داغ و امیر کی شاعرانہ خصوصیات ایک دوسرے سے اس قدر متغائر و متمائز ہیں کہ ہم کلام سنتے ہی بغیر کسی غور و تلاش کے فوراً جان لیتے ہیں کہ یہ کس شاعر کے رنگ میں ہے۔

لفکاڈیو ہرن کا بیان ہے کہ اگرچہ شکسپیر کے بعد سے آج تک انگلستان میں رومانی دبستان ہی سے بڑے بڑے اہل کمال ادیب اور شاعر پیدا ہوتے ہیں تاہم رومانی تحریک نہایت دشوار اور خطرناک ہے۔ ان دشواریوں اور خطروں کا مقابلہ میدان سخن کے سورما اور شہسوار ہی کر سکتے ہیں۔ قدیم قواعد وضوابط کو توڑ کر نئے اصول و قوانین وضع کرنا۔ پُرانے پُرامن و محفوظ راستہ کو چھوڑ کر نئی راہ نکالنا معمولی یا متوسط درجے کے شاعر یا ادیب کا کام نہیں ہے۔ بلکہ اس کے لئے مجدّد و مجتہد کی ضرورت ہے۔ بلکہ قدیم سُنت ترک کر کے نئی سنت قائم کرنا پیمبران سخن کا کام ہے لیکن پیغمبر دنیا میں ہر روز نہیں آتے۔ خیر پیمبر کی تو بات ہی اور ہے صاحب کمال بھی مشکل سے پیدا ہوتے ہیں۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اگر متوسط درجے کے ادیب و شاعر بھی قواعد وضوابط کی پیروی سے بے نیاز ہو جائیں اور تمام قیود و شرایط کو توڑنے لگیں تو سارا لٹریچر ہی خاک میں مل جائے گا۔ قدیم ڈگر کو چھوڑنا آسان ہے لیکن نیا جادہ قائم کرنا سخت دشوار امر ہے۔ ہزاروں سہل انگار آدمی صرف اس لئے رومانی تحریک میں شامل ہونا چاہتے ہیں کہ وہاں اُن کو من مانے کام کرنے کا موقع ہاتھ آتا ہے۔ کلاسی قواعد وضوابط پر عبور حاصل کرنے کے لئے اعلیٰ درجے کی تعلیم و تربیت کی ضرورت ہے۔ جو لوگ قدما کی لطیف نگاری و رنگین بیانی کے اتباع کی صلاحیت نہیں رکھتے وہ اپنی نااہلیت و عدم قابلیت کی پردہ پوشی کے لئے خود کو رومانی تحریک کا حامی ظاہر کرنے لگتے ہیں۔ یہ لوگ بھول جاتے ہیں کہ محض آئین شکنی اور بے راہ روی سے کوئی شخص رومانی ادیب نہیں بن سکتا۔ باکمال رومانیوں نے اگر قدیم اُصول و قوانین توڑے ہیں تو ان کی جگہ ان سے بہتر قواعد وضوابط مرتب بھی کئے ہیں۔ لیکن آج کل تو آئین و اُصول کی خلاف ورزی کی ہر طرف ہوا چل رہی ہے۔ جس کو دیکھو بلا وجہ اور بغیر کسی بہتر نتیجہ کے قانون شکنی پر آمادہ نظر آتا ہے۔ قدیم اُصول و قوانین کی خلاف ورزی کرنے والے رومانیت کا صحیح مفہوم سمجھنے سے قاصر ہیں۔ انہوں نے غلطی سے خود رائی اور ذاتی تصرف کو آزادی کا مرادف تصور کر لیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ لٹریچر میں روز بروز انحطاط و تنزل واقع ہو رہا ہے۔ ایسی حالت میں ہر محب وطن کا فرض ہے کہ وہ کلاسی ردّ عمل کا ساتھ دے اور قدیم دبستان کی حمایت کرے کیونکہ ذاتی تصرف اور خود رائی سے لٹریچر کو جو نقصان پہونچ رہا ہے اس کے اندفاع کی یہی سب سے بہتر

تدبیر ہے۔ اسی طرح جب کبھی حامیانِ کلاسیت کی سخت گیری اور غلو پسندی کی وجہ سے ارتقائے شاعری میں ٹھہراؤ اور جمود پیدا ہونے لگا تو
میں رکاوٹ واقع ہو تو اس کا قدرتی رد عمل ہے جیسا کہ یورپ میں اٹھارہویں صدی عیسوی کے وسط میں پیش آیا تھا۔ ہمارے
ملک کی ادبی فضا بھی خود رائی اور بے راہ روی سے مسموم ہو رہی ہے۔ جسے دیکھو جدت طرازی کا مدعی اور حریت و آزادی کا
علمبردار نظر آتا ہے۔ کوئی زبان بگاڑ کر اپنے کلام میں "لوکل کلر" یعنی مقامی رنگ پیدا کرنے کا دعویدار ہے۔ کوئی عروضی قیود سے
بے نیاز ہو کر "بلینک ورس" کی پیروی سے میدان سخن کو وسیع کرنا چاہتا ہے۔ کوئی سانٹ اور اسٹانزائی نظم کا دلدادہ بنا ہوا ہے۔
کوئی ذاتی تصرف و تبدیلی کو اجتہاد کا مرادف سمجھتا ہے۔ کوئی ردیف و قافیہ کو اظہار خیال میں رکاوٹ تصور کرتا ہے لیکن
فی الحقیقت یہ تمام باتیں شاعرانہ ضعف و عجز کی دلیل ہیں۔ قدما کی معجز بیانیوں کا اتباع ٹیڑھی کھیر ہے۔ متوسط درجہ کے
شاعروں سے جب تمام فنی قیود و شرائط اور اصول و ضوابط کا نباہ نہیں ہو سکتا تو وہ جدت طرازی کے حامی اور حریت و
آزادی کے علمبردار بن کر طرح طرح کے حیلے اور بہانے تلاش کرنے لگتے ہیں۔ یہاں بھی ہر محب ادب کا فرض ہے کہ نام
نہاد علمبردارانِ حریت کی مضرت رساں خود رائی و تصرفات کا مقاطعہ اور قدما کی شیوہ بیانیوں کی حمایت کر کے اپنے ادب و شاعری
کو تباہی و ہلاکت سے بچائے۔

اردو شاعری کی عمر فرانسیسی شاعری کے مقابلہ میں بہت تھوڑی ہے۔ یہاں قدامت پسندی اور جدت طرازی کی
کشمکش بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔ البتہ اساتذۂ سخن اصولِ ارتقا کے بموجب گیسوئے اردو کے سنوارنے، زبان سے
ثقالت و کرختگی دور کرنے اور کلام میں صفائی و شستگی پیدا کرنے کی ہمیشہ کوشش کرتے رہے ہیں۔ ہمارے نامور اسلاف
وضع کے بڑے پابند تھے۔ وہ یکایک تبدیلیوں اور انقلابوں کے سخت مخالف تھے۔ وہ اپنے پیشروؤں کا حد درجہ احترام کرتے
تھے اس لئے قدیم چیزوں سے بیزاری و بغاوت کا ان کے دل میں کبھی خیال بھی نہیں گذرا۔ وہ قدیم عمارت ڈھا کر نئی عمارت
تعمیر کرنا نہیں چاہتے تھے، اس لئے انہوں نے پرانی عمارت ہی کو بلند سے بلند تر بنا لیا اور اس کو نقش و نگار سے آراستہ
مزین کرنے میں مشغول رہا کئے۔ اُن زمانہ میں اپنے ہی بزرگوں سے بغاوت انتہا درجہ کی بے ادبی و بدبختی خیال کی جاتی
تھی۔ البتہ ابتذال، سوقیت اور سخافت سے بیزاری کا اظہار کیا جاتا تھا۔ یورپ میں قدیم چیزوں سے بیزاری اور مقررہ و
متعین اصول و ضوابط کی خلاف ورزی تاریخی و سیاسی اسباب کی بنا پر تھی۔ قرونِ وسطیٰ میں وہاں زندگی کا ہر شعبہ کلیسا
کے پنجۂ استبداد میں گرفتار تھا۔ کلیسا ہر جدت و بدعت کو الحاد کے مرادف خیال کر کے خاطیوں کو سخت سزا دیتا تھا
امرا کے طبقہ کو کلیسا کی حمایت حاصل تھی۔ غریبوں پر وہ طرح طرح کے مظالم ڈھایا کرتے تھے۔ ادبی و علمی معاملات میں بھی
لوگوں کو ذہنی آزادی حاصل نہ تھی۔ کلیسا اور امرا دونوں قدامت پرست تھے۔ اس لئے عوام کے دلوں میں کلیسا، طبقہ
امرا اور قدامت پسندی تینوں عناصر سے نفرت و بیزاری پیدا ہونے لگی۔ کلیسا کے جبر و تشدد کی وجہ سے ہر قسم کی علمی و
معاشرتی ترقی رک گئی تھی۔ بہت عرصہ تک لوگ ذہنی غلامی میں مبتلا رہے۔ آخر جب پانی سر سے گذر گیا تو وہاں مجاہدوں
کی ایک جماعت حریت و آزادی کی علمبردار بن کر منظرِ عام پر آگئی اور کلیسا و امرا کے پنجۂ استبداد سے رہائی پانے کے
لئے علم بغاوت بلند کیا۔ غرض کہ وہاں مذہبی و ذہنی آزادی کا حاصل ہونا تھا کہ زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی کے آثار

[illegible] ان مادیات کے تحت مغربی دنیا میں شہری زندگی سے نفرت، حالت فطری کی طرف رغبت، آداب و مراسم سے بیزاری، تکلفات و تصنعات سے ناراضی، مقررہ قوانین و ضوابط کی مخالفت و رزی فطری امر تھی۔ فرانس کا زبردست سیاسی انقلاب بھی انہیں مادیات کا نتیجہ تھا۔ ادبی دنیا میں سادگی و فطرت کی پرستش اور قدامت و رسمیت سے نفرت و بے زاری کا رد عمل بھی اسی عالمگیر انقلاب میں مضمر تھا۔ کلاسیت کے خلاف رومانیت کی جنگ اسی انقلابی ذہنیت کا ایک کرشمہ تھی۔ بہرحال یورپ میں جو کچھ پیش آیا اس کے لئے تاریخی و سیاسی اسباب موجود تھے۔

لیکن ہمارے ہاں اس قسم کے تغیر و انقلاب کے لئے کوئی قدرتی اسباب مہیا نہ تھے۔ یہاں جو کچھ ہوا وہ یورپ کی کورانہ تقلید کا نتیجہ تھا۔ اس ملک میں جب انگریزی تسلط قائم ہوا تو مشرقی و مغربی تمدنوں میں تصادم واقع ہوا۔ چونکہ مغربی تمدن حاکمانہ اقتدار کے ساتھ آیا تھا اس لئے محکوم اقوام کا اس سے مرعوب ہونا ایک فطری امر تھا۔ یہاں قدامت پرستی و جدت نوازی کے درمیان ایک دوسرے پر سیادت و بہتری حاصل کرنے کے لئے کسی قسم کی پُرخلوص کشمکش یا جد و جہد نہیں ہوئی بلکہ محض انگریزی کی تقلید میں محض مغرب زدہ حضرات نے قدیم شاعری کی مخالفت اور اصول و قوانین کی خلاف ورزی شروع کر دی۔ چونکہ ان کے سامنے کوئی اعلیٰ نصب العین نہ تھا بلکہ ان کی تحریکی کوششیں محض تقلید و نقالی پر مبنی تھیں اس لئے جدید شاعری کی بے آئینی نے اردو لٹریچر میں کوئی قابل قدر اضافہ نہیں کیا بلکہ اُلٹا نقصان پہونچایا ہے۔ ہمارے شعرا میں قابل احترام ہستیاں انہیں کی ہیں جو قدما کی لے میں نغمہ سرائی کرتے ہیں۔ یہاں آج تک قدامت پسندوں ہی کا طبقہ برسر اقتدار رہا کیا ہے جن لوگوں نے قدیم ڈگر سے ہٹکر چلنے کی کوشش کی ہے اور قدما کی رنگین نوائیوں اور رشیدہ بیانیوں کو ترک کر کے سادہ پیرایہ بیان اختیار کیا ہے اور روزمرہ محاورہ اور عام بول چال کی زبان میں نظمیں لکھی ہیں ان کو بالعموم ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑا ہے، قدیم طرز سخن کی صناعیوں اور مرصع کاریوں سے بے نیاز ہو کر جن جدت نواز شاعروں نے بے تکلف اور سادہ زبان میں اپنے خیالات و جذبات کا اظہار کیا ہے۔ ان میں صرف حالی، اکبر اور شوق قدوائی کے بعض حصہ کلام کو قبول عام کی سند حاصل ہوئی ہے۔ حالی نے بے شمار غزلیں اور نظمیں لکھی ہیں لیکن خاص و عام کے حلقہ میں صرف ان کی "مسدس مد و جزر اسلام" مشہور و مقبول ہوئی۔ شاعرانہ نقطۂ نظر سے اس مسدس میں کوئی نزاکت و باریکی یا تاثیر و گیرائی نہیں پائی جاتی۔ چنانچہ اس کے متعلق خود مولانا حالی فرماتے ہیں کہ "ہمارے ملک کے اہل مذاق ظاہرا اس روکھی پھیکی اور سیدھی سادی نظم کو پسند نہ کریں گے کیونکہ اس میں یا تاریخی واقعات ہیں یا چند آیتوں اور حدیثوں کا ترجمہ ہے یا جو آج کل قوم کی حالت ہے اس کا صحیح صحیح نقشہ کھینچا گیا ہے۔ نہ کہیں نازک خیالی ہے نہ رنگین بیانی، نہ مبالغہ کی چاٹ ہے نہ تکلف کی چاشنی۔ غرض کوئی بات ایسی نہیں جس سے اہل وطن کے کان مانوس اور مذاق آشنا ہوں۔ اور کوئی کرشمہ ایسا نہیں ہے جسے نہ کسی کان نے سنا نہ کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ کسی بشر کے دل میں گذرا ہو۔ گویا اہل دہلی و لکھنؤ کی دعوت میں ایک ایسا دسترخوان چنا گیا ہے جس میں اُبالی کھچڑی اور بے مرچ سالن کے سوا کچھ نہیں۔"

شاعرانہ خوبیوں کے فقدان کے باوجود اس مسدس کو جو کامیابی نصیب ہوئی اس کا اصلی سبب یہ ہے کہ وہ مقتضائے وقت کے مطابق تھی۔ اگر یہی مسدس نواب نصیر الدولہ یا نواب واجد علی شاہ کے تعیش پسند زمانے میں لکھی جاتی تو شاید اسے کوئی آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھتا لیکن یہ نظم اس وقت معرض وجود میں آئی جب بقول حالیؔ قوم کی حالت تباہ تھی، عزیز ذلیل ہو گئے تھے۔ شریف خاک میں مل گئے تھے، علم کا خاتمہ ہو چکا تھا، دین کا صرف نام ہی باقی تھا، افلاس کی گھر گھر پکار تھی، پیٹ کی چاروں طرف دُہائی تھی۔ اخلاق بالکل بگڑ گئے تھے۔ تعصب کی گھنگھور گھٹا قوم پر چھائی تھی رسم و رواج کی بیڑی ایک ایک کے پاؤں میں پڑی تھی۔ اس زمانہ میں سرسید نے قومی اصلاح کا بیڑا اُٹھایا اور علماء کا ایک گروہ اپنے گرد جمع کر لیا جن میں مولانا حالیؔ بھی شامل تھے۔ جس طرح سرسید کے اصلاحی کارناموں کی قدر ہوئی اُسی طرح حالیؔ کی مسدس کو بھی عام مقبولیت حاصل ہوئی۔ کیونکہ یہ بھی اصلاحی تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے لکھی گئی تھی۔

واضح رہے کہ قدما کے لطیف و رنگین پیرایۂ بیان کا بار بار اعادہ و تکرار ہونے کے باوجود اس کی دلکشی و تاثیر برقرار رہتی ہے۔ اگرچہ مسدس حالی کا مضمون نہایت شاندار ہے لیکن اسلوب بیان ایسا روکھا پھیکا ہے کہ قوم اس سے صرف ایک بار متاثر ہوئی۔ اور جہاں اس کا اعادہ ہوا کہ یہ نظم اجیرن بنی۔ چنانچہ شوقؔ قدوائی نے اسی شاندار مضمون کو اپنی مسدس "لیل و نہار" میں اسی شرح و بسط سے ادا کیا جیسا حالیؔ نے کیا تھا لیکن اس کی طرف کسی نے آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ اور وہ قعر گمنامی میں گر گئی۔ البتہ فصاحت و بلاغت کے رمز آشنا سر اقبال نے بھی یہی مضمون لیا۔ صورت بھی مسدس ہی کی رہنے دی لیکن لَے قدیم عجمی اختیار کی۔ قدما کی رنگین بیانی کے اتباع نے آب حیواں کا کام کیا۔ اور "شکوہ" و "جواب شکوہ" کو زندۂ جاوید بنا دیا۔ اسی ایک مثال سے ظاہر ہے کہ قدیم پُرشکوہ پیرایہ بیان اور جدید سادہ طرز نگارش میں کیا فرق ہے۔ اول الذکر شاعری کے حق میں آبحیات کا جرعہ ہے اور ثانی الذکر شبنم کا ناچیز قطرہ جسے سورج کی کرن آن کی آن میں غائب کر دیتی ہے۔ اکبر الہ آبادی کی کامیابی کا راز بھی ان کی سادگی کلام میں نہیں بلکہ ظرافت آمیز اسلوب بیان میں مضمر ہے۔ اگر ان کے کلام سے ظرافت و بذلہ سنجی کی چاشنی نکال دی جائے تو عجب نہیں کہ وہ بھی حالیؔ کی اُبلی کھچڑی یا بے مرچ سالن بن جائے۔ شوقؔ قدوائی کی مثنوی "عالم خیال" نے بھی بڑی شہرت و مقبولیت حاصل کی ہے۔ اس مثنوی میں وہ بھی قدیم ڈگر سے ہٹ کر چلے ہیں اور نہایت صاف و سادہ زبان میں اپنے خیالات ادا کئے ہیں۔ اُن کی کامیابی کی اصلی وجہ یہ ہے کہ اُنہوں نے اس مثنوی میں بھاشا کی شاعری کا تتبع کیا ہے۔ بھاشا کی شاعری میں سوز و گداز اور درد و اثر پیدا کرنے کے لئے جتنے وسائل اختیار کئے جاتے ہیں تقریباً وہ سب اس مثنوی میں استعمال کئے گئے ہیں۔ اگرچہ شوقؔ قدوائی کسی خاص طرز کے موجد نہیں کہلا سکتے۔ کیونکہ اُنہوں نے جو کچھ کیا ہے وہ محض تقلیدی ہے تاہم اردو میں یہ ایک نئی چیز تھی اور ہر نئی اور عجوبہ چیز بمصداق کُلُّ جَدِیْدٍ لَذِیْذٌ۔ دلچسپی کی موجب ہوتی ہے۔ لیکن یہ امر مشتبہ ہے کہ اگر اس طرز کا اعادہ کیا جائے تو اُس کی دلکشی برقرار رہے گی یا نہیں۔ اغلب ہے کہ حالیؔ کی مسلک

کی طرح یہ شعوری بھی تکرار و اعادہ سے بے مزہ اور اجیرن بن جائے گی۔

---

خلاصہ کلام یہ ہے کہ نئے نئے خیالات، نئے نئے جذبات، نئے نئے مضامین کے ذریعہ سے اُردو شاعری کے دامن میں وسعت اور فراخی تو ضرور پیدا کی جانی چاہیئے لیکن اسلوب بیان میں اگر قدما کی پیروی نہ کی جائے۔ خودرائی اور ذاتی تصرفات سے کام لیا جائے اور روزمرہ بول چال کی زبان اختیار کی جائے تو کلام بالکل پست بے مزہ اور بے اثر بن جائے گا۔ سر اقبال نے اس گُر کو اچھی طرح سمجھا ہے۔ انہوں نے ہر قسم کے قومی، ملکی، مذہبی، اخلاقی، فلسفیانہ اور حکیمانہ مضامین کے نظر فریب گلدستے تیار کئے ہیں اور شاعری کے دائرہ کو پہنائے عالم سے ہم آغوش کر دیا ہے لیکن کسی حالت میں بھی انہوں نے قدما کی رنگین بیانیاں ترک نہیں کیں۔ ان کے کلام کا موضوع بحث عربی لیکن اس کا ساز و برگ عجمی ہے مضمون توحید پرستی کے متعلق بھی ہو تو پیرایۂ بیان میں وہ صنم پرستی کی اصطلاحیں استعمال کرتے ہیں۔ الغرض وہ حقیقت کو مجاز کے رنگین لباس میں جلوہ گر کرنے کے عادی ہیں۔ چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں کہ ؎

مرا ساز گرچہ ستم رسیدۂ زخمہائے عجم رہا
وہ شہید ذوق وفا ہوں میں کہ نوا مری عربی رہی

مولوی احمد الدین صاحب اقبال کے طرز کلام و انداز بیان کے متعلق تحریر فرماتے ہیں کہ "حالی اور اکبر جو قدیم اُردو شاعری کے بت شکن کہے جا سکتے ہیں نہ صرف بُت کے بلکہ اس بُت کے ساز و سامان، اُس کی حرکات و سکنات، اُس کے اہالی موالی، اُس کے تمام متعلقات اور جملہ لوازمات کے بھی مخالف ہیں۔ وہ حُسن کے ناز و انداز اور عشق کے راز و نیاز میں کچھ لُطف نہیں پاتے۔ اقبال بھی ان کی طرح عشق و عاشقی کے بُت سے تو متنفر ضرور ہیں لیکن ان کی رواداری ماسوائے بُت سے بیزار نہیں ہے۔ چنانچہ ان کی شاعری میں قدیم بُت تو مفقود ہے لیکن بُت کے پُرانے ٹھاٹ باٹ، ساز و سامان اور دلچسپی و دلفریبی کے تمام لوازمات موجود ہیں۔ حُسن کی وہی شوخیاں ہیں، عشق کی وہی گرمیاں ہیں۔ اقبال قدما کی رنگین بیانی کے شیدائی ہیں اور انہیں کی طرح گل و گلزار، رنگ و بو، ساقی و مینا، رقص و سرود اور عشوہ و ناز کے فدائی۔ ان کے کلام میں حالی اور اکبر کی سادگی نہیں پائی جاتی۔ ان کا طرز بیان قدیم حُسن و عشق کی زبان میں ہے۔" اُردو شاعری کی توسیع و ترقی کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ اُسے ہر قسم کے جذبات و خیالات، معاملات حیات، حکیمانہ و فلسفیانہ نکات اور نئے نئے مضامین کا حامل بنایا جائے لیکن اسلوب بیان اور طرز ادا وہی اختیار کیا جائے جسے صدیوں کے تجربہ کے دلکش و موثر ثابت کیا ہے۔ سر اقبال کا یہی انداز بیان ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ ؎

عجمی خُم ہے تو کیا مے تو حجازی ہے مری
نغمہ ہندی ہے تو کیا لَے تو حجازی ہے مری

اقبال کی شاعری نور کا مینار ہے۔ جب کوئی قدامت پسند یا جدت نواز شاعر اپنے سفینۂ سخن کو بھٹکتا ہوا یا طوفان سے گھرا یا بھنور میں پھنسا ہوا پائے گا تو یہ مینارِ نور اس کی رہنمائی کرے گا۔ قلزمِ شاعری کے کشتی بان اگر اس نور سے استفادہ کریں تو وہ ضرور ساحلِ مُراد کو صحیح و سالم پہونچ جائیں گے۔ یہاں جو کچھ بیان ہوا اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ تمام اساتذۂ سخن کا کلام تکلفات و تصنعات سے گرانبار ہوتا تھا اور ان کے نزدیک سادگی کی کوئی قدر ہی نہ تھی۔ خود ملک الشعرا میر تقی میر کی زبان نہایت سہل اور سادہ تھی لیکن فی الحقیقت اُن کی سادگی پُرکاری ہے اور سہل نگاری سہلِ ممتنع۔ ان کے کلام میں جو درد و اثر پایا جاتا ہے اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ انہوں نے عام بول چال کی زبان اختیار کی ہے بلکہ اُن کے طرزِ ادا کی جدت نے شعر کو آسمان پر پہونچا دیتی ہے۔ اس طرز کی بہتوں نے تقلید کرنی چاہی لیکن کامیابی میسر نہ ہوئی چنانچہ ذوق معترف ہیں کہ ؎

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب
ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

اسی طرح مرزا داغ بھی نہایت سہل اور سادہ زبان استعمال کرتے ہیں لیکن جس چیز نے ان کے مجموعۂ کلام کو نشترکدہ بنا دیا ہے وہ سادگی نہیں بلکہ اُن کی غیر معمولی شوخی اور بے باکی ہے۔ الغرض ہر بڑے شاعر کے کلام میں کوئی نہ کوئی امتیازی وصف پایا جاتا ہے۔ مثلاً میر کے کلام کو جدتِ ادا نے، اکبر کے کلام کو ظرافت نے، داغ کے کلام کو شوخی نے چمکایا ہے۔ ورنہ محض محاورہ روزمرہ اور عام بول چال کے استعمال سے کلام میں کوئی خوبی پیدا نہیں ہو سکتی۔

جب ہم تمام اصنافِ سخن سے قطع نظر کر کے غزل کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو اُردو شاعری کی سب سے مشہور و مقبول صنف ہے تو یہاں نہ مضمون میں وسعت کی اور نہ اسلوبِ بیان میں تبدیلی کی گنجائش نظر آتی ہے۔ کیونکہ غزل کا اصل موضوع حسن و عشق کے معاملات ہیں۔ کیا مغرب اور کیا مشرق ہر جگہ یہ امر مسلمہ ہے کہ حسن و عشق سے بڑھکر نہ صرف ادب و شاعری کے لئے بلکہ تمام فنونِ لطیفہ کے لئے اور کوئی موضوع ہو ہی نہیں سکتا۔ تاہم ہمارے وسیع المشرب شعرا نے غزل کو صرف عشقیہ مضامین تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے ہر قسم کے عاشقانہ، صوفیانہ، فلسفیانہ، حکیمانہ، اخلاقی اور معاشرتی مضامین کے اظہار کا ذریعہ قرار دیا بلکہ وہ اس میں انسانی زندگی کے ہر چھوٹے بڑے معاملہ کی ترجمانی کرنے لگے۔ مولانا حالی نے دامنِ غزل کو وسیع کرنے کے لئے یہ تجویز پیش کی کہ غزل میں صرف عشقیہ معاملات ہی نہیں بلکہ ہر قسم کے لطیف و پاکیزہ خیالات بیان کئے جائیں اور اس کو تمام انسانی جذبات و احساسات کے اظہار کا آلہ بنایا جائے۔ لیکن یہ کوئی نئی تجویز نہیں ہے۔ ہمارے بیشتر شعرا اس پر مدت سے کاربند ہیں۔ آج سے صدیوں پیشتر خواجہ حافظ شیرازی نے نہ صرف یہی تجویز پیش کی بلکہ غزل کو ہر قسم کے لطیف خیالات اور پاکیزہ

پاکیزہ جذبات کا حامل بنا کر ایسا بلند پایہ نمونہ بطور یادگار چھوڑا ہے جو رہتی دنیا تک غزل گو شعرا کی رہنمائی کرتا رہیگا اگرچہ غزل میں ہر قسم کے مضامین بیان کئے جانے لگے ہیں لیکن حسن کارانہ نقطۂ نظر سے عشقیہ معاملات کو دوسرے تمام مضامین پر ترفع و تفوق حاصل رہنا چاہیئے۔ اگر حسن و عشق کے مضامین کو ترک کر دیا جائے تو یہ تغزل کی اصلاح و ترقی نہیں بلکہ انحطاط و زوال متصور ہوگا۔ غزل جب تک غزل ہے اس میں عشقیہ معاملات کی دوسرے موضوع پر سیادت و برتری قائم رہے گی۔ اسلوب بیان کے مدنظر تو لطافت و رنگینی غزل کے مایۂ خمیر میں داخل ہے۔ خیالات و افکار کیسے ہی جدید و لطیف۔ جذبات و احساسات کیسے ہی پاکیزہ و پرجوش اور واقعات و معاملات کیسے ہی دلچسپ و پُر لطف کیوں نہ ہوں لیکن اگر انہیں روزمرہ کی معمولی اور سادہ زبان میں ادا کیا جائے تو شعر میں کچھ جان باقی نہیں رہتی بلکہ وہ ادنیٰ بات چیت ہو جاتی ہے۔ نئے خیالات جن الفاظ میں براہ راست ظاہر ہونا چاہتے ہیں اُن کو انہیں الفاظ میں بیان کر دینے سے کلام میں کچھ بھی دلکشی و تاثیر پیدا نہیں ہو سکتی۔ فرض کرو کہ شاعر یہ بیان کرنا چاہتا ہے کہ "اہل ہند میں اتحاد و اتفاق، ضبط و تمرین اور انتظام و انصرام کی ایسی صلاحیت قابلیت نہیں پائی جاتی کہ وہ ملک میں امن و امان قائم رکھ سکیں۔ جب تک فرقہ وارانہ مناقشات اور جماعتی تنازعات دور نہ ہوں اور ایک وسیع ہندی قومیت قائم نہ ہو جائے اُس وقت تک سوراج حاصل نہیں ہو سکتا۔ آج کل ملک میں کامل آزادی کے لئے جو جوش و خروش پھیلا ہوا ہے وہ ابھی خام ہے۔ اس میں پختگی نہیں آئی ہے۔ ہر طرف خود غرضی و مطلب پرستی کا نظارہ دیکھنے میں آتا ہے لیکن سوراج کے لئے خلوص و ہمدردی اور ایثار و بے نفسی کی ضرورت ہے جو ابھی ملک میں مفقود ہے۔ اس لئے اہل ہند کو چاہیئے کہ وہ حکومت انگلشیہ کی سیادت کا جوا اپنے کندھوں سے اُتار پھینکنے کی سعی ناکام کے بجائے اپنی اندرونی تنظیم اور معاشری اصلاح میں مشغول ہوں" اس وسیع خیال کو عام بول چال کی زبان میں ادا کرنے کے لئے ایک شعر کافی نہ ہوگا بلکہ قطع بند کی ضرورت ہوگی۔ لیکن ترک و حذف سے کام لیکر ایک سادگی پسند اور فطرت پرست شاعر اس کی ترجمانی حسب ذیل طریقہ پر کر سکتا ہے ؎

چھوٹا ہے سارا جوش جو پھیلا ہے آج ملک میں
برطانیہ ہی کو ابھی کرنے دو راج ملک میں

عام بول چال کی سادہ اور سہل زبان میں ایک شعر تو ہو گیا لیکن بالکل بے کیف و بے مزہ۔ اب اسی خیال کو ایک بلاغت شناس اور تمثیل و کنایہ کا ماہر شاعر قدما کے رنگین و پُر لطف انداز میں اس طرح ظاہر کرتا ہے:۔

بادہ ہے نیم رس ابھی شوق ہے نارسا ابھی
رہنے دو خم کے سر پہ تم خشت کلیسیا... ابھی

شعر ہے یا جادو جس سے گوش آشنا ہوتے ہی زبان چٹخارے بھرنے لگتی ہے۔ سامعہ کوثر و تسنیم کی موجوں میں غوطے کھانے لگتا ہے۔ قلب میں اہتزاز پیدا ہوتا ہے جس کی ارتعاشی کیفیت عرصہ تک

قائم رہتی ہے۔

الغرض معمولی بول چال کی زبان غزل کا بار امانت نہیں اُٹھا سکتی۔ غزل کی زبان، پیرایۂ بیان، تشبیہ و استعارہ، تمثیل و کنایہ، سب کچھ معیّن و مقرر ہیں۔ غزل کے الفاظ کو بدلنا تو درکنار اگر ایک لفظ کی جگہ اسی کا ہم معنی لفظ رکھدیا جائے تو شعر کی ساری طلسمی قوت و تاثیر زائل ہو جائے گی۔ چنانچہ مولانا حالی جن کے سر جدید شاعری کی اوّلیت کا سہرا ہے فرماتے ہیں کہ "یہ ممکن ہے کہ کسی قوم کے خیالات میں دفعتہً وسعت پیدا نہیں ہو سکتی۔ بلکہ نامعلوم طور پر بیان کے اسلوب آہستہ آہستہ اضافہ کئے جاتے ہیں۔ اور اُن کو رفتہ رفتہ عوام کے کانوں سے مانوس کیا جاتا ہے۔ اور قدیم اسلوب کو جو کانوں میں رچ گئے ہیں بدستور قائم و برقرار رکھا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر علم کی ترقی سے بہت سے قدیم شاعرانہ خیالات محض غلط اور بے بُنیاد ثابت ہو جائیں تو بھی جن الفاظ کے ذریعے سے وہ خیالات ظاہر کئے جاتے تھے وہ الفاظ ترک نہیں کئے جاتے۔ فرض کرو کہ آسمان کا وجود، اس کا گردش کرنا، زمین کا ساکن ہونا، پانی اور ہوا کا بسیط ہونا، عناصر کا چار میں منحصر ہونا، جام جم کا جہاں نما ہونا، ظلمات میں چشمۂ حیوان کا مخفی ہونا، سیمرغ اور دیو پری کا موجود ہونا، اور اسی قسم کی اور بہت سی باتیں علم انسانی کی ترقی سے غلط ثابت ہو جائیں تو بھی شاعر کا یہ کام نہیں ہے کہ ان خیالات سے بالکل دست بردار ہو جائے بلکہ اس کا کمال یہ ہے کہ حقائق و واقعات اور سچے اور فطری خیالات کو انہیں غلط اور بے اصول باتوں کے پیرایہ میں بیان کرے اور اس طلسم کو جو قدما باندھ گئے ہیں ہرگز ٹوٹنے نہ دے ورنہ وہ بہت جلد دیکھے گا کہ اس نے اپنے منتر سے وہی اچھر کھلا دئے ہیں جو دلوں کو تسخیر کرتے تھے۔"

غزل کی کامیابی کے لئے قدیم روش کا اتباع لازمی ہے۔ غزل کے جو الفاظ کثرت استعمال کی وجہ سے کانوں میں رچ گئے ہیں ان میں جادو کا سا اثر پایا جاتا ہے۔ ان کے لغوی معنی کی زیادہ اہمیت نہیں ہوتی۔ بلکہ ہر لفظ کے ساتھ بیسیوں تلازمات وابستہ ہوتے ہیں۔ اگر کسی لفظ کی جگہ اس کا مرادف لفظ رکھدیا جائے تو تمام تلازمات و ایتلافات غائب ہو جائیں گے۔ لہٰذا غزل کا پیرایہ بیان تغیّر و تبدل کی سطح سے بالاتر ہے۔ دوسرے میدان سخن میں جدّت پسند طبائع سمند فکر کو بے لگام چھوڑ کر بھی شہسواری کے دو چار کرتب دکھا سکتے ہیں لیکن غزل کے میدان میں جہاں قدیم ڈگر سے ہٹے کہ گمراہی کے گڑھے میں گرے۔ احساس تنوع، اشتیاق تجدد، تقلید سے بے زاری، مقررہ قیود و شرائط سے بے نیازی، رسمیت سے آزادی۔ ہیں تو بڑی اچھی چیزیں لیکن صرف زبانی جمع خرچ سے کام نہیں چلتا۔ محض قانون شکنی کی حیثیت تخریبی ہے۔ لیکن شاعر کا فریضہ تخریب نہیں بلکہ تعمیر ہے۔ آج تک کوئی شخص قدیم عروضی قواعد و ضوابط یا رسمی قیود و شرائط سے بے نیاز ہو کر غزل کا کوئی جدید دلکش و موثر نمونہ پیش نہیں کر سکا ہے۔

یہ امر ذہن نشین رہے کہ معاشرہ جتنا مہذب اور شایستہ ہو گا اتنا ہی وہ قانون پسند بھی ہو گا۔

مغربی دُنیا بصورت سیاسی حلقوں میں بلکہ دائرۂ ادب میں بھی انتشار اور بے آئینی کو مردود قرار دیتی ہے۔ وہاں زندگی کے ہر شعبہ میں آداب و مراسم کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ تکلف، تصنع، اور رسمیات بھی حیات متمدنہ کے لوازم ہیں۔ فرانسیسی ادیب روسو نے "فطری حالت" اور اس کی سادگی، بے فکری اور فارغ البالی کی جو دلکش تصویر پیش کی تو ایک صاحب نظر طنزاً چلا اُٹھے کہ "تمہاری کتاب پڑھکر میرا دل چاہتا ہے کہ چاروں ہاتھ پاؤں پر رینگتا پھروں" فی الحقیقت معاشری آداب و مراسم اور تکلفات و تصنعات کو چھوڑ کر فطری سادگی و آزادی کی جانب قدم بڑھانا متمدن زندگی سے وحشت و بربریت کی طرف عود کرنا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو مصنوعی پر فطری کو ترجیح دینے کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی۔ لباس اور پوشاک بھی مصنوعی چیزیں ہیں لیکن کیا دُنیا کی کوئی تہذیب برہنگی و عریانی کو ستر پوشی و خوش لباسی پر ترجیح دے سکتی ہے؟ کیا دُنیا کا کوئی مجموعۂ اخلاق برلن کے برہنہ کلب کے شرکاء پر بے غیرتی و بے حیائی کا الزام عائد کئے بغیر رہ سکتا ہے؟ کون نہیں جانتا کہ انسان کی ساری ترقیاں قدرت سے جنگ کرنے کا نتیجہ ہیں۔ ابتدائے آفرینش سے ہی انسان فطرت پر فتح پانے کی کوشش میں مشغول ہے۔ اگر انسان اپنی قدرتی حالت پر قائم رہتا تو بئے کے گھونسلے اور آدمی کے گھر میں کچھ فرق نہ ہوتا انسان کے تمام قومی اور معاشری ادارے اسی کے بنائے ہوئے رسوم و ضوابط کی بُنیادوں پر قائم ہیں۔ جس طرح سیاسی اور اخلاقی قوانین کی پیروی بقائے تمدن کے لئے لازمی ہے اسی طرح ادب و شاعری کی اصلاح و ترقی بھی علم معانی و بیان کے اُصول اور نحوی و عروضی قواعد کی پابندی سے مشروط ہے۔ ملکی و معاشری قوانین میں گاہ بگاہ تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ کوئی شارع یا واضع مقتضیات زمانہ کے مطابق اگر قدیم ضوابط منسوخ کرتا ہے تو ان سے بہتر قوانین وضع بھی کرتا ہے۔ اسی طرح ادب و شاعری میں بھی قدیم اُصول کی خلاف ورزی اُسی وقت جائز ہو سکتی ہے جب کہ اُن سے بہتر اُصول و ضوابط مُرتب کئے جا سکیں۔ لیکن بے آئینی و بے ضابطگی کسی حالت میں مناسب نہیں ہے۔ مغربی دُنیا میں تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ معمولی معمولی چیزیں بھی فن کی حیثیت اختیار کرتی جا رہی ہیں۔ یہانتک کہ ضیافتوں اور عصرانوں نے بھی آرٹ کی شکل اختیار کرلی ہے اور اُن کے لئے قواعد و ضوابط مُرتب کئے گئے ہیں۔ کھیل کُود، نشست و برخاست، لباس پوشاک، سیر تماشہ، ملاقات، بات، مزاج پُرسی، مبارک بادی، طعام و کلام، مجلس و انجمن کی شرکت۔ غرض کہ ہر چیز کے لئے آداب و مراسم اور اصول و قوانین مقرر ہیں۔ شاعری تو بہترین فن ہے۔ یہاں بے آئینی و بے قاعدگی کس طرح جائز ہو سکتی ہے۔ تمام قاعدے اور ضابطے انسان ہی کے بنائے ہوئے ہیں اس لئے کسی شے کو رسمی و مصنوعی کہکر اُس کا مضحکہ اُڑانا سخت نادانی ہے۔ ادب و شاعری میں قدیم اُصول و ضوابط اور رسوم و روایات نہ صرف قابلِ تقلید بلکہ قابلِ احترام بھی ہیں۔ جس شخص کے دل میں تہذیب و تمدن کی قدر ہوگی وہ ادبی تکلفات و تصنعات یا شاعرانہ صناعیوں و مرصع کاریوں کو بھی وقعت کی نگاہ سے دیکھے گا کیوں کہ تمدن کی ترقی ان کی تخلیق کا باعث ہوئی ہے۔ جب مغربی دنیا میں زندگی کے ہر شعبہ پر آئین و ضوابط کی حکومت ہے تو مغرب زدہ

حضرات کا ادبی معاملات میں اصول و قواعد سے انحراف بڑے تعجب کی بات ہے۔ جناب کیفی صاحب ایسے لوگوں سے حیرت کے لہجہ میں دریافت کرتے ہیں کہ:-

قاعدے سے یہ انحراف ہے کیوں	تم تو سب ضابطے کے ہو شیدا
ور دستور جاپ سے آئیں	دور قانون ہے تمہارا خدا
پھر ہو کیوں دشمنِ قواعدِ فن	شعر کے قاعدے سے بغض یہ کیا

جس طرح انگریزی شاعری میں "سانٹ" سب سے اعلیٰ و مکمل صنفِ سخن ہے اسی طرح اُردو شاعری میں غزل شاعرانہ حُسن کاریوں کا بہترین نمونہ ہے۔ صُوری و معنوی دونوں قسم کی خوبیوں کے لحاظ سے غزل کو دوسرے تمام اصنافِ سخن پر ترجیح حاصل ہے۔ انگریزی شعرا نے "سانٹ" کی آرائش و زیبائش میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا ہے، اسی طرح فارسی اور اُردو کے شاعروں نے عروسِ غزل کی جمال آرائی میں اپنے خونِ جگر کا غازہ صرف کر دیا ہے۔ غزل کی تکمیل کے لئے نہ صرف خیالات و جذبات کی لطافت بلکہ اسلوبِ بیان کی رنگینی و دلآویزی بھی لازمی شے ہے۔ یہاں ہر قسم کے تکلفات، تصنعات، رسمیات اور روایات کو برقرار رکھنے کی ضرورت ہے، قانون شکنی، ذاتی تصرف اور خود رائی غزل کی تخریب و ہلاکت کی موجب ہے۔ میدانِ غزل میں قدیم راستہ ہی نہایت محفوظ و پُرامن ہے۔ غزل کے الفاظ، تشبیہات، استعارات، تمثیلات سب مقرر و معیّن ہیں۔ ان میں خواہ مخواہ تغیر و تبدل کرنے سے کلام کی لطافت و دلکشی زائل ہو جاتی ہے۔ معاشری معاملات میں مصلحین کی انتھک کوششوں سے اصلاح و ترقی عمل میں آسکتی ہے لیکن مذہبی اُصول کو بدلنا اور نئی سُنّت قائم کرنا پیغمبروں کا کام ہے۔ غزل کی اصلاح و ترقی بھی پیمبرانِ سخن کا کام ہے جو مدت میں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ جب تک کسی کے دل پر خاص طور سے فیضانِ ربانی تجلّی ریز نہ ہو غزل میں وہ مفیدِ مطلب تبدیلی نہیں کر سکتا۔ بہرحال اُردو شاعری کی اصلاح و ترقی کے لئے وقتاً فوقتاً امامِ فن پیدا ہوتے رہے ہیں جن میں غالب کا درجہ سب سے بلند ہے۔ مرزا غالب کے عرش پرواز ہمائے فکر کے لئے غزل کی فضا کافی وسعت نہیں رکھتی تھی۔ اس لئے انہوں نے ایجاد و اختراع سے کام لیا۔ وہ خود فرماتے ہیں:-

بقدرِ شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے

خیالات جان ہیں اور الفاظ جسم۔ ہر جان اپنا جسم خود ہمراہ لاتی ہے۔ اُنہوں نے اپنے رفیع الشان خیالات کے لئے شاندار الفاظ خود تیار کئے۔ الفاظ سازی کے فن میں غالب کو اجتہادِ کامل کا درجہ حاصل تھا جو الفاظ مرزا غالب کے ایجاد کردہ ہیں وہ باوجود نئے ہونے کے لطافت و رنگینی اور عظمت و شوکت میں قدیم رسمی الفاظ کے نہ صرف ہم پلہ ہیں بلکہ بعض اعتبار سے ان پر فوقیت بھی رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر بجنوری نے غالب کے حسب ذیل ایجاد کردہ الفاظ بطور مشتے نمونہ از خروارے پیش کئے ہیں:-

دامِ تمکین، خمارِ رسوم، آتشِ خاموش، جوہرِ اندیشہ، گلبانگ تسلی، نبضِ خس، شبنستان، دریائے مے، پہلوئے اندیشہ، عرقِ نمکداں، خانۂ نازِ زلف، زنجیرِ رسوائی، جمع و خرچ دریا، موجِ نگاہ، تشنۂ فریاد، خلوتِ ناموس، صیدِ زدامِ جستہ، خودداری ساحل، شہپرِ رنگ، موجۂ گل، گذرگاہِ خیال، برگِ ادراک، طالعِ خاشاک، آئینۂ انتظار، خسِ جوہر، لذتِ سنگ، گردشِ رنگ، افسردۂ انگور، شہرِ آرزو، صحرا دستگاہ، دریا آشنا، محشرِ خیال، مژگانِ سوزن، مژگانِ تیمم، لنگرِ استغنا، سلکِ عافیت، معاشِ جنون، دامِ تمنا، دریائے بے تابی، وادیٔ خیال، سیاستِ دربان، نسیہ و نقدِ دو عالم، طلسمِ پیچ و تاب، طعنۂ نایافت، جنتِ نگاہ، فردوسِ گوش، کالبدِ دیوار، گلستانِ تسلی، چشمِ صحرا، شیرازۂ مژگاں، برخوردارِ بستر، رنگ و فروغ، دامانِ خیال، قلزمِ خوں، غبارِ وحشت، شرارِ جستہ، جیبِ خیال، دعوتِ مژگاں وغیرہ۔ ان الفاظ کی جدت اور خوشنمائی کی تعریف کے ضمن میں ڈاکٹر بجنوری میکائیل انجلو کی ہمنوائی کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "مجسمہ ساز بُت کو مرمر تراش کر نہیں بناتا بلکہ حقیقت میں بُت ابتدا ہی سے سنگِ سفید میں موجود اور جلوہ نمائی کا منتظر و متقاضی ہوتا ہے۔ یہی حالت مرزا کے خود ساختہ الفاظ کی ہے، وہ ساختہ نہیں بلکہ ورجل کی مثال آفریدہ ہیں" کیا ان الفاظ میں وہی شگفتگی، تر و تازگی، لطافت اور رنگینی نہیں پائی جاتی جو غزل کے قدیم رسمی الفاظ کا طرۂ امتیاز ہے؟۔

مرزا غالب کا اشتیاقِ تجدد مقررہ تشبیہات و استعارات کے دائرہ میں بھی محدود رہنا گوارا نہیں کرتا تھا اس لئے انہوں نے الفاظ میں نادر اور شستہ تصرفات کرنے کے علاوہ تشبیہات اور استعارات میں بھی عام پابندی سے گریز کیا ہے۔ مرزا غالب کا کارنامہ تخریبی نہیں بلکہ تعمیری ہے۔ وہ قدیم پابندیوں سے آزاد ہوتے ہیں لیکن اُن کی جگہ اپنی خود آفریدہ تشبیہات اور استعارات ایسے بے تکلف انداز سے استعمال کرتے ہیں کہ وہ ہزار بار کے سُنے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں اجنبیت و نامانوسیت مطلق نہیں پائی جاتی مرزا غالب کے ایجاد کردہ تشبیہات و استعارات کی چند مثالیں پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر بجنوری فرماتے ہیں کہ "مرزا کس خوبی سے موئے آتش دیدہ کو زنجیر سے، دانہ ہائے تسبیح کو صد دلِ عشاق سے۔ خانۂ مجنوں کو گردابِ بے دروازہ سے، بہار کو حنائے پائے خزاں سے، جوہرِ آئینہ کو طوطیٔ بسمل سے، حضرت یعقوب کی نابینا آنکھوں کو زندانِ یوسف کے روزنِ دیوار سے، دامِ موج کو حلقۂ صد کامِ نہنگ سے۔ تارِ اشکِ یاس کو رشتۂ چشمِ سوزن سے، ہر قطرۂ خونِ تن کو نگینِ نامِ معشوق سے، دریا کو زمین کے عرقِ انفعال سے۔ سرمہ کو دودِ شعلۂ آواز سے۔ نالہ کو گردشِ سیارہ کی صدا سے۔ صبحِ وطن کو خندۂ دنداں نما سے۔ موئے شیشہ کو دیدۂ ساغر کی مژگانی سے۔ آئینہ کو ورطہ سے، موجِ شراب کو مژۂ خوابناک سے۔ ساغر کو متاعِ دست گرداں سے۔ مماثل بیان کرتے ہیں" شیکسپیر کی طرح غالب نے بھی کہیں کہیں زبان کے مسلمہ اصول سے انحراف کیا ہے کیونکہ قواعد کا کام تحریر و تقریر میں فقط صحت پیدا کرنا ہے، کلام میں لطافت پیدا کرنا نہیں ہے۔ اسی طرح سر اقبال نے بھی بہت سے شگفتہ و معنی خیز ترکیبیں، لطیف و پاکیزہ تشبیہیں اور جدید و نادر استعارے ایجاد

کئے ہیں اور کہیں کہیں نحوی قواعد کی خلاف ورزی بھی کی ہے۔ لیکن یہ تمام باتیں شکسپیر، غالب اور سر اقبال جیسے ائمۂ فن ہی کو زیب دیتی ہیں۔ اس قسم کے ایجادات و تصرفات کی صلاحیت ہر کس و ناکس میں نہیں پائی جاتی۔ اُردو شاعری کے مصلحین کو رومانیوں کی طرح کلاسیت و قدامت کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے کی مطلق ضرورت نہیں ہے۔ یورپ میں کلاسیت اور رومانیت کی آویزش اس وسیع و عالمگیر جنگ کی محض ایک فرع تھی جو کلیسا اور قدامت پرست امرا کے جبر و تشدد کے خلاف مذہبی، اخلاقی اور ذہنی غلامی سے رہائی پانے کے لئے جاری کی گئی تھی۔ ہمارے ہاں اس قسم کی بغاوت و مخالفت کے قدرتی اسباب موجود نہیں ہیں۔ اس لئے اردو شاعری کی اصلاح و ترقی کی کوشش اصول ارتقا کے بموجب ہونی چاہیئے۔ یہاں یکایک تغیر و انقلاب ہلاکت بار ثابت ہوگا۔ اگر کسی شخص کو قدرت کی جانب سے ایجاد خیز طبیعت عطا ہوئی ہو تو اس کا فرض ہے کہ غالب اور اقبال کی طرح ایسی ہی چیزیں ایجاد کرے جو قدیم چیزوں سے ملتی جلتی ہوں اور سننے والوں کو اجنبی و نامانوس نہ معلوم ہوں لیکن ہر شخص کو اپنی جودت طبع دکھانے سے پیشتر اپنی قوت بازو کا اچھی طرح اندازہ کر لینا چاہیئے اور اصلاحی کمان کو اُسی وقت ہاتھ لگانا چاہیئے جب وہ اپنے اندر اس کے زہ کرنے کی طاقت پائے، ورنہ محض انگریزی کی اندھی تقلید میں یہی خصوصیات کا لحاظ کئے بغیر قدیم اصول و ضوابط کی خلاف ورزی اور فطری سادگی اور عوام کی بول چال میں اظہار خیال کی حمایت لائق سرزنش و درخور ملامت ہے۔ حریت و آزادی کے نام نہاد علمبرداروں کی مثال موج آب کی سی ہے۔ موج کی روانی کے لئے ندی کے بیچ میں جو راستہ مقرر ہے اس سے منحرف ہو کر وہ آزادی کے لئے ہاتھ پاؤں مارتی ہے، اچھلتی ہے، کودتی ہے، آخر پتھروں سے سر ٹکراتی ہے اور نالہ و شیون بلند کرتی ہے۔ متوسط درجے کے شعرا کو جو جدت طرازی کے شوق میں بے آئینی اختیار کرتے ہیں سر اقبال کا یہ شعر یاد رکھنا چاہیئے۔

دہر میں عیش دوام آئیں کی پابندی سے ہے
موج کو آزادیاں سامان شیون ہو گئیں

# انتخاب دیوان شمس تبریز

جناب عبدالملک صاحب روی نے پروفیسر نکلسن کے انتخاب دیوان شمس تبریز پر نہایت محققانہ مقالہ لکھا ہے اور اس ضمن میں تصوف صوفی شاعری اور شعرا اور دوسرے اہم مسائل پر جن کا تعلق تصوف سے ہے بڑی قابلیت سے بحث کی ہے۔ ان کے ماخذ زیادہ تر انگریزی اور فارسی تذکرے اور کتابیں ہیں، اس کتاب سے فاضل مرتب کی وسیع نظری اور تنقیدی قوت کا اظہار ہوتا ہے۔ آخر میں مولانا روم کے دیوان کا (جو دیوان شمس تبریز کے نام سے مشہور ہے۔) انتخاب دیا ہے۔ انتخاب تو صرف پچیس چھبیس صفحے پر ہے لیکن باقی تمام کتاب یعنی ۲۰۹ صفحات پر دوسری متعلقہ بحثیں ہیں جو محققانہ معلومات سے لبریز ہیں۔

ملنے کا پتہ:۔ ساقی بکڈپو دہلی

# سیاح عورت کا خط اپنے فوجی محب کے نام

از محترمہ مس حجاب اسمٰعیل

ایک گرم ایشیائی ساحل سے

۲ جون ۱۹۳۱ء

غیر شاعر ہارلی!!

خدا تمہیں ذوقِ سلیم عطا کرے!

بہار کا موسم شروع ہو گیا ہے۔ سرخ گلاب کے باغیچوں میں دن رات عاشق مزاج رنگیلے بھونرے بڑے جوش و خروش سے عشقیہ راگ گانے میں مشغول ہیں۔ اب تم بھی جلد آؤ، ہم دونوں مل کر ایسے ہی راگ چاندنی کی زرد روشنی میں ساحل کی سفید ریت پر بیٹھ کر گائیں ——!

میں سمندر کی اژدھا موجوں کو بندر گاہ عباس پر خدا حافظ کہکر من جوری پہونچ گئی ہوں، تاکہ بہار کے پرلطف اور زندگی بخش جھونکوں میں اطمینان اور نجات سے دن کاٹوں، اور خوبصورت موسم کے جگمگانے والے آسمانوں کے نیچے حسن تمہارے پاکیزہ حسن کی نظم گا سکوں، اور ساتھ ہی زندگی کے فلسفے پر غور کروں...... تم بھی فوراً اپنی تیز تلوار دوں، ریوالوروں کو خیرباد کہہ کر ایک جوشیلے خوبصورت بازوؤں والے نوجوان پرندکی طرح جو جنوب کی ہواؤں میں گاتا ہوا پرواز کرتا ہے، محبت کا شیریں نغمہ گاتے ہوئے میرے پاس پہونچ جاؤ۔

میں یہ خط سرخ گلاب کے باغیچے میں، نارنگی کے ایک شاداب درخت کے سایہ میں بیٹھی لکھ رہی ہوں میرے اطراف ایک روحانی موسیقی لہریں لے رہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے مبارک روحیں گلستانِ عمر خیام میں میری دلچسپی کے لئے شعر و نغمہ گا رہی ہوں!۔

میرے گرد سینکڑوں رنگین پھول مسکرا رہے ہیں۔ کاسنی اور بنفشی رنگ کے پھولوں پر بہار کے موسم کی تیکھی ایشیائی محبوب دھوپ ناچ رہی ہے۔ اور نیلے آسمانوں پر ایک گہرا استقلال برس رہا ہے۔ نیچر مسکرا رہی ہے، آہ کس قدر دلپذیر وقت ہے۔ میرے گلابی ہونٹ بھی مسکرانے کے متمنی ہیں۔ پر ایک خیال مجھے مغموم کر رہا ہے۔ ایک آرزو میرے دل میں چٹکیاں لے رہی ہے۔ وہ یہ —— ہائے ہارلی...... وہ یہ کہ کاش، ہارلی... ہارے ہارلی! کاش تم شاعر ہوتے! میرے جذبات کو پہچان سکتے، اور میری طرح خواب کو زندگی سمجھتے۔ تم ایک فلسفی کی طرح زندگی کو خواب سمجھنے کے عادی ہو۔ مگر تمہاری محبوبہ خواب کو زندگی سمجھتی ہے۔ وہ خوابوں کی دنیا میں مسکرانے والی عورت ہے، اور تم زندگی کو خواب سمجھ کر روئی صورت بنانے والے مرد ہو! یہ ہیں ہم دونوں۔

جب بہار کا سنہرا اور بڑا سا آفتاب ان عظیم الشان ایشیائی پہاڑوں پر چمک اُٹھتا ہے، تو تم اپنی بندوق لئے ہوئے وادیوں اور پہاڑوں میں غائب ہو جاتے ہو۔ جب کہ میں موسم کی دلفریبی سے متاثر ہو کر اُس وقت ایک پُرانے افسانوی دریچے کے آگے یا ہار سنگھار کی ایک شگفتہ ٹہنی کے سائے میں بیٹھی زندگی کے موضوع پر ایک نظم لکھنے میں مشغول ہو جاتی ہوں۔

اور جب ابتدائے موسم برشگال میں بلند پہاڑوں اور گرجتے ہوئے سمندروں پر گھنگور گھٹا اُٹھتی ہے، اور جب ایک سریلی راگنی ہمارے خوابوں کے جزیرے میں گونج اُٹھتی ہے، آسمان سے ایک روح پرور فرحت اور نیچر کی دلفریب رحمت برسنے لگتی ہے تو تم اُس وقت اپنے گھوڑے کے ساتھ ہرن یا جنگلی سور کی تلاش میں نکل پڑتے ہو اور ہوا کے کسی وحشی جھونکے کی طرح خبر نہیں کدھر نکل جاتے ہو کہ شام تک تمہارا پتہ نہیں لگ سکتا ہائے ـــــ جب کہ میں سمندر کی پُراسرار برساتی موجوں سے زندگی کے راز کو معلوم کرنے کی خواہش میں گھنٹوں بے تعداد سوال کرتی رہتی ہوں اور کسی تنہا گوشہ میں اپنا محبوب ستارلے کر بیٹھ جاتی ہوں یا اُکتا کر پیانو بجانے لگتی ہوں۔ بلند آسمان!! مقدس معبود!! اونچائی پر رہنے والے پیارے خدا!!! کس قدر فرق ہے ہم دونوں میں! آہ اس وقت بے اختیار ایک دعا میرے دل سے نکلتی ہے، کاش، تم شاعر ہوتے کیونکہ ؎

بے شک اسی میں لطف ہے دونوں ہوں بیقرار
دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی!

ہارلی! جس ہرن کو مار کر تم کباب بنا کر مزے میں کھاتے ہو۔ ہائے تمہاری شاعرہ اسی ہرن کی مظلوم آنکھوں میں حُسن اور زندگی کی روشنی کو ڈھونڈتی ہے۔

جس جنگل کی فضا میں تمہاری محبوب بندوق کی آواز تہلکہ مچا دیتی ہے اسی جنگل کی فلسفیانہ تنہائیوں میں تمہاری دل پسند سہیلی (؟) گھنٹوں چرواہوں کے سریلے گیت سننے کی خواہشمند ہے!

زندگی تمہاری نظروں میں جنگ و شکار، گرد و غبار ہے۔ اور میری نظروں میں خواب و نغمہ شعر و موسیقی!!۔ .....

کون سچا ہے؟
خدا تم کو ذوق سلیم عطا کرے!

---

# بد قسمت شاہجہاں!!

از جناب مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی بی اے ایل ایل بی علیگ

رات کے بارہ بجے تھے مگر رنج اور فکر کی وجہ سے شاہجہاں کو نیند نہ آتی تھی غیر معمولی طور پر دیوان خاص میں بادشاہ چند امرائے معتمد سمیت موجود تھا۔ یہ سب کے سب راجپوت سردار تھے۔ اورنگ زیب اور مراد کی فوجیں دکن سے بڑھتی چلی آرہی تھیں اور ان کو روکنا تھا۔ کون اس کام پر متعین ہو یہ سوال درپیش تہا۔ بادشاہ نے کئی نام نامزد سرداروں کے پیش کئے۔

"جہاں پناہ خلیل اللہ خاں بہتر اس موقعہ کے لئے کون ہو گا" ایک راجپوت سردار نے کہا۔

"مجھکو خلیل اللہ خاں اور اسکی فوج پر قطعی اعتماد نہیں۔ در اصل میں خالص راجپوتی لشکر چاہتا ہوں" شہزادہ داراشکوہ نے کہا۔

"خلیل اللہ خاں کا لشکر بھی ساتھ ہونا چاہیئے" جہاں پناہ نے فرمایا۔

"اگر ایک بھی سیدوں یا پٹھانوں یا مغلوں کا دستہ گیا تو قطعی سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ دشمن سے (اورنگ زیب اور مراد) سے مل جائیں گے۔ میری دانست میں مہاراجہ جسونت سنگہ کے راجپوت کافی ہونگے" داراشکوہ نے عرض کیا۔

"نہیں جو کچھ بھی فوج مہیا ہو سکے اسے جلد روانہ کرو۔ مہاراجہ جسونت سنگہ کو بھی بلاؤ" بادشاہ نے ارشاد کیا۔

(۱)

مہاراجہ جسونت سنگہ کی فوج تیار ہوئی جس میں بیشتر حصہ مسلمانوں کا تھا لیکن راجپوت بھی تھے۔ بادشاہ نے رخصتی کے وقت مہاراجہ جسونت سنگہ کو طلب کیا۔ ایک خلعت فاخرہ اور مرصع زر و جواہر کے دستہ کی تلوار دی اور تاکید کے ساتھ کہا کہ دیکھو دونوں شہزادے زندہ گرفتار ہوں۔ مہاراجہ جسونت سنگہ بادشاہ سے رخصت ہوئے کہ پھر بادشاہ نے طلب کیا۔ بادشاہ اسوقت تنہا تھے۔ سوائے داراشکوہ کے اور کوئی نہ تھا۔ فکر اور رنج کی وجہ سے چہرہ پر ضعف تہا۔ بادشاہ نے جسونت سنگہ سے کہا "جسونت سنگہ تم میرے قوت بازو ہو"۔

جوش عقیدت اور محبت کے جذبہ میں آکر راجپوت سپہ سالار نے بڑھکر مسند کو بوسہ دیا۔ بادشاہ نے ازراہ عنایت اپنا ہاتھ بڑھا دیا اور مہاراجہ نے بوسہ دیا۔ بادشاہ نے بجائے ہاتھ ہٹا لینے کے مہاراجہ کے کندھے پر رکھ دیا۔ مجبوراً مہاراجہ اسی حال میں سر جھکائے کھڑے رہے۔ بادشاہ نے پھر بھرائی ہوئی آواز میں کہا "جسونت سنگہ شہزادوں کا خاص خیال رکھنا"۔

"جہاں پناہ شہزادوں سے لڑنے میں تلوار سے کام نہیں لیا جاتا بلکہ ڈھال سے کام لیا جاتا ہے" مہاراجہ نے کہا۔

"مراد کی طبیعت میں وحشت ہے وہ فوج میں سب سے آگے ہوگا۔ وہ اپنی جان جوکھم میں ڈالدیگا لہذا اس کا خاص خیال رکھنا۔ سپاہیوں کو سمجھا دینا کہ زندہ پکڑ لیں"۔ یہ الفاظ شاہجہاں نے مہاراجہ کو بطور آخری ہدایت کے کہے۔

مہاراجہ بادشاہ سے رخصت ہو کر باہر نکلے کہ داراشکوہ نے مہاراجہ سے کہا "مراد احمق ہے لیکن تم کہیں یہ غلطی نہ کرنا کہ

ساتھی

خواہ مخواہ شکست کہا جاؤ۔" اتنے میں ایک خواجہ سرا آیا اور شہزادی صاحبہ کی طرف سے مہاراجہ جسونت سنگھ سے کہا کہ مراد کا خیال رکھنا اس کا بال بیکا نہ ہونے پائے۔" قلعے سے باہر نکلتے نکلتے شہزادی بلند اقبال کا دوسرا پیغام آیا کہ اگر کہیں مراد کا بال بیکا بھی ہو گیا تو بس یہ سمجھ لو کہ جہاں پناہ عمر بھر تمہارا منہ نہ دیکھیں گے۔"

مہاراجہ جسونت سنگھ اس مہم پر روانہ تو ہو گئے مگر انکی عقل کام نہ کرتی تھی۔ آدھی کے قریب فوج مسلمانوں کی تھی اور یہ جسونت سنگھ کو خوب اچھی طرح معلوم تھا کہ اگر کہیں اورنگ زیب کا ایک جاسوس بھی آ گیا تو وہ ساری فوج کو لمحہ بھر میں ملا لیگا۔ دوسرے وہ یہ سوچ رہے تھے کہ بھلا کس طرح لڑنا چاہیے کہ شہزادوں کا بال بیکا نہ ہونے پائے۔

## (۲)

مہاراجہ جسونت سنگھ نے شہزادوں کی فوج کو دریائے نربدا پر روکنے کی ٹھہرائی۔ جگہ جگہ دریا پر ناکہ بندی کر دی اور عبور کرنیکے مقامات پر پہرا لگا دیا۔ آخر کو وہ دن آیا کہ اورنگ زیب اور مراد کی فوجیں ملکر دریا کے اس کنارہ پر تھیں اور مہاراجہ جسونت سنگھ کا سرکاری لشکر اس طرف۔ مہاراجہ نے سب سے پہلے ایک راجپوت سردار کو شاہی خط دے کر اورنگ زیب کے پاس روانہ کیا۔ اورنگ زیب اور مراد خیمہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ سردار نے آکر سلام کیا۔ اور خط حوالہ کر کے مہاراجہ جسونت سنگھ کی طرف سے نصیحت کی کہ اپنی اپنی جگہ پر واپس چلے جائیں۔

اورنگ زیب نے خط کو ہاتھ میں لے کر سر پر رکھا پھر اسکو بوسہ دیکر آنکھوں سے لگایا تکیہ علیحدہ کر کے مودب بیٹھ کر خط کھولا اور پڑھ کر کہہ دیا۔

"یہ جعلسازی ہے جہاں پناہ کو دارا شکوہ نے قید کر رکھا ہے پھر اسکے قبضہ میں ہیں جو جی چاہا لکھکر مہر لگا دی۔"

"ہم خوب جانتے ہیں دارا شکوہ کو باپ کے قتل کرنے کی ہم سزا دیں گے" چمک کر مراد نے کہا۔

"صاحب عالم جہاں پناہ کو خدا ہمارے سر پر ہمیشہ سلامت رکھے" سردار نے کہا۔

"تم غلط کہتے ہو دارا شکوہ نے بھلا زندہ کیوں چھوڑا ہوگا۔ اگر ہونگے بھی تو قید ہونگے تم مہاراجہ سے کہدو ہم ہرگز نہیں رک سکتے ہم ابھی دریا عبور کرتے ہیں۔" مراد یہ کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور سردار جو خط لایا تھا مہاراجہ کے پاس بے نیل و مرام واپس گیا۔

اورنگ زیب کی رائے تھی کہ کسی دوسری جگہ سے دریا کو عبور کرنیکی کوشش کیجائے تاکہ اتلاف جان زیادہ نہ ہو۔ مگر بھلا مراد کا ہیکو سنتا تھا۔ سب سے پہلے اس نے اپنا ہاتھی دریا میں ریل دیا اور ہودہ میں سے فوج کو پکار پکار کر بلا رہا تھا۔ مراد کا حملہ تاریخ ہند میں یادگار رہیگا خود سب سے آگے تھا اور تیر و تفنگ کا نشانہ بنا ہوا تھا مراد کی فوج پانی میں تھی اور بری طرح اس پر بھاری پڑ رہی تھی۔ مگر جسکا کمانڈر ایسا باہمت ہو وہ فوج بھلا رک سکتی ہے۔ مہاراجہ جسونت سنگھ حیران و پریشان دوڑ رہے تھے اور جگہ جگہ تاکید کرا دی تھی کہ شہزادہ کے ہاتھی کا خیال رہے۔ مگر بھلا سپاہی کا ہیکو مانتے تھے۔ سینکڑوں تیر مراد کے ہاتھی کے اوپر آ رہے تھے۔ ایک مختصر مگر نہایت ہی سرعت کے ساتھ خونی جنگ ہوئی۔ مراد کے ساتھ ساتھ اورنگ زیب کی فوج اور وہ خود آ گیا۔ مراد نے خود ہاتھی کو جگہ جگہ ریل دیا اور تھوڑی ہی دیر میں مہاراجہ جسونت سنگھ نے دیکھا کہ سوائے راجپوتوں کے

**بقیہ فوج بھاگ** رہی ہے تھوڑی دیر تک تو راجپوت پامردی سے جمے رہے کہ مہاراجہ نے دیکھا اب رکنا فضول ہے اور میدان چھوڑ دیا۔

یہ وہ پہلی شکست تھی جو مہاراجہ جسونت سنگھ کو نصیب ہوئی۔ وہ سیدھے اپنے وطن جودھپور پہونچے مگر راٹھوڑی رانی نے قلعہ کے پھاٹک بند کرا دئے۔ اور کھولنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں ایسے خاوند کا منہ نہیں دیکھنا چاہتی جو بجائے میدان جنگ میں جان دینے کے شکست کھا کر زندہ لوٹ آئے۔ رانی کو کیا معلوم کہ مہاراجہ کو کن معاملات کا سامنا کرنا پڑا تھا

(۳)

نربدا کو عبور کر کے اور شاہی فوج کو شکست دیکر شہزادوں کی ہمت بڑھ گئی وہ چاہتے تھے کہ جس قدر بھی جلد ہو سکے آگرہ پہنچکر آخری جنگ بھی فتح کر لیں کیونکہ ان کو اندیشہ تھا کہ کہیں وہ فوج نہ واپس آجائے جو بنگالہ کی طرف سپہر شکوہ کی سرکردگی میں شجاع کی سرکوبی کے لئے گئی ہے۔ بھاگا بھاگ اور مارا مار کوچ کرتے ہوئے دونوں شہزادے اپنی فوجوں کو لیکر آگرہ کے نواح میں پہونچ گئے۔ لیکن اُنہوں نے اب دریائے چمبل کو ناقابل عبور پایا کیونکہ جگہ جگہ استحکامات ہو رہے تھے۔

شاہجہاں کی حالت کا اندازہ کرنا دشوار ہے۔ مہاراجہ جسونت سنگھ کے لشکر کی شکست نے کمر توڑ دی۔ مگر پھر بھی ہمت کر کے دارا شکوہ کو افواج اکٹھا کرنیکا حکم دیا۔ دارا شکوہ دن رات فوج کو ترتیب دے دیکر جگہ جگہ تعینات کر رہا تھا۔ دریا کے کنارے کنارے ہزاروں توپیں لگی تھیں اور لاتعداد فوج پڑی تھی کہ اسی گرما گرمی میں خبر آئی کہ اٹاوہ کے قریب اودی گھاٹ کے قریب شہزادوں کی فوجیں کسی نہ کسی طرح دریا پار کر کے آگرہ کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ دارا شکوہ نے جب یہ خبر سنی تو ہونٹ چبا ڈالے اسکی ہر تدبیر اُلٹی پڑ رہی تھی۔ وہ کھلم کھلا مسلمان سرداروں کی دغابازی پر لعنت و ملامت کرتا تھا اور وہ اسکو ہر جگہ چرکہ دیتے تھے اسکو دراصل معلوم ہی نہ تھا کہ یہ حرکت ناعاقبت اندیشانہ ہے۔ کیونکہ شدہ شدہ تمام مسلمان امرا کے کان تک یہ خبر پہنچ چکی تھی مگر دارا شکوہ ابھی مجبور تھا کیونکہ اسکو ہر جگہ دھوکا کھانا پڑتا تھا اور اسی وجہ سے وہ صرف راجپوتوں پر بھروسہ کرتا تھا اور اب اس نے وہ زبردست راجپوتی لشکر تیار کیا کہ جسنے اورنگ زیب اور مراد کے دانت کھٹے کر دئے۔

اورنگ زیب اور مراد اپنی فوج کو بچاتے ہوئے گھما کر دھولپور والے میدان کی طرف لے آئے۔ دارا شکوہ نے شاہی لشکر جو ہر طرح شہزادوں سے بہتر تھا۔ اُس طرف روانہ کیا۔

شاہجہاں کی قسمت گردش میں تھی اس نے بھائیوں بھائیوں میں خونریزی کو روکنے کی آخری کوشش کی اور وہ اس طرح دارا شکوہ اور اورنگ زیب کی فوجوں کے درمیان جا کر اپنے خیمے نصب کرا دئے دونوں میں سے کسی کی ہمت نہ تھی کہ باپ جو بچاؤ کر رہا تھا اسکے اوپر حملہ کریں بڑی طول طویل خط و کتابت ہوئی مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا اورنگ زیب باپ کے سامنے آتا ڈرتا تھا۔ شاہجہاں بیٹوں کے پاس نہ جا سکتا تھا۔ دارا شکوہ کے اشارے پر شاہجہاں کام کر رہا تھا اور ایک اشارہ میں شاہجہاں میں چلا گیا۔ شہزادوں کی فوجیں آگرہ کے اُس مشہور میدان پر تھیں جو آگرہ سے قریب بیس میل کے فاصلہ پر ہے اور جو جی۔ آئی ریلوے کے اسٹیشن جاجو سے شروع ہو جاتا ہے۔ اور اسی مقام پر دارا شکوہ نے اپنی فوجیں ملا دیں۔

(۴)

اب ہندوستان کی وہ فیصلہ کن جنگ شروع ہوئی جو ساموگڑھ کی جنگ کے نام سے مشہور ہے۔ اورنگ زیب اپنے دکھنی سواروں کے بھروسہ پر تھا اور ادھر داراشکوہ کو اپنی راجپوت پیدل فوج پر پورا بھروسہ تھا۔ راجپوتانے کے بڑے بڑے سردار اور مشہور ٹھکانہ دار اپنے اپنے دستے لے کر آئے تھے اور داراشکوہ کی حمایت میں انہوں نے اس جنگ کو قوس رنگ میں رنگ دیا تھا۔ کیسریا بانا پہن کر راجپوت آج مرنے اور مارنے پر تیار ہو کر آئے تھے۔ فوج کا کمانڈر خود داراشکوہ ایک کوہ پیکر ہاتھی پر سوار تھا۔ گرمی کا زمانہ تھا اور اس دن گرمی کی شدت گویا گرمی کا بہترین نمونہ پیش کر رہی تھی۔ جنگ اول ہی وقت شروع ہو گئی اور دوپہر کے وقت سورج کی تپش اور لوہ میں اس قدر شدت تھی کہ میدان میں ریت کے بگولے اڑ رہے تھے اور سوار سے سوار اور پیدل سے پیدل گتھم گتھا کشت و خون میں مصروف تھا۔ دن کے شباب کے ساتھ ساتھ جنگ کا بھی شباب تھا اور وہ کشت و خون ہوا کہ الاماں۔ داراشکوہ کے راجپوت معرکہ کی جنگ لڑ رہے تھے اور اورنگ زیب کا مشہور دکھنی رسالہ بار بار اپنے جانبازانہ حملوں میں ناکام ہو کر لوٹ لوٹ پڑتا تھا۔ اورنگ زیب دیکھ رہا تھا کہ اسکا بدمقابل بھائی داراشکوہ اپنے کوہ پیکر ہاتھی کو ہر موقعہ پر ریل دیتا تھا اور آواز دے دیکر سپاہیوں کو جوش دلا کر لڑا رہا تھا اور اورنگ زیب یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ داراشکوہ کے راجپوت چٹان کی طرح ڈٹے ہوئے ہیں اور یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ اسکا رسالہ بددل ہو رہا ہے اور یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ اب تھوڑی دیر اگر یہی عالم رہا تو اس کو شکست ہو جائیگی۔ بہرہ رہ کر خلیل اللہ خاں کے دستہ پر نظر ڈالتا تھا اور ہر دم اسے یہی امید تھی کہ اب خلیل اللہ خاں اس سے آملیگا مگر یہ ہی معلوم تھا کہ خلیل اللہ ابن الوقت ہے وہ ہارتے کا ساتھ نہ دیگا اور یہی وجہ تھی کہ خلیل اللہ کی ساری کی ساری فوج گویا جنگ سے الگ تھلگ تماشہ دیکھ رہی تھی۔ اسکی فوج لڑ رہی تھی مگر دلچسپی نہ لیتی تھی وہ دل سے چاہتا تھا کہ اورنگ زیب سے جا ملے۔ مگر ہارے ہوئے اورنگ زیب سے فتحمند داراشکوہ پھر بھی اچھا تھا اب چونکہ لڑائی کا رنگ بدل رہا تھا لہذا وہ اورنگ زیب کا ساتھ کیسے دیتا۔

راجپوتوں نے اس مستقل مزاجی سے جنگ کی کہ اورنگ زیب کے مشہور دکھنی رسالہ کا نظام آخر کو توڑ ہی دیا۔ ایک نعرہ مار کر راجپوتوں نے آخری حملہ کیا اور اورنگ زیب کے دکھنی سپاہی دُم دبا کر بھاگے۔ مراد جو آج شیر غژاں کی طرح لڑ رہا تھا فوج کا یہ حال دیکھ کر غضبناک ہو گیا اسے اپنے مہاوت کو گالی دیکر کہا کہ میرے ہاتھی کو راجپوتوں کے دل میں لیچل۔ دیکھتے دیکھتے اس نے اپنا ہاتھی راجپوتوں کے خطرناک دل میں گھسیڑ دیا۔ ساتھ کی فوج کو راجپوتوں نے کاٹ کر رکھدیا اور گویا مراد چاروں طرف سے راجپوتوں میں گھر گیا مگر پھر بھی اسکی فوج اس سے ملنے کی کوشش کر رہی تھی اورنگ زیب نے چھوٹے بھائی مراد کو تو اس نرغہ میں پھنسا ہوا پایا اور دوسری طرف اپنی فوج کو بھاگتا ہوا پایا وہ پکار پکار کر کہہ رہا تھا "دل یارانہ۔ دل یارانہ۔ خدا ہے خدا ہے۔ اے میرے ساتھیوں تم کہاں جاتے ہو۔ دکن بہت دور ہے" مگر اسکی آواز کون سنتا تھا۔ راجپوتوں کا نرغہ بڑھتا جاتا تھا اور اسکے ساتھی اسکو بھاگنے کی صلاح دے رہے تھے۔ اب اس نے دیکھا کہ ایک لمبی سی خندق اسکے اور داراشکوہ کے درمیان ہے؟ اور اس خندق کو پھلانگ کر راجپوت آیا ہی چاہتے ہیں۔ اس نے نہایت ہی غضبناک ہو کر اپنے ساتھیوں سے بھاگنے سے انکار کیا اور حکم دیا کہ میرے ہاتھی کے پیروں میں زنجیریں ڈال دو تاکہ میں اگر بھاگنے کا حکم بھی دوں تب بھی بھاگنا ناممکن ہو۔ اور ہر نظر

اٹھاکر مراد کی طرف دیکھا تو اسکو اس جنگ میں مشغول پایا جسکی وجہ سے مورخوں نے لکھا ہے کہ شہزادہ مراد میدان جنگ میں اپنے دشمنوں کیلئے وبال جان تھا اور یہی اس نوجوان شہزادہ کی بہترین تعریف ہے۔ مراد کا مہاوت مارا جاچکا تھا اور اسکے ارد گرد ایک منہ زور سمندر راجپوتوں کا لہریں مار رہا تھا کیونکہ وہ کیسری بانا پہنے اسوقت بھنگ کے نشہ میں چور ہوکر لیا رہے تھے کہ ان کو اپنے تن بدن کا ہوش نہ تھا۔ رہ رہ کر دارا شکوہ کا نعرہ بلند کرتے تھے۔ ادھر مراد کا عجیب حال تھا اس کا ہودہ تیروں ٹک کر سیہی کی پشت کی طرح ہوگیا تھا اصل اتنے تیر اس میں آکر لگے تھے اور چبھے کہ بھکے رہ گئے تھے کہ اب جگہ تک نہ تھی نشوں سے مراد بالکل چور چور ہو رہا تھا اور اسکا سارا شاہی لباس خون میں تر تھا۔ اسکا چھوٹا بچہ اسکے ساتھ ہودہ میں تھا جسکی عمر مشکل سے چار برس یا پانچ برس کی تھی اور اس جنگ کو ایسے دیکھ رہا تھا جیسے آجکل کے بچے اپنے باپ کے ساتھ کسی چھت پر بیٹھ کر محرم کا جلوس دیکھتے ہیں۔ وہ گھٹنوں کے بل کھڑا زخموں سے چور جھوم رہا تھا اپنے بچہ کو دشمن کے حربوں سے بچانے کیلئے اپنی ڈھال سے چھپا دیا تھا کیونکہ اب نرغہ بڑھتا جاتا تھا۔ اتنے میں اس دار و گیر میں راجہ رام سنگھ راٹھور جست کرکے ہاتھی پر حملہ آور ہوا اور اس نے مراد کو ڈپٹ کر کہا کہ "تو نالائق دارا شکوہ سے تخت کیلئے لڑتا ہے"۔ یہ کہہ کر مراد کے ہودہ کی رسی کاٹ دی مگر مراد نے راجہ کو دمیں تیر سے ہلاک کر دیا۔ راجہ کا مرنا تھا کہ راجپوت پاگل ہوکر ہاتھی کے اوپر امنڈ آئے۔

(۵۱)

ایسے نازک وقت پر دارا شکوہ نے وہ غلطی کی جسکی وجہ سے اسکے راجپوتوں کی جانبازی سب اکارت گئی۔ اور فتح کے بدلے شکست ہوئی اور تخت کی بجائے تختہ ملا کہا جاتا ہے کہ خلیل اللہ خاں نے دارا شکوہ سے کہا کہ آپکے ہودہ پر دشمن کے گولے سیدھے آرہے ہیں اور جنگ تو ختم ہو چکی اب گھوڑے پر سوار ہوکر فوج کو ہزیمت خوردہ غنیم کے تعاقب کا حکم دیجئے۔ یہ واقعہ تھا کہ فوج تو شہزادہ کی منتشر ہو چکی تھی اور صرف شہزادہ ہی جان پر کھیل کر لڑے ہوئے تھے۔ اورنگ زیب نے دارا شکوہ کا ہودہ خالی دیکھا ایک کامیابی کی لہر شکست خوردہ فوج میں دوڑ گئی۔ دارا شکوہ مارا گیا۔ دارا شکوہ مارا گیا سب کی زبان پر دوڑ گیا۔ بھاگتی فوج نے مڑ کر دارا شکوہ کا ہاتھی خالی دیکھا اور اورنگ زیب کے ہاتھی کے پیروں میں زنجیریں دیکھیں۔ اور مراد کو جو دیکھا لڑتے پایا فوج کی فوج لوٹ پڑی۔ ادھر دارا شکوہ کی فوج نے یاس و حراس کے ساتھ اپنے مالک کا ہودہ خالی پایا۔ فوج کا دل چھوٹ گیا ہمت ٹوٹ گئی اور ایک غل ہوا کہ دارا شکوہ مارا گیا۔ فوج کسکے لئے لڑتی ادھر اورنگ زیب کے سپاہی اس بلا اور کر و فر سے ٹوٹ پڑے جو الم زدی سے حملہ کرکے مراد کو راجپوتوں کے نرغہ سے چھڑایا۔ چشم زدن میں جنگ کا رنگ پلٹ گیا اور دیکھتے دیکھتے دارا شکوہ کی فوج بھاگ کھڑی ہوئی۔ دارا شکوہ نے ہر جگہ گھوڑا دوڑایا مگر بیکار شکست کھا کر بدحواس آگرہ پہونچا۔

شاہجہاں نے دارا شکوہ کو طلب کیا مگر اسنے یہ کہلا بھیجا کہ میں اب منہ دکھلانے قابل نہیں۔ مغرب کا وقت گذر چکا تھا اور رات آرہی تھی۔ دارا شکوہ پنجاب کی طرف بھاگنا چاہتا تھا۔ شاہجہاں نے شاہی اصطبل کے گھوڑے دلوائے اور شاہی رتھ دلوائے اور خزانہ کو دارا شکوہ کے سپرد کیا۔ دارا شکوہ خزانہ لے کر معہ چند رفیقوں کے پنجاب کی طرف بھاگا دوسرے روز اورنگ زیب نے قلعہ کی طرف توجہ مبذول کی اور اسکو محاصرہ میں لے لیا۔ باپ نے بیٹے کو عالمگیر کا خطاب عنایت

کیا اور ایک مرصع تلوار عنایت کی۔ باپ اور بیٹے میں نامہ و پیام ہونے لگے۔ بیٹے کے خطوط میں ہوتا تھا کہ آپکی قدمبوسی کا اشتیاق ہے اور ادہر باپ کے خطوں میں ہوتا تھا کہ تم نور نظر ہو اور تمہیں دیکھنے کو آنکھیں ترستی ہیں۔ خدا کی شان ہے کہ بادشاہی بھی کیا چیز ہے۔ نہ باپ کو بیٹے کا اعتبار تھا اور نہ بیٹے کو باپ کا۔ باپ کی نیت تھی کہ بیٹا قلعہ میں آجائے تو قبضہ میں کروں اور اورنگزیب قلعہ میں باپ کی قدمبوسی کے لئے جانیکو تیار ہی ہو گیا اور دراصل سب معاملہ رفع دفع ہو گیا ہوتا مگر بدقسمتی سے شاہجہاں کے صلاح کار باپ بیٹوں میں صلح نہ چاہتے تھے۔ یہاں قلعہ میں یہ انتظام کیا گیا کہ جونہی اورنگزیب قلعہ میں داخل ہو مسلح قلماقنیاں یعنی حبشنیں اسکو حملہ کرکے گرفتار یا قتل کر دیں۔ اورنگزیب نے جو یہ سنا تو ارادہ ملتوی کر دیا۔ عذر کرکے بجائے اپنے اپنے بیٹے شہزادہ معظم کو بھیجدیا جسنے قلعہ میں پہنچکر دادا کی قدمبوسی کے ساتھ ساتھ قلعہ کو گویا قیدخانہ میں تبدیل کر دیا۔ یعنی سب پہرہ اپنے ہاتھ میں لے کر قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح شاہجہاں کی بادشاہت ختم ہوئی اور وہ بادشاہ سے قیدی ہو گیا۔

(۶)

بعد کے حالات سبکو معلوم ہی ہیں۔ اسی قید کی حالت میں اپنے سب سے پیارے بیٹے دارا شکوہ کی شکست و قید کی خبر سنی۔ دارا شکوہ جسوقت ایک مریل سے ہاتھی پر قیدیوں کی طرح بٹھا کر شہر میں سے تشہیر کے لئے نکالا گیا۔ تو خلقت پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ خلیل اللہ خاں اکڑا ہوا دارا شکوہ کی نگرانی کر رہا تھا اور لوگوں نے اس پر اینٹوں سے حملہ کیا! ایسے ہردلعزیز شہزادہ کو بھلا کس طرح اورنگزیب زندہ چھوڑتا۔

مذہب کی شینری کو حرکت دیگئی اور فقہا نے فتویٰ دیا کہ دارا شکوہ قتل کیا جائے۔

وہ دارا شکوہ جو تخت طاؤس کے داہنی طرف بیٹھتا تھا اور جو ولیعہد تھا ایک معمولی سے مکان میں مقید ہے۔ اپنا کھانا اپنے بچوں کے ساتھ خود پکاتا تھا کہ کہیں زہر نہ دیدیا جائے۔ ایک پتیلی میں مسور کی دال چڑھائی تھی اور چولہے کی طرف متوجہ تھا کہ کھٹکا ہوا۔ بیٹوں سے پریشان ہو کر کہا "وہ آ گئے"۔ دراصل قاتل آ پہونچے تھے۔ ہمت کرکے اٹھا کیونکہ دارا شکوہ بزدل نہ تھا۔ دشمن کے چار آدمی تھے اور مسلح تھے اور یہاں دارا شکوہ کے پاس سوائے تکیوں یا ترکاری کاٹنے کے چاقو کے اور کچھ نہ تھا۔ اس نے تکیہ لیکر اسکی ڈھال بنائی اور بامردی سے چاقو سے حملہ کیا مگر چشم زدن میں اسکو موذیوں نے زمین پر گرا لیا اور اسکو ذبح کر ڈالا۔ بچے سہمے ہوئے اپنے باپ کا سر کٹتا دیکھ رہے تھے۔

جسوقت سر اورنگزیب کے سامنے لایا گیا تو اس نے کہا کہ اسپر پانی ڈالو تاکہ خون دہلجائے اور میں پہچانوں کہ کس کا سر ہے۔ اسنے دیکھا کہ واقعی دارا شکوہ کا سر ہے۔ وہ دارا شکوہ جسنے ایک ہی ماں کے پیٹ میں پیر پھیلائے تھے اور ایک ہی ماں کا اورنگزیب کے ساتھ دودھ پیا تھا۔ ممتاز محل کا قبر میں کیا حال ہوگا۔ یہی حشر اس جری شہزادہ مراد کا ہوا جسنے ساموگڈھ کے میدان میں تنہا ہمت و جرأت کے وہ جوہر دکھائے تھے کہ اورنگزیب اپنی بہادری کا حوالہ یہ کہہ کر دیتا تھا کہ میں مراد کا سگا بھائی ہوں۔ وہ ہودہ جسپر بیٹھکر مراد لڑا تھا اور جسمیں اتنے تیر آکر لگے تھے کہ خارپشت ہو رہا تھا بطور یادگار عرصہ تک قلعہ میں رکھا رہا اور روایت ہے کہ ایک شہزادی نے کسی وقت میں باغیوں کو یہ ہودہ دکھا کر کہا کہ جانتے ہو میں اسکی اولاد میں سے ہوں جسکا یہ ہودہ ہے اور اس طرح باغیوں کو

# جاپان کا خط

(مرسلہ محترمہ نور جہاں بیگم صاحبہ)

کمری تسلیم برادرم جناب نورالحسن صاحب برلاس پروفیسر ٹوکیو یونیورسٹی نے جاپان پہونچکر ایک مفصل خط بھیجا جو دلچسپ ہونے کے علاوہ مفید معلومات کا بھی متحمل ہے۔ میں اسے ساقی میں بغرض اشاعت بھیجتی ہوں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو شائع فرمادیں +

---

ہمشیر عزیزہ

السلام علیکم۔ ہمیں یہاں آئے ہوئے ڈیڑھ مہینہ ہوگیا۔ اور دہلی سے چلے ہوئے سوا دو مہینے۔ ہندوستان میں ریل کا طویل سفر ہماری توقع کے خلاف بہت آرام سے کٹا۔ کولمبو میں ایک روز آرام کرکے جہاز میں بیٹھے۔ جہاز میں دو ایک دن آرام سے گذرے، پھر مسز برلاس کی طبیعت خراب ہوگئی۔ ان کے بعد قیصر کی طبیعت بگڑی اور ہانکانگ تک بگڑی رہی بلکہ سنگاپور سے ہانکانگ تک کا سفر بہت تکلیف سے کٹا۔ ان دونوں نے تو تین چار روز کچھ نہیں کھایا ہانکانگ کے قریب دو ایک روز میری طبیعت بھی خراب رہی۔ ہانکانگ کے بعد سمندر میں مقابلتاً سکون رہا اور سب کی حالت اچھی رہی۔

جہاز میں مسز برلاس اور قیصر کو کھانے کی بہت تکلیف رہی۔ ان دونوں سے ابلا ہوا بساندہ کھانا نہیں کھایا جاتا۔ اتفاق سے ہمارے جہاز پر چار پنجابی ہندو سفر کررہے تھے۔ سنگاپور پر ان سے ملاقات ہوئی یہ لوگ اپنے ہمراہ کھانے کا سامان لائے تھے اور خود پکاتے تھے۔ اُنہوں نے ہمکو بھی پکا کر کھلایا۔ پھر تو ہم جہاز سے کچھ کچا سامان لینے لگے۔ یہ ان لوگوں سے پکواتے تھے اور ان کو بھی حصہ دیدیتے تھے اسکے علاوہ کچھ تیار کھانا جہاز سے لیتے تھے جو اکثر ان ہندوؤں کو بھیج دیتے تھے۔ مسز برلاس اور قیصر نے تو کئی روز صرف آئس کریم اور پھلوں پر گذارے ہیں۔ ان کے کیک اور پڈنگ وغیرہ بھی ہمارے ہندو دوستوں کے حصہ میں آتے تھے۔

ہانکانگ سے ایک مسلمان محمد شفیع نامی دہلی کے رہنے والے سوار ہوئے۔ یہ شانگھائے پر اتر پڑے۔ اُنہوں نے ہندوستانی کھانے کی دعوت کی اور شانگھائے کی سیر کرائی۔ ہمیں وہاں پہلی مرتبہ نہایت خوبصورت اور شاندار روشنی دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ کئی بڑے بڑے لمبے بازار رنگ برنگ کی روشنی سے جگمگا رہے تھے۔ ہمیں ایک چینی رئیس کا جنازہ دیکھنے میں آیا ہمارے ہاں کسی رئیس کی شادی میں بھی اتنی دھوم دھام نہیں ہوتی جو اس جنازہ میں تھی۔ سُنا ہے یہاں عام طور سے جنازہ کو بڑی دھوم سے اُٹھاتے ہیں۔

جزائر جاپان میں داخل ہونے پر بڑے دلکش مناظر پیش نظر تھے۔ کوبے تک ایک روز جاپان کے (INLAND Sea) میں جہاز چلتا ہے۔ ایک لمحہ کیلئے ڈک پر سے ہٹنے کو دل نہیں چاہتا۔ یہ سمندر بجا طور پر دُنیا کا خوبصورت ترین سمندر کہلاتا ہے۔ کوبے پر

جہاز سے اترے۔ میرے اسسٹنٹ ہمیں اتروانے کے لئے کوبے پہنچ گئے تھے۔ چند گھنٹے ہوٹل میں قیام کرکے رات کو ریل میں سوار ہوئے۔ اور صبح کو دس بجے ٹوکیو پہنچ گئے۔ یہاں چند روز تک ہوٹل میں قیام کیا پھر مکان تلاش کرکے وہاں منتقل ہو گئے۔

ٹوکیو کا شہر نہایت وسیع ہے۔ میری یونیورسٹی وسط شہر میں شہنشاہ کے محل کے بالمقابل ہے اور مکان یونیورسٹی سے دس میل کے فاصلہ پر ہے پھر بھی نہایت آبادی میں ہے پہلا مکان بھی اسی قدر دور تھا۔ وسط شہر میں رہائشی مکان نہیں ملتے اور آس پاس مکان ملتے ہیں تو انکے واسطے گزارہ نہیں ہوتا۔ مجھے یونیورسٹی پہنچنے میں ایک گھنٹہ لگتا ہے قیصر کو ٹوکیو کے امریکن کالج میں داخل کیا ہے۔ کالج صبح کے ساڑھے آٹھ بجے کھل جاتا ہے پہلا مکان یوکوہامہ سے اس قدر دور تھا کہ قیصر کو ۶ بجے گھر سے روانہ ہونا پڑتا تھا۔ اسی بات کے خیال سے بدل کر یہ مکان لیا ہے اب اسکو کالج پہنچنے میں ایک گھنٹہ لگتا ہے۔ ہم دونوں ریل سے سفر کرتے ہیں۔ اور کچھ فاصلہ ٹرام پر طے کرتے ہیں۔ ریل اور ٹرام کا ایسا معقول انتظام ہے کہ کسی اسٹیشن پر چار پانچ منٹ سے زیادہ انتظار کرنا نہیں پڑتا۔ پھر بھی آدمیوں کی آمد و رفت اس قدر ہے کہ اکثر اوقات نصف سے زیادہ آدمی گاڑی میں کھڑے رہتے ہیں۔

یہاں عموماً مکان لکڑی کے ہوتے ہیں اتنا تو ہم ہندوستان میں بھی جانتے تھے۔ مگر دیکھے بغیر اندازہ نہیں ہو سکتا مکان کیا ہیں گڑیوں کے گھر ہیں۔ صرف ۔ بامیت میں گڑیا کے گھر سے ایک ہزار یا پانچ ہزار گنے بڑے ہوتے ہیں۔ نزاکت وہی گڑیا کے گھر کی سی۔ سارا مکان لکڑی شیشے اور کاغذ کا ہوتا ہے کہیں کہیں پختہ دیوار بھی ہوتی ہے جو صرف دو انچ موٹی ہوتی ہے۔ شیشے اور کاغذ کا کام ایسا نازک (اور خوبصورت بھی) ہوتا ہے کہ ڈر لگتا ہے کہیں کہنی سے دیوار نہ ٹوٹ جائے۔ مکان بنگلہ نما ہوتا ہے شیشہ اور کاغذ کی تمام دیواریں الگ ہو سکتی ہیں۔ پٹ نکال کر رکھ دیجئے مکان کی بارہ دری بنگئی۔ دو کمروں کی درمیانی دیوار نکال دیجئے ہال بن گیا۔ مکان کو دھوپ دینے کیلئے یہی کرتے ہیں کہ باہر کے پٹ ایک طرف کو سرکا دیتے ہیں یا نکال کر رکھ دیتے ہیں۔ سونے کے کمروں میں دوہری دیوار ہوتی ہے۔ باہر لکڑی کے پٹ ہوتے ہیں اور اندر شیشہ کے لکڑی کے پٹ دن کو خانہ کے اندر سرکا دئے جاتے ہیں۔ متوسط درجہ کے مکانوں میں سب سے بڑا کمرہ ۴ گز بر ۳ گز کا ہوتا ہے۔ ہمارے مکان میں اتفاق سے ایسے دو کمرے ہیں اور سب سے بڑا کمرہ ۴ گز مربع ہے۔

لکڑی کے مکان زلزلوں سے بہت محفوظ ہوتے ہیں۔ اینٹ پتھر کے مکان ہوتے تو روز دیواریں پھٹتیں اور چھتیں گرتیں۔ یہ مکان تھوڑا سا جھول لیتے ہیں اور اپنی جگہ پر قائم رہتے ہیں۔ ابھی حال میں باد و باراں کا طوفان آیا تھا۔ طوفان غیر معمولی طور سے شدید تھا۔ ہوا کی رفتار ستر میل فی گھنٹہ ہو گئی تھی۔ پندرہ بیس برس سے ایسا طوفان نہیں آیا تھا۔ ہمارا مکان رات بھر جھولا کیا۔ بستر پر لاس تو ایسی پریشان ہوئیں کہ اوپر سے بچھونا اٹھوا کر نیچے کی منزل میں یا مد جیانہ میں آ لیٹیں کہ مکان گرے تو دروازہ کھول کر باہر بھاگ جائیں۔ مگر مکان ویسا ہی کھڑا رہا صرف پختہ دیوار جھولنے لگی۔ اور پانی ٹپکنے لگا۔ اس طوفان سے ٹوکیو کے دیہات میں البتہ سینکڑوں مکان گرے اور کئی جگہ آگ لگی جس سے کچھ جانیں بھی تلف ہوئیں مگر خاص ٹوکیو میں صرف بعض مکانوں کے احاطہ کے کٹہرے گرے یا درختوں کے گرنے سے بجلی کا سلسلہ ٹوٹ گیا تھا۔ سب

علاقہ میں بھی رات بھر اندھیرا رہا۔ زلزلوں کی کوئی گنتی نہیں۔ دن بھر میں کتنے ہی آجاتے ہیں۔ مسز برلاس بعض اوقات بہت پریشان ہوتی ہیں۔ مگر یہاں کے باشندے بالکل متاثر نہیں ہوتے۔ یہ لوگ آگ سے بہت ڈرتے ہیں۔ کیونکہ یہاں کے مکان آگ کے آگے پھونس کا کام دیتے ہیں۔ آگ کی بڑی احتیاط برتی جاتی ہے۔ رات کو ایک ایک چنگاری بجھا دی جاتی ہے۔ تقریباً ہر مکان کا بیمہ مالک کی طرف سے کرایا ہوا ہوتا ہے۔ ضروری کپڑوں کا ایک چھوٹا بکس تیار رکھا رہتا ہے کہ مکان میں آگ لگے تو اسے بچالیں۔ ہمنے بھی یہ انتظام کر رکھا ہے۔ سامان کا بیمہ کرلینے کا ارادہ ہے۔

یہاں پختہ مکانات بھی ہیں مگر بہت کم۔ بڑی دکانیں، بنک، دفاتر وغیرہ عموماً پختہ عمارتوں میں ہوتے ہیں۔ یہاں بعض دکانیں اتنی عظیم الشان ہیں کہ بمبئی اور کلکتہ کی وائٹ آوے لیڈلا کی دکانیں ان کے آگے ہیچ ہیں۔ انکا کرایہ ہی چار پانچ لاکھ "ین" سالانہ ہوتا ہے۔ سب سے بڑا اسٹور "متسوکوشی" ہے۔ اسکی عمارت تقریباً ایک سو تیس گز لمبی اور نوّے گز چوڑی ہے۔ آٹھ منزلیں ہیں اور ہر قسم کا سامان موجود ہے۔ دانتوں کی خلال سے لیکر پورے مکان کا فرنیچر یہاں سے مل جاتا ہے۔ برتنے کا سامان بھی ہے اور کھانے پینے کی چیزیں بھی۔ پھرتے پھرتے تھک جایئے تو بیٹھ کر آرام کر لیجئے۔ چائے پی لیجئے۔ بلکہ کھانا تک کھا لیجئے۔ یہاں کے ڈائننگ ہال میں پانسو آدمیوں کی نشست کا انتظام ہے۔ اور میں کئی بار وہاں گیا ہمیشہ بھرا ہوا دیکھا۔ حجامت کی ضرورت ہو تو حجامت کرا لیجئے۔ پیشاب خانہ، پاخانہ اور سنگار خانہ تک موجود ہے۔ غرضکہ اتنا بڑا اسٹور ہے کہ دن بھر میں آدمی اچھی طرح نہیں دیکھ سکتا۔ پھر ذرا سی سامان خریدا ہو تو مکان کا پتہ بتا دیجئے وہ خود اپنے صرفہ سے مکان پہنچا دینگے۔ یہ بات بڑے بڑے اسٹوروں کے ساتھ مخصوص نہیں۔ بلکہ چھوٹی دکانوں کا بھی یہی حال ہے کہ وہ مکان پر سامان پہنچا دیتے ہیں۔

جاپانی آدمی بڑے خلیق اور متواضع ہوتے ہیں۔ ہمکو اکثر پتہ دریافت کرنے کی ضرورت ہوتی ہے تو لوگ نہ صرف اچھی طرح پتہ بتا دیتے ہیں۔ بلکہ نقشہ بنا کر سمجھا دیتے ہیں۔ اس پر بھی سمجھ میں نہ آئے تو خود مقام مقصود تک پہنچا دیتے ہیں۔ بچہ والی عورت اور بوڑھوں کا بہت لحاظ کرتے ہیں۔ ریل گاڑی اور ٹریم میں ہمیشہ دیکھا ہے کہ بچہ والی عورت یا کوئی بوڑھا آدمی داخل ہوا اور بیٹھنے کی کوئی جگہ موجود نہ ہوئی تو کوئی نہ کوئی کھڑا ہو جائیگا اور اُسے بٹھا دیگا۔ ہر شخص کے نام کے ساتھ "صاحب" لگاتے ہیں۔ ہندوستان میں ڈاکٹر صاحب، حکیم صاحب سنا ہے۔ مگر یہاں قصائی صاحب، کنجڑے صاحب، مہتر صاحب، نوکر صاحب، اور ماما صاحب بھی ہوتے ہیں۔ بات بات پر شکریہ ادا کرتے ہیں۔ مگر باتونی ایسے ہوتے ہیں کہ اگر کوئی بات پوچھے تو جب تک چار پانچ منٹ تک باتیں نہ کر لیں مطلب حل نہیں ہوتا۔

لباس سب کا یکساں ہوتا ہے۔ مرد عموماً یوروپین لباس پہنتے ہیں۔ اور عورتیں عموماً قومی لباس میں نظر آتی ہیں البتہ لڑکیاں یوروپین لباس پہنتی ہیں۔ کپڑوں سے امیر غریب میں تمیز کرنی مشکل ہے۔ غور سے دیکھ کر قیمت کا اندازہ کرنے سے ہی پتہ لگایا جا سکتا ہے۔ وضع میں کچھ فرق نہیں۔

یہاں کی بہت سی باتیں ہمارے لئے عجیب ہیں۔ جن میں سے چند کا ذکر میں اُوپر کر چکا ہوں۔ عورتیں بڑی آزاد اور نڈر ہیں۔ دُنیا کے تمام کام کاج کرتی ہیں اور کوئی آنکھ بھر کر نہیں دیکھتا۔ بچپن سے آزادی کا سبق سیکھتی ہیں۔ لڑکے اور لڑکیاں اکیلوں ریل اور ٹریم میں بیٹھ کر مدرسہ جاتی ہیں۔ اکثر چھوٹی دوکانوں پر دیکھا، عورتیں منیجر ہیں۔ لڑکیاں تو ہر بڑی دوکان

پر ملازم ہیں۔

جاپانی اخبار بینی کے بڑے شوقین ہیں۔ ہر شخص اخبار خریدتا ہے ریل اور ٹرام میں بھی اخبار پڑھتے رہتے ہیں چاہے کتنا ہی تھوڑا فاصلہ طے کرنا ہو۔ پھولوں اور درختوں کے بڑے شوقین ہیں۔ مکانوں کے گرد تو درخت ہوتے ہی ہیں۔ مکان کے اندر اور دوکان میں کچھ گملے ضرور موجود ہوتے ہیں۔ ہر بازار میں پھولوں اور پودوں کی کئی کئی دکانیں ہوتی ہیں۔ ٹوکیو میں دس پندرہ بازار نہیں ہیں بلکہ ہزاروں بازار ہیں جہاں رہائشی مکان ہیں۔ ان کے آس پاس بازار ضرور موجود ہونگے ان بازاروں میں ہر قسم کا سامان موجود ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ سلے ہوئے سوٹ بھی موجود ہیں۔ خانہ داری کے آرام کی چھوٹی چھوٹی چیزیں بہت ہوتی ہیں۔ صرف جھاڑو کو لیجئے تو ایک گھر میں پانچ چھ طرح کی جھاڑوؤں کی ضرورت ہوتی ہے۔

پاخانہ کا حال بالکل عجیب ہے تین صاحب صفائی کرتے ہیں۔ ایک صاحب بوقت ضرورت پاخانہ اور پیشاب خانے کے چینی کے برتن صاف کرتے ہیں۔ دوسرے صاحب کوڑا اٹھاتے ہیں اور تیسرے صاحب پاخانہ کماتے ہیں اور یہی مہتر صاحب کہلاتے ہیں۔ مہتر صاحب مہینہ میں صرف دو مرتبہ کمانے آتے ہیں۔ مسز برلاس نے مکاندار اور پڑوسیوں سے کہہ سن کر یہ انتظام کیا کہ مہتر صاحب ایک دن بیچ کمانے آیا کریں وہ صاحب دو مرتبہ تو آئے پھر انکار کر دیا کہ پانی بہت ہوتا ہے ناچار پاخانہ میں پانی کا استعمال ترک کر دیا۔ پاخانہ سنڈاس کی وضع کا بنا ہوتا ہے۔ نیچے پختہ گول حوض ہوتا ہے۔ اسی میں پاخانہ جمع ہوتا رہتا ہے۔ یہاں کی سردی کی وجہ سے پاخانہ ایسی جلدی نہیں سڑتا جیسا کہ ہندوستان میں مگر ہمیں گوارا نہیں ہوتا۔ جاپانی یوں بڑے صاف ستھرے ہوتے ہیں بلکہ تمام دنیا میں یہ قوم سب سے زیادہ صاف ستھری مانی جاتی ہے مگر پاخانہ ان کا بہت غلیظ ہوتا ہے نشست کے کمرہ کی بغل میں ہی ہوتا ہے۔ پھر بھی ان لوگوں کو بدبو ناگوار نہیں ہوتی۔

جاپانی سخت گرم پانی سے نہاتے ہیں۔ ہم تو مبالغتہ اسے کھولتا ہوا پانی کہیں گے ایک ٹب میں پانی گرم ہوتا ہے پہلے ایک بار صابن مل کر نہاتے ہیں۔ پھر میل صاف کرنے کے بعد اسی کھولتے ہوئے پانی میں بیٹھ جاتے ہیں اسی ٹب میں سب گھر والے یکے بعد دیگرے نہا لیتے ہیں۔ پبلک حمام بھی موجود ہیں جہاں ایک بڑا حوض کھولتے ہوئے پانی کا ہوتا ہے "ایک حمام میں سب ننگے" کی مثل یہاں لفظاً صحیح ہے۔ گھر میں عموماً رات کو نہاتے ہیں۔ ہمیں اول اول تو اتنا سخت گرم پانی ناگوار گذرا۔ اب کچھ عادت ہو چلی ہے پھر بھی اتنا گرم پانی نہیں سہ سکتے جتنا جاپانی۔ ایک روز بیچ نہانا ضروری ہے۔ ورنہ ڈاکٹر کے بل کا ڈر لگا رہتا ہے۔ دن کو نہانے سے یہی کہہ کر منع کیا جاتا ہے کہ زکام ہو جائیگا اور ڈاکٹر کا بہت بڑا بل ادا کرنا پڑیگا۔ رات کو نہانے میں یہ آرام تو ہمیں صریحاً محسوس ہوتا ہے کہ بدن میں خوب گرمی پیدا ہو جاتی ہے۔ نہانے کے بعد ہی سو جاتے ہیں۔ سردی کی بھی تکلیف محسوس نہیں ہوتی۔

یہاں گوشت کی بڑی تکلیف ہے۔ مسز برلاس نے گوشت کھانا قطعاً بند کر دیا ہے مچھلی اور انڈے البتہ روز کھانے میں آتے ہیں کبھی کبھی مرغی بھی مل جاتی ہے۔ پھل بہت اچھے ہوتے ہیں اور دہلی سے سستے ملتے ہیں۔ دودھ بہت مہنگا ہے۔ اکثر ہوٹلوں میں چائے پینے کا اتفاق ہوتا ہے۔ دودھ صرف دکھا دیتے ہیں ایک پیالی میں چار پانچ قطرے کافی سمجھتے ہیں ایک مرتبہ ہم تینوں نے ہوٹل میں چائے پینے گئے۔ ملازمہ چائے کی پیالیاں رکھ کر ایک گڑیا کی پیالی میں دودھ لائی اور تینوں پیالیوں میں

دودھ جھاگ کو ہم نے چکھا مسز برلاس نے اس سے پیالی مانگی اور اپنی پیالیوں میں سب دودھ خالی کر لیا۔ ملازمہ منہ دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ جاپانی بلا دودھ کی چائے پیتے ہیں جس میں شکر بھی نہیں ہوتی۔ وہ سبز چائے پیتے ہیں۔ اسی فرق کی بنا پر نام بھی الگ الگ ہیں جاپانی چائے کا نام "چا" ہے اور غیر ملکی چائے کا نام "کوچا"

سردی کا یہ عالم ہے کہ ہم لوگ دو دو تو شکیں بچھاتے ہیں ایک کمبل اور لحاف جوڑ کر اوڑھتے ہیں۔ ابھی دسمبر کا شروع ہے۔ زیادہ سخت جاڑے کیلئے ایک اور لمبا چوڑا اور موٹا لحاف تیار ہے۔ ہر وقت دو انگیٹھیاں سلگتی رہتی ہیں۔ صرف سوتے وقت بجھائی جاتی ہیں۔ زیادہ سردی کے وقت بجلی کا اسٹوو روشن کرتے ہیں۔ سونے کا کمرہ اسی سے گرم کیا جاتا ہے۔ مگر [illegible] سوتے وقت بجھا دیا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں آجکل چار طرح کا ایندھن صرف ہوتا ہے۔ کوئلہ۔ کوک۔ گیس اور بجلی۔ ہمارے ایک [illegible] دوست کہتے ہیں کہ سخت جاڑے میں پتھر کے کوئلہ کا اسٹوو جلانا پڑیگا تب پانچویں ایندھن کا اضافہ ہو جائیگا۔ آجکل روز پالا پڑتا ہے۔ ایک روز برف پڑ چکی ہے مگر نہایت تھوڑی کہ ہمیں محسوس بھی نہیں ہوئی۔

عورتوں کی آزادی کی پوری قدر یہاں ہوتی ہے اسقدر آرام ملتا ہے پردہ سے نفرت ہوتی ہے۔ مسز برلاس پر ہندوستان کی قید پردہ کا اثر باقی ہے۔ راستہ بھولنے میں بڑا تکلف ہوتا ہے۔ ایک روز شام کو اکیلی بازار چلی گئیں۔ خرید و فروخت کرنے کے بعد واپس چلیں تو رستہ بھول گئیں۔ ادھر ادھر کئی پھیرے کئے مگر رستہ نہ ملا۔ آخر ایک دوکان پر کھڑی ہوکر رونے لگیں۔ عورتیں اور مرد جمع ہو گئے مگر انگریزی جاننے والا کوئی نہ تھا۔ اتفاق سے اپنے محلے کا ایک لڑکا مل گیا اس نے انہیں گھر تک پہنچایا۔ مجھے انکی اخلاقی جرأت پر تعجب ہوتا ہے کتنی جلدی ایسی آزادی کی عادی ہو گئیں گویا کبھی پردہ کیا ہی نہ تھا۔ جہاز پر مردوں سے برملا گفتگو کرنے میں کچھ جھجک تھی۔ رفتہ رفتہ وہ بھی جاتی رہی۔ دکانداروں سے انکی گفتگو سننے میں بڑا مزہ آتا ہے۔ کچھ جاپانی الفاظ سیکھ لئے ہیں۔ ان کو انگریزی سے ملا کر اپنا مطلب ادا کیا جاتا ہے۔ کچھ اشاروں سے کام چلتا ہے۔ بہت کم جاپانی انگریزی جاننے والے ملتے ہیں۔ مچھلی والے کی دوکان پر ایک روز بڑا لطیفہ رہا۔ چھوٹی بڑی سمجھانے کیلئے انہوں نے مچھلی کی بیٹی کہا تو دوکاندار بہت ہنسا اور اس نے بڑی مچھلی دکھا کر کہا یہ مچھلی کا باپ ہے۔

وہ جدھر جاتی ہیں عورتیں اور بچے دیکھنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مرد بھی غور سے دیکھتے ہیں۔ بڑے اسٹوروں میں زنان کا تماشہ بن جاتا ہے۔ دکان کی لڑکیاں ان کو دیکھنے کیلئے ان کے گرد جمع ہو جاتی ہیں۔ مگر کبھی کسی کو ہنستے ہوئے نہیں دیکھا۔ آپس میں باتیں کرتے ہوئے کبھی کبھی مسکراتے ہیں۔ مگر کبھی انگلی کا اشارہ نہیں کرتے۔

یہاں کھانا پکانے میں کچھ دیر نہیں لگتی۔ ڈبل روٹی بازار سے آتی ہے۔ چاول مچھلی وغیرہ پکانے میں آدھ گھنٹہ سے زیادہ نہیں لگتا (ہم آجکل سخت جاڑے میں خشکا کھا رہے ہیں) کئی چیزیں پکانی ہوں تو البتہ چولہے کی کمی کے سبب کچھ دیر لگتی ہے گیس جلائی اور پاؤ گھنٹہ میں مچھلی تیار ہو گئی۔ مصالحہ پیسنے کا جھگڑا نہیں پسا ہوا مصالحہ ڈبوں میں ملتا ہے۔ ہندوستان میں ماما دن بھر پکاتی رہتی ہے۔ اور بیگم صاحبہ کے بھی کئی گھنٹے کھانا پکانے کے انتظام میں لگ جاتے ہیں۔ یہاں ماما کا زیادہ وقت مکان کی صفائی میں صرف ہوتا ہے۔ کونہ کونہ صاف کرتی ہے اور مکان کے کئی حصے روز دھوتی ہے اور سیتی ہے۔ دن رات رہتی ہے۔ دن کو دو تین گھنٹے کتاب پڑھنے کیلئے چھٹی لیتی ہے۔ مہینہ میں ایک روز گھر جانے کی چھٹی لیتی ہے۔ ہماری ماما سے کھانا پکانے میں [illegible]

بہت کم مدد ملتی ہی بتدریج رفتہ رفتہ سیکھ رہی ہے کنواری ہے مگر غیر گھر میں سونے سے نہیں ڈرتی۔ اس کو ایک کمرہ الگ دے رکھا ہوا اور یہی یہاں کا دستور ہے۔ یہاں معلوم ہوا کہ کنواری لڑکیاں اپنی شادی کا سامان مہیا کرنے کیلئے نوکری کرتی ہیں شادی ہونے پر اپنے شوہر کے کام میں اسکا ہاتھ بٹاتی ہیں۔ ہندوستان میں ہماری عورتوں کا حال اسکے برعکس ہے وہ مردوں کے کام میں ہاتھ بٹانے کی بجائے اپنا باہر کا سب کام مردوں سے کراتی ہیں جب ہی ہم پوری ترقی نہیں کر سکتے۔

ٹوکیو بہت گراں شہر ہے مکان کا کرایہ چالیس "ین" ماہوار دینا پڑتا ہے۔ ماما سستی مل گئی ہے اسکو پچیس "ین" دینے پڑتے ہیں۔ گوشت اور دودھ بہت مہنگا ہے دہی کا کہیں پتہ نہیں انڈے اور مچھلی البتہ سستی ہے۔ سردی سے حفاظت کے لئے بہت خرچ کرنا پڑتا ہے ✦

نور الحسن برلاس

---

# اِخوان الشیاطین

اور

# دیگر افسانے

جناب افضل حسین چشتی (علامہ مضحک دہلوی) کے سائنٹفک افسانے ساقی گذشتہ اشاعتوں میں شائع ہو کر بیحد مقبول ہو چکے ہیں خصوصاً "اخوان الشیاطین" جو اپنی طرز کا زبان اردو میں پہلا افسانہ ہے۔ شائقین ادب کے اصرار سے اسی نوع کے چند اور افسانے بھی صاحب مضمون سے لکھوا کر اس مجموعہ میں شامل کئے گئے ہیں۔ قوت ارادی۔ تنویم۔ نقل افکار اور سائنس کی بے شمار کرشمہ سازیوں کا انکشاف جرائم میں کس بیدردی کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے حصول جاہ و ثروت کیلئے انسانی خون کس سفاکی سے بہایا جاتا ہے۔ یہ اور اسی قسم کے لرزہ خیز واقعات افسانوں کے پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں۔ ... یت رکھنے والے بھی اس متمدن زمانہ کے خوفناک جرائم اور ترقی یافتہ ذہنیتوں کی بہیمانہ خونریزی کے طریقوں سے واقف ہو جائیں۔ عمل تنویم سے نقل ارواح عمل جراحی سے انقلاب ذہنیت قوت ارادی کے مہلک نتائج مقیاس البرق کی جانسوز برقی لہریں دل ہلا دینے والے واقعات کی اگر آپ تصویر دیکھنا چاہتے ہیں تو **اخوان الشیاطین** اور دیگر افسانے کی ایک جلد طلب کیجئے اس مجموعہ میں سائنٹیفک افسانوں کے علاوہ ایسے مزاحیہ مضامین بھی ہیں جن کو پڑھ کر آپ ہنستے ہنستے لوٹ جائیں گے۔ ایک بہت دلچسپ رومانی تمثیل بھی شامل ہے طرز تحریر اسقدر پُرلطف اور زبان اس درجہ شستہ و رفتہ ہو کہ ہر ہر فقرہ دل میں کھب جاتا ہے۔ ضخامت ۲۵۶ صفحات کتابت و طباعت اعلیٰ درجہ کی۔ قیمت صرف ایکروپیہ چار آنے (عہ) - علاوہ محصول ڈاک

ملنے کا پتہ۔ **ساقی بکڈپو دہلی**

# عزمِ اُستوار

از جناب مولوی حاجی سید شاہ ابو محمد ثاقب کانپوری

میں رہا کرتا ہوں اکثر غرقِ حُسنِ صوت میں — میری نظروں کے لئے ہر جلوہ برقِ طور ہے
تو نے دُنیا کو سمجھ رکھا ہے زندانِ الم — ہے یہ غفلت ورنہ ہر شے دہر کی مسرور ہے

کیوں سمجھتا ہے کہ دنیا یاس و غم کا نام ہے — یہ تخیّل ننگ ہے رُوحِ شرافت کے لئے
تو اگر زندہ ہے، دے اپنا ثبوتِ زندگی — ساری دُنیا صید ہے مردانہ ہمت کے لئے

ہو اگر ہمت بدل جاتے ہیں طوفانِ حیات — یہ ہوائے تیز کیا ہے، صرف اک سازِ طرب
ہوں اگر دل میں اُمنگیں اور سماعت مطمئن — خشمگیں موجوں میں سُن سکتا ہے آوازِ طرب

ہیچ اور بے مایہ ہیں دُنیا میں یہ دشت و جبل — ہمتِ مردانہ کی نظروں میں یہ سب پست ہیں
خود غرورِ کامرانی چوم لیتا ہے قدم — اپنے ہی ہمت کے نشّے میں جو انساں مست ہیں

جب کبھی بیدار ہو جاتا ہے عزمِ اُستوار — نغمہ بنجاتا ہے خود بڑھتے ہوئے دریا کا جوش
یہ گھٹائیں، یہ تلاطم، یہ بھنور کچھ بھی نہیں — پست کر دیتا ہے طوفانوں کو انسانی خروش

# حکیم آغا جان عیشؔ دہلوی کا غیر مطبوعہ کلام

(عطیہ جناب یونس مرزا صاحب اسسٹنٹ کمشنر پولیس حیدرآباد دکن)

اے صبا یار کی تو کاکلِ پیچاں کو نہ چھیڑ
ہو گی تو جان پریشان پریشاں کو نہ چھیڑ

چارہ گر دیکھ مرے سینۂ سوزاں کو نہ چھیڑ
اسمیں ہے آگ بھری آتشِ پنہاں کو نہ چھیڑ

بخیہ گر اپنے گریبان کی تو خیر منا
باز آ دیکھ مرے چاکِ گریباں کو نہ چھیڑ

اس طرح اذیت خونِ خوار جگر ریشوں کے
دمبدم نشترِ مژگاں سے رگِ جاں کو نہ چھیڑ

یوں مسیح آئیں تو آئیں پہ یہ کہنا اُن سے
نبضِ جاں سوختۂ آتشِ ہجراں کو نہ چھیڑ

عیشؔ انساں کو ہے حفظِ مراتب لازم
اسمیں ہے ترکِ ادب یار کے داماں کو نہ چھیڑ

## رُباعی

الفت میں بتوں کی اپنی جان پر کھیلے
جو رنج و ستم نہ جھیلے تھے جھیلے
گر جیتے رہنا ایک دن کا ہو تو جیتیں
عاشق ہوئے جب سے یہ ہی پاپڑ بیلے

## رُباعی

جوں برق ایک عمر بیقراری میں کٹی
جوں شمع ایک عمر آہ و زاری میں کٹی
القصہ رہی ہیں یہ ہی جھگڑے درپیش
باقی جو رہی سو شرمساری میں کٹی

# "پیتم سے!"

اے اکاش کے منڈل پر چمکنے والے تارے! اپنی داسی کا پرنام قبول کر ــــ جب سے اس داسی نے تیری سُندر انکھیوں سے پریم کا سوم رس پیا ہے۔ اُسی وقت سے اے میرے چندرمان ۔ ! تو میرے من کے مندر میں براجمان ہے۔ اور اُسی وقت سے اے ٹھاکر ! میں تیری انوپ مورتی کو ہر لحظہ اپنے آنسوؤں کے نرمل جل سے اشنان دیتی رہتی ہوں۔ ہر وقت اے شام مراری ! ــ میرے کانوں میں تیری سندر مرلی کے میٹھے منتر گونجتے رہتے ہیں ــــ تیرے خیال ہی سے میرے من کی جوگ قائم ہے ــــ میرے شریر کے روم روم میں تیری محبت بسی ہوئی ہے۔ لیکن اے سا جن ۔ ! اب پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ داسی برہ کے بڑھتے ہوئے شعلوں میں بھسم ہو کر رہ جائے۔ یہ میں مانتی ہوں کہ تیری آرزو اور تیری تمنا کو اپنے دل میں لئے ہوئے مرجانا آتما کی مکتی اور شانتی کا باعث ہے۔ لیکن میں اتنی مورکھ نہیں کہ اپنی مکتی کے پیچھے تجھے چھوڑ دوں۔ میری آتما کی مکتی اور شانتی تو تیری سیوا کرنے میں ہے۔ میں تو صرف تجھے چاہتی ہوں ــــ آ ــــ اے سندر سوامی ۔ ! میری آنکھیں تیرے لئے ترس رہی ہیں۔ میں تیرے غم میں گھلی جاتی ہوں۔ آ ــــ اور میرے من کی پیاس بجھا ــــ آ ــــ اور اپنی داسی کو درشن دے۔ تا کہ اُس کے دُکھے ہوئے دل کی دُنیا روشن ہو جائے۔

تیری داسی کو۔ تیری باندی کو۔ تیرا سندر نام جپنے والی کو لوگ ایک چنڈال کے سپرد کرنے والے ہیں۔ ہائے! میں کیا کروں ــ میں، میری آتما، میرا شریر، صرف تیرا ہے۔ میرے دل کے راج کا تو ہی سرتاج ہے ــ اے راجہ ! ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ کوئی دوسرا اس راج پر قابض ہو۔ تیری داسی صرف تیری ہی داسی رہی ہے ــ مگر میں بے بس ہوں ! میری کوئی نہیں سنتا ــــ جلد آ ــــ اور مجھے اس چنڈال کے چنگل سے چھڑا لے ــــ کہیں ایسا نہ ہو کہ تو نہ آئے ــــ اور میں ــــ ایشورا ــــ پھر ــــ پھر میں کیا کروں گی ــ ! ــ ــ ــ اے پیتم پیارے ــــ جلد آ ــــ !!"

ا۔ ن۔ ص۔ ا۔ س

خمستان

# جام صہبائی

لذت کش ناکامیٔ ارمان وفانی ہوجانا
بیگانۂ ہم ذوق سے خزانی ہوجانا
مستیٔ شباب و دانی سے اکثر
یکسر مئے عشق جاودانی ہوجانا

---

یہ وقت نہیں ہے سرگراں ہونے کے لئے
کیوں وقف ہو کوئی فنا ہونے کے لئے
ہنگام ہے مستیٔ جلوہ ہائے ازلی
نظارے عجیب ہیں نگاہوں کے لئے

---

کیا کیا نہ کیا ادب میں کیا کیا نہ ہوا!
پابند طلب کمالِ تہذیب بنا
ہر فن کو فن ہوا یہ آشفتہ سری
وہ شعر کہ ایسا ہوا ایسا نہ ہوا

---

میخانہ بدوش فصلِ گل آئی ہے
ہر ساغرِ زندگی کی لالی ہے
ہر ذرہ پہ ہے بہار سرمستی کا اثر
سرشار ہی جوانی زندگی گنگناتی ہے

اثر صہبائی

# حیاتِ محمودؒ

(گذشتہ سے پیوستہ)

(از جناب اسعد حسین الاشرفی الدہلوی)

دکن کے ساحل مشرقی کے قریب کرناٹک اور تلنگانہ کے بیچ میں سلطنت بہمنی کی ہم سرحد ایک ریاست تھی جو مسولی پٹم تک پھیلی ہوئی تھی، اسکے راجہ کا نام نرسنگہ تھا جس نے بیجانگر کا بہت سا ملک فتح کر اپنی ریاست کو بڑھا لیا تھا اور بہت سے قلعے بنا لئے تھے وہ اس زمانہ میں بہت عروج پہ تھی، نرسنگہ اپنی طاقت کے زعم میں اکثر زمینداران مملکت بہمنی کو اغوا کرکے اپنے ساتھ ملالیتا تھا اور انکی مدد سے اُسکی حدود میں گھس کر بدامنی پھیلایا کرتا تھا محمد شاہ اسکے مغلوب کرنیکے قصد سے معہ خواجہ گاواں کے روانہ ہوا قریب سرحد ایک جگہ مقام کیا۔ وہاں رستہ کے متصل پہاڑ پر ایک شکستہ و ویران قلعہ نظر آیا جو کسی زمانہ میں بادشاہان دہلی نے ان حدود کے انضباط و انتظام کے واسطے بنوایا تھا۔ محمد شاہ نے قلعہ کو دیکھ کر اسکے موقعہ کو پسند کیا اور اس خیال سے کہ اگر دشمن کے مقابلہ میں کامیابی نہ ہو اور ناکام واپس ہونا پڑے تو اس قلعہ سے بہت مدد ملیگی خواجہ گاواں کو اسکی مرمت کا حکم دیا خواجہ نے بکوشش بسیار و سعی بے شمار دو سال کا کام چھ ماہ میں مکمل کرکے قلعہ کو خوب مضبوط و مستحکم کردیا اور اس میں غلہ و آزوقہ و سامان حرب۔ توپ۔ ضرب زن وغیرہ جمیع آلات قلعہ داری مہیا کرکے بادشاہ کو اطلاع دی۔ بادشاہ نے خود آکر اُسکا معائنہ کیا اور خواجہ کی اس حسن کارگذاری کو پسند کرکے اسکو تحسین و آفرین کہی اور اتنا خوش ہوا کہ اپنی قبا اتار کر خواجہ کو پہنائی اور اسکی خود پہنی اور کہا کہ اللہ تعالی نے مجھ پر بڑا فضل کیا ہے کہ ایک تو سلطنت عطا کی دوسرے خواجہ گاواں جیسا لائق و فائق اور وفادار ملازم دیا اتنی قدر افزائی کبھی کسی بادشاہ نے اپنے کسی نوکر کی نہیں کی۔ خواجہ کی عزت و وقعت دن دونی رات چوگنی دیکھ کر حاسد انگاروں پر لوٹتے اور اسکا فریق مخالف جل بھن کر کوئلہ کباب ہوا جاتا تھا۔

قلعہ کا معائنہ کرکے بادشاہ آگے بڑھا اور کوندپور پلی پہنچا یہاں اپنے فرزند شہزادہ محمود کو خواجہ کی حفاظت میں چھوڑ کر خود ملک حسن نظام الملک بحری۔ یوسف عادل خاں اور تغرش خاں وغیرہ سرداروں کے ساتھ مقام کنچی پہنچا جو مدراس کے پاس ہے اسکو فتح کرکے ملک حسن کی صلاح سے یوسف عادل خاں و فخر الملک ترک وغیرہ امراء کو جو فریق غیر ملکی سے تعلق رکھتے تھے جنیر و دولت آباد کے پندرہ ہزار لشکر کے ساتھ نرسنگہ کے تعاقب میں مامور کرکے خود مسولی پٹم پہنچا اور اسپر قبضہ کرکے کوندپور پلی کو مراجعت کی۔

خاندان بہمنی کے بانی سلطان علاء الدین حسن گنگو بہمنی کے زمانہ میں سلطنت مختصر اور چار صوبوں پر منقسم تھی ہر صوبہ طرف کے نام سے موسوم تھا اور وہ چار صوبے یا اطراف یہ تھیں۔ صوبۂ گلبرگہ۔ صوبۂ دولت آباد۔ صوبۂ تلنگانہ۔ صوبۂ برار۔ ہر صوبہ پر ایک حاکم بنام صوبیدار یا طرف دار تعینات ہوتا تھا وہی اُس صوبہ کا سرلشکر یعنی فوج کا افسر اعلیٰ بھی ہوتا تھا۔ اس صوبہ کا سارا لشکر اور سب قلعہ دار اُسی کے ماتحت ہوتے تھے جنکا عزل و نصب تبادلہ و تعیناتی وغیرہ سرلشکر کے اختیار میں ہوتی تھی

علاء الدین کے جانشین جواب تک لائق ہوئے تھے برابر ملک میں اضافہ کرتے رہے تھے یہاں تک کہ اب محمد شاہ کے عہد میں سلطنت اس قدر وسیع ہوگئی تھی کہ ہر ایک صوبہ بجائے خود ایک چھوٹی سی مملکت بن گیا تھا۔ مگر ملک کی تنظیم و تقسیم حسب دستور قدیم چلی آتی تھی جس سے یہ نقصان تھا کہ ایک آدمی اتنے بڑے صوبہ کا انتظام اچھی طرح نہیں کر سکتا تھا۔ علاوہ اس کے صوبیدار اس قدر قوی ہوتے تھے کہ جب چاہیں بغاوت کردیں ان پر بادشاہ کا اثر کم ہوتا تھا خواجہ گاواں نے ان نقائص کو رفع کرنے کی غرض سے اصلاحات کا ایک خاکہ مرتب کر کے بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا اور معقول دلائل کے ساتھ ان کے فوائد بادشاہ کے ذہن نشین کر کے ان کو نافذ کردیا ان اصلاحات کی رو سے ملک کو بجائے چار کے آٹھ حصوں میں بہ تفصیل ذیل تقسیم کیا گیا تھا۔

| شمار | صوبہ ہائے قدیم | شمار | صوبہ ہائے جدید |
|---|---|---|---|
| ۱ | گلبرگہ | ۱ | گلبرگہ |
| | | ۲ | بیجاپور |
| ۲ | دولت آباد | ۳ | دولت آباد |
| | | ۴ | جنیر |
| ۳ | تلنگانہ | ۵ | راجمہندری |
| | | ۶ | ورنگل |
| ۴ | برار | ۷ | گاویل |
| | | ۸ | ماہور |

صرف ایک قلعہ صوبے کے صدر مقام پر صوبے دار کے ماتحت رکھا گیا تھا بقیہ جملہ قلعے اسکے اختیار سے نکل کر براہ راست سرکار شاہی کی ماتحتی میں آگئے تھے جنکے قلعہ دار بادشاہ کی طرف سے مقرر کئے جاتے تھے پہلے یہ قاعدہ تھا کہ پانصدی کو ایک لاکھ اور ہزاری کو دو لاکھ ہن سالانہ دے جاتے تھے۔ مگر ان کی نگرانی کا کوئی معقول انتظام نہیں تھا سو بہت عہدہ داروں کو موقعہ ملتا تھا کہ اگر چاہیں تو وظیفہ کے مطابق فوج نہ رکھیں بلکہ کم رکھیں۔ قواعد جدید کی رو سے پانصدی کے سوا لاکھ ہن اور ہزاری کے ڈھائی لاکھ مقرر ہوئے اور اسی حساب سے عطائے جاگیر کا قاعدہ معین ہوا یعنی پانصدی کو سوا لاکھ اور ہزاری کو ڈھائی لاکھ ہن کی جاگیر ملے۔ اگر جاگیر کا محاصل اس سے کم ہو تو بقیہ رقم خزانہ شاہی سے دیکر مقدار مقررہ پوری کردی جائے اس رعایت کیساتھ یہ بھی تاکید تھی کہ منصبدار و جاگیردار فوج کی پوری تعداد رکھیں اگر کوئی تعداد معینہ سے ایک سپاہی بھی کم رکھے تو انکی تنخواہ اس سے بازیافت کی جائے تعمیل اصلاحات کی نگرانی کی غرض سے ساری سلطنت میں ایک سرے سے دوسرے تک معائنہ کنندہ افسر مقرر کئے گئے تھے جو سختی سے نگرانی کرتے تھے۔

خواجہ گاواں نے فوج کی تنخواہ میں بھی اضافہ کیا تھا سنہ ۱۸۳۱ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنی ہندوستانی فوج کی نظرثانی

---

علہ ہن ایک سکہ طلائی تھا جو آجکل کے انگریزی ساڑھے چار روپیہ کے برابر ہوتا تھا۔

کرکے جو تنخواہ مقرر کی تھی وہ اس سے کم تھی جو سنہ ۱۴۷۲ء میں بہمنی فوج کو ملتی تھی۔ حالانکہ سنہ ۱۸۳۰ء میں روپیہ کی قیمت کم اور سنہ ۱۴۷۲ء میں زیادہ تھی۔ اُسوقت فوج بہمنی کے پانچسو سواروں کے ایک دستہ کا سالانہ خرچ تین لاکھ دس ہزار روپیہ تھا اور سنہ ۱۸۳۰ء میں فوج کے لئے ہی سواروں کی ایک رجمنٹ کا خرچ دولاکھ ایک ہزار نوسو روپیہ تھا۔ بہمنی فوج میں ایک سوار جو گھوڑا اور ہتھیار اپنے پاس سے مہیا کرتا تھا۔ چالیس روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی تھی درحالیکہ انگریزی فوج کے ایک سوار کو سنہ ۱۸۳۰ء میں ایک معمولی پیدل سپاہی کی تنخواہ سات آٹھ روپے اور بیس روپے اور گھوڑے کا الاؤنس ملتا تھا۔ علاوہ فوج کے خواجہ نے۔ مال۔ عدالت اور تعلیم وغیرہ ہر صیغہ میں اصلاحیں کی تھیں۔

ان اصلاحات سے کاروبار سلطنت میں خوب ترقی ہوئی فوج باقاعدہ اور پوری رہنے لگی مگر جو لوگ صاحب اعتبار تھے جنکے حوصلے بڑھے ہوئے تھے اور ناجائز طریقوں سے ہاتھ رنگتے تھے اُن کو ان اصلاحات سے بہت نقصان پہنچا وہ خواجہ گاواں کے دشمن ہوکر اسکی بیخکنی کی فکر کرنے لگے اس کو بھی اسکا علم تھا مگر وہ سلطنت کی خیرخواہی اور بادشاہ کی محبت کے پیچھے کسی کی دشمنی کی پروا نہیں کرتا تھا۔ خواجہ کو محمد شاہ سے بہت انس تھا وہ بڑے خضوع وخشوع سے اسکے طول حیات اور بقائے دولت کی دعائیں مانگا کرتا تھا جمعہ کے دن رات کے وقت روپیوں اور اشرفیوں کی تھیلیاں لے کر بہ تبدیل لباس گھر سے باہر نکلتا اور بیدر کی گلی کوچوں میں گشت لگاکر مساکین ومحتاجین کو حسب ضرورت ان کے اشرفی وروپیہ دیتا اور کہتا کہ یہ بادشاہ نے تمکو بھیجا ہے۔ اُسکی درازی عمر وترقی اقبال کی دعا مانگو۔ یہ اُسی کی تربیت کا نتیجہ تھا کہ محمد شاہ خاندان بہمنی میں سب سے بڑا اور زبردست بادشاہ ہوا ہے سارا دکن سوائے ریاست بیجانگر کے اسکے زیر نگیں تھا۔

بادشاہان ایران وخراسان وعراق وغیرہ خواجہ پر غائبانہ بہت مہربانی کرتے تھے اور اسکو اپنے پاس بلایا کرتے تھے مگر وہ محمد شاہ کو چھوڑکر کہیں جانا پسند نہیں کرتا تھا۔ ایک دفعہ سلطان حسین مرزا بادشاہ خراسان نے مولانا سید کاظم کو خواجہ کے پاس بھیجکر بڑے بڑے شاہانہ وعدوں کے ساتھ بلوایا۔ سید کاظم ہرات دارالسلطنت خراسان سے براہ قندہار ولاہور بیدر پہنچا خواجہ نے بطائف الحیل اسکو ٹالنا چاہا اور کہا کہ اگر بادشاہ اجازت دیگا تو چلونگا بادشاہ سے سید کاظم کے آنیکی غرض بیان کی۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ اجازت نہیں ملیگی۔ چنانچہ محمد شاہ نے اجازت نہیں دی اور خواجہ نے بادشاہ خراسان کے واسطے بہت سی تحفے سوغاتیں اور ہدیے سید کاظم کو دیکر رخصت کیا اور ایک عریضہ اپنے نہ آنیکی معذرت کا لکھا۔ سید کاظم نے براہ دریا ہرات کو مراجعت کی اور ایران پہنچکر شیراز میں قیام کیا مگر وہاں سے بجائے سفر ہرات کے سفر آخرت اختیار کیا اور وہ سب تحف وہدایا رستہ میں تلف ہوگئے۔

خواجہ گاواں بلحاظ علم وفضل اپنے زمانہ کے علما وفضلا میں بہت ممتاز تھا شعر بھی اچھا کہتا تھا۔ صاحب دیوان تھا۔ اسنے اپنے معاصر ارباب کمال سے کے خطوط جن سے اسکی خط وکتابت تھی۔ جمع کرکے ایک رسالہ بنام روضۃ الانشاء مرتب کیا تھا جس میں چند مکتوب حضرت مولانا عبدالرحمن صاحب جامی رحمۃ اللہ علیہ کے بھی ہیں انہوں نے ایک قصیدہ خواجہ کی مدح میں لکھا تھا جسکا مطلع یہ ہے:-

مرحبا اے قاصد ملک معانی مرحبا الصلا کز جان ودل بنزل تو کردم اصلا

اسی قصیدہ کا ایک شعر ہے

ہم جہاں را خواجہ وہم فقر را دیباجہ اوست — آیت الفقر لکن تحت استار الغنا

ایک دفعہ یہ قطعہ خواجہ کو لکھا تھا

جامی اشعار دلاویز تو بس ہست لطیف — پرورش از حسن بود لطف معانی تارش

ہم رہ قافلہ ہند رواں کن کہ رسد — شرف عز و قبول از ملک التجارش

صاحب تاریخ فرشتہ محمد قاسم فرشتہ نے خواجہ کے متعلق لکھا ہے کہ: "ذات شریف آن آصف جاہ بہ انواع علوم عقلیہ ونقلیہ خصوصاً ریاضی وطب اتصاف داشت ودر فن نظم ونثر وانشا وحساب بے نظیر روزگار خویش بود۔ خط سیاق راخوب مے نوشت" خواجہ نے بہت سے رفاہ عام کے کام کئے۔ کثرت سے باغ لگائے، کنوئیں کھدوائے، عمارتیں بنوائیں۔ تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ "آثار جمیلہ وحمیدہ آں خواجہ آصف شعار در زمین فتنہ خیز دکن بسیار است"۔ شہر بیدر میں ایک عالیشان مدرسہ[1] اور خوبصورت مسجد بنوائی تھی طالبان علم کو خوراک وپوشاک اور کتابیں اور دیگر خرچ ضروری مدرسہ کی طرف سے ملتا تھا۔ اپنا کتب خانہ جس میں تین ہزار کتابیں تہیں، طلبائے علوم کے واسطے وقف کردیا تھا جب کسی کتاب کے مطالعہ کی ضرورت ہوتی تو مدرسہ سے عاریتاً منگا لیتا تھا اور پڑھ کر واپس کردیتا تھا۔ تین ہزار کتابوں کے کتب خانہ کی قدر وقیمت اس زمانہ میں ایسی تھی جیسی اس وقت تیس ہزار کے کتب خانہ کی۔ بہت وقت ومشقت اور صرف کثیر کے بعد ایک ایک کتاب کی نقل دستیاب ہوتی تھی جب ومہمات ملکی سے فارغ اور بیدر میں موجود ہوتا تھا تو مدرسہ میں جاکر طالب علموں کو خود درس دیتا تھا۔ ملا سامعی نے جو اسکا مصاحب وملازم تھا تعمیر مدرسہ کی یہ تاریخ کہی تھی۔

ایں مدرسہ رفیع محمود بنا — چوں کعبہ شدہ است قبلۂ اہل صفا

آثار قبول بیں کہ شد تاریخش — از آیت ربنا تقبل منا

خواجہ گاواں بہت متین ومتحمل وبردبار آدمی تھا مگر ساتھ ہی اسکے ظرافت وخوش طبعی بھی اسکے مزاج میں تھی۔ ایک روز احمد آباد بیدر میں قلعۂ ارک کے اندر قصر شاہی میں محمد شاہ مع اپنے ندیموں اور خواجہ کے بیٹھا ہوا تھا کہ قلعہ کے نیچے ایک گائے زور سے بولی۔ حاضرین میں سے کسی نے خواجہ سے مزاحاً پوچھا کہ یہ کیا کہہ رہی ہے؟ اسنے جواب دیا کہ یہ مجھے بلارہی ہے۔ کہہ رہی ہے۔ "گاواں" یعنی یہاں آ تو تو ہماری جنس میں سے ہے گویا جانور ہے، مجلس شاہی میں بیٹھا ہوا کیا کررہا ہے۔ بادشاہ ہنس پڑا اور اس لطیفہ سے بہت خوش ہوا۔ اسی محفل میں یہ بھی کہا کہ مجکو شاہان بہمنیہ ماضیہ پر یہ تفاخر ہے کہ میرے پاس خواجہ جیسا نوکر ہے اور ان کے پاس نہیں تھا۔

[1] یہ مدرسہ بیدر میں اب بھی موجود ہے عالمگیر جب دکن میں تھا تو اس مدرسہ سے میگزین کا کام لیا جاتا تھا اسمیں بارود بھری ہوئی تہی کہ ایک دفعہ اس پر بجلی گری جس سے اسکا ایک حصہ منہدم ہوگیا۔ ٹوٹی ہوئی عمارت کے بڑے بڑے ٹکرے پڑے ہوئے تھے سر سالار جنگ اول مرحوم نے حضور میر محبوب علی خاں مغفور کے زمانہ میں حکم دیا تہا کہ ان کو توڑ کر سڑک پر کوٹ دیا جائے۔ مگر وہ ایسے مضبوط نکلے کہ بہت ہی مشکل سے ٹوٹتے تھے اور صرفہ زیادہ ہوتا تھا مجبوراً یہ تجویز ترک کردیگئی۔

وہ بہت سخی اور بامروت آدمی تھا اُس نے اپنے خزانے کو دو صیغوں پر منقسم کر رکھا تھا ایک کا نام خزانہ شاہ تھا دوسرے کا خزانہ درویشاں۔ اول الذکر سے مطبخ اور حشم و خدم وغیرہ لوازمۂ ریاست کا خرچ اور فوج کی تنخواہ دی جاتی تھی۔ خواجہ کے پاس چار ہزار سوار تھے۔ دو ہزار سرکاری دو ہزار ذاتی۔ موخر الذکر سے محتاجین و مساکین کے وظیفے دئے جاتے تھے۔ اور رفاہ عام کے کام ہوتے تھے۔ اکثر درویشوں اور مشائخ و فقرا کی خدمت کی جاتی تھی جنسے ایام تجارت و سیاحت میں اسکی ملاقات ہوئی تھی اور دوست احباب کی بھی کیجاتی تھی جنسے اسی زمانہ میں راہ و رسم پیدا ہوگئی تھی۔ اور وہ ہندوستان نہیں آئے تھے۔ اور وطن کے غربا و اعزا و اقربا کو نقدی سوغاتیں اور تحفہ تحائف بھیجے جاتے تھے۔ جب جاگیر سے روپیہ آتا تھا تو اس میں سے ملبوسات امارت کے لائق خرچ رکھ کر باقی خزانۂ شاہی میں بھیجدیا جاتا تھا۔ اور کچھ غریبوں حاجتمندوں کو دیدیا جاتا تھا خواجہ اس میں سے ایک حبہ بھی اپنی ذات خاص پر خرچ نہیں کرتا تھا۔ اسکے اپنے گذارے کی یہ صورت تھی کہ جب وہ ایران سے آیا تھا تو بغرض تجارت چالیس ہزار لاری[1] اپنے ساتھ لایا تھا اس سے مال خرید کر اپنے معتمدین کے ہاتھ قرب و جوار کی بندرگاہوں میں بھیجتا تھا۔ جہاں ممالک غیر کے تاجر ہندوستان کا مال خریدنے آیا کرتے تھے جب مال فروخت ہوکر روپیہ آتا تھا تو راس المال علیحدہ کرکے منافعہ میں سے اپنے خرچ کو بارہ لاری یومیہ کے حساب سے رکھ کر بقیہ روپیہ خیرات کردیتا تھا۔ اسکے مذہب کے متعلق مورخین میں اختلاف ہے بعض اسکو سنی کہتے ہیں بعض شیعہ۔ مگر اصلیت یہ ہے کہ وہ ایک صوفی مشرب محب اہل بیت مسلمان تھا۔ صاحب تاریخ محمود شاہی ملا عبدالکریم ہمدانی نے اسکی بابت لکھا ہے کہ:۔

"او بس پاک دین و پاک اعتقاد بود۔ شیخیں را بہ تبجیل و تکریم و تعظیم یاد مے کرد۔ اخلاص تمام بسلطان محمد شاہ بہمنی داشت وصیت سخاوتش عالمگیر شدہ۔ ہیچ بلدہ و قریہ در ربع مسکوں نماند کہ انعام او دراں جا بہ اہل اللہ نہ رسیدہ باشد و بحسن خلق باہر دم زندگانی میکرد و در کمال شگفتگی با خلائق سلوک مے نمود"

خواجہ دولت بہمنی جیسی عظیم الشان سلطنت کا وزیر اعظم تھا اس وجہ سے اس کو اپنے حفظ مرتبت کے واسطے بہت شان و شوکت قائم رکھنی پڑتی تھی بظاہر وہ بہت بڑا امیر مگر بباطن ایک سچا فقیر تھا اسکے مطبخ میں ہر قسم کے بیش قیمت ظروف نقرہ و طلا موجود تھے مگر اسکا اپنا کھانا مٹی کی ہنڈیا میں پکتا تھا اور وہ مٹی کے برتن میں کھانا کھاتا تھا اسکا توشہ خانہ قالین ہائے ایرانی و پشمینہ ہائے کرمانی۔ مخمل ہائے کاشانی اور غالیچہ ہائے اصفہانی اور جملہ اقسام فرش فروش سے معمور تھا۔ مگر وہ خود بوریئے پر سوتا تھا۔

خواجہ کا رسوخ مملکت بہمنی میں اس قدر تھا کہ وہ اسکے سیاہ و سفید کا مالک بنا ہوا تھا۔ اگر وہ چاہتا تو اپنے فریق مخالف کو جڑ بنیاد سے اکھاڑ کر پھینکدیتا۔ اور اگر بیوفائی پر آمادہ ہوتا تو خود بادشاہ بن بیٹھتا۔ لیکن اسکی ذات بابرکات جو ستودہ صفات تھی ان خیالات کو اپنے دل میں بھی کبھی جگہ نہیں دیتی تھی۔ وہ کبھی اپنے ذاتی اغراض کو مصالح ملکی پر ترجیح نہیں دیتا تھا۔ مخالفین میں سے اگر کسی سے سلطنت کی بھلائی اور خیر خواہی کا کوئی کام ہوتا تو وہ اسکی سفارش کرکے انعام و اکرام دلواتا۔ بادشاہ بالکل اسکے ہاتھ میں تھا سلطنت کا کوئی کام بغیر اس سے دریافت کئے نہیں کرتا تھا۔ اور کبھی اسکے کہنے کو نہیں ٹالتا تھا۔ مگر وہ کبھی کسی کی برائی بادشاہ سے نہیں کرتا تھا

[1] ایک سکہ نقرہ جسکی قیمت آجکل کے انگریزی پانچ چھ آنہ کے برابر ہوتی تھی۔

ہر کہ شہ آن کند کہ او گوید حیف باشد کہ جز نکو گوید

اس پر بھی اسکا فریق مخالف ہمیشہ اسکی بربادی کی فکر میں رہتا تھا حسد بُری چیز ہے جوں جوں خواجہ کی عزت و عظمت میں اضافہ ہوتا وہ وں وں مخالفین کی آتش بغض و عناد شعلہ زن ہوتی۔

جب نصف النہار کے وقت نیر فیروز اپنے منتہائے عروج کو پہنچ چکتا ہے تو اسی وقت سے اسکا زوال شروع ہوجاتا ہے یہاں تک کہ قریب شام اسکی حرارت سرد اور چہرہ زرد پڑجاتا ہے اور وہ شرم کے مارے منہ چھپا لیتا ہے جب ہلال ترقی کرتے کرتے بدر کامل بنجاتا ہے تو اسکے نقصان کا زمانہ آتا ہے اور وہی ماہ نیم ماہ جسکی ضیا دنیا کی فضا کو پُرنور کردیتی ہے کاہیدہ ہوتے ہوتے ایکدن غائب ہوجاتا ہے۔ ہر کمالے را زوالے! یہ قدرت کا ایک قانون معینہ ہے اسی قانون معینہ کے مطابق جب خواجہ خجستہ خصال و فرخندہ مآل کا نیر اقبال بفضل خداوند لایزال و خالق ذوالجلال اپنے حد کمال کو پہنچ چکا تو اسکے زوال و ملال کا وقت آیا۔ اسکے مخالفوں نے خدام شاہی کو ملاکر انسے کہا کہ وقتاً فوقتاً خواجہ گاواں کی شکایتیں بادشاہ سے کیا کرو اور اسکی طرف سے خوب اسکے کان بھرا کرو انہوں نے ایسا ہی کیا مگر بادشاہ کے اوپر خواجہ کا کچھ ایسا اثر تھا کہ وہ انکی باتوں پر بالکل کان نہیں دیتا تھا جب یہ تیر تدبیر ہدف مقصد پر نہ پہنچا تو دشمنوں نے ایک مشورہ کیا کہ آجکل اچھا موقعہ ہے یوسف عادلخاں موجود نہیں ہے۔ نرسنگہ کے تعاقب میں گیا ہوا ہے اسکے آنیسے پیشتر اس خار کو پہلو سے نکال دینا چاہیئے اسوقت بادشاہ کوندپور پلی میں مقیم تھا جہاں خواجہ کے ہواخواہ بہت کم تھے۔

اس جلسہ مشاورت میں جو بات طے ہوئی تھی اس کے مطابق ظریف الملک دکنی اور مفتاح حبشی نے جو فریق ملکی کے سرگرم رکن اور ملک حسن نظام الملک کے خاص آدمی تھے خواجہ کے ایک حبشی غلام سے جسکے پاس اسکی مہر رہتی تھی دوستی پیدا کی اسکو زر و جواہر و امتعۂ لطیفہ و اقمشۂ نظیفہ اور عمدہ عمدہ عربی گھوڑے دیکر اپنا زیر بار احسان کرلیا۔ یہ دونوں بادشاہی غلام تھے مگر خواجہ کی عنایت و مہربانی کے سبب سے ترقی کرکے منصب امارت پر پہنچ گئے تھے۔ ایک دن اس غلام نافرجام و بدانجام و زشت کام کو جبکہ وہ مجلس شراب وکباب میں نشۂ بادۂ سرجوش سے مدہوش تھا ظریف الملک دکنی اور مفتاح حبشی نے ایک سادہ کاغذ لپیٹ کر دکھایا اور کہا کہ یہ ہمارے ایک دوست کی براتٌ ہے اس پر اور سب افسروں کے تو دستخط ہوگئے ہیں مگر خواجہ کی مہر ابھی نہیں ہوئی اگر تم اسکی مہر لگادو تو تمہاری بڑی مہربانی ہوگی ایک ضرورتمند کا کام نکل جائیگا اور ہم بھی تمہاری اس مکرمت بیقیاس کے منت شناس ہونگے۔ اس خرمیخوار و ناہنجار و زبوں کار نے کہ نشہ میں سرشار تھا نہ تو کاغذ کو پڑھا نہ کھول کر دیکھا خواجہ کی مہر جہاں انہوں نے بتائی وہاں اس پر لگادی۔

وہ دونوں اس کاغذ کو لیکر رات کے وقت ملک حسن کے پاس پہنچے اور اس سے سب حال کہا۔ وہاں مشورے سے اس پر خواجہ کی طرف سے ایک خط رائے اڑیسہ کے نام اس مضمون کا لکھا گیا کہ "سلطان محمد شاہ بڑا ظالم و جابر ہے شراب بہت پیتا ہے ہر وقت نشے میں رہتا ہے ہم لوگ اس سے بیزار ہیں۔ اگر آپ تھوڑی سی فوج بھی لیکر اس طرف آئیں تو مملکت بہمنی مسخر ہوجائیگی کیونکہ راجمندری میں اور اس طرف کی سرحد پر کہیں کوئی قابل سردار موجود نہیں ہے جبوقت آپ ولایت دکن کی حدود میں قدم رکھیں گے اسیوقت

ٌ کاغذ زر جس کے ذریعہ سے خزانۂ سرکاری سے روپیہ وصول ہوتا ہے۔

میں اور بہت سے لشکر جو میرے زیر اثر ہیں ہر طرف سے یورش کر دینگے اور محمد شاہ کو دفع کر کے اسکی سلطنت کو بحصۂ مساوی باہم تقسیم کر لیں گے۔

دوسرے دن ۵ صفر ۸۸۶ھ مطابق ۵ اپریل ۱۴۸۱ء کو ظریف الملک اور مفتاح نے وہ خط ایسے وقت بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا جب کہ ملک حسن اسکے پاس موجود تھا۔ بادشاہ خواجہ کی مہر کو پہچانتا تھا خط کو دیکھ کر سراسیمہ ہو گیا۔ ملک حسن نے موقعہ پاکر خواجہ کے خلاف بہت سی باتیں کہیں بادشاہ کو اتنا غصہ آیا کہ آپے سے باہر ہو گیا اور خط کے متعلق تفتیش و تحقیق کئے بغیر خواجہ کو طلب کیا۔ اُس کے مقربین کو اس فتنہ کی اطلاع ہوئی تو اُنہوں نے اسکو مطلع کیا کہ اسوقت بادشاہ کے سامنے جانا مناسب نہیں ہے۔ کسی حیلہ سے ٹال دیا جائے۔ خواجہ نے یہ شعر جو اُن ایام میں اسکے ورد زبان تھا پڑھا۔

چوں شہید عشق رود نیا دعقبے سرخرو ست    خوش دمے باشد کہ مارا کشتہ زیں میدان کند

اور داڑھی کو ہاتھ لگا کر کہا کہ یہ داڑھی جو علاء الدین شاہ اور ہمایوں شاہ کی خدمت میں سفید ہوئی ہے۔ اگر ان کے فرزند کے ہاتھ سے سرخ ہو تو موجب سرخروئی ہے۔ قسمت کا لکھا اٹل ہے اور قضا سے بچنا ممکن نہیں اتنے میں چند امرائے کبار نے جو خواجہ کے تابعین میں سے تھے اپنے معتمدین کے ہاتھ اس کو کہلا کر بھیجا کہ ہم نے بڑی وحشت خیز خبر سنی ہے آپ کے خاصے کے ہزار سوار موجود ہیں۔ اگر آپ ان کے ساتھ گجرات کو سوار ہو جائیں تو بہتر ہے۔ ہم بھی ہمرکاب چلنے کو تیار ہیں اس نے جواب دیا کہ میں نے اپنی عمر کا بڑا حصہ دولت بہمنی کی خدمت میں گذارا ہے۔ اس عرصہ میں مجھ سے کوئی خطا سرزد نہیں ہوئی محض دشمنوں کی تہمت کے سبب سے بادشاہ مجھکو بے وفا نہیں سمجھے گا۔ اور اگر قصوروار سمجھکر سیاست کرے تو بھی میرے نزدیک غداری سے جاں سپاری بہتر ہے۔

خواجہ بادشاہ کی خدمت میں پہنچا تو بادشاہ نے اس سے کہا کہ اگر کوئی شخص اپنے ولی نعمت سے بلا وجہ بیوفائی کرے اور وہ پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے تو اس کی کیا سزا ہے۔ اُس نے جواب دیا کہ جو بدبخت اپنے آقا سے نمک حرامی کرے اور وہ ثابت ہو جائے تو اسکی سزا سوائے شمشیر آبدار کے اور کچھ نہیں۔ بادشاہ نے وہ خط دکھایا خواجہ نے کہا "سُبحانک ہٰذا بُہتانٌ عظیم" اور عرض کیا مہر تو بیشک میری ہے مگر مکتوب میرا نہیں ہے۔ نہ مجھکو اسکے متعلق کچھ علم ہے بڑی تہمت کہا میں اور یہ قطعہ پڑھا

بخدائے کہ جوہر امرش    اہل معنی بجزن دل سفتند
کہ چو بہتان یوسف دگر است    انچہ از بندہ دشمناں گفتند

خواجہ نے بادشاہ کو اپنی بے گناہی کا بہت یقین دلایا۔ مگر وہ نشۂ شراب میں چور اور سکرے سے مخمور تھا کچھ اثر نہ ہوا بلکہ اور زیادہ قہر آلود و غضبناک ہو کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور حالت غیظ و غضب میں جوہر حبشی کو اسکے قتل کرنیکا حکم دیا خواجہ نے کہا کہ میں ضعف و پیری کے سبب سے خود مرنیکے قریب ہوں میرا قتل کرنا بہت آسان ہے۔ مگر اس سے سلطنت کی بربادی اور حضور کی بدنامی ہوگی۔ محمد شاہ نے اسکی بات نہ سنی اور بغیر کچھ جواب دئے حرم سرائے میں چلا گیا۔

کوتہ اندیش اور جلد باز بادشاہ نے یہ اس شخص کے قتل کا حکم دیا ہے۔ جسنے بڑی محبت و شفقت سے اسکو اپنی

گودوں میں کھلایا تھا بہت محنت و مشقت سے اسکی تربیت کی تھی۔ اپنی اٹھتر برس کی عمر میں سے پینتیس برس بڑی جاں نثاری و وفاداری کے ساتھ دولت تیموری کی خدمتگذاری میں گذارے تھے اور اسکو ایک معمولی حالت سے ترقی دیکر اعلیٰ درجہ پر پہنچایا تھا اس واقعہ سے چند روز پیشتر خواجہ نے محمد شاہ کی مدح میں بڑے خلوص و عقیدت سے ایک قصیدہ کہا تھا۔ جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

تیغ تو آب حیواں مردم ز حسرت آں　　　آں بعہد من شد آب حیات قاتل

بادشاہ کے اس حکم سے ایک سناٹا چھا گیا۔ در و دیوار سے مایوسی برسنے لگی جوہر شمشیر جوہردار کو بے نیام کر کے آمادۂ قتل ہوا۔ خواجہ نے قبلہ کی طرف منہ کیا اور دو زانو بیٹھ کر کہا "لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ" جلاد نے تلوار اٹھائی تو خواجہ کی زبان سے نکلا: "الحمد للہ علی نعمۃ الشہادۃ" اور ایک ہی ضرب کے ساتھ خاک و خون میں تڑپ کر جان دیدی۔

# گل و خار

(از جناب محمد شرف الدین یکتا جودھ پوری)

کہا اک پھول نے کانٹے سے اک دن　　کہ میں ہوں رونق گلزارِ دوراں
ہے قائم مجھ سے زینت بوستاں کی　　مرے دم سے گلستاں ہے گلستاں
عیاں ہے مجھ سے فطرت کا تبسم　　کسی کا ہوں میں رخسار درخشاں
صبا مجھ کو افق تابی سے پہلے　　جگاتی ہے پکڑ کر میرا داماں
ذرا سا لیکے پھر شبنم سے پانی　　دُھلاتی ہے میرا مُنہ صبح خنداں
پرپرد کرتے ہیں نظارہ میرا　　ہوں میں ہی سجدہ گاہِ ماہرویاں
ہو خالی مجھ سے گر یہ باغ ہستی　　تو ہو صبح چمن شام غریباں
مگر او بے خبر کم مایہ کانٹے!　　تری ہستی بھی کچھ ہستی ہے ناداں!
نہ تجھ میں حُسن کی ادنیٰ جھلک ہے　　نہ تجھ میں دل کشی کا کوئی ساماں
حسینوں کی نظر بچتی ہے تجھ سے　　ترے دیدار میں وحشت ہے پنہاں
تری منحوس صورت داغ ہے اک　　برائے صفحۂ رنگین بستاں
غرض یہ ہے کہ تو بارِ چمن ہے　　نہ ہونا تیرا تھا گلشن پہ احساں
تو ہی کہدے کہ خوبی تجھ میں کیا ہے　　کہ ہے جسکی بنا پر اتنا ناداں
سُنی جب خار نے یہ گل کی باتیں　　ہنسی لب پر ہوئی اسکے نمایاں
کہی بس پھول سے یہ ایک ہی بات　　"بہ پیری می رسد خار بیاباں"

# آسمانی سوار

از جناب منشی کنھیا لال۔ ایم۔ اے۔ ایل ایل بی۔ ایڈوکیٹ الہ آباد

**سین**۔ ایک بندرگاہ میں دریا کا کنارہ ہے۔ چند کھمبے اور زنجیریں پڑی ہوئی ہیں۔ ایک ستون بنا ہوا ہے۔ تین پولیس کے جوان داخل ہوتے ہیں۔ چاندنی رات ہے۔ سرجنٹ جو دونوں جوانوں سے سن رسیدہ ہے۔ اسٹیج کے داہنے جانب جاتا ہے اور نیچے زینہ کو دیکھتا ہے دوسرے جوان گوند کا برش زمین پر رکھکر اشتہاروں کا ایک بلندہ کھولتے ہیں۔

**پہلا سپاہی**۔ اشتہار لگانے کے لئے تو یہ بہت عمدہ جگہ ہوگی (ستون کی طرف اشارہ کرتا ہے)

**دوسرا سپاہی**۔ دریافت کرو (سرجنٹ کو آواز دیتا ہے) اشتہار لگانے کے لئے یہ جگہ مناسب ہوگی نا

(جواب ندارد)

**پہلا سپاہی**۔ ہم اس ستون میں اشتہار لگا دیں؟

(جواب ندارد)

**سرجنٹ**۔ یہاں تو بہت سی سیڑھیاں بنی ہیں جو پانی تک چلی گئی ہیں۔ یہ ایسی جگہ ہے جس کی پوری نگرانی کرنی چاہیئے۔ اگر وہ یہاں آ جائے تو اُس کے دوست اُس کے لئے کشتی کا انتظام کر سکتے ہیں جو باہر کی طرف سے بآسانی اندر آ سکتی ہے۔

**پہلا سپاہی**۔ اشتہار چسپاں کرنے کے لئے یہ ستون ٹھیک ہے نا؟

**سرجنٹ**۔ ٹھیک ہے، لگا دو۔

(دونوں اشتہار لگاتے ہیں)

**سرجنٹ**۔ (اس کو پڑھتے ہوئے) سیاہ بال، سیاہ آنکھیں صاف ہموار چہرہ، پانچ فٹ پانچ انچ قد۔ حلیہ سے تو کوئی ایسی بات نہیں پائی جاتی۔ افسوس کہ پہلے مجھے کبھی دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا۔ لوگوں کا بیان ہے کہ وہ بہت حیرت انگیز انسان ہے۔ نئی نئی ترکیبیں ایجاد کیا کرتا ہے جس ترکیب سے بازی لے گیا ہے آئرلینڈ میں تو اس کا ثانی پیدا نہیں، اس کامیابی میں ہونہ ہو اُسکے دوستوں کا بھی ہاتھ ضرور ہے۔

**پہلا سپاہی**۔ ایسے شخص کی گرفتاری کے لئے تو سو پونڈ انعام بہت کم ہے۔ آپ ہر شخص کو یقین دلا دیں کہ جو اُس کو گرفتار کریگا اُس کی ترقی بھی کی جائیگی۔

**سرجنٹ**۔ میں خود اس جگہ کی نگرانی کروں گا۔ وہ اس راستے سے آ جائے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ وہ پھسلتا ہوا اُس مقام پر آ سکتا ہے (دریا کے کنارے کی طرف اشارہ کرتا ہے) اور اُس کے دوست اُس جگہ اُس کے منتظر رہ سکتے ہیں (زینے کے نیچے اشارہ کرتا ہے) اگر وہ یہاں سے بچ گیا تو پھر اُس کا ہاتھ آنا مشکل ہے اور کیا عجب ہے کہ وہ اپنے دوستوں کے ہمراہ کشتی میں موجود ہو لیکن مجھ غریب کا مدد کرنے والا کوئی نہیں۔

**دوسرا سپاہی**۔ اور اگر ہم نے گرفتار بھی کر لیا تو ملیگا کیا۔ کچھ بھی نہیں۔ لوگوں کی گالیاں اور کیا عجب

کہ ہمارے رشتہ دار ہی ہیں۔ اچھا کہیں۔

**سرجنٹ۔** کچھ بھی ہو ہم کو اپنا فرض ادا کرنا ہے، قانون اور علم کی پابندی کرنے کی وجہ سے کیا اہلِ ملک ہم پر اعتبار نہیں کرتے ہیں۔ وہ زمانہ بہت جلد آئے گا کہ جو لوگ ذلیل اور کم حیثیت ہیں معراجِ ترقی پر قدم رکھیں گے اور جو اپنی شان میں پھولے ہوئے ہیں اُن کو ذلیل ہونا پڑیگا۔ اچھا اب جلدی کرو۔ ابھی بہت سے مقامات پر اشتہار لگانا ہے اور کام ختم کرنے کے بعد میرے پاس واپس آؤ۔ لالٹین لیو اب دیر نہ کرو۔ اس جگہ سناٹا بہت ہے اور بجز چاند کے کچھ نظر نہیں آرہا ہے۔

**پہلا سپاہی۔** افسوس، ہم لوگ آپ کے ساتھ یہاں ٹھیر نہیں سکتے۔ ایسے ایسے مقامات پر پہرہ دینے کے لئے ہم مقرر کئے جائیں گے تو گورنمنٹ کو شہر کے انتظام کے لئے باہر کی پولیس کی امداد لینی پڑجائے گی۔ اچھا خدا حافظ۔ اس محنت کا خدا کرے تم کو نیک پھل دے۔

(دونوں چلے جاتے ہیں)

**سرجنٹ۔** (دو ایک مرتبہ اِدھر اُدھر ٹہلتا ہے اور اس کے بعد اشتہار کی طرف دیکھتا ہے) سو پونڈ اور ترقی۔ یہ سو پونڈ حاصل کرنے کے لئے سخت محنت کرنی ہوگی۔ اور یہ قابلِ افسوس بات ہے کہ ایماندار لوگ ہرگز نہیں حاصل کر سکتے ہیں۔

(ایک آدمی پھٹے پرانے کپڑے پہنے بائیں جانب سے آتا ہے اور گذرنے کی کوشش کرتا ہے کہ سرجنٹ گھوم پڑتا ہے۔)

**سرجنٹ۔** تم کہاں جارہے ہو؟

**آدمی۔** ایک غریب گویا ہوں سرکار (ستاروں کا بنڈل دکھلاکر) اور ان میں سے چند ملاحوں کے ہاتھ بیچنا چاہتا ہوں۔

(وہ آگے بڑھتا ہے)

**سرجنٹ۔** ٹھہرو کیا میں نے تم سے ٹھہرنے کیلئے نہیں کہا تم وہاں نہیں جاسکتے۔

**آدمی۔** بہت اچھا حضور۔ افسوس غریب ہونا بڑی مصیبت ہے۔ دنیا میں ان کا کوئی ساتھی نہیں۔

**سرجنٹ۔** تم کون ہو؟

**آدمی۔** اگر میں نے بتلا دیا تو میری ہی طرح آپ بھی عقلمندی کا ثبوت دیں گے مگر کچھ پرواہ نہیں میں ہوں جیمی والش ایک مشہور گویا۔

**سرجنٹ۔** جیمی والش؟ میں اس نام سے واقف نہیں۔

**آدمی۔** اینس میں مجھ کو سب لوگ جانتے ہیں۔ آپ کو کبھی اینس جانے کا اتفاق ہوا ہے؟

**سرجنٹ۔** تم یہاں کیسے آئے؟

**آدمی۔** کچہری میں کچھ پیسے پیدا کرنے کے لئے ججوں کے ساتھ ہی تو گاڑی میں بیٹھ کر آیا ہوں۔

**سرجنٹ۔** اچھا اگر تم اتنی دور آگئے ہو تو یہاں نہ ٹھیرو بلکہ اور دور نکل جاؤ۔

**آدمی۔** جہاں جارہا تھا چلا جاؤنگا۔

(زینے کی طرف جاتا ہے)

**سرجنٹ۔** وہاں سے واپس آؤ۔ کسی کو آج رات میں سیڑھیوں پر سے گذرنے کی اجازت نہیں ہے۔

**آدمی۔** ملاحوں کو دیکھنے کے لئے میں زینے کے اوپر ہی بیٹھوں گا۔ آپ اطمینان رکھیں، شاید کوئی

ستار وغیرہ خرید کرے جس سے کھانے کے لئے کچھ پیسے مل جائیں۔ وہ جہاز پر بہت رات گئے جاتے ہیں، میں نے اکثر اُن کو کارک سے دریا کے کنارے آتے ہوئے دیکھا ہے۔

**سرجنٹ۔** اچھا یہاں سے چلو۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی شخص آج رات میں اس مقام کے ارد گرد ٹہلتا نظر آئے۔

**آدمی۔** بہتر ہے میں چلا جاتا ہوں۔ غریبوں کی جان کو سینکڑوں عذاب ہیں ان کی زندگی بڑی مشکل سے گذرتی ہے۔

**سرجنٹ۔** چلو چلو یہاں سے۔

**آدمی۔** ذرا صبر کیجئے اور سنیئے تو۔

(گاتا ہے)

**سرجنٹ۔** خاموش رہو، شور نہ مچاؤ۔

(اپنے ستاروں کو باندھتا ہے اور زینے کی طرف جاتا ہے۔)

**سرجنٹ۔** تم کہاں جا رہے ہو؟

**آدمی۔** آپ ہی نے تو مجھ سے جانے کے لئے کہا میں چلا جا رہا ہوں۔

**سرجنٹ۔** بیوقوف نہ بنو۔ میں نے شہر میں واپس جانے کے لئے کہا ہے اس طرف نہیں۔

**آدمی۔** شہر کو واپس۔ اچھا یہ بات۔

**سرجنٹ۔** (اس کا شانہ پکڑ کر اور سامنے کی طرف دکھلاکر) یہ راستہ ہے۔ اس طرف جاؤ۔ چلو لمبے ہو۔ ہیں، اب کیوں ٹھیرے ہو؟

**آدمی۔** (نوٹس کو دیکھ کر اور اس کی طرف اشارہ کر کے) سرجنٹ صاحب آپ جس انتظار میں ہیں مجھے معلوم ہو گیا۔

**سرجنٹ۔** پھر تم کو کیا؟

**آدمی۔** میں اس آدمی کو جانتا ہوں خوب اچھی طرح۔ لو میں چلا جاتا ہوں۔

(جاتا ہے)

**سرجنٹ۔** تم اس کو جانتے ہو؟ واپس آؤ واپس۔ وہ کس قسم کا آدمی ہے؟

**آدمی۔** میں واپس آؤں؟ کیا آپ میری جان لینا چاہتے ہیں۔

**سرجنٹ۔** تم بکتے کیا ہو؟

**آدمی۔** خیر، میں جا رہا ہوں۔ اگر انعام اس کا دس گنا ہو تو بھی میری جوتیوں کو پرواہ نہیں ہے۔

(اسٹیج کے دوسری طرف جاتا ہے)

**سرجنٹ۔** (اس کے پیچھے جھپٹتے ہوئے) واپس آؤ واپس آؤ۔ (پکڑ کر پیچھے گھسیٹتا ہے) وہ کیسا آدمی ہے؟ تم نے اُسکو کہاں دیکھا ہے؟

**آدمی۔** جہاں رہتا ہوں وہیں دیکھا ہے۔ اُس کے پھیر میں نہ پڑو۔ دیکھو گے تو پتلون ڈھیلی ہو جائیگی۔ دنیا میں کوئی ہتھیار نہیں جس کا استعمال وہ نہ جانتا ہو اور اُس کی طاقت کا کیا کہنا ہے۔ پٹھے تو ایسے سخت ہیں جیسے یہ ستون (ستون کو تھپتھپا کر)

**سرجنٹ۔** وہ اتنا خطرناک ہے؟

**آدمی۔** پھر اور کیا۔

**سرجنٹ۔** سچ کہتے ہو؟

**آدمی۔** میری ہی طرح ایک غریب آدمی تھا جس نے ایک سرجنٹ کو ایک بہت بڑے پتھر سے مارا تھا۔

**سرجنٹ۔** میں نے کبھی نہیں سُنا۔

**آدمی**۔ نہ سنا ہوگا۔ ساری باتیں تھوڑا ہی اخبار میں چھپتی ہیں۔ پولیس کا ایک جوان ہی تو سادے لباس میں موجود تھا۔۔ لیمرک کا واقعہ تو نے۔۔۔۔ کلانالک میں پولیس بارک پر حملہ کے تھوڑی ہی دیر بعد۔۔۔۔ چاندنی نکلی تھی۔۔۔ بالکل آج ہی کی طرح ۔۔۔۔۔ دریا کا کنارہ تھا۔۔۔ بالکل غفلت کی حالت میں۔

**سرجنٹ**۔ واقعی؟ اگر ایسا ہے تو یہ بہت خطرناک ملک ہے۔

**آدمی**۔ ہاں۔ فرض کرو تم کھڑے ہوئے اس طرف دیکھ رہے ہو اور سوچ رہے ہو کہ وہ اس طرف سے آئیگا (اشارہ کرتا ہے) اور وہ اس دوسری طرف سے آکر (اشارہ کرتا ہے) اچانک تمہارے سر پہ پہونچ جائے۔

**سرجنٹ**۔ ایسے آدمی سے مقابلے کے لئے تو پولیس کی پوری جماعت کو اس جگہ تعینات کرنا چاہئیے۔

**آدمی**۔ اچھا اگر تم مجھ کو روکتے ہو تو میں اس ستون پہ چڑھ جاتا ہوں اور بیٹھ کر اس طرف دیکھتا ہوں۔

**سرجنٹ**۔ تم اس کو بخوبی پہچانتے ہونا؟

**آدمی**۔ ایک میل کے فاصلے پر دیکھ کر پہچان لوں گا۔

**سرجنٹ**۔ لیکن انعام میں تو حصہ نہ لگاؤ گے؟

**آدمی**۔ کیا یہ بھی میرے ہی طرح غریب ہے جو سڑکوں اور میلوں میں دو دو چار چار پیسے کے لئے گاتا پھرتا ہے؟۔ معلوم ہوا تم کو میری ضرورت نہیں ہے۔ شہر میں یہاں سے زیادہ محفوظ رہونگا۔

**سرجنٹ**۔ اچھا ٹھیرو۔

**آدمی**۔ (ستون پر چڑھ کر) تعجب معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح سے ٹہلتے ٹہلتے آپ تھکے نہیں۔

**سرجنٹ**۔ تھک جاؤں گا تو میں بھی اسی پر بیٹھ جاؤں گا۔

**آدمی**۔ ممکن ہے آج رات میں آپ کو بہت سخت کام انجام دینا پڑے تو جس قدر آرام مل سکے آرام لیجئے۔ اس ستون پر جگہ بہت کافی ہے اور جب آپ بلندی پر ہوں گے تو دور تک دیکھ سکیں گے۔

**سرجنٹ**۔ ٹھیک تو کہتے ہو۔ (ستون پر چڑھتا ہے۔ دونوں پیٹھ ملا کر بیٹھتے ہیں اور مختلف سمت دیکھتے ہیں) تم نے اپنی باتوں سے مجھے کچھ حیرت زدہ کر دیا۔

**آدمی**۔ سرجنٹ صاحب ایک دیا سلائی تو دیجئے۔ (وہ دیا سلائی دیتا ہے اور آدمی پائپ جلاتا ہے۔) ایک کش آپ بھی تو لیجئے۔ اس سے کچھ سکون ہو جائے گا۔ ٹھیرو میں دیتا ہوں۔ سر نہ پھیرنا۔ جان کی خیر چاہتے ہو تو دریا کے کنارے سے نظر نہ ہٹے۔

**سرجنٹ**۔ ڈرو مت۔ کوئی بات نہیں (پائپ جلاتا ہے اور دونوں پیتے ہیں) یہ کام بہت سخت ہے رات بھر مارے مارے پھرنا اور اسکا تو کچھ خیال نہیں خواہ ہماری جان سولی ہی پر کیوں نہو اور ہم کو جو صلہ ملتا ہے وہ لوگوں کی گالیاں ہیں۔ اپنی مرضی تو کوئی چیز نہیں بس جو حکم دیدیا گیا وہ

اٹل ہے اگر سر پر کوئی مصیبت آن پڑے تو کوئی پُرسانِ حال نہیں۔

(آدمی گاتا ہے)

**سارجنٹ**۔ چپ بھی رہو۔ یہ گانے کا وقت نہیں ہے۔

**آدمی**۔ آہ سارجنٹ صاحب۔ میں اپنا دل بڑھانے کے لئے گا رہا ہوں۔ جب اس کا خیال آتا ہے تو دل بیٹھ جاتا ہے کہ ہم دونوں یہاں بیٹھے ہیں دوسری طرف سے آکر کہیں چڑھ نہ بیٹھے۔

**سارجنٹ**۔ اچھی طرح دیکھ رہے ہو نا؟

**آدمی**۔ دیکھ رہا ہوں لیکن مفت، انعام و اکرام کچھ بھی نہیں۔ میں بھی اچھا خاصا بیوقوف ہوں لیکن کسی کو مصیبت میں مبتلا دیکھ کر بچانے کی کوشش کرنا ہر انسان کا فرض ہے۔ اور میں ایسی حالت میں ضرور حصہ لیتا ہوں۔ ہیں یہ کیا۔ میرے کوئی چیز لگی ہے۔

(سینہ ملتا ہے)

**سارجنٹ**۔ (اس کا شانہ تھپتھپا کر) گھبراؤ نہیں۔ عاقبت میں اس کا صلہ ملے گا۔

**آدمی**۔ سب کچھ جانتا ہوں۔ لیکن جان بہت پیاری ہے۔

**سارجنٹ**۔ اچھا، گانے سے تمہارے دل کو تقویت ہوتی ہے تو گاؤ۔

(آدمی گاتا ہے)

**سارجنٹ**۔ یہ اس طرح سے نہیں ہے۔ تم گاتے گاتے بھول گئے۔

**آدمی**۔ ہاں ہاں سارجنٹ صاحب بیشک میں بھول گیا (پھر اُس کو دُہراتا ہے) لیکن سارجنٹ صاحب معلوم ہوا کہ آپ بھی گانے سے واقف ہیں۔

**سارجنٹ**۔ انسان کو بہت سی باتیں معلوم ہوتی ہیں لیکن اُن سے کام نہیں پڑتا۔

**آدمی**۔ اب تو میں کہہ سکتا ہوں کہ تم اپنے لڑکپن میں اسی طرح دیوار پر چڑھ کر بیٹھا کرتے تھے اور تمہارے پاس اور بھی لڑکے بیٹھے ہوتے تھے اور تم غزلیں گایا کرتے تھے۔

**سارجنٹ**۔ تم صحیح کہتے ہو، میں ایسا کرتا تھا۔

**آدمی**۔ اور کچھ بھی؟

**سارجنٹ**۔ ہاں۔

**آدمی**۔ اور دادرا؟

**سارجنٹ**۔ دادرا بھی گایا کرتا تھا۔

**آدمی**۔ اور ممکن ہے جس آدمی کی تاک میں تم آج رات کو بیٹھے ہو وہ بھی اُنہیں لڑکوں میں سے ہو جو بچپن میں تمہارے ساتھ دیوار پر بیٹھکر گایا کرتے تھے ...... ہا دنیا بھی عجیب جگہ ہے۔

**سارجنٹ**۔ ہشت ...... چپ ...... کوئی چیز آتی ہوئی دکھائی دے رہی ہے ...... اونہہ کُتا ہے۔

**آدمی**۔ آپ کی کیا رائے ہے۔ دُنیا عبرت کی جگہ نہیں ہے؟ ...... ممکن ہے یہ انہیں لڑکوں میں سے کوئی ہو جو آپ کے ساتھ گایا کرتے تھے۔ اب آج پاگل اُس کو گرفتار کر کے آپ جیل میں ڈالدیں گے ......

**سارجنٹ**۔ بیشک تم سچ کہتے ہو۔

**آدمی**۔ اور کیا یہ ممکن نہیں ہو سکتا کہ گانا دانا ختم

ہونے کے بعد لڑکے تم سے ملک آزاد کرانے کی سازش میں شریک ہونے کے لئے کہیں جس کی اُن لوگوں نے پہلے تیاری کر رکھی ہو۔ اور تم اُس کو منظور کرلو اور پھر بعد میں تم کسی آفت میں پھنس جاؤ۔

سرجنٹ۔ یہ باتیں قرین قیاس ہیں اس زمانے میں میرے سینہ کے اندر ایک پُرجوش دل تھا۔

آدمی۔ واہ ری دُنیا تو کیسی عجیب چیز ہے۔ ماں جب اپنے ننھے بچے کو زمین پر رینگتے ہوئے دیکھتی ہے تو وہ نہیں جانتی کہ اُس کا پیارا بچہ جوان ہوکر جب دنیا کے اسٹیج پر قدم رکھیگا تو اس کی زندگی میں کیا کیا واقعات پیش آئیں گے اور اُس کا کیا انجام ہوگا۔

سرجنٹ۔ یہ ایک عجیب خیال ہے اور سچا خیال اچھا ٹھیرو ذرا میں بھی تو غور کر دں ......

.... اگر میں فوج میں ملازمت نہ کرتا۔ میری شادی نہ ہوتی۔ گھر بار کا مجھے خیال نہ ہوتا اور میں خود اس فعل کا مرتکب ہوتا اور اندھیرے میں چھپنے کی کوشش کرتا۔ وہ شخص میری جگہ اس ستون پر میری تاک میں بیٹھا ہوتا اور میں اُس سے بچنے کے لئے بھاگنے کی کوشش میں رینگتا ہوا اس طرف آتا وہ قانون برتتا اور میں اس کی خلاف ورزی کرتا اور اُس کے سر میں گولی مارنے کی کوشش کرتا یا پتھر مار کر لیمپ کو توڑ دیتا جیسا کہ تم نے بیان کیا تھا....

..... آہ (ہانپتا ہے، ذرا توقف کے بعد) یہ کیا معاملہ ہے؟ (آدمی کا بازو پکڑ لیتا ہے)

آدمی۔ (ستون پر سے کود پڑتا ہے اور پانی کی طرف دیکھکر کہتا ہے) کچھ نہیں ہے۔

سرجنٹ۔ غالباً کشتی ہوگی۔ میرے خیال میں اُس کے دوست کشتی لیکر دریا کے کنارے آئے ہوں گے۔

آدمی۔ سرجنٹ صاحب، میں سوچ رہا ہوں کہ جوانی میں جب آپ کا لوگوں سے ساتھ پڑا ہوگا تو اُس وقت قانون والوں کا خیال نہ آتا رہا ہوگا۔

سرجنٹ۔ اُس وقت میں بیوقوف تھا اب وہ زمانہ گیا۔

آدمی۔ اور سرجنٹ صاحب یہ بھی ممکن ہوسکتا ہے کہ باوجود اس وردی پیٹی کے بعض وقت اُس شخص کے قدم بقدم چلنے کا آپ کے دل میں خیال آتا ہو۔

سرجنٹ۔ جو کچھ میں سوچتا ہوں اس سے تمہیں کوئی سروکار نہیں۔

آدمی۔ ممکن ہے ابھی تک آپ ملک کے طرفدار ہوں۔

سرجنٹ۔ ستون سے اُتر کر مجھ سے ایسی باتیں نہ کرو۔ مجھ کو اپنا فرض ادا کرنا ہے اور میں سب کچھ جانتا ہوں (چاروں طرف دیکھتا ہے) وہ کشتی ہے پتوار کی آواز آرہی ہے۔

(زینے کی طرف جاتا ہے اور نیچے دریا میں دیکھتا ہے)

آدمی۔ (گاتا ہے)

سرجنٹ۔ خاموش رہو خاموش۔ میں کہتا ہوں سنتے نہیں۔

آدمی۔ (اور زور سے چلا کر گاتا ہے)

سرجنٹ۔ اگر تم چپ نہ ہوگے تو میں گرفتار کرلوں گا۔

(گانے کا جواب نیچے سے سیٹی کے ذریعہ دیا جاتا ہے)

**سرجنٹ۔** یہ اشارہ ہے (آدمی اور زینے کے درمیان کھڑا ہو جاتا ہے) خبردار اس راستے سے نہ جانا ..... پیچھے ہٹو ..... تم کون ہو؟ ... تم گونگے نہیں ہو۔

**آدمی۔** پوچھنے کی ضرورت نہیں ہیں کون ہوں۔ یہ اشتہار خود بتا دے گا۔

(اشتہار کی طرف اشارہ کرتا ہے۔)

**سرجنٹ۔** تم وہی شخص ہو جس کا مجھے انتظار ہے۔

**آدمی۔** (ٹوپی اور مصنوعی بال اُتار دیتا ہے سرجنٹ اُن کو لے لیتا ہے) میں ہوں جس کے سر کیلئے سو پونڈ انعام مقرر ہے لو ہاں نیچے کشتی میں میرا ایک دوست موجود ہے۔

**سرجنٹ۔** رحم، رحم۔

**آدمی۔** مجھے جانے دو گے یا میں خود اپنا راستہ پیدا کر لوں۔

**سرجنٹ۔** میں فوجی ہوں تمہیں جانے نہیں دوں گا۔

**آدمی۔** میں زبان ہی سے کام نکالنا چاہتا تھا مگر نہیں مانتے تو خنجر (سینے میں ہاتھ ڈالتا ہے) یہ کیا معاملہ ہے؟۔

**دوسرا سپاہی۔** (باہر سے) جہاں ہم چھوڑ گئے تھے یہی جگہ تو ہے۔

**سرجنٹ۔** یہ میرے ساتھیوں کی آواز ہے وہ آرہے ہیں۔

**آدمی۔** دیکھو دغابازی نہ کرنا۔

(ستون کے پیچھے چھپ جاتا ہے۔)

**پہلے سپاہی کی آواز۔** وہ تو آخری اشتہار تھا۔

**دوسرا سپاہی۔** (جب اندر آتے ہیں) اگر وہ بھاگ گیا ہے تو کسی کو خبر بھی نہ ہوگی۔

(سرجنٹ ٹوپی اور بال اپنے پیچھے چھپا لیتا ہے۔)

**پہلا سپاہی۔** اس راستے سے کوئی آیا تھا؟

**سرجنٹ۔** (تھوڑے توقف کے بعد) کوئی نہیں۔

**پہلا سپاہی۔** کوئی آیا ہی نہیں۔

**سرجنٹ۔** نہیں کوئی نہیں آیا۔

**پہلا سپاہی۔** ہم کو تھانے واپس جانیکا حکم نہیں ملا اس لئے ہم آپ کے ساتھ ٹھہر سکتے ہیں۔

**سرجنٹ۔** بے کار ہے یہاں کوئی کام نہیں ہے۔

**پہلا سپاہی۔** آپ نے واپس آکر نگرانی کرنے کا ہم لوگوں کو حکم دیا تھا۔

**سرجنٹ۔** میں تنہا نگرانی کر لوں گا۔ کوئی اس طرف سے گذرے گا تو تم لوگ اُس سے باتیں کرو گے۔ اور یہاں خاموشی کی ضرورت ہے۔

**پہلا سپاہی۔** بہتر ہے۔ لالٹین چھوڑے جاتے ہیں۔

(اس کو دیتا ہے)

**سرجنٹ۔** نہیں نہیں ضرورت نہیں۔ اپنے ساتھ لیتے جاؤ۔

**پہلا سپاہی۔** آپ کو اس کی ضرورت ہوگی۔ آسمان ابر آلود ہو رہا ہے اور رات تاریک سی ہے۔ میں اس کو یہاں ستون پر رکھے دیتا ہوں۔

(ستون کے پاس جاتا ہے)

**سرجنٹ۔** اس کو اپنے ہمراہ لے جاؤ اور زیادہ باتیں نہ کرو۔

**پہلا سپاہی۔** بہتر ہے۔ مجھے تو آپ کے آرام کا خیال تھا۔ لالٹین جب میرے ہاتھ میں ہوتی ہے تو مجھے بہت خیال رہتا ہے اور جس مقام پر اندھیرا ہوتا ہے لالٹین ہلا ہلا کر دیکھ لیتا ہوں (ہلاتا ہے) اس کو اس طرح ہلا ہلا کر دیکھنے سے بجنسہ وہی صورت پیدا ہوتی ہے جیسے گھر میں لکڑی کے کندے سے بار بار لو اٹھکر گوشہ گوشہ کو روشن کر دیتی ہے۔

(لالٹین کو کبھی سرجنٹ کی طرف ہلاتا ہے اور کبھی ستون کی طرف)

**سرجنٹ۔** (غصہ سے) چلے جاؤ۔ جاؤ دونوں جاؤ اور لالٹین لیتے جاؤ۔

(دونوں چلے جاتے ہیں۔ آدمی ستون کے پیچھے سے نکلکر آتا ہے اور دونوں ایک دوسرے کو کھڑے ہوکر دیکھتے ہیں)

**سرجنٹ۔** تمہیں کس چیز کا انتظار ہے؟۔

**آدمی۔** ٹوپی اور بال۔ امید ہے سردی کی وجہ سے میری موت کے خواہاں نہ ہونگے؟۔

(سرجنٹ ان کو دیدیتا ہے)

**آدمی۔** (زینے کی طرف جاتے ہوئے) اچھا دوست تسلیم عرض کرتا ہوں۔ آج رات تم نے میرے ساتھ بے حد سلوک کیا جس کا میں ممنون ہوں اور انشاء اللہ بہت جلد اس کا معاوضہ ادا کرونگا۔ وہ زمانہ قریب ہے کہ چھوٹے عزت پائیں گے اور بڑے ذلیل ہوں گے ..... جب ہم چاند کے نکلنے کے وقت اپنی اپنی جگہ تبدیل کریں گے۔

(ہاتھ ہلاتا ہے اور غائب ہو جاتا ہے)

**سرجنٹ۔** (حاضرین کی طرف پشت کرکے اشتہار پڑھتے ہوئے) سو پونڈ انعام سو پونڈ (حاضرین جلسہ کی طرف منھ کرکے) مجھے تعجب ہے۔ کیا در اصل میں ایسا ہی بیوقوف ہوں جیسا کہ میرا خیال ہے؟۔

## ڈراپ

---

# حُسنِ اتفاق

از جناب نقی علی یاسمی

چندر بھال جب پہلے پہل الہ آباد میں بدلی ہو کر آئے تو ایک دن بیٹھے بیٹھے اُن کو اپنے زمانہ طالب علمی کا ایک واقعہ یاد آ گیا جس کو وہ ابھی تک بھولے ہوئے تھے لیکن آج جب اُنہوں نے ایک کسان کو ایک سائیکل سوار سے ٹکرا کر گرتے دیکھا تو وہ واقعہ اُن کی نظروں میں پھر گیا اور اُس وقت کی ایک ایک بات اُنکو از سرِ نو یاد آ گئی اور یہ سحر آفریں جُملہ بار بار اُن کے کانوں میں گونجنے لگا "شاید پھر ملاقات ہو" وہ اسی کا وِرد کرنے لگے، اُنہوں نے حساب لگایا کہ اِس واقعہ کو کے دن ہوئے ہیں؟ اُنگلیوں پر شمار کر کے دل میں کہا "پندرہ برس —— اُف پندرہ برس گذر گئے میری زندگی کا وہ دن کتنا خوبصورت تھا میں اُس روز کتنا خوش قسمت تھا جبکہ اُس نے کہا تھا "شاید پھر ملاقات ہو" مجھے یاد ہے اچھی طرح یاد ہے اس نے یہی کہا تھا۔ وہ کون تھی، کیا پھر اُس سے ملاقات ہو سکتی ہے؟"

یہ سوچتے سوچتے چندر بھال گھر پہونچے تو اُن کو متفکر اور اُداس دیکھکر بیوی نے پوچھا "کیا معاملہ ہے؟" اُنہوں نے سُنا ہی نہیں۔ بیوی نے قریب جا کر اُن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر کہا "کیا سوچ رہے ہو کچھ کہو گے بھی؟"

چندر بھال کا نشہ اُتر گیا بولے "ایک پُرانی بات یاد آ گئی تھی تم جانتی ہو میری طالب علمی کا ایک خوشگوار زمانہ یہاں گذرا ہے اس وقت کا مجھے اچھی طرح خیال ہے، آج یکایک ایک بات یاد آ گئی بس وہی سوچ رہا تھا"

"وہ ایسی کونسی بات ہے مجھے بھی تو سُناؤ"

"اس سے تمہارا کوئی تعلق نہیں، تم سنکر کیا کرو گی"

"میں تمہاری ہر ایک بات معلوم کرنا چاہتی ہوں، ابھی تک تو تم نے مجھ سے کوئی بات نہیں چھپائی"

"اور جو چھپانے کی کوئی بات نہیں، ابھی تک میں خود نہ سمجھ سکا کہ وہ کیا واقعہ تھا ذرا سوچ لوں، اسوقت مجھے تنہائی کی ضرورت ہے پھر تم کو پورا واقعہ سُنا دوں گا"

"اچھا تو پہلے کھانا کھا لو"

چندر بھال بغیر کچھ کہے چوکے میں جا بیٹھے، وہ کھانا کھاتے کھاتے سوچ رہے تھے "وہ کتنی خوبصورت تھی اور کس تیزی سے اپنی سکول کی گاڑی سے اُتر کر میرے پاس آئی تھی، حالانکہ اُس کی سہیلیوں نے روکا تھا، سکول کی ملازمہ نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ لیکن اُس نے کہا "چاہے جو ہو

میں اس آدمی کی مدد کرنے لگی اُٹھو ... مدد کو؟

میں اس وقت ... تھا، مجھے اُس دیہاتی کی پیٹھ پر بندھی ہوئی لکڑیوں سے سخت چوٹ آئی تھی، میری سائیکل کہیں پڑی تھی اور کتابیں کہیں، اُس نے کتابوں کو اکٹھا کیا سائیکل اٹھا کر کھمبے کے سہارے کھڑی کی اور مجھ سے پوچھا "کیا چوٹ زیادہ آئی ہے؟"

میں نے یہ ... الفاظ سُن کر آنکھیں کھولیں محض یہ دیکھنے کے لئے کہ یہ جادو بھری کس کی آواز ہے جو میری مدد کرنا چاہتی ہے۔

اگر وہ مدد کو نہ آئی ہوتی تو میں یقیناً اُس دیہاتی کو بغیر پیٹے نہ چھوڑتا، بیوقوف اندھا ہو کر چل رہا تھا، نہ معلوم کس گلی سے نکل کر میری سائیکل کے اگلے پہیے سے اُلجھ گیا تھا۔ باوجود سخت تکلیف کے میں نے اُس کا بھینا ہوا کرتا پکڑ رکھا تھا، مجھے خوب یاد ہے اُس نے اُس کو چھوڑ دینے کی درخواست کرتے ہوئے کہا تھا "جانے دیجئے اُس کو مارنے سے کیا ہوگا جو ہونا تھا وہ ہو چکا"

میں نہ معلوم کیوں ایک شریر دہ شخص کی طرح اُس کی ہر بات پر سر تسلیم خم کرتا تھا، یہ میں ابھی تک نہ سمجھ سکا کہ آخر اُس میں ایسی کونسی کشش تھی۔

مجھے اُس کی صورت کا اچھا خیال ہے، میرا دل گواہی دیتا ہے کہ ہزاروں کے ہجوم میں اُسکو پہچان لونگا، وہ سفید زمردیں کناری کی ساڑھی پہنے تھی، کناری کا ٹھیک خیال نہیں لیکن ساڑھی سفید تھی ——— بالکل سفید، بے اُسوقت کی ایک ایک بات یاد ہے اس نے کہا تھا "میں آپکی اور کیا مدد کر سکتی ہوں؟" میں نے جواب دیا تھا "کچھ نہیں، مجھے بالکل چوٹ نہیں آئی آنکھوں پر صرف خراش آئی ہے جو گھر پہونچنے تک اچھی ہو جائے گی"

کھانا ختم ہونے پر بھی جب چندر بھال چوکے ہی میں بیٹھے رہے تو اُنکی بیوی نے کہا "تم تو کبھی ایسا نہیں کرتے تھے، آج یہ کیا بات ہے"

اپنی شرمندگی مٹانیکے لئے اُنہوں نے کہا "ابھی نئے نئے یہاں آئے ہیں ہر ایک چیز بکھری پڑی ہے اس لئے ذرا سستی آگئی، دو ایک روز میں سب کام دُرست ہو جائیگا"

بیوی نے پھر پوچھا "کچھ خیال آیا کیا سوچ رہے تھے"

چندر بھال نے کہا "یہ صحیح ہے کہ عورتوں میں بالکل صبر نہیں ہوتا عجلت پسند عورتیں اپنے خاوندوں کی زندگی اجیرن کر دیتی ہیں"

وہ جھنجھلا کر اپنی ایک سہیلی کے گھر چلی گئی، یہاں اُس کا میکہ تھا، غپ شپ کرنیوالوں کی کمی نہ تھی اُنہوں نے آزادی کا سانس لیا اور بستر پر جا لیٹے، پھر وہی نقشہ اُن کی نظروں میں پھر گیا، وہ لڑکی کون تھی اور میری مدد کرنے گاڑی سے کیوں اُتری تھی، عورتوں کو اجنبیوں کی امداد کے لئے دوڑنا

معیوب معلوم ہوتا ہے لیکن اگر کوئی عورت کسی کی مدد کرے تو اِس میں عیب کی کونسی بات ہے، مگر وہ عورت نہیں تھی رام رام، میں یہ کیا کہہ گیا، وہ لڑکی تھی ـــــ سرلا سوکمار ی ـــ! اس کا دل رحم کی شراب سے لبریز تھا اور میری مدد کو اس کا دوڑنا محض اتفاق تھا ـــ حُسن اتفاق لیکن اُس نے یہ کیوں کہا تھا "شاید پھر ملاقات ہو" ممکن ہے اور کچھ کہا ہو اور میں بھول گیا ہوں" وہ تفکرات کی لہروں میں ڈوب گئے۔ کچھ دیر بعد اُنہوں نے کروٹ بدلی اور اُٹھ بیٹھے، اُن کی نیند اُچاٹ ہو گئی تھی، باوجود ہر ممکن کوشش کے وہ نہ سو سکے، اُن کو ایسا محسوس ہوا گویا کوئی کان میں کہہ رہا ہے "آپ کہاں رہتے ہیں؟" پلنگ پر بیٹھے بیٹھے اُنہوں نے جواب دیا "فتحپور" "شاید پھر ملاقات ہو، اچھا اب جاتی ہوں، نمسکار" چندر بھال اِس طرح بڑبڑا رہے تھے کہ بیوی نے آکر پوچھا "ابھی تک نہیں سوئے، خواب دیکھ رہے ہو؟" چندر بھال چپ سادھ گئے۔

## ۲

علی الصباح وہ خواب سے بیدار ہوئے۔ رات میں کب نیند آئی اِس کا اُن کو علم نہ تھا لیکن اِس وقت دماغی توازن درست تھا اُن کو اپنے حال پر ہنسی آئی اور وہ غور کرنے لگے، کوئی سنے گا تو کیا کہے گا پندرہ برس پہلے کی بات پر آج میں فضول پریشان ہو رہا ہوں، شب میں انہوں نے ارادہ کیا تھا کہ کُل کیفیت بیوی کو سُنا دونگا لیکن صبح ہوتے ہی اس نے طے کیا کہ یہ ٹھیک نہیں، اِس سے میری بیوی کو رنج ہوگا۔ یہ معلوم کرکے کہ میں ایک غیر عورت سے محبت کرتا ہوں۔

اُن کو یہ واقعہ بھول جانا چاہیئے، وہ اپنے ارادے کے پکے تھے جس بات کا تہیہ کر لیتے وہ کبھی کسی پر ظاہر نہ ہونے دیتے بیوی سے دیر تک باتیں کرتے رہے کہ الہ آباد میں وہ کہاں رہتے تھے اور کس طرح بائیسکل پر سیر و تفریح کرتے اور کیوں سُسرال میں رہنا پسند کرتے تھے لیکن اس خیال سے کہ اُنکی پڑھائی میں ہرج ہوگا اُن کے پتا نے سُسرال میں رہنے کی سخت ممانعت کر رکھی تھی شریف دل استری ایک دن پہلے کی لڑائی کو بھول گئی اور جس طرح چکور محبت بھری نظروں سے چاند کو دیکھتی ہے اسی طرح وہ اُنکی طرف دیکھکر باتیں سُن رہی تھی۔

کھانے سے فراغت پاکر وہ دفتر روانہ ہوئے لیکن جونہی گھر سے باہر قدم رکھا پھر وہی واقعہ یاد آگیا۔ وہ اُس کو بھول جانے کی غرض سے دفتر کی طرف تیزی سے قدم بڑھانے لگے لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے، اُنہوں نے اپنے کو ایک نامعلوم مقام پر کھڑا پایا۔ واقعہ یہ تھا کہ وہ دفتر نہ جاکر اُس مقام کو دیکھ رہے تھے جہاں آج سے پندرہ برس پہلے وہ ایک دیہاتی سے ٹکرا کر گرے تھے اور ایک ناآشنا لڑکی اُن کی امداد کے لئے سکول کی گاڑی سے اُتری تھی، انہوں نے سوچا شاید وہ اُسی راستہ سے پھر آتی ہو اور ممکن ہے ملاقات ہو جائے۔

اگرچہ اُن کے قدم اُسی مقام کی طرف بڑھ رہے تھے لیکن دل اُن پر ملامت کر رہا تھا اور وہ خود کو اِس طرح سمجھاتے بھی جاتے تھے "چندر بھال تم کتنے بیوقوف ہو گیا وہ لڑکی ابھی تک بیٹھی ہوئی، بالفرض اگر بیٹھی بھی ہو گی تو کیا تمہاری اُس سے شادی ہو سکتی ہے، تم شادی شدہ ہو، اپنے دفتر جاؤ اپنا کام کرو، تم کو اب عشق کرنے کا کوئی حق نہیں "

یہ سوچ کر وہ گھر جانے کے لئے مُڑے ہی تھے کہ ناگہاں اُن کے دل میں یہ خیال آیا کہ اس میں ہرج ہی کیا ہے، کسی بات کی واقفیت حاصل کرنا آدمیوں کا ہی کام ہے، لوگ اخباروں میں ہزاروں قسم کی خبریں پڑھتے ہیں محض معلومات کے لئے اُس سے اُن کا کوئی تعلق نہیں ہوتا لیکن میں تو ایک ایسی لڑکی کا پتہ معلوم کرنا چاہتا ہوں جس نے میری مدد کی تھی مجھ سے ہمدردی کا اظہار کیا تھا اور دوبارہ ملنے کی مجھے اُمید دلائی تھی، مجھے تو یہ کام برسوں پہلے انجام دینا تھا اُس نے بھی اپنے دل میں کیا خیال کیا ہو گا کہ میں کیسا غیر مہذب آدمی ہوں عہد گذشتہ کی یاد سے آدمی کو ایک قسم کی مسرت ہوتی ہے لیکن وہ بھولی بسری باتیں یاد کر کے رنجیدہ ہو رہے تھے، جتنا غور کرتے اُسی قدر اُن کی بے چینی میں اضافہ ہوتا تھا۔

اُس دن وہ دفتر نہ جا سکے لیکن وہ مقام انہوں نے تلاش کر لیا سڑک کے اُسی کنارے پر کھڑے ہو کر انہوں نے چاروں طرف دیکھا کچھ عمارتیں نئی بن گئی تھیں اور باقی اُسی حالت میں کھڑی تھیں اُن میں کوئی نمایاں تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ اُن کی تار کے اُسی کھمبے پر نظر پڑی جس کے سہارے اس لڑکی نے اُن کی سائیکل کھڑی کی تھی۔ انہوں نے دل میں کہا "اے کھمبے تجھے اس بات سے کیا غرض کہ اس راستہ سے کون کس وقت گذرا ہے، کاش تو اپنے گذشتہ ایام کا افسانہ دُہرا سکتا تو مجھے ضرور اُس لڑکی کا پتہ معلوم ہو جاتا" انہوں نے اس کھمبے کو ہاتھ لگایا اُس وقت اُن کی عجیب حالت تھی۔

چار بجے سکول کے لڑکے جب اپنے اپنے گھروں کی طرف جانے لگے تو اُن کی بے چینی میں مزید اضافہ ہو گیا اور آنکھوں میں طالب علمی کے زمانے کا وہ واقعہ پھر گیا اُن کو ایسا معلوم ہوا گویا لڑکیوں کی سکول سے گاڑی آ رہی ہے۔

وہ اُسی طرف دیکھنے لگے جدھر سے پندرہ برس پہلے وہ گاڑی آئی تھی۔ اس وقت بھی ایک گاڑی اُسی جانب سے آ رہی تھی، اُن کا دل دھڑکنے لگا۔ انہوں نے خیال کیا اگر وہ اس گاڑی میں ہوئی تو مجھے دیکھ کر ضرور اُترے گی۔ اور ممکن ہے یہ پوچھے "بہت دنوں بعد ملاقات ہوئی" تو میں اس کا کیا جواب دونگا۔ وہ ایک معقول جواب سوچنے لگے اتنے میں گاڑی وہاں آ کر کھڑی ہو گئی۔ اُس میں سے ایک لڑکی اُتری۔ چندر بھال سمجھے شاید یہ وہی ہے لیکن اُس لڑکی نے اُنکی طرف دیکھا بھی نہیں

اور دوڑکر ایک قریب کے مکان میں چلی گئی۔

اب اُن سے برداشت نہ ہوسکا اُنہوں نے آگے بڑھکر گاڑی والے سے دریافت کیا۔

"کیوں جی، تم یہ گاڑی کب سے ہانکتے ہو؟"

"چھ ماہ سے"

"اور تم سے پہلے کون ہانکتا تھا؟"

"میرا باپ، لیکن اب اُس کا انتقال ہوچکا ہے"

"تمہارے باپ نے کے روز گاڑی ہانکی ہے؟"

"پورے بیس برس"

چندر بھال نے ایک ٹھنڈا سانس لیکر کہا "کیسا اچھا آدمی سنسار سے اُٹھ گیا" گاڑی بان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ گاڑی میں بیٹھی ہوئی ملازمہ یہ گفتگو سُنکر باہر آئی اور بولی "بابو کیا تم اُن کو جانتے ہو، وہ بہت اچھے آدمی تھے، شہر کا کوئی ایسا رئیس نہیں جو اُن کو نہ جانتا ہو، وہ سب کے گھر سلام کرنے جاتے تھے، یہ لڑکا ان کے برعکس ہے" پھر اُس نے گاڑی بان کو ڈانٹ کر کہا "آپ کی باتوں کا ٹھیک جواب کیوں نہیں دیتا" گویا اس نے ظاہر کیا کہ وہ اس کی ماں ہے اور بولی "اس نوکری میں میری زندگی کٹ گئی۔ سسرال آنے پر میں بھی اس گاڑی کی چھپکلی بن گئی۔ اب کسی دوسری جگہ طبیعت نہیں لگتی"

چندر بھال نے تار کے کھمبے کی طرف دیکھ کر کہا ایسے لوگوں سے قسمت ہی سے ملاقات ہوتی ہے۔ اب گاڑی سڑک پر چل رہی تھی اور ملازمہ اُن سے بات چیت کرنے گاڑی سے اُتر گئی تھی۔ چندر بھال نے کہا "تم سکول کی سب لڑکیوں کو پہچانتی ہوگی؟"

"کیوں نہیں"

"تم کو اُس دن کا وہ واقعہ یاد ہے جب میں اس مقام پر سائیکل سے گرا تھا اور ایک لڑکی میری مدد کے لئے گاڑی سے اُتری تھی"

"میں کسی لڑکی کو راستہ میں گاڑی سے اُترنے نہیں دیتی"

"لیکن ایک دفعہ ایسا اتفاق ہوا ہے"

"نہیں ایسا کبھی نہیں ہوا"

"شاید تم کو خیال نہ رہا ہو لیکن مجھے یاد ہے"

"اُتری ہوگی"

"تم اُس لڑکی کا پتہ بتلا سکتی ہو؟"

"نام بتلاؤ"
"نام مجھے معلوم نہیں"
"تو میں کچھ بتلا نہیں سکتی، اچھا جاتی ہوں، لے گاڑی بہت دور چلی گئی"
"تمہارا کیا نام ہے"
"بھلا وائی"

چندر بھال کھمبے سے کہنے لگے بغیر نام معلوم کئے پتہ لگانا مشکل ہے، وہ ناکام ہو کر گھر لوٹ گئے۔ اُس دن رات کو وہ بستر پر لیٹے ہی تھے کہ کچھ سوچ کر فوراً اُٹھ بیٹھے اور ایک نسوانی رسالہ کے لئے مندرجہ ذیل اشتہار تیار کیا۔

"میں اُن شریمتی جی سے نیاز حاصل کر کے شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے آج سے پندرہ برس پہلے تری وینی جانے والی سڑک پر مجھے بائیسکل سے گرتے دیکھ کر میری مدد کے لئے اپنی اسکول کی گاڑی سے اُتری تھیں، مجھے بے حد افسوس ہے کہ میں اُس وقت اُن کا شکریہ ادا نہ کر سکا۔ براہ نوازش اپنا پتہ تحریر فرما کر میری پریشانی رفع کرنے کی تکلیف گوارا فرمائیں؟"

اس کے علاوہ اشتہار میں اور کوئی بات نہ تھی، بیوی اور دوستوں سے پوشیدہ رکھنے کے لئے اُنہوں نے اپنا نام اور پتہ بھی نہ لکھا۔

دوسرے مہینے کے رسالہ میں اُنہوں نے اپنے اشتہار کے ساتھ یہ پڑھا "پرسوں! اُسی مقام پر!! اُسی وقت!!! ضرور"

(۳)

چندر بھال آج ساڑھے تین بجے ہی اپنے دوستوں سے یہ کہہ کر کہ اُن کو ایک ضروری کام ہے، دفتر سے نکل کھڑے ہوئے، اُن کی مسرت کا کوئی ٹھکانا نہ تھا، جو عورت اُن کے ایوانِ تخیل میں حکومت کر رہی تھی اُس سے آج پہلی مرتبہ اُن کی ملاقات ہونے والی تھی، شاید وہ زندگی میں کبھی اتنے خوش نہ ہوتے ہوں گے۔

چندر بھال جب اُس مقام پر پہونچے تو وہاں بالکل سناٹا تھا، وہ اُسی کھمبے سے پیٹھ کے سہارے کھڑے ہو گئے، وہ مقام اُن کو اپنے گھر جیسا مانوس معلوم ہو رہا تھا، کھڑے کھڑے وہ سوچنے لگے ——— "اس سے فائدہ، میں نے سخت غلطی کی، میری اُس سے شادی نہیں ہو سکتی، علاوہ ازیں میری شریک حیات میرا اُس کا ساتھ کسی طرح سے نہیں کر سکتی۔ اگر وہ بھی شادی شدہ ہوئی تو یقیناً اُس کا شوہر ہماری ملاقات کو ناپسند کرے گا۔ افسوس میرے خیالات ایسے کیوں ہو گئے۔ کسی غریب کی عورت کو تنہائی میں بلا کر اُس سے بات کرنے کا مجھے

کیا حق ہے۔"

اس طرح وہ اپنے پر ملامت کرنے لگے کہ چندر بھال تم کیسے بے شرم ہو بھلا یہ عمر ادھوری ملو۔ کی تلاش تم کو کیا ہو گیا؟ اپنے گھر جاؤ اور بھول کر اس طرف آنے کا نام نہ لو۔

وہ گھر جانے کے لئے مڑے ہی تھے کہ پھر یہ سوچ کر ارادہ بدل دیا کہ اگر وہ یہاں آئی اور مجھ کو نہ پایا تو دل میں کیا کہے گی۔ یہ تو بڑی بے وقوفی ہے، جس نے اپنے ساتھ ایسا سلوک کیا ہو اُس کو اس طرح دھوکا دینا یقیناً دانشمندی سے بعید ہے۔ اُنہوں نے خیال کیا کہ دُنیا میں اُن کے جیسا شریف اور نیک دل آدمی نہیں، وہ جو کچھ کر رہے ہیں محض بھلائی کے خیال سے۔ لیکن یہ کیوں سوچتے کہ کسی فاسد خیال کے زیر اثر اُن کو اس عورت کی تلاش ہے، وہ تو صرف اُس کا شکریہ ادا کرنا چاہتے ہیں۔ بالفرض اگر اِس میں کوئی بُرائی ہوتی تو وہ جواب ہی کیوں دیتی۔

چندر بھال اِنہی خیالات کی رو میں غوطے کھانے لگے ممکن ہے وہ بھی مجھ سے ملنے کے لئے اتنی ہی بے چین ہو، بالفرض اگر میں بغیر دریافت حال کئے واپس چلا گیا تو پھر ایسا موقع ہاتھ نہ آئے گا۔ پندرہ برس کی بات معلوم کرنے کے لئے جب میں اتنا مضطرب ہوں تو ضرور اِس کا اچھا نتیجہ نکلے گا۔

اُنہوں نے جیب سے گھڑی نکال کر دیکھی تو ساڑھے چار بج چکے تھے، یہی تو وقت تھا، وہ کہنے لگے وہ ابھی تک کیوں نہیں آئی۔ شاید خیال کرے ایک اجنبی سے مل کر فائدہ، لیکن اس نے یہ کیوں کہا تھا، شاید پھر ملاقات ہو؟ بس یہ معلوم کرنے کی مجھے بڑی آرزو ہے۔

اچانک پہیوں کی گڑگڑاہٹ اُن کے کان میں پڑی، وہ سنبھل کر کھڑے ہو گئے، ایک تانگہ سامنے سے نکل گیا پھر وہی سناٹا۔ تھوڑی دیر بعد دوسرا تانگہ گذرا وہ ذرا سی آہٹ پر چونک جاتے تھے۔ آخر جب چھ بجے کا عمل ہو گیا تو وہ نا اُمید ہو گئے۔ اُنہوں نے خیال کیا شاید کسی نے اُن سے مذاق کیا ہے، لیکن یہ کون ہے، وہ یہ معلوم کرنے کے لئے اخبار کے دفتر میں جانے کا ارادہ کرنے لگے۔ لیکن پھر خیال آیا شاید وہ آتی ہو ایک گھنٹہ اور اس کا انتظار کیا جائے۔

مگر اب اُن کو زیادہ انتظار کی زحمت نہ اُٹھانی پڑی۔ سامنے سے ایک تانگہ آرہا تھا اور جیسے جیسے نزدیک آتا جاتا تھا اُس کی رفتار مدھم پڑ رہی تھی، وہ یکبارگی بول اُٹھے "اے لو وہ آ گئی، یہی ہے۔"

اُن کا خیال ٹھیک تھا، تانگہ وہاں آکر کھڑا ہو گیا۔ اُس میں سے ایک عورت اُتری۔ "اے، تو اُن ہی کی بیوی ہے۔ شاید اُن کے گھر نہ پہونچنے پر اُن کی تلاش میں نکلی ہو، اب وہ جز کنم ہیں

پڑ گئے کہ وہ عورت بھی آجائے تو کیا ہو؟ وہ مبہوت ہو کر قطب از جائی جنبد، کے مصداق بنے کھڑے تھے۔

پہلے تو وہ اُس مقام کا سناٹا دیکھ کر ڈر رہی تھی لیکن شوہر کو سامنے کھڑے دیکھ کر اُس کا خوف جاتا رہا اگر کوئی اور موقع ہوتا تو وہ اُن کو اُس جگہ ایک بے وقوف کی طرح کھڑا دیکھ کر ضرور خفا ہوتی لیکن وہ خوش ہوئی اور آگے بڑھ کر اس نے خندہ پیشانی سے دریافت کیا "کیوں صاحب آپ یہاں کیسے کھڑے ہیں؟"

چندر بھال کی بھی جان میں جان آئی، بولے "ارے تم یہاں کیوں آئی ہو؟" بیوی نے جواب دیا "اپنے بچپن کے ایک رفیق سے ملاقات کرنے پانچ بجے تک تمہارا انتظار کیا جب تم گھر نہ آئے تو تنہا ہی آنا پڑا کیونکہ میں وعدہ کر چکی تھی آنا ضروری تھا"

بیوی نے رسالہ کا وہ صفحہ جس میں اشتہار چھپا تھا اُن کو پیش کیا۔ وہ گویا سوتے سے جاگ اُٹھے، بولے "ارے میرے بچپنے کی رانی تم ہی ہو ——— مجھے گھر ہی میں کیوں نہ بتلایا"

"تم نے کبھی پوچھا بھی تو نہیں"

"اچھا پہلے بتاؤ، تم نے یہ کیوں کہا تھا کہ شاید پھر ملاقات ہو"

اس نے کہا "میرے دریافت کرنے پر تم نے کہا تھا کہ فتحپور میں رہتا ہوں"

"و شاید کہا ہو"

"لہٰذا میں نے کہا تھا کہ اگر میرا فتحپور آنا ہوا تو تم سے ضرور ملاقات کرونگی"

تانگے والا قریب کی دوکان پر بیڑی پینے چلا گیا تھا آسمان پر تارے نکل آئے تھے۔ درخت کے گھنے سائے کے نیچے چندر بھال نے محبت بھری نظروں سے بیوی کی طرف دیکھا اور اُس کو اپنی آغوش میں لیکر کہا "میرے تخیلات کی ملکہ ——— میری روح ——— میں نے آج پہلی مرتبہ تجھے پہچانا ہے"

اُس نے بھی اپنے کو چندر بھال کی گرفت میں دیکر اُسی انداز سے کہا "میری زندگی کے مالک ——— میرے سرتاج ——— میں بھی آج پہلی مرتبہ تم سے ملی ہوں"

تھوڑی دیر بعد پہیوں کی گڑگڑاہٹ ہوئی اور وہ مقام نظروں سے اوجھل ہو گیا اُن کو اب کسی بات کی فکر نہ تھی، وہ نہایت اطمینان سے اپنے گھر کی طرف جا رہے تھے۔

(ترجمہ از سرسوتی)

---

# جذبات نجم

دامن چھوٹے تو دوں کا چھوٹا ساقی
پھر آتش گل کی زہری نے لوٹا ساقی
ہے تشنگی ہے دست طلب میں رعشہ
بھر دے بھر دے کہ جام ٹوٹا ساقی

---

بھر دے ساقی ضرور بھر دے ساقی
تاریک ہے فضا ہے اور بھر دے ساقی
شیشہ رکھ دے نقاب چہرہ سے اٹھا
ساغر میں نہ کچھ ہو تو بھر دے ساقی

---

اب سانس میں پیتا ہوں گلابی ساقی
سرخی تری ہو گئے تبسم شرابی ساقی
وہ اور تبسم میں جھلکی
کعبہ میں اڑی غلافیہ سب دان ہیکل میں اپنا ترابی ساقی

---

بھر رو دیکھا تھے والے جل تھل ساقی
بھر دے گا ہے بادل ساقی
شوا دے کہ سب ابر زند
ہے تبسم غلافیہ اپنے جنگل ساقی
جنگل میں منا رہا ہے

نجم آفندی

# غزل

از جناب سید مقبول حسین احمد پوری بی. اے

ہو کے مائل یہ پشیمانی کیوں؟
دلِ ناداں یہ نادانی کیوں؟

اب جو ہونا تھا ہوا۔ غم بےکار
مُفت کی چاک گریبانی کیوں؟

جان سے اپنی ہوئے ہم بیزار!
ناصحا تجھ کو یہ حیرانی کیوں؟

اب تو فریاد کی خو بھی نہ رہی
میرے اشکوں سے پریشانی کیوں؟

کس لئے باندھتے ہو رختِ سفر
آج گھر میں مرے ویرانی کیوں؟

جاتے ہو جاؤ مگر یہ تو کہو
بھائی اغیار کی مہمانی کیوں؟

ہے بڑی دُور کی منزل درپیش
اس قدر بے سروسامانی کیوں؟

ہم تو مقبول کے مذہب پر ہیں
گر ہو کُفر مسلمانی ......؟

# گندم نما جو فروش

از "ایک ولی پوشیدہ اور کافر کھلا" دہلوی

اتنی نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ، ذرا بندِ قبا دیکھ

حق اور صداقت کا اعلان کرنے پر سقراط کو جامِ زہر کس نے پلایا؟ دقیانوسی خیالات کی تردید کرنے اور نوامیسِ فطرت کی صحیح تشریح کرنے پر گلیلیو پر کس نے مقدمہ چلایا؟ ملک و قوم کو غلامی کی لعنت سے آزاد کرانے کے صلہ میں اور حریتِ ضمیر اور آزادیٔ خیال کا درس دینے کے معاوضہ میں کس نے جون وف آرک کو پھانسی کے تختہ پر لٹکایا؟ اور پھر کس "زود پشیماں" نے اسی کافرہ اور ملحدہ کو سینٹ و ولیہ کا خطاب عطا کیا! کلمۃ الحق کے بے خوف و خطر آوازۂ صداقت پر کس نے کفر کا فتویٰ دیکر منصور کو دار پر چڑھایا؟ (باوجود اس امر کا دلی زبان سے اعتراف کرنے کے کہ وہ صحیح کہتا تھا)، توحید، اخوت، علم، تزکیۂ نفس اور تصفیۂ قلب کی تلقین کو ٹھکرا کر کس نے "اعلیٰ ترین انسان" کو اس کے عزیز وطن سے نکالا اور کس نے اس پر طرح طرح کے ظلم و ستم توڑے، کس نے ایک فاسق و فاجر، جابر و ظالم، زانی و عیش پرست انسان کے ہاتھ پر بیعت نہ کرنے پر امام حسینؑ کو مع رفقاء کے میدانِ کربلا میں بھوکا پیاسا تہِ تیغ کیا؟ سرسید، ڈاکٹر نذیر احمد، اقبال اور نیاز پر کس نے لامذہبیت، دہریت اور کفر و الحاد کے فتوے لگائے؟ ہوش و حواس، عقل و دانش، اختراع و اجتہاد، حریتِ ضمیر و آزادیٔ خیال کے دشمن علماء مذاہب و ادیان نے جنہیں اپنی آنکھ کا شہتیر کبھی نظر نہیں آتا اور جن کی تصویر کا دوسرا رُخ یہ ہے۔ چوں بخلوت می روند آں کارِ دیگر می کنند۔

جب صورتِ حالات یہ ہے، جب انسانی تاریخ کا کوئی ورق ان بزرگ و برتر ہستیوں کی کرم گستریوں اور روحانی "فیوض و برکات" سے خالی نظر نہیں آتا تو میں سمجھنے سے قاصر ہوں کہ عظیم بیگ صاحب چغتائی علمائے کرام سے کیوں صداقت اور حق کی تائید کے متوقع ہیں۔ کسی عالم دین سے سچ کی اعانت کی اُمید خیالِ خام ہے۔ خواہ وہ صداقت قرآن سے متعلق ہو یا حدیث سے۔ اگر ان کے مفاد کے خلاف ہے تو یقیناً وہ ہر ممکن کوشش اس امر کی کریں گے کہ اسے لغو و مہمل ثابت کیا جائے۔ اس طرح چاہے قرآن پاک کے مطالب کو توڑا مروڑا جائے اور چاہے حدیث کو خواہ وہ جمہور کے نزدیک قوی ہو ضعیف بتایا جائے۔ ان کی حالت بالکل اس مشرقی خود مختار بادشاہ کی سی ہے جو جسے چاہتا قتل کرا دیتا اور جسے چاہتا اس کا منہ موتیوں سے بھروا دیتا۔ چنانچہ بالکل اسی طرح یہ بھی جس امر کو چاہتے ہیں حلال قرار دیتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں حرام بتاتے ہیں۔ سرسید کے زمانہ میں علماء ہی کے فتووں سے انگریزی تعلیم حاصل کرنا کفر تھا، اور اب ان ہی کے فتوے قرآن و حدیث سے اس کا جواز بتاتے ہیں کہ "علم حاصل کرو، خواہ وہ چین ہی میں کیوں نہ ملے"۔ "حاکمِ وقت کی اطاعت فرض ہے" کی حدیث سُنا کر کبھی انگریزوں سے تعاون کی ہدایت کرتے ہیں اور مسلمانوں کو ترکوں کے خلاف جنگ کی ترغیب دیتے ہیں اور کبھی "حریت و آزادی مسلمانوں کا پیدائشی حق ہے" کہہ کر مسلمانوں کو کانگریس سے اتحاد و عمل کا درس دیتے ہیں۔ غرض جو چاہتے ہیں سو کرتے ہیں، مطلق العنان ہیں کوئی حرف گیری کر نہیں سکتا۔

ورائیں نے زبان کھولی اور ہر طرف سے کفر کے فتووں کی بوچھار ہونا شروع ہوئی۔ خیر یہ تو بہت پرانی چیز ہے جسے اب کوئی اہمیت حاصل نہیں۔ یہانتک کہ لفظ فتویٰ اب دہلی میں فریب اور دھوکہ کا مترادف خیال کیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں مولوی صاحب کل تو خوب فتویٰ دیا۔ کل تو خوب آئے، انتظار ہی دکھایا۔ بڑے فتوے باز ہو۔ تعجب تو یہ ہے کہ اب ان حضرات نے قانون بھی اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ چنانچہ دلائل سے قائل معقول کرنے کے بجائے دھمکیاں دیتے ہیں کہ یا تو معافی مانگو ورنہ قتل کرا دیا جائے گا۔ یعنی ہم تو مرد نہیں ہیں ہمارے بھائی مرد ہیں۔ قتل ہمیں کرائیں گے، پھانسی پر دوسرے مسلمان کو چڑھوائیں گے اور ہم دور سے کھڑے تماشہ دیکھیں گے۔ حال ہی میں عظیم بیگ صاحب چغتائی نے ایک مضمون لکھا تھا جس میں انہوں نے ثابت کیا ہے کہ رسول اللہ صلعم نے گانا سُنا اور ناچ دیکھا۔ قوی احادیث پیش کر کے اپنے دعوے کو ثابت کیا۔ بڑے بڑے ائمہ مثلاً امام غزالیؒ، امام شافعیؒ، امام حنبلؒ، امام محمد بن حسنؒ، امام ابو یوسفؒ وغیرہم کے اقوال نقل کئے۔ اب بجائے ان اقوال و احادیث کو غلط ثابت کرنے کے عظیم بیگ صاحب چغتائی کو قتل کی دھمکیاں دی گئیں۔ "انقلاب" کے ایڈیٹر نے اُنکی ماں بہنوں کو گالیاں دیں۔ دیکھئے یہ ہیں وہ اخلاق حسنہ اور دلائل و براہین جن کی بنا پر علما اور دیگر حامیان مذہب دوسروں کی زبان بندی کرتے ہیں۔ مولوی عبدالماجد صاحب ایڈیٹر "سچ" نے بلا دلیل اور بغیر قرآن پاک یا حدیث شریف کا حوالہ دئے فرما دیا کہ "..... گانے اور باجے کی ممانعت میں حضور کے متعدد ارشادات وارد ہیں عملاً بھی حضور اس سے محترز رہے ..... کل زندگی میں شاید دو بار ایسے موقعے پیش آئے ہیں کہ جشن و مسرت عام کے دن پیشہ ور عورتیں نہیں، فنِ موسیقی کی جاننے والیاں نہیں، بستی کی کمسن لڑکیاں مبارکباد اور نعتیہ اشعار گاتی بجاتی آئیں ....." متعدد ارشادات میں سے جناب عبدالماجد صاحب نے ایک ارشاد بھی نقل نہیں کیا۔ کیونکہ آپ کا قول حدیث اور آپ کا حکم قرآن ہے (نعوذ باللہ) کیوں صاحب، عظیم بیگ صاحب نے اپنے مضمون میں یہ کہاں لکھا تھا کہ پیشہ ور عورتوں کا گانا یا ناچنا جائز ہے۔ یہ آپ نے خوب فرمایا فنِ موسیقی جاننے والیاں نہیں بلکہ بستی کی کمسن بچیاں گاتی بجاتی آئیں۔ گویا بستی کی کمسن لڑکیاں فنِ موسیقی سے واقف ہی نہیں ہو سکتیں۔ خیر اسے بھی جانے دیجئے۔ آپ ہی کے قول سے یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ بستی کی کمسن لڑکیوں کا گانا اور ناچنا جائز ہے جب حضور نے ایک بار یا دو بار گانا سُنا ہے تو یہ صاف ظاہر ہے کہ گانا سننا اور ناچ دیکھنا گناہ تو نہ ہوا اور نہ اسے ناجائز ہی کہہ سکتے ہیں پیغمبر معصوم ہوتا ہے اس سے ناجائز فعل سرزد نہیں ہو سکتا۔ پھر یہ کہنا کیا معنی رکھتا ہے کہ باوجود اس اعتراف کے کہ حضور نے گانا سُنا اور ناچ دیکھا، گانا سننا اور ناچ دیکھنا ناجائز ہے۔ عبدالماجد صاحب فرماتے ہیں کہ حضور کا دو ایک بار گانا سننا اتفاقاً یا اضطراراً تھا۔ بہت خوب، گویا رسول اتفاقاً یا اضطراراً ناجائز فعل کا بھی مرتکب ہو جایا کرتا ہے۔ لیجئے ایک نہ شد دو شد، اب علماء کرام مولوی عبدالماجد صاحب پر کس چیز کا فتویٰ لگائیں گے۔ ہم تو یہی سنتے آئے ہیں اسی پہ ہمارا ایمان ہے کہ رسول سے عمداً یا غیر ارادی طور پر کسی طرح ناجائز کام ہو ہی نہیں سکتا۔ مولانا فرماتے ہیں ہو سکتا ہے اب ہے کوئی باحمیت مسلمان جو مولانا موصوف سے تعرض کر سکے۔ مولانا کو معلوم ہونا چاہیئے کہ آپ کا جامۂ تقدس تو اسی دن چاک ہو گیا تھا جس دن دُنیا کو یہ معلوم ہوا کہ آپ نے اپنی منکوحہ بیوی کی موجودگی میں ایک غریب [illegible] سے نکاح کر کے چند ماہ کے بعد اسے بلا قصور طلاق دیدیا اور اس کا مہر تک دابہ کیا۔ اور پھر بھی اپنی حرکت [illegible] کی طرف

منسوب کرکے اپنی برئیت کا اظہار کیا۔ سارے مسلمان اس قدر اندھے نہیں ہیں کہ آپ چاہے جو کہیں اور کئے جائیں اور وہ دیکھے اور سُنے جائیں، ایسے شخص کی کوئی بات از روئے قرآن و حدیث قابل اعتبار نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ مولانا موصوف سے بصد ادب التجا ہے کہ آپ اپنے گراں بہا خیالات و آراء سے مسلمانوں کو زیر بار احسان نہ فرمایا کریں۔ ورنہ بقول دیگر علماء کے خرابی ہوگی اگر کوئی "دیوانہ" پیدا ہوگیا تو۔

اب ذرا ایک غیر مولوی کا مضمون دیکھئے جو "رقص و سرود" کے عنوان سے ایک پمفلٹ کی صورت میں شائع ہوا ہے۔ جس میں احادیث سے ثابت کیا گیا ہے کہ حضورؐ نے گانا سننے کی خود اجازت دی اور جناب اُم المومنین حضرت عائشہؓ سے گانے کی فرمائش کی۔ "عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میرے پاس ایک لڑکی خاندان انصار میں سے تھی میں نے اسکی شادی کی۔ رسول اللہؐ نے فرمایا عائشہ تم گاتی نہیں؟ یہ انصار کا خاندان ہے جو گانے کو دوست رکھتے ہیں" (ابن ماجہ مشکوٰۃ شریف)، ترمذی اور مشکوٰۃ میں آیا ہے کہ "عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہؐ بیٹھے ہوئے تھے کہ ہم نے شور اور بچوں کی آوازیں سنیں، رسول اللہؐ کھڑے ہوگئے دیکھا کہ ایک حبشی عورت ناچ رہی ہے اور بچے اس کے چاروں طرف حلقہ کئے ہوئے ہیں۔ آپ نے فرمایا عائشہ یہاں آؤ دیکھو، میں حاضر ہوئی اور ٹھوڑی حضور کے شانہ پر رکھدی اور سر اور شانہ کے درمیان سے جھانکنے لگی۔ حضور فرماتے رہے ابھی تمہارا جی نہیں بھرا، ابھی تمہاری طبیعت سیر نہیں ہوئی، اور میں نہیں نہیں کہے گئی۔ اتنے میں حضرت عمرؓ آگئے اور لوگ اس رقاصہ کو چھوڑ کر بھاگ گئے۔ رسول اللہؐ نے فرمایا میں دیکھتا ہوں کہ شیاطین اور جن و انس عمرؓ سے بھاگتے ہیں پھر میں واپس آگئی"۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اس حدیث میں شیطان ناچنے والی کو نہیں کہا گیا۔ کیونکہ اگر ناچنا شیطان کا فعل ہوتا تو حضور خود کیوں دیکھتے اور عائشہؓ کو کیوں دکھاتے، یہاں شیاطین سے مراد بچے ہیں۔ بچوں کو از راہ محبت شیاطین فرمایا۔ اس حدیث کے متعلق امام غزالیؒ فرماتے ہیں "یہ نص صریح ہے اس بات پر کہ گانا اور کھیل حرام نہیں ہے"۔ اب رہا پیشہ ور عورتوں کا گانا اور ناچنا۔ سو یہ ہر اعلیٰ انسانی ذوق رکھنے والا شخص جانتا ہے کہ فن لطیف کو ذریعہ معاش بنانا حد درجہ کی بد ذوقی ہے جن لوگوں نے فلسفہ اخلاق کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ کسی شخص کو لذت حاصل کرنے کا ذریعہ بنانا نہ صرف ناجائز بلکہ گناہ ہے۔ ہر شخص بذات خود ایک مقصد ہے نہ کہ ذریعہ۔

Every human being is an end in himself; he ought not to be made "means" to achieve ends other than those conducing to the well being of his own personality

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ہونی کا گانا سننا لہو و لعب کے تحت میں آ [illegible]

[illegible] طلاق لہو و لعب [illegible]

# ریزۂ مینا

جھانسی

بھائی شاہد!

محبت نامہ موصول ہوا۔ میں اور مضمون نگاری؟ —— دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اوّل تو میرا دماغ ہی اُن مخصوص "جراثیم" سے خالی ہے اور اگر نہ بھی ہو تو بھائی صاحب! وقت کہاں؟ کشمکشِ حیات سے اتنی بھی مُہلت نہیں ملتی کہ میں اپنے گرد و پیش نظر ڈال سکوں۔ اُس پر مستزاد "قوم کی خدمت!" بس یوں سمجھئے کہ ع:۔ اے روشنیٔ طبع تو برمن بلا شدی!

مجھ خاکسار کو تو بس آپ عملی خدمت گذاران میں سے رہنے دیجئے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں گذشتہ سال آپ کو صرف ۲۵ اخریدار دے سکا لیکن اس سال میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ مبلغ ۲۰۰ خریدار ضرور دونگا۔ مقامی درسگاہوں اور کتب خانوں میں سے تقریبًا تمام میں ساقی مستقل طور سے منظور ہو چکا ہے۔ رفتہ رفتہ انشاء اللہ تمام بندیلکھنڈ میں ساقی ہی ساقی نظر آئیگا۔ اس کا میں ذمہ دار ہوں۔

میرا خیال ہے کہ تم شاید اس کو خوشامد یا چاپلوسی سمجھو گے یا شاید "حُسنِ ظن" کچھ بھی ہو میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ساقی (خدا اسے نظرِ بد سے بچائے) مضامین کے اعتبار سے اس وقت اُردو کا بلکہ ہندوستان کا بہترین پرچہ ہے —— "معنویت" کی فراوانی نے "تصویریت" کے فقدان کو صرف پورا ہی نہیں کر دیا بلکہ اور چار چاند لگا دئے ہیں ——!!

ساقی صرف "شرابِ معنوی" کا حامل ہی نہیں بلکہ وہ "شرابِ مجسم" ہے جس کے تصور ہی سے ایسی کیفیات پیدا ہو جاتی ہیں جن کے آگے کیفِ مے محض شورشِ حباب ہے —— ہر "صاحبِ ذوق" کے سجدہ ہائے نیاز کو اپنے "آستانۂ ناز" کے لئے وقف سمجھنا اُس کا جائز حق ہے —— منجملہ ان کے ایک قابلِ غور بات اور عرض کرتا ہوں وہ یہ کہ ع:۔ نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوست!

جگر آئے تھے۔ تمام تمام رات مشاعرہ گرم رہا۔ کاش تم بھی شریکِ بزم ہوتے۔ جھانسی میں آجکل Grand Hotel پوری طاقت کے ساتھ چمک رہا ہے۔ اب اُسی کو سہ بارہ دیکھنے جاتا ہوں۔

تمہارا

عبدالحکیم

(ایم۔اے۔ ایل ایل۔ بی۔ وکیل۔ جھانسی)

# پیامِ عمل

از حضرت نہال سیوہاروی

کب تک فسانۂ غمِ ایام کہہ کے تُو
اسلامیوں کو خون کے آنسو رُلائے گا

کب تک خیالِ عظمتِ رفتہ میں غم کا جوش
کب تک وفورِ گریہ سے طوفاں اُٹھائیگا

کب تک رہے گی لب پہ حدیثِ کہن ترے
جو کہہ چُکا ہے اُس کو کہاں تک سُنائے گا

کب تک دُھنیگا حزن کے عالم میں سر کو تُو
کب تک جہاں کو غم کے مناظر دکھائیگا

کبتک یہ طُولِ نوحۂ اقبال و ملک و جاہ
دُکھے ہوئے دلوں کو کہاں تک دُکھائے گا

کب تک تباہ رہے گا خرابِ مئے قنوط
تا چند یہ شراب پیئے گا پلائے گا

وہ آئی مُسکراتی ہوئی صبح عید کی
تمہید ہو یہی ترے دورِ جدید کی

ماضی کے تذکرے میں نہ اوقات کر تلف
جوشِ عمل سے اپنے نیا اک جہاں بنا

پھر رُوحِ نغمہ بطنِ گلستاں میں پھونکدے
شاخِ چمن پہ از سرِ نو آشیاں بنا

معیارِ ہست و بودِ جہاں کو بلند کر
بالفرض یہ زمین ہے تو آسماں بنا

طاعت کی تیرے دل میں ہو پیدا وہی تڑپ
سنگ سیہ کو جلوہ گہِ جانِ جاں بنا

وقفِ خزاں ہوئیں روشیں باغِ ہند کی
بھارت کا مدعا ہے کہ جنت نشاں بنا

وہ دور ہو کہ زاہدِ صد سالہ بھی کہے
ساقیٔ نشاط بادہ سے مجھ کو جواں بنا

تقلید جوئے آب مکن بے کنار شو
مردیٔ خویش مُردہ مکن مردِ کار شو




”احساسِ ملکیت!“

خوش رہنا ہر شخص کا فطری حق ہے۔ اگر آپ بھی مسرور رہنا چاہتے ہیں تو ساقی کا ”ظریف نمبر“ حاصل کیجئے

جو

تڑپا دینے والے رنگا رنگ مزاحیہ مضامین سے مرصع ہوگا اپریل ۴۳ء کو منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوگا۔

## نقد و تبصرہ

# ویمپائر

مرزا عظیم بیگ چغتائی کی عمر بحیثیت مضمون نگار مشکل سے دو سال ہے مگر کثرتِ نگارش کے ساتھ ساتھ جدّت و تازگی مضامین اگر کسی مضمون نگار میں ہے تو صرف مرزا عظیم بیگ میں۔ نیرنگ خیال لاہور کے سالنامہ [illegible] میں آپ کا پہلا ہنگامہ آفرین مضمون "انگوٹھی کی مصیبت" شائع ہوا اور بیحد پسند کیا گیا۔ اسی سال اپریل میں ساقی کے "ظریف نمبر" میں آپ کا دوسرا مشہور مضمون "کولتار" شائع ہوا اور اس کے بعد ہی "ہمایوں" لاہور میں "آشنائی الا غرض" پے در پے کئی مضامین مختلف رسائل میں شائع ہو کر مشہور ہوئے اور اُن کی نمود کا سبب بنے۔ مرزا عظیم بیگ نے جو نئی چیز پیش کی وہ مزاحیہ افسانہ ہے۔ ایک تو اچھا افسانہ یونہی دلچسپ ہوتا ہے پھر اگر اُس میں ظرافت کی شوخی بھی گھلی ملی ہو تو سبحان اللہ! یوں سمجھیے کہ ایک تو روئے نگار اور پھر اُس پر غازے کا نکھار۔ کون ہے جو گھائل نہ ہوگا۔

مزاحیہ افسانوں کے ساتھ ساتھ آپ نے سنجیدہ افسانے بھی لکھے اور اُن میں بھی وہی دلکشی پائی جاتی ہے جو آپ کے ہنسانے والے افسانوں کی خصوصیت ہے۔ اُن میں پہلا افسانہ "مہارانی کا خواب" ہے اور دوسرا "اُلو کا پٹھا"! یہ دونوں افسانے اپنے اچھوتے موضوع اور طرزِ بیان کے اعتبار سے لاجواب ہیں۔

فسانہ نگاری کے علاوہ مرزا صاحب کو مذہبیات سے بھی شغف ہے۔ چنانچہ "قرآن اور پردہ"، "حدیث اور پردہ" اور "تفویض"! یہ تینوں کتابیں مذہبی اور رسمی معتقدات سے متعلق ہیں۔ ان کے علاوہ آئے دن اُن کے مذہبی مضامین اکثر اخبارات و رسائل میں چھپتے رہتے ہیں۔ میں حیران ہوں کہ ایک کامیاب وکیل کو اس درجہ مختلف موضوعوں پر اس روانی اور عمدگی سے قلم اُٹھانے کی فرصت کیسے میسر آجاتی ہے؟ (بُری نظر بد سے بچائے) اسی دو ڈھائی سال کے مختصر عرصے میں مرزا صاحب کی مندرجہ ذیل بارہ کتب بھی شائع ہو چکی ہیں اور متعدد زیرِ طبع ہیں:۔

(۱) شریر بیوی (۲) روحِ ظرافت (۳) روحِ لطافت (۴) کولتار (۵) چینی کی انگوٹھی اور لوٹے کا دزد (۶) مرزا جنگی (۷) فل بوٹ (۸) قرآن اور پردہ (۹) حدیث اور پردہ (۱۰) تفویض (۱۱) ویمپائر (۱۲) رقص و [illegible]

ان میں سے دس کتابوں پر وقتاً فوقتاً ساقی میں اظہارِ خیال کیا جا چکا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ مرزا صاحب کی تازہ ترین تصنیف "ویمپائر" کی خوبیاں تفصیل کے ساتھ بیان کروں۔ تنقیص نقادوں کے لیے چھوڑتا ہوں۔ دیکھوں وہ کیا کہتے ہیں؟

ہر اچھے افسانہ کے لئے چار خصوصیات لازمی ہیں:-

(۱) جدّت (۲) اصلیت (۳) مناسبت اور (۴) طرزِ تحریر۔

(۱) پلاٹ کی جدّت چغتائی کے ہر افسانہ میں پائی جاتی ہے۔ کسی خاص پلاٹ سے زیادہ اُنکے ہر افسانہ اور ہر ناول میں مختلف واقعات اتنے زیادہ اور اتنے دلچسپ ہوتے ہیں کہ پڑھنے والا واقعات کی بھول بھلیاں میں کھوسا جاتا ہے۔ "ڈیمپایر" میں بھی ایک ایسا اچھوتا موضوع چھانٹا ہے کہ جس پر اب تک کوئی شائستہ کتاب نہیں لکھی گئی۔ زنا بالجبر جیسے نازک اور قابلِ اعتراض پلاٹ پر اس خوبی سے افسانے کی بنیاد قائم کی ہے کہ متأثر کی بجائے ہمدردی، حیا سوزی کی بجائے پاکبازی اور حیا داری کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ ایسی بنجر زمین میں گُل کھلانا جدّت کی آخری حد ہے۔ (۲) اصلیت (Realism) پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے۔ کہ مصنف نے فطرتِ انسانی اور کائنات کو اُچٹتی ہوئی نظر سے نہ دیکھا ہو بلکہ تاثراتِ انسانی اور کائنات کے ہر ذرّہ کا مطالعہ کیا ہو۔ چغتائی کی دُور رس نگاہیں کائنات کی اُن باریکیوں تک پہونچتی ہیں جو ہر شخص کو نظر نہیں آتیں۔

کامیاب افسانہ نگار کہلانے کا مستحق وہی ہے جو شاعر کی طرح پوشیدہ حقیقتوں کو بے حجاب دیکھتا ہو اور انہیں بے نقاب کر کے اُبھار بھی دیتا ہے تاکہ عوام کی سرسری نظروں میں بھی یہ حقیقتیں کُھب جائیں۔ چغتائی کی دُوربیں آنکھوں نے انسانی فطرت کو ہر پہلو سے دیکھا ہے خصوصاً صنفِ نازک کے صحیح اور سچے جذبات کا غائر مطالعہ اور اُن کی ترجمانی جس عمدگی سے کی ہے وہ اِنہی کا حصّہ ہے۔ "سوسائٹی اور عورت" اُن کا موضوع خاص ہے جس پر وہ اپنے مضامین میں مختلف زاویوں سے روشنی ڈالتے رہتے ہیں۔ اس موضوع کے کسی ایک تاریک رُخ کو لے کر اُس پر اتنی روشنی ڈالتے ہیں کہ اُس کا ذرّہ ذرّہ چمک اُٹھتا ہے۔ "ڈیمپایر" کے مختصر سے پلاٹ کو جس عمدگی سے ڈیولپ (Develope) کیا ہے اور جس خوبی سے اِس قابلِ اعتراض موضوع کو نبھایا ہے سچ تو یہ ہے کہ اِسی ایک بات سے مصنّف کی بلندی و پاکیزگیِ مذاق ظاہر ہے۔ اگر ذرا بھی چُوک ہو جاتی تو یہی کتاب کوک شاستر بن کر رہ جاتی۔ مصنّف نے اِس تاریک موضوع کی وضاحت و تنقید کے لئے افسانہ کا پیرایہ اختیار کیا ہے اور ایک غیر دلچسپ واقعہ کو افسانہ کی رنگ آمیزی سے دلچسپ اور عبرت انگیز بنا دیا ہے۔ پھر لُطف یہ ہے کہ ہر واقعہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو ہم نے خود کہیں دیکھا ہے اور یا کسی کی زبانی پہلے سُنا ہے۔ واقعہ نگاری کی اس سے بہتر اور کیا مثال ہو سکتی ہے۔

(۳) افسانہ نگار کی کامیابی یہ ہے کہ اس کے افرادِ افسانہ (Characters) جیتے جاگتے ہم ہی جیسے اِنسان ہوں اور اُن سے جو افعال سرزد ہوں خواہ وہ اچھے ہوں خواہ بُرے، انسانی افعال سے مُشابہ ہوں۔ اُن میں وہی جذبات و احساسات موجود ہوں جن سے کہ فطرتِ انسانی عبارت ہے۔ "ڈیمپایر" میں ہیروئن کا کیریکٹر اِس خوبی سے رقم کیا گیا ہے کہ پڑھنے والا یہی سمجھتا ہے کہ اُس نے ہیروئن جیسی ایک نہیں متعدد

لڑکیاں دیکھی ہیں مگر اُنہیں دیکھ کر پہلے اُس نے حقارت سے مُنہ موڑ لیا تھا اور اب اُنہی میں سے ایک کی مجبوریوں پر آنسو بہاتا ہے۔ یہ فرق کیسے واقع ہوا؟ فسانہ نگار نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دکھایا۔ اس کی نظروں نے گدلے پانی کی تہہ میں خوش آب موتی دیکھے جن کو اُس نے نکال کر منظرِ عام پر رکھدیا۔ یا یوں سمجھئے کہ حقیقت کے چہرے سے اُس گندی نقاب کو اُٹھا دیا جس کی بدنمائی میں عام نظریں اُلجھ کر رہ جاتی تھیں۔ "ویمپائر" میں بے شمار سین ہیں مگر مُصنّف نے ہر سین میں واقعات اور کردار میں مناسبت کو قائم رکھا ہے اور قرینِ قیاس واقعات سے ہر کردار کے اقوال و افعال ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔

(۴) کسی مضمون کے لئے صرف اس قدر کہد ینا کہ مرزا عظیم بیگ چغتائی کا ہے ان خصوصیات کی کافی ضمانت ہے کہ وہ مضمون اپنے موضوع کے لحاظ سے اچھوتا۔ واقعات کی حیثیت سے دلچسپ، طرزِ تحریر کے اعتبار سے تصنّع سے پاک اور حُسن کارانہ ([illegible]) نقطۂ نظر سے بلند پایہ ہے۔ چنانچہ "ویمپائر" میں بھی یہ سب خوبیاں موجود ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس میں ہر خوبی گذشتہ تصانیف سے زیادہ نمایاں ہے اس لئے اگر "ویمپائر" کو "چغتائی کا شہ پارہ" موسوم کیا گیا ہے تو نامُناسب معلوم نہیں ہوتا۔ اب تک جتنی کتابیں چغتائی کے قلم کے سانچے میں ڈھلی ہیں اُن سب میں "ویمپائر" طرزِ تحریر کے اعتبار سے ممتاز و نمایاں ہے۔ اسٹائیل کی سادگی نے رنگین عبارت آرائی سے آمیز ہو کر کچھ اور ہی لُطف پیدا کر دیا ہے۔ اس کے چند نمونے حسبِ موقع نقل کئے جائینگے۔ مجھے اُمید ہے کہ اُن کے اسٹائیل کا یہ ڈھنگ اور بھی زیادہ مطبوعِ خلائق ہوگا کیونکہ اِس میں چغتائی نے سادگی و رنگینی کو گلے ملوا دیا ہے۔

چغتائی کا مادّہ اختراعی اور اُن کی جدّت پسندی کتاب کے سرورق ہی سے شروع ہو جاتی ہے کتاب کا نام "ویمپائر" رکھا گیا ہے۔ موضوعِ کتاب کے اعتبار سے ہماری زبان میں ایسا جامع و مناسب لفظ کہاں؟ "ویمپائر" ایک ایسا لفظ ہے جس کا مفہوم ہماری زبان کے کسی ایک لفظ سے ادا نہیں ہوسکتا۔ مشرقی یورپ کے ایک روائتی خون آشام بھوت کو "ویمپائر" موسوم کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ایک خبیث روح ہے جو رات کی تاریکی میں اپنی قبر سے نکلتی ہے اور سوتے ہوئے آدمیوں کا خون چوس لیتی ہے۔ اس خبیث روح کا جسم انسانی جسم سے مُشابہ ہوتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ بھیانک چہرے کے علاوہ اس کے چمگادڑ جیسے دو بڑے بڑے پر بھی ہوتے ہیں۔ اسی لئے بعض حضرات نے "ویمپائر" کا ترجمہ "خفّاش" بھی کیا ہے مگر اِس لفظ سے مفہوم پوری طرح ادا نہیں ہوتا۔ اِسی دُشواری سے مجبور ہو کر مرزا صاحب نے کتاب کے دیباچہ میں تحریر فرمایا ہے:-

"ویمپائر" ایک انگریزی لفظ ہے اور مجھے تسلیم ہے میں نے انگریزی زبان کی چوری کی۔ ...
... دیکھتے نہیں آپ کہ اُردو زبان کے ادیب ایران اور عرب اور خراسان اور ٹرکی پر حملہ کر رہے ہیں اور عرب کو تو لوٹ لیا۔ میں چونکہ مُسلمان ہوں لہذا میں نے سوچا کہ مُسلمانوں کو

تو چھوڑو یہ لنگر یزی بڑی جاتی رقم ہیں۔ ان کے ہاں ڈاکہ ڈالو چنانچہ میں یہ لفظ انگلستان پر ڈاکہ ڈال کر زمعدی خدمت میں پیش کرتا ہوں کیونکہ اُردو کو اس لفظ کی بڑی سخت ضرورت ہے ........ یہ بھی نوٹ کر لیجیگا کہ یہ "میڈان انگلینڈ" ہے اور یہ مال ایران اور توران اور عرب اور عجم کہیں نہیں ملیگا"

صفحہ (۵) سے مرزا صاحب "معذرت" کے زیرِ عنوان تحریر فرماتے ہیں :-

گھاس چھیلتے چھیلتے جی میں آیا کہ لاؤ اُردو زبان کی کمر پر ایک لٹھ دیں۔ چنانچہ جب یہ طے کر لیا تو؟........ پھر کیا تھا........ لُغت پھاڑ ڈالی! قواعد پھینک دی! محاورے توڑ ڈالے! الفاظ دے مارے! جملوں کی ٹانگیں چیر ڈالیں! ٹریجڈی کا سر پھاڑ دیا! اور ظرافت نگاری کو چاروں خانے چت پچھاڑ دیا! اور پھر خم ٹھونک کر کہا۔ ع

دیکھا اِس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

ان سطور میں غالباً مصنّف نے ایک نئے انداز سے کسرِ نفسی کی ہے ورنہ واقعہ یہ ہے کہ جس طرز پر آپ لکھتے پڑھتے ہیں کسی اور کے بس کی بات نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ قلم کی روانی میں مرزا صاحب کے اکثر فقروں کی بندش سست اور ناقص رہجاتی ہے مگر زیرِ نظر تصنیف میں ایسے فقروں کی تعداد بہت کم ہے۔ برخلاف اس کے اکثر مقامات تو اس درجہ لطیف ہیں کہ ان کی مثال ان کی کئی اور تصنیف میں نہیں ملتی۔ افسوس کہ طوالت کے خوف سے یہاں مثالیں پیش نہیں کی جا سکتیں۔ طرزِ بیان کے اعتبار سے مرزا صاحب کی بہترین تصنیف یا زیادہ جامع الفاظ میں "چغتائی کا شہ پارہ" ویمپائر ہی ہے جس میں مصنّف کا زورِ قلم ہر فقرے سے عیاں ہے۔

"ویمپائر" میں سوسائٹی کے ایک گندے ناسور کو قلم کے نشتر سے چھیڑا گیا ہے چابکِ دستِ چغتائی کا نشتر فاسد مادّے میں سے یوں گذر گیا ہے جیسے صابن میں سے تار۔ "ویمپائر" کا پلاٹ، خواہ متدیّن و متشرّع حضرات اُسے اخلاقی حیثیت سے بدترین کہہ کر مُنہ ہی کیوں نہ پھیر لیں، (اور ان سے اس کے علاوہ اور ہو بھی سکتا ہی) ایک ایسی تلخ اور ناگوار حقیقت ہے جو رُو گردانی پر بھی اپنا نفرت انگیز چہرہ بار بار پیش نظر کرتی ہے۔ سوسائٹی کا بدترین جُرم "زنا بالجبر" ایسا جُرم نہیں ہے کہ اُس کی طرف سے آنکھوں پر ٹھیکری رکھ لی جائے اور کانوں میں تیل ڈال لیا جائے مگر ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ ہماری سوسائٹی کے ریفارمر اور بڑے آدمی اس کے انسداد و تدارک کی بجائے سرے سے اس کی طرف متوجہ ہی نہیں ہونا چاہتے۔ مرزا عظیم بیگ چغتائی نے جہاں سماج کی اور خامیوں کو چھیڑا ہے وہاں اب کے اس متعفّن زخم کو بھی کُرید ا ہے اور ان گندگیوں کو عُریاں کر کے منظرِ عام پر رکھ دیا ہے جو ہماری چشم پوشی اور سماجی قوانین کی کمزوری کی وجہ سے ہماری معاشرتی زندگی میں اپنا زہریلا اثر پھیلا رہی ہیں





Murari Art Press Delhi

میں یہاں مذہبی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا کہ اسلام نے ایسے مجرم کو کس سزا کا مستوجب قرار دیا ہے اور نہ میں یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارے علماء اس مسئلہ میں کیا کر رہے ہیں۔ ہاں یہ میں بھی دیکھتا ہوں اور دنیا بھی دیکھ رہی ہے کہ سوسائٹی کا ایک بدترین مجرم چند جھوٹی گواہیوں کی بنا پر ارتکابِ جرم کے بعد مکرر آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اور ایک معصوم ہستی اپنی مظلوم و مجبور زندگی کی خاموش سوگوار استانہ معصیت پر بھینٹ چڑھائی جانے کے بعد بدترینِ خلائق قرار دی جاتی ہے، محض اس لئے کہ اس کا بدترین جرم اُس کی بے بسی اور سب سے بڑا گناہ اس کی مجبوری ہوتی ہے۔

اصل کتاب کے بارے میں میں صرف اسقدر اور کہنا چاہتا ہوں کہ پلاٹ، اصلیت، مناسبت طرزِ تحریر، ہر اعتبار سے بہترین کہی جاسکتی ہے۔ کتاب کے مطالعہ کے دوران میں ذہنِ قاری محسوس کرتا ہے کہ دکھیا ہیروئن کے ساتھ ساتھ وہ پاپ اور دکھ کی دنیا میں پہونچ گیا ہے اور دیکھتا ہے کہ ہیروئن کا ہر قدم اُسے موت کے غار سے قریب تر کرتا جا رہا ہے یہانتک کہ جب یہ یقین ہو جاتا ہے کہ صرف آخری قدم اور اٹھانا باقی ہے اور یہ مظلومہ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے موت کی آغوش میں سو جائیگی عین اسوقت واقعات کی دنیا ہی بدل جاتی ہے اور ــــ کیا ہوتا ہے؟ میں یہاں بتانا نہیں چاہتا۔ مصنف کا یہ ایک اچھوتا تخیل ہے جس کا لطف اٹھانا ہر شخص کا کام ہے میں اُسے بیان کر کے لطف کرکرا نہیں کرنا چاہتا۔ شائقین کو یہ معلوم کر کے بھی بہت تعجب ہوگا کہ چغتائی صاحب جہاں قلم کے دھنی ہیں وہاں موقلم کے بھی اُستاد ہیں۔ اسکے ثبوت میں "ویمپائر" کی پانچ تصویریں پیش کی جاسکتی ہیں جنہیں سے دو ہم شائع کر رہے ہیں۔ ایک میں "ویمپائر" کا پلید رقص دکھایا گیا ہے۔ اور دوسری میں عبارت کے ایک خاص حصّہ کو مصوّر کیا گیا ہے۔ مصنّف کی تازہ ترین تصویر بھی اس میں شامل ہے کتاب کی ضخامت ۲۰۰ صفحات ہے۔ خوشنما مضبوط جلد۔ رنگین ٹائیٹل۔ کتابت وطباعت اعلیٰ درجہ کی۔ قیمت صرف دو روپے (۲؎) ہے۔ ملنے کا پتہ:۔ مصنّف جودھپور یا ساقی بک ڈپو دہلی۔

## تعلیم زن بیوی

ڈرامہ کی تاریخ" ایک وسیع اور وضاحت طلب موضوع ہے جس کے متحمل نقد و تبصرہ کے محدود صفحات نہیں ہو سکتے۔ مختصراً یوں سمجھئے کہ ڈرامہ متمدن زمانہ کی پیداوار نہیں ہے بلکہ کسی نہ کسی صورت میں ہر قوم اور ہر ملت میں نسلاً بعد نسلٍ پایا جاتا ہے۔ اسلاف کے ذیشان کارناموں کی یاد تازہ رکھنے اور اپنے احساسات کی نشر و اشاعت کی غرض سے جہاں اخلاف نے قصّے کہانیوں اور نظموں کا وسیلہ ڈھونڈا وہاں اس متبرک یادگار کو تا دیر قایم رکھنے کیلئے ڈرامہ کی داغ بیل بھی ڈالی۔ ہر چند کہ یہ نوع بھی انواعِ ماسبق کی طرح احساسی ہے۔ لیکن اس اختراعِ فائقہ کو اُن پر یہ تفوّق حاصل ہے کہ اُن میں اگر صرف سامعہ کو متاثر کرنے کی صلاحیت ہے تو اس میں سامعہ کے ساتھ ساتھ باصرہ نوازی کے اسباب بھی مہیّا ہوتے ہیں۔ یا یوں سمجھئے کہ اِن دونوں میں وہی فرق ہے جو کہ تخیل اور تشکل میں۔ محض سُنی سُنائی باتیں حافظہ پر اتنے گہرے نقوش نہیں چھوڑ سکتیں جتنی کہ آنکھوں دیکھی اور کانوں سُنی دونوں ملی جُلی۔ مزید بریں رقص و سرود کی شمولیت نے ڈرامہ کو اور بھی "جنّتِ نگاہ" اور "فردوسِ گوش" بنا دیا۔ غرض اسلاف کی یاد کو قایم رکھنے اور

اخلاف کیلئے اپنی محسوس یادگاریں چھوڑ جانے کے لئے ڈرامہ سے بہتر اور کوئی توسل نہیں ہوسکتا۔

جس طرح ایک افسانہ نگار اپنے گرد وپیش کے مناظر سے متاثر ہوکر سوسائٹی کے کسی خاص رُخ سے حسن و قبح کو اپنے افسانے میں اس انداز سے اُبھار کر بیان کرتا ہے کہ ذہنِ قاری یا ذہنِ سامع زیادہ سے زیادہ متاثر ہو۔ اسی طرح ایک ڈرامہ نسٹ بھی اپنے ماحول کے زیر اثر سماج کے کسی ایک پہلو کو لے کر اُسکے خوب و زشت کو اپنے کرداروں کی زبانی نہ صرف بالوضاحت کہلوا دیتا ہے بلکہ اداکاروں کی حرکات و سکنات سے باصرہ کے ذریعہ دیکھنے والوں کے ذہنوں کو اس درجہ متاثر کر دیتا ہے کہ جب چاہتا ہے رُلا دیتا ہے اور جب چاہتا ہے ہنسا دیتا ہے۔ ڈرامہ کا مقصد محض طلبِ تعیش و حصولِ مسرت نہیں ہے۔ ڈرامہ ہی اصلاحِ معاشرت و حسنِ معیشت، بلکہ اصلاحِ تمدن و سیاسیات کی بھی بہترین درسگاہ ہے۔ جو ڈرامے اس اصلاحی مقصد کو نظر انداز کرکے اسٹیج کئے جاتے ہیں۔ حیاسوزی اور بداخلاقی کے بدترین نمونے ہوتے ہیں مگر نہیں بہت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہندوستانی ڈراموں میں آج بہ استثنائے چند جس بدذوقی اور کور مذاقی کا ثبوت ملتا ہے اُس کی مثال نہ تو دُنیا کے کسی اور حصّہ میں ملتی ہے اور نہ اب سے پہلے خود ہندوستانی ڈرامہ ہی کی تاریخ میں اِس مُتبذل روش کی نظیر ملیگی۔

ڈرامے کی بے شمار اصناف میں سے دو بہت نُمایاں ہیں:۔

(۱) ٹریجڈی۔ (حزنیہ) ———— (Tragedy)

(۲) کامیڈی۔ (مزاحیہ) ———— (Comedy)

ہماری زبان میں اگر اوّل الذکر کی حالت بد ہے تو ثانی الذکر کی بدتر اور جب دو ایسے مختلف ڈراموں کے سین جن میں سے ایک ٹریجک اور دوسرا کامک ہو۔ یکے بعد دیگرے دکھائے جاتے ہیں تو دونوں بدترین نظر آتے ہیں۔ ہندوستانی اسٹیج کی پستی اور پبلک کی سوء مذاقی اسی سے ظاہر ہے کہ موخر الذکر طرز کے متضاد و متناقض ڈراموں کو پہلو بہ پہلو پیش کرنا ہماری تھئیٹریکل کمپنیاں اپنی ایک قابلِ فخر خصوصیت اور لائقِ رشک کامیابی سمجھتی ہیں حالانکہ اس خلط مبحث سے "تسلسل" جو ڈرامہ کی روح رواں ہوتا ہے نہ ایک میں قائم رہتا ہے نہ دوسرے میں۔ بھدی اور بھونڈی سین سینری کے علاوہ مُروّجہ ڈراموں کے پلاٹ جدت سے اور اداکار اپنی جان سے عاری نظر آتے ہیں۔ ڈرامہ زندگی کی جیتی جاگتی تصویر ہوتا ہے۔ مگر ہمارے ڈراموں میں فطرت سے بغاوت اور نوامیسِ فطرت کی خلاف ورزی کو بڑا ہنر سمجھا جاتا ہے۔ خلافِ قیاس مظاہر اور مافوق الفطرت کارناموں کی نمائش پر ڈرامہ کی بُنیاد رکھی جاتی ہے۔ شوہر کے مرنے پر ہندوستانی اسٹیج کی بیوی کا فرض ہے کہ ایک بھڑکتی ہوئی عاشقانہ غزل گائے اور بچہ اگر آنکھوں کے سامنے ذبح کر دیا جائے تو مامتا کی ماری ماں جب تک ایک گیت نہیں گا لیتی اُسے چین نہیں آتا۔ یہ اور اسی قسم کے بے شمار نقائص بیک نظر دیکھے جاسکتے ہیں۔ افسوس کہ یہاں اُن کو فرداً فرداً گنوانے کی گنجائش

نہیں، ہندوستانی کامک اسٹیج کی کُل کائنات چند لغو اور فحش پلاٹ ہیں جن میں مزاح کا شائبہ بھی نہیں ہوتا۔ ہاں یاوہ گوئی اور ہرزہ سرائی کا نمونہ جو ہمارا اسٹیج پیش کرتا ہے کسی اور ملک میں ہرگز اسکا جواب نہیں مل سکتا۔

کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ نور الٰہی محمد عمر صاحبان نے چند پاکیزہ مزاحیہ ڈرامے غیر زبانوں سے ترجمہ کئے اور اس طرح اُردو ڈرامہ کے سرمایہ میں معتد بہ اضافہ کیا۔ جناب فضل حق قریشی دہلوی نے بھی اس کمی کو محسوس کرتے ہوئے چند مزاحیہ ڈرامے لکھے اور ترجمہ کئے جو وقتاً فوقتاً مُوقّت الشیوع اردو رسائل میں شائع ہوئے اور بہت پسند کئے گئے۔ حال ہی میں آپ نے "تعلیم زدہ بیوی" کے نام سے ایک ڈرامہ لکھا ہے جس کا پلاٹ مشہور فرانسیسی ڈرامہ نویس مولیئر کے تین ڈراموں سے ماخوذ ہے بلکہ یوں سمجھئے کہ مولیئر کی طرز کو اپنی زبان میں نبھایا ہے۔ زبانِ غیر کی جملہ خوبیاں برقرار رکھتے ہوئے اپنی طرف سے اس میں پاکیزہ اضافہ بھی کیا ہے۔ اس ڈرامے کی پہلی خوبی یہ ہے کہ یہ ایک اصلاحی ڈرامہ ہے جس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ بعض کج فہم لڑکیاں تعلیم حاصل کرنے کے بعد مغالطہ اور خود فریبی میں مبتلا ہوجاتی ہیں۔ سلمیٰ ایک ایسی ہی آزاد منش مگر ناقص الرائے بیوی ہے جو اپنے سادہ لوح شوہر کو روحانی اور جسمانی تکلیف پہنچاتی ہے، خود شدید آفتوں میں مبتلا ہے جس کی وجہ سے اس کو بسا اوقات سخت مصیبتیں اُٹھانی پڑتی ہیں اور بالآخر شرمندگی اور ننگوں ساری ہوتی ہے۔ آزادی کے لئے بھی چند قیود کی پابندی لازمی ہے۔ یہ پابندیاں "تعلیم یافتہ" لڑکیاں محسوس کر سکتی ہیں۔ "تعلیم زدہ" نہیں۔ سیٹھ صاحب اور اُن کی لڑکی کے واقعات کچھ اس پُرلطف پیرایہ میں قلمبند کئے گئے ہیں کہ اُنہیں پڑھکر بے اختیار ہنسی آتی ہے۔ اس میں بھی اصلاحی پہلو یہ رکھا گیا ہے کہ والدین کو چاہیئے کہ رشتۂ مناکحت قائم کرنے سے پہلے لڑکی کا بھی عندیہ لے لیں۔ اگرچہ یہ دونوں موضوع اچھوتے نہیں ہیں تاہم نصیحت اگر نصیحت کے پیرایہ میں کیجاتی تو اتنے خاطر خواہ نتائج برآمد نہ ہونے جتنے کہ اس پرلطف پیرایہ میں پیش کرنے سے برآمد ہونے کی اُمید کیجا سکتی ہے۔

"تعلیم زدہ بیوی" آسانی سے اسٹیج کیا جا سکتا ہے۔ گنتی کے صرف چھ افراد ہیں۔ سین سینری اور زرق برق لباسوں کی مطلق ضرورت نہیں۔ اس ڈرامہ میں آلاتِ موسیقی اور جا و بیجا گانے بھی نہیں ہیں۔ لیکن باوصف ان تمام عدم موجودگیوں کے اور عام روش کے ڈراموں سے یکسر جُدا ہوتے ہوئے بھی مجھے اُمید ہے کہ "تعلیم زدہ بیوی" اگر مقبولیت عام نہیں تو مقبولیت خاص ضرور حاصل کریگا۔

اس ڈرامہ کے متعلق ایک امر یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ روشن تھیٹر دہلی میں نہایت کامیابی کے ساتھ اسٹیج کیا گیا اور خود مصنف نے اختر کا پارٹ کیا۔

ضخامت ۸۸ صفحات۔ کتابت طباعت عمدہ۔ قیمت صرف آٹھ آنے (۸؍) ساقی بکڈپو سے یہ کتاب مل سکتی ہے۔

"شاہد"




# شہنشاہِ ظرافت حالتِ غیض میں

—— آخر اس کور ذوقی کی حد بھی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ دُنیا بھر کے ادبی رسائل میں صرف "ساقی" ہی ایسا جلیل القدر رسالہ ہے جو ہر سال ایسا "ظریف نمبر" پیش کرتا ہے جس میں سینکڑوں قہقہہ خیز مضامین اور ہزاروں مزاحِ عالیہ کے رنگارنگ افسانے ہوتے ہیں۔

اب دیکھئے نا غصہ آئے یا نہ آئے —— بھلا ساقی غریب ہمارا نام روشن کرنے کے لئے یوں سر توڑے اور آپ ہیں کہ ٹس سے مس نہیں ہوتے ہیں سچ کہتا ہوں اگر آپ نے ظریف نمبر نہ خریدا تو مع اس نورانی داڑھی اور اس "کمر توڑ" لکڑی کے کسی دن خواب میں آکر آپ کی تواضع کر دوں گا —— آپ میری توہین کریں اور میں ٹک ٹک دیکھا کروں......"

## ساقی کا ظریف نمبر اپنا جواب آپ ہو گا۔

# عقدۂ لاینحل

از جناب فضلِ حق قریشی دہلوی

دنیا کے بڑے بڑے فلسفی جو اپنے علم و فضل کے اعتبار سے بلا مبالغہ سقراطِ عصر کہلانے کے مستحق ہیں، میری درسگاہ میں آتے ہیں۔ اپنے دقیق مسائل جن کی توضیح ان کی عقل و فراست سے بعید ہوتی ہے میرے سامنے پیش کرتے ہیں۔ میں چند لمحے ان پر غور کرتا ہوں اور بالآخر ان کو اس کاوشِ پیہم سے رہائی ہو جاتی ہے جس کی خلش سے تنگ آ کر وہ میری دہلیز تک آئے تھے۔ بڑے بڑے مؤقت الشیوع رسائل میرے عالمانہ مضامین سے اپنے اوراق کو زینت دینا باعثِ فخر تصور کرتے ہیں۔ حاملانِ ادب اور محققینِ حکمت مجھ سے شرفِ نیاز حاصل کرنے کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں۔ شہرۂ آفاق اداروں میں میرے علمی نظائر کا حوالہ پیش کر کے درسِ حکمت دیا جاتا ہے۔ میرے دریافت کردہ نسخے اور ایجاد کردہ ادویات مایوس العلاج مریضوں کے لیے مسیحائی کا کام کرتی ہیں۔ ماہرینِ فلکیات، ثوابت و سیّار کی بابت مجھ سے استفسار کرتے ہیں۔ میں ان کی گردش و رفتار کے متعلق تسلی بخش جواب دے کر انہیں مطمئن کر دیتا ہوں۔ ان کا خیال ہے کہ اگر دنیا میرے تجربات سے مستفید نہ ہو تو عالم کے رازہائے سربستہ کا انکشاف نہیں ہو سکتا۔ اخبارات کے نامہ نگار میرے دار المعمل کا محاصرہ کیے رہتے ہیں تاکہ برقیات و کہربا کے ضمن میں جدید سے جدید معلومات بہم پہنچا کر شائع کر سکیں۔ علمی مجلسوں میں تقریر کرنے کے لیے مجھے دعوتیں دی جاتی ہیں۔ لوگ میرے ہر ہر لفظ کو ہمہ تن گوش ہو کر سنتے ہیں۔ میں اپنی تقریر کے دوران میں صد ہا نکاتِ حکمت کی توضیح کر ڈالتا ہوں تو سامعین نعرہ ہائے تحسین کے ساتھ میری مسلّم الثبوت قابلیت کے معترف ہو جاتے ہیں۔ میں مصروفِ سفر ہوتا ہوں تو منزلِ مقصود پر پہنچنے سے قبل میری شہرت پہنچ جاتی ہے۔ اور دنیائے شہر نہایت سرگرمی کے ساتھ میرے استقبال کی تیاری شروع کر دیتے ہیں۔ انتہائی ذوق و شوق کے ساتھ میری تصویریں اتاری جاتی ہیں — علمِ نجوم و رمل میں مجھ کو ایسی مہارت حاصل ہے کہ بڑے بڑے منجّم و رمّال خود اپنی قسمت کا حال مجھ سے دریافت کرتے ہیں — ان کو یقین ہے کہ میرے وضع کیے ہوئے قوانین نوامیسِ فطرت پر بھی حاوی ہیں۔

کاش یہ غلط فہمی ان لوگوں کے دلوں سے محو ہو جائے جو میری تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہیں۔ وہ اس حقیقت سے واقف ہو جائیں کہ میرا ناقص علم اس قدر وسیع نہیں ہے جتنا کہ وہ تصور کرتے ہیں۔ اگر مجھ سے دریافت کیا جائے تو میں یہ کہنے کے لئے تیار ہوں کہ میں اپنے آپ کو ایک جاہلِ مطلق تصور کرتا ہوں — آخر کیوں؟ — سنو محض اس لئے کہ میری فکرِ رسا اس رازِ سربستہ کی عقدہ کشائی نہ کر سکی۔ جو مدتِ مدید سے میرے دل میں جاگزیں ہے۔ میں نے اپنا استفسار ان لوگوں کے سامنے بھی پیش کیا جو میرے علم سے افادہ حاصل کرنے کے لئے میرے دار المعمل میں آتے تھے۔ مگر افسوس! وہ میری خلش کو دور کرنے سے قاصر رہے۔ کاش دنیا کی کوئی ہستی مجھے یہ بتا دے کہ:

"آخر وہ اُن کی کونسی ادا تھی جس نے میرے دل کو موہ لیا ہے!"

فضلِ حق قریشی دہلوی

# حُسن و عشق کی ہلاکت آفریں آویزش

## کتب مُصنّفہ جناب انصار ناصری دہلوی۔ بی۔ اے

**چندرا موہنی!** حُسن و عشق کی ایک جگر پاش داستان مُحبّت کے لطیف جذبات کا مُرقع۔ حُسن کی ہلاکت پسندی عشق کی عبرتناک لمناکی سچّی محبت کا غمناک انجام لیلیٰ مجنوں کی داستانِ پارینہ اور شیریں فرہاد کا افسانۂ کُہن چندرا موہنی کی زہرہ گداز سرگذشت کے آگے بدرنگ اور پھیکی کہانیاں نظر آئینگی "چندرا موہنی" سے زیادہ دردناک انجام آپنے حُسن و عشق کی کسی حکایت میں نہیں دیکھا ہو گا۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ حساس طبیعت رکھنے والے حضرات اسکو پڑھکر اپنے آنسو ضبط نہیں کر سکینگے قیمت عہ علاوہ محصولڈاک ؛

**نجمہ نوری** ماں کی مامتا کے متعلق ایک اندوہ تمثیل۔ ناممکن ہے کہ آپ اسے پڑھیں اور آپکے لطیف جذبات کو ٹھیس نہ لگے۔ نجمہ کی خانہ بربادی گھر سے نکلکر نجمہ نے معصیت کی زندگی میں کیا دیکھا؟ گناہ آلود زندگی نے اُسے کیا سکھایا؟ جھوٹے فریبی عاشقوں نے اُسکے ساتھ کیا سلوک کیا؟ نجمہ اپنی گھناؤنی زندگی سے خود بیزار ہو جاتی ہے۔ مگر اپنے بچے کی خاطر اپنے ناپاک وجود کو زندہ رکھتی ہے کس طرح؟ کیسی کیسی مصیبتیں جھیل کر؟ ناقابلِ بیان تلخ حقیقتیں اس تمثیل میں ملاحظہ کیجئے جو گناہ اور موت کی لرزہ خیز تصویر ہے قیمت ۱۲ر علاوہ محصول ؛

**سلمیٰ!** حسین سلمیٰ جب اپنے پاکباز محبوب پر اپنے حُسن کے جادو سے فتح نہیں پا سکتی تو ایک عجیب و غریب شرط کی تکمیل کے لئے اُس کا سر حاصل کرتی ہے اور اُسکے مُردہ لبوں کو دیوانہ وار چوم کر تسکینِ جنونِ عشق کرتی ہے سلمیٰ اپنے محبوب کو زندہ حاصل نہ کر سکی تو اُس نے اپنے محبوب کو موت کے گھاٹ اُتار کر اُسے حاصل کیا اور اِس ناپاک جذبۂ حیوانی کے آستانہ پر اپنی جان بھی بھینٹ چڑھا دی۔ ہلاکت پسند حُسن کی بہترین تمثیل ہے قیمت ۵ر علاوہ محصولڈاک ؛

ملنے کا پتہ:- **ساقی بُک ڈپو دہلی**

تار کا پتہ: ریمیڈی سنٹر دہلی — ٹیلیفون نمبر ۵۵۶۶

# اکسیر نایاب

## دُنیا کی مقوی باہ اور مُمسک دواؤں کی سرتاج ہے

سینکڑوں مریض جن میں ہر طبقہ کے لوگ حتیٰ کہ والیان ریاست بھی شامل ہیں اسکے فوائد کی تصدیق کر چکے ہیں

**اکسیر نایاب** اعلیٰ درجہ کی مقوی باہ اور ممسک ہونے کے علاوہ عام مقوی جسم (ٹانک) بھی ہے۔ تمام جسمانی قوتوں کو بحال کرتی ہے ضعف اعصاب اور ضعف دماغ کو دور کرکے جسم میں ایک نئی روح پیدا کرتی ہے۔ دماغی کام کرنے والوں کے لئے اکسیر ہے۔ دماغی تکان کو دور کرکے دماغ کو فوراً کام کے لئے مستعد کرتی ہے اور فرحت و تازگی پیدا کرتی ہے مرض سرعت کیلئے لاثانی دوا ثابت ہو چکی ہے چند روز کے استعمال سے قدرتی امساک پیدا کرتی ہے۔ ان فوائد کے علاوہ دائمی نزلہ و زکام اور نزلہ کی کھانسی کے لئے بھی بیحد مفید ہے۔ قیمت ۲۴ گولی چار روپے (للعہ) جو اس کے فوائد کے مقابلہ میں بہت کم ہے۔

# ماء اللحم خاص الخاص

## جدید سائنٹفک طریقہ سے تیار کیا جاتا ہے اور کیمیاوی امتحان سے بھی اس کی تصدیق ہو چکی ہے

یہ بہترین مقوی جسم (ٹانک) اور زود ہضم غذا و دوائی ہے جسمانی قوتوں کو قوی کرنا، اعضائے رئیسہ اور روح کو قوت دینا، [illegible] کو برانگیختہ کرنا اس کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے۔ صالح اور جید خون بکثرت پیدا کرتا ہے۔ لہٰذا جسم میں بہت جلد نمایاں ترقی کرتا اور طبیعت میں فرحت اور بشاشت اور دل میں حوصلے اور ولولے پیدا کرتا ہے۔ تقویت باہ اور امساک کے لئے حیرت انگیز اثر رکھتا ہے جو شخص ایک بار استعمال کر لیتا ہے وہ اس کو بار بار طلب کرتا ہے اور اپنے [illegible] دوستوں کو طلب کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔

نوٹ: ہندوستانی دواخانہ کی خاص چیز ہے کسی دوسرے دواخانہ سے "اصلی" ملنا ناممکن ہے قیمت فی بوتل پانچ روپے (صـہ)

ہندوستانی دواخانہ دہلی پوسٹ بکس نمبر ۲۳

# خمستان

زیر طبع

ہندوستان کے مایۂ ناز شاعر نقاش فطرت حضرت خواجہ عبدالسمیع پال اثر صہبائی ایم اے، ایل ایل بی وکیل سیالکوٹ و ہائیکورٹ جموں و کشمیر کا نام نامی دنیائے ادب میں محتاج تعارف نہیں ہے۔ آپکا کیف انگیز کلام ملک کے بہترین رسائل میں شایع ہو کر ارباب ذوق سے خراج تحسین حاصل کرتا رہتا ہے اس سے قبل آپکی رباعیات و قطعات کا ایک مختصر سا مجموعہ جام صہبائی کے نام سے شایع ہو کر ملک کے علمی اور ادبی حلقوں میں مقبول ہو چکا ہے معارف، اردو، ہمایوں، ساقی، اور پیشوا وغیرہ میں بہترین تبصرے شایع ہو چکے ہیں ۔ اخبارات ٹریبیون، نگرینی، انقلاب اور زمیندار نے بھی اس مجموعہ کو ادب اردو میں ایک گرانقدر اضافہ قرار دیا ہے۔ مشاہیر نقادان فن نے حضرت اثر کے ادبی کمالات کا اعتراف کیا ہے۔

حضرت علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ ایڈیٹر معارف اعظم گڑھ نے حضرت اثر کو اردو کا خیام اور سحابی قرار دیا ہے حضرت نیاز فتحپوری ایڈیٹر نگار لکھنؤ نے حضرت اثر کی شاعری کا اعتراف کرتے ہوئے اس مجموعہ کو حقیقی معنوں میں "خمستان" تصور فرمایا ہے علامہ کیفی دہلوی نے حضرت اثر کو جدید شاعری کا سرمایہ آبرو اور علمبردار بیان فرمایا ہے چوہدری خوشی محمد صاحب ناظر کے الفاظ میں یہ رباعیات اردو زبان میں ایک درخشاں اور ہمیشہ زندہ رہنے والی چیزیں ہیں یہ حال ہی میں اکثر احباب کے اصرار پر حضرت موصوف نے اپنے کلام کا مجموعہ "خمستان" کے نام سے مرتب فرمایا ہے جو مندرجہ ذیل ابواب پر منقسم ہے:-

(۱) **تخیلات**۔ حافظ شیرازی کی رندی و مستی، اقبال کی حیات افروز اور حقائق آفریں نغمہ سرائی، غالب کی ندرت نگاہی ... کے سوز و گداز کو یکجا کر کے حضرت اثر نے اردو غزل میں نئی روح پھونک دی ہے۔

(۲) **سمن زار**۔ قریباً پچاس نظموں کا مجموعہ ہے جن میں ستارۂ صبح، خمستان بہار، تاروں بھری رات، بلائے جانی اور پیلا ساقی، پھول اور ستارہ، کائنات اور انسان، اور عالم افسردگی خاص طور پر مقبول ہو چکی ہیں۔ انہی نظموں سے متاثر ہو کر ایڈیٹر ہزار داستان لاہور نے حضرت اثر کو ورڈزورتھ، کیٹس اور شیلے کا ہمپایہ قرار دیا ہے۔

(۳) **جام صہبائی**۔ علامہ کیفی دہلوی کے الفاظ میں "جام صہبائی حقیقت میں مناظر فطرت کی رنگینیوں، حسن و عشق کی نغمہ سرائیوں، بادۂ عرفان کی سرمستیوں اور فلسفہ و حکمت کی حقائق آرائیوں کا روح افروز مجموعہ ہے"

(۴) **راحت کدہ**۔ اس میں چار سو کے قریب اشعار ہیں۔ شاعر نے یہ اشعار اپنی جواں مرگ رفیقۂ حیات "راحت" کے غم میں ڈوب کر لکھے ہیں یہ اشعار خود شاعر کے الفاظ میں "داغہائے فرقت کے چند پھول، اشکہائے محبت کے موتی اور سازہائے غم کے چند نغمے ہیں۔

(۵) **ستارے**۔ ایک سو کے قریب منتخب متفرق اشعار ہیں۔

خمستان کا سائز ۲۰×۲۶/۱۶ رکھا گیا ہے۔ کتابت نہایت اہتمام کے ساتھ ایک بہترین کاتب و آرٹسٹ کے سپرد کی گئی ہے۔ ضخامت قریباً اڑھائی سو صفحات ہوگی۔ طباعت۔ اقبال برقی پریس سیالکوٹ میں طباعت و اشاعت کے لئے بھیجی گئی ہے۔ تشنگان بادۂ سخن سے امید ہے کہ وہ "خمستان" کی اشاعت میں پورے شوق سے کام لینگے قیمت مجلد ہے غیر مجلد عہ قبل از اشاعت جو حضرات اپنے اسمائے گرامی خریداروں کی فہرست میں شامل کرا دیں گے ان سے رعایتی قیمت مجلد عہ غیر مجلد ۱۲؍ لی جائیگی ۔

**المشتہر منیجر آزاد بکڈپو سیالکوٹ**

## شاہی کوکشاستر

شاہانِ مغلیہ و ترکی نے جہانبانی کے سب مراحل طے کرنے کے بعد جب تعیش کی ادنیٰ کی وادی میں قدم رکھا تو سب باہنر نے لذت کے سرچشمہ عورت کو اپنے اپنے انداز میں پیش کیا لہٰذا وہ تدبیریں اور نسخہ جات جو ایک جوان اور نئی عورت سے متعلق کر سکتا ہے شاید ہی وہ اپنے پلنگ کبھی نہیں جوان اسباب تعیش نے عورت کے دل میں گدگدیاں کی تلاش کیں اور اسی طرح مردانہ قوت مدنی کی وہ دوائیاں بیان کیں کہ جس سے معلوم ہوسکتا ہے کہ انسان ضعیف البنیان ہے لیکن درحقیقت بڑی طاقت کا حامل ہے اور اس کی حیثیت بالکل ایک انجن کی ہے جو ذرا سی ترکیب اور جنبش کے بعد ہزاروں ہارس پاور کی طاقت نمایاں کر دیتا ہے اور ایک نہیں صدہا ترکیبیں ایسی ہیں جو ایک نہیں چار چار عورتوں کو مسخر کرسکتی ہیں جیسے کہ ایک بات اور سن لیجئے اس کتاب میں مغلیہ اور سلاطین نے اپنی بیوہ وہ حکایتیں بیان کی ہیں کہ صدہا مجرموں ایک طرف اور ایک حکایت سننے کا اثر ایک طرف۔ غرض عورت اور مرد کی مواصلت کی انسائیکلو پیڈیا ہے ضخامت ۹۰ صفحات قیمت عہ محصول ۷ /ر

## کیف مواصلت

دُنیائے لطف و مسرت اور لذت و کیف میں تنہائی چیز ایک مرد اور جوان مرد کے لئے عورت ہے مواصلت ہے اور یہی وہ کیف افزا امر ہے کہ جس پر دُنیا کی بقا کا دار و مدار ہے۔ یوں تو فطرت کی بسیط دُنیا میں ہزاروں ہستیاں ایسی ہیں جو صرف قانونی طریق پر دُنیا کی آبادی میں اضافہ کرتے اور چل بستے ہیں لیکن یہ زندگی تو حیوانوں جیسی گذارتے ہیں انسان وہ ہے کہ جس کیف پرور شعبہ جات کا اس درجہ تمتع حاصل کرے جو دوسرے ذی حیات عالم سے مابہ الامتیاز ہو۔ یہ کتاب مواصلت کے اس درجہ پر پہنچا دیتی ہے جہاں لذت ہی لذت ہے۔ کتاب کے جزئیات سے تعارف اتنے مختصر اشتہار میں ناممکن ہے صرف اتنا بتا دینا چاہتا ہوں کہ یہ کتاب سید صابری ماہر علوم صنفیات کی سب سے زیادہ کیف انگیز اور آخری تصنیف ہے اور نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اول کی مصداق ہے۔ ۹۰ صفحات کی ضخامت ہے اور متعدد قلمی تصاویر اندرونی اعضائے جسمانی اور فوٹو بلاک کی بھی ہیں۔ قیمت عہ محصول ۷ /ر

## لذت النساء اور بہار عیش

ان دونوں خرب اخلاق کتابوں کی تلاش میں اپنا وقت برباد نہ کرو۔ ماڈرن کوکشاستر کو آج ہی پھاڑ کر پھینک دو۔ شب عروسی کے افسانے پڑھو جو کسی کوک پنڈت کی نہیں بلکہ ہندوستان کے ایک نامور ماہر علم النساء کی لکھی ہوئی نایاب کتاب ہے جس کا نام عروس نو ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے آپ کو معلوم ہوگا کہ عورت کے حسن کی بہار کس طرح لوٹی جاتی ہے حقیقۂ حیات کی سرمستی۔ اسکے جذبات کا ہیجان منزل کرنے کے لاجواب طریقے، لطف اندوز ہونے کی لاتعداد نئی نئی ترکیبیں، ہم آغوشی کی البیلی کیفیتیں، دلولہ خیز اور شباب آفریں ترکیبیں، غرض کہ وہ تمام باتیں آپ کو عروس نو میں ملیں گی جنہیں پڑھ کر ایک مرتبہ مرجھائی ہوئی کشت تمنا بھی سرسبز ہو جاتی ہے۔ ضخامت ۱۹۲ صفحات قیمت دو محصول ۵ /ر

## ایرانی کوکشاستر

شباب جاودانی کی جستجو ہو تو ”لذت شباب“ یعنی ایرانی کوکشاستر کا مطالعہ کیجئے جس کے مطالعہ سے آپ کو معلوم ہوگا کہ شباب کو عرصہ دراز تک کس طرح قائم رکھ سکتے ہیں۔ عورت کے تاثرات کیا ہیں حسن کی ملکہ سے کس طرح لطف اندوز ہونا چاہیئے۔ عورت اگر عورت سے اور مرد اگر مرد سے اپنی خواہش پوری کرے تو کیسے خطرناک نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ لذت شباب میں سرمستان شباب کو حیات تازہ بخشنے کے لئے تاجداران بنگال اودھ اور رامپور کے درباری طبیبوں کے سینکڑوں سہل الحصول صدری مجربات ہیں۔ ضخامت تقریباً پونے دو سو صفحات۔ آٹھ بہترین بلاک کی تصاویر اور قیمت صرف ایک روپیہ دو عہ محصول ۶ /ر

**ملنے کا پتہ:۔ ادبستان کٹرہ ٹریاں دہلی**

## شب نامچہ عروسی

اس کتاب میں نہایت دلآویز اور پُر کیف طریقہ پر ازدواجی زندگی کے تمام پوشیدہ رازوں اور رازداروں کو نہایت وضاحت و متانت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ عورت کی ازدواجی مسرتوں کا راز اسی میں پوشیدہ ہے کہ وہ شادی کے متعلق تمام امور سے واقف ہو جائے ہندوستان کے گھروں میں بدنصیب میاں بیوی کی زندگی بڑے عذاب میں کٹتی ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ عورت کو شادی سے پیشتر اپنی آیندہ زندگی کے متعلق ذرا بھی علم نہیں ہوتا اسی خیال کو پیش نظر رکھ کر یہ کتاب صدہا مغربی کتابوں کی ورق گردانی کے بعد لکھی گئی ہے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ نوعمر عورتوں کی صنفی تعلیم کے لئے ہندوستان میں یہ سب سے پہلی کتاب ہے گیارہ اعلیٰ درجہ کی فوٹو بلاک کی تصویریں لگی ہیں ضخامت ۱۶۴ صفحات قیمت عہ محصول ۶ ر

## برتھ کنٹرول

عورت کی شباب آفریں لذت اسوقت حاصل ہوسکتی ہے جبکہ تم اسکے حسن و جمال کے خزانہ کو محفوظ رکھنے کا راز سمجھ لو۔ اولاد کی کثرت سے نہ صرف ملکۂ حسن کے باغِ جمال پر خزاں چھا جاتی ہے بلکہ غریب والدین کے لئے انکی پرورش سوہانِ روح ثابت ہوتی ہے اور انسان ازدواجی زندگی کی سچی مسرتوں سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو جاتا ہے تم کو معلوم ہو جائیگا کہ اولاد کی پیدائش کو روک کر زندگی کی بہار لوٹنے کا سچا پر شباب طریقہ کیا ہے جب چاہو گے اولاد ہوگی اور جب چاہو گے اولاد نہ ہوگی۔ پھر لطف یہ کہ اس حیرت انگیز کتاب سے تم حسب خواہش بیٹا یا بیٹی بھی پیدا کر سکتے ہو۔ برتھ کنٹرول یورپ و امریکہ کی بہترین سائنٹفک کتابوں کا جوہر ہے اور برسہابرس کے تجربات کا نچوڑ ہے ضخامت ۸۰ صفحات قیمت عہ محصول ۶ ر

## سہاگن کا سہاگ

شریف خواتین کے لئے ناول کے پیرایہ میں صنفیات کی وہ اہم تعلیم ہے جسکے مطالعہ سے ہر سہاگن کا سہاگ عیش و نشاط سے لبریز ہو جائیگا پردے ہی پردے میں وہ تمام باتیں بیان کر دیگئی ہیں جنکا علم ایک نوعمر دولہا کے لئے نہایت ضروری ہے پھر لطف یہ کہ حجلۂ عروسی کی پس پردہ جھلک کیساتھ ہی اسمیں ایک لفظ بھی ایسا نہیں جو مذاق سلیم پر بار ہو افسانہ کا دلکش ترین پلاٹ سہیلیوں کی پُرلطف نوک جھوک محلات لکھنؤ کی خالص زبان سات دلہنوں کی زبان سے شب عروسی کی داستانیں ازدواجی زندگی کے اہم ترین پوشیدہ رازوں کا انکشاف غرض کہ سہاگن کا سہاگ دنیائے صنفیات و ادب میں اپنے طرز کی ایک ہی کتاب ہے جسکو سات دلہنوں نے ایک شادی کے جلسہ میں بیان کیا قیمت عہ محصول ۵ ر

## شبِ عروسی

دس رنگی تصویریں

پڑھ لینے کے بعد تم کو خانگی زندگی میں جنت کا لطف آئیگا۔ نوجوانوں کے لئے علم الازدواج پر یہ معرکۃ الآرا کتاب عرصہ دراز کی محنت اور ہندی انگریزی کتابوں کی ورق گردانی کے بعد بصرف زرکثیر لکھی گئی ہے، یہ مغرب کی تازہ ترین صنفی تحقیقاتوں کا جوہر ہے اس میں ازدواجی زندگی کی اہم ذمہ داریوں محبوبہ سے صحیح معنوں میں لطف اندوز ہونیکے طریقے مواصلت کے اوقات، استقرار حمل کی کیفیت اور اس کے طریقے۔ علاوہ بریں اسمیں ازدواجی زندگی کو کامیاب بنانیکے لئے وہ بیش قیمت طریقے درج ہیں جنہیں آپ لاکھوں روپیہ صرف کر کے بھی حاصل نہیں کر سکتے ضخامت ۱۶۰ صفحات قیمت عہ محصول ۵ ر

**ملنے کا پتہ۔ ادبستان کٹرہ بڑیاں۔ دہلی**

# فلسفۂ مسرت!

(از جناب منظور حسین ماہر القادری)

یہ امر بدیہی ہے کہ حیاتِ انسانی مسرت و غم سے عبارت ہے۔ زندگی کے کسی شعبہ کا بھی بالاستیعاب جائزہ لیجئے تو یہ بات بہت زیادہ واضح ہو جائے گی کہ رنج اور خوشی کا چولی دامن کا ساتھ ہے عیش کی محفلوں کا [illegible] سرور جہاں تفریحی محفلوں پر منحصر ہے اندوہناک آہیں بھی ہنگامۂ محفل کی گونج میں برابر شریک ہیں۔ یہ تو روز مرہ کے مشاہدات ہیں کہ آج ایک محفل کا ذوق و ابتہاج انتہا پر ہے اور کل وہاں بجھے دل کی راکھ اڑائی جاتی ہے۔ خاک اڑ رہی ہے نحوست و وحشت طاری ہے اور آثار ماتم گذرتے ہوئے ہیں۔ ابھی حال کی بات ہے کہ ہسپانیہ تاج قرطبہ کے کھنڈر دیکھنے کیلئے گیا تھا۔ یہ امر کسی تشریح کا محتاج نہیں کہ ایک زائر کو اسلام کی تباہی و بربادی کا کیا درد ہو سکتا ہے لیکن جب یہ [illegible] سیاح قرطبہ کے عالیشان کھنڈروں کے قریب پہنچا تو بے اختیار وہ چیخ اٹھا اور مسلمانوں کے عظمت پر ماتم کیا۔ اور حیرت و شکوہ کن برباد کئے رنج انگیز مناظر [illegible]

ظریف نمبر کا مقصد مزاح و ظرافت ہے اور مزاحیہ نگاری کا سرمایہ مسرت اور صرف مسرت ہے لہٰذا ہم حیاتِ انسانی کے اسی عنصر پر یہاں بحث کرتے ہیں۔ انشاء اللہ کسی آئندہ اشاعت میں "فلسفۂ غم" پر بھی اظہار خیال کرینگے تاکہ تصویر کے دونوں رخ اجاگر ہو سکیں۔ مسرت کے بعد غم کی تشریح اس لئے بھی ضروری ہے کہ احتظاظ و ابتہاج کے بعد انسانی نگاہ کے سامنے عبرت و موعظت کے مناظر پیش کئے جا سکیں۔ تاکہ بادۂ مسرت سے مخمور دل تلخیٔ غم سے بھی لذت اندوز ہو سکیں۔ اور "تعرف الاشیاء باضدادہا" کے مصداق مسرت و غم کا صحیح اندازہ ہو سکے۔

## مسرت کی تخلیق

انسان کے تمام جذبات کا مرکز دل ہے۔ قادرِ مطلق نے لوحِ دل کو اسقدر حساس بنایا ہے کہ ہر نقش خواہ کسی نوعیت کا ہو فوراً اس لوح پر مرتسم ہو جاتا ہے۔ اور ان نقوش کے ارتسام کے بعد انسان پر مختلف کیفیات طاری ہو جاتی ہیں۔ اگر طاری شدہ کیفیت اپنے اندر زیادہ [illegible] نہیں رکھتی یا شخص متعلقہ ضبط کا خوگر ہوتا ہے اور اس کو اپنے جذبات پر قابو رکھنے کی کافی طاقت ہوتی ہے تو دل ہی دل میں کیفیت [illegible] کارفرما رہتی ہیں اور اگر طاری شدہ کیفیات قوی ہیں ساتھ ہی ضبط کی طاقت بھی نہیں تو پھر رگ رگ سے ان کیفیات کے چشمے پھوٹ نکلتے ہیں اور اعضاء و جوارح کے ذریعہ انکا اظہار کیا جاتا ہے۔ بچوں میں قوتِ ضبط قریب قریب مفقود ہوتی ہے لہٰذا وہ ہر معمولی سے معمولی کیفیت سے متاثر ہو کر وارفتہ ہو جاتے ہیں اور طرح طرح کی حرکات کرنے لگتے ہیں۔ اگر کسی بڑے آدمی سے طفلانہ وارفتگی کا ظہور ہو تو دیکھنے والے اسکو مذبوحی حرکت سے تعبیر کریں لیکن کمسنی کے اعتبار سے ان مذبوحی حرکات میں ایک قسم کی دلچسپی اور محبوبیت پائی جاتی ہے۔ اسکے برخلاف عورتوں میں ضبط کی کافی طاقت ہوتی ہے نیز ان کے جذبات میں اس قدر رسوخ و استحکام ہوتا ہے کہ وہ قوی ترین موثرات کے باوجود جنبش میں نہیں آتے اور معمولی سی چنگاری ان کو مشتعل نہیں کر سکتی اسکا مطلب یہ نہیں کہ

ہوتیں موثرات خارجی جو ان کی خلقت سے متاثر نہیں ہوتیں یا خدانخواستہ اُن کے پہلو میں گداز دل کی بجائے شیشہ کا ٹکڑا رکھا ہوا ہوتا ہے بلکہ مقصد عرض کرنے کا یہ ہے کہ کسی کیفیت سے متاثر ہو کر وہ جلد وارفتہ نہیں ہو جاتیں۔ اور دل ہی دل میں [illegible] چٹکیاں لیتی رہتی ہے۔

کیفیتِ مسرت جب طاری ہوتی ہے تو پہلے دل میں ایک گدگدی محسوس ہوتی ہے اور اسی گدگدی کا نام دراصل مسرت ہے دل میں مسرت خود بخود پیدا نہیں ہوتی۔ بلکہ اُسکے لئے اسباب و موثرات کی ضرورت لازمی امر ہے۔ آپ کی نظروں نے کسی خوشنما منظر کا مشاہدہ کیا اور مشاہدہ کے بعد آپ کا دل مسرت سے لبریز ہو گیا۔ اگر آپ اُس منظر کو نہ دیکھتے تو مسرت بھی پیدا نہ ہوتی لہذا تخلیقِ مسرت کے لئے مشاہدہ بھی ضروری چیز ہے۔ لیکن مشاہدہ کی مختلف نوعیتیں ہوتی ہیں لہذا کیفیات مسرت میں بھی تنوع پیدا ضروری ہے۔ آپ نے باغ میں ٹہلتے ہوئے سبزے۔ ہنستے ہوئے پھول اور جھومتی ہوئی شاخ کا مشاہدہ کیا۔ اس کے بعد آبشار کے زیروبم۔ موجوں کی سبک رفتاری۔ اور پانی کی اٹھلاتی ہوئی چال کا نظارہ کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک حسین و جمیل ہستی کو دیکھا جسکی مخمور آنکھوں میں شراب چھلک رہی تھی جس کے نرم و نازک ہونٹ پر بجلیاں کوند رہی تھیں جسکی ہر مستانہ ادا شگفتگی کی ایک دنیا اپنے آغوش میں رکھتی تھی۔ پھر آپ ایک مدت کے بچھڑے ہوئے دوست سے ملے جسکے انتظار میں آپ بیقرار تھے۔ اسکے بعد آپ نے ایک ایسا موٹر دیکھا جو بغیر پٹرول کے چلتا ہے۔ اور اسکا انجن ہوا کے اشاروں پر حرکت کرتا ہے۔ اسکے بعد آپ نے اخبار میں ایک یہ خبر پڑھی کہ "تخفیف اسلحہ کی تحریک کامیاب ہو گئی اور تمام اسلحہ اور خونریز سامان تباہ کر دئے جائیں گے اور امن و امان کے قیام کے سوا حکومتوں کے باہمی خلفشار کیلئے کوئی ہتھیار استعمال نہ کیا جائیگا۔" آپ کے دل پر مندرجہ بالا مشاہدات نے مختلف کیفیات طاری کیں اور ہر مسرت دوسری مسرت سے متنوع الاصل تھی باغ میں جا کر جو فرحت آپ کے دل نے محسوس کی۔ موٹر کے دیکھنے کے بعد کیا اسی کیفیت سے آپ کا دل لطف اندوز ہوا؟ نہیں ایسا نہیں ہوا دونوں مسرتوں میں نمایاں فرق تھا اور اسی طرح دیگر کیفیات مسرت میں بھی ضروری تفارق و تباین آپ نے محسوس کیا۔ وہ فرق کیا تھا؟ اُسکی تشریح الفاظ میں نہیں ہو سکتی کیونکہ احساسات انسانی بیحد لطیف ہوتے ہیں کہ الفاظ کی ثقالت اور گرانی ان کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ فرض کیجئے آپ سے کوئی سوال کرے کہ شہد کا مزہ کیسا ہوتا ہے؟ آپ فوراً جواب دینگے میٹھا لیکن اگر پوچھنے والے کی تسکین نہ ہو اور وہ آپ سے پھر سوال کرے کہ میٹھے کا مزہ کیسا ہوتا ہے؟ تو یقین جانئے کہ باوجود اپنی سحر بیانی اور شیریں مقالی کے آپ اپنے کو معترفِ عجز پائیں گے اور اسکا جواب نہیں دے سکیں گے۔ کیونکہ الفاظ کے ذریعہ کیفیات کی صحیح تصویر نہیں کھینچی جا سکتی غرض دنیا کی ہر کیفیت کا یہی حال ہے کہ الفاظ اُن کی صحیح ترجمانی نہیں کر سکتے۔

## مسرت پر تخیل کا اثر

مشاہدہ کے علاوہ مسرت کا تعلق تخیل سے بھی ہے۔ آپ کچھ دنوں قبل آپ کسی مسرت سے لطف اندوز ہوئے تھے فرض کیجئے کشتی میں بیٹھ کر آپنے دریا کی سیر کی تھی۔ وہ ایک وقتی مسرت تھی اور آپ کی زندگی کا کوئی ایسا اہم واقعہ نہیں تھا جو کبھی نہ بھلایا جا سکے لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لمحاتِ فرصت اور تنہائی میں معمولی معمولی واقعات سلسلہ وار یاد آتے چلے آتے ہیں اِس دوران میں آپ کو دریا کی سیر بھی یاد آ گئی۔ اور آپ کی قوتِ متخیلہ نے آپ کو اُسی ماحول میں لیجا کر پہنچا دیا یعنی آپ محسوس کرنے لگے گویا کہ کشتی دریا کی موجوں

سے ٹکرا رہی ہے اور آپ اُس میں بیٹھ کر لطف اندوز ہو رہے ہیں اگرچہ گذشتہ ایام کی مسرت کے مقابلہ میں یہ تخیلی مسرت کم ہے لیکن بہر حال آپ مسرور ہوئے۔ یہ تو گذشتہ واقعات کی تخیلی مسرت کی ایک مثال تھی اب مستقبل کے متعلق مثال ملاحظہ فرمائیے۔ یہ انسان کا خاصہ ہے کہ وہ ماضی سے زیادہ مستقبل کے بارے میں غور و فکر کرتا ہے اور قبل از وقت محظوظ و مسرور ہونے کے لئے خیالی پلاؤ پکاتا ہے۔ اور اپنی کامیابی فتحمندی اور کامرانی کے تخیلی مناظر کا خیالی نگاہوں سے مشاہدہ کرتا ہے۔ یہ ایسی عامۃ الورود باتیں ہیں جو ہر انسان پر روزانہ گذرتی رہتی ہیں۔ مثال کے طور پر آپ کے دل میں لندن جانے کی تمنا ہے لیکن ابھی تک بدقسمتی سے موقع میسر نہیں آئے یا آپ کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ اب تنہائی کے اوقات میں آپ نے سوچنا شروع کیا کہ آپ لندن کیلئے گھر سے روانہ ہو رہے ہیں۔ سامان تیار ہو گیا ہے دوست احباب جوق در جوق آپ کو "خدا حافظ" کہہ رہے ہیں۔ لیجئے آناً فاناً میں ملتان سے روانہ ہو کر آپ بمبئی بھی پہنچ گئے اور وہاں سے جہاز میں سوار ہو کر لندن میں آ دھمکے۔ وہاں پر لوشنوں کی جھرمٹ ہے اور آپ ہیں۔ تفریحی ضیافتوں میں آپ شرکت کر رہے ہیں سینما اور تھیٹروں میں آپ ڈٹے ہوئے ہیں۔ رقص و بال کا آپکی نگاہیں نظارہ کر رہی ہیں۔ مدبرین فرنگ سے آپکو انٹرویو کرایا جا رہا ہے۔ غرض تخیل کے ذریعہ آپکا دل اکتساب مسرت کر رہا ہے۔ اور جتنے عرصہ تک آپ تصور میں محو ہیں اتنے عرصہ تک آپ مسرور ہیں بعض وقت تو خیالی مسرت اسقدر قوی ہوتی ہے کہ اچھا خاصہ انسان جوش مسرت سے بیقرار ہو کر طرح طرح کی حرکات کرنے لگتا ہے۔ چنانچہ ماہرین نفسیات نے اس سلسلہ میں ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ کسی شخص کو اولاد کی بڑی تمنا تھی لیکن شومی قسمت سے عرصہ دراز تک یہ تمنا پوری نہیں ہوئی۔ عرصہ کے بعد بیوی سے بچہ پیدا ہونے کی امید ہوئی ایک دن تنہائی میں اُس شخص نے قبل از وقت خیالی مسرت سے محظوظ ہونا شروع کیا۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے پلنگ کا تکیہ اُٹھا کر گود میں رکھ لیا اور اسکو بچہ سمجھکر زور زور سے آواز کیساتھ اُچھالنا شروع کیا۔ آپ نے دیکھا کہ خیالی مسرت نے اسکے جذبات کو بے قابو کر دیا اور بغیر اظہار مسرت کئے نہ رہ سکا۔ اسکے ماسوا قوت سامعہ۔ قوت ذائقہ۔ قوت لامسہ۔ اور قوت شامہ بھی مسرت کی ذمہ دار ہیں۔ اور ان کے ذریعہ بھی اکتساب مسرت کیا جاتا ہے۔

## مسرت کی خاصیت اور اوقات

مسرت و غم جس طرح کیفیات کے اعتبار سے مختلف ہیں اسی طرح خاصیت کے لحاظ سے بھی آپس میں متباعد اور متغایر ہیں۔ غم کی خاصیت "انقباض" ہے اور مسرت کی خاصیت "تفریح" ہے۔ مسرت دل میں کشادگی اور طبیعت میں شگفتگی پیدا کرتی ہے۔ جو لوگ مسرور رہتے ہیں ان کے چہرے ہشاش بشاش نظر آتے ہیں لیکن برخلاف اسکے غمگین شخص کے چہرہ پر پھیکا پن اور افسردگی برستی ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ اُس کا ہر رونگٹا سکڑ رہا ہے۔ مسرت میں ایک قسم کی حرارت ہوتی ہے اور حرارت کی خاصیت ہے کہ وہ ہر چیز کو بڑھاتی (EXPAND) ہے اور کشادگی پیدا کرتی ہے۔ انسانوں پر ہی کیا منحصر ہے؟ نباتات کو دیکھئے کہ جس درخت کو صدمات سے دوچار ہونا پڑتا ہے وہ مرجھایا رہتا ہے اور جو پودا فضا کی مسرت سے محظوظ ہوتا ہے وہ شاداب نظر آتا ہے۔ نسیم صبح جب کلیوں کو گدگداتی ہے تو وہ وفور مسرت سے بیقرار ہو کر مسکرا دیتی ہیں۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ذرا سی کلی پھول بن جاتی ہے۔ کلی کا نشو و نما پا کر پھول بنجانا مسرت ہی کا سبب ہے۔

مسرت کے اوقات بھی مختلف اور خاص ہیں۔ عام طور پر صبح سویرے اُٹھ کر پورے طور پر جاگنے کے بعد قلب ایک قسم کی فرحت محسوس کرتا ہے۔ اسکے بعد دن بھر کام کرنے سے شام کے وقت طبیعت پست سی ہو جاتی ہے لیکن کام سے چھٹکارا پانیکے بعد دل مسرور ہو جاتا ہے۔ چاندنی راتوں میں عموماً آسمان کا نظارہ بھلا معلوم ہوتا ہے یہ اوقات تو ایسے ہیں جن سے عام طور پر طبیعت فرحت محسوس کرتی ہے ورنہ اکتساب مسرت کیلئے تو کسی خاص وقت کی قید نہیں ہے جسوقت بھی انسان کا دل کسی خاص سبب سے محظوظ ہونے لگے۔ غرض "فکر ہر کس بقدر ہمت اوست" کے مصداق ہر شخص اپنی استعداد کے موافق خود ہی مسرت سے لطف اندوز ہوتا ہے۔

## مسرت اور تبسم

یہ ضروری نہیں ہے کہ آپ کا دل مسرتوں سے لبریز ہو اور ساتھ ہی آپ کے لب تبسم آشنا بھی ہوں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آپ دل ہی دل میں خوش ہوتے ہیں لیکن مسکراہٹ کا شائبہ بھی ہونٹوں سے نمایاں نہیں ہوتا۔ لیکن تبسم بہرحال مسرت ہی سے عبارت ہے اور مسرت کے جو مدارج ہیں ان کے ایک درجہ کا نام تبسم بھی ہے۔ تبسم کا آخری درجہ قہقہہ ہے جب جذبات پر قطعاً قابو نہیں رہتا۔ اور وفور مسرت انسان کو بیتاب کر دیتا ہے تو انسان قہقہہ لگانے پر مجبور ہو جاتا ہے بعض لوگ پہلے متبسم ہوتے ہیں پھر آہستہ آہستہ انکا تبسم قہقہہ میں تبدیل ہو جاتا ہے بعض فوراً ہی کھلکھلا کر ہنس پڑتے ہیں گویا کہ پہلے ہی سے مواد تیار تھا صرف نشتر لگانے کی دیر تھی بعض وقت جس سرعت کے ساتھ دل میں گدگدی پیدا ہوتی ہے اسی لحاظ سے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوتی ہے یعنی ایک ساتھ ہی لب متبسم نہیں ہو جاتے۔ بلکہ پہلے خفیف سی لبوں میں لرزش پیدا ہوتی ہے۔ پھر یہ لرزش ارتعاش خفی میں تبدیل ہو جاتی ہے اُسکے بعد جا کر کہیں "تبسم" کا نمبر آتا ہے تبسم کا حملہ کیونکہ کمزور ہوتا ہے لہذا اسکا اثر دیرپا نہیں ہوتا برخلاف اسکے قہقہہ کے آثار بہت دیر تک نمایاں رہتے ہیں۔ ایک شخص منٹوں تک قہقہہ لگا سکتا ہے لیکن اتنے عرصہ تک اپنے لبوں کو متبسم نہیں رکھ سکتا ممکن ہے کوئی شخص قصداً ایسا کرنے کی کوشش کرے لیکن یہ تبسم سراسر بناوٹی ہوگا اور فطرت انسانی کے خلاف ایک جارحانہ اقدام قہقہے اور تبسم کی درمیانی کڑی کا نام ہنسی ہے ہنسی کے شباب کا نام قہقہہ اور اسکے بچپن کا نام تبسم ہے ہنسی اور تبسم میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ مسکراہٹ میں آواز کا ہونا ضروری نہیں ہے لیکن ہنسی میں ایک قسم کی آواز ہوتی ہے مگر "خندۂ زیرلبی" تبسم ہی کی ایک قسم ہے چونکہ ہنسی اور قہقہہ تبسم ہی کے مدارج میں لہذا ہم "تبسم" کی چند ضروری اقسام درج ذیل کرتے ہیں۔ تاکہ اصل کی تشریح فروع پر بھی حاوی ہو سکے۔

## اضطراری تبسم

آپ باغ میں جا رہے ہیں پھولوں کو مسکراتا ہوا دیکھ کر آپ کو بے اختیار ہنسی آجاتی ہے۔ آپ نے امتحان دیا ہے۔ نتیجہ کا بے چینی سے انتظار ہے۔ اخبار میں اپنا "رول نمبر" آپ دیکھ کر مسکرا دیتے ہیں۔ آپ کے مدتوں کے بچھڑے ہوئے دوست سے اتفاقاً ملاقات ہو جاتی ہے۔ ملاقات کی ابتدائی ساعتوں میں آپ مسکرانے پر مجبور رہیں۔ آپ میز پر بیٹھے ہوئے لکھ رہے ہیں۔ جاذب کی ضرورت درپیش آتی ہے۔ تمام میز چھان ماری لیکن جاذب نہیں ملا۔ آخر کار جس کاپی میں آپ لکھ رہے ہیں اُسکو جو اُلٹتے ہیں تو جاذب رکھا ہوا پاتے ہیں۔ اپنی

اس حرکت پر آپ کو ہنسی آجاتی ہے۔ احباب کیساتھ آپ کھانا تناول کر رہے ہیں۔ خوب مزے مزے کی باتیں ہو رہی ہیں۔ کوئی خاص مسئلہ چھڑ گیا ہے آپ کو گفتگو میں اس قدر انہماک ہو گیا ہے کہ فیرنی کی طشتری میں پلاؤ سمجھکر قورمہ ملا دیا۔ اب جو چمچہ اُٹھا کر منہ میں لیجاتے ہیں تو عجیب قسم کا مزہ معلوم ہوتا ہے اور صورت حال کا علم ہونے پر اپنی حرکت پہ خود بھی ہنستے ہیں اور دوسروں کو بھی ہنساتے ہیں اس قسم کے تبسم کو "اضطراری تبسم" کہتے ہیں۔

## اختیاری تبسم

آپ کے کوئی سادہ لوح دوست جنکے کچے چٹھے سے آپ اچھی طرح واقف ہیں دونکی لے رہے ہیں اور بے سر و پا باتیں کہہ کر آپ پر رعب جمانا چاہتے ہیں آپ دل ہی دل میں اُن کی حماقت اور چرب زبانی سے فائدہ اٹھا ۔ ایک قسم کی مسرت محسوس کرتے ہیں آپ ہنسنا چاہتے ہیں لیکن اس خیال سے کہ کہیں حضرت والا کو ناگواری نہ ہو اور ساتھ ہی انکی ڈینگیں اگر ختم ہوگئیں تو یہ لطف و مسرت کا تسلسل بھی باقی نہیں رہیگا، آپ مطلق نہیں ہنستے بلکہ نہایت سنجیدگی کیساتھ انکی باتیں سنے جاتے ہیں۔ یا مثلاً آپ کی کوئی دعوت کرتا ہے کہ شام کو غریب خانہ پر ما حضر تناول فرمایئے۔ مزیدار کھانوں کے تخیل نے آپ کے دل میں گدگدی پیدا کردی ہے۔ آپکے احساسات آپ کو مسکرانے پر مجبور کر رہے ہیں لیکن اس خیال سے کہ دعوت کرنیوالا کہیگا کہ یہ شخص بڑا ندیدہ ہے" آپ ہنسی کو ضبط کر جاتے ہیں۔ غرض اس قسم کا تبسم جسکا اظہار اختیاری ہو تبسم اختیاری کہلاتا ہے۔

## مصنوعی تبسم

آپ بے ٹکٹ سفر فرما رہے ہیں سیکنڈ کلاس میں پوری سیٹ پر آپ اس طرح قبضہ جمائے ہوئے ہیں کہ گویا ایران کے تیل کے چشموں کی طرح آپ نے اسکا پٹہ لے لیا ہے۔ بڑے مزے کیساتھ اپنے ہمسفر اصحاب سے خوب گپ ہانک رہے ہیں اتنے میں ٹکٹ چیکر قبلہ کمپارٹمنٹ میں تشریف لے آتے ہیں اور آپ سے ٹکٹ کا مطالبہ ہوتا ہے۔ اس پر آپ بے پروائی کیساتھ لیکن بھوؤں سے پسینہ پونچھتے ہوئے، مُسکرا دیتے ہیں۔ یا مثلاً کوئی دوست آپکے یہاں مہمان ہے۔ اُسکے خطوط آپکی معرفت آتے ہیں۔ لیکن آپ کو کچھ ایسی بے تکی لت پڑی ہوئی ہے کہ دوست کا خط کسی نہ کسی طرح پڑھ لیتے ہیں چنانچہ دوست کا تازہ آیا ہوا لفافہ احتیاط سے کھولکر آپ جلدی جلدی پڑھ رہے ہیں۔ اتفاقاً آپ کے دوست ملک الموت کی طرح وہاں آجاتے ہیں۔ اسپر آپ مسکرا کر کہتے ہیں "ایں ... ا لیجئے یہ تو آپ کا خط نکلا قسم خدا کی میں نے تو اپنا سمجھ کر کھول ڈالا تھا" یا مثلاً آپ نے حال ہی میں سائیکل پر چڑھنا سیکھا ہے۔ بیچ بازار میں آپ سائیکل سے گر پڑتے ہیں اور کپڑے جھاڑتے ہوئے اور مسکراتے ہوئے یہ کہہ کر اُٹھتے ہیں "بھائی صاحب نے ٹھیک کہا تھا کہ جب تک اس سائیکل کے پیڈل درست نہ ہو جائیں چڑھنے کا نام نہ لینا" یا مثلاً کونسل میں غیر سرکاری ممبروں کی جانب سے کوئی تحریک پیش ہے حکومت کے وزیر اسکے مخالف ہیں۔ یہاں تک کہ رائے شماری کی نوبت آجاتی ہے اور زوردار آواز میں پریسیڈنٹ صاحب فرماتے ہیں" ۸۰ رائے موافق ۔ ۲۰ رائے مخالف۔ لہذا تحریک پاس ہوگئی۔ اس پر غیر سرکاری ارکان تالیوں سے ایوان کی فضا میں گونج پیدا کر دیتے ہیں لیکن ساتھ ہی سرکاری ارکان بھی

مسکرا مسکرا کر سر ہلاتے ہیں۔ اس قسم کے تبسم کو مصنوعی تبسم کہتے ہیں۔

## جبری تبسم

آپ کسی امیر کے شومیٔ قسمت سے مصاحب ہیں۔ امیر صاحب کسی ایسی بات پر جو قطعاً پھیکی اور بے مزہ ہو۔ جس کی آپکو مطلق دلچسپی نہیں اور جس کو سن کر آپ کو الٹی نفرت ہوتی ہے۔ مسکرا دیتے ہیں۔ صاحب نعمت کو خوش کرنیکے لئے آپ بھی بلا وجہ کھکھلا رہے ہیں۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے جبڑے آج سلامت نہیں رہیں گے۔ یا مثلاً گھر کے طاق میں رکھا ہوا پانی کا لوٹا کوے نے گرا دیا۔ آپ نے اسکو دیکھا۔ لیکن چونکہ کوئی خاص بات نہیں تھی اپنا کام کرتے رہے آپ کی بیوی نے آپ کے پاس آکر پہلے آپ کو ٹہو کا دیکر متوجہ کیا اور ہنس ہنس کہنا شروع کیا "لے لو! موئے کوے کی باتیں تو دیکھو دن دہاڑے ڈاکہ ڈالتا ہے ایسی کالی کلوٹی صورت اور ایسے نخرے" بیوی کا دل خوش کرنیکے لئے آپ بھی خواہ مخواہ مسکرا دیتے ہیں ایسے تبسم کو "جبری تبسم" کہتے ہیں۔

## محبوبانہ تبسم

آپ باغ کی روش پر ٹہل رہے ہیں آپ نے چھڑی بڑھا کر ایک پھول توڑنیکی کوشش کی لیکن پھول گرفت میں آکر صاف نکل گیا۔ آپ کے سامنے ٹہلنے والا شخص جسکے لب پھول سے زیادہ تر و تازہ اور نازک ہیں آپ کی اس پسپائی پر مسکرا دیتا ہے۔ یا مثلاً آپ تھیٹر ہال کی اگلی صف میں بیٹھے ہوئے تھیٹر دیکھ رہے ہیں کوئی قتالہ جہاں نہایت سنجیدگی کے ساتھ پارٹ کر رہی ہے۔ اسکی ہر ادا سے وقار و متانت ٹپک رہی ہے اور اسکی طرز ادا کا تصنع اپنے اندر حقیقتوں کی ایک وسیع دنیا رکھتا ہے آپ بھی اس دلکش نظارہ میں محو ہیں۔ سگرٹ ہاتھ میں لگا ہوا ہے اور نظریں اسٹیج پر۔ اتنے میں سگرٹ آپ کی شیروانی کے دامن پر گر پڑتا ہے لیکن آپ کو مطلق خبر نہیں ہوتی۔ مگر جب آپکے دامن کا کچھ حصہ جل چکتا ہے۔ اور آپکا جسم گرمی محسوس کرتا ہے۔ تو آپ بے اختیار ہو کر اپنی رانیں پیٹنے لگتے ہیں۔ آپ کی اس حرکت کو دیکھ کر ایکٹرس کو بے اختیار ہنسی آجاتی ہے۔ ایسے تبسم کو محبوبانہ تبسم کہتے ہیں۔ ریاض خیرآبادی نے محبوبانہ تبسم کی تعریف یہ کی ہے:-

ہنگام نزع گریہ عجب بیکسی کا تھا ۔۔۔ تم ہنس پڑے یہ کونسا موقع ہنسی کا تھا

## مختلف ممالک کے باشندوں کا تبسم

انگریز کا تبسم تصنع اور بناوٹ سے لبریز ہوتا ہے لیکن ساتھ ہی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا کسی بات پر غور کرتے ہوئے ہنس رہا ہے۔ ترک کے تبسم سے متانت اور وقار ٹپکتا ہے اور اسکی آنکھوں میں بھی مسرت چمکنے لگتی ہے۔ ایرانی کے تبسم میں بے تکلفی پائی جاتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اسکو کسی خاص مسرت نے محظوظ نہیں کیا بلکہ تفریح کیلئے ہنس رہا ہے۔ افغانی کا تبسم اپنے اندر مردانگی کی وسیع دنیا رکھتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی روکھا پن بھی پایا جاتا ہے۔ اور اس میں کوئی دلچسپی نہیں

ہوتی چینی کا تبسم آدھا مردانہ اور آدھا زنانہ ہوتا ہے جس سے اس امر کا پتہ لگتا ہے کہ اسکے جذبات میں یکرنگی نہیں ہے، ساتھ ہی ہونٹوں پر بوزینیت طاری ہوجاتی ہے۔ ہندوستانی کا تبسم ناز و عشوہ سے مرکب ہوتا ہے جسکی ہر لرزش پر سحر کاری کا گمان ہوتا ہے جب وہ ہنستا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ مسرت کا اسکو صحیح احساس ہے۔ عسکری تبسم کے عادی ہوتے ہیں، اُن کے تبسم کی عمومیت بہت سے اسرار و معانی کی حامل ہوتی ہے۔ لیکن ریا و فریب سے قطعاً مبرا اور منزہ۔ آزاد اقوام کا تبسم شگفتہ اور غلام اقوام کا تبسم افسردہ ہوتا ہے۔

ماہر القادری

# نوید

چند نوخیز جواں "بزم" میں تھے گرم سخن
گفتگو یہ تھی کہ اس دور میں پردا کیسا!

صنفِ نازک بھی جو مردوں کے ہو دوش بدوش
قوم میں تربیت قوم کا چرچا کیسا!

ذرہ ذرہ ہے سرِ محفل ہستی بیباک!
ظلم ہے فطرتِ آزاد پہ کیسا کیسا!

دعویٔ عشق پہ یہ تنگ خیالی کیا خوب!
قیس بیتاب! یہ محمل پئے لیلیٰ کیسا!

جام میں لرزشِ صہبا سے ہے طوفاں برپا
اب یہاں مسئلہ تلخ و گوارا کیسا!

بجھ چکا سینۂ گیتی میں چراغِ ناموس
اب سرِ بخیہ دامانِ زلیخا کیسا!

تھی یہی بحث کہ اک پیرِ طریقت نے کہا
صاحبو! یہ سخنِ تلخ، یہ غوغا کیسا!

عورتیں آپ ہیں جب پردہ دری کی طالب
پھر یہ شورِ طلب و جوشِ تقاضا کیسا!

سچ ہے بیگانۂ اسرار ہے جویائے مآل
عیشِ امروز میں اندیشۂ فردا کیسا!

اگلے وقتوں کے تخیل میں نہ تھی یہ وسعت
لیکن اب عہدِ گذشتہ کا فسانا کیسا!

ہم تو خوش ہیں کہ ہوئی محفل گیتی روشن
تلخ تھا بندِ نقابِ رخِ سلمیٰ کیسا!

بے حجابی ہی سے ملتی ہے رہِ عریانی
یہ بھی ہو جائے کہ اندیشۂ بیجا کیسا!

لو مبارک کہ ہوئی منزلِ عاشق آساں
اب وہ دردِ طلبِ حوصلہ فرسا کیسا!

شرم کہتی ہے کہ ہے پردہ دری ننگِ جہاں
شوخیاں اُن کی یہ کہتی ہیں کہ پردا کیسا!

**علی اختر** (حیدرآباد دکن)

# مرزا شکی

از حضرت ایم۔ اسلم

ہمارے مرزا جی تعلیم یافتہ اور بڑے نستعلیق قسم کے بزرگ تھے۔ چالیس سے کچھ اوپر ہی تھے، اور ریاست میں ملازم تھے۔ نہایت حلیم الطبع اور رحم دل آدمی تھے۔ کسی کے سر آنا تو جانتے ہی نہ تھے۔ عام طور پر اکثر ریاست کے ملازموں کو رئیس کی خوشامد کے سوا اور کوئی کام نہیں ہوتا۔ لیکن مرزا جی میں سب سے بڑا وصف یہی تھا کہ وہ نہ تو خود خوشامد پسند تھے اور نہ خوشامد کرنا جانتے تھے۔ اور بعض اوقات تو رئیس سے بھی ایسی ایسی کھری کھری کہہ دیتے کہ سننے والے حیران رہ جاتے۔ اس کے ساتھ ہی اپنا کام بہت جانفشانی اور دیانتداری سے کیا کرتے۔ ساتھ ہی مطالعہ کا بھی بہت شوق تھا اور اکثر رات کے وقت مطالعہ کرتے۔

امارت، عزت، حکومت سبھی کچھ حاصل تھا لیکن بدقسمتی سے وہم کے مرض میں بھی مبتلا تھے۔ اور اس کمبخت مرض نے یہاں تک طول کھینچا کہ دوست تو رہے درکنار اکثر گھر والے بھی چیخ اُٹھتے۔ لیکن مرزا جی کا چال چلن کچھ ایسا نستعلیق تھا کہ کوئی کچھ کہنے کی جرأت نہ کر سکتا۔

دستور یہ تھا کہ تنخواہ لاتے ہی پیسہ پیسہ گن کر بیگم صاحبہ کے حوالے کر دیتے۔ گھر کے سیاہ سفید کی مالک بیگم تھیں۔ کیا مجال جو مرزا جی کبھی ان کے کسی کام میں دخل دیں۔ اسی طرح آپ بھی یہ چاہتے تھے کہ بیگم ان کے معاملات میں دخل نہ دیا کریں۔ لیکن دُنیا بھر میں شاید یہی ایک ایسی تمنا تھی جو نہ آج تک پوری ہوئی اور نہ کبھی اس کے پورا ہونے کی اُمید تھی۔

چونکہ گھر میں بیگم شاہی حکومت تھی اس لئے گھر کے سب ملازم بیگم کے اشارے پر چلتے تھے لیکن مرزا صاحب کو یہ بات سخت ناگوار گذرتی تھی۔ کیونکہ بعض اوقات ان کے حکم کی بھی بیگم شاہی فرمان جاری ہوئے بغیر تعمیل نہ ہوتی۔ اور اس طرح آپ کو کبھی کبھی دوستوں کے سامنے بھی ذرا خفیف ہونا پڑتا۔ اس قسم کے بیگم شاہی قانون کے خلاف مرزا صاحب نے کئی بار صدائے احتجاج بلند بھی کی لیکن کبھی شنوائی نہ ہوئی۔ مہینہ میں ایک دو بار کھانا کھائے بغیر ناراض ہو کر دفتر چلے جاتے۔ لیکن بیگم شاہی قانون میں نہ تو ترمیم ہی ہوتی نظر آتی اور نہ کوئی تنسیخ کی صورت نکلتی۔

گاہے گاہے آپ اپنے گھر کے ملازموں پر جُرمانہ بھی کر دیا کرتے۔ لیکن چونکہ روپیہ پیسہ بیگم کے ہاتھ میں تھا اور تنخواہ بھی وہ خود ہی تقسیم کیا کرتی تھیں۔ اس لئے کبھی جھنجھی کوڑی بھی کسی کی تنخواہ میں سے نہ کٹتی۔ اس قسم کا سلوک اور برتاؤ دیکھ دیکھ کر مرزا کے دل میں طرح طرح کے شکوک پیدا ہوتے لیکن ابھی تک کوئی ایسا واقعہ نہیں ہوا تھا جس سے اس قسم کے شکوک کچھ مستحکم ہو سکیں۔

شہر سے باہر سرکاری باغ کے پچھواڑے ہمارے مرزا صاحب کا دو منزلہ بنگلہ نما مکان تھا۔ اُوپر کی منزل زنانے کا اور نچلی مردانے کا کام دیتی۔ بنگلہ کی شمالی جانب بڑی سڑک تھی اور اس سڑک کے دونوں جانب مختلف قسم کے درخت پاس پاس لگے تھے۔ سڑک پر کولتار بچھا ہوا تھا۔ اور ریاست بھر میں خوبصورتی اور صفائی کے لئے یہ سڑک خاص مشہور تھی۔ جس جانب سڑک تھی اُسی سمت بنگلے کا وہ بیضوی کمرہ تھا جہاں رات کے وقت مرزا صاحب مطالعہ کیا کرتے تھے۔ اس کمرے کی جو سمت سڑک کی جانب تھی "گلیز ونڈوز" تھیں۔ رات کے وقت سڑک کا منظر ان "آئینہ پوش" کھڑکیوں میں سے اور کمرے کا منظر سڑک پر سے بجلی کی روشنی میں بہت بھلا معلوم ہوتا تھا۔

ان "آئینہ پوش" کھڑکیوں کے بالمقابل جو دیوار تھی یہاں آئینہ دار الماریوں میں کتابیں رکھی تھیں۔ اور میز کے سامنے ایک آتشدان تھا۔ جسے مختلف چیزوں سے سجا رکھا تھا۔ مرزا صاحب کی "روٹیٹنگ چیئر" (گھومنے والی کُرسی) سُرخ باناتِ سے منڈھی ہوئی تھی۔ جب مرزا صاحب کُرسی پر بیٹھتے تو سڑک آپ کے داہنی جانب ہوتی۔ بائیں جانب مُرادآبادی اُگالدان رکھا ہوتا۔ آپ پان بہت کثرت سے کھایا کرتے اور اکثر آپ کے کپڑوں پر پیک کی افشاں نظر آیا کرتی تھی۔

---

سردیوں کا موسم تھا اور رات کا وقت۔ کوئی گیارہ بجے ہوں گے۔ مرزا صاحب اسی کمرے میں بیٹھے مطالعہ کر رہے تھے کہ اچانک ایک زور کا دھماکا اور ساتھ ہی آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی چمک پیدا ہوئی اور کوئی چیز اس زور سے ان "آئینہ پوش" کھڑکیوں پر آکر پڑی کہ اکثر شیشے چکنا چُور ہو گئے اور شیشے کا ایک ٹکڑا ہاتھ پر لگ جانے سے مرزا جی کا ہاتھ بھی زخمی ہو گیا۔ اب اگر کوئی بُزدل ہوتا تو شاید چیخ پکار سے گھر کیا ریاست ہی سر پر اُٹھا لیتا۔ آپ صرف جلدی سے اُٹھ کر کھڑے ہو گئے اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ٹوٹی ہوئی کھڑکیوں کی طرف دیکھنے لگے۔ اتنے میں چوکیدار بھاگتا ہوا آیا تو آپ نے فرمایا:۔

"ابے بھاگ چوکی کی طرف، کہنا کہ جناب مرزا صاحب پر بم پڑا ہے۔ سُنا! بہت خوفناک بم کہنا۔ وہی جس کے پھٹنے سے آدمی مر جاتا ہے یا بُری طرح زخمی ہو جاتا ہے۔ اور اگر وہ کچھ پوچھیں تو کہہ دیجیو کہ مرزا صاحب بہت زخمی ہوئے ہیں لیکن ہیں زندہ سلامت۔ چل بھاگ!"

نوکر پلٹا ہی تھا کہ آپ نے پھر آواز دی "ابے سُن تو ذرا! ہاں اگر کوئی راستہ میں آتا جاتا مل جائے تو اس سے بھی یہ ماجرا کہہ دیجیو۔ سُن لیا نا؟ چل بھاگ!"

اتنے میں بیگم بھی نیچے آگئیں اور مرزا صاحب کو دیکھ کر بولیں "ہیں! آپ بچ گئے! الٰہی توبہ!"

ٹوٹے ہوئے شیشوں پر جو نگاہ پڑی تو کہا "اے توبہ میرے اللہ! یہ شیشے کس نے توڑے؟ دن دھاڑے اتنا ظلم! یہ سینہ زوری!!"

"کیا کہہ رہی ہو تم؟" مرزا صاحب نے پوچھا "بس اسی عقل پر ناز ہے تمہیں، جو رات کو دن کہہ رہی ہو۔

اور پھر سینہ زوری کیسی۔ کسی نے ڈاکہ تو ڈالا نہیں۔"

"ڈالتا کون؟" بیگم نے ایک ہاتھ کو لے پر رکھ کر کہا۔ "سو بار کہہ چکی ایک پستول اپنے پاس رکھا کیجئے۔ کسی کو جرأت تو نہ ہوگی جو یوں لوٹ مار مچاتا پھرے۔"

مرزا ماتھے پر بل ڈال کر بولے "تم جیسے دو چار صلاح کار اگر اور مل جائیں تو ممکن ہے کسی روز ریاست سے بھی جواب مل جائے۔ لیکن یہ بھی جانتی ہو پستول تو آج کل وہ لوگ رکھا کرتے ہیں جن پر کانگریس والوں کو اعتماد نہیں رہی لوٹ مار، تو خود ہی دیکھ لو۔ سب چیزیں جوں کی توں رکھی ہیں۔"

"اور یہ جو شیشے چکنا چور ہوئے پڑے ہیں؟" بیگم نے پوچھا۔

"تو پھر ہم کیا کریں" مرزا نے کہا "شیشے ٹوٹ جانے کا تو تمہیں بہت افسوس ہے اور ہم جو لہو لہان ہو گئے۔ اسکی تمہیں کچھ پرواہ ہی نہیں۔ دیکھو تو ذرا ہمارا ہاتھ!"

بیگم نے ہاتھ پر نگاہ ڈالتے ہوئے مسکرا کر کہا "ذرا سی تو کھرنچ ہے۔ پٹی کپڑا باندھ دیجئے۔ صبح تک ٹھیک ہو جائے گا۔"

اتنا سنتے ہی مرزا صاحب کو غصہ آگیا اور چلا کر بولے "ہیں، ہم تو ......."

لیکن پیشتر اس کے کہ کچھ اور کہیں ملازم نے پولس کے آنے کی اطلاع دی۔

"جاؤ جی جاؤ!" آپ بیگم کی طرف دیکھ کر بولے "خدا تم جیسی غمگسار بیوی تو دشمن کو بھی نصیب نہ کرے!"

بیگم کے جاتے ہی مرزا بڑے اطمینان سے ایک کتاب اٹھا کر کچھ اس انداز سے دیکھنے لگے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ اور جب پولیس انسپکٹر نے اندر آکر آپ کو سلام کیا تو آپ نے کتاب پر سے نگاہ اٹھائے بغیر ہی کہا۔

"آپ آگئے!" اور پھر ایک اور ورق الٹ کر "اچھا ہوا کہ آپ آگئے!" اتنا کہہ کر آپ پھر کتاب دیکھنے لگے۔ انسپکٹر پاس ہی ایک کرسی پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا کہ کب مرزا صاحب کچھ کہتے ہیں۔ دو چار منٹ بعد آپ نے پھر فرمایا "خوب آئے آپ!"

"بندہ حاضر ہے" انسپکٹر نے کہا "پولیس کے سپاہی سڑک پر اور مکان کے آس پاس تعینات کر دئے گئے ہیں۔"

"بہت خوب! بہت خوب!" مرزا نے ایک دو بار سر ہلا کر کہا اور پھر "شکر ہے! دوات نہیں ٹوٹی ورنہ سیاہی گرنے سے کاغذات کا تو ستیاناس ہو جاتا۔"

آخر انسپکٹر نے خود ہی پوچھا "تو جناب! یہ کس وقت کا واقعہ ہے؟"

"واقعہ؟" آپ نے انسپکٹر کی طرف دیکھ کر کہا "کیسا واقعہ؟"

"یہی بم پھٹنے کا!"

"تو گویا آپ کو معلوم ہی نہیں"

"آپ فرمائیں تو پتہ چلے۔ ایسے ....."

"خوب!" مرزا بات کاٹ کر بولے "لیکن پولیس افسر آپ ہیں یا ہم؟"

"اور پھر ہم نے تو محض ایک اخلاقی فرض سمجھ کر آپ کو اطلاع دیدی تھی۔ اب آپ یہاں بیٹھے کیا کرتے ہیں۔ ملزم کو پکڑنے کی تدبیر کیجئے۔"

"آپ نے کسی کو دیکھا بھی؟"

یہ سُنکر مرزا صاحب کچھ مُسکرائے اور پھر کہا "انسپکٹر صاحب! آج تو آپ کچھ بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں۔ میں کیا جانوں۔ کون آیا کون گیا۔ ملزم کا پتہ لگانا تو آپ لوگوں کا کام ہے نہ کہ ہم اہل قلم کا!!"

"لیکن آپ نے بھی تو کسی کو بھاگتے دیکھا ہوگا۔ یا کوئی آواز ہی سُنی ہوگی۔"

"خوب! خوب!" مرزا نے مُسکرا کر کہا "تو گویا جب تک ہم کچھ بیان نہ دیں آپ کچھ نہ کریں گے۔ تو سنیئے حضرت! کہ ہم اسی طرح بیٹھے کتاب دیکھ رہے تھے۔ اچانک آنکھوں کو چکاچوند کر دینے والی روشنی نمودار ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی کچھ اس غضب کا دھماکا ہوا کہ ہم کرسی پر سے گرتے گرتے بچے۔ دل میں تو یہی سمجھے تھے کہ لو آج واقعی مر گئے۔ لیکن جب چوکیدار نے ہمیں آواز دی تو ہم نے جانا کہ مرے نہیں، بچ گئے ہیں۔ ہمارا تو خیال تھا کہ بجلی گری ہے۔ لیکن مطلع بالکل صاف تھا ستارے ایک دوسرے سے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ اب ہم نے جانا کہ ہو نہ ہو بم پھٹا ہے۔ ہمیں تو خیال تھا کہ آپ کو علم ہی ہوگا کہ آج مرزا صاحب کے مکان پہ بم پھٹے گا۔ اور شاید آپ ملزم کا پتہ و نشان بھی جانتے ہوں گے۔ اس لئے ہمیں آپ کے انتظامات میں دخل درمعقولات نہیں دینا چاہیئے لیکن وہ جو خدا کا حکم ہے کہ اے ایمان والو! جب کوئی کام کرنے لگو تو آپس میں صلاح مشورہ کر لیا کرو۔ تو ہم نے محض اخلاقی فرض سمجھ کر آپ کو اطلاع دیدی۔ لیکن صاحب! آپ نے یہ خوب سُنائی کہ آپ کو کچھ علم ہی نہیں۔"

"تو شاید!" انسپکٹر نے کچھ سوچ کر کہا "آپ کے خدمتگاروں میں سے کسی نے کچھ دیکھا سُنا ہو؟"

"سنیئے!" مرزا بولے "بم پڑا ہم پر اور ہمارے مکان پر۔ ہمارے مُلازموں کو اس سے کچھ سروکار نہیں۔"

"لیکن عرض یہ ہے!" انسپکٹر نے کہا "کہ ہمارے ہاں یہ پہلی مثال ہے" اور پھر سب سے زیادہ تعجب یہ ہے کہ آپ کے مکان پر بم پھٹا۔ مجھے تو اس میں کچھ سازش نظر آرہی ہے۔ آپ بھی ذرا غور فرمالیں شاید آپ کی نگاہ میں بھی کوئی ایسا آدمی ہو جسے آپ سے کچھ نقصان پہونچا ہو اور اس موذی نے انتقام یا محض ڈرانے کی خاطر یہ خبیثانہ حرکت کی ہو۔"

"انتقام! سازش؟" مرزا نے ذرا بھرائی ہوئی آواز سے پوچھا۔

"جی ہاں!" انسپکٹر بولا "اس قسم کے خطرناک کام سازش کے بغیر نہیں ہوا کرتے ہم تو انشاءاللہ کچھ نہ کچھ سُراغ لگا ہی لیں گے لیکن آپ بھی ذرا فکر کیجئے!"

پولیس انسپکٹر صاحب تو چلتے بنے لیکن مرزا جی کو سخت اُلجھن میں ڈال گئے۔ ان کے دماغ میں اس وقت صرف دو باتیں تھیں۔ ایک سازش اور دوسرا انتقام۔ اسی فکر میں پلنگ پر جا لیٹے۔ لیکن جسے وہم کا مرض ہو اُسے نیند کہاں۔ کبھی لیٹے لیٹے اُٹھ کر بیٹھ جاتے اور پھر "میرے اللہ" کہہ کر دراز ہو جاتے۔ آخر اُٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگے۔

بیگم نے پوچھا "کیوں خیر تو ہے؟ کچھ پیٹ میں قراقر تو نہیں؟ وہ الماری میں چورن رکھا ہے۔ تھوڑا سا پھانک لیجئے۔"

"چُپ رہو جی!" مرزا نے جھنجھلا کر کہا۔ "تمہیں تو سوا بد ہضمی کے سوا اور کچھ سُوجھتا ہی نہیں۔"

"تو اور کیا!" بیگم بولیں۔ "آپ کھاتے بھی تو بیل کی طرح ہیں۔"

"سُنو جی!" مرزا نے ان کی طرف مُڑ کر کہا۔ "یہ باتیں کرنے کا وقت نہیں۔ تمہاری بکواس تو ہر روز سُنا ہی کرتے ہیں۔ ہزار بار کہا کہ تم عورت بنائی گئی ہو اس لئے سمجھ رکھو کہ تم ناقص العقل ہو۔ اور ہم مرد ہیں اور تم عورت ذات سے عقل میں افضل ہیں۔ جب ہم کچھ سوچ رہے ہوں تو تم بیچ میں دخل در معقولات مت دیا کرو۔ سُن لیا تم نے؟"

"ہاں سُن لیا!" اب بیگم نے بھی ذرا چمک کر جواب دیا۔ "لیکن سوچنے کے لئے دن کیا تھوڑا ہے جو آپ رات کو بھی کسی کو چین نہیں لینے دیتے۔ آپ کے اندھیرے میں یوں چلنے سے مجھے ہول ہوتا ہے۔"

"ہول!" مرزا نے پوچھا۔ "کیسا ہول؟"

"یہی!" بیگم بولیں۔ "کہ کوئی چور اُچکا گھر میں نہ گُھس آیا ہو۔"

یہ سُنکر مرزا نے بجلی کا لیمپ روشن کر دیا اور گرم ہو کر کہا۔ "بس اب مت بولنا، ورنہ فساد ہو جائے گا۔"

"فساد!" بیگم نے بھی ذرا تلخی سے جواب دیا۔ "یہ دھمکیاں کسی اور کو دینا۔ میں پٹھان کی بیٹی ہوں۔"

"اور ہم بھی مغل زادے ہیں!" مرزا نے غصے سے فرش پر پاؤں مار کر کہا۔ "سو پشت سے سپاہگری کرتے چلے آئے ہیں۔ کسی سے دب کر نہیں رہ سکتے ہم!"

ممکن تھا کہ اس پٹھان زادی اور مغل بچہ میں کوئی جھڑپ ہو جائے لیکن پہرہ دار کی آواز "خبردار!" نے دونوں کو خاموش کر دیا۔ اور مرزا صاحب بجلی کا لیمپ بند کر کے پلنگ پر جا لیٹے اور خود بخود بڑبڑانے لگے۔

"ایک اِتّی سی تو جان ہے ہماری اور اس پر پڑا بم۔ اور بم بھی ایسا جو قہر الٰہی سے کم نہ تھا۔ یہ تو قسمت تھی جو ہم بچ گئے۔ لیکن ذرا ان لوگوں کو دیکھئے کیا مزے سے پڑے سوتے ہیں۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ ان کے تو کان پر جوں بھی نہیں رینگتی۔ آج اگر ہماری بھی بی امی جان ہوتیں تو سو سو بار قربان جاتیں، چٹ چٹ بلائیں لیتیں۔

اور ہم بھی ان کی گود میں بیٹھ کر آنسو بہاتے۔ اللہ کسی کو یتیم بھی نہ کرے" اور جب دیکھا کہ کوئی جواب نہیں دیتا تو آپ بھی چپ ہو گئے۔

---

اگلے روز جب میں مرزا کے ہاں پہونچا تو چند دوست پرسشِ احوال کے لئے آئے ہوئے تھے لیکن مرزا صاحب بالکل صمٌ بکمٌ بنے بیٹھے تھے۔ اب اگر کوئی رات کے واقعہ کے متعلق ذکر کرتے ہوئے آپ کو بچ جانے پر مبارک دیتا یا اظہارِ مسرت کرتا تو آپ دوسروں کی طرف دیکھ کر اور رد لکھی ہنسی ہنس کر فرماتے:۔

"لو دیکھ لیا نا! اسے کہتے ہیں ہمدردی۔ ہمارا تو نقصان ہوا اور یہ مہربان مبارک باد دیئے آئے ہیں۔ انہیں تو جب افسوس ہوتا جب ہم اس وقت ہسپتال میں پڑے ہوتے۔ خدا ایسے ہمدردوں سے محفوظ ہی رکھے!"

اور اگر کوئی شامت کا مارا اظہارِ افسوس کرتا تو آپ اس کے بھی سر ہو جاتے اور بگڑ کر فرماتے:۔

"ہاں بھیا! یہ تو واقعی ہماری بدقسمتی ہے جو ہم بچ گئے۔ اور اس وقت آپ کو بیٹھے نظر آتے ہیں۔ لیکن ذرا ہماری سخت جانی تو ملاحظہ ہو کہ لوگ مارتے ہیں اور ہم نہیں مرتے۔ آپ لوگوں نے تو جانا کہ مرزا جی مر گئے۔ چلو جی! خس کم جہاں پاک! لیکن ہماری ڈھٹائی دیکھئے کہ ابھی تک جی ہی رہے ہیں۔ اجی! تف ہے ایسے جینے پر کہ دوست ہمیں زندہ دیکھ کر افسوس کر رہے ہیں۔ آپ تو خوش ہوں جو آجائے ہمیں غیر کی آئی ہوئی۔ اچھا بھائی قسمت!!"

---

جب سب لوگ جا چکے تو آپ نے دربان کو بلا کر حکم دیا کہ اب جو کوئی آئے اُسے باہر سے ہی رخصت کر دو اور کہدو کہ مرزا صاحب "سرکار" کے سلام کو گئے ہیں۔ جب دربان جا چکا تو اب مرزا نے میری طرف دیکھا۔ میں بیٹھا دیوانِ حافظ کا ایک قلمی نسخہ دیکھ رہا تھا۔ آپ کچھ دیر تو میری جانب دیکھتے رہے۔ پھر کچھ ہولے ہولے الاپنے لگے (مرزا جی کو گانے بجانے کا بھی شوق تھا) پھر ایک جمائی لیکر بولے:۔

"گویا ہم بچ ہی گئے! کیوں جی! کیا خیال ہے تمہارا؟"

"واقعی تعجب ہی ہے!" میں نے ورق الٹتے ہوئے کہا۔

"تعجب؟" آپ نے میری طرف دیکھکر پوچھا "کیسا تعجب؟"

"یہی!" میں نے بھی ذرا سنجیدگی سے جواب دیا "کہ آپ بالکل ہی بچ گئے یعنی بال بال اور پھر....."

"کون احمق کہتا ہے؟" آپ نے بات کاٹ کر پوچھا۔

"آپ ہی تو کہہ رہے ہیں"

مرزا بگڑ کر بولے "آج کچھ سن کر رہو گے!"

اور میں نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "کیا سنائیے گا۔ ہارمونیم یا ستار یا کوئی ٹھمری؟"

"کہنے والے کی ایسی تیسی!" آپ نے ذرا مسکرا کر کہا۔

"خوب!" میں نے بھی اسی انداز سے جواب دیا "تو یہ کوئی نیا ساز ہوگا"

ساتھ ہی میں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا "لیجئے اب اجازت دیجئے!"

"کیا ابھی سے؟"

"تو اور کیا"

"کیوں؟ اتنی بھی کیا جلدی ہے؟"

"اب معاف ہی فرمائیے" میں نے روکھے پن سے کہا "بس تانت باجی اور راگ بوجھا۔ وہ ساز ہی کیا سُننا جس کے تاروں سے گالیاں نکلیں"

"میرے یار بیٹھ بھی جاؤ" آپ نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا "بھئی! تمہیں ہمارے ہی سر کی قسم بیٹھو بھی!"

"کہئے کیا ارشاد ہے؟"

"اب مذاق چھوڑو گے بھی!" مرزا بولے "ہم پوچھتے ہیں ان لوگوں کو ہو کیا گیا ہے۔ جو آتا ہے یہی کہتا ہے کہ ہم بال بال بچ گئے!!"

"تو پھر؟" میں نے کہا "کیا کوئی ٹانگ وانگ کٹ بھی گئی ہے آپ کی؟ خدا کا شکر ادا کیجئے کہ نیازمندوں کو گالیاں دینے کے لئے آپ زندہ سلامت بیٹھے ہیں"

"کون ہم؟" مرزا نے پوچھا۔

"اور کیا آپ کے فرشتے؟"

"غضب کرتے ہو مرے یار! ہمارا ہاتھ زخمی دیکھتے ہوئے بھی اپنی ہی ہانکے جاتے ہو۔ کچھ تو خدا کا خوف کرو تم بھی۔ کیا دوستی اور ہمدردی اسی کا نام ہے؟"

"حد ہو گئی!" میں نے کہا "ذرا سی خراش کیا......"

مرزا سر ہلا کر اور بات کاٹ کر بولے "جی ہاں خراش! تم تو تب جانتے جو ہم مر ہی جاتے"

"تو پھر کیا قیامت برپا ہو جاتی۔ کیا لوگ مرا نہیں کرتے۔ لیکن آپ دن بھر مرنا مرنا پکار رہے ہیں، پر یہ معلوم نہ ہوا کہ آپ مرتے کیسے؟"

"بم جو آکر پڑا۔ شیشے چکنا چور ہو گئے۔ ہاتھ زخمی ہوا اور ہم مرتے مرتے بچے"

"لیکن بم پھینکا کس نے؟ بس وہم ہی تو ہے آپ کا!"

"مرے یار! آپ نے سر کو ذرا جھٹکا دیکر کہا "یا تو ہم ہسٹری ہیں یا تم دیوانے ہو"

"جی ہاں سچ ہے" میں نے ذرا مُسکراتے ہوئے کہا "جو خود پاگل ہوتا ہے وہ اوروں کو بھی پاگل ہی سمجھتا ہے"

آپ ایک آہ بھر کر بولے "چھوڑو بھیا! تم نے تو پھوٹے مُنہ سے اتنا بھی نہ پوچھا کہ مرزا صاحب خیریت تو گذری۔ آئے اور لے بیٹھے دیوان حافظ۔ گویا "دیوان حافظ" کے اشعار سے ہماری باتیں کچھ کم پُر لطف ہوا کرتی ہیں

کاش کسی دوست کو ہماری بھی فکر ہوتا۔"

"غضب کرتے ہیں آپ بھی!" میں نے ہنس کر کہا۔ "فکر کیسا! آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ آپ بھلے چنگے سامنے بیٹھے ہیں۔ اور کانوں سے سُن رہا ہوں کہ آپ خواہ مخواہ اُلجھ رہے ہیں۔ رہی یہ بات کہ میں نے کچھ کہا سُنا کیوں نہیں۔ تو حضرت! اظہارِ ہمدردی کرنے والوں کی جو گت آپ بنا رہے تھے وہ دیکھتے ہوئے پھر کوئی احمق ہی ہو جو آپ سے کچھ کہے۔ اب رہیں آپ کی باتیں تو وہ تو میں کئی بار عرض کر چکا....."

"خیر!" آپ نے بات کاٹ کر کہا۔ "اچھا اگر ہم مر جاتے تو تم کیا کرتے؟"

"آپ کے سر کی قسم جنازے کے ساتھ جاتا اور مٹی دیکر واپس لوٹتا۔"

"بس اتنا ہی؟" مرزا نے میری طرف تعجب سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "بس یہی محبت ہے تمہیں ہم سے؟"

"تو اور کیا؟" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "آپ شاید یہ سمجھتے ہوں گے کہ اِدھر آپ کا جنازہ نکلا۔ اور اُدھر ہم ستی ہو گئے۔"

"نہیں!" مرزا نہیں کو ذرا لانبا کر کے بولے۔ "ہم تو کچھ اور ہی سمجھے تھے۔"

"تو ذرا ہمیں بھی سمجھا دیجئے گا۔"

"کیوں مغز پچی کرتے ہو!" مرزا نے جھنجھلا کر کہا۔ "رات پٹھان زادی نے "رت جگا" رکھا اور پلک جھپکانی حرام ہو گئی۔ اور اب تم جان کے لاگو ہو رہے ہو۔ مرے یار! عاہ۔

تمہیں اٹھکیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

حالانکہ صبح جو تم آئے تو ہم نے جانا کہ جب تم سے رات کا ماجرا کہیں گے تو ہماری مصیبت کی داستان سُن کر تمہارا جی بھر آئے گا۔ اِدھر تم ٹسوے بہانے لگو گے۔ اُدھر روتے روتے ہماری ہچکی بندھ جائے گی۔ لیکن تم نے تو آتے ہی مذاق کرنا شروع کر دیا۔ اچھا بھائی عاہ۔ تم جو ہنستے ہو مرے حال پہ رونا ہے یہی!!"

"کون کہتا ہے کہ ہم ہنس رہے ہیں؟" میں نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے پوچھا۔ "یا محض یہ بھی آپ کا وہم ہی ہے؟"

"افسوس!" آپ بولے۔ "یہ یورپ والے بنتے تو بہت دانشمند ہیں لیکن لطف تو تب تھا کہ کوئی ایسی دوا بھی ایجاد کرتے کہ جسے پلائی وہی جان نثار بن گیا۔ سچ پوچھو تو ہم نے تو ساری عمر ہی برباد کر ڈالی۔ ورنہ اگر ہم بھی طبابت کی طرف کچھ توجہ کرتے تو "چھلے والے حکیم" کی طرح ہمارا بھی آج ملک میں ڈنکا بج رہا ہوتا اور جہاں جاتے کوٹھے والیاں آنکھیں فرش راہ کرتیں اور اپنی موٹر سیر کے لئے پیش کرتیں۔ خیر اب بھی اگر خدا کو منظور ہے تو کوئی ایسی دوا تیار کریں گے جس کے کھانے سے انسان کا حُلیہ ہی بدل جائے!"

"خوب!" میں نے سنجیدہ صورت بنا کر کہا۔ "یعنی اگر مرد کھائے تو عورت ہو جائے اور جو عورت کھائے تو مرد بن جائے۔"

"جھک مارتے ہو تم!" مرزا ذرا غصے سے بولے۔ "حلیہ سے ہمارا مطلب ہے کہ انسان کی سرشت ہی بدلجائے۔"

"ضرور کوشش کیجئے" میں نے کہا "اور آج ہی ملازمت چھوڑ چھاڑ حکیم بن جائیے"
مرزا ایک آہ بھر کر بولے "اب کیا ہو سکتا ہے!"
"کیوں نہیں کچھ ہو سکتا ہے۔ آپ کوشش تو کریں"

"میرے یار!" مرزا بولے "اگر کچھ ہم کر سکتے تو سب سے پہلے بیوی تبدیل کر لیتے۔ واہ ری قسمت! جو وہ بھی ملی تو بیتے کی بھی۔ خیر! اب سُنو ہم تم سے کچھ خاص طور پر کہنا چاہتے ہیں۔ لیکن پہلے قسم کھاؤ کہ اب مذاق نہیں کروگے"

"کافر ہو جو مذاق کرے!" میں نے کہا۔

"تو سُنو!" مرزا بولے "کل انسپکٹر صاحب ایک ایسی بات کہہ گئے ہیں کہ اس کے خیال سے ہی ہم پر تو کھانا پینا حرام ہو گیا ہے"

"کہیں پولیس والوں کو یہ شک تو نہیں کہ آپ ہی کہیں سے بم اُٹھا لائے تھے۔ جو کسی طرح پھٹ گیا" میں نے پوچھا۔

"ارے توبہ!" مرزا سر ہلا کر کہنے لگے "نہیں ہرگز نہیں۔ بلکہ پولیس والوں کا خیال ہے کہ یہ جو بم کل رات پھٹا ہے کسی سازش کا نتیجہ ہے۔ یا کسی شخص نے کوئی ذاتی انتقام لینے کی خاطر ہماری جان پر حملہ کیا ہے۔ کیا خیال ہے تمہارا؟"

"سازش! انتقام!!" میں نے بھی ذرا تعجب کے لہجہ میں کہا "کون ایسا ہو سکتا ہے جو آپ کے خلاف کچھ سازش کرے یا آپ سے انتقام لینے کی ٹھانے۔ آپ تو ایک طفلِ شیر خوار کی طرح بے ضرر اور معصوم واقع ہوئے ہیں"

"میرے یار تم تو پھر مذاق کرنے لگے!"

"ہرگز نہیں!" میں نے کہا "حضرت! یہ بھی ایک قسم کا وہم ہی ہے جو آپ سیدھی بات بھی مذاق سمجھتے ہیں"

"نہیں یہ بات نہیں!" مرزا نے ایک آہ بھر کر کہا "رات بھر اسی فکر میں ہوں۔ ہماری تو وہی مثال ہوئی کہ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن! لیکن خیر!"

"خیر کیا!" میں نے پوچھا "اگر کسی پر کچھ شک ہے تو پھر خاموشی کیسی؟"

"بھئی! اتنا تو تم بھی مانو گے کہ ہم بھی آخر انسان ہی ہیں۔ وہی جن کے متعلق قرآن میں آیا ہے کہ "ظلوماً جہولا"......"

"سُنیئے بندہ پرور!" میں نے ٹوک کر کہا "اپنے متعلق کچھ زیادہ تفصیل سے آپ کو بیان کرنے کی کچھ ضرورت نہیں۔ کیونکہ "ظلوماً جہولا" تو رہا درکنار آپ اس سے بھی کچھ بڑھ کر ہیں۔ کیونکہ آپ کوئی معمولی انسان نہیں، بلکہ......"

آپ بات کاٹ کر کہنے لگے "خدا کے لئے پہلے ہماری بات سُنو!"

"ارشاد!"

"ہم بھی تو انسان ہیں۔ ۔ ۔ ۔"

"کم از کم مجھ نیازمند کو تو اس میں کچھ شک نہیں۔"

"کیا بُری عادت ہے تمہاری۔ بیچ میں ٹوک دیتے ہو۔"

"حضرت!" میں نے کہا۔ "آپ نے جو پوچھا کہ ہم بھی تو انسان ہیں۔ تو کیا میں کہہ دیتا کہ استغفراللہ آپ نہیں ہیں۔"

"پھر وہی! ارے میرے یار!" مرزا ذرا ناراض ہوکر بولے "کیوں مفت میں پریشان کر رہے ہو۔ بات تو سُنو۔ بھیا! غلطی صرف انسان سے ہی ہوا کرتی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"معاف فرمائیے!" میں نے پھر روک کر کہا۔ "مجھے آپ سے اتفاق نہیں۔"

"تو پھر؟"

"غلطی تو حیوان بھی کرتا ہے اور غلطی کے خمیازے میں ڈنڈے کھاتا ہے۔ چلئے آگے فرمائیے۔ جی ہاں! غلطی انسان سے بھی ہوا کرتی ہے۔ آپ سے کیا ہوئی؟"

"ہم بھی ہزاروں غلطیاں دن میں کر بیٹھتے ہیں۔" مرزا ذرا ماتھے پر بل ڈال کر بولے "اور سب سے بڑی غلطی جو ہم روز کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ تمہیں بہت رازدار اور غمخوار سمجھتے ہیں۔"

"تو مرزا صاحب!" میں نے کہا۔ "اگر صبح کا بھولا شام کو گھر آجائے تو اُسے بھولا مت جانیئے۔ دیکھئے آج سے یہ غلطی مت کیا کیجئے۔ اور اب یا تو مجھے جانے کی اجازت دیجئے یا کوئی اور بات کیجئے۔ دیکھ حضرت! اسے کہتے ہیں وہم۔ کیوں کیا ارشاد ہے اب؟"

"سُنو بھائی!" آپ بولے "ہم تو دن رات تم لوگوں کے فکر میں گھلے جاتے ہیں اور تم ایسے طوطا چشم ہو کہ مصیبت کے وقت مشورہ تک دینے کے روادار نہیں۔"

"اجی توبہ کیجئے!" میں نے کہا۔ "یہ بھی تو وہم ہی ہے کہ آپ کو ہمارے متعلق اس قسم کا خیال پیدا ہوجاتا ہے۔ ذرا دل میں سوچئے تو سہی کہ دُنیا بھر کے کام چھوڑ کر آپ کے پاس بیٹھے ہیں اور طوطا چشم کا خطاب پاتے ہیں۔ رہا مشورہ تو آپ کچھ پوچھیں تو ہم کہیں بھی۔"

"نہیں! نہیں!!" آپ مسکرا کر بولے "مجھے تمہارے متعلق تو ایسا خیال نہیں۔ بھئی کافر ہو جو تمہیں دلی دوست نہ سمجھتا ہو۔ تو بات یہ ہے کہ ممکن ہے کہ کسی شخص کی حق تلفی ہم سے ہوگئی ہو، اور وہ اس قدر سنگین جُرم پر آمادہ ہوگیا ہو۔ دیکھو اِسے ہمارا وہم مت سمجھو۔ کسی نے خدا کو آنکھوں سے تو دیکھا نہیں لیکن عقل سے تو ضرور پہچانا ہے۔"

"آپ عقل والوں کی بات رہنے دیجئے، اپنی کہیئے۔" یہ میں نے ذرا دبی زبان سے کہا۔ "تو پھر آپ کو کسی

واقعی شک ہے۔"

"شک!" آپ بولے "نہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے دشمن کا پتہ لگا لیا ہے۔"

"کہئے!" میں نے ہنس کر کہا "کیا آپ کو الہام ہوا ہے۔ اب لگے ہاتھوں پیغمبری کا اعلان بھی کر دیجئے۔ اور جو پانچ دس دن ہی میں سو دو سو کاٹھ کے اُلّو مرید نہ ہو جائیں تو بس میں گنہگار۔!"

"ارے بھیا!" مرزا نے ہنس کر کہا "الہام نہیں۔ بلکہ یوں آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں"

"بہت خوب!" میں نے کہا "اب تو ہم بھی مان گئے۔"

"کیا؟ کیا مان گئے تم!"

"یہی کہ آپ کو پیر جی سپنے میں ملزم کا نام بتلا گئے ہوں گے۔"

"تو اس میں شک ہی کیا ہے" مرزا بولے۔

"خیر!" میں نے کہا "یہ تو اپنی اپنی عقل ہے۔"

"عقل نہیں!" آپ نے گرم ہو کر کہا "بلکہ اعتقاد کہو۔ رہی عقل۔ اگر عقلمند نہ ہوتے تو رئیس کے ہاں ملازم کیسے ہو جاتے۔"

"بس!" میں نے ہنس کر کہا "معلوم شد بافندگی! حضرت یہ ملازم ہونے کی بات جانے دیجئے اور یہ فرمائیے کہ پیر جی نے کیا کہا۔"

"لو بتلائے دیتے ہیں!" مرزا بولے "یہ سب شرارت ہمارے دھوبی کی ہے۔"

"دھوبی کی!" میں نے ہنس کر کہا "کہیں دھوبن پر تو دل......"

"بہت فضول آدمی ہو تم" آپ نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھ کر کہا "وہ اگر سن لیں تو بس ہم دونوں کی شامت ہی آ جائے۔ لیکن خیر! ہم شرط بدتے ہیں کہ یہ کام صرف دھوبی کا ہے۔"

"آخر کچھ وجہ بھی؟" میں نے پوچھا۔

"لو سنو!" مرزا بولے "کوئی پندرہ بیس روز کا ذکر ہے کہ حکیم جی ملنے کیلئے تشریف لے آئے۔ باتوں باتوں میں انہوں نے کہا کہ جس دھوبی سے ہم کپڑے دُھلاتے ہیں اُسے تپ دق ہے۔ یہ سنتے ہی ہم نے اس سے کپڑے دُھلانے موقوف کر دیئے۔ کیونکہ بھیا! اس موذی مرض کے جراثیم بہت خطرناک ہوتے ہیں۔ کون جانے کسی وقت کوئی ایک آدھ جرم کپڑوں میں چلا آئے تو کنبہ ہی سارا مصیبت میں مبتلا ہو جائے۔ جب ہم نے کپڑے دُھلانے بند کئے تو ہماری جان پہچان کے اکثر لوگوں نے بھی اسے علیحدہ کر دیا اور اس طرح اس "غریب" کا بنا بنایا روزگار محض ہمارے باعث تباہ ہو گیا۔ سو ہو نہ ہو یہ ہم اسی کے پھندے کا ہے۔"

"حد ہو گئی!" میں نے کہا "تو اب اسے پکڑا کیوں نہیں دیتے۔ لیکن مجھے تو تعجب یہ ہے کہ اس احمق نے بجائے کمرے

پر ہم پھینکنے کے دس بیس ہم کپڑوں میں رکھ کر آپ کے ہاں کیوں نہ بھجوا دیتے؟"

"کیا فضول باتیں کرتے ہو"

"کون؟ میں یا آپ؟"

"ہم کیسے؟"

"دل سے پوچھئے"

"میرے یار!" مرزا نے کہا "کٹ حجتی کیوں کرتے ہو۔ ہمارے استدلال کی داد نہیں دیتے"

"استدلال یا حماقت یا وہم! خدا کے لئے بات سوچ کر کیا کیجئے۔ اچھا ہوا کہ اس وقت اور کوئی موجود نہیں۔ ورنہ جانے دل میں کیا سمجھتا۔ اور سچ پوچھئے مجھے تو تعجب ہے کہ آپ کا سرکار کس طرح انجام دیتے ہیں"

"کار سرکار!" آپ نے ذرا ایک لانبا سانس لے کر کہا "مرے یار! اس کی تو عادت ہو گئی ہے۔ کولھو کا بیل ہی سمجھ لو لیکن کیا تمہارے خیال میں ہمارا خیال غلط ہے؟"

"بندہ پرور!" میں نے ہنس کر کہا "اب کوئی اور پیر تلاش کیجئے۔ کہاں غریب دھوبی اور کہاں ہم۔ کیا ٹھکانا ہے اس کمبخت وہم کا بھی۔ اللہ بچائے اس وہم سے"

یہ سُنکر آپ نے سر جھکا لیا۔

---

آپ کچھ دیر اسی طرح سر جھکائے خاموش بیٹھے رہے اور پھر ذرا آبدیدہ ہو کر بولے "بھیا! ہم تمہارا احسان نہیں اُتار سکتے"

"احسان؟" میں نے تعجب سے پوچھا "کیسا احسان؟"

"آج تم نے ہماری آبرو رکھ لی" آپ نے رومال سے آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا "ورنہ ہم دنیا میں بھی رسوا ہوتے اور داور محشر کے سامنے بھی گنہگار ٹھیرتے"

"آپ کیا فرما رہے ہیں!" میں نے مسکرا کر پوچھا "کہیں پیر جی تو نظر نہیں آ رہے؟"

"سچ پوچھو!" مرزا نے اب مسکرا کر کہا "آج تو تم پیر جی سے بھی بازی لے گئے۔ ورنہ ہم نے تو ایک بے گناہ کو آج مصیبت میں ڈال ہی دیا تھا"

اور پھر کچھ سوچ کر "ہمارے خیال میں ایک مسلمان بھائی پر شک کرنا بھی گناہ ہے۔ اور اب اس گناہ کا کفارہ یہ ہو سکتا ہے کہ ہم کل سے پھر اسی دھوبی سے کپڑا دُھلانے لگیں۔ اور اُسے بُلا کر چپکے سے اس سے معافی بھی مانگ لیں۔ کیا خیال ہے تمہارا؟"

"بہت مبارک ارادہ ہے"

"جیتے رہو!" آپ خوش ہو کر بولے "اچھا اب سُنو! سوال یہ ہے کہ آخر بم پھینکا کس نے۔ ہم تو اس معاملہ کو اتنا شاید طول نہ دیتے لیکن مصیبت یہ ہے کہ اگر کل تھانیدار صاحب پھر آگئے تو ان سے کیا کہیں گے۔ اگر ہم چُپکے ہو رہے تو جانے وہ دل میں کیا خیال کرے۔ اور شاید تمہاری ہی بات وہ بھی سمجھ بیٹھے کہ ہم خود ہی کہیں سے بم اُٹھا لائے تھے۔ کیوں بھیا! ٹھیک ہے نا؟"

اور پھر ذرا رازداری کے طور پر "ریاستوں میں اس قسم کی سازشیں ہوا ہی کرتی ہیں۔ اور اکثر اہلکار ہمارا حشم اور عروج دیکھ کر کچھ جلتے رہتے ہیں۔ جانے تھانیدار بھی انہی لوگوں کی پارٹی کا آدمی ہو۔ اور بیٹھے بٹھائے ہم پر مصیبت آجائے۔ کیوں بھیا! ٹھیک ہے نا!"

"پیر و مرشد!" میں نے سر جھکا کر کہا "سب ٹھیک۔"

"اور پھر اور سُنو!" آپ نے ذرا آگے جھک کر کہا "اگر ملزم گرفتار نہ ہوا تو بات اور بھی بڑھے گی۔ رئیس کو بھی کچھ شک ہوگا کہ ہیں مرزا صاحب کے مکان پر بم پڑے اور مرزا کو مجرم کا پتہ نہ ہو۔ اس لئے جس طرح بھی ہو ہمیں اس معاملہ میں بہت احتیاط کرنی چاہیئے۔"

"ضرور!"

"تو خیر!" آپ پھر بولے "یہ تو ثابت ہو گیا کہ دھوبی بے گُناہ ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ پھر اور کون ایسا ظالم ہو سکتا ہے۔ ہاں سُنو تو! کوئی دس پانچ روز ہوئے ہم بازار کچھ سامان خریدنے گئے تھے۔ جس کے ہاں سے ہم ہمیشہ خریدا کرتے ہیں، ہم سے کسی نے کہا تھا کہ وہ بہت زیادہ دام وصول کرتا ہے۔ حالانکہ وہ ہمیشہ ہمیں یہ یقین دلا دیا کرتا ہے کہ اس کے ہاں دام مقررہ ہیں ایک کوڑی بھی کم و بیش نہیں ہو سکتی۔ ہم نے محض آزمانے کے لئے اس سے دو چار چیزوں کے دام کم کرنے پر زور دیا لیکن وہ نہ مانا۔ اس پر ہمیں بھی تاؤ آگیا اور ہم ناراض ہو کر وہاں سے ہٹ کر اور جگہ سے سامان خرید کر لے گئے۔ واپسی کے وقت جو اس کی دوکان کے سامنے سے گذرے تو اس نے سلام تک نہ کیا۔ حالانکہ ہمیں دیکھتے ہی وہ ایک کیا بیسیوں فرشی سلام دور سے ہی کیا کرتا تھا۔ ہم بھی آخر کچھ عقل رکھتے ہیں۔ بھانپ گئے کہ اس پاجی کی نیت خراب ہے۔ اور شاید انتقام لینے کی فکر میں ہے۔ کہیں یہ کام اسی پاجی کا نہ ہو۔ کیا خیال ہے تمہارا؟"

"بس ٹھیک ہے پکڑوا دیجئے اسے؟"

"اب تو مانو گے؟" آپ ذرا خوش ہو کر بولے "کہ ہم بھی عقلمند ہیں۔ دیکھا کیسے سراغ لگا لیا۔ اسے کہتے ہیں الہام!"

"جی ہاں!" میں نے کہا "بھنگڑ خانے میں بھی اس قسم کے الہام ہوا کرتے ہیں۔ دہلی کے غدر کا باعث بھی تو ایک بھنگڑ کا الہام ہی تھا۔"

"لگے پھر بے تکی ہانکنے تم کبھی تو قائل بھی ہو جایا کرو!" مرزا نے ناراض ہو کر کہا۔

"حضرت!" میں نے ایک آہ بھر کر جواب دیا "آپ قائل ہونے کو کہتے ہیں اور میں تو حشر کو مانتا ہوں بن دیکھے!"

"جانے کیا کہہ رہے ہو تم" اور پھر میری طرف دیکھ کر "جو کچھ ہم نے کہا وہ بھی سُنا، یا سوتے ہو؟"

"سوتا نہیں بلکہ آپ کی عقل پہ روتا ہوں"

"تو کیا ہمارا خیال غلط ہے؟"

"کون کہتا ہے"

"تو پھر؟"

"پھر عرض یہ ہے کہ وہ جو دو چار روز ہوئے آپ نے ایک سائل کو بنگلے سے باہر نکلوا دیا تھا اس کے متعلق کیا خیال ہے آپ کا؟"

"ہوں!" آپ ہُوں کو بہت لانبا کر کے کہنے لگے "ٹھیک! بالکل ٹھیک! خوب یاد دلایا تم نے بس یہ اسی حرامی کا کام ہے!"

اور پھر آسمان کی طرف دیکھ کر "شکر ہے میرے مولا! اس مخمصے سے تو نے نجات دی"

اور میں نے بھی ایک آہ بھر کر اور آسمان کی طرف دیکھ کر کہا "توبہ ہے میرے اللہ! کسی کو وہم کا مرض بھی نہ ہو۔ توبہ ہے!!"

آپ پھر خاموش ہو گئے۔ کبھی کبھی کچھ زیر لب بڑبڑا دیتے۔ پھر کہنے لگے "تم پھر بھرے وہم وہم پکار رہے ہو لیکن یہ نہ معلوم ہو سکا کہ وہم سے تمہارا مطلب کیا ہے"

"اللہ ہی جانے!" میں نے کتاب دیکھتے ہوئے کہا۔

"اللہ کو تو علم ہے ہی" آپ نے کہا "لیکن کچھ تم بھی تو کہو!"

"اللہ ہی جانے!" میں نے پھر اسی طرح جواب دیا۔

"تو پھر تم کیوں ناحق ہمیں دق کر رہے ہو؟"

"اللہ ہی جانے!"

آپ جھنجھلا کر بولے "آج تم ہمیں پاگل کر کے چھوڑو گے!"

"اللہ ہی جانے!"

"ہم بھی بڑے احمق ہیں جو تم سے مشورہ کرنے بیٹھ جاتے ہیں"

"اللہ ہی جانے!"

"جہنم میں جاؤ تم اور تمہارا......"

"تمہارا کہہ کر آپ رک جو گئے تو میں نے کہا "اب آگے بھی کہہ دیجئے نا۔ کیا تمہارا ہوں مرزا جی ارشاد!"

آپ ہنسنے لگے اور پھر کہا "ہاں بھیا! بیٹھے بیٹھے ایک بات اور بھی یاد آگئی۔"
"کہئے کہ بیٹھے بیٹھے پھر الہام ہوا۔ جی! ارشاد!!"
"مرے یار! بہت خوفناک بات ہے۔"
"خدا رحم کرے۔"
آپ آنکھیں بند کرکے کچھ دیر بیٹھے آہستہ آہستہ سر ہلاتے رہے اور پھر کہا "اچھا قسمت!"
میں نے کتاب بند کرتے ہوئے پوچھا "حضرت! یہ بیچ میں قسمت کہاں سے گھس آئی اس وقت؟"
"بھائی!" آپ نے کچھ متفکرانہ انداز سے کہا "اب خیریت اسی میں نظر آتی ہے کہ ہم ملازمت سے کنارہ کش ہو جائیں۔"
"آخر کچھ وجہ بھی؟"
"انگریزی علاقہ کا اثر ہیں۔ ریاست میں بھی پھیلتا نظر آتا ہے۔"
"جانے آپ کیا کہہ رہے ہیں" میں نے پھر کتاب کھولتے ہوئے کہا "کوئی بات بغیر تمہید کے تو آپ کرنی جانتے ہی نہیں۔"
آپ نے میری طرف دیکھا اور مسکرا کر کہا "تم نے بھی گلستاں پڑھی ہوتی تو گفتگو کرنے کا سلیقہ جانتے۔ سنو میاں! جب کوئی بات کسی سے کہنی ہو تو پہلے تمہید اٹھایا کرو۔"
"جی ہاں!" میں نے کہا "جیسے مشاعرہ میں مصرعہ اُٹھایا کرتے ہیں۔ ہاں صاحب! مکرر فرمائیے۔ واہ سبحان اللہ!"
"بہت ناکارہ مذاق کرتے ہو۔"
"حضرت! 'ناکارہ' نہیں گھٹیا فرمائیے۔ اگر کہیں مولٰنا 'ناکارہ' کو معلوم ہو گیا کہ آپ ان کے نام کا مذاق اُڑاتے ہیں تو پھر اچھا نہ ہوگا۔"
"تمہارے کہنے کی سند نہیں۔ جانتے بھی ہو ہم اہلِ زبان ہیں۔ ہمارا کہا سند ہے۔"
"بجا ارشاد ہوا۔ جب ہی تو آپ کے صوبے کی زبان ہندی ہے۔ بیشک! آپ زبان درازوں نہ تو یہ زبان دانوں کا حق ہے۔ کہ ہم لوگوں پر خوب فقرے کسا کیجئے۔ کیوں مرزا صاحب! اگر ہم "تمہیں" کی بجائے "تم نے" لکھدیں پھر تو شاید آسمان ہی پھٹ پڑے یا کوئی اہلِ زبان حواس باختہ ہو کر کوئیں میں کود پڑے۔"
"مرے یار!" مرزا ہنس کر بولے "تم تو گلے کا ہار ہی ہو گئے۔ تو ہاں ہم کہہ رہے تھے کہ خیریت اسی میں ہے کہ ہم ملازمت سے کنارہ کش ہو جائیں۔ اصل بات یہ ہے کہ کئی روز سے رئیس کے سامنے تخفیف کا مسئلہ پیش ہے۔ لیکن ابھی تک قطعی طور پر کچھ فیصلہ نہیں ہوا۔ لیکن خیال ہے کہ کچھ بڑے بڑے عہدے تخفیف میں لائے جائینگے۔ ممکن ہے کہ رئیس ہی نے تخفیف کی یہ ایک نئی ترکیب نکالی ہو کہ سانپ بھی مرے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ کیوں

کیا خیال ہے تمہارا؟"

"سمجھ گیا!" میں نے کہا "تو آپ کے خیال میں بم رئیس کے ہی اشارے سے پھینکا گیا ہے"

"رئیس کہو یا پولیس! بات ایک ہی ہے۔ اور یہ ترکیب ہے بھی تو بہت موزوں۔ اگر ہم مر جائیں تو رئیس کو حق ہو کہ ہمارا عہدہ تخفیف میں لے آئے۔ کیوں کیا خیال ہے تمہارا؟"

"میرے خیال میں تو آپ کا یہ خیال بہت نامعقول ہے" میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"لیکن بھیا! اس میں ہنسنے کی تو کوئی بات نہیں۔ اگر ہم غلطی پر ہیں تو تم ذرا تمیز سے سمجھا دو۔ اور کہو کہ مرزا صاحب دیکھئے دیوار ہم گوش دارد! اگر کہیں رئیس تک یہ بات پہونچ گئی تو بس آفت ہی آجائیگی"

میں نے سر جھکا لیا تو آپ نے پوچھا "اب کچھ تم بھی کہو!"

"سنئے! ایک تھا شیخ چلی......."

"نہیں سنتے!" آپ بات کاٹ کر بولے "ہمیں شیخ چلی کہتے تمہیں شرم نہیں آتی"

"آپ نے بات تو سنی نہیں اور ٹوک پہلے ہی دیا"

"ہم شیخ چلی کی بات نہیں سننا چاہتے کوئی کام کی بات کرو"

"بہت اچھا۔ سنئے! ایک تھے مرزا حماقت بیگ! اور وہ......."

مرزا پھر غصہ سے بولے "آج کچھ سنکر جاؤ گے"

"جی ہاں! بھلا سنائیے تو آج ع۔ دلِ بے قرار سو جا!"

آپ بے ساختہ ہنسنے لگے اور بولے "خدا کی قسم! تم پر غصہ بھی بہت ہے لیکن......"

اتنا کہہ کر مرزا چپ ہو گئے تو میں نے کہا "لیکن کچھ بس نہیں چلتا۔ ورنہ آپ مجھے ہی مجرم بنا دیتے ٹھیک ہے نا مرزا صاحب!"

آپ یہ سنکر مسکرائے اور ایک آہ بھر کر بولے "کیا کریں! اب چالیس پینتالیس کے لگ بھگ ہوگئے طبیعت کچھ کمزور ہو گئی ہے۔ خیر! اچھا ہوا کہ آج تم سے باتیں کرنے کا موقع مل گیا۔ اب ایک بات اور بھی سنو۔ اتنا تو تم بھی مانو گے کہ بعض اوقات انسان کو غصہ بھی آجاتا ہے۔ اور غصہ میں اکثر کوئی ایسی حرکت بھی ہو جاتی ہے جس سے بعد میں پچھتانا پڑتا ہے۔ تم سے ایک راز کی بات کہتے ہیں۔ بس تم تک ہی رہے۔ کچھ دنوں سے ہم نے بیگم کے انتظامات میں دخل دینا شروع کر رکھا ہے، حالانکہ اس سے پہلے ہم ان کے کسی کام میں مخل نہیں ہوا کرتے تھے"

"جی ہاں!" میں نے بھی رازداری کے انداز سے کہا "یہ تو مجھے بھی معلوم ہے کہ آپ کے ہاں بیگم شاہی چلتی ہے۔ اور آپ کو کوئی پوچھتا تک نہیں۔ واقعی بڑے ستم کی بات ہے"

"ٹھیک ہے!" مرزا نے ہولے سے کہا "اسی بات کا تو ہم انسداد کرنا چاہتے ہیں۔ بھائی! کولھو کے

بیل کی طرح آٹھ پہر تو ہم کام کرتے ہیں لیکن ادھر تنخواہ آئی اُدھر اس نے قبضہ کر لیا۔ اب اگر ہم ایک پیسہ بھی مانگیں تو جب تک یہ نہ پوچھ لیں کہ کہاں خرچ ہوگا کبھی نہ ملے گا۔ ایک طرح سے یہ عادت ہے تو بہت اچھی۔ اگر سبھی لوگوں کی گھر والیاں خاوند کی ہر بات پر یونہی نظر رکھا کریں تو مردوں کے بگڑنے اور فضول خرچ ہونے کا کم احتمال ہو۔ لیکن خیر! مشکل یہ ہے کہ یہ نوکر حرام زادے جب تک ان سے پوچھ نہ لیں ہمارا کوئی کام کرتے ہی نہیں۔ تو اس کا علاج ہم نے یہ سوچا کہ گاہے گاہے کسی ایک پر جرمانہ کر دیا۔ لیکن جرمانہ وصول کرنے والی چونکہ بیگم ہیں۔ اس لئے وہ بجائے اس کے کہ جرمانہ وصول کریں جس پر ہمارا عتاب ہوتا اُسے اُلٹا کچھ انعام دے دیتیں ہیں۔ اب خدا کیلئے تم ہی انصاف کرو کہ کون غیرتمند اس قسم کا برتاؤ برداشت کر سکتا ہے؟"

"اجی توبہ کیجئے! اس کا تو ضرور کچھ تدارک ہونا چاہئے۔"

"تدارک کی ہی تو ہم تم سے بات کہہ رہے ہیں۔ تو خیر! جب اس طرح کام بنتا نظر نہ آیا تو ہم نے یہ ترکیب کی کہ جب تنخواہ لاتے بیگم کو صرف اتنا روپیہ دیدیتے جو گھر کے اخراجات کے لئے ضروری ہے۔ اس پر بگاڑ شروع ہوا۔ لیکن ہم بھی دبنے والی اسامی تو ہیں نہیں۔ ہم اپنی ضد پر قائم رہے لیکن اس کمبخت نے انتقام لینے کی جو ترکیب نکالی ہے تو بھیا! سچ پوچھو تو اس سے تو ہم واقعی ڈر گئے ہیں۔"

"کیا مطلب آپ کا؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"خوب!" آپ نے ناراض ہو کر کہا "پہر بھر سے تو ہم بک بک کر رہے ہیں اور تم ابھی تک مطلب بھی نہیں سمجھ سکے۔ ارے میاں! یہ سب گل بیگم کے ہی کھلائے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ہمیں تو اس میں اسکے میکے والوں کا بھی ہاتھ نظر آرہا ہے۔ یہ بم جو کل رات پھٹا۔ بڑی گہری سازش کا نتیجہ ہے۔"

"واللہ حد ہوگئی!" میں نے کہا "توبہ ہے توبہ! لیکن سنئے میرا خیال کچھ اور ہی ہے۔"

"تو پھر کہتے کیوں نہیں؟"

"آپ اکثر بچوں کو بھی تو کھیل کود سے منع فرمایا کرتے ہیں۔"

"تو پھر اور کیا کریں۔ سارا دن وہ اُدھم مچاتے ہیں کہ توبہ ہی بھلی۔ اور وہ بڑا کلیم تو مدرسے سے آتے ہی قیامت برپا کر دیتا ہے۔"

"اور کبھی کبھی ایک آدھ چپت بھی تو رسید کر دیا کرتے ہوں گے!"

"کل ہی تو اس کلیم کی بید سے مرمت کی تھی جس پر اس کی ماں نے ہمیں سارا دن بھوکا رکھا۔"

"ہوں!" میں نے سر ہلا کر کہا "بس معاملہ صاف ہے!"

"کیا؟"

"یہ سب میاں کلیم ہی کی شرارت ہے۔ اب دیر مت کیجئے اور پولیس میں اطلاع کر کے پکڑوا دیجئے۔"

"مرے یار!" آپ بولے "پھر مذاق کرنے لگے۔ بچے کو پکڑوا دوں۔ کہیں عقل گھاس چرنے تو نہیں

گئی تمہاری!"

"اچھا بچے کو نہ سہی بیگم کو ہی سہی!"

"کیوں تنگ کرتے ہو میاں!"

"کافر ہو جو اب بیٹھے!"

"سمجھ تو ہم ہی رہے ہیں"

"آپ تو خاک بھی نہیں سمجھ رہے"

"پھر کیا کروں!"

"پولیس میں اطلاع دیجئے"

"بیوی بچوں کے خلاف؟ غضب کرتے ہو میرے یار!"

"کیوں اس میں حرج ہی کیا ہے۔ مجرم جو ہوئے!"

"کیا کہیں!" مرزا ایک آہ بھر کر بولے "ہم نے تو قیاس ہی کیا تھا"

"قیاس نہیں۔ وہم فرمائیے!"

"کچھ نہیں کہہ سکتے!"

"دیکھا حضرت! یہ وہم کیا بری بلا ہے۔ آپ کہاں سے کہاں پہونچے۔ حد ہو گئی۔ بیوی اور بچہ بھی نہ بچا۔ توبہ! سمجھ لیجئے وہم تباہی کا پیش خیمہ ہوا کرتا ہے۔ وہمی اپنے لئے بھی مصیبت اور دوسروں کے لئے بھی وبالِ جان ہوتا ہے"

"سچ کہتے ہو!"

"آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ شب برات سر پر آ رہی ہے"

"ہے تو سہی!"

"اور سبھی لڑکے بالے پٹاخے چھوڑتے پھرتے ہیں"

"بچوں کا کھیل جو ہوا" آپ بولے "ہمیں بھی کبھی آتشبازی کا بہت شوق تھا"

"اور آپ کے کلیم میاں کا تو سارا دن شغل ہی یہی ہے"

"کہتے تو سچ ہو" کہتے ہوئے مرزا اُٹھے اور دوسرے کمرے کی طرف جاتے ہوئے بولے "ذرا ٹھیرو تو سہی"

دو ہی منٹ بعد آپ ایک کوٹ ہاتھ میں پکڑے مسکراتے ہوئے آئے اور پوچھا "یہ کس کا کوٹ ہے؟"

"کلیم ہی کا ہوگا"

"اسی شیطان کا ہے۔ بوجھو تو بھلا اس کی جیب میں کیا ہے!"

"میں کیا جانوں۔ مجھے آپ کی طرح الہام تھوڑی ہوتا ہے"

آپ دو انگلیوں سے بتلا کر بولے "دو!"

"کیا دو؟"

"پٹاخے!" آپ نے ہنس کر کہا "بس یہ سب شرارت اس شیطان کلیم ہی کی تھی"

اور پھر دو بہت بڑے پٹاخے جن میں "پٹاس" بھری ہوئی تھی جیب سے نکال کر مجھے دکھلائے اور کہا۔

"لیکن یہ اسے سوجھی کیا؟"

"محض دل لگی!"

"مرے یار! تم بھی کمال کرتے ہو۔ اگر میں کچھ زیادہ چوٹ آجاتی تو پھر؟"

"خیر!" میں نے کہا "ان باتوں کو تو چھوڑیئے اور اب یہ فرمائیے کہ میں آپ کو بچ جانے پر مبارک باد دوں یا اڑلانے کی کچھ ترکیب کروں"

مرزا ہنسنے لگے اور پھر بولے "سچ کہتے ہو تم۔ ہم واقعی بہت ستی ہو گئے ہیں۔ اب خدا کے لئے کسی اور سے یہ ذکر نہ کر بیٹھنا"

ایم۔ اسلم

# کھرپا بہادر

از مصورِ ظرافت جناب مرزا عظیم بیگ چغتائی

**نوٹ:۔** سالنامہ ساقی [illegible]ء میں چغتائی صاحب کا ایک مضمون "روستا بہادر" کے عنوان سے شایع ہوا تھا۔ یہ مضمون اس قدر پسند کیا گیا کہ اب تک شائقین متقاضی ہیں کہ مرزا صاحب اپنے نرالے ہیرو کی شادی کے بعد کے واقعات بھی قلمبند فرما دیں۔ چنانچہ بقیہ حالات بھی لکھے جا چکے ہیں۔ اور ایک عمدہ کتاب کی صورت میں مرتب کئے جا رہے ہیں۔ اس کتاب کا نام "کھرپا بہادر" رکھا گیا ہے اور مستقبل قریب میں شایع ہو جائیگی۔ مضمون مندرجہ ذیل "کھرپا بہادر" کے بے شمار دلچسپ حالات کا ایک جزو ہے۔ "شاھد"

## گربہ کشتن

اب میں نے دیکھا کہ شہزادی صاحبہ تو ہار گئیں۔ دروازے بند ہیں، لہذا پٹنے کا تو اب خطرہ رہا نہیں۔ سامنے نظر پڑی چھوٹی چھوٹی میزوں پر جن کے اوپر خوان پوش ڈھکے ہوئے تھے۔ کوئی مزیدار چیز ہوگی اس میں کھانے کی! مجھے بھوک لگ رہی تھی۔

میں چلا اس طرف کہ ایک دم سے شہزادی صاحبہ کے جوتے پر نظر پڑی۔ ہیرے جھل جھل کر رہے تھے۔ میں ایک دم سے رک گیا۔ شہزادی صاحبہ کی طرف دیکھا، وہ اسی طرح بیجان گٹھڑی بنی ہوئی تھیں۔ ایک چادر انہیں اڑھادی مسہری کا پردہ ڈال دیا اور اب میں نے جناب غور سے اس قیمتی جوتے کو دیکھا۔ اس میں طرح طرح کے جواہرات لگے ہوئے تھے۔ سب سچے ہوں گے، میں نے دل میں کہا اور اب یہ سوچا کہ شادی تو میری شاید ہو گئی ہے، مگر کچھ عقل کام نہیں کرتی، کچھ ٹھیک نہیں، نہ معلوم کیا ہو کیا نہ ہو، اس جوتے کو لیکر اگر بندہ صفائی کے ساتھ اڑ جائے تو کیا کہنے ہیں۔ میں نے پھر جوتا غور سے دیکھا۔ انگلی سے بیچ کا بڑا ہیرا دیکھا۔ بڑی کوشش کر کے اسے اکھیڑ لیا اور انٹی میں مضبوطی سے کس لیا کہ داشتہ آید بکار۔ اگر پھاند پھوند کر نکل گئے اور کوئی افتاد پڑی تو کام آئیگا۔

میں ہیرا نوچ کر سیدھا چھوٹی چھوٹی میزوں کی طرف پہونچا۔ یہ قالینوں کا ..... بڑے بڑے اون کے قالینوں کا فرش بھی کس قدر واہیات ہوتا ہے۔ دو جگہ گرنے سے بچا۔ خوان پوش کو دیکھا تو اس میں سچے موتی لگے تھے۔ ایک تو بہت بڑا تھا میں نے بلا تکلف اس کو بیچ میں سے توڑ کر احتیاطاً رکھ لیا تب جا کر خوان پوش ہٹایا ہے تو کیا دیکھتا ہوں کہ کھانے کی وہ چیزیں رکھی ہیں جو عمر میں کبھی میں نے سنی بھی نہ ہونگی، واللہ ریشم اور کلابتو کہیئے، خوب ڈٹ کر کھایا۔ کھانے کے بعد میں اس امر پر غور کر رہا تھا کہ اے کاش یہ چاندی کے برتن اور سونے کی نمکدانیاں میں کسی طرح ساتھ لیکر پھاند پھوند کر

محل سے نکل جاتا کیونکہ دل بول رہا تھا کہ شادی تو ہو گئی مگر کچھ جھگڑا اس میں ضرور ہے۔

میں اسی طرح مشغول تھا کہ میں نے کنکھیوں سے دیکھا...... میں نے دیکھا کہ شاہزادی صاحبہ مسہری کے داہنی طرف سے سر نکالے نہایت ہی خفیہ طریقہ سے جھانک رہی ہیں۔ دل ہی میں میں نے کہا کہ پکڑوں اسے۔ میں ایک تصویر کو دیکھنے میں مشغول تھا۔ سرکتا جاتا تھا۔ بڑی احتیاط سے شہزادی صاحبہ کو کنکھیوں سے دیکھتا بھی جاتا تھا شہزادی صاحبہ اسی طرح جھانک رہی تھیں، یہ سوچ کر کہ میں انہیں نہیں دیکھتا۔ میں بڑھتا بڑھتا آڑ میں پہونچا۔ ابھی دور تھا۔ ایک دم سے ملائم غالیچوں پر شیر کی طرح جھپٹ کر مسہری میں شہزادی صاحبہ کی میں نے گردن پکڑ لی۔ ایک دبی ہوئی چیخ ان کے منہ سے نکلی کہ میں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹ کر قالین پر رکھ دیا۔ وہ مسہری پر جانے کے لئے جو زور لگانے لگیں تو میں نے ذرا ڈانٹ کر کہا "اب میں تمہیں بیطرح ٹھوکونگا...... بیٹھو سیدھی...... دیکھو ادھر...... ہماری طرف...... ......جواب دو جو ہم پوچھیں...... زندگی سے عاری ہیں ہم...... ویسے ہی موت ہمارے سامنے ہے...بس... بس [illegible] اب میری باتوں کا جواب دو...... ورنہ......"

شہزادی صاحبہ کو میں نے قابو میں کر کے سیدھا بٹھایا کہ وہ شرم کے مارے مری جا رہی تھیں لیکن جیسے ہی میں نے "ورنہ" کہا ایک دم سے وہ بل کھا گئیں۔ اللہ رے تمکنت۔ حجاب کو رخصت کر کے انہوں نے بگڑ کر اپنا سر سیدھا کر کے کہا "ذرا تمیز سے" بخدا میں سن سے ہو کر رہ گیا۔ کیونکہ شہزادی صاحبہ میں حسن و جمال کے ساتھ ساتھ اپنے والد بزرگوار کا دبدبہ، رعب اور جلال اس طرح تھا کہ بس چیتون سے چیتون ملالو۔ میں نے جھٹ سے جھک کر سلام عرض کرنا شروع کئے۔ اور بولا "میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں آپ تو خود گڑبڑ کر رہی ہیں...... آپ کو کیا معلوم میرے اوپر کیا مصیبت آئی ہے۔"

یہ کہہ کر جو میں ہاتھ باندھ کر سیدھا کھڑا ہوا ہوں تو معلوم ہوا کہ گویا خود آقائے لنگران کے سامنے کھڑا ہوں۔ میں بیٹھنے لگا کہ اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کروں گا۔ شہزادی صاحبہ تو اب میرے اوپر حاوی ہو رہی تھیں فوراً بولیں مگر قدرے ملائمت سے "بغیر اجازت نہیں بیٹھنا چاہیئے۔"

"گستاخی معاف" میں کہہ کر ذرا رکا اور پھر سلام کر کے بیٹھ گیا۔ دل ہی میں میں نے کہا کہ واللہ یہ چھوکری تو بڑی تیز ہے۔ ابھی ابھی تو اس کی گ۔دن دابی تھی۔ اور لگی رعب جتانے۔ خیر اس کو ٹھیک کروں گا اگر واقعی شادی ہو گئی ہے تو یہ جورو اپنے قابو کی نہیں، بغیر مارے کوٹے یہ رستے پر نہ آئے گی۔ خیر میں بیٹھ گیا اور اب میں نے عرض کیا۔

"......جناب شہزادی صاحبہ...... میں غریب آدمی ہوں مگر خود لنگران اعظم کی اولاد میں سے ہوں......"

ایک دم سے شہزادی صاحبہ نے سخت تعجب کا اظہار کیا کہ جیسے کچھ ان کو شک ہے۔

"جی ہاں......" میں نے کہا "لنگران اعظم کی اولاد سے ہوں...... گذارہ داروں میں ہوں مگر ڈیڑھ روپیہ گذارہ میں کیا گذر چلتی۔ محنت مزدوری کرتا پھرا...... اب ایک دم سے پکڑ لایا گیا میں سمجھا کہ میں مارا جاؤں گا اور

میرے ساتھ مذاق ہو رہا ہے؟"

یہ کہہ کر میں نے ساری کیفیت دربار کی بیان کی، کس طرح میں ڈرتا تھا کس طرح میں نے آدمی بننے سے انکار کیا، کس طرح مجھے مارا گیا۔ کس طرح نکاح کے وقت میں نے ڈر کر انکار کیا اور پھر کس طرح پیٹا گیا۔ یہ تفصیل سن سن کر شہزادی صاحبہ ہنس پڑیں۔ میں نے ادھیڑ دار تفصیل بیان کی اور آخیر میں بتایا کہ کس طرح اندر آیا تو آپ نے میرا منہ خاصدان کے ڈھکنے سے توڑ دیا۔ اور جوتی لیکر مرمت کرنے بڑھیں۔

شہزادی صاحبہ کے خوبصورت اور شاہانہ چہرہ پر پھولوں کی بارش ہو گئی۔ میں نے اصرار کر کے کہا "آخر یہ آپ مجھے مارنے پر کیوں تُل پڑیں؟" شہزادی صاحبہ نے کہا کہ "میں تمہیں گنوار سمجھی کہ تم گستاخی کرنے آئے ہو۔ مجھے کیا معلوم کہ...... (ڈر کر) جہاں پناہ ہی نے مجھے دھمکی دی تھی کہ گنوار......"

"اہا ہا اوہو!" میں نے چونک کر کہا "شہزادی صاحبہ اگر اجازت ہو تو......... آپ خفا نہ ہوں تو عرض کروں کہ اُس روز رات کو باغ میں جو آپ آئی تھیں.......... داروغہ کی لڑکی سے آپ باتیں کر رہی تھیں..."

"ہیں!" شہزادی صاحبہ چونک پڑیں "تمہیں کیسے معلوم؟"

میں نے کہا "میں وہاں باغ میں...... گیا تھا...... ملا تھا..... پھر داروغہ کی لڑکی سے آپ کی باتیں دروازہ کی درار میں سے سب سُنی تھیں۔"

"تم تھے؟" شہزادی صاحبہ نے کہا "تم تھے...... وہ روش پر....."

"جی۔ جی۔ خاکسار تھا۔ حضور کا باغ کھسوٹنے بندہ گیا تھا۔"

کچھ رنجیدہ یا سنجیدہ ہو کر شہزادی صاحبہ نے کہا "یہ باتیں تمہیں نہ کرنا چاہئیں۔"

میں نے کچھ بے تکلفی سے کہا "تو اب تھوڑا ہی میں باغ کھسوٹنے جا رہا ہوں۔ ان قصوں کو تو آپ جانے دیجئے۔ اور اب خدا کے واسطے مجھے ایک بات بتائیے، وہ یہ کہ اب تو میں مارا کوٹا نہیں جاؤں گا؟"

شہزادی صاحبہ پھر ہنس پڑیں لیکن ایک وقار کے ساتھ کہا "اب تم کو چاہئیے کہ گستاخی اور بے ادبی کرنا چھوڑ دو۔ ذرا وقار کیساتھ رہنا چاہئیے....."

"اجی" میں نے کہا "یہ فضول باتیں جانے دیجئے..... مجھے تو ایسی ترکیب بتائیے کہ یہ پٹنے وٹنے کا دھڑکا جاتا رہے اور پھر یہ بتائیے کہ کوئی خطرہ تو مجھے نہیں ورنہ میں بھاگنے کا فکر کروں۔"

"بھاگ جاؤ گے؟" وہ بولیں۔

"اور نہیں یہ چار چوٹ کی مار تھوڑی کھاؤں گا دن رات" میں نے کہا "یا تم مجھے بچاؤ اور ترکیب بتاؤ۔"

شہزادی صاحبہ ایکدم سے بولیں "تمیز سیکھو تمیز..... یہ تم؟"

"معاف فرمائیے" میں نے کہا "اچھا آپ سہی........ تو پھر مطلب میرا یہ ہے کہ مجھے کوئی ترکیب بتائیے جو میرا اطمینان ہو۔"

شہزادی صاحبہ بولیں "بس ترکیب یہ ہے کہ تمہیں شاہزادوں کی طرح رہنا چاہیئے۔ آداب دربار سیکھنے چاہئیں سب ملازموں خواجہ سراؤں اور خواصوں کو رعب میں رکھنا چاہیئے۔ میرے سامنے ہمیشہ قاعدہ سے مؤدب رہنا۔ میں خواصوں کو بتادونگی۔ جہاں وہ کہیں موقع سے مجھے سلام کیا کرنا۔ اور ہمیشہ ادب سے پیش آنا۔ صبح دربار میں جانا تو بالکل کسی سے نہ ڈرنا۔ اندر والدہ صاحبہ ملکہ معظمہ صاحبہ کی خدمت میں قاعدے سے نظر پیش کرنا۔ تمہیں سب قواعد بتادئے جائیں گے۔ جب تم سلام کروگے تو میں رومال آگے بڑھادونگی۔ اس کے کونے کو پکڑ کر تم آنکھوں سے اور پھر دل سے لگا لینا۔ بس یہی قواعد ہیں۔"

میں نے غور سے یہ سب باتیں سُنیں۔ مجھے جب یقین آگیا تو اب مجھے کچھ اور سوجھی۔ میں نے آداب و القاب کو تو فی الحال رکھا بالائے طاق اور اب میں نے ذرا ہمت کرکے کہا "تو اب ان باتوں کو چھوڑ دو۔ اب یہ بتاؤ تم کہ تمہارے ساتھ شادی کٹھ گئی ہماری یا کوئی جھگڑا باقی ہے؟ اور اب بندہ خان تمہارے ضابطہ کے میاں ہیں یا نہیں اور اگر........"

"ہائیں!" شہزادی صاحبہ نے تیوری پر بل ڈال کر کہا "یہ گستاخی..... !"

انہوں نے غصہ میں بل کھایا ہی تھا کہ میں نے دل میں یہ سوچ کر کہ گربہ کشتن روز اول والا مضمون ٹھیک رہیگا۔ نہایت ہی لاپرواہی سے کہا۔

"گستاخی کو ڈالو چولہے میں...... تم ہو ہماری بیوی...... آداب القاب ہم کچھ نہیں جانتے یہ جھگڑے ...... سب واہیات ہے...... تم ذات کی ٹھہریں شاہزادی اور ہم ٹھہرے آخر کو "ٹھرپنے" مگر قسم ہے خدا کی ہم تمہیں سر پہ بٹھائیں گے...... ہم اپنی پیاری اور خوبصورت شاہزادی کو سر پہ بٹھا لیں گے۔"

قبل اس کے کہ وہ کچھ کہہ سکیں۔ یہ کہہ کر میں نے اپنی پیاری شہزادی کو لپک کر پھول کی طرح اُٹھا کر سچ مچ سر پہ رکھ لیا...... میرا دماغ شہزادی صاحبہ کی خوشبو سے معطر ہوگیا۔ اور میں اب ان کو سر پہ اُٹھا کر لگا جھولا جھلانے۔

"ہائیں..... یہ گستاخی..... " شہزادی صاحبہ سر پہ سے بولیں۔

اسکے جواب میں ادھر میں نے جملہ گستاخیاں ختم کرکے سر پر سے اُتار کر محبت میں ان کے رخساروں پر آہستہ سے دو عدد چانٹے رسید کرکے مسہری پر پٹخ دیا اور ڈپٹ کر کہا "چور دو اذرا ہوش کی باتیں کرو"

---

# دربار

صبح کے دربار میں جشن کا سامان تھا۔ مجھے آپ دیکھتے تو کہتے۔ ہر کس و ناکس کی نظریں میری ہی طرف اُٹھتی تھیں۔ "نواب ٹھرپا بہادر" ہر زبان پر خاموشی کے ساتھ تھا۔

میرے اوپر شاہی عنایات کی بارش ہوگئی۔ تیس ہزار روپیہ سالانہ آمدنی کی کراچی اور بمبئی میں جائداد کا اعلان کیا گیا۔ اکیاون ہزار کی جاگیر کا لنکران میں اعلان کیا گیا۔ شہزادی صاحبہ کے اخراجات پاندان کے لئے اکیس ہزار کی جاگیر علیحدہ ملی، رہنے کے لئے قلعہ سے باہر آرام محل عطا کیا گیا۔ مع خدم و حشم موٹر ملازمین وغیرہ وغیرہ کے، گیارہ اُستاد میرے اوپر مامور کئے گئے جو مجھے اُردو، فارسی، انگریزی، تمام کھیل شہسواری اور دوسری باتیں تمیز وغیرہ میں طاق کر دیں۔ فوج میں مجھے کپتانی کا عہدہ دیا گیا اور حکم دیا گیا کہ تین سال کے اندر اندر فوجی کام سیکھ کر تمام لنکران کی افواج کا جنرل اور کمانڈر انچیف بنا دیا جاؤں۔

باہر کے دربار سے فراغت پائی (بغیر کھائے ہوئے) اس کے بعد پھر اندر ملکۂ معظمہ کی خدمت میں نذر گذرانی اور وہاں میرے اوپر جو محبت کے پھولوں کی بارش ہوئی ہے اس کا بیان نہیں کر سکتا۔ تحفہ تحائف سے میں لد گیا۔ باہر پھر دربار میں آیا اور اس دوران میں قلعہ سے آرام محل کی طرف موٹروں کا تار بندھ گیا۔ شہزادی صاحبہ اپنے گھر یعنی آرام محل رُخصت ہو رہی تھیں۔ مع تمام اپنے زنانہ اسٹاف اور عملہ کے۔

---

دربارِ عام کے بعد شاہی دعوت ہوئی، میری تمیز اور میری متانت اور سنجیدگی اور میرا لحاظ ادب شاہی سب دیکھنے کے قابل تھا جہاں پناہ سے نہ رہا گیا۔ میری پیٹھ ٹھونک کر کہا "واہ رے میرے گھرپے ...... کر لیا نا تجھے مار پیٹ کر ایک ہی روز میں درست" میرا انداز دیکھئے کہ اسکے جواب میں جہاں پناہی کے قدم چُوم لئے، بس باغ باغ ہی تو ہو گئے۔

شاہی دعوت ختم ہوئی اور میں موٹر پہ آرام محل روانہ ہوا۔ موٹر برآمدہ کے پاس جا کر رُکا اور گارد نے مجھے سلامی دی میں اُترا تو خدا کی شان نظر آئی دیکھتا ہوں کہ جُمّن خاں اکڑے ہوئے "اٹینشن" کھڑے نہایت ہی فوجی ادب کے ساتھ مجھے سلامی دے رہے ہیں۔ کون جُمّن خاں؟ وہی جنہوں نے کوتوالی میں مارے جوتوں کے میرا "فشار" نکال دیا تھا!۔

میں اندر داخل ہوا تو خزانچی نے بڑھ کر مجھے سلام کیا اور ایک رُقعہ حساب کا میرے ہاتھ میں دیا معلوم ہوا کہ ایک ایک سال کی میری اور شہزادی صاحبہ کی جاگیر کی اور دوسری رقمیں کھاتہ میں جمع ہیں۔ یہ میرا خزانچی تھا اور روزانہ یہاں آکر اپنا دفتر کھولے گا۔ اور اس حد تک مجھے حسب ضرورت وقتاً فوقتاً روپیہ دیتا رہیگا۔ ٹھیک ہے، میں نے کہا۔

میں اندر بڑے ہال میں داخل ہوا، یا میرے اللہ، یہ سامان آرائش اور ٹھاٹھ دیکھکر بے قابو ہو کر بیٹھ گیا۔ اتنے میں پریوں کا سا ایک جھمگٹ آیا یعنی لونڈیوں کا، میرے پاس آکر گھٹنوں کے بل جُھک کر آداب بجا لایا۔ عرض کی کہ "چلئے" شہزادی صاحبہ کے سلام کو" کان میں ایک چُلبلی نے کہا "خدا کے واسطے قاعدہ سے سلام کیجیگا۔ پہلا موقع ہے، ورنہ جہاں پناہ کے کانوں تک بات پہنچ جائیگی"

میں اندر بڑے ہال میں پہنچا جہاں شہزادی صاحبہ جلوہ افروز تھیں۔ بال بال موتی پُروئے ہوئے سر پر زرنگار جڑاؤ تاج تھا۔ موتی اور جواہرات کا درباری لباس پہنے بلندی پر ایک زرنگار کرسی پر کس دبدبہ اور شان سے بیٹھی تھیں کہ دیکھتا رہ گیا۔ ان کے بے انتہا حسین و جمیل چہرہ پر حسن کی بجلیاں کوند رہی تھیں "والاشان۔ عالی مقام جناب نواب دولہ نواب گھرا بہادر" یکھ کڑک کر ایک پُرانی سی خواص نے کہا۔ میرے لئے یہ اشارہ تھا اور میں نے جھک کر سات عدد سلام کرنے شروع کئے۔ دلمیں کہتا جا رہا تھا کہ "واہ ری جورو تیرے ٹھاٹھ۔"

شہزادی صاحبہ کے خوبصورت چہرہ پر بیحد سنجیدگی تھی تاج پہنے ہوئے۔ وہ شاہانہ دبدبہ تھا کہ دیکھا کیجیے۔ انہوں نے سلام کے جواب میں اپنا نازک اور حسین ہاتھ بڑھا دیا جس میں ریشمی رومال تھا۔ میں آگے بڑھا اور میں نے ایک گھٹنہ ٹیک کر رومال کو بوسہ دیا۔ شہزادی صاحبہ نے اُٹھنے کی جھوٹ موٹ دکھی دی کہ میں فوراً سلام کر کے برابر والی مرصع کرسی پر بیٹھ گیا۔

یہ دراصل ہمارا دربار ہو رہا تھا اب دربار شروع ہو گیا۔ وہی پُرانی سی خواص گویا وزیر اعظم کا کام کر رہی تھی ایک ایک لونڈی اور باندی کو اب لباس فاخرہ، زیور، انعامات ملنا شروع ہوئے۔ تنخواہوں میں اضافہ کے اعلان کئے گئے اور پھر لونڈیوں اور خواصوں کو اونچے اونچے خطابات عنایت ہوئے۔ کسی کو زمرد کسی کو فردوس کسی کو گل شبو کسی کو گلنار کسی کو گلعذار کسی کو کچھ کسی کو کچھ خطابات دئے گئے۔

اس کے بعد ان ہی لونڈیوں نے طرح طرح کے کپڑے بدل کر گلاب پاش کی مینہ اور مشکیں بارش میں ساز و سامان کے ساتھ مبارکبادیاں گانی شروع کیں وہ گائیں اور وہ ناچیں کہ بس دیکھا ہی کیجیے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر مجھ سے نہ رہا گیا اور میں بول اٹھا (چپکے سے ہی) واہ رے جوبن لوٹے ٹھاٹھ۔ قصہ مختصر یہ دربار بخیر و خوبی ختم ہوا۔ میرے کپڑے لونڈیوں نے اتروائے، شہزادی صاحبہ نے بھی گھر کا لباس پہنا اور ہم دونوں اندر کے گول کمرے میں باتیں کرنے آئے۔

واللہ شہزادی صاحبہ کیسی خوش ہیں۔ میں نے انہیں گلے سے لگا لیا۔ فرطِ اُلفت سے ان کے ہاتھ کو بوسوں سے تر کر دیا۔ ہم دونوں بیٹھ گئے اور شہزادی صاحبہ نے اب متوحش خبر سُنائی۔ وہ یہ کہ اُن کے بھائی یعنی ولیعہد بہادر میری شادی پر اس قدر گرم ہیں اور اس قدر سخت خلاف ہیں کہ انہوں نے جب سُنا تو مارے صدمے کے بیہوش ہو کر گر پڑے۔ اور کہتے ہیں کہ میں اپنی جان دیدونگا اور یہ بے عزتی گوارا نہ کرونگا اور اس شادی کو چھڑا دونگا یہی وجہ تھی جو میں نے انہیں نہ تو دربار میں دیکھا اور نہ اُن کا ذکر سُنا۔

دلمیں میں نے کہا کہ "سالے" کا سر نہ پھاڑ دیا ہو تو میرا ذمہ، مگر گھبرایا ضرور کہ یہ ضدی آدمی مشہور ہے... نوجوان غصہ ور ہے کہیں کچھ گڑبڑ نہ کر بیٹھے۔

شہزادی صاحبہ نے بھی کہا کہ بیحد ضدی ہیں، مگر میری محبت ہی میں ایسا کر رہے ہیں میں راضی کر لونگی۔ میں نے دل میں کہا اگر ناراض ہوں گے تو میرا کیا بگاڑ لیں گے۔ سر پھاڑ دونگا سرا میں نے مضبوط ہو کر دل میں

کہا۔ پھر میں نے کچھ سوچکر کہا۔

"شہزادی صاحبہ۔ میری نازو بیگم۔ اور جو تمہارے بھیا ولیعہد بہادر راضی نہ ہوئے۔ بگڑ اکھڑے ہوئے اپنی ضد پر اڑ گئے تو...... تو؟..... تو کیا تم مجھے..... مجھے تم..... تم مجھے نکالدوگی؟"

ایک جھلکی سی شہزادی صاحبہ کے پر نور چہرہ پر آئی اور چلی گئی "مجال ہے ان کی؟" کچھ غصہ سے انہوں نے کہا۔ "اور تم ان کے نکالے نکل جاؤ گے؟!"

"سر پھاڑ دونگا.......... سب ولیعہدی بھس میں ملا دونگا...؟"

"ہائیں! غضب..." شہزادی صاحبہ نے متعجب ہوکر ہنستے ہوئے اپنے نازک ہاتھ سے میرا منہ بند کردیا اور پھر تیزی سے کہا "بکواس مت کرو..... ہونا آخر کو......"

شہزادی صاحبہ کا مسرت آمیز چہرہ دمک اٹھا۔ خوشی اور کامرانی کے تارے ان کے خوبصورت چہرہ پر جگمگانے لگے۔ پھول سی کھل گئیں اور اپنی مخمور آنکھوں میں ایک دنیا کا طلسم پیدا کرکے مسکرا کر بولیں..."ہونا آخر... ہونا آخر... کھُر....."

انہوں نے کہا "کھُر" اور میں نے جملہ یا لفظ مکمل کیا۔ میں نے کہا۔ "پے" اور "پے" کے ساتھ ہی ایک جھپٹے میں اوچھال کر شہزادی صاحبہ کو سر پر پہونچایا۔

ادھر ان کے منھ سے ہنسی کی چیخ نکلی اور ادھر اپنا عصا لئے خان بہادر "رزن خاں" ایک دم سے درآئیں.......

"اے ہے میری شہزادی" ان کے منھ سے نکلا اور ادھر میں شرم سے پانی پانی۔ شہزادی کو میں زمین پر چھوڑ بھی چکا تھا۔

"اے ہے نواب صاحب" رزن خاں بولیں "حضور نے غضب ہی کردیا اور پھر شاہی ادب بھی کوئی چیز ہے۔ ایسی بے ادبی! ایسی گستاخی! یہ بادشاہزادیاں ہیں..... میری جان ان کا ادب کرو۔ میں آپ کے صدقے" یہ کہہ کر میری بلائیں لینے لگیں" اور ادھر شہزادی صاحبہ نہ معلوم کس طرف چپکے سے رینگ گئیں۔

---

وہ خواص۔ وہ بزرگ صورت خواص جس نے ہمارے چھوٹے سے دربار میں وزیر اعظم کی خدمات انجام دے کر لونڈیوں باندیوں کو خطاب دئے تھے ان کا لقب یا خطاب جہاں پناہی کی سرکار سے "خان بہادر رزن خاں" تھا۔ اور انہوں نے چونکہ شہزادی صاحبہ کو کھلایا تھا' اس وجہ سے اب یہاں آئی تھیں۔

اس وقت انہوں نے تنہائی پاکر مجھے تو صوفہ پر بٹھایا اور خود فرش پر بیٹھ گئیں۔ اتنے میں ایک لونڈی آئی تو اس سے کہا کہ شہزادی صاحبہ سے کہدو کہ نواب صاحب کو میں "تعلیم" دے رہی ہوں۔ جب تنہائی ہوگئی تو رزن خاں نے کچھ پریشان ہوکر کہا۔ "بیٹا! خدا کے واسطے ڈھنگ سے چلنا۔ قدم قدم پر کنواں ہے! ان ریشم کے

لندن کو کانٹوں کا ڈھیر سمجھو گے جب گذر ہوگی۔ کسی بات پر پھول نہ جانا۔ دم مارنے میں کیا سے کیا ہو جائے گا!۔ ذرا پھونک کے قدم رکھنا! شہزادی صاحبہ مجھے بڑی پیاری ہیں اس وجہ سے تم میری آنکھ کا تارا ہو۔ مگر اچھی طرح سمجھ لو کہ بس قدم قدم پر یہاں کنواں ہے۔"

میں کچھ گھبرا گیا اور میں نے کہا "کیوں؟ کیسے؟"

"کیسے!" رزن خاں نے بھنویں سکیڑ کر کہا "پوچھتے ہو کیسے! آنکھوں سے دیکھتے ہو اور پوچھتے ہو کیسے؟۔ جانتے ہیں حضور میں کون ہوں؟ میرا نام ہے "راز دار خاں" عرف رزن خاں۔ میں سرکار کی راز دار ہوں اس سینہ میں (سینہ پر ہاتھ مار کر کہا) لنکران کے شاہی دربار کے راز بھرے پڑے ہیں۔ آپ پوچھتے ہیں کیسے؟ تو بہتر ہے کہ آپ رزن خاں کی زبانی لنکران کا پہلا راز سن لیجئے۔

# پہلا راز

رزن خاں نے پہلا راز اس طرح بیان کیا۔

"دیکھو بیٹا میرا نام "راز دار خاں" ہے اور میں تم سے آداے لنکران کے پوشیدہ راز بیان کرتی ہوں اس لئے کہ تم سمجھو کہ کہاں ہو...... یہ جب کا ذکر ہے کہ حضور والا جوان تھے...... سالگرہ کا جشن تھا۔ اندر باہر رنگ رلیاں مچی تھیں۔ دن بھر زنان خانہ میں جشن رہا۔ سرکار نے محل میں ٹھاٹھ کا دربار کیا حضور ملکہ زمانی مرحومہ۔ اللہ انہیں جنت نصیب کرے۔ میری آنکھوں میں اس وقت ان کی جوانی کی صورت پھر گئی۔ زر و جواہر میں غرق بال بال موتی پروئے سنگار کئے دربار میں اس شان سے آئیں کہ ولیعہد بہادر مرحوم کی والدہ ماجدہ رنجیت محل بیگم کی آنکھیں جھپکنے لگیں۔ یہ قصہ تو خیر بعد میں بتاؤنگی یہاں اتنا کافی ہے کہ زنانہ محل میں بڑی دھوم دھام سے دربار ہوا۔ رات کے وقت باہر جشن ہوا۔

چالیس کمروں والا کمخواب کا دل بادل تان دیا گیا۔ کمرہ کمرہ میں قالین کا فرش تھا۔ صدر ہال میں انگریزی بینڈ کی گت پر انگریزی ناچ تھا۔ سرکار بہادر مشرقی لباس میں بڑی شاہانہ سج دھج سے خود بہ نفس نفیس اس جلسۂ رقص میں شریک تھے۔ میری ڈیوٹی بھی اس ہال میں تھی۔ بس کیا بتاؤں بیٹا کہ جلسہ آنکھوں میں پھرا جا رہا ہے۔ ایک سے ایک خوبصورت انگریزن موجود تھی۔ اور اسی جھمگٹ میں ایک سولہ برس کی لڑکی تھی۔ میں کیا عرض کروں کہ اس کے آتشیں حسن سیال نے سرکار کی کیا حالت کر دی۔ یہ انگریز وزیر مال کی لڑکی تھی۔ سرکار بہادر کے ساتھ ایک چکر رقص کا لگایا تھا۔ بس گویا انہیں چکرا دیا۔ کامنی صورت، نازک بدن، میدہ اور شہاب کا رنگ، بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ مینائے بلورین میں کسی نے سیماب اور گلال بھر کر جادو پھونک دیا ہے۔ سرکار ایسے وارفتہ ہوئے کہ اسی جلسہ میں گلے سے ستلڑا ہار ریدہ اتار کر اس کے گلے میں ڈال دیا۔ حاضرین نے بینڈ کی گت پر خوشی کی تالیاں بجائیں اور وہ اپنی عشوہ گری پر

نازکرتی پیمانہ کی طرح چھلکتی مسکراتی بجلیاں گراتی رقص ختم کرکے اپنے باپ کے پاس جا بیٹھی۔ مجھ سے حضور نے پانی طلب کیا تو میں نے حال دیکھا۔

رات بھر یہی حال رہا اور تیسرے چکر میں زمرد کا ہار بھی اس کے گلے میں دیا۔ صبح ہوتے جب جلسہ برخاست ہوا تو میں نے مسکرا کر بامعنی فرشی سلام جو کیا تو پھول کی طرح کھل گئے۔ ہاتھ پکڑ کر میرا الگ لائے اور اپنے سینہ پر ہاتھ رکھکر کہا "خاموش" میں ادب سے جھک گئی۔

دوسرے ہی روز اس کے باپ کی ترقی کر دی اور اس کے بعد ہی ہفتہ بھر تک اس کی ماں اور اس کے باپ کے اوپر وہ عنایات کی بارشں رہی کہ اس کو بھی معلوم ہو گیا ہوگا۔ زیادہ دن تک بات بھی دل میں نہ رکھی اور موقع دیکھ کر اس کے باپ سے آخر کو خواہش ظاہر کر دی، باپ نے بڑی سادگی سے کہا "آپ اُس سے خود دریافت کر لیجیگا میری طرف سے صرف ایک شرط ہے۔ وہ یہ کہ ایک تو پردے میں نہیں رہے گی اور دوئیش اپنا مذہب نہیں بدلیگی"

کچھ بھی ہو مگر اتنا کہوں گی کہ خدا سرکار کو ہزاری عمر دے، مذہب کے معاملہ میں بڑے پکے ہیں۔ کہنے لگے کہ مذہب بھی بدلنا پڑیگا اور پردہ میں بھی رہنا پڑے گا۔ ظاہر ہے کہ اس کے باپ کو یہ کسی طرح منظور نہ تھا۔ مگر پھر بھی بہ نفس نفیس اس سے خود اس معاملہ میں گفتگو کا ارادہ کیا۔ ایک روز دعوت کی اور چہل قدمی کے دوران میں اس کی ماں اور باپ نے اسے قصداً سرکار کے ساتھ باغ کی دوسری روش پر چھوڑ دیا۔ سرکار نے اس سے بات چیت جو کی تو اُس نے بڑی رکھائی سے مجبوری ظاہر کی اور جب سرکار نے بہت زور دیا تو معلوم ہوا کہ وہ کسی اور شخص کی محبت میں گرفتار ہے اور اس نے صاف کہدیا کہ میں کسی اور سے عہد و پیمان کر چکی ہوں۔ تو پھر سرکار نے لاکھ لاکھ اُسے توڑا "سمجھایا" بجھایا مگر وہ کافر بھلا کاہیکو جنبش کرتی۔ نتیجہ یہ کہ سخت صدمہ ہوا مگر برداشت کر گئے اور اس خیال سے کہ اس کا باپ یہ نہ سمجھے کہ خفا ہیں، اسی روز لڑکی کو اور تحائف دئے۔ اور صبح اس کے باپ کی اور ترقی کر دی باپ سے کہہ دیا کہ لڑکی اس وجہ سے مجھے قبول کرنے سے انکار کرتی ہے۔ خیر کوئی مضائقہ نہیں ظاہرا بات آئی گئی ہوئی۔

(۲)

اس بدبخت نے یہ نہ سمجھا کہ کسے انکار کیا ہے۔ آقائے لنکران کی درخواست ٹھکرائی جائے! کوئی معمولی بات تھی مارے غصہ کے جھنجلا رہے تھے۔ بل کھا رہے تھے۔

اس کے تیسرے روز کا ذکر ہے کہ رات کا وقت تھا۔ خاصہ تناول کرنے کے بعد مجھے طلب فرمایا اور سب احوال بیان کر کے مجھ سے بولے کہ "اُسنے بیگم بننے سے انکار کیا ہے۔ بولو کیا کہتی ہو"

میں نے کہا "حضور ایسی کی تو یہ سزا ہے کہ اب لونڈی بنائی جائے"

خوش ہو کر کہنے لگے "شاباش، مگر ترکیب بتاؤ"

میں نے گستاخی سے عرض کی کہ "جہاں پناہ ترکیب تو میں بتا نہیں سکتی۔ رہ گئی خدمت تو یہ میرے سپرد

دیجئے ادھر تین مہینے کی مہلت دیجئے۔ وہ ترکیب چلوں کہ لندن تک خبر یاد کرے تو کچھ نہ ہو۔ نہ حضور کی بدنامی ہوگی۔"

وہ لڑکی محض جشن سالگرہ میں شریک ہونے شملہ سے آئی تھی۔ جہاں وہ اسکول میں پڑھتی تھی اور دو چار روز میں جانیوالی ہو رہی تھی۔ لہذا فرمایا: "وہ تو جا رہی ہے" اسکے جواب میں میں نے عرض کیا کہ آپ کچھ پرواہ نہ کریں۔

---

اب میرے سپرد یہ انتظام ہوگیا تو میں نے تین آدمی اوّل نمبر کے بدمعاش تلاش کئے۔ یہ تینوں جیل خانہ میں سخت جرائم کی پاداش میں لمبی قیدیں بھگت رہے تھے میں نے جہاں پناہ سے عرض کی کہ آج رات کو خفیہ طور پر جیلر کو حکم ہو کہ فلاں فلاں قیدیوں کو تخلیہ میں حاضر کریں۔ سرکار نے جب وجہ دریافت کی تو میں نے عذر کیا کہ لونڈی وقت پر عرض کرے گی۔

حکم کی دیر تھی۔ رات کو تینوں قیدی حاضر کئے گئے اور میں نے ان سے ایک ایک کر کے تنہائی میں گفتگو کی۔ ان کو اچھی طرح سمجھایا کہ جیسا حکم دیں ویسا کرنا بہت معمولی خدمت ان کے سپرد کی۔ وہ یہ کہ دیدہ و دانستہ تم کو جیل سے بھاگ جانے دیا جائیگا۔ مگر ظاہرا تعاقب کیا جائے گا۔ گولیاں بھی ہوا میں چلائی جائیں گی، اگر تمہیں نکل جانے دیا جائیگا اس کے بعد تمہارا فرض ہے کہ سچ مچ روپوش رہنا۔ کیونکہ ہزار ہزار روپے کے انعام کا اشتہار بھی تمہاری گرفتاری کا مشتہر کیا جائیگا۔

اس کے بعد تمہیں خدمت کے لئے ایک خاص دن طلب کیا جائیگا۔ وہ خدمت یہ ہوگی کہ فلاں فلاں سڑک سے فلاں وقت وزیر مال کی لڑکی موٹر میں بیٹھ کر گذرے گی۔ صرف ڈرائیور ہوگا اور وہ ہوگی۔ تمہارا کام یہ ہوگا کہ موٹر پر پستول لیکر حملہ کرو ڈرائیور کو مجبور کرو۔ لڑکی کو باندھ کر ڈالدو منہ میں گودڑ ٹھونس دو۔ اس کا مال و اسباب لوٹ لو۔ ڈرائیور سے کہو کہ جنگل میں لے چلے جنگل میں پہونچکر لڑکی کو اُتار لو اور ڈرائیور کو بھگا دو جب ڈرائیور چلا جائے تو لڑکی کی آنکھوں پر پٹی باندھکر رات کو گاڑی میں ڈال کے شہر لاؤ اور ڈولی میں ایک کمبل میں لپیٹ کر رات کو خفیہ طور پر میرے حوالے کر دو اور بھاگ جاؤ۔ پھر اس کے بعد پولیس تمہاری تلاش کرے گی اور جنگل میں تمہیں کسی مقام پر گھیر لے گی۔ وہاں مصنوعی طور پر گولی بھی چلے گی۔ تم تینوں پکڑے جاؤ گے تمہارے اوپر مقدمہ چلے گا۔ تم لوگ جُرم سے اقبال کرنا اور کہنا کہ ہم تینوں نے ڈاکہ ڈالا تھا اور تم میں سے ایک یہ بھی اقبال کرنا کہ میں نے اس کو بےعزت کیا تھا۔ تم تینوں پر مقدمہ چلیگا عمر قید کی سزا ملے گی۔ تم تینوں کو عمر بھر پچاس روپے ماہوار تنخواہ ملیگی جیلر کو حکم دیدیا جائیگا کہ دن بھر جیل میں رکھا کرے اور رات کو گھر چلا جانے دیا کرے۔ تم ویسے ہر طرح آزاد ہوگے۔ صرف حاضری کے وقت جیل پر آنا پڑیگا۔

ظاہر ہے کہ تینوں راضی ہوگئے۔ میں نے خوب اچھی طرح سمجھا بجھا کر ان کو جہاں پناہ کے سامنے پیش کر دیا۔ حکم ہوا کہ ان کو فی کس پانچ پانچ سو روپیہ دے کر ابھی چھوڑ دیا جائے۔ چنانچہ تینوں دعائیں دیتے چلے گئے۔ حضور والا نے میری تجویز سُنی تو پھڑک اُٹھے۔

ظریف نمبر
اپریل ۴۳ء

## (۳)

لڑکی کو غائب ہوئے کوئی بیس روز ہوئے ہوں گے۔ تینوں قیدی رات کو جیل پھاند چکے تھے ان کی گرفتاری اور انعام کے اشتہار بھی نکل چکے تھے۔ جہاں پناہ کی طرف سے پولیس کو سخت احکام جاری ہو چکے تھے۔ کہ ان زبردست بدمعاشوں کو دوبارہ گرفتار کیا جائے۔ غرض پولیس سرگرمی سے اُن کی تلاش میں تھی کہ میں نے جہاں پناہ کو اشارہ کیا۔ اُنہوں نے دیوہ ماں کو سرکاری کام سے بیس دن کے دورے پر ریاست کے کاروبار کے متعلق دہلی روانہ کیا۔ ادھر وہ دہلی گیا اور ادھر باپ کی طرف سے لڑکی کو ڈبل تار گیا کہ جلدی آؤ۔ لڑکی نے تار کا جواب دیا فلاں وقت پہونچونگی۔ جوابی تار تھا اور پتہ اس کے باپ کے دفتر کا تھا۔ وزیر انصاف اس کا کام کر رہے تھے اُن کے پاس تار آیا تو اُنہوں نے اس کی ماں کو بھجوا دیا۔ ماں کی سمجھ میں نہ آیا کہ لڑکی کیوں آ رہی ہے لہذا وہ موٹر لیکر خود اسٹیشن پر پہونچی۔

اسٹیشن سے بنگلہ دور تھا، سڑک ویران تھی، واپسی میں دن دہاڑے تینوں ڈاکوؤں نے بہانہ سے موٹر روک لیا اور حملہ کر کے ماں اور بیٹی دونوں کو باندھ کر ڈال دیا۔ جنگل میں جا کر ماں اور ڈرائیور کو چھوڑ دیا اور لڑکی کو لیکر رفوچکر ہو گئے۔ ماں نے فوراً تھانہ میں جا کر رپورٹ لکھائی۔ حضور جہاں پناہ سے ملی تو حضور جہاں پناہ نے اس کے سامنے کوتوال شہر اور انسپکٹر جنرل پولیس کو سخت تاکید کی کہ جلد از جلد مجرم کا پتہ لگایا جائے ورنہ خیر نہیں، خاص طور پر گزٹ میں جہاں پناہ کے تاکیدی احکام شایع ہوئے۔ لڑکی کے باپ کو الگ تار ہمدردی کے دئے گئے۔

---

رات کے بارہ بجے ہوں گے کہ خاموشی اور تاریکی میں تینوں مجرموں نے ایک کمبل میں لپٹی ہوئی امانت ہمارے سپرد کی۔ فوراً "تاریک محل" کا چور دروازہ کھولا گیا۔

میں نے پوچھا "یہ تاریک محل کدھر ہے؟"

وہ بولیں "آپ سنتے جائیے ....... دربار والے کمرے سے زنانہ محل میں جو راستہ جاتا ہے۔ بائیں ہاتھ کی طرف اس کے ایک کمرہ ہے۔ اس کے اندر تہ خانہ کا ایک دروازہ ہے۔ سنگ مرمر کی چودہ سیڑھیاں اُتر کر زیر زمین تاریک محل شروع ہوتا ہے۔ محل کے نیچے سترہ کمرے ہیں۔ اور پورا کا پورا محل ہے۔ آپ سنتے جائیے ....

... تاریک محل کا دروازہ کھولا گیا اور امانت کو میں نے نیچے پہنچوایا۔ مجرموں کو انعام دے کر رخصت کیا۔ ایک بٹن دباتے ہی تاریک محل میں دن ہو گیا۔ میں تو اوپر چلی آئی اور تین "رازدارنیوں" کو نیچے بھیجدیا۔ اُنہوں نے وہاں جا کر کمبل کو کھول کر لڑکی کو نکالا۔ کوئی پندرہ منٹ بعد ان میں سے ایک حواس باختہ میرے پاس دوڑی آئی اور اس نے اطلاع دی کہ مس صاحبہ آگ بگولا ہو رہی ہیں۔ جہاں پناہ نے مجھے بھیجا۔ میں گئی۔

تاریک محل کے وسیع ہال میں پہنچی۔ در و دیوار پر بانات منڈھی ہوئی تھی، ہال میں رومی غالیچوں کا فرش تھا

اور جھاڑ فانوس کی روشنی سے دن ہو رہا تھا بیچ کمرے میں ایک صوفے کے پاس مس صاحب سورت جلال حسن بر ہم بنی کھڑی تھیں۔ نہ معلوم کیا خرافات بک رہی تھیں۔ میں نے پہنچتے ہی اُن کو فرشی سلام کیا۔ اور دونوں خواصوں کو اشارہ کیا اور وہ رخصت ہوگئیں۔ اس کے بعد میں نے جہاں پناہ کے "لازوال" عشق کی داستان جو سنائی تو میں کیا عرض کروں کہ اس چڑیل نے کیسی بکواس شروع کی۔ جہاں پناہ نے حکم دیا تھا کہ ان کی طرف سے پیغام نکاح دوں مگر اس نیک بخت نے ایک نہ سُنی۔ ایک سرے سے جہاں پناہ کو جو جی میں آیا سنا ڈالا۔ میں نے لاکھ سمجھایا۔ بہلایا، پھسلایا، ڈرایا دھمکایا۔ مگر توبہ کیجئے۔ اس کے سر پر تو جیسے بھوت چڑھا تھا۔ وہ کا ہیکو مانتی۔ جب میں نے ذرا کرختگی سے کام لیا تو وہ غضبناک شیرنی کی طرح میرے، دیریکی میں مجبوراً ہو کر وہاں سے جو بھاگی تو وہ میرے پیچھے پیچھے۔ مجبوراً میں نے لپک کر چپکے سے اندھیرا گھپ کر دیا۔ وہ تو اندھیرے کی وجہ سے رہ گئی اور میں ٹٹول کر باہر آئی۔ جہاں پناہ کو دروازہ پر منتظر پایا۔ میں نے عرض کر دیا کہ میرے بس کی بات نہیں۔ انہوں نے روشنی کر دی اور اب وہ خود چلے اور ان کے پیچھے میں۔

ہال میں پہونچتے ہی دونوں میں انگریزی میں باتیں ہوئیں وہ تو شیر نر اں ہو رہی تھی ان پر بھی برس پڑی۔ انگریزی میں نہیں سمجھتی۔ مگر اندازے سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ بھی اس کو سمجھا رہے تھے مگر جب انہوں نے دیکھا کہ اس نے انکے ساتھ حقارت کا برتاؤ کیا تو مارے غصہ کے جہاں پناہ کا رنگ بدل گیا۔ آہستہ سے انہوں نے تالی بجائی اور پانچ خواصیں تیر کی طرح اشارہ پاتے ہی مع میرے اس پر جھپٹ پڑیں۔ ایک تالی کے ساتھ اندھیرا گھپ ہو گیا اور ہم سب اس تاریکی میں اس کو جہاں پناہ کے سپرد کر کے چلے آئے۔

---

اس کے تیسرے روز وزیر مال آ گئے۔ شہر بھر میں اس خبر سے تہلکہ مچا ہوا تھا۔ جہاں پناہ نے فوج اور پولس دونوں کو مجرموں کی گرفتاری پر تعینات فرمایا تھا۔ اور روزانہ پولیس کی کارگذاری کی رپورٹ پیش ہوتی تھی۔ یہ سب کچھ تو باہر ہو رہا تھا اور اندر "تاریک محل" کی گہرائی میں مس صاحب معمولی باندی بنائی جا چکی تھیں۔ ان کا وہ غرور اور تمکنت اب عزت و آبرو لٹنے کے بعد کچھ نہ رہا تھا۔ مگر ہاں چہرہ پر ایک غمگین وقار کی جھلک تھی کہ باندگی کی طرح سلطاً تھی۔ شاہی دبدبہ سے کب کی متاثر ہو چکی تھیں اور جانتی تھیں کہ جس نے عزت لی ہے وہ ذرا سے اشارے پر جان بھی لے لیگا۔ کیونکہ میں نے چپکے سے ان کے کان میں یہ بات پھونک دی تھی کہ عجب نہیں تمہیں جہاں پناہ اس کمرے کی تاریکی میں گڑھا کھود کر دفن کر دادیں تاکہ تم باہر نکل کر ان کو بدنام نہ کر سکو۔ لہذا بہتری اسی میں ہے کہ خاموش رہو۔ میں نے جب یہ کہا تھا تو حقیقت دیکھتے ہوئے ان کا چہرہ مارے دہشت سے سپید ہو گیا تھا اور وہ جان گئی تھیں کہ شاہان اعظم کی اولاد سے سابقہ ہے اُدھر میں نے جہاں پناہ کو مشورہ دیا تھا کہ ہر قسم کی دلجوئی سے کام لیں اور اس کو راضی رکھیں۔ جہاں پناہ کہتے تھے کہ کہیں ایسا نہو کہ اس کو چھوڑ دوں اور پھر یہ میرے پاس نہ آئے۔ چنانچہ وہ ہر طرح اسکی دلجوئی کرتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ راضی ہو جائے۔

اب ضرورت تھی کہ وزیر مال سے لڑائی کی صورت پیدا کی جائے۔ چنانچہ جس مشن کیلئے وہ بھیجے گئے تھے اسکی تفصیل جہاں پناہ نے سُنی انکی کارگذاریوں میں زبردستی غلطی نکال کر ان پر سخت خفا ہوئے اور بطور سزا دو سو روپیہ ماہوار کا ان کی تنخواہ میں تنزل کیا اور گزٹ میں یہ بات شایع کرادی۔

وزیر مال گورنمنٹ کا آورده تھا وہ بھلا کب اس سختی کو برداشت کرتا اور اس نے جھٹ استعفےٰ دے دیا۔ حضور پرنور نے تین مہینہ کے بعد استعفےٰ منظور کرنے کا حکم دیا۔ تاکہ اس دوران میں وہ چارج دے سکیں۔ وزیر مال نے جب فوراً استعفےٰ دینے پر اصرار کیا تو جہاں پناہ نے فوجی گارد اس کے بنگلہ پر بھیج دیا اور کہلا دیا کہ معاملات کا معاملہ ہے اور ہمیں شک ہے کہ کہیں کوئی زبردست غلطی نہ ہو۔ ساتھ ہی گورنمنٹ کو تار دیکر ایک انگریز افسر کو بلا کر تعینات کیا کہ وزیر مال کے محکمہ کی جانچ کر کے جلد سے جلد رپورٹ دے تاکہ وزیر مال کو سبکدوش کیا جائے۔

---

یہ سب کچھ تھا مگر مس صاحبہ کی مفروضہ تلاش میں دن رات پولیس لگی تھی درحالیکہ وہ تاریک محل میں خود رنگ رلیوں کا مرکز بنی ہوئی تھیں۔ آخر ش وہ وقت آیا کہ پولس نے تین میں سے دو مجرموں کو جنگل میں بعد ایک معرکہ کے گرفتار کیا تیسرا بھاگ نکلا۔

دوسرے ہی روز جہاں پناہ نے حکم دیا کہ ایک خاص جج اس مقدمہ کیلئے مقرر ہو اور کارروائی مقدمہ بند کمرے میں ہو۔ وزیر مال کی میم صاحب نے ملزموں کو شناخت کیا۔ ان کو اقبال جُرم تھا۔ انہوں نے تمامتر الزام تیسرے غیر حاضر ملزم پر رکھا اور یہ کہا کہ ہم سے مس صاحبہ سے کوئی سروکار نہیں جب سے وہ گئی ہیں اسی کے پاس ہیں اور اُسی نے ان کو بےعزت کیا ہے۔

مقدمہ چل رہا تھا کہ تمام شہر میں کھلبلی مچ گئی کہ تیسرا ملزم شہر کے ایک مکان سے مع مس صاحبہ کے برآمد ہوگیا۔ مس صاحبہ اپنے والدین کے حوالے کی گئیں۔ مگر ان کی والدہ ماجدہ سے جو اس ملزم کو شناخت کرنے کو کہا گیا تو انہوں نے کارروائی مقدمہ میں شریک ہونے سے انکار کر دیا۔ مگر چونکہ ثبوت کافی موجود تھا اور یہ ملزم بھی اقبالی تھا لہذا تین سخت ترین جُرم عائد کر کے اس کی پاداش میں تینوں کو جنم قید کی سزا دیدی گئی۔ اِدھر ان تینوں کو سزا ہوئی اور اُدھر وزیر مال نے اپنی بیٹی کی بےعزتی کا حال معلوم کر کے معاملہ گورنمنٹ میں خود جا کر پیش کیا۔

ایک دفعہ تو اس کارروائی سے تہلکہ پڑ گیا۔ کیونکہ انگریز کا پلہ بھاری ہوتا ہے۔ وہاں سے حضور پرنور سے جب اس کی دبی زبان سے بازپرس کی گئی تو انہوں نے سخت برہم ہو کر جواب دیا اور لکھدیا کہ وزیر مال کی بدمعاشی ہے۔ اس کا تنزل کیا گیا ہے۔ لہذا اُس نے بیٹی کو سکھا کر یہ الزام تھوپا ہے۔ اور اس جواب کے ساتھ مقدمہ کی پوری مسل گورنمنٹ میں بغرض ملاحظہ روانہ کر دی۔ وہاں بھلا کیا خامی تھی شروع سے لیکر آخیر تک مسل کا پیٹ بھر دیا گیا تھا۔ ساتھ ہی مختلف تاریخوں کے گزٹ کے اشتہارات بھی ارسال کئے گئے تھے جو وزیر مال کی تنزلی اور اس مقدمہ سے کسی طرح بھی متعلق تھے۔ نتیجہ یہ کہ گورنمنٹ نے اُلٹا وزیر مال کو حکم دیا کہ جہاں پناہ سے

معافی مانگے اور بہتر ہے کہ استعفےٰ واپس لے۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ اس کو معافی مانگنا پڑی۔ مگر استعفےٰ اس نے واپس نہ لیا۔ بدستور کشیدہ رہا۔

---

لیکن معافی مانگتے ہی حضور پرنور نے اس کے تنزل کا حکم منسوخ کر دیا مزید ترقی کا اعلان کیا اور نہایت ہی ملائم الفاظ میں خیال ظاہر فرمایا کہ اگر استعفےٰ واپس لے لیں تو بہتر ہے اور اسی روز ان کو تخلیہ میں طلب کیا۔

تخلیہ میں میں بھی تھی۔ مگر باتیں انگریزی میں ہو رہی تھیں لہذا مجھے نہیں معلوم کہ کیا باتیں ہوئیں مگر وہ چلے گئے تو حضور پرنور نے جوشِ مسرت سے مجھے چپٹا لیا اور مجھے معلوم ہوا کہ وہ اس بات پر راضی ہو گیا ہے کہ لڑکی کو شاہی حرم میں داخل کر دے۔ حضور نے از راہ غربا پروری مس صاحبہ سے عقد کرنا منظور کر لیا ہے۔

اس طرح مس صاحبہ جہاں پناہ کے قبضہ میں آئیں اُن کو جہاں پناہ نے دلرس بانو بیگم کا خطاب دیا اور یہی دلرس بانو بیگم تھیں جنکی وجہ سے خاندان لنگران کی عظمت مٹی میں مل گئی۔ وہ کچھ ہوا جو کبھی نہ ہوا تھا لنگران اعظم کی اولاد کو اس فرنگز کی وجہ سے وہ ذلت اور پشیمانی نصیب ہوئی جو کبھی نہ ہوئی تھی۔

اور اصل پوچھو تو شاید لنگران اعظم کی اولاد کو کئے کی سزا ملی۔ دلرس بانو نے جہاں پناہ سے اپنے ظلم کا ایسا بدلا لیا کہ سات پشت تک کے لئے لنگران اعظم کی اولاد کے ماتھے پر کلنگ کا ٹیکہ لگ گیا۔ اس نے ایسا بدلا لیا کہ آج کل جہاں پناہ انگاروں پر لوٹ رہے ہیں۔ دُنیا ان کو خوش دیکھتی ہے مگر نہیں ان کو گھن لگ گیا ہے۔ دُنیا سے وہ بیزار ہو گئے ہیں اور یہ سب محض دلرس بانو کے خوفناک بدلے کی وجہ ہے۔ دلرس بانو کو مرے ہوئے آج سات سال ہو گئے مگر اس کے انتقام کی برچھیاں آج بھی جہاں پناہ اور ان کی اولاد کے کلیجہ کو چھلنی کر رہی ہیں۔ لہذا خبردار بھول میں مت رہنا، ہوشیار رہنا۔ ورنہ یاد رکھو کہ دلرس بانو کے انتقام کی چنگاریاں اپنے شعلوں میں تمہیں بھی لپیٹ لینگی۔ دوسرا راز میں پھر بتاؤں گی ابھی اسی پر غور کرو اور سوچو۔ مگر خبردار جو یہ باتیں تم نے شہزادی صاحبہ سے کہیں۔"

میں نے غور سے اس مکارہ کی باتیں سُنیں، ایک سناٹے میں آ گیا۔ پھر سوچ میں پڑ گیا کہ اتنے میں شہزادی صاحبہ کا خوبصورت جگنو سا چہرہ دروازے میں سے چمکا اور ان کی مسکراہٹ سے محبت کی شعاعیں نکلتی جو معلوم دیں تو بڑے زور سے "حرافہ ہے" کہتا ہوا لپکا شہزادی صاحبہ کی طرف کہ "لینا" یہ کہکر میں لپکا۔

---

مگر میں نے دیکھا کہ شہزادی صاحبہ کے پُرنور چہرہ پر جلال کی ایک جھلکی سی آئی۔ میں نے کہا "کیوں" تو انہوں نے انتہائی جذبہ اور غصہ کے عالم میں کہا میری بدزبانی پر سختی سے نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا "میری شان مذاق میں کبھی نہیں حرافہ کا لفظ استعمال نہیں کرنا چاہیئے وہ بھی اتنی بلند آواز سے۔"

"ارے" میں نے ... اور بھی زور سے دھاڑ کر کہا "پگلی کہیں کی۔ ہم نے تجھے خرافہ کب کہا تھا لیکن یہ پھر تو یہی ہی اور اب کہے ......"

لیک کر شہزادی صاحبہ نے اپنے نازک اور میٹھے ہاتھ سے میرا منھ بند کیا اور خوف زدہ ہو کر بولیں کہ "خدا کے لئے"

"تو پھر ......" یہ کہہ کر جب میں نے نہیں پکڑ کر "چک پھیری" دینا چاہی تو وہ پھسل گئیں۔ اور انہوں نے تیزی سے مجھ سے کہا کہ "آدمیت سیکھو ..... کیا باتیں ہو رہی تھیں"

یہ کہتی ہوئی وہ صوفہ پر بیٹھ گئیں۔ سامنے ان کے فرش پر پھسکڑا مار کر میں بیٹھ گیا اور میں نے شروع سے لیکر آخر تک جو کچھ سنا تھا اپنی پیاری گھر والی کو سنا دیا اور غور سے دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک دم سے وہ متفکر سی ہو گئیں۔

میں غور سے ان کے چہرہ کو دیکھ ہی رہا تھا کہ ایک خواص دوڑی ہوئی آئی اور اس نے اطلاع دی کہ حضور ولیعہد بہادر تشریف لائے ہیں۔

# ٹیڑھا سوال

از مسٹر مظہر انصاری ۔ بی ۔ اے (آنرز)

## افراد

سلیقہ ............ بیوی
عقیل ............ میاں } گھر کے "اعضائے رئیسہ"
اصغر ......... بیٹا

بلی ۔
مکھی کا مرتبان ۔
خالہ عشرت نواز ۔ } "باقیات" خانہ
پھوپھی دلآرا ۔
بلی کا بچہ، مچھلی، وغیرہ ۔

## پہلا منظر

ایک اوسط درجے کا کمرہ ۔ اور بہت سی چیزوں کے علاوہ دو پلنگ بھی بچھے ہوئے ہیں ۔ ایک پلنگ پر بستر قرینے سے تہ ہوا رکھا ہے ۔ دوسرے پر عقیل کمبل اوڑھے لیٹا ہے ۔ اس کا منہ کمبل سے باہر ہے ۔ سر پر ایک روئی کا کنٹوپ ہے جس سے اس کی شکل خاصی بیچا کی سی معلوم ہوتی ہے ۔ پہلو میں کمبل کی ایک عمیق اور شاندار بھوری بھوری دھاریوں کی ایک بلی محوِ خواب ہے ۔ سلیقہ کمرے میں داخل ہوتی ہے ۔ پہلے زیر لب بڑبڑاتی ہے ۔

سلیقہ ۔ (بآواز بلند) "واہ جی واہ ۔ مُردوں سے شرط باندھ کے سوئے ہیں اُٹھنے کا نام ہی نہیں لیتے (قریب جاکر) لے دیکھنا میں نے کہا اُٹھتے نہیں"

(عقیل دو ایک مسکوڑے لیتا ہے اور کچھ بڑبڑا کے کروٹ لے لیتا ہے ۔ میاں کی "بڑبڑاہٹ" اور بیوی کی افسوس آمیز "چچ چچ" کے درمیان بلی اپنی ایک صدائے "میاؤں" بلند کرتی ہے ۔ اور آنکھیں بند کرتے ہوئے گردن ڈال کر دبک جاتی ہے ۔)

سلیقہ ۔ واہ وا واہ ۔ لو صاحب ہماری بات کا یہ جواب ملا ۔ اے میں نے کہا دیکھنا !

عقیل ۔ (جواب ہوش میں آچکا ہے) کیا کچھ منہ سے پھوٹو گی بھی یا یونہی دیکھنا دیکھنا کیے چلی جاتی ہو ۔

اُٹھ کے بیٹھ جاتا ہے۔ کمبل کا کنارہ سینے سے شانے تک چل کر اُلٹی کمر تک جاری ہے۔ اُلٹا شانہ اور اُس کے نیچے کچھ فاصلے تک جسم کا حصہ ایک مثلث نما شکل میں ننگا ہے۔ عقیل کے عُریاں سینہ پر لمبے لمبے بال ہیں۔ دونوں ہاتھوں سے آنکھیں ملتا ہے۔ اپنی گود کی طرف ایک نگاہ ڈالتا ہے۔ اس طرح جیسے کسی تالاب کی تہ میں جھانک رہا ہے اور سینہ سے ہاتھ کی انگشت شہادت سے سینہ کے بالوں کو چکر دے کر کھیلنے لگتا ہے۔ سلیقہ اس مشغلِ "سینہ کاوی" کو دیکھتی ہے اور منہ پھیر کر مسکراتی ہے)

عقیل۔ ہاں تو اب کچھ کہو نا۔ یا یونہی اُٹھا کے بٹھا دیا۔ کیسے مزے کی تو نیند آرہی تھی۔

سلیقہ۔ اے دیکھنا وہ اصغر رونی صورت بنائے بیٹھا ہے۔ کوئی سوال غلط ہو گیا ہے۔ گوڑھے کی سمجھ میں نہیں آتا۔ ذرا تم جا کے بتا دیتے نا۔

عقیل۔ یہ دُنیا بھی ساری عمر ناک میں دم رکھتی ہے۔ شادی کرو، بیوی کے ناز اُٹھاؤ، اولاد جنواؤ، اسے سوال سمجھاؤ۔

سلیقہ۔ پھر وہی اول جلول باتیں لگائیں۔ سوال دیگر جواب دیگر۔ ہم نے کہا تھا اُسے سوال سمجھانے کو، آپ لگے جوانی کے بکھان بکھانے۔

عقیل۔ بہت بہتر حضور بہت بہتر۔

(عقیل اُٹھتا ہے، بلی بھی اُٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ دُم سیدھی کرتی ہے۔ اور پیٹ کی گولائی، کمر کی لمبائی یعنی اپنے درمیانی حصہ جسم کے حجم کو ایک قوس کی صورت دے کر آنکھوں کو نیم بند کرتی ہے اور جمائی لیتی ہے۔ ایک منٹ کی خاموشی۔ چھت کی کاغذی چھت گیری میں چوہوں کی دوڑیں لگ رہی ہیں۔ گو "رفتار موش" سے پیدا ہونے والی صدائیں بلی کی توجہ سے محروم ہیں۔ عقیل چارپائی کے نیچے سے سلیپر نکالتا ہے۔ پہنتا ہے۔ دوشالہ اوڑھتا ہے۔ سلیقہ لحاف تہ کرنے لگتی ہے۔ عقیل نیم اُفتاں چال میں دروازے کا رُخ کرتا ہے۔)

## دوسرا منظر

باورچی خانہ۔ دو دروازے ہیں ایک صحن میں کھلتا ہے۔ دوسرا اصغر کے پڑھنے لکھنے کے کمرہ میں۔ نعمت خانے پر اوپر تلے کی دو طشتریوں سے ڈھکی ہوئی مچھلی رکھی ہے۔ ایک بلی کا بچہ طشتری کھولنے کی خفیہ کوشش کر رہا ہے۔ باہر کی طرف سے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔ آہٹ پاکر بلی کا بچہ نعمت خانے کے نیچے دبک جاتا ہے۔ عقیل داخل ہوتا ہے۔ دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر فلسفیانہ انداز سے کھڑا ہو جاتا ہے۔

عقیل۔ سوال تو بہر حال کسی نہ کسی وقت نکل ہی آئے گا، فی الحال تو خانہ شکم میں کسی انڈے صاحب، یا کچوری بیگم یا کسی لڈو بھائی کو داخل کرنا چاہیئے۔ کیوں ہیں کوئی صاحب یا بیگم یا بھائی حاضر؟

(دفعتاً کھڑ کھڑاہٹ کی آواز آتی ہے۔ عقیل نعمت خانے کی طرف دیکھتا ہے۔ جہاں بلی کے بچے نے اپنی کمین گاہ سے

نے دوبارہ "ماہی گیری" شروع کر دی ہے۔)

عقیل (قہقہہ لگا کر) کیوں بے شریر۔ ابھی سے یہ حال۔ مچھلی کے جانے سے تیرنا چھوٹ گیا۔ بچارہ دو طشتریوں کے بیچ میں آن پڑا۔ مگر تجھ بلی کے جائے سے ابھی تک گوشت خوری نہیں چھوٹی۔ ٹھیر تو سہی، میں تجھے اس قبضۂ مخالفانہ کا مزہ چکھاتا ہوں۔

(عقیل کفگیر کھینچ کر مارتا ہے۔ نشانہ خطا کرتا ہے کفگیر گھی کے مرتبان پر لگتا ہے مرتبان طاق سے نیچے گر پڑتا ہے۔ دھماکا سنکر سلیقہ گھبرائی ہوئی داخل ہوتی ہے گھی مرتبان میں سے بہہ بہہ کر زمین کے خشک دہن کی تواضع کر رہا ہے عقیل حیران کھڑا دیکھ رہا ہے سلیقہ ٹھٹک کر رہجاتی ہے۔ پہلے مرتبان کی طرف دیکھتی ہے پھر عقیل سے مخاطب ہوتی ہے۔

سلیقہ۔ تم اصغر کو سوال نکلوانے آئے تھے یا باورچی خانے کی سیر کرنے؟ یہ کیا کیا؟۔

عقیل۔ بلی کا بچہ گھی کھائے جاتا تھا میں نے کفگیر کھینچ کے مارا وہ اس کے تو لگا نہیں اس مرتبان کے جا لگا اور یہ گھی کے آنسوؤں سے پھوٹ بہا۔ اب تم ہی بتاؤ اس میں میرا کیا قصور۔ پوچھو اس بلی کے بچے سے کہ یہاں کیوں شرارت کرنے آیا تھا۔ یا اس سے نہ پوچھو تو جواب طلب کرو اس مرتبان سے کہ کیوں دست دیتا ہے؟ دھتے۔

سلیقہ۔ اے بس جاؤ بھی، ساری عمر یونہی مسخرے بنے رہو گے۔

(عقیل چپ کھڑا رہتا ہے)

سلیقہ۔ اچھا اب جا کے سوال سمجھاؤ نا اسے۔ کھڑے ہو بت بنے ہوئے۔

(عقیل اس دروازے کی طرف قدم بڑھاتا ہے جو اصغر کے پڑھنے لکھنے کے کمرے میں کھلتا ہے۔ اور ایسی حالت میں کہ قدرے حیران، قدرے پریشان، قدرے پشیمان۔ یہ سب کچھ اور پھر کچھ بھی نہیں۔)

# تیسرا منظر

اصغر کے مطالعہ کا کمرہ۔ کئی دروازے ہیں۔ اور ان میں سے ایک باورچی خانے کے رخ ہے۔ ایک میز کے آگے جو دھبوں اور لکیروں کی خوب نمائش کر رہی ہے، اصغر بیٹھا ہے۔ وہ چوتھی جماعت کا طالب علم ہے۔ اس کا چہرہ گول مگر کسی مخصوص حسین تراشش سے محروم ہے۔ رنگ سانولا ہے۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی ہیں اور اس وقت آنسوؤں کی ڈبڈباہٹ سے موتی رول رہی ہیں۔ وہ کرسی پر بیٹھا ہے۔ مگر دونوں ٹانگوں کو نیچے لٹکانے کی بجائے سینے اور پیٹ کے مقابل دو جڑے ہوئے ستونوں کی طرح آگے پیچھے ہل رہا ہے۔ پیچھے کی طرف ہلتے میں وہ کرسی کی پشت سے اتنے زور سے نہیں ٹکراتا کہ کرسی الٹ جائے اور آگے کی طرف ہٹنے میں وہ اتنی بیش حرکتی ریش قدمی کے وزن پر، نہیں کرتا کہ منہ کے بل آن رہے۔ میز پر حساب کی کتاب الٹی رکھی ہے اور اصغر اسے ٹیڑھی ٹیڑھی نظروں کو دیکھ رہا ہے عقیل داخل ہوتا ہے۔

عقیل۔ اصغر!۔

اصغر۔ جی ابا!۔

عقیل۔ کر رہے ہو کام؟۔

اصغر۔ ہاں ابا!۔

عقیل۔ ہاں بیٹا کام تو سب آدمیوں کو کرنا ہی پڑتا ہے۔ ابھی زندگی کی صبح ہوئی۔ ابھی دوپہر آئی، وہ سہ پہر گذرا۔ اے لو وہ ہو گئی شام۔ زندگی بہت ہی مختصر ہے۔ جتنے جلدی بھی کام نمٹ سکے نمٹا دینا چاہئے۔ (اصغر کے چہرے کی طرف دیکھ کر) یہ تمہاری آنکھیں اتنی لال کیوں ہو رہی ہیں۔ زیادہ پڑھ رہے ہو گے آج کل؟ اسی لئے شاید— ہاں بھئی کھیل کے مقابلہ میں تو پڑھنا گراں گذرتا ہی ہے رہی ہی .....

(باورچی خانے کی طرف سے سلیقہ کی آواز آتی ہے)

"اب یہ تم بچے پہ قہقہے لگانے گئے تھے یا سوال سمجھانے۔ جاڑے کی صبحیں نگوڑی ہوتی ہی کتنی لمبی ہیں۔ آنا فاناً میں دس بج جائیں گے۔ تمہیں دفتر جانے کی جلدی سوار ہو جائیگی اس کا سوال یونہی رہ جائیگا۔ پھر کھڑا میری جان کو روئیگا کہ سوال تو نکلا ہی نہیں اسکول کیا خاک جاؤں؟"

عقیل (ذرا بلند آواز سے) اچھا اچھا خفا کیوں ہوتی ہو۔ سمجھائے دیتے ہیں۔ تمہیں تو اب ہمارا ہنسنا بولنا بھی ناگوار گذرنے لگا (اصغر سے) کونسا سوال ہے بھئی؟۔

اصغر۔ (کسی قدر خوش ہو کر) یہ ہے کسروں کی تقسیم کا۔

عقیل۔ ایک کسر کو دوسری کسر پہ تقسیم کرنا ہے؟۔

اصغر۔ جی ہاں۔

عقیل۔ تو اس میں مشکل کی کون سی بات ہے۔ (کتاب لیکر سوال پڑھتا ہے) قاعدے کو اچھی طرح سمجھ لو۔ ختم ہوا قصہ۔ اب دیکھو..... اچھا۔ ایک کسر کو دوسری کسر سے تقسیم کرنے کے لئے ہم کیا کرتے ہیں۔ (چند صفحے الٹ کر کتاب دیکھتا ہے) ہاں ..... تو کسروں کی تقسیم کے لئے ہم پہلی کسر کے نسب نما کو دوسری کسر کے اوپر والے ہندسے سے ضرب دیتے ہیں۔ جو کچھ حاصل ہوگا وہ حاصلِ قسمت کا اوپر کا ہندسہ ہوگا۔ اب سوال میں........

اصغر (بات کاٹ کر) یہ تو میں پہلے ہی سے جانتا ہوں۔ مگر اس سوال کو کیسے نکالوں حل کر دو۔

عقیل۔ اچھا حل کر دوں۔ تو یوں کہو۔ تم کو بھی کس گدھے نے آدمی بنا دیا۔ عقل کے دشمن یہ بات پہلے ہی سے نہ کہہ دی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ تمہیں کسروں کی تقسیم کا قاعدہ بھی نہیں آتا۔ اچھا تو اب حل کئے دوں اس سوال کو۔ دینا ذرا پنسل کاپی۔ لو دیکھو، اچھا فرض کرو کہ ہم سات بٹے آٹھ کو دو بٹے پانچ پر تقسیم کرنا چاہتے ہیں۔ ہائیں؟ یعنی ایک کسر کو دوسری کسر پہ تقسیم کرنا ہے۔ چائے تیار ہو گئی ہو گی؟۔

اصغر۔ خبر نہیں۔

عقیل۔ وقت تو ہو گیا ہوگا۔ ساڑھے آٹھ بج رہے ہیں شاید۔ ہائیں؟ اچھا اب اس کو یوں دیکھو کہ فرض کرو ہم سات بٹے آٹھ کو دو بٹے پانچ سے تقسیم نہیں کرتے بلکہ اس کی جگہ دو سے تقسیم کرتے ہیں یعنی صرف .... اچھا کرو تقسیم۔ کیا آیا؟۔

اصغر۔ سات بٹے سولہ۔

عقیل۔ ٹھیک بالکل ٹھیک، تو اس میں گُر یہ ہے کہ — اس کا ..... گُر یہ ہے کہ ... کہ ... کہ اگر ہم نے دو سے تقسیم کیا تو ..... مگر بھئی ذرا تھمنا۔ میں خود ایک جگہ اٹک گیا۔ ہمارے زمانے میں ایک ریاضی کے اُستاد رفیق آلو تھے۔ وہ بھی اللہ بخشے ہر سوال میں

اسی طرح اٹک جایا کرتے تھے۔ صورت یہ ہوتی تھی کہ انہوں نے ایک قاعدہ کلاس کو سمجھانا شروع کیا اور سمجھاتے سمجھاتے کہیں کے کہیں جا نکلے۔ اور اب جو واپس لوٹے ہیں تو پتہ نہیں چلتا کہ کیا کہہ رہے ہیں۔ کلاس دم سادھے گُپ چُپ بیٹھی ہے۔ رفیق صاحب بار بار قاعدے کو ذہن نشین کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر اندھی قسمت کا پھیر کہ نہیں پہنچتے۔ چہرہ غصے کے مارے سُرخ پیشانی پر پسینہ کے موٹے موٹے قطرے۔ بار بار لڑکوں کو ڈانٹ رہے ہیں۔ کہ ابے کیا تمہارے دماغ میں آلو بھر گئے ہیں جو نہیں سمجھتے یا کچھ میرے ہی بھیجے میں آلو بھرے ہوئے ہیں کہ سمجھا نہیں سکتا۔ لڑکے ایک انکسار آمیز متانت کے ساتھ خاموش ہیں۔ آخر کس مُنہ سے کہیں کہ حضرت آپ پر تو آج ہی یہ حقیقت کھلی ہے ہم ایک عرصے سے جانتے ہیں کہ آنجناب قبلہ کو رفیق آلو کہا جاتا ہے۔ دروازے کے قریب جا کر رفیق صاحب خوب زور زور سے ناک صاف کرتے ہیں (رومال سے نتھنے رگڑتے ہوئے آتے ہیں اور بے کار بولنا شروع کر دیتے ہیں۔ لیکن بھئی ایمان کی یہ ہے۔

——— (سلیقہ کے قدموں کی ہر لحظہ قریب تر ہوتی ہوئی چاپ سُنائی دیتی ہے۔ عقیل دروازے کی طرف دیکھتا ہے) وہ آ رہی ہیں (بلند آواز سے) اچھا بھئی تو ہاں یہ کسر اس کسر سے ضرب کھائیگی۔ تو ———

سلیقہ۔ (کمرے میں داخل ہوتے ہوئے) لو آؤ چائے تیار ہو گئی۔

عقیل۔ (انہماک ظاہر کرتے ہوئے) ذرا یہ سوال کر لیں بس ابھی آئے۔

سلیقہ۔ بس اب اٹھو بھی۔ رکھی رکھی چائے ٹھنڈی ہو جائے گی۔

عقیل۔ اچھا تو پھر اٹھنا ہی پڑیگا چلو بھئی اصغر ———

(کرسی سے اُٹھتا ہے۔ اصغر بھی اُٹھتا ہے۔ اور اسکے چہرے پر کئی طرح کے جذبات کے اثرات ہیں کچھ حیرانی کے کچھ پریشانی کے کچھ مایوسی کے، کچھ جھنجھلاہٹ کے۔)

# چوتھا منظر

ایک کمرہ۔ دستر خوان بچھا ہوا ہے۔ چائے کے علاوہ اور بھی بہت سی چیزیں ہیں۔ خاصی دعوت معلوم ہوتی ہے۔ ایک بوسیدہ سے قالین پر ایک طرف خالہ عشرت نواز بیٹھی ہیں جو نہ اپنی کہتی ہیں نہ دوسرے کی سُنتی ہیں۔ دوسری طرف پھوپھی دلآرا بیگم ہیں جو گونگی اور بہری ہیں اور جو ہچکیاں بڑی کثرت سے لیتی ہیں۔ اور جنکی اس عادت سے عقیل بیحد نالاں ہے۔ سلیقہ آتی ہے اور "اے خالہ شروع کرو نا" کہکر دونوں کے بیچ میں بیٹھ جاتی ہے۔ ایک منٹ بعد عقیل اور اصغر داخل ہوتے ہیں اور عورتوں کے مقابل بیٹھ جاتے ہیں۔

سلیقہ۔ (عقیل سے) لو یہ سموسے چکھو۔ میں نے خالہ کے لئے تلے تھے۔

عقیل۔ یا اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ دوسروں کے صدقے میں ہمیں ایسی اچھی اچھی چیزیں چکھوا تا ہے۔

(سلیقہ تیوریوں پر بل ڈال کے عقیل کی طرف دیکھتی ہے۔ بلی آتی ہے اور عقیل کی کمر سے اپنی پیٹھ رگڑنے لگتی ہے۔ اُس کی دُم اوپر اُٹھی ہوئی ہے اور "خُر خُر" کرتی جاتی ہے۔)

**سلیقہ** (خالہ سے) اے ہے یہ مربا لو نا خالہ۔

**عقیل۔** (اصغر سے) اے ہے بیٹا تم بھی لو نا مربا ہمیں ملے یا نہ ملے تم تو چکھو۔

(سلیقہ تیوریاں چڑھا کر عقیل کی طرف دیکھتی ہے۔ اصغر چپکا میٹھا کھائے جاتا ہے۔ خالہ مُربا چمچے میں اُٹھاتی ہیں اور ہونٹوں تک لے جاتی ہیں۔ مُربا مُنہ میں رکھتے ہی شیرینی کے احساس سے باچھیں کھل جاتی ہیں مگر منہ سے تعریف نہیں کرتیں۔ گردن ہلاتی ہیں۔)

**عقیل۔** (اصغر سے) کیوں بیٹا چکھا تم نے مُربا! ہے مزیدار؟ مُنہ ہی مُنہ میں مزے لے رہے ہو زبان سے کچھ نہیں کہتے۔ اماں کم سے کم گردن ہی ہلا دو۔

(سلیقہ دانت پیستی ہے اور عقیل کی طرف گھور کر دیکھتی ہے۔ پھوپی کو ہچکی آتی ہے۔ عقیل کو جس نے چائے کی پیالی مُنہ سے لگا رکھی ہے "اُچھو ہو جاتا ہے "تی تی تی" کرتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ ہنسی ضبط نہیں ہوتی سلیقہ گھورتی ہے۔ رومال سے منہ صاف کر کے بیٹھ جاتا ہے اور کھانا شروع کر دیتا ہے۔)

**سلیقہ۔** (انڈوں کی طشتری خالہ کی طرف بڑھاتے ہوئے۔) لو خالہ یہ لو۔

**عقیل۔** (اپنے آگے کی خالی طشتری اصغر کی طرف بڑھاتے ہوئے۔) لو یہ بیٹا یہ لو (اصغر عقیل کے مُنہ کی طرف دیکھتا ہے۔) مُربا تو نہیں ہے۔ مگر ہے یہ چیز بھی مزیدار۔ انڈے ہیں۔ (پھوپی کو ہچکی آتی ہے۔) ہاں ہاں سچ۔ (پھر ہچکی آتی ہے۔) لو ایک دفعہ پھر۔

**سلیقہ۔** (گھور کر) اُوں ہوں۔

(پھوپی کو ہچکی آتی ہے۔)

**عقیل۔** ٹھیک، ٹھیک۔

**سلیقہ۔** (نظر بچا کے پھوپی کی طرف دیکھتے ہوئے) اُوں ہوں۔

(پھوپی کو پھر ہچکی آتی ہے۔)

**عقیل۔** دیکھا، تائید اور پھر اس پہ تائید مزید۔

(سلیقہ گھورتی ہے۔ پھوپی کو ہچکی آتی ہے۔)

**عقیل۔** گھورنے سے آخر کوئی فائدہ بھی۔ تائید تو برابر ہو رہی ہے۔

**سلیقہ۔** (اصغر سے) جاؤ بیٹا تم تو اُٹھو۔ اسکول کی تیاری کرو۔

**اصغر۔** تیاری کیسے کروں؟ سوال تو نکلا ہی نہیں۔

**سلیقہ۔** ہائیں۔ (عقیل کی طرف دیکھ کر) اور تم اتنی دیر سے وہاں کیا کر رہے تھے؟

(عقیل سر کھجانے لگتا ہے۔ سلیقہ اسے گھورتی ہے۔ اصغر نظر بچا کے عقیل کے چہرے پر ایک نگاہ ڈالتا ہے اور خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ فرش کی طرف دیکھنے لگتا ہے۔

ڈراپ

# سناؤں تمہیں بات اک رَت کی

(از حضرت شوکت تھانوی)

واللہ میں بزدل نہیں ہوں اور نہ لکھنو میرا وطن ہے، بلکہ میرا تعلق تو اُس خاندان سے ہے جس کی بہادری کے افسانے آج تک بزدلوں کو بہادر بنانے کے کام میں آتے ہیں، لیکن بعض واقعات ہی ایسے ہوتے ہیں کہ بڑے سے بڑا بہادر بھی لرزہ براندام ہو جائے، بلکہ ہمارا تو خیال یہ ہے کہ جو واقعہ ہم پر گذرا ہے اگر کسی اور بہادر انسان پر گذرتا تو شاید وہ دہل کر مر جاتا یا سہم کر عرصہ تک اختلاج قلب وغیرہ میں مبتلا رہتا، لیکن ہم نے اس آزمائشی اور امتحانی موقع پر اپنے ہوش و حواس کو اس حد تک قائم رکھا کہ نہ تو خوف کی وجہ سے دم نکلا اور نہ اختلاج قلب کی شکایت مستقل طور پر پیدا ہوئی۔ البتہ گھگی ضرور بندھ گئی تھی، خیر یہ کوئی ایسی بزدلی کی بات نہیں۔

قصہ یہ ہوا کہ لکھنو میں مسلح ڈاکوؤں کی کثرت نے ایک تو یوں ہی سب کو ڈرا رکھا تھا، اُس پر طرہ یہ کہ کسی اللہ کے بندے نے ایک خط بھی ہمکو بھیج دیا کہ اگر جان کی خیریت چاہتے ہو تو ایک ہزار روپیہ ہمارے نذر کرو ورنہ مقابلہ کیلئے تیار ہو جاؤ۔ اس خط کو دیکھ کر پہلے تو تھوڑی دیر کے لئے ہمکو بھی محسوس ہوتا رہا کہ واقعی قلب کی حرکت بند ہونے والی ہے لیکن پھر ہم نے اپنی اس بزدلی پر دل ہی دل میں خود ہی انتہا تنفر کیا اور مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے وہ خط لیکر بیگم کے پاس پہونچے تاکہ ان کو بھی یہ الٹی میٹم دکھا کر خطرہ کے لئے تیار کر دیں۔ لیکن بیگم ٹھہریں عورت! ان کا خط دیکھتے ہی گویا دم نکل گیا۔ ایک دم سے زرد پڑ گئیں اور ڈرتے ڈرتے بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگیں۔ "پھر"؟

ہم نے بہادرانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا: "پھر کیا؟ دیکھا جائیگا۔"

بیگم نے ہکا بکا ہو کر کہا "دیکھا کیا جائیگا؟ مجھ کو اور بچوں کو لیکر آپ آج ہی زرا کوٹھی چلئے۔ میں اب یہاں ایک منٹ نہ ٹھہرونگی۔"

ہم نے بیگم کو مطمئن کرتے ہوئے کہا "گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ میں آج ہی تمام زیور اور روپیہ تو بینک میں رکھوائے دیتا ہوں اور ایک پہاڑی بندوقچی پہرہ دینے کیلئے نوکر رکھے لیتا ہوں۔"

بیگم نے اس تجویز سے اختلاف کرتے ہوئے کہا "اس سے کیا ہوگا۔ اگر ڈاکوؤں کو روپیہ نہ ملا تو وہ جان لیں گے۔ بنک میں روپیہ رکھنے سے کیا فائدہ ہوگا؟"

ہم نے کہا "مگر بنک میں ایسا کوئی طریقہ نہیں ہے کہ میں آپ کو اور بچوں کو بھی رکھوا دوں۔ ہم سب کی حفاظت خدا کریگا۔"

بیگم ہیں ذرا مذہبی قسم کی آدمی، خدا کا نام سن کر دلیر نہ سہی مگر اخلاقاً کچھ اس انداز سے چپ ہو گئیں کہ گویا اطمینان تو نہیں ہوا ہے مگر مجبوری کا نام شکریہ ہے۔ بہرحال ہم واقعی صرف یہی کر سکتے تھے کہ روپیہ اور زیور بنک میں رکھوا دیں اور پہرہ دار نوکر رکھ لیں۔ اسکے علاوہ ہم نے یہ بھی کیا کہ وہ دہشت انگیز خط جو ہم کو موصول ہوا تھا پولیس میں بھجوا دیا اور اسکے بعد اپنے کو معہ بال بچوں کے خدا کو سونپ کر بیٹھ رہے۔

جس روز کا یہ واقعہ ہے اس دن چراغ میں بتی پڑتے ہی ہمارا تمام گھر مقفل کر دیا گیا، پہرہ دار خاص ہمارے کمرہ کے دروازہ پر تعینات کر دیا گیا اور کمرے کے اندر بھی یہ انتظام تھا کہ خود ہماری چارپائی پر توشک کے نیچے بندوق تھی۔ اور تکیہ کے نیچے کارتوس بیگم نے اپنے دونوں بچوں کو ان کے لبنروں کے بجائے خود اپنے پاس لٹایا تھا اور یہ طے کر لیا گیا تھا کہ تمام رات کوئی نہ سوئے گا، حالانکہ بغیر طے کئے بھی نیند کا آنا ذرا مشکل ہی تھا۔ بہر حال شام ہی سے ہم سب اس طرح کیل کانٹے سے لیس ہو کر بیٹھ گئے کہ گویا کسی کی آمد آمد ہے

رات کا ابتدائی حصہ بخیریت تمام گذر گیا۔ اور بارہ بجے رات تک سڑک پر آدمیوں کی اور سواریوں کی آمد و رفت سے چہل پہل رہی لیکن اس کے بعد رفتہ رفتہ سناٹا ہونے لگا۔ یہاں تک کہ ایک ہُو کا عالم طاری ہو گیا۔ رات کی بھیانک تاریکی اور یہ دہشت ناک سناٹا معلوم ہوتا تھا کہ گویا ہم سب کو نگل جائیگا اور بغیر ڈکار لئے ہضم کر جائیگا اس وقت ہم گویا تاریک رات کے بھیانک دیو کی آغوش میں تھے کہ وہ جب چاہے ہمکو اٹھا کر منہ میں رکھ لے۔ اس خوفناک سکوت کو اس طرح توڑا جا سکتا تھا کہ ہم بیگم سے باتیں کرتے اور بیگم ہم سے۔ لیکن ہم دونوں اس قیمتی وقت کو فضول بک بک میں ضائع کرنا نہیں چاہتے تھے بلکہ اپنی اپنی جگہ پر یہی سوچ رہے تھے کہ جب ڈاکو آئیں گے تو ہم سب ان کا خیر مقدم کس طرح کرینگے؟ جب وہ ہم کو پستول دکھائیں گے تو ہم کس طرح ہاتھ اُٹھا کر اعلان شکست کرینگے اور جب وہ ہم سے روپیہ طلب کرینگے تو ہم کس طرح اپنی ناداری اور مفلسی کا اُن کو یقین دلائینگے، پھر اگر خدانخواستہ ان ظالموں نے ہم کو قتل وغیرہ کیا تو کیا ہوگا۔؟

پہرہ دار نے نہایت ڈراونی آواز سے کہا "ہاہ —— ہو"

ہم تو خیر کوئی چھ سات انچ اُچھلے ہونگے، مگر بیگم غڑاپ سے لحاف میں گھس گئیں اور سانس روک کر رہ گئیں۔ اس حماقت کا احساس پانچ منٹ کے بعد ہمکو اور سات آٹھ منٹ بعد ان کو ہوا مگر اسکے باوجود نہ تو ہنسی آئی اور نہ دونوں میں سے کسی نے اس پر کوئی تبصرہ کیا بلکہ پھر اس طرح بیٹھ گئے کہ ؎

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی　　اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

یعنی سکوت کا یہ عالم تھا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے دل کی دھڑکن نہایت صاف سن رہے تھے اور ذرا ذرا سے کھٹکے پر یہ دھڑکن اور بھی تیزی کے ساتھ ڈبل مارچ کرتی ہوئی سنائی دیتی تھی۔ ہم نے اس مہمل اور بزدلانہ خاموشی پر خود ہی غور جو کیا تو کچھ شرم سی آنے لگی۔ لہٰذا یہ طے کیا کہ کوئی کتاب پڑھ کر یہ وقت کاٹا جائے۔ مگر سوال یہ تھا کہ کتاب تھی میز پر اور میز تھی چارپائی سے تھوڑے فاصلہ پر، لہٰذا یہ کیونکر ممکن تھا کہ ایسے نازک موقع پر ہم چارپائی سے اُٹھتے اور میز تک جا کر وہاں سے کتاب لاتے۔ اور فرض کر لیجئے کہ ہم اس طرح اپنے کو خطرہ میں ڈال بھی دیتے لیکن اگر اسی وقت کوئی آجاتا تو؟ —— لہٰذا یہ ارادہ ملتوی کرنا ہی پڑا، اور یہی مناسب معلوم ہوا کہ بیگم سے باتیں کریں چنانچہ اس اسکیم کے نشیب و فراز پر خاموشی کے ساتھ خوب اچھی طرح غور کرنیکے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ اگر چپکے باتیں کیجائیں تو چنداں مضائقہ نہیں ہے۔ لہٰذا تھوڑی دیر تک ارادہ کرنیکے بعد ہمنے کہا: "بیگم"

بیگم نے زیر لب کہا۔ "ہوں"

ہم نے کہا۔ "جاگ رہی ہونا؟"

بیگم نے پھر اسی طرح بغیر منہ کھولے ہوئے کہا "ہوں"

ہم نے چپکے سے کہا "ڈرنا نہیں ہم جاگ رہے ہیں"

بیگم نے اسکا جواب دینا کچھ ضروری نہ سمجھا اور ہم بھی سوچنے لگے کہ اب کیا کہیں لیکن ہمکو زیادہ غور کرنیکی مہلت ہی نہ ملی اس لئے کہ چار پانچ بلکہ اس سے بھی زیادہ کتوں نے آواز ملا کر خوفناک طریقہ پر بھونکنا شروع کیا اور ان کے بھونکنے سے قدرتی طور پر ہمکو اس نتیجہ پر پہونچنا پڑا کہ ضرور کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آیا ہے۔ غالباً یہی فیصلہ بیگم صاحبہ نے بھی کیا۔ اسلئے کہ چپکے سے انہوں نے پوچھا "یہ کتے کیوں بھونک رہے ہیں؟"

ہم نے کہا "معلوم نہیں"

بیگم نے کانا پھوسی کے انداز سے پوچھا "چوکیدار سو گیا"

ہم نے راز دارانہ طریقہ پر جواب دیا "معلوم نہیں"

بیگم نے کہا "اسکو آواز دیجئے"

ہم نے کہا "ابھی چپ رہو کتے ذرا چپ ہو جائیں"

مگر سوال یہ تہا کہ کتے واقعی کیوں بھونک رہے ہیں یقیناً انہوں نے کسی اجنبی آدمی کو اس طرف آتا ہوا دیکھا ہے اور کیا تعجب ہے کہ وہ آدمی ڈاکو ہو۔ یقیناً اب خطرہ نزدیک تھا۔ اور خطرے کے نزدیک ہونیکی یہ علامت بھی پائی جاتی تھی کہ ہمارے دل کی حرکت سول سردس کپ کی ریس بنگئی تھی اور ہاتھ پیر ذرا کانپ رہے تھے کتے بدستور بھونک رہے تھے بلکہ بھونکتے ہوئے عین ہمارے مکان کے سامنے آگئے تھے کہ ناگاہ۔

"آہ —— ہاؤ —— ہا ہا ہا"

ایکے ہم بھی سجدہ میں گر پڑے اور معلوم نہیں کہ "اوئی" کہہ کر بیگم کا کیا حشر ہوا لیکن تہوڑی ہی دیر کے بعد آواز آئی۔

"جاگتے رہو"

ہم بھی سنبھل کر بیٹھ گئے اور بیگم بھی لیکن کتے بدستور قیامت برپا کئے ہوئے تھے، بیگم نے بھرائی ہوئی آواز میں پھر کہا:۔ "یہ کتے کیوں بھونکے جاتے ہیں"

ہم خود اس بات کو سمجھنے سے قاصر تھے آخر ہمنے ہمت کر کے چوکیدار کو چپکے سے پکارا اور پوچھا کہ "یہ کتے کیوں بھونک رہے ہیں؟"

اس نالائق نے لاپرواہی سے جواب دیا "انکا اور کام ہی کیا ہے؟"

ہمنے اس مہمل جواب سے جل کر مگر خوشامدانہ انداز سے کہا "پھر بھی آخر بات کیا ہے؟"

اس پہاڑی گدھے نے پہر وہی مہمل جواب دیا کہ "حضور اگر وہ بھونکیں نہ تو کتا ان کو کون کہے"

ہم جل بھن کر چپ ہو رہے اسلئے زیادہ بات چیت کرنا بھی موقع اور محل کے اعتبار سے مناسب نہ تہا لیکن کتوں کا بھونکنا یقیناً بلا وجہ نہیں ہو سکتا تہا۔ اور پھر عین ہمارے دروازہ پر یقیناً کوئی نہ کوئی بات ضرور تھی۔ بہر حال ہم زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتے تھے کہ اپنا کانپتا ہوا ہاتھ چپکے سے اٹھا کر بستر پر اس جگہ رکھ لیا جہاں بستر کے نیچے بندوق رکھی ہوئی تھی مگر اب ہمکو معلوم ہوا کہ

بندوق اس قسم کے موقعوں کے لئے بالکل بیکار چیز ہے اس لئے اس کمبخت کے لئے یہ ضروری بات ہے کہ اسکو چلایا بھی جائے تو چلے اور یہاں سوال یہ درپیش تہا کہ آخر چلائی کس طرح جائیگی۔ اور کس کا فہ سے چلائی جائیگی۔ ہماری نشانہ بازی مسلّم، ہماری بندوق بازی کی مہارت تسلیم۔ لیکن جناب ڈاکو کوئی ہرن یا نیل گائے، لوا یا تیتر تو تھے نہیں کہ خاموشی سے گولی کہا کر ڈہیر ہو جاتے، یہاں تو برابر کا مقابلہ تہا کہ ایک گولی تم چلاؤ تو دس گولیاں اُدہر سے چلائی جائینگی پھر سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ بندوق بھی بھری ہوئی نہیں تھی بلکہ بغیر بھری ہوئی چارپائی کے ایک طرف رکھی ہوئی تھی اور کارتوس تکیہ کے نیچے تھے۔ اسکے یہ معنی ہوئے کہ پہلے بندوق بستر کے نیچے سے نکالی جائے پھر اسمیں تکیہ کے نیچے سے کارتوس نکال کر بھرے جائیں۔ اسکے بعد اگر گھوڑا انگلی سے دب سکے تو بندوق چھوٹ سکتی ہے ورنہ نہیں، استغفر اللہ یہ بھی کوئی تفریحی شکار تھا کہ اسقدر اہتمام کے بعد بندوق چلائی جاتی، مجبوراً ہمنے بندوق پر سے ہاتھ ہٹا لیا اور دراصل یہ ہماری ایمانی کمزوری بھی تھی کہ خدا کو بھول کر بندوق سے کوئی توقع رکھتے، چنانچہ بندوق سے مایوس ہو جانے کے بعد ہمنے اپنے ذہن میں سوائے خدا کے اور کسی کو نہ رکھا اور واقعی اس خیال کے پیدا ہوتے ہی اسقدر تقویت پیدا ہوگئی کہ ہمنے آزادی سے مُنہ کھول کر سانس لینا شروع کر دئے اور اسوقت تک پہلی مرتبہ ڈاڑہ میں دبلے ہوئے پان کو بھی چبایا بلکہ ایک آدہ ڈگری گردن گھما کر بیگم کو بھی دیکھا کہ کس حال میں ہیں۔ وہ اللہ کی بندی دروازہ پر اسطرح نظریں جمائے ہوئے تھی کہ گویا اب دروازہ کھلا اور اب کوئی آیا۔ خیر یہ تمام صورتیں تو جس طرح ہو سکتا تہا برداشت کی جا رہی تھیں مگر اس مصیبت بالائے مصیبت کا کوئی حل ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسی نازک موقع پر پیشاب نے بھی ستایا۔ یہ دراصل ہماری ہی حماقت کا نتیجہ تہا کہ مغرب کے بعد ہی پیشاب کر کے چارپائی پر آ گئے تھے ورنہ اگر ہمنے اول حصہ شب کے سناٹے میں ایک مرتبہ اور اس طرف سے فراغت کر لی ہوتی تو اس وقت اس مصیبت کا سامنا نہ ہوتا۔ چارپائی سے اُتر کر غسلخانہ تک یا کم سے کم تاب دان تک جانا اور وہاں اس بھیانک رات کے سناٹے میں بیٹھ کر تنہا پیشاب کرنا ظاہر ہے کہ ایک ناممکن اور ناقابل عمل سی بات تہی۔ لیکن اگر چارپائی کے اوپر بیٹھے ہی بیٹھے اس ضرورت کو پورا کرتے تو بیگم ہمکو بُزدل سمجھتیں، ایسی صورت میں صرف یہی بات ممکن تہی کہ پیشاب کو روکا جائے لیکن یہاں تو یہ حال تہا کہ مثانہ پھٹنے کے قریب تہا اور وہ تمام تدابیر عمل میں لائی جا چکی تہیں جو اس قسم کے مواقع پر پیشاب روکنے کیلئے عمل میں لائی جاتی ہیں۔ اتفاقاً عین اسی موقع پر ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر ہمنے غسلخانہ جانیکا ارادہ بھی کیا تو بیگم خود ہی ہمکو نہ جانے دینگی اور اگر ہم گئے بھی تو وہ خود ہمارے ساتھ چلینگی، بہرحال دونوں صورتوں میں ہمارا مقصد حل ہو جاتا ہے۔ لہذا ہم نے بیگم سے کہا:۔

"سُنتی ہو"؟

بیگم نے چپکے سے کہا "کیا ہے"؟

ہم نے کہا "پیشاب"!

بیگم نے اس اہم مسئلہ کو کوئی معمولی سی بات سمجھ کر کہا "اونہہ ہوگا بھی"۔

ہم نے کہا "بڑے زور سے معلوم ہو رہا ہے۔ بس اب نکلنے ہی والا ہے"۔

بولیں "تو جاؤ پھر"۔

ہمنے حیرت سے کہا "اور تم — تم ڈروگی نہیں؟"

بیگم نے کہا "اگر اسوقت یہیں کرلو تو کیا ہرج ہے؟"

ہمنے اخلاقاً کہا "یہاں؟ یعنی کمرہ کے اندر؟ اجی نہیں بُرا معلوم ہوتا ہے۔"

بیگم نے کہا "ہوگا بھی صبح کمرہ دُھل جائیگا۔"

ہمنے پھر کچھ اور کہنا مناسب نہ سمجھا اسلئے کہ یہ بھی ممکن تہا کہ بیگم ہمت کرکے ہمکو باہر جانے کی اجازت دیدیتیں اور اسکا بھی امکان تھا کہ ناگہانی طور پر یہ ضرورت ہی باقی نہ رہتی۔ لہذا ہمنے نہایت اطمینان کے ساتھ چارپائی پہ بیٹھے ہی بیٹھے شاشیلان کا مصدر گردانا شروع کردیا مگر کیا عرض کیا جائے کہ عین اسی موقع پر ا۔

"آ— خاد — بزباد — خبردار"

کی فلک شگاف بہیانک آواز نے ہمکو مجبور کردیا کہ پیشاب کا سلسلہ غیر ارادی طور پہ باقی آئندہ کرتے ہوئے جلد کے توں ڈہلک کر لحاف کے اندر گُہس رہے اور جب کچھ دیر کے بعد یہ اطمینان ہو گیا کہ یہ پہرہ دار نے اپنا فرض انجام دیا تہا تو ہمنے بھی لیٹے ہی لیٹے ازار بند کس لیا اور پیشاب کی دوسری قسط بھی ادا کرنیکا خیال نہ رہا۔ اس وقت تقریباً ڈہائی بجے تھے اور ڈاکوؤں کے انتظار کے باوجود نیند کا بھی غلبہ تہا بلکہ بیگم تو شاید بیٹھے ہی بیٹھے اُونگھ بھی رہی تہیں مگر ہم سونا نہیں چاہتے تھے۔ اسلئے کہ اگر اسوقت سونیکا ارادہ کرتے تو یہ اندیشہ تھا کہ شاید پھر حشر سے پہلے آنکھ نہ کھُلے گی۔ مانا کہ پہرہ دار جاگ رہا تھا وہ اسی لئے نوکر رکھا گیا تہا کہ ہم اطمینان سے سوئیں اور وہ جاگتا رہے لیکن انسان ہی تو تہا اگر وہ بھی سو جاتا اور ڈاکو اتفاق سے آجاتے تو ظاہر ہے سیدہے ہمارے سینہ پہ آکر چڑہ جاتے اسوقت کیا ہوتا؟ اسی خیال سے ہم جاگتے رہے اور زبردستی جاگتے رہے جمائیاں آتی رہیں انگڑائیاں لیتے رہے لیکن سو جانا یقیناً خطرناک تہا البتہ چونکہ آنکھ بند کرنے میں ذرا لطف آتا تہا لہذا کبھی کبھی ایک ایک سکنڈ کیلئے آنکھ بند کرتے رہے تھوڑی دیر کے بعد ایک ایک سکنڈ کے بجائے دو دو سکنڈ کردئے۔ پھر تین تین سکنڈ پھر چار چار سکنڈ —— پھر —— پھر —— پھر —— خر خر خر خر

غالباً ابھی آنکھ لگی تھی کہ ڈاکو موقع پاکر چڑہ بیٹھا اور ہم اُچھل کر جاگ پڑے۔ ڈاکو ہمپر لدا ہوا تہا اور ہم کلمہ پڑھ پڑھ کر جان دے رہے تھے۔ سانس تک روک لی تھی آنکھیں بھینچ کر بند کرلی تہیں اور زندگی کی اس آخری کشمکش پہ موت کو ترجیح دے رہے تھے کہ یکایک ڈاکو نے کہا "اُو، اُو، اُو، اُو، —— اُو —— اُ —— و —— اُو —— اُو —— اُ —— و" اور ہمنے بھی غیر ارادی طور پر اسکی آواز سے آواز ملاکر کہنا شروع کیا "اُو، اُو، اُو —— اُ —— و، اُو، اُو —— اُو —— اُو —— اُو" ہم لحاف کے اندر سے اور ڈاکو لحاف کے اوپر سے اسی مسلسل اور متواتر "اُو، اُو" میں مصروف تھے بلکہ دونوں بچے بھی غالباً جاگ کر اس "اُو، اُو" میں شریک ہوگئے تھے اس لئے کہ نہایت مہین اور باریک آوازیں بھی اس راگ میں شامل تہیں البتہ پہرہ دار نہایت کرخت آواز میں "کیا ہے؟ کیا ہے؟؟" کا شور بلند کئے ہوئے تہا۔ آخرکار وہ دروازہ کھول کر کمرہ میں گھس آیا۔ اور پہلے تو زبانی "کیا ہوا، کیا ہوا" کہتا رہا حالانکہ اندھا دیکھ رہا تھا کہ ڈاکو ہمپر سوار ہے۔ اور آخرکار اس ڈاکو کو ہمپر سے ہٹا کر کہا:-

بیگم صاحبہ چُپ تو ہوئیے آخر ہوا کیا؟"

اب ذرا ہماری بھی گھگی بنچم سے مدہم پر آئی اور رفتہ رفتہ خاموش ہوئے لحاف ہٹا کر دیکھا تو بیگم صاحبہ پہرہ دار کے پاس مدحواس

کھڑی تھیں اور پہرہ دار دونوں چوں کو اٹھائے ہوئے تھا۔ پہرہ دار نے ہم سے بھی پوچھا حضور آخر ہوا کیا؟"

ہم نے ہانپتے ہوئے کہا "ڈاکو مجھ پر چڑھ بیٹھا تھا"

بیگم نے کہا "نہیں ڈاکو نہیں میں آپ کے پاس آئی تھی ڈاکو تو باورچیخانہ میں برتن سمیٹ رہا تھا"

پہرہ دار نے فوراً لالٹین اٹھا کر باورچیخانہ میں جا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ڈاکو نے سوائے اسکے اور کوئی جرم نہیں کیا ہے کہ دودھ کی پتیلی گرا کر دودھ پھینک دیا اور پھر اُسکو چاٹ بھی گیا۔

پہرہ دار نے کہا "واہ، واہ، واہ!"

بچے ہنس دئے۔

بیگم نے کہا "توبہ ہے اللہ!"

ہم نے کہا "لاحول ولا قوۃ۔ اب کے یہ حرامزادی بلی آئی تو گولی مار دونگا"

اسکے بعد مرغ اذان دے رہا تھا اور ہم سب سو رہے تھے۔

شوکت تھانوی

---

# اُضحوکہ

از جناب سعد حسین الاشرفی الدہلوی

ایک واعظ تھے نہایت گویا | اور خوش لہجہ و شیریں گفتار
وعظ و مولود کی اُن کے شہرت | تھی جہاں میں بہ دیار و امصار
اُن کا پردازِ سخن دُر افشاں | اُن کا اندازِ بیاں گوہر بار
عمامے سے شانِ بزرگی پیدا | رُخ سے نیکی کے ہویدا آثار
پست قد دُبلا بدن سانولا رنگ | چہرہ خورشید صفت پُر انوار
جُھرّیاں ماتھے پہ سب بال سفید | اور پچکے ہوئے دونوں رُخسار
گاؤدُم چہرے پہ چُگّی ڈاڑھی | بیضوی فرق پہ شالی دستار
ایک گاؤں میں گئے ایک دفعہ | حضرتِ مولوی عالی تبار
آج تو وعظ یہاں کہہ دیجئے | گاؤں والوں نے کیا یہ اصرار
وعظ کہنے کا تھا پیشہ اُن کا | وعظ سے ہوتا اُنہیں کیا انکار
ہو گئے مولوی صاحب راضی | اور سب جمع ہوئے نمبردار
وعظ فرمایا بحُسنِ اسلوب | شہدِ خالص کی بہائیں انہار

آبِ کوثر کے پلائے ساغر — باغِ جنت کے کھلائے اثمار
حور و غلماں کے سنائے قصّے — خُلد کے خوب دکھائے گلزار
الغرض مولوی صاحب نے وہاں — رکھ دیئے کھول کے سارے اسرار
مُتأثّر نہ ہوا کوئی مگر — کیونکہ وہ لوگ تھے سب ناہنجار
ہاں مگر ایک جولاہا بُڈھا — ہو رہا تھا جو بہت زار و نزار
اُس پہ طاری تھی بغایت رقت — چشم سے جاری تھا اشکوں کا تار
دیکھکر مولوی صاحب نے اُسے — یہ کہا تم ہو بہت خوش کردار
سیدھے جنت کو تمہیں جاؤ گے — بخشے گا تم کو خدائے غفار
بھائی تم خوب سمجھتے ہو وعظ — تم ہو ان سب سے زیادہ ہشیار
بولا وہ بڈھا کہ ہے[1] مولبی[2] جی — بآج[3] گے[4] سمجھنگے ہم جیسے گمار[5]
مھارے[6] ایک بوک[7] تھا ٹھاڈا[8] ہجرت[9] — لو[10] بڈی[11] ڈاڈھی[12] تھی اُسکی سرکار
ایسی ہی جیسی ہے تھاری[13] ڈاڈھی — بلک[14] اِس سے بھی تھی جاقے[15] گھندار
کال[16] وہ کر گیا پرسوں ابسوچ[17] — تھا گھنا[18] مھارا[19] تو اُس بوک پہ پیار
تھاری ڈاڈھی پہ وہی آگیا یاد — ہائے رے ہائے نہیں جی کو کرار[20]

۱ اے ۲ مولوی ۳ وعظ ۴ کیا ۵ گنوار ۶ ہمارے ہاں ۷ نر بکرا جوان جو خصی ہو ۸ بڑا خوب مضبوط ۹ حضرت ۱۰ یہہ ۱۱ بڑی ۱۲ داڑھی ۱۳ تمہاری ۱۴ بلکہ ۱۵ زیادہ ۱۶ انتقال ۱۷ افسوس ۱۸ بہت ۱۹ ہمارا ۲۰ قرار۔

# شلوارانِ ادب کا المناک احتراق

## آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہوگئے

از علامہ مضحک دہلوی

جس وقت ساقی کے دسمبر نمبر میں مخلص صاحب کی سرسری نظر شائع ہوئی میرا ماتھا ٹھنکا تھا مگر ہائے افسوس میں اپنی ملازمت کی مجبوری اور اس بُعد کو کیا کروں جو مجھ کو اس وقت ادارہ ساقی سے حاصل ہے ورنہ اپنی بساط بھر اُس کو شائع نہ ہونے دیتا اور کوشش کرتا کہ یہ ہی سرسری نظر ایک "بالغ نظر" ہوکر شائع ہو یعنی پورے پورے زورِ استدلال اور حجّت کے ساتھ تنقید شائع ہوتی مگر اب اس کارروائی کو ایک آہِ سرد کے ساتھ ...... تیر از کمان جستہ۔ کہہ کر رہ گیا۔ میں جانتا تھا کہ جس وقت یہ "سرسری نظر" لاہور پہونچے گی تو جہاں اس "پہلوان خیز" خطہ کا ایک گروہ لنگر جانگیا باندھ کر آمادۂ پیکار" ہوگا اور خم ٹھونک کر چیلنج دیگا کہ "آ میرے نال گھل!" وہاں چند "سمن تن" اس ہلکی سی چٹکی سے بلبلا اُٹھیں گے اور اپنی "شدانِ گلعذاری" کو پوری قوت کے ساتھ استعمال کرکے بے محابہ اور بے نقط سُنائینگے اور ہم اہلِ دہلی بقول اُستاد مرحوم کے ؎

واں گیا بھی میں تو اُنکی گالیوں کا کیا جواب — یاد تھیں جتنی دعائیں صرف درباں ہوگئیں

ان حضرات کو "دعائیں" دیتے رہ جائینگے۔ میری سمجھ میں اب تک یہ نہیں آیا کہ مخلص صاحب نے "انارکلی" کو درخورِ اعتنا اور تنقید کے قابل کیوں گردانا اور کیوں نہ اس "شاہکار" کو (جو ادبی کاوش نہ سہی چند فاقوں کا نتیجہ ہی سہی) "ہیر رانجھا" "سہتی مراد" "سسی پنوں"۔ جھوک۔ بٹہ وغیرہ کی طرح پنجابی اُردو کا "شعر منثور" سمجھ لیا۔ مخلص صاحب کو صرف یہ غور کرنے کی ضرورت تھی کہ یہ "نمک خیز" "خطّہ پروفیسر آزاد مرحوم جیسے خدمت گذارِ ادب کی "ادبی تکبیر" سے جاگا ہے۔ وہاں ابھی "خواب دوشین" کا خمار مستولی ہے اور بقول شخصیکہ۔ ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں۔ ابھی اُردو دانی کے لئے وقت درکار ہے کہ آتی ہے اُردو زباں آتے آتے۔

ان حضرات میں ابھی "طاقتِ خلشِ خار بھی نہیں" بھلا یہ تنقید کا نیشرہ کہاں برداشت ہوگا۔ بہرحال اب چونکہ سب کچھ ہوگیا اور "برادرانِ شلوار" نے دہلی والوں کو خوب شلوار پھیلا پھیلا کر کوسنے بیاد گالیاں دے لیں مگر بہ حیثیت ایک "دہلوی" ہونے کے میرے لئے تحفظِ زبان کا مطالبہ ناگزیر ہے اور اس کُل معاملہ پر چند پہلوؤں سے نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ ہرچند کہ بیماری نے کمر توڑ دی اور بقول اُستاد نظ "ایا جہاں پر سایۂ دیوار بیٹھے ہیں" بن کر رہ گیا ہوں مگر اس خدمت کو انجام دے رہا ہوں۔ ہاں تو ان پہلوؤں کی تشریح یہ ہے کہ پہلا پہلو خود تنقید کا مسئلہ ہے۔ یعنی تنقید صحیح ہے یا غلط جائز ہے یا ناجائز۔ یہ معاملہ بالکل صاف

ہے یعنی ایسا صاف اور چمکدار ہے جیسے کسی شلواری بھائی کا "کلین شیو" (Clean Shave) چہرہ اور کسی کا کیوں کہیئے بلکہ خود بھائی تاجو کا وہ چہرہ جس سے یہ مشتاق لقا آنکھیں ۱۹۲۵ء میں سیراب ہو چکی ہیں، یہاں ایک بات اور عرض کر دینی ضروری ہے۔ مجھ پر الزام لگایا جا سکتا ہے کہ میں نے مولانا "تاج" صاحب کا نام کیوں بگاڑا اور اس بد تہذیبی کا مرتکب کیوں ہوا۔ تو حضرات خطا معاف، یہ میری غلطی نہیں ہے بلکہ پنجابی تلفظ کی خامی ہے، اگر یقین نہ ہو تو کسی شلواری بھائی سے کہیئے کہ وہ آپ کے سامنے دس دفعہ لفظ تاج کی تکرار کرے۔ آپ ملاحظہ کرینگے کہ ہر دفعہ "تاج" کا جیم اس قدر کھینچ تان کر ادا کیا جائے گا کہ خواہ مخواہ اس میں واؤ کی آواز پیدا ہو جائیگی اور "تاج" "تاجو" بن جائیگا۔ یہ جملہ معترضہ تھا جو بطریق مدافعت قارئین کرام کی ضیافت طبع کے لئے لکھا گیا۔ پھر اصلی مضمون شروع۔ تو پہلو نمبر ا کو میں نے صاف اس لئے کہا کہ تنقید وارد ہوئی "انارکلی" پر اور بالواسطہ حضرت تاج کے طرز نگارش پر، اُن کی سعادتمندی ملاحظہ ہو کہ وہ بیچارے اسکو سمجھ گئے، اپنی اغلاط زیر تنقید کا "اعتراف مکمل" کر لیا۔ اور اظہار خاموشی نیم رضا بن کر رہ گئے۔ تاج صاحب اس رواداری پر خراج تحسین کے مستحق ہیں۔ تنقید بڑی لگی کس کو؟ جواب (اگرچہ وہ فی الجملہ مہمل ہی سہی) دیا کس نے؟ اور ایک آتش بدامن شخص کی طرح رقص کون کرنے لگا؟ "نیازمندانِ لاہور" یعنی "تینی والیاں دی ہٹی" کی نئی جنس کا سد۔ اب لگایئے اس مقدمہ پر ادبیات کی کوئی دفعہ۔ تسلیم ہے کہ حضرت تاج ان مرفع الحال لوگوں میں سے ہیں جنکے دستر خوان پر مکھیاں بھنبھناتی رہتی ہیں۔ اور باوجود بجلی کے پنکھے کے دس پانچ روٹی سالن سے اوبھتی رہتی ہیں۔ ممکن ہے اس طرح پر حق نمک ادا کیا گیا ہو مگر حضرت یہ مقدمہ تو آگے چلتا ہی نہیں اور ہر پہلو سے "مدعی سست اور گواہ چست" ہو کر رہ جاتا ہے۔ اب جب تک حضرت تاج خود مخلص صاحب کی تنقید پر اپنے "ادب ریز" قلم سے کچھ نہ رقم فرمائیں اس وقت تک ان شلواری حوارئین کی چیخ پکار تنقیدی مسئلہ میں کیا چیز ہے؟ جواب صاف ہو گا — "صدا بہ صحرا"........

مضمون تو یہیں ختم ہے مگر چند اور لطائف و نکات ادبی اس چیخ پکار میں پوشیدہ ہیں جو قارئین کرام کی دعوت نظر کا سامان فراہم کرتے ہیں اور اُن سے کماحقہ لُطف اندوز نہ ہونا ملت ادبی کے خلاف ہے حالانکہ ع میں جانتا ہوں وہ جو لکھیں گے جواب میں........

دستور ہے کہ کسی مضمون یا تحریر کو پڑھتے وقت چند حقائق کو پیش نظر رکھنا پڑتا ہے۔ اور قاری ہمیشہ اس مضمون یا تحریر کو۔ انشاء۔ واقعات۔ شائستگی کلام۔ زور بیان کی صنعتوں سے لطف اندوز ہونے کیلئے پڑھتا ہے، اگر اس مضمون میں اس قسم کی صنعتیں موجود ہیں تو مضمون شگفتہ اور کامیاب ہے۔ ورنہ لاحول ولاقوۃ۔ آیئے آج کی صحبت میں ان مضامین کا اسی نیت سے تجزیہ کرکے دیکھیں۔ اور شلواری بھائیوں نے جو "گلے بازی" کی ہے اُس کو بھی پرکھیں۔

اس وقت دو مقالے میرے پیشِ نظر ہیں۔ پہلا مقالہ ایک گمنام ہستی کی طرف سے ۲۳ر دسمبر کے روزانہ انقلاب میں ”افکار و حوادث“ کے ذیل میں لکھا گیا۔ دوسرا ”نیازمندانِ لاہور“ کی طرف سے نیرنگِ خیال کے فروری نمبر میں سپردِ قلم کیا گیا ہے۔ میں اپنے مضمون میں ان دونوں مقالوں سے بحث کرنے سے پہلے ایک اور زبردست واقعیت کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ اظہار میں مختلف موقعوں پر اپنے مخصوص رنگ میں کر چکا ہوں اور اس کا اعادہ بارِ خاطر نہیں بلکہ قند مکرر ہوگا۔

کوئی شعر یا مضمون ہمیشہ نتیجہ ہوا کرتا ہے ایک خاص دماغی کھجلی کا جو ایک ادیب یا شاعر پر وقتاً فوقتاً عارض ہوتی رہتی ہے۔ جب اس قسم کا دورہ لاحق ہوتا ہے تو دماغ اس کھجلی سے بیتاب ہو کر شعر کہنے اور مضمون لکھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں دماغ پر ہمیشہ ماحول اور اس مخصوص فضا کا جس کے اندر رہ کر وہ شعر یا مضمون گانٹھا جائے بہت بڑا اثر ہوتا ہے۔ یعنی اگر کسی شگفتہ اور شاداب جگہ میں جو کثافت اور بیماری وغیرہ سے پاک ہو بیٹھ کر یہ عمل کیا جائے تو اس کا نتیجہ بھی شگفتہ ہوگا اور اگر کسی کثیف اور جراثیم آلودہ جگہ میں عمل کیا جائے تو نتیجہ یقیناً بول و براز کا ایک ڈھیر ہوگا اور بس۔ اس نظریہ کی اصولی بحث ختم کرنے سے پہلے ایک اور بات قابلِ غور ہے۔ آج کل کی جدید تحقیقات اور سائنس کے نئے انکشافات بالخصوص ڈاکٹر جرجیس لاخوسکی کی معروف تحقیق قابلِ غور ہے۔ ڈاکٹر موصوف کہتا ہے کہ تمام حیوانات اپنے جسم سے ایتھر کی لہریں خارج کرتے رہتے ہیں۔ دوسری تحقیقات متعدی امراض کے متعلق ہے یعنی جس جگہ متعدی امراض کا زور ہوتا ہے وہاں ایتھر کی لہریں نہیں بلکہ خود جسم جراثیم اس جسم ماؤف سے پیدا ہو ہو کر فضا میں اس مرض کے اسباب پیدا کرتے ہیں۔ مقصد اس بحث کا یہ ہے (جیسے میں نے اوپر بیان کیا) کہ اگر شعر یا مضمون شگفتہ اور بیماری سے پاک و صاف فضا میں گانٹھا جائے تو نتیجہ شگفتہ اور پاک صاف ہوگا اور اگر یہی عمل ایسی فضا میں کیا جائے جہاں بہائم ایتھر کی لہریں اور متعدی امراض اپنے جراثیم خارج کر کے اس فضا کو ناپاک اور ملوث کر رہے ہیں تو نتیجہ معلوم۔

تمثیلاً حافظ شیرازی علیہ الرحمتہ کا شعر لیجئے جو انہوں نے رکن آباد کے دورِ قیام میں کہا ؎

بدہ ساقی مے باقی کہ در جنت نخواہی یافت
کنارِ آبِ رکن آباد و گل گشتِ مصلیٰ را

رکن آباد کی ندی اور اس کی گل گشت کے نظر فریب مناظر کو دیکھ کر یہ شعر کہا گیا جس کی شگفتگی خود شاہد ہے۔ غور کیجئے اگر یہ جذبہ اس وقت وارد ہوتا جب رکن آباد میں بگولے اٹھ رہے ہوتے۔ آندھیاں آ رہی ہوتیں۔ سموم کے جھکڑ چل رہے ہوتے تو کیا یقین آ سکتا ہے کہ پھر بھی حافظ ایسا ہی شگفتہ شعر کہہ ڈالتے؟

اب تمثیل کو چھوڑیئے بحث طولانی ہوتی ہے واقعات پر غور کیجئے۔ یہ دونوں مقالے لکھے گئے لاہور کی ایسی فضا میں۔ آیئے لاہور کے مواد کو دیکھئے اور غور کیجئے کہ جس جگہ کئی ہزار کی لاگت کا بنا ہوا حدیقۂ حیوانات موجود ہو اور جہاں کئی سنو بہائم دن رات بہیمیت کی ایتھری لہریں خارج کر رہے ہوں اور جس جگہ (خدا آباد

رکھے) ایک عدد پنجاب کا مایۂ ناز پاگل خانہ ہو جہاں کئی ہزار پاگل دن رات "سوداویت" کے جراثیم خارج کررہے ہوں۔ وہاں کی فضا میں بیٹھ کر مضمون نگاری کرنا۔ رکن آباد جیسے مضامین پیش کریگا۔ یا وادئ نجد کے سے؟ جناب والا اس قدر پرزور استدلال اور حجت بالغہ کے ساتھ جو یہ مسئلہ حل کیا گیا تو کیا یہ لفاظی ہے؟ اگر ایسا خیال ہے تو آیئے پھر ان مضامین کا مشاہدہ کریجئے۔ مقالہ نمبر ۱ یعنی انقلاب جی لاہور بھائی والے مقالے کو لیجئے۔ اور "صورت بہ بیں حالش مپرس" عنوان خود شاہد ہے کہ یہ مقالہ "افکار وحوادث" کے چکر سے تنگ آکر ایک "مزارِ غریباں" والی گمنام ہستی نے حوالۂ قلم کیا ہے۔ آہ کیسا "مزار غریب" اور کیسی گمنامی جب پر نہ لوح نہ کتبہ کہ قبرستان کے گذرنے والے فاتحہ مرقدِ ویران پر بھی پڑھتے جائیں۔ ایسے ہی مزاروں کی شان میں کسی نے کہا ہے ع بر مزارِ ما غریباں نے چراغ نے گلے۔ کچہری عدالت کے کاغذات میں ایسا تو دیکھا گیا ہوگا کہ مسمی فلاں ولد نا معلوم کی طرف سے دعویٰ دائر ہوکر مقبول ہوگیا ہو مگر واللہ آپنے کبھی ایسا عجیب قسم کا دعویٰ نہ دیکھا ہوگا جس میں مدعی بھی نا معلوم اور ولدیت بھی نہ معلوم اور پھر حوصلہ ہے اور ہوس ہے کہ ہمارا دعویٰ مقبول ہوجائے — افکار وحوادث کے اثر سے جو کچھ نہ ہو جائے کم ہے۔ تاج صاحب کی مرفع حالی ان کے لئے باعث صد تشکر ہے کہ ایسے ایسے گمنام قصیدہ خواں۔ افکار وحوادث سے تنگ آکر اُن کی تعریف میں رطب اللسان ہی نہیں بلکہ دوسروں سے لڑنے مرنے کو آمادہ ہیں۔ اب بھی اگر اس گمنام ہستی کے افکار وحوادث دور ہوں تو از راہِ ہمدردی میری صلاح ہے کہ ہر روز جبکہ علی الصباح چو مردم بکار رو بار روند۔ بلاکشانِ محبت بکوئے یار روند۔ مقالہ نویس صاحب درِ جاناں پر حاضری دیں اور ایک فلک شگاف آہ کے ساتھ یہ شعر پڑھ لیا کریں ؎

وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے | جس سحر سے سفینہ رواں ہو سراب میں

غالباً کہہ دیا جائیگا کہ یہ مقالہ ایڈیٹر صاحب کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے اس لئے نام محذوف ہے۔ آیئے دوسرے مقالے کو ملاحظہ کیجئے۔ بہیمیت خود فراموشی اور سوداویت کے آثار اس میں بھی بدرجہ اتم موجود ہیں انقلاب جی لاہور بھائی نے خیر ایسا واہی تباہی مقالہ شائع کردیا اور نہ کرتے تو اور کیا کرتے۔ روزنامہ کا پیٹ بھرنا آسان کام نہیں۔ ہمیں حیرت ہے تو حکیم جی پر کہ اُنہوں نے بھی لاہوری نمک کو نہ جانچا نہ چکھا بلکہ آنکھیں بند کرکے فوراً اپنے "طبلۂ عطاری" میں داخل کرلیا۔ آہ وہ نیرنگِ خیال جو اپنی اختراع فائقہ کی دن رات تانیں الاپتا ہے جو تصاویر اور کارٹونوں کے ذریعہ اپنے آپکو کثیر الاشاعت ثابت کرتا ہے کیا اب ایسی آخور کی بھرتی ہوجائیگا کہ جس میں بے سروپا مضامین درج ہونگے۔ مگر حکیم جی بیچارے کیا کریں وہ بھی مجبور ہیں ان بہیمیت کی ابتھری لہروں سے جو حدیقۂ حیوانات سے نکل رہی ہیں اور مجبور ہیں سوداویت کے اُن جراثیم سے جو پاگل خانہ سے آرہے ہیں۔

یہ مقالہ نیازمندانِ لاہور کی طرف سے ہے اور غالباً پہلی قسط ہے اس سلسلہ کی جو آئندہ فدویانِ لاہور

خاکساران لاہور۔ بے چارگانِ لاہور۔ بلاکشانِ لاہور۔ مخبوط الحواسانِ لاہور۔ وغیرہ کی طرف سے شائع ہونگے، دیدہ باید۔ ایک مقالہ تازہ آئیگا ایک جائیگا۔ مارا چہ ازیں قصّہ کہ گاؤ آمد و خر رفت۔

سب سے زیادہ عجیب مخالفت بھیانہ خود فراموشی اور سوداویت کی مثال اس مقالہ میں یہ ہے کہ نیازمندانِ لاہور کی طرف سے یہ مقالہ شروع ہوکر اسی پاک نام یعنی نیازمندانِ لاہور پر ختم ہوتا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ ستواری بھائیوں کی ایک گرانقدر جماعت نے مجتمع مساعی اور متفقہ دماغ سے اُسکو مرتب کیا۔ مگر آہ یہ کیسی تعجب انگیز بات ہے کہ ان حضرات کی قوتِ باصرہ متفق نہ ہوسکی اور نہ اُس کی نظرِ ثانی کی شاید ساتھ یوں پیش آیا کہ جب یہ مقالہ لکھا گیا ہے تو سب حضرات تاج صاحب کے ہاں یا کسی جگہ یکجا ہوکر بیٹھے ایک صاحب لکھتے رہے اور باقی حضرات طبع آزمائیاں کرتے رہے بندشیں ہوتی رہیں، اور پھر اکثر ایسا ہی ہوگیا ہے کہ لکھنے والا نیازمند بیچارا اکیلا رہ گیا اور باقی حضرات عندالضرورت پاخانہ پیشاب کے لئے چلے گئے اور پھر سب جمع ہوگئے عبارت صاف بتا رہی ہے کہ کہیں نیازمندان جمع متکلم کی شان سے ہیں تو دوسری جگہ اکیلا نیازمند واحد متکلم کی صورت میں جلوہ گر۔ سبحان اللہ کیا طرزِ نگارش ہے، ملاحظہ ہوں جملے صفحہ ۴۴ نیرنگِ خیال فروری ۱۹۳۳ء تیسرا پیراگراف ..... "جب ہم نے یہ الفاظ پڑھے ....." اس کے بعد ہی ملاحظہ ہو صفحہ ۴۶ دوسرا پیراگراف۔ ان ہی مثالوں سے میں قارئین کو اس بات کا یقین دلانا چاہتا ہوں کہ یہ سمجھئے کہ یہ کتابت کی غلطی ہے۔ مگر اہلِ نظر سمجھ جائینگے کہ اس قسم کی کتابت کی اغلاط بھی محیّر العقول ہیں کہ یوں تو سارا جملہ صحیح ہو مگر عبارت کے سیاق کے مطابق نہ ہو اور پھر اس پر لطف یہ کہ تواردِ موجود ہے، ملاحظہ ہو صفحہ ۵۱ پیراگراف نمبر ۳۔ دیکھا آپ نے اس بہیمیت زدہ اور سوداویت خوردہ فضا کا اثر۔ تو جناب اس بحث اور مشاہدہ سے اچھی طرح سمجھ میں آگیا کہ جس ماحول میں یہ مقالہ جات لکھے گئے وہ بہیمیت اور سوداویت سے خالی نہیں، پھر جب یہ بات ہے تو صاف ظاہر ہے کہ اس میں جو کچھ گندگی نہ اُچھلی ہو وہ کم ہے۔ ایک اہلِ نظر کیواسطے تو صرف اس بحث کے بعد ہی یہ تمام کا غذات جو آٹھ نو صفحوں کے حجم میں ہیں یا تو صرف حکیم جی کے دواخانے میں پڑیا باندھنے کے قابل ہیں یا پھر حجّام بہتر کے حوالے کر دیئے جائیں کہ وہ غسل خانہ کے کام میں لائے۔ مگر مجھ علامہ مضحک نے ہمیشہ بھولوں کو گھر تک پہنچانے کی نیک خدمت ذمہ لی ہے اس لئے ان مدعیانِ ادب کی انشاء کے "مشتے از خروارے" نمونہ بھی پیش کردئے جائیں تاکہ قارئین کرام کو معلوم ہوجائے کہ لاہور کی اس "تتی والیاں دی ہٹی" میں اردو علم ادب کی کہاں تک کم یابی ہے اور جو کچھ ہے بھی وہ جنس کاسد ہے

حسنِ فروغِ شمعِ سخن دور ہے اسدؔ　　پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

آیئے پہلے انقلاب بھائی لاہور جی کے مقالے کو لے لیجئے۔ اور انشاء پردازی کی مندرجہ ذیل صنائع ملاحظہ کرتے جایئے۔

(۱) انشاء کی اغلاط۔ ”دہلی میں ایک ادبی رسالہ ساقی کے نام سے جاری ہے“۔ اس جملہ میں لفظ میں کس قدر برمحل ہے۔ یہ غالباً ”وہج کا“ کا ترجمہ ہے۔ مضمون نگار غریب کو یہ بھی نہیں معلوم کہ کوئی رسالہ کسی مخصوص چھاپہ خانہ میں شائع ہوتا ہے اور اپنی مخصوص دارالاشاعت سے جاری ہوتا ہے۔ رسالہ کسی شہر میں جاری نہیں ہوتا بلکہ شہر سے جاری ہوتا ہے۔ جناب۔

”خرگین کی بھرتی“۔ یہ خرگین کا عجیب الہیت لفظ نہ معلوم کس زبان سے تعلق رکھتا ہے۔ کیا یہ اسکنجبین شکنجبین کے قسم کا لفظ ہے؟ مگر وہ تو بامعنی لفظ ہیں۔ خرگین میں خر کا لفظ ہی گواہ ہے کہ یہ قلم کی خرمستی کا نتیجہ ہے اور بس۔ ایک لفظ ”خوگیر“ میں نے بھی سنا ہے جن معنوں خرگین استعمال کیا گیا ہے اس سے ظاہر ہے کہ قابل مضمون نگار کے ”خرک انگ“ تخیل نے چلتے چلتے ٹھوکر کھائی یا ہانکنے والے نے پیچھے سے ایک ڈنڈا رسید کیا اس لئے گھبرا کر ”خوگیر“ کا خرگین ہو گیا۔ یہ لفظ سند کا محتاج ہے۔ اور اگر بے سند ایجاد بندہ اگرچہ گندہ ہے تو جناب یہ ”بھرتی“ آپ ہی پر لدی رہ جاتی ہے۔

”لیکن اہل نظر کو لسکے اندر ایک ”ضعیف و ناتواں جنازہ رواں“ ناکام شاعر ناکام ڈرامالسٹ اور ناکام اخبار نویس کا چہرہ صاف جھلکتا نظر آ رہا ہے“۔ ترکیب کے اعتبار سے یہ ٹھونس ٹھانس اور بھرتی مشتمل ہے دو جملوں پر۔ پہلا جملہ ”لیکن“ سے ”رواں“ تک، دوسرا ”ناکام“ سے ”بیکر آ رہا ہے“۔ آخر الذکر جملہ کی ترکیب تو مکمل ہے مگر یہ سمجھ میں نہ آیا کہ مخلص صاحب نے تنقید کی ڈرامے پر اور وہ ناپسند ہے تو مخلص ناکام ڈرامالسٹ سہی مگر وہ ”ناکام شاعر“ کس حیثیت سے ہیں؟ اچھا اگر تاویل ابعید سے اور صرف آپ کی ادبی لاج رکھنے کے لئے تاج صاحب کا ڈرامہ شعر منثور مان لیا جائے تو خیر ”ناکام شاعر“ بھی چسپاں ہو جاتا ہے مگر اخبار نویس کا چہرہ کہاں دکھائی دیا؟ اسکو کہتے ہیں ”افکار و حوادث“۔ یہ تو دوسرے جملے کا حشر ہوا جو مکمل سا ہے۔ اب پہلے جملے کو لیجئے اور خدارا بتایئے کہ اس میں کوئی فعل یا ربط ایسا استعمال کیا گیا ہے جس سے بیچارے ”جنازۂ رواں“ کی بھی اوّل منزل ہو جائے اور ننو فاقوں کے بعد حاصل کی ہوئی یہ ترکیب ٹھکانے لگ جائے۔ قابل مضمون نگار اگر اس جملہ میں کوئی فعل استعمال نہ کرینگے اور اپنے قلم کی اس بدفعلی سے خوش ہونگے تو حضرات یہ اُن کا ”ضعیف و ناتواں جنازۂ رواں“ بے گور کفن ہی رہ جائیگا۔ لگے ہاتھوں ”جنازہ“ کے لئے ضعیف و ناتواں۔ کسقدر برجستہ صفات ہیں گویا لاہور میں ”قوی“ قسم کے جنازے بھی ہوتے ہیں۔ اس کے بعد ”رواں“ کی صفت اور بھی پُرمعنی ہے۔ جنازہ نہ ہوا ریل اور موٹر ہو گیا۔ اماں کیا تعجب ہے جو اس ہیبت زدہ اور سوداویت خوردہ فضا میں جنازے۔ خنداں و گریاں۔ دواں و پرّان بھی ہوتے ہوں۔ عجب ثم عجب۔

”بھنگیائے ہوئے“۔ دیکھا بھائی پنچوں قابل ادیب کی الفاظ ڈھالنے کی قوت! یہ بات تو ٹاٹا آئرن کمپنی کو بھی نصیب نہیں۔ ”بھنگ پینا“ سے بھنگیانا۔ بقول قابل ادیب اُنہوں نے تراکیب اور الفاظ

کی ژولیدگی سے بچنے کے لئے کیسا حسین و جمیل لفظ ڈھالا ہے۔ اب اسی معیار پر آپ کو اختیار ہے کہ کوئی صاحب کھانا کھائے ہوئے ہوں تو آپ اُن کو "کھنیائے ہوئے" اور اگر پانی پئے ہوئے ہوں تو "پنیائے ہوئے" کہہ سکتے ہیں۔ اس ژولیدگی سے بچنے کے لئے ہر ایک اسم سے اسی طرح فعل مرتب کر سکتے ہیں۔ یہ "انقلاب بھائی لاہورجی" کا ایک کارنامہ آب زر سے لکھنے کے لائق ہے۔ اور ایک ادبی خدمت ہے جو ہر طرح کے خراج تحسین کی مستحق ہے۔

اُردو کی لغات مرتب کرنے والے اصحاب اس سے فائدہ اُٹھائیں۔ دیکھا آپ نے اس قابلیت پر پھر یہ ادعائے ادب کہ دہلی والوں کے پاس رکھا ہی کیا ہے سوائے چند محاوروں کے۔ قابل مضمون نگار کو معلوم ہونا چاہئے کہ یہ ہی چند الفاظ اور محاورے کسی "علم ادب" کی جان اور اس کی شان ہوا کرتے ہیں جو بدقسمتی سے آپ کو میسّر نہیں اور نہ یہ معاندانہ اور متعصبانہ جذبات آپ کو سیکھنے دیں۔

طوالت کے خیال سے اس مضمون کا مزید تجزیہ فضول ہے جب چند سطور میں اغلاط انشاء کا یہ حال تو آگے چل کر سوائے "لاحول" کے اور کیا دھرا ہے۔

اب ذرا حقائق۔ واقعہ نگاری۔ تہذیب و شائستگی کے میدان میں بھی اس اہل نظر کو دیکھ لیجئے اور کچھ نہیں تو ثواب ہی ہوگا۔

ایک جگہ رقمطراز ہیں "خدا جانے راقم صاحب اب بھی بھنگ پیتے ہیں یا نہیں آج سے چند سال پہلے تو پیتے تھے"۔ اس جملہ کی تہذیب و شائستگی تو "تہذیب کا ریگران معاف" کہکر برطرف کر دیجئے، ذرا حقائق پر نظر ڈالئے اور دیکھئے کہ اس سے زیادہ "مہمل نگاری" بھی دُنیا میں کہیں ہوگی۔ ایک طرف تو اس مایۂ ناز ادیب کو مخلص صاحب کی نقاب میں صرف ناکام......... چہرہ نظر آتا ہے۔ ابھی نام معلوم کرنے کی آرزو باقی ہے۔ ادھر تمدّن اور واقف کاری کا یہ زور ہے کہ مخلص صاحب کو اپنی بھنگڑ سوسائٹی کا شریک کار سمجھتے ہیں اور اس وارفتگی اور زور کے ساتھ چند سال قبل کے واقعات بیان کرتے ہیں گویا مخلص صاحب ان کے ساتھ بیٹھ کر پی پلا چکے ہیں۔ اللہ رے حقائق نگاری اور فنِ مزاح نگاری! جو جی چاہا لکھ دیا اور سمجھ لیا کہ ہم کامیاب ہیں۔ بِل شیرا۔!!!

فرماتے ہیں "مخلص کے نقاب سے اپنا چہرہ چھپانا چاہا ہے لیکن اہل نظر کو اس کے اندر...... نظر آرہا ہے۔" اللہ رے جادو نظری اور اللہ رے زور نظر۔ فرمایئے ایسے اہلِ نظر کے سامنے جس کو مستور چیزیں دکھائی دیتی ہوں اس کے سامنے لاہور والوں کے ستر کا خدا حافظ۔ الحذر الحذر۔ دیکھا آپ نے حقائق کے میدان میں یہ زور قلم۔ کہ آگے پیچھے کی کچھ خبر نہیں۔

یہ ہوا انقلاب بھائی لاہورجی کے صرف چند سطور کا لب لُباب۔ اس سے نتیجہ اخذ کر لینا آسان اور رائے قائم کرنا سہل ہے کہ یہ پنجاب کا مایۂ ناز ادیب کہاں تک صفِ ادب میں جگہ پانے اور "باب تنقید" میں منقار سنائی کرنے کا اہل ہو سکتا ہے۔

اب تھوڑی دیر کے لئے "زمین شور" کے اس نمکداں کو دیکھئے جس کو میں "تتنی والیاں دی ہٹی" کہہ چکا ہوں اور ان نمک پاروں پر غور کیجئے جن کو ہمارے حکیم جی نے رکھ لیا ہے نظر گذر کے لئے سمجھ کر "طبلہ عطاری" میں رکھ لیا۔ جناب والا اس سرکاری عملداری میں دو شخص اگر آپس میں دست و گریباں ہو جائیں تو فوجداری میں چالان ہو جاتا ہے اور اگر ایسا ہی جُرم پانچ یا پانچ سے زیادہ آدمیوں سے سرزد ہو تو بلوہ ہوتا ہے جس کی سزا اس سے زیادہ سخت۔ مطلب یہ ہے کہ کسی ایک جُرم کی اہمیت مجرموں کی قلّت اور کثرت پر بھی منحصر ہوتی ہے۔ مقالہ "زیر نظر" شلواری بھائیوں کی لاتعداد جماعت کی متفقہ کاوش کا نتیجہ ہے اس لئے اُس کی ادبی اور اخلاقی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ یقین جانیئے کہ اس ادبی شاہکار میں ایک ایک لفظ اور ایک ایک نقطہ کی اغلاط بھی بڑی سنگین اور قابلِ معافی نہیں۔ آیئے ذرا شائستگی کلام اور انشاء پردازی کے میدان میں اس "تتنی والیاں دی ہٹی" کے مال کو دیکھ لیجئے اور معلوم کیجئے کہ یہ مال مقبول ہے یا جنس کاسد۔

یہ مقالہ شروع ہوتا ہے مخلص صاحب کی "بدگوئی" کے بیان میں اب اس سے ایک قاری کو خیال پیدا ہوتا ہے کہ "نیاز مندانِ لاہور" نام ہے ایک ایسی جماعت کا جو لاہور کی شائستگی۔ تہذیب۔ ادبی و علمی قابلیت کا اعلیٰ ترین نمونہ ہوگی۔ اور چونکہ اس مقتدر جماعت نے سب سے پہلے مخلص صاحب کی بدگوئی پر باز پُرس شروع کی ہے۔ اس لئے خود اس صنف سے کلّی احتراز کرنا ان پر لازم ——— "آنچہ بر خود نہ پسندی بہ دیگران مپسند"۔ مگر اس معاملہ میں بھی آپکی نگاہ ناکامیاب اور مایوسی مجسّم ہو کر رہ جائیگی۔ آپ دیکھینگے کہ بیچارے مخلص صاحب کو صرف بدہضمی ہوئی تھی، اس برگزیدہ جماعت کو اسہال جاری ہو گئے اور تمام شائستگی۔ تہذیب اور آدابِ تحریر اسی گندگی میں لتھڑ کر رہ گئے۔ ایک جملہ ملاحظہ ہو۔ مخلص صاحب کو بدہضمی کی شکایت لاحق ہو گئی چنانچہ اُن کی بے قرار روح سے طرح طرح کی کریہہ آوازیں نکلتی ہیں۔ تہذیب اور شائستگی کلام کے علاوہ اس جُملہ میں اور بھی ادبی جواہر ریزے موجود ہیں "شکایت لاحق ہونا" دیکھا آپ نے اس حسین لالہ شاہی اُردو کو۔ "بدہضمی کی شکایت ہونا" سیدھا سادا اور سلیس جملہ ناکافی تھا ادھر اپنی قابلیت کا اظہار بھی ناگزیر تھا اس لئے "لاحق" کا لفظ باوجود تمام "زود نذ" کے بھی استعمال کر ڈالا۔ اس تعلیم یافتہ طبقہ کی یہ "بے محابہ نگاری" اور اس کاروانِ ادب کی یہ بے محاری قابل داد ہے چلتے چلاتے ایک اور حکیمانہ پہلو پر نظر کیجئے گا۔ بدہضمی کی شکایت سے روح کا بے قرار ہونا اور پھر اس روح سے طرح طرح کی کریہہ آوازوں کا نکلنا۔ سبحان اللہ کیسے حسین و جمیل تلازمہ ہیں۔ سب سے زیادہ حکمت اس تلازمہ کی روح کو آواز کا مخرج بنانا ہے۔ اس جُملہ سے حکیم صاحب ایڈیٹر نیرنگِ خیال کی حکمت کا بھی پتہ چلتا ہے لیجئے اب ایک اور نادر نکتہ اس جملہ سے ہاتھ آیا۔ آئندہ سے اگر کوئی "کریہہ الصوت" گوّیا یا مقرر آپ کے سامنے الاپے یا تقریر کرے تو کہہ سکتے ہیں۔ فلاں گوّیا بڑی بے سُری روح کا انسان ہے فلاں لکچرار کی روح بڑی بھونڈی ہے۔ کیونکہ آواز کا مخرج روح ہے۔ اِسلیئے گلے کی بجائے روح استعمال ہوگا۔

صحیح ہے تو پھر معلوم نہیں آواز کا سبب کیا ہے ممکن ہے پس ماندگانِ لاہور آئندہ مقالہ لکھنے تک یہ عقدہ بھی حل کرلیں اور اس پر روشنی ڈالیں۔ زبان بگڑی تو بگڑی تھی اب داغ بھی بگڑ گیا۔ ارحم یا ارحم الراحمین۔ اور ایک جملہ ملاحظہ ہو" کام کی بات کہنا سیکھ گئے ہوں " بات کرنا محاورہ ہے اور بات کہنا دیہاتی زبان ہے۔ بچّہ باتیں کرنی سیکھتا ہے۔ باتیں کہنی نہیں سیکھتا۔ چنانچہ کہاجاتا ہے کہ فلاں بچّہ باتیں کرنی سیکھ گیا۔ اللہ ان "نیازمندانِ لاہور" کے معاندانہ جذبات کو دور کرے۔ کاش یہ ہم سے اور نہیں تو باتیں ہی کرنی سیکھ لیں۔ اُردو علم ادب اور زباندانی تو بہت دُور ہے اپنے صوبہ کی جُداگانہ زبان رکھ کر پھر اُردو دانی کے مزعومات ایسی ہی اغلاط پیدا کرتے ہیں۔ پنجابی ہوکر اگر اُردو زبان کا دعویٰ کیجئے گا تو جناب یہ ہی گت ہوگی۔ ایک نیازمند لاہور ہو یا لاتعداد نیازمندانِ لاہور جو کچھ بھی لکھیںگے "زبان" کے اعتبار سے وہ "مہملات" کا بحرِ بے پایاں ہوگا——

اور ایک جملہ ملاحظہ ہو——"یوں تو اہلِ زباں کی "پت جھڑ" شروع ہوکر ختم بھی ہونے کو آئی"۔

آہ افسوس شلواری بھائیوں کو ابھی تک "نظامِ عالم" اور موسم کے تغیّر کا بھی پتہ نہیں کیسی کم بضاعتی کی بات ہے کہ انکو آج تک یہ نہیں معلوم کہ ہر خزاں کے بعد بہار اور ہر بہار کے بعد خزاں ہوتی ہے۔ ادھر پت جھڑ ختم ہوئی اُدھر پھر کونپلیں پھوٹیں۔ اب کرتے رہیئے سینہ کوبی اس نظامِ عالم پر۔ یہاں تو آپ کی "پت جھڑ" پر اللہ میاں نے ہم اہلِ زبانوں کو یہ توفیق دیدی ؂

زندگی ہے تو خزاں کے بھی گذر جائینگے دن ٭ فصلِ گُل اگلے برس زندوں کو پھر آئینگے دن

اِس پھوہڑپن کو کوئی کیا کرے کہ ناک سِنکی اور تہنی سے پونچھ لی۔ جب تک زبان کا درخت آپکا دل جلانے کے لئے زندہ ہے تو محض پت جھڑ سے اہلِ زبان کی مستقل بربادی اور فنا کی صورت نہیں پیدا ہوتی۔ ہاں اگر آپ کو انشا پردازی کا سلیقہ ہوتا اور آپ اس درخت ہی کو حوادث کی نظر کر دیتے تو کام کی بات ہوتی اور سب اہلِ زبان بہ یک وقت فنا ہوجاتے۔ ورنہ جتنے ایک پت جھڑ میں گرجائینگے اتنے بہار میں نکل آئینگے اور وہی شادابی ہوگی۔

اور جملہ ملاحظہ ہو——"اور زبان کو ہانکتے ہانکتے ادب کی دُم میں بھی نمدہ باندھ گئے"...... واللہ جملہ کیا ہے گویا "ادب" کا لاہوری "فالودہ" اور زباندانی کی "لسّی" ہے۔ جس طرح تانگہ ہانکی جاتی ہے اسی طرح شلواری بھائیوں کے نزدیک زبان بھی ہانکی جاتی ہے۔ مگر اس لفظ "گو" نے تو اس جُملہ کو "نانواں جنازہ" سے "قوی ہیکل جنازہ" بنادیا۔ یہ ہوئی پوری پوری تانگے والوں کی زبان۔ اور کیوں نہ ہو لاہور کا تانگہ دُور دُور مشہور ہے ہمارے ہاں بھی "تہ بند" اور "شلوار پوش" تانگے والوں کی ارزانی ہے اور بازار بازار "ہٹ اگوں پایاں" اور "بیچ موڑ توں" کی آوازیں آتی ہیں پھر اس زبان کی توفیق ہمارے شلواری بھائیوں کو نہ ہوتی تو کیا حضرات دہلی اور لکھنؤ کو ہوتی۔ آگے چل کر "دُم میں...... نمدا باندھ گئے" نے تو تانگہ بازی کا تلازمہ تکمیل کو پہنچادیا

مخلص صاحب پر تو الزام ہے کہ اُن کا ظرف ایک چلو کے برابر بھی نہیں جو ڈوب مرتے، یہاں ہر ایک شلواری بھائی کا ظرف بقدر "پنج آب" ہے اور پھر یہ حالت ہے کہ انشاء پردازی ہے تو عامیانہ رنگ کی محاورات استعمال ہو رہے ہیں تو مہمل اور غلط۔ لایئے انکو یہ محاورہ سمجھا دوں اور ان کی اصلاح کر دوں۔ دہلی کی عامیانہ زبان میں دو محاورے استعمال ہوتے ہیں، ایک دُم میں دھاگا یا دُم میں نمدہ باندھنا دوسرا نمدہ کسنا۔ اور دونوں کے محل و موقعہ اور معنی مختلف ہیں۔ "دُم میں نمدہ باندھنا" سے مطلب ہے شکست دینا اور بھگا دینا۔ "نمدہ کسنا" سے مطلب ہے سواری کرنا۔ حاوی ہونا۔ کسی چیز پر عبور ہونا۔ نمدہ زین سواری میں زین کے نیچے استعمال ہوتا ہے۔ جب کوئی شخص سواری سیکھتا ہے تو ابتدا میں رکاب نہیں استعمال ہوتی بلکہ "نمدہ" کسا جاتا ہے تاکہ سوار "آسن" قائم کرنا سیکھ جائے، اُس کے بعد زین کی سواری کی جاتی ہے۔ اب اسی تشریح کی روشنی میں شلواری بھائیوں کے محاورے کو دیکھ لیجئے معلوم ہو جائیگا کہ محاورہ عامیانہ ہی نہیں بلکہ بڑی ہوناکی کے ساتھ غلط بھی استعمال ہوا ہے۔ اسکو کہتے ہیں "اناڑی کی بندوق"۔۔۔ آہ کس قدر المناک ہے ان (لاتعداد) نیازمندوں کی ادبی فرمائیگی ایک طرف اہلِ دہلی کے چند محاروں اور الفاظ پر طعنہ زنی ہے دوسری طرف ان ہی کے محاورے استعمال کئے جا رہے ہیں مگر غلط۔ ایک سارق مالِ مسروقہ کی قدر کیا جانے۔ لایئے ان ضرورت مندوں کی خاطر یہ جُملہ صحیح بھی کر دیا جائے کیونکہ کسی کی ضرورت کو پورا کرنا بھی ثواب ہے۔ صحیح جملہ یوں ہوا "یا یاں! زبان کی بڑ ہانکتے ہانکتے ادب پر بھی نمدہ کس چکے"

اور ایک جملہ ملاحظہ ہو۔۔۔ "مخلص صاحب کے دار المطالعہ کے دروازے پر دستک دیں اور وہ جھروکے سے جو جھانکیں"! اِس جملہ میں دو نکات ہیں۔ پہلا "علم تعمیرات" کا دوسرا انشار کا۔۔۔ دیکھا آپنے شلواری بھائیوں کو ابتک یہ علم نہیں کہ "جھرکا" کس کو کہتے ہیں اور وہ کس قسم کی عمارتوں میں ہوتا ہے اور علم بھی کیسے ہو۔ بقول شخصیکہ۔ "رہیں جھونپڑوں میں اور خواب دیکھیں محلوں کا"۔ جھرو کا محلات اور بارہ دریوں میں ہوتے تھے۔ دار المطالعہ میں اُن کا وجود کہاں؟ خدا بھلا کرے نادانی کا چونکہ جواب لکھنے میں غیر معمولی تسامح اور شوخیٔ قلم دکھانا منظور ہے اس لئے بے تحاشہ لکد کوبی شروع کر دی، الفاظ کے محلِ استعمال اور صحت معنی سے کیا مطلب۔ انشار کا نکتہ لفظ "جو" سے ظاہر ہے، اس کا لطف قارئین کو اُسی وقت آسکتا ہے جب تنہائی میں بیٹھ کر لحن کے ساتھ اس جملہ کی تکرار کرتے رہیں۔ اور دعا مانگتے رہیں کہ یا اللہ اس لفظ "جو" کا کیا موقع و محل ہے۔ کیا مفہوم ہے؟ اگر یہ اسمِ ضمیر ہے تو اُس کا مُرجع "کدھر ہے۔ اگر صرف بقول شلواری بھائیوں کے محض جملہ کے تیور بدلنے کے لئے استعمال ہوا ہے تو پھر اس کی ترکیب نحوی کیا ہوگی "یعنی" در شلوار"۔

اور ایک جملہ ملاحظہ کیجئے ....... "ہم جاہلوں کے فائدے کے لئے کر رکھّی ہے "مس رحمو جان" "مس اللہ رکھی" کے نام اور ریکارڈ تو ہم نے سُنے "یہ مس کر رکھّی" کوئی اور اسی سر زمین کی پیداوار ہے۔ شلواری بھائیوں نے آخر "کر چھوڑی" کا ترجمہ کر ہی ڈالا۔ کیوں نہو لاکھ "اردو" کو مانگ تانگ کر اپنا کشکول ادبی بھرا ہو مگر حسن زبان

اہلِ زبان سے ساتھ لائے ہیں اُس کی بُو باس کہاں جا سکتی ہے۔

اور ایک جملہ ملاحظہ ہو "ڈرامہ پر کوئی کتاب لے کر پڑھ لی تھی" ذرا غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہ جملہ پورا پورا انگریزی ساخت کا ہے اور ترجمہ ہے ( A book on Drama ) کا جن عجیب الدیار ادیبوں کو صحیح اُردو لکھنی آتی ہو ان کی طرف سے تنقید کا جواب شائع ہوتا اگر بوالعجبی نہیں تو اور کیا ہے۔

اور ایک جملہ ملاحظہ ہو "علم سیکھنے لگ گئے" ملاحظہ کیجئے اس فعل لگ گئے کو "جو لگنا" سے پنجابی فلک لگا کر بنایا گیا ہے۔

اور ایک جملہ ملاحظہ ہو "کمزوری یا بے راہ روی"...... اس "بے راہ" کو نوٹ کر لیجئے یہ "جو راہ" کا سگا بھائی ہے۔ داشتہ آید بکار۔ بے رہ روی سے یوں ہی مٹی پلید ہوتی ہے۔ ۱

اور ایک جملہ ملاحظہ ہو "تو مبادیاتِ ڈرامہ کے متعلق" پھر کہہ سکیگا کہ شلواری بھائی صرف و نحو بھی جانتے ہیں اُنہوں نے اُردو زبان باقاعدہ "ادب" کی حیثیت سے پڑھی ہے۔ اور یہ حضرات علمی حیثیت سے یہ فرو مایہ۔ بے بضاعت نہیں ہیں "مبادیاتِ ڈرامہ" کی ترکیب سمجھ لیجئے۔ انگریزی اور عربی الفاظ کے درمیان اضافت جائز ہے۔ آہ آہ۔ غریبوں کو "تمثیل" کا لفظ استاد نے نہ سکھایا آئیں اور ایک اہل زبان دھلوی سے سیکھ لیں۔

اور ایک جملہ ملاحظہ ہو "وہ چیز جسے انگریزی میں ( Atmospara ) کہتے ہیں" یاد رکھئے یہ لفظ کہیں ہوئے ہوسے (Atmosphere) نہ سمجھ لیجئے گا۔ غلط لفظ لکھ دینے کے بعد جو طنزیہ ہدایت جس کے متعلق مخلص صاحب کو کی ہے وہ اور دقیع اور قابل قدر ہو جاتی ہے۔

کس قدر المناک مایوسی ہوگی ان شلواری بھائیوں کو جنہوں نے اپنے زعمِ ناقص میں انگریزی قابلیت کا اظہار کیا مگر اپنے داؤں سے خود ہی چت ہو گئے۔ کاش نادان انگریزی نہ بگھارتے اپنا لفظ "فضا" ہی لکھ دیتے۔ یا "ماحول" جو انہی معنوں میں مستعمل ہے۔

اور ایک جملہ ملاحظہ ہو "بذریعہ تحریر میں سو میل کے فاصلہ" لفظ "میں" پر غور کیجئے اور خدارا بتلائیے ہے وہ وہی "شب لیلۃ القدر کی رات" والی بے مثل ترکیب۔

اور ایک جملہ ملاحظہ ہو "جو لوگ پرانی وضع کے ہندوستانی کھیلوں"...... ڈرامہ کا ترجمہ اس جگہ "کھیل" بھی بہت اچھا ہے۔ اس جگہ بھی زعمِ خوردہ ادیبوں کو "تمثیل" نہ یاد آیا۔ اگر ہندی میں ترجمہ کرنا تھا تو یہ فرمائیے ادیبہ "ناٹک" لکھتے۔ اب معلوم نہیں ( Sports ) کا ترجمہ کیا کیا جائیگا۔

اور ایک جملہ ملاحظہ ہو "دوپہر کے بعد ہی ڈھلنے لگ جاتے ہیں" "لگ جاتے ہیں" نوٹ کر لیجئے۔ لاحول ولا قوۃ۔ آپ کہیں گے "اور ایک جملہ ملاحظہ ہو" کا طومار باندھ دیا۔ مگر مجھے عرض کرنا ہے کہ یہ مقالہ بانداز دماغ۔ آنکھیں۔ اور ایک مال گاڑی کے برابر خزانۂ علم و ادب کو "نیازمندانِ لاہور" کی تہ بند

میں باندھ کر پیش کیا گیا ہے اس میں اغلاط کا شائبہ بھی نہ ہونا چاہیئے چہ جائیکہ گندگی اور غلاظت کا یہ حال ہے کہ اگر لاہور بھر کے تمام خاکروب متفقہ قوت کے ساتھ اس مقالہ پر "جاروب کشی" اور آخور کی صفائی کریں اور پھر بالالتزام اس مقالہ کو "پنج آب" میں دھوئیں تب شاید اس لائق ہو کہ کوئی بھلا آدمی اس کو پڑھ سکے ورنہ ـــــ این دفتر بے معنی غرق ...... اولے۔

دونوں مقالوں کے ادبی حقائق و معارف۔ لطائف و نکات۔ انشا پردازی۔ صرف و نحو پر روشنی ڈالنے کے بعد اب کچھ مختصر سی بحث ان مقالہ جات کے "نفس مضمون" پر بھی سن لیجئے تاکہ یہ "کوہ کندن و کاہ برآوردن" والی کاوش بھی عقل و شعور کی روشنی میں آجائے اور اگر شلواری بھائیوں کے جوابات صحیح ہوں تو پھر مخلص صاحب بھی مطلع ہو جائیں۔ اس سلسلہ میں زیادہ کاوش کی ضرورت نہیں، میں دونوں مقالوں پر یکجا روشنی ڈالونگا کیونکہ یہ دونوں مقالے ایک دوسرے کا عکس ہیں اور دونوں ایک ہی جماعت کی خارش دماغ کا نتیجہ ہیں۔

مخلص صاحب کی لمبی چوڑی تنقید میں (جسکے رقبہ کے متعلق ان "بے چارگان ادب" نے اپنی بضاعت کے موافق اور بقدر ظرف بزلہ سنجی اور خوش طبعی کی ہے) ان سبک غواصوں کو صرف تین اعتراض مل سکے ہیں جن کو جواب کے لئے پسند کیا گیا ہے۔ میں بھی اپنی بحث میں ان ہی تینوں جوابوں کو علی الترتیب لونگا۔

پہلا اعتراض مخلص صاحب کا یہ ہے کہ تاج صاحب نے "انار کلی کا ڈرامہ لکھ کر شہنشاہ اکبر کی باعظمت سیرت تباہ کی ہے۔ اس اعتراض کا جواب ۴۶ صفحہ کے نصف سے شروع ہو کر ۴۸ صفحہ پر ختم ہوتا ہے۔ اور اس لمبی چوڑی لایعنی بحث کا مطلب شلواری بھائیوں کی زبان میں یہ ہے "ڈرامہ نویس یا انشا پرداز اس بات کا حق رکھتا ہے کہ کسی تاریخی شخصیت کو جس طرح جی چاہے پیش کرے" ـــــ اللہ اکبر کیا ثنا و صفت ہو سکتی ہے اس عظیم الشان "استحقاق" کی جو نیاز مندان لاہور کے دربار سے ایک ڈرامہ نویس یا انشا پرداز کو عطا ہوا ہے، اس سلسلہ میں زیادہ بحث فضول ہے، بہتر تو یہ ہی ہے کہ اس "حق" کا عملی مظاہرہ کیا جائے اور "نیاز مندان لاہور" کی مدمغ جماعت یا یکے از نیاز مندان لاہور" اسی حق کو آغوش میں لے کر ایک اور تمثیل لکھنے کی زحمت گوارا کریں اور اس تمثیل میں یہ جسارت کریں کہ شاہان برطانیہ میں سے کسی ایک بادشاہ یا شہنشاہ کی سیرت کو اسی طرح تباہ کریں اور جس طرح جی چاہے پیش کریں۔ پھر اگر اس تمثیل کی وقعت رینالڈز (Reynolds) کی مسٹریز آف دی کورٹ آف لندن (Mysteries of the Court of London) سے زیادہ ہو اور تمثیل نگار حضرت خود اس نہتنگ اور ازالہ حیثیت عرفی کی پکڑ دھکڑ سے بچ جائیں تو سہی۔ یعنی جب مسلح پولیس کا ایک دستہ ان کے استقبال کے لئے آئے اور وہ گورنمنٹ عالیہ کے "مہانسر ائے" میں "حبس دوام" کی سیاحت سے بچ جائیں تو البتہ تسلیم کر لیا جا سکتا ہے ورنہ مخلص صاحب کا اعتراض اپنی جگہ اٹل ہے اور نیاز مندان لاہور کا یہ جواب اور اسی سلسلہ میں آئندہ شائع ہونے والے جوابات گیدڑ کے شور بے ہنگام سے زیادہ وقعت

نہیں رکھتے۔

دوسرا اعتراض مخلص صاحب کا تاج صاحب کی طرزِ نگارش میں بے ضرورت لفاظی پر کیا ہے۔ مثلاً "موسم بہار کی دوپہر ظہر کی نماز ادا ہونے ڈیڑھ گھنٹہ ہوچکا ہے۔ ستونوں اور محرابوں کے سایہ طویل ہونے ........" اس پر شلواری بھائیوں نے جو جواب عنایت فرمایا ہے اس کو اور زیادہ غور سے نہیں صرف سرسری نگاہ سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ واقعی "خالی ہانڈی" پر لڑائی کا منظر پیش کیا گیا ہے۔ فقرہ اس بات کا شاہد ہے کہ اس میں دو اوقات کا منظر پیش کیا گیا ہے (دوپہر اور ظہر کی نماز کے بعد) تمثیل میں ضرورت ہے صرف پہر کے وقت کی اسی "وقت" کی طرف اشارہ ہونا چاہیئے تھا۔ موسم بہار اپنے اندر صدہا رعنائیاں رکھتا ہے اور اس دلفریب موسم کے ہر لحہ اور ہر ثانیہ میں جاذبِ نظر مناظر کا بحرِ بیکراں پوشیدہ ہوتا ہے۔ اس لئے ہر اہل نظر فوری موسم بہار کا لفظ پڑھتے ہی بہارستان میں محو خواب ہو جاتا ہے۔ پھر بھلا خارج الذکر مناظر کو پیش کرکے طول بیانی سے کیا حاصل۔ شلواری بھائیوں کا یہ جواب کہ "ظہر" کے لفظ سے ایک مسلمان گھر کی مصروفیت کی طرف ضمناً اشارہ ہے۔" خود زمین بوس ہو جاتا ہے جب تاج صاحب خود اسی فقرے میں یوں بلبلا اٹھتے ہیں۔ "ظہر کی نماز ہوئے ڈیڑھ گھنٹہ ہوچکا ہے۔" لیجئے خود بخود اس جملہ میں وہ تضاد پیدا ہوگیا کہ جس نے دوپہر کی دھوپ کے ان مناظر کو جس میں شلواری بھائی اپنی شلوار سکھانا چاہتے تھے غائب کر دیا۔

اس بیان کو دیکھکر مجھے اپنے محلّے کے پنجابی مولوی کا دلچسپ واقعہ یاد آگیا جو مکتب میں ایک بچے کو یوں پڑھاتے تھے ــــ چ الف زبر چا۔ ق (ک) دبیش قو (کو) دس پیش (کا چو)" یعنی ہجّے درست کئے مگر جب رواں پڑھنے لگے تو وہی ذہنیت اپنے اوپر مستولی کرلی۔ غضب خدا کا سارے فقرے کا تجزیہ کر ڈالا حجّت اور بحث کی مگر انصاف کی باگ ہاتھ میں تھام کر یہ نہ غور کیا کہ فقرے میں جو اجتماع ضدین ہوگیا ہے اس کا کیا علاج۔ تمثیل میں کام تو پڑیگا ظہر کے بھی ڈیڑھ گھنٹے بعد کے وقت سے پھر قاری موسم بہار کی دوپہر کے منظر کو لے کر کیا کریگا۔ یہ دوپہر تو صرف اسی کے کام کی ہوگی جو دوپہر کی پیدائش ہو۔ آگے چل کر سایہ کے طویل ہونے کی بحث حوالۂ قلم کی گئی ہے جو اس مقالے کی روحِ رواں ہے اور جس سے شلواری بھائیوں کی خود فراموشی۔ نادانی اور بے علمی کا پورا پورا اندازہ ہوتا ہے۔

مخلص صاحب کا اعتراض برطرف میں بھی کہتا ہوں کہ "سایہ کا طویل ہونا" ہی سرے سے غلط ہے اور اس کی بجائے سایہ ڈھلنا ہی ہونا چاہیئے ــــ صبح سے شام تک ہر ایک چیز کا سایہ دو وقت طویل ہوتا ہے، ایک چاشت سے لیکر اسوقت تک جب آفتاب نصف النہار پر آئے۔ اور پھر دوسرا اسوقت جب آفتاب نصف النہار سے چل کر گوشۂ مغرب میں پہنچے۔ اوّل الذکر حالت میں سایہ طویل ہوکر مغرب کی طرف جاتا ہے ثانی الذکر حالت میں مشرق کی طرف (ممکن ہے لاہور میں چاشت کا وقت ہی نہ ہوتا ہو اور آفتاب قدم سے اُچک کر نصف النہار پر پہنچ جاتا ہو) اسی اعتبار سے ایک حالت "دن چڑھنا" اور دوسری حالت

دن ڈھلنا" کہلاتی ہے۔ ظہر کے بعد سایہ "ڈھلا" ہوا کہلا یگا۔ طویل کے لفظ سے وہ بات "ہدایت" کی نہیں پیدا ہوتی۔ ایسی پھوہڑ انشا پر یہ "ادعائے سخن" کہ "دھوپ کے متعلق مخلص صاحب کا مشاہدہ صرف بال سفید کرنے کے کام آتا ہے"۔ ممکن ہے یہ صحیح ہو مگر کسی کو کیا علم کہ پنجاب سوپ فیکٹری کی پیداوار سے کاریگری کرنے کے بعد جامۂ ادبی کو دھوپ میں سُکھانے کا مشاہدہ بھی شلواری بھائیوں کو میسّر ہے۔

تیسرا اعتراض زبان کے متعلق بنایا جاتا ہے اسکے دو حصّہ ہیں پہلے حصّہ میں غلط انشار کا استعمال دوسرے حصّہ میں جدید مگر بھونڈی اور بے معنی تراکیب کا ڈھالنا دکھایا گیا ہے۔ غلط انشار کے اعتراض کا جواب دیتے وقت صرف ونحو کے مطالبات "جیسے وچ" ڈال لئے گئے اور زبان کو صرف ونحو کے قیود سے آزاد کرکے ایک نیا مسئلہ جُملے کے تیور بدلنے کا بنا لیا گیا۔ حروف ندا خطاب وغیرہ کے متعلق کُل قواعد جہالت کی چھُری سے ذبح کر ڈالے اور زعمِ خوردہ "زباندان" بن گئے۔ اگر چندے نادانیوں کی یہ ہی حالت رہی تو جان لینا چاہیئے ؎

چھڑکے ہے شبنم آئینۂ برگِ گُل پہ آب      اے عندلیب وقت وداعِ بہار ہے

دوسرے حصّہ میں جدید مگر بھونڈی تراکیب کا تذکرہ ہے۔ زیرِ اعتراض تراکیب چھ ہیں جن کا جواب اس عبارت سے دیا گیا ہے "پختہ حُسن۔ پھیکا آسمان وغیرہ ........ بجا ہے حضور یہ نئی ترکیبیں ہیں ــــ بھُوت وہ جو سر چڑھ کر بولے۔ شلواری بھائی ادعائے زباندانی کے بھُوت کو بہت چھُپاتے رہے مگر آخر وہ سر چڑھ کر بولا۔ "بجا ہے حضور" سے اعتراف شکست ظاہر اس باب میں اب قلم چلانے کی ضرورت نہیں اگر ان خود ساختہ ادیبوں نے ان بھونڈی۔ انمل اور بے جوڑ تراکیب کے حُسن وجمال کی تشریح کی ہوتی تو البتہ اس کا بھی تجزیہ کیا جاتا ــــ تعجب تو بھائی تاجو پر ہے جن کو ان تراکیب کے ایجاد کرتے وقت معمولی سا بھی خیال زباندانی کا نہ آیا ــــ حُسن تو خود ایک ہمہ صفت موصوف مجموعہ کا نام ہے اُس پر اور پختگی کا اضافہ کیا معنی؟ اگر ایسا ہے تو پھر خام حُسن بھی ماننا پڑیگا اور یہ ایسا نادر الوجود جانور ہے جو شاید "تنبی والیاں دی ہٹی" میں دستیاب ہو۔

اِسی طرح "پھیکا آسمان"۔ پھیکا اور تیز صفات کسی رنگ کی ہو سکتی ہیں اِسلئے آسمان سے پہلے "رنگ" کا تذکرہ ضروری ہے اگر صرف "پھیکا آسمان" کہا جائے تو میٹھا اور کڑوا آسمان تلاش کرنا پڑیگا۔ اِن تراکیب میں سب سے زیادہ قابلِ تحسین ترکیب "نقشِ انارکلی" کی ہے جو صرف ونحو کی تمامتر پامالیوں کے بعد ایک گریجویٹ کی قلم سے پھسل پڑی۔ اِسی طرح گرم نیند۔ تپتی نیند اور جھُلستی نیند۔ کی تراکیب ہیں جو ظاہر کرتی ہیں کہ قابل تمثیل نگار نے "نیند" کے حکیمانہ پہلوؤں کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ اور اِس عدیم المثال مُصنّف کو مبادیاتِ حکمت سے بھی مَس نہیں۔ اگر یہ صفات موسم کے اثرات سے نیند میں پیدا ہو گئے ہیں تو پھر جاڑے میں یقیناً یہ قابل ادیب برفستانی نیند۔ پالا ماری نیند۔ اور موسم برشگال میں ہوسلا دھا

نیند- گرجتی نیند- کڑکتی نیند- کوندتی نیند- صاعقہ زدہ نیند سوتا ہوگا-

براین عقل و دانش بباید گریست

بتقریب اختتام دو باتیں اور گذارش کرنی ضروری ہیں، ایک تو یہ کہ نیاز مندانِ لاہور کی طرح ضمناً میں بھی کری اور بے ڈھنگے اور بے تکے جواب کی دعوت دیتا مگر میں جانتا ہوں کہ صریحی اور بدیہی اغلاط کا جواب محال ہے اس لئے یہ مقالہ فی الجملہ مسکت ہے۔

دوسری بات تقدس مآب حکیم یوسف حسن ایڈیٹر نیرنگِ خیال کے گوش گزار کرنی ہے جنہوں نے محض بہ اقتضائے حُبِ الوطن" نیاز مندان لاہور" کو جواہر ریزے کی حیثیت سے جگہ دی ہیں اُنکو بتادینا چاہتا ہوں کہ ان کی وقعت بقدر یک سنگ ریزہ بھی نہیں کہ جس کو دیکھ کر کسی "عاشق شوریدہ سر" کو اپنا سر یاد آئے- اور اُن کی اصلیت بقدر نارِ مغیلان بھی نہیں کہ جو "اشتر محمل برادر" کی دعوت ہی کا سامان ہوتے- اس گذارش کے بعد بھی اگر "نیاز مندان لاہور" کے لئے طبلۂ عطار کھلا ہے- تو بسم اللہ ـــ دیکھیو یارب یہ درِ گنجینۂ گوہر کھلا ـــ ساقی بھی اس جوہر شناسی کے لئے (خارِ چشم دشمناں) حاضر ہے- ہیں گوئے و ہمیں میداں- اگر ادعائے ادب کی ہوس باقی ہے تو خوب لکھیے اور خوب لکھوائیے، خوب چھپئے اور خوب چھپوائیے کیونکہ ع

"بیکار ہیئے جنوں کو ہے سر پیٹنے کا شغل"

---

علامہ مضحک دہلوی

# اخوانُ الشیاطین

## اور
## دیگر افسانے

علامہ مضحک دہلوی کے معرکتہ الآرا سائنٹفک افسانوں کا مجموعہ چھپ کر تیار ہوگیا ہے۔

اخوان الشیاطین" جیسا ہنگامہ خیز اور خون میں ہیجان پیدا کرنے والا طویل افسانہ بھی اِس مجموعہ میں شامل ہے۔ "موتی کی آب"، "روحِ مبتلا"، "رجعت" میں دیکھئے کہ موجودہ سائنس کی ایجادات ارتکاب جرم میں کس بہیمیت کے ساتھ استعمال کی جاتی ہیں اور ان کے کیسے خوفناک و لرزہ خیز نتائج برآمد ہوتے ہیں- انسانی خون کس بے دردی سے بہایا جاتا ہے اور پھر دیکھئے کہ قدرت کے زبردست ہاتھ کے بدولت کس طرح ظالم اپنے کیفرِ کردار کو پہنچتا ہے- سات بے انتہا جاذب توجہ مضامین اس کتاب میں شامل ہیں ضخامت ۳۵۲ صفحات قیمت ایک روپیہ چار آنے (ع۱۲) علاوہ محصولڈاک:

ملنے کا پتہ:- ساقی بک ڈپو- دہلی-

# "گاؤں کی شادی"

(ایک حیدرآبادی کی زبانی)

نِکلے دُولا آئیں جیجھر صاب علّی ہوئے ہوئے
اب مُجیھر ہُر ہے بریانی کی ڈلی ہوئے ہوئے

چاروں طرفاں سے براتیاں بیچ میں دولامیاں
کیا دھڑتے سے برات اب ہی یہ چلی ہوئے ہوئے

بھالاں اُتّے لمبے بندوقاں ہیں چھتّیں ٹھائیں ٹھائیں
جِتّا منہ ہُر ہُتّا گھوڑا ہتّی نلّی ہوئے ہوئے

دھیٹرے سِنلھیاں تمڑنی پینگیاں کپڑے لنگیاں کی برات
پھر کو آئیں کھیتیاں گیناں اَلّی گلّی ہوئے ہوئے

سر کو پگڑیاں تن پو کیچیاں انگ میں دھوتیاں نیچے ہیں لٹ
یُوں میں چپلاں گاؤں زبانی ہر دو تلّی ہوئے ہوئے

بنڈیاں گنڈیاں ہوئے ہوئے اب کیکو دھیکا دیکتیں
ہیں پٹیل اِس گاؤں کے نِتّار علّی ہوئے ہوئے

بائیکاں گاتیں سو، کیا خبصُورت اُن کے ناؤں ہیں
کوئی نرسُو، کوئی پُچھی، کوئی یلّی ہوئے ہوئے

گاؤں کی شادی کا مجبہ گاؤں والا بیچ ہے
کیوں جمتیں چھوٹے بڑے حالی ہوّلی ہوئے ہوئے

مُرنجی صاب اپنے ہاتاں سے ہیں باندہیں تہمتا
سہرا بدھی مالا سب پائیں تجلّی ہوئے ہوئے

بھاری لوگاں آکو ہیں وہ کون ؟ محمّد علّی صاب
ہور رسُل صاب میاں ہُر شیخ علی ہوئے ہوئے

دِسس رہی ہمناں کو بستی ہے یہ مکّا راج پیاٹ
کیسی پیاری کیسی اچھی کیسی بھلّی ہوئے ہوئے

شار والاں کے بھی عقلاں آکو چر کھاتی ھیں یاں
یاں کے کھیتاں یاں کے گرسیاں کی سلّی ہوئے ہوئے

جی بھڑک کو ہور گھبراکے جو لاتا ہے کھینچ کو
آتے کے ماندان کو ہوتی ہی تسلّی ہوئے ہوئے

سب سجاراں بیوپاری آڈے گڈے یاں کے سب
بکتیں گڈیاں اَلّی گڈے گڈے پلّی ہوئے ہوئے

پھلے لوگاں بولتیں تھیں یا نکی بھلّی کو گمار
دُسرا ناوں اب پڑگیا ہے شکّی کی بھلّی ہوئے ہوئے

وہ جمانہ کاڑیں تو دستا کیوں کچ ہمسیں
دل اُچھلتے کودتے اِک اِک بلّی ہوئے ہوئے

یاں کے بیلاں یاں کے گاباں یاں کے بھینساں دے اردا
کھاتے ہیں من بھر کو دانہ چارہ کھلی ہوئے ہوئے

جتہ و صاحب ہر گھر و صاحب بھی پڑھتی ہیں نماز
بولنا آتا چ نہیں اُن کو اُملی ہوئے ہوئے

یاں کے لوگاں کھاتیں من بھرتی ہیں پلیاں دودھ
سیر کا اک من تو دو ماشیاں کی پلی ہوئے ہوئے

بھینسیں بھینساں میں سکا کیا بگاڑیں شیخ جی
آتیں بڑے اک یکہ بھی مانیکو وتی ہوئے ہوئے

بابہ کو دو ناہیاں کو کھل کھلا کو نفس پڑی
اُنکی ہر کا انکی تیلل اُڑ کی تلی ہوئے ہوئے

روپیاں پیساں لاکھاں ہزاراں لٹا دیتی ہیں آج
ہوتیں اگر موزود کا ملم صاب علی ہوئے ہوئے

سب انوں کو جانتیں پہچانتے سب نوبراں
باگ بھی اُن کے ہیں کتیں معلی ہوئے ہوئے

اُن کے گھر کو بنکو دولا چڑھ کو گھوڑا کیا کدیں
پھر نا سب بھوتی گیا ہے اور ان جھلی ہوئے ہوئے

اچپیا کو دیا اچھلیا بولیا جلکو میں دولے کا دل
کیا خبر آتی ہے دولن کی تجلی ہوئے ہوئے

مرون گرداں باتکاں گیکاں کے دل کے اب کنول
کیوں کھلیں جیسے کہ پکھلو کی دو پلی ہوئے ہوئے

سب مبارک ہوئے ہوئے اب کیکو دیتی ہیں دعا
اچھے نچھے بچے گچے پلی ملی ہوئے ہوئے

بیٹی کی شادی مبارک تمنا کو سید د جیر
ہیں اپن بھی بھلے پھل بھی ہی بھلی ہوئے ہوئے

خوش رہیں دولا دلن دے نیک اولاد اب خدا
مانگیں اُن کے دشمناں سب بھیک پلی ہوئے ہوئے

کھانا گینا کھا کو ہاں پیٹ پوسے پھیر کو
کہتے ہے کو ڈکاراں ہیں مُصلی ہوئے ہوئے

کیا پلاؤ ہے جا مکھن دار اور مچھیر جوردار
کیتی ہیں کھا کھا کو سالے پلی ڈلی ہوئے ہوئے

کیسے بھاری بھینساں ہیں کیسے پیارے اُن کے ناؤ
ماسی پیٹ آدے یارم مرزان پلی ہوئے ہوئے

گاؤں شالے کھا کو جنگلاں کی ہوا رہتیں مسنڈ
کیسے بھاری اُن کے پیچے کیسی تلی ہوئے ہوئے

میرے مضموں جو ہے سو کی یہ سنتیں ہائے ہائے
پھر کھیڑ کو بولتیں جھیر زٹلی ہوئے ہوئے

سن کو اشعاراں کو میرے اپنے رحیم صاب یاں
رستے رستے ہوئے ہوئے ادرکی گلی ہوئے ہوئے

# "گاؤں کی شادی"

(ایک حیدرآبادی کی زبانی)

نکلے وُولا آئیں جیھر صاب علّی ہوئے ہوئے
اب مجھپر ہر ہے بربانی کی ڈلی ہوئے ہوئے

چاروں طرفاں سے براتیاں بیچ میں دولامیاں
کیا دھڑتے سے برات اب ہی یہ چلّی ہوئے ہوئے

بھالاں اُتّے لمبے بندوقاں ہیں جھنڈیں ٹھائیں ٹھائیں
جِتّا منہ ہر مُنّا گھوڑا ہتّی نلّی ہوئے ہوئے

دھڑے سنگھیاں نمڑی پنگیاں کپڑے لنگیاں کی برات
پھر کو آئیں کھیتاں گنناں الّی گلّی ہوئے ہوئے

سر پو پگڑیاں تن پو کیچیاں نگ میں دھوتیاں نیچے میں لپٹ
پوں میں چپلاں گاؤں زبانی ہر دو تلّی ہوئے ہوئے

نیڈیاں گنڈیاں ہوئے ہوئے اب کیکو دیکا وچ کتیں
ہیں پٹیل اس گاؤں کے نثّار علّی ہوئے ہوئے

بائیکاں گاتیں سو، کیا خبصورت اُن کے ناؤں ہیں
کوئی نرسُو، کوئی پکھمی، کوئی یلّی ہوئے ہوئے

گاؤں کی شادی کا مجّہ گاؤں والا بیچ ہے
کیوں جھمیں چھوٹے بڑے حالی ہوّلی ہوئے ہوئے

مُرنجی صاب اپنے ہاتاں سے ہیں باندہیں ہٹھّا
نیرا بدھی مالا سب پائیں تجلّی ہوئے ہوئے

بھاری لوگاں آکو ہیں وہ کون ؟ محمّد علّی صاب
ہور رسُّل صاب میاں ہر شیخ علّی ہوئے ہوئے

دِس رہی ہمناں کو بستی ہے یہ مکّا راج پیاٹ
کیسی پیاری کیسی اچھی کیسی بھلّی ہوئے ہوئے

شار والاں کے بھی عقلاں آکو جر کھاتی ہیں یاں
یاں کے کھیتاں یاں کے گربیاں یاں کی سلّی ہوئے ہوئے

جی بھڑک کو ہور گھبرا کے جو لاتا ہے ... کھینچ کو
آتے کے ماندان کو ہوتی ہی تسلّی ہوئے ہوئے

سب بجاراں بیوپاری اُڈّے گڈے یاں کے سب
ملکیں گڈیاں اُلّی گڈے بلّی ہوئے ہوئے

پچھلے لوگاں بولتیں تھیں یا نکی بھلّی کو گمار
دُسرا ناؤں اب پڑ گیا ہے مٹکی کی بھلّی ہوئے ہوئے

وہ جمانہ کا ڑیں تو دستا کیوں کیچ ہم سبیں
دل اُچھلتے کودتے اِک اِک بلّی ہوئے ہوئے

ے بیاں بیاں کے گاباں پاں کے بھینساں وی آردا
کھاتے ہیں من بھر کو دانہ چارہ کھلی ہوئے ہوئے

صاحب ہر گھر کو ساتھ بھی پڑھتی ہیں ناج
بولتا آناج نہیں اُن کو اُصلی ہوئے ہوئے

لوگاں کھاتیں نہ بھرتی ہیں پایاں سے دودھ
سیر کا ک من تو دو ماشیاں کی پلّی ہوئے ہوئے

ستیں کھیتیاں میں سکا کیا نگاڑیں شیخ جی
آ نہیں بڑے اک نلو نہا نہلو وتی ہوئے ہوئے

کو دو امیاں نہ کھل کھلا کو ہنس پڑی
اُنکی ہر کا ٹکی نعلیں اُن کی تلّی ہوئے ہوئے

رو پیاں پیساں لاکھاں ہزاراں لٹادیتی ہیں آج
ہوتیں گے وزور دو کا محصاب خلی ہوئے ہوئے

سب اناں کو جانتیں پہچانتے سب تو ہیں اں
بگ بھی ہاں اُن کے ہیں کتنیں مُصلّی ہوئے ہوئے

اُن سے گھر کو بنکو دولا چڑھ کو گھوڑا کیا کدریں
پھر نہ سب جو بچ گیا سے اور ان جھلّی ہوئے ہوئے

اچھیا کو دیا، اچھلیا لولیا حلکو میں دولے کا دل
کیا نجر آتی ہے دولن کی تجلّی ہوئے ہوئے

مرداں گرداں بائکاں گیکاں کے دل کے اب کنول
کیوں کھلیں جیسے کہ مکھلو کی دو پلّی ہوئے ہوئے

سب مبارک ہوئے ہوئے اب کیکو دیتی ہیں دعا
اچھے بچّے بچّے گچّے پلّی پلّی ہوئے ہوئے

بیٹی کی شادی مبارک ثمنا کو سید وجیر
ہیں اپن بھی بھلّے مچھل بھی، ہو بھلّی ہوئے ہوئے

کھش رہیں دولا دُلن دے نیک ولاداب کھدا (خدا)
مانگیں اُن کے دشمناں سب پھباس بلّی ہوئے ہوئے

کھانا گینا کھا کو ہاتاں پیٹ پوسے پھیر کو
گیتے ہے کوڈکاراں ہیں مُصلّی ہوئے ہوئے

کیا پلاؤ ہے جا نکہ دار اور مجھیر جوردار
کیتی ہیں کھاکھا کو سارے پلّی تلّی ہوئے ہوئے

کیسے بھاری ٹھینساں ہیں کیتے پیارے اُن کے ناؤ
مائی پیٹ اَدّ بارم مرزان پلّی ہوئے ہوئے

گاؤں دالے کھاکو جنگلاں کی ہوا رہتیں مُسنڈ
کیسے بھاری اُن کے پنجے کیسی نلّی ہوتے ہوئے

میرے "مضموں" جو ہے سو کی "یہ سُنتیں ہائے ہائے
پھڑ پھڑ کو لوٹتیں جھیمر زٹلّی ہوئے ہوئے

سُن کو اشعاراں کو میرے اے رحیم صاحب میاں
رستے رستے ہوئے ہوئے ادر گلّی گلّی ہوئے ہوئے

# رہئیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو

بھائی شاہد۔

لیجئے صاحب یہ مضمون حاضر ہے۔ شاید اتنا مختصر مضمون آپ کو ظریف نمبر میں نظر نہ آئے۔ اس کے عذر میں یہ عرض کروں گا کہ آج کل ”سر پہ امتحاں سر پر کھڑا محنت کرو محنت کرو“ پر پوری طاقت سے کاربند ہوں۔ اتنا بھی خدا معلوم کس طرح لکھا ہے۔ آپ اس کی ”مقدار“ پر نہ جائیے بلکہ ”نوعیت“ ملاحظہ کیجیے ـــ اختصار پسندی ظرافت کی روح ہے! آیا خیال شریف میں!! ـــ جی ـــ؟ اگر آپ نے پسند فرمالیا تو میں سمجھونگا میری محنت وصول ہوئی۔

آپکا ـــ انصار

ـــــــــــــــــــــــــ

اپنی عزیز از جان بیگم صاحبہ کی مداخلت آمیز توجہ سے تنگ آکر فیصلہ کر لیا کہ اب کسی نئی فضا میں زندگی کے دن پورے کریں گے۔ چنانچہ فوراً ایک سستا سا مکان کرایہ پر لے لیا۔ ایک ایسا مکان جو اپنی بوقلمونی اور رنگارنگی کے باعث عرصہ سے ہماری توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ صبح سے شام تک اس مکان کے شاعرانہ ماحول پر ایک دل خوش کن اُداسی مسلط رہتی تھی۔ دوسرے ہی دن ہمارے باوفا ملازم صاحب نے ہمارا ضروری سامان وہاں پہونچا دیا۔ اور جھاڑ پونچھ کے بعد دری کو اس احتیاط اور اس کمال سے بچھایا کہ اس کے تمام اُبھار سے یا تو پلنگ اور میز کے نیچے پڑیں یا ٹرنکوں کے نیچے آجائیں۔ تین ٹانگوں والی میز کو بڑی دانائی اور ہشیاری سے دیوار کے سہارے کھڑا کیا۔ ہم بھی اس آرائش میں پوری طاقت کے ساتھ حصہ لیتے رہے۔ درسی کتابوں کے حصہ ”لخت لخت“ کو بڑی فراست کے ساتھ یکجا کیا تاکہ ”دعوت امتحان“ کا مقابلہ کر سکیں۔ مجروح تابدان زمینٹل پیس پر ”رہزن تمکین ہوش“ کی قسم کی بہت سی ”بے تکلف تصاویر“ رکھیں۔ ایک شکستہ تپائی پر چائے کی دو مجروح پیالیاں ایک عدد بیوہ طشتری، ایک یتیم چادانی اور ایک بے ڈھکنے والی کیتلی انتہائی ہنرمندی کے ساتھ رکھی گئیں۔ لکھنے کی میز کے عین سامنے ”قبلہ و کعبہ“ کی ایک گھورتی ہوئی تصویر لٹکائی اس لئے کہ شاید اُن کے اس ”قہر بھرم“ سے ہم ہر وقت پڑھنے پر مجبور رہیں۔

اس طرح اپنے کمرہ کو آراستہ کرنے کے بعد اپنے گردوپیش نظر کی اور اطمینان کا سانس لیتے ہوئے ”آ۔ عن۔ دلیب۔ مل ل ل ل۔ کے کریں۔ آ و و زاآآ۔ یاں ں ں“ گنگنانے لگے۔ بظاہر کوئی وجہ نہیں تھی کہ ہم اس نئی فضا میں رہ کر غیر معمولی محنت نہ کر سکیں اور امتحان میں کامیاب نہ ہوں۔

یہاں اور تو کوئی تکلیف نہیں سوائے اس کے کہ سردی بڑی محنت سے پڑتی ہے۔ یوں تو صبح سے شام تک ہمارے گھر میں صبح کاذب کا عالم رہتا ہے لیکن جس روز آسمان پر ذرا بھی غبار ہو تو ہمارا گھر ”چھائی گھٹا گھنگور“ کی مستقل تفسیر بنا یا کرتا ہے۔ خنکی کا یہ عالم ہے کہ ”آہ و بکا“ کرنے والے پلنگ پر بیٹھے بیٹھے بارہا یہ احساس ہوتا ہے کہ ہماری

ٹانگوں کا وہ حصہ جو گھٹنوں سے نیچے ہوتا ہے غائب ہوگیا ہے۔ اکثر راتوں کو جب کہ لحاف کی کم مائیگی کا احساس بڑھتا جاتا ہے اور ٹانگیں کم بخت شل ہونے سے باز نہیں آتیں تو ہم قوانین صحت پر عمل کرتے ہوئے چہل قدمی کرنے لگتے ہیں یا باہر سڑک پر بیٹھ کر نیم کی خشک ٹہنیوں میں سے چاند کا نظارہ کرنے لگتے ہیں اور اسی شعریت سے اس درجہ متاثر ہوتے ہیں کہ سردی محسوس نہیں ہوتی۔ نیم کے خشک درخت ——— صحرا کی چاندنی ——— رات کا سماں ——— اور ایک فرضی محبوب کا تصور، بلا مبالغہ ایک ایسی ذہنی انگیٹھی ثابت ہوتی ہے کہ ہمارے دانت بجنے موقوف ہو جاتے ہیں۔ لیکن بعض اوقات ہماری حرارت غریزی جواب دے دیتی ہے اور ہمارا شاعرانہ تخیل بے سود ثابت ہوتا ہے۔ اس کا علاج ہمارے پاس سوائے اس کے کوئی نہیں ہوتا کہ تکلف کو بالائے طاق رکھکر سرگرمی سے بیٹھکیاں لگانے لگتے ہیں۔ یہانتک کہ صبح ہو جاتی ہے اور امیر و غریب کو یکساں طور پر حرارت پہونچانے والے سورج دیوتا نکل آتے ہیں اور اُس وقت دُنیا کی کوئی طاقت ہمیں سڑک پر کھڑے ہوکر دھوپ میں سکنے سے نہیں روک سکتی۔

ہمارے کمرے کا سامان کباڑیے کی دوکان کی طرح اس سلیقہ سے بکھرا رہتا ہے کہ میز اور پلنگ تک کا پتہ نہیں چلتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے "کتم عدم سے دائرۂ وجود" میں آنے کا مقصد صرف اپنی کھوئی ہوئی چیزیں تلاش کرنا ہے۔ طرّہ یہ کہ ہر کھوئی ہوئی چیز کسی ناممکن القیاس جگہ سے برآمد ہوتی ہے۔ جب ہمارا دانتوں کا بُرش بوٹ میں سے پایا گیا اور جب ہماری کنجیوں کا گچھا بے ڈھکنے والی کیتلی میں سے ملا اور جب ہماری ٹوپی کا پھُندنا تکیہ کے غلاف میں سے برآمد ہوا تو ہمیں ذرا بھی تعجب نہیں ہوا لیکن جب ایک ہمسایہ کا کئی دن کا کھویا ہوا اُلّتا ہمارے پلنگ کے نیچے سے نمودار ہوا تو ہمارے حیرت کی انتہا نہ رہی، اور اب تو یہ معمول ہوگیا ہے کہ ہر صبح کالج جانے سے پہلے موزوں کی تلاش میں کونہ کونہ چھان مارتے ہیں لیکن ایک موزے کے علاوہ دوسرا کسی طرح نہیں ملتا۔ البتہ اس تلاش و تجسس میں اور بہت سی کھوئی ہوئی چیزیں مل جاتی ہیں۔ اکثر اسی جستجو میں محو ہوکر ہم کتابوں کی ورق گردانی کرتے رہتے ہیں اور ایک کتاب ہاتھ میں لیکر فلسفیانہ انداز سے کمرے میں ٹہلا کرتے ہیں۔ پھر اچانک پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالنے سے دوسرا موزہ بھی برآمد ہو جاتا ہے ——— قضا و قدر کے معاملوں میں کس کو دخل ہے؟۔

کالج سے واپس آکر ہم کمرے کا روشن ترین کونہ تلاش کرتے ہیں اور نہایت دلجمعی سے آرام کرسی بچھا کر طبیعت کو پڑھنے کی طرف مائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ابھی ہمارا دل پوری طرح راضی نہیں ہونے پاتا کہ سامنے کی دوکان سے دلاور خاں صاحب (جو اوّل گرمی میں کنجڑے بن جاتے ہیں، آخر گرمی میں پنساری۔ اوّل جاڑے میں دُھنیئے اور آخر جاڑے میں سب کچھ یعنی کنجڑے، پنساری، دُھنیئے۔) اپنی بکری، جس کو وہ ٹِٹو کہتے ہیں اور اپنے نوکر رمضانی جسے وہ پیار سے مجو کہتے ہیں، دونوں کو اس فصاحت و بلاغت سے مشترکہ گالیاں دینی شروع کرتے ہیں کہ ہمارے لئے یہ تمیز کرنا ناممکن ہو جاتا ہے کہ آیا نوکر بکری ہے یا بکری نوکر۔ البتہ اس بات کے ہم قائل ہو چکے ہیں کہ اُردو زبان بہت وسیع ہے اور دلاور خاں صاحب ایک مسلم الثبوت زباں داں ہیں۔

ہر سہ پہر کو ہمارے مکان پر ایک اعلیٰ قسم کے فیشن ایبل فقیر صاحب آکر دھنا دیتے ہیں، اور جبتک وہ کچھ نہ کچھ وصول نہیں کر لیتے، ایک رُول نما اوزار اور لوہے کی متعدد چوڑیوں سے بینڈ بجاتے رہتے ہیں اور اس کی معیت میں "بشر دو رب العالمین کے آیا" لہک لہک کر گاتے رہتے ہیں۔ ہم آج تک معلوم نہ کر سکے کہ کس صنعت کے ساتھ فقیر صاحب "....... آیا" کو ایک لپک دار "ایم" میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ اُصولاً ہم اُن کی تشریف آوری کے منتظر رہتے ہیں اور جیسے ہی کہ اُنہوں نے پہلا مصرعہ بلند کیا اور ہم نے ایک پیسہ اُن کی نظر کیا لیکن نہ معلوم یہ کیا رسم خاص ہے کہ وہ پیسہ لینے پر بھی پوری غزل سُنائے بغیر نہیں جاتے۔

ہمارا اصول یہ ہے کہ سونے سے پیشتر نہایت پاکیزہ اور شریفانہ خیالات ہی لاتے ہیں اور اپنے ضمیر سے کہہ کر اپنے آپ کو دن بھر کی خطاؤں کی سزا میں خوب ملامت کرواتے ہیں۔ اس سے فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ہم ساری رات معصومیت کی گہری نیند سو سکتے ہیں۔ اور خواب بھی نہایت لطیف دیکھ سکتے ہیں۔ گذشتہ شب حسب معمول ہم نیک خیالات دل میں لائے، آنکھیں بند کیں اور سو گئے۔ کوئی آدھی رات گئے ہماری آنکھ کھلی تو کیا دیکھتے ہیں کہ ہماری چارپائی کے عین قریب ایک گھوڑے صاحب کھڑے ہیں —— ابھی نہایت استغراق سے گھوڑے صاحب کی موجودگی پر ہر ممکن پہلو سے غور کر رہے تھے کہ دفعتاً ایک ہیبت آواز نے ہمیں چونکا دیا۔ گھوڑے صاحب نے ہمیں فکر میں مستغرق دیکھکر اپنی موجودگی کا یقین دلانا ضروری سمجھا اور لگے اپنی پوری قوت کے ساتھ ہنہنانے ——!

ہم اپنے ہوش میں کبھی اتنی سرعت سے کمرہ سے باہر نہیں نکلے۔

بعد میں معلوم ہوا کہ ہمارے مکان کے پیچھے کچھ تانگے والے رہتے ہیں۔ یہ گھوڑا اُن کا تھا۔ نہ معلوم کیا سمجھ کر وہ ہمارے مکان میں چلا آیا۔ بہزار دقت گھوڑے کو باہر نکالا۔ باقی رات عجب پریشانی میں کٹی آنکھوں کے سامنے ہزارہا عجیب الخلقت گھوڑے لہراتے رہے۔ کبھی اُن کی گردن کٹ کر ہمارے جسم پر آ لگتی اور کبھی ہماری گردن اُن کے جسموں پر جا لگتی۔

بس ارادہ کر لیا کہ صبح ہی بیگم صاحبہ کے پاس چلا جاؤں گا۔ بغیر شریک حیات کے زندگی بیکار ہے۔

**انصار ناصری۔ بی۔ اے۔ دہلوی**

---

"SAQI"



اسرار ناروی

۔۔۔ہمت نہیں ہارتا۔
میرے دوستوں نے بہت سمجھایا کہ
موت کے بھیانک غار میں داخل ہونا ہے۔ ایسی
آبادی سے، اور وہاں بقائے حیات کے لئے

Calcutta Art Press, Delhi.



فضل حق قریشی

معصیت کی زندگی میں کیا دیکھا ... رمدن نے اسے کیا سکھا
طفنا ونی زندگی سے خود بیزار ہو جاتی ہو مگر اپنے بچے کی خاطر اپنے ناپاک وجو
اس تمثیل میں ملاحظہ کیجیے جو گناہ اور موت کی لرزہ خیز تصویر ہے قیمت ۱۲
بکڈپو دہلی

# عالمِ مریخ میں چند یوم

از جناب فضل حق قریشی دہلوی

ڈیر ... ہے خوش ہو ظریف نمبر کے لئے مضمون روانہ کرتا ہوں۔ جو اپنی تمامتر سنجیدگیوں کے ساتھ حقیقی واقعات پر مبنی ہے۔ قارئینِ ساقی تو ایک طرف شاید تم بھی مطالعہ کے وقت اس کے ہر جملہ کو فرضی اور افسانوی رنگ میں دیکھنے لگو گے۔ لیکن نہیں۔ میں تم کو یقین دلاتا ہوں کہ اس کے کسی ایک لفظ کو بھی تخیلی نہ سمجھنا۔ یہ میرا اپنا تجربہ ہے اور سیاحت کے تمام کوائف عینی مشاہدہ پر مبنی ہیں۔ میں نے اپنے سفر کے متعلق چند لیکچر نکاآرکی رصدگاہ میں دئے تھے۔ ... میجک لنٹرن کے ذریعہ کچھ تصاویر بھی دکھائی تھیں۔ جو اہلِ مریخ کی معاشرتی زندگی سے متعلق ہیں تم نے ان کی تفصیل اخباروں میں پڑھ لی ہو گی۔ میں اکتوبر کے اختتام تک ہندوستان آؤں گا۔ کیونکہ اگلے ہفتہ ستارۂ زحل کی سیاحت کے لئے روانہ ہونے والا ہوں۔

تمہارا دوست ـــــ فضل حق قریشی دہلوی

> اے عالمِ مریخ کے محیر العقول طویل القامت باشندو! تمہاری پُر اسرار ہستیاں اہلِ زمین کے لئے موجبِ حیرت و استعجاب ہیں۔ لیکن مستقبل قریب میں تمہارے اور ان کے درمیان ہر قسم کے خوشگوار تعلقات پیدا ہونے والے ہیں اور جب وہ اشتراک باہمی اتصالِ جنسی کی حد تک تجاوز کر جائیگا تو ایک ایسی معصوم نسل کتمِ عدم سے عرصۂ وجود میں جلوہ گر ہوگی جس کی پرستش کے لئے کون ومکان کے بڑے بڑے دیوتا اپنا سر جھکا دیں گے۔ میری دعا ہے کہ ہمیشہ تم پر یزدانی لطف واکرام کی بارش ہو۔

مجھے کامل یقین تھا کہ میرے ساتھی صرف ...ی وقت تک میری تحریک میں حصہ لینے ...ے تیار رہیں جب تک کہ اس کو دائرۂ عمل ...لایا جائے۔ چنانچہ جب یہ فیصلہ کیا گیا کہ پر... دل صبح اپنی مہم پر روانہ ہو جاتا ہے، ...ب نے بے بنیاد عذر پیش کرنے شروع ...ے اور ایک ایک کر کے سب کنارہ کش ...لئے پھر نہ صرف یہ کہ میرے ہمراہ چلنے سے انکار کیا بلکہ خود مجھ کو مشورہ دینے لگے کہ میں اپنے ارادے سے باز آ جاؤں۔ لیکن ہمیشہ سے عزمِ صمیم میری فطرت میں شامل ہے، میں جس بات کا بیڑا اُٹھاتا ہوں اُس کو ضرور سرانجام دیتا ہوں۔ خواہ اس سلسلہ میں کتنے ہی مصائب کا سامنا کرنا پڑے، مگر میں ہمت نہیں ہارتا۔

میرے دوستوں نے بہت سمجھایا کہ کرۂ ارض سے پرواز کر کے مریخ کی دُنیا میں جانا گویا جان بوجھ کر ... کے بھیانک غار میں داخل ہونا ہے۔ ایسی حالت میں جب کہ ہم کو یہ بھی معلوم نہ ہو کہ اُس کرہ میں کس قسم کی ...ق ہے، اور وہاں بقائے حیات کے لئے کن کن چیزوں کی ضرورت ہے، کس طرح معلوم ہو سکتا ہے کہ اس جگہ

کی آب و ہوا ہمیں زندہ رکھنے کے لئے کار آمد ہو سکتی ہے یا نہیں۔ مگر میں اس بات پر مُصر تھا کہ جب ایک کام کرنے کا تہیّہ کر لیا ہے تو پھر پس و پیش نہ کیا جائے، لہٰذا میں نے اپنے دل میں فیصلۂ انقطاعی کر لیا کہ اگر میرے دوست میرا ساتھ نہیں دیتے تو نہ سہی میں خود اکیلا عالمِ مریخ میں جاؤں گا، تاکہ اس دُنیا کے تمام حالات معلوم کر سکوں، مر جانے کی صورت میں کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوگی کہ میرا کیا حشر ہوا؛ اور اگر قسمت نے یاوری کی اور دوبارہ زندہ و سلامت اپنی دُنیا میں واپس آگیا تو مجھ سے زیادہ خوش نصیب کوئی نہ ہوگا۔ لوگ میرا بیان قلمبند کرنے اور مجھسے شرفِ نیاز حاصل کرنے کے لئے بے تاب نظر آئیں گے۔ علمی اداروں میں تقریر کرنے کے لئے مجھ کو مدعو کیا جائے گا۔ موقّت الشیُوع رسائل میرے مضامین شائع کرنا باعثِ افتخار سمجھیں گے۔ نہایت شان کے ساتھ میری سوانح حیات مرتب ہوگی۔ "ور ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما" کے مصداق میرے کارنامے تاریخِ عالم میں سونے کے حرفوں سے لکھے جائیں گے۔

---

۲۲ر اکتوبر کی مبارک صبح کو بازیچۂ عالم پر حیات و ممات کی ایک بازی کھیلنے کے لئے میں نے پہلا مہرہ چلدیا۔ ضروری سامانِ سفر اُس عظیم الشان جہاز میں لاد دیا گیا جو خاص میری ہدایت کے مطابق تیار کیا گیا تھا، اور جس کی رفتار برق رو سے بھی زیادہ تیز تھی۔ روانگی سے قبل میرے بیوی بچوں نے بچشمِ پُرنم مجھے الوداع کہا، دوستوں نے ہار وغیرہ ڈالے اور میں نے سب کو تسلی دیتے ہوئے بہت جلد واپس آنے کا وعدہ کر لیا۔

بٹن دبانے کی دیر تھی کہ میرا جہاز چشمِ زدن میں سطحِ ارض سے ہزاروں میل کے فاصلے پر جا پہنچا۔ سوائے فضائے بسیط کے مجھے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ البتہ تند ہوا کے جھونکے اور جہاز کے پنکھے کا شور سماعت پر بُرا اثر ڈال رہا تھا، لیکن میں نے مطلق پروا نہ کی۔ اور جہاز اپنی پوری قوت کے ساتھ پرواز کرتا رہا۔ یہاں تک کہ ایک گھنٹہ اور ساڑھے سات منٹ کے بعد میں نے محسوس کیا کہ جہاز کی رفتار غیر معمولی طور پر بہت زیادہ تیز ہو گئی ہے۔ میں سمجھ گیا کہ اب زمین کی کشش سے باہر نکل گیا ہوں، اور مریخ یا کوئی دوسرا سیارہ مجھ کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے، اس لئے اصولاً میں نے اپنے جہاز کی رفتار کو بتدریج کم کرنا شروع کر دیا۔ حتیٰ کہ ایک وقت ایسا آیا کہ مشین بالکل بند کر دی مگر جہاز بدستور چل رہا تھا جس سے معلوم ہوا کہ اس سیارہ میں جس کی طرف میں جا رہا ہوں زمین سے زیادہ کشش موجود ہے، جوں جوں وقت گذر رہا تھا، میری بے چینی بڑھتی جاتی تھی۔ اس وقت میرا دماغ یہ تصوّر کرنے سے عاجز تھا کہ انجام کار مجھے کن کن مصائب کو برداشت کرنا پڑیگا۔ تاہم میری نظریں اس دوربین کے شیشے پر تھیں جس کی مدد سے پچیس لاکھ فٹ کے فاصلہ پر ہر چیز کو دیکھ لینا ممکن ہے۔ مگر سوائے سفید بادلوں یا کبھی کبھی لپکنے والے آتشیں شعلوں کے مجھے کچھ نظر نہ آتا تھا۔

کامل نصف گھنٹہ اسی اضطراب میں گذر گیا، لیکن اب کسی قدر خنکی محسوس ہونے لگی تھی۔ اور تھوڑی دیر میں سیاہ رنگ کے پہاڑ بھی نظر آنے لگے۔ اس وقت مجھ کو نہایت ہوشیاری سے کام لینا تھا، ورنہ جان جانیکا

اندیشہ تھا۔ میں نے فوراً جہاز کے موٹر کو مخالف سمت میں یعنی زمین کی طرف آہستہ آہستہ چلانا شروع کیا۔ تاکہ کشش ثقل میں کچھ رکاوٹ پیدا ہو سکے۔ مگر حسب منشا کامیابی نہ ہوئی، کیونکہ چند ہی لمحہ میں میرا جہاز نہایت تیزی کے ساتھ کسی چیز سے ٹکرایا اور میرے حواس مختل ہو گئے۔

---

جب ہوش آیا تو میں نے ایک روزن میں سے جھانک کر دیکھا۔ سیاہ رنگ کی زمین نظر آئی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اس وقت بھی میں سطح زمین سے چھ یا سات سو فٹ کے فاصلے پر ہوں۔ مگر میرا جہاز ساکن تھا۔ اس لئے سمجھ میں نہ آیا کہ میں کس مقام پر ہوں۔ لہذا کھڑکی کا دروازہ کھول کر جہاز سے باہر نکل آیا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ میرا جہاز جس کا حجم تین سو پچیس مکعب فٹ اور وزن دو ہزار چار سو ایک لوہے من تھا، ایک درخت کی ڈالیوں میں الجھ کر رہ گیا ہے جس کا ہر پتہ میری کھانے کی میز سے بڑا تھا۔ اور چھوٹی چھوٹی شاخیں برآمدہ کے ستون سے زیادہ موٹی تھیں۔ اگرچہ میں درخت پر چڑھنے یا اترنے کا عادی نہیں ہوں، بلکہ ایک حد تک ناواقف ہوں لیکن جب درخت کی شاخیں کھیتوں میں بل کھانے والی پگڈنڈی سے زیادہ عریض ہوں تو ان پر نہایت آسانی کے ساتھ چلنا ممکن ہے۔ علاوہ ازیں درخت کی چھال کے نشیب و فراز زینہ کی سیڑھیوں کا کام دے رہے تھے۔ اس لئے میں بلا تکلف نیچے اتر آیا۔ سطح زمین پر قدم رکھنے کے بعد میں نے اقصائے عالم پر نگاہ ڈالی۔ عجیب و غریب چیزیں نظر کے سامنے تھیں۔ گھاس اور دیگر قسم کی نباتات بجائے سبز کے بالکل سیاہ رنگ کی تھی۔ خودرو پودے بھی جو درختوں کے زیر سایہ نشو و نما پاتے ہیں آٹھ دس فٹ تک بلند تھے۔ اور معمولی گھاس کی پتیاں میری ہتھیلی سے زیادہ بڑی تھیں، بعض پھولوں کا رنگ کسی قدر سرخی مائل عنابی تھا ورنہ سب سیاہ تھے۔

میں کائنات کے ہر ذرہ کو حیرت و استعجاب کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا کہ اچانک مکھی کی قسم کا ایک جانور جس کی جسامت نوزائیدہ بچے کے سر سے کسی طرح کم نہ ہوگی، نہایت تیزی کے ساتھ بھنبھناتا ہوا آیا اور میرے سینہ پر بیٹھ گیا۔ اس نے بار بار اپنے زہریلے ڈنک کو میرے جسم میں چبھونے کی کوشش کی مگر میرا کوٹ جو سخت چمڑے کا بنا ہوا تھا، اس کے حملوں کو برداشت کرتا رہا۔ آخر کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے میں نے اس کو جھٹکا دیا۔ اور وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔

میرے چاروں طرف کھیت ہی کھیت تھے جن کے اندر مختلف قسم کا سیاہ اناج لگا ہوا تھا۔ اور اناج کا ہر دانہ جنگلی بطخ کے انڈے کے برابر تھا۔ میں نے دو ایک دانے توڑ کر چبائے، وہ نہایت لذیذ اور خوش ذائقہ تھے تاہم ایک قسم کی مہک تھی۔ جو کسی قدر ناگوار معلوم ہوتی تھی۔ میں تمام چیزوں پر نگاہ ڈالتا چلا جا رہا تھا یہاں تک کہ ایک پختہ دیوار کے قریب پہنچ گیا۔ جو دو ڈھائی سو فٹ کے قریب بلند تھی، بظاہر وہ کھیت کی منڈیر معلوم ہوتی تھی۔ اور دوسری طرف جانے کے لئے اس میں کہیں کہیں رستے بنے ہوئے تھے، مگر میں اس پر چڑھ نہ سکا ہر سیڑھی چھ یا سات فٹ اونچی تھی۔ اور پتھر نہایت چکنے اور ڈھلوان تھے۔

میں اِسی جستجو میں تھا کہ دیوار کے اندر کوئی روزن نظر آجائے تو بہتر ہے کہ اتنے میں پاؤں کی چاپ سُنائی دی۔ میں نے مُڑ کر دیکھا۔ تقریباً ڈیڑھ سو گز کے فاصلے پر ایک نہایت طویل القامت انسان نُما حیوان نظر آیا۔ وہ میری طرف آ رہا تھا میں نے اندازہ لگایا کہ اس کا ہر قدم تیس فٹ کے قریب ہوتا ہے۔ میں نے ارادہ کیا کہ کسی محفوظ جگہ پوشیدہ ہو جاؤں۔ مگر نو وارد نے مجھ کو دیکھ لیا اور سو فٹ کے فاصلے سے اپنا ہاتھ بڑھا کر مجھے پکڑ لیا۔ اُس کی گرفت سے آزادی حاصل کرنے کی کوشش ایک فعلِ عبث تھا۔ جب کہ میں نے محسوس کیا کہ اُس کے ہاتھ کی سرانگلی میرے تمام جسم سے زیادہ موٹی ہے۔ مجھ کو نہایت غور سے دیکھ کر اس نے ایک قہقہہ لگایا ایک ایسا قہقہہ جس سے تمام فضا گونج اُٹھی۔

اس وقت میں نے دیکھا کہ اس کے حلق کا محیط اس قدر بڑا ہے کہ مجھ جیسے پانچ یا چھ آدمی بیک وقت اسکے اندر سے گُذر سکتے ہیں۔ معاً مجھ کو خیال آیا کہ اگر یہ شخص مجھ کو کھا جائے تو کیا ہو، اور اس خیال کے آتے ہی میرے بدن کے تمام رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ کیونکہ قدرتی طور پر ہر شخص کو اپنی جان عزیز ہوتی ہے۔ مگر نہیں، وہ شخص بہت رحمدل تھا امیر القمہ بنانے کی بجائے اس نے نہایت احتیاط کے ساتھ مجھ کو اپنے پاجامہ کی جیب میں رکھ لیا، جسکی تراش پتلون سے ملتی جلتی تھی۔ دو چار لمحے تک میں خاموش بیٹھا رہا مگر پھر بھاگ نکلنے کی ٹھان لی۔ چنانچہ دبے پاؤں جیب کے مُنہ تک آگیا۔ اس وقت وہ شخص گھاس کاٹنے میں مشغول تھا۔ اور میری نقل و حرکت کی اُسے مطلق خبر نہ تھی۔ کیونکہ میرا وزن یا میرے جسم کی جنبش اس کے لئے ناقابلِ احساس تھی۔ میں نے چھلانگ مارنے کا ارادہ کیا مگر ہمت نہ پڑی۔ کیونکہ اس جگہ سے جہاں میں کھڑا ہوا تھا، سطحِ زمین تقریباً ایک سو فٹ نیچی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ چوٹ لگنے سے ہڈی پسلی نہ ٹوٹ جائے۔ پھر بھی میں جیب کے باہر آگیا۔ اس کے سر کے بال جو میرے ازار بند کے برابر موٹے تھے کمر تک لٹک رہے تھے۔ میں ان کو پکڑ کر ایک چور کی طرح جسم کے بالائی حصّہ کی طرف چڑھنے لگا، یہانتک کہ کان کے اس حصہ میں جا بیٹھا جہاں ہم لوگ عطر کا پھویا رکھتے ہیں۔ وہاں اس قدر کُشادہ جگہ تھی کہ میں نہایت اطمینان کے ساتھ لیٹ گیا۔

اب اس شخص کی پریشانی ملاحظہ کیجئے۔ کہ تھوڑی دیر کے بعد مجھے باہر نکالنے کے لئے اس نے دوبارہ جیب میں ہاتھ ڈالا اور مجھ کو وہاں موجود نہ پاکر بہت حیران ہوا۔ مجھے بے اختیار ہنسی آگئی اور شاید اُس نے کچھ آواز سُن لی، کیونکہ ایک دم اس کا ہاتھ کان کی طرف اُٹھا، اور میں دوبارہ اس کی گرفت میں تھا۔ اُس نے نہایت غور کے ساتھ میرے تمام جسم کا جائزہ لیا۔ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ میرے کسی عضو میں نیش زنی کی قوت تو نہیں ہے۔ شاید وہ مجھ کو ایک مُہلک کیڑا سمجھتا ہوگا۔ بہرحال اچھی طرح معائنہ کر لینے کے بعد وہ ایک سمت روانہ ہو گیا۔ اُس وقت میں اس کی دو اُنگلیوں کے درمیان سخت تکلیف میں مُبتلا تھا اور اس کے ہاتھ کی ہر جنبش کے ساتھ جو سطحِ زمین سے ڈیڑھ سو فٹ کی بلندی پر نصف دائرہ کی شکل میں گردش کر رہا تھا۔ میری روح انقباضِ شدید حاصل کر رہی تھی۔ اس کی رفتار نہایت تیز تھی۔ کیونکہ جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں، اس کا ہر قدم تیس فٹ

نبا پڑتا تھا میں نے چیخ چیخ کر خدائے لایزال سے دُعا کی کہ اے خداوند! تو ہی اس بلائے ناگہانی سے مجھ کو چھٹکارا دینے والا ہے، مجھے جلد اس مصیبت سے آزاد کر۔ مگر میری دُعا قبول نہ ہوئی، میرا خدا مجھ سے ناراض تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ کُرّۂ ارض سے عالمِ مریخ تک پہونچنے کی جسارت کو کارکنانِ قضا و قدر نے نظامِ قدرت کی توہین تصوّر کیا ہے، اور اسی کی پاداش میں یہ عذابِ الٰہی مجھ پر نازل کیا جا رہا ہے، میں نے اُس دیوزادے سے بھی التجا کی کہ خدا تیرا قد اور بھی زیادہ دراز کرے۔ مجھ غریب الوطن کے حال پر رحم کر۔ مگر اس نے مطلق پروا نہ کی۔ بہت ممکن ہے کہ میری آواز اس کے کانوں تک نہ پہنچی ہو۔

---

وہ مجھ کو اپنے مکان میں لے گیا۔ جس کی تعمیر پہاڑوں کی سنگلاخ چٹانوں اور درختوں کے تنوں سے کی گئی تھی۔ ہیئتِ ظاہری سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ لوگ فنِ عمارت سے قطعی ناواقف ہیں، مکان کے اندر اس کی بیوی اور چار چھوٹے چھوٹے بچے موجود تھے۔

وہ مجھے دیکھ کر پہلے تو خوفزدہ ہوئے، مگر دیوزادے سے تمام حال سُن لینے کے بعد دلچسپی کا اظہار کرنے لگے۔ خاص طور پر اس کا بڑا لڑکا مجھ سے بہت جلد مانوس ہو گیا۔ مُلازمہ کی اطلاع پر کہ کھانا تیار ہو گیا ہے، ہم سب دوسرے کمرے میں گئے۔ میرے میزبان کرسیوں پر بیٹھ گئے اور ازراہِ کرم میرے قامت کا خیال کرتے ہوئے مجھ کو میز کے اوپر ایک پیالہ کی پُشت پر بٹھا دیا۔ تاکہ میرا ہاتھ آسانی کے ساتھ کھانے کی رکابی تک پہنچ سکے۔ ایک پلیٹ میں پُلاؤ تھا جس کے اندر گوشت کی بوٹیوں کے بجائے سالم جانور پڑے ہوئے تھے، اور چاول کا ہر دانہ گاجر مولی کے برابر لمبا تھا۔ دوسری پلیٹ میں سیاہ رنگ کا شوربہ دار سالن تھا۔ جس کے اندر تربوز کے برابر آلو تیر رہے تھے۔ دیوزادے نے شوربہ چاول کی پلیٹ میں ڈالا اور کھانا شروع کیا۔ ساتھ ہی مجھکو بھی اشارہ کیا۔ اس وقت میرے لئے یہی مناسب تھا کہ اس کے احکام کی تعمیل کرتا رہوں۔ چنانچہ پلیٹ میں سے ایک چاول اُٹھایا اور خوب اچھی طرح دیکھ بھال کے اس کو کُتر کُتر کر کھانے لگا۔ تین چاول کھانے کے بعد میرا شکم سیر ہو گیا۔ مگر وہ لوگ بدستور کھاتے رہے۔ مُلازمہ نے جو قریب ہی کھڑی تھی، میری ضرورت کو محسوس کیا، اور فوراً اپنے ہاتھ میں پانی کا ایک ٹب اُٹھا لائی۔ جس کے اندر سیاہی گھول رکھی تھی یا قدرتی طور پر وہاں کے پانی کا رنگ سیاہ ہوتا ہوگا۔ بہرحال میں نے دو تین چُلو پانی پی کر خدا کا شکر ادا کیا۔ میری اس قلیل المقدار خور و نوش پر سب لوگ ہنسنے لگے۔ حالانکہ میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت بھی میں اپنی خوراک سے زیادہ کھا چُکا تھا۔

وہ لوگ اپنے کھانے میں مشغول تھے کہ اسی اثناء میں ایک بلّی جو بیل سے زیادہ فربہ تھی کمرے میں گھس آئی۔ اور کسی کی نگاہ اس پر نہ پڑی۔ مگر میں خوف کے مارے سہم رہا تھا۔ اور جس بات کا اندیشہ تھا وہ ہو کر رہا۔ یعنی اُس نے موقع پا کر ایک جست لگائی اور مجھ کو مُنہ میں دبا کر بھاگ جانا چاہا کہ اچانک ملازمہ کی نگاہ پڑ گئی اور

اس نے فوراً بلی کی گردن پکڑ کر مجھے آزاد کر دیا۔

میں نے شکریہ ادا کرنے کے لئے اپنی محسنہ کی طرف دیکھا اور وہ شاید میرے اشارات کو اظہارِ محبت سمجھ کر شرما گئی۔

کھانے سے فارغ ہو کر ہم دوسرے کمرے میں چلے گئے جہاں نرس ایک شیر خوار بچے کو بہلا رہی تھی۔ بچہ جو میرے قد و قامت سے آٹھ یا دس گنا بڑا تھا۔ مجھ کو دیکھ کر رونے لگا۔ اور اپنے دونوں ہاتھ اس طرح پھیلا دئے، گویا وہ مجھ کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔

مُلازمہ نے مجھے اُٹھا کر اس کے ہاتھ میں دیدیا۔ بچوں کی نطرت میں داخل ہے کہ وہ ہر شے کو اپنا کھلونا سمجھتے ہیں اور عموماً اس کو چوس کر اپنا دل خوش کرتے ہیں۔ چنانچہ اس طفلِ شیر خوار نے بھی مجھ کو ایک مصنوعی کھلونا تصور کیا اور فوراً میری کمر پکڑ کر میرے سر کو چوسنا شروع کر دیا۔ انتہائی کرب و بلا کے عالم میں ایک بر دست چیخ میرے مُنہ سے نکل گئی جس سے ڈر کر بچے نے مجھے چھوڑ دیا اور اگر میری ٹانگ نرس کے پھٹے ہوئے دامن میں نہ اُلجھ جاتی تو میں یقیناً زمین پر گرتا اور میرا سر پاش پاش ہو جاتا۔

اب رات کافی گذر چکی تھی اور راستہ کی تھکن نے بھی میرے اعصاب کو مُضمحل کر دیا تھا۔ اس لئے نیند کی کیفیات میرے اوپر طاری ہونے لگیں۔ غنیمت ہے کہ دیوزاد میرے مطلب کو سمجھ گیا اور فوراً نرس کو ہدایت کی کہ مجھ کو خوابگاہ میں لے جائے۔

---

صبح ہونے تک میں نہایت اطمینان کے ساتھ سوتا رہا۔ البتہ رات بھر بھیانک خواب دکھائی دئے۔ جن کی دہشت سے کبھی کبھی میں چونک پڑتا تھا۔ سب سے پہلے میں ہی بیدار ہوا۔ لیکن پلنگ پر ہی پڑا رہا۔ کیونکہ وہ سطح زمین سے چالیس یا پچاس فٹ بلند تھا۔ جس پر سے بغیر زینے کے اُتر آنا میرے لئے بہت مشکل تھا۔ میں ماضی کی یاد، حال کے تصور، اور مستقبل کی فکر میں خاموش لیٹا تھا کہ اتنے میں دو چوہے اُچھلتے کودتے میرے قریب آ گئے، جو شکاری کتوں کے برابر تھے۔ میں نے جلدی سے اپنا تمام جسم اُس کمبل میں لپیٹ لیا۔ جو پلنگ پر رکھا تھا اور تین فٹ موٹے چمڑے سے تیار کیا گیا تھا۔ مگر چوہے اس قدر ظالم تھے کہ اپنے تیز دانتوں سے کمبل کے پرخچے اُڑا دیتے۔ اب سوائے اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ میں اپنا پستول جس کو اب تک اپنے پاس چُھپا رکھا تھا باہر نکال لوں اور ان مُوذی حملہ آوروں کی زندگی کا خاتمہ کر دوں۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا اور ایک گولی سے دونوں کو ہلاک کر دیا۔ خون کے فوّارے جاری ہو گئے، اور میرا تمام جسم بستر وغیرہ اس سے غلیظ ہو گیا۔ خون بالکل سیاہ اور کسی قدر لیسدار تھا۔

گولی کی آواز سُنکر دیوزاد اور دیگر افرادِ خانہ جو ملحقہ پلنگوں پر نیم بیداری کے عالم میں لیٹے کروٹیں بدل رہے تھے، اُٹھ بیٹھے۔ اگرچہ وہ آواز اُن کے نزدیک کچھ زیادہ اہم نہیں تھی اور شاید بعض نے اچھی طرح

سُنی بھی نہ ہو۔ مگر ان کو میرے آرام کا بہت خیال تھا۔ اور انہوں نے محسوس کر لیا کہ اس دُنیا کی معمولی سے معمولی تکلیف میرے لئے عذاب الیم کے برابر ہے۔ اس لئے نرس فوراً دوڑ کر میرے پلنگ کے پاس آگئی اور چوہوں کی لاشیں دیکھ کر بے اختیار ہنس پڑی اس نے دونوں کی دُم پکڑ کر کھڑکی کے باہر پھینک دیا اور دوسری چادر پلنگ پر بچھا دی۔ میں نے اپنا پستول پہلے ہی چھپا لیا تھا تاکہ آیندہ بھی وقتِ ضرورت کام آجائے۔

پھر نرس مجھ کو غسل خانہ میں لے گئی۔ اور نہانے کا اشارہ کر کے باہر نکل آئی۔ میں نے چاروں طرف نگاہ ڈالی۔ غسل خانہ میں سیاہ پانی کا حوض بھرا ہوا تھا۔ میں نے سوچا کہ نہانے سے پہلے حوائج ضروری سے فارغ ہو جاؤں، کیونکہ دو روز سے اجابت نہیں ہوئی تھی اور پیٹ میں سخت تکلیف تھی۔ لہذا "قدرت کی پکار کا جواب" دینے کے لئے ایک کونہ میں بیٹھ گیا۔

اس کے بعد تمام کپڑے اُتار کر حوض میں کود پڑا جس کے اندر نہایت آسانی کے ساتھ تیر سکتا تھا۔ بڑا لُطف حاصل ہوا صرف پانی کی سیاہی کسی قدر ناگوار معلوم ہو رہی تھی۔ میں ابھی حوض کے اندر ہی تھا کہ میرے "فادر دیوزاد" کی بڑی لڑکی کواڑ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ اُس نے مجھ کو نہیں دیکھا، کیونکہ اس وقت میرے جسم کا زیادہ حصہ پانی کے نیچے تھا۔ اُس نے فوراً اپنے چمڑے کے کپڑے اُتار دیئے اور بالکل برہنہ ہو گئی۔ اس کا سارا جسم اپنی تمام تر کثافتوں کے ساتھ بالکل عُریاں حالت میں میرے لئے "دوزخِ نگاہ" بنا ہوا تھا۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ اس نظارے سے مجھے کتنی کراہیت حاصل ہوئی۔ اور اگر اس وقت اپنے ذہن میں لطیف و خوشگوار اشیاء کا تصور نہ کرتا تو یقیناً استفراغ ہو جاتا۔ پانی کی خنکی نے بھی طبیعت کو کسی قدر سکون بخشا۔

---

ناشتہ کی غرض سے مُلازمہ مجھ کو کھانے کے کمرے میں لے گئی۔ باقی تمام اراکینِ خانہ وہاں موجود تھے، میں نے دیکھا کہ میز پر اُبلے ہوئے انڈے رکھے ہیں، جن میں سے ہر ایک کا حجم بلامُبالغہ مسجدِ اقصیٰ کے گنبد سے زیادہ تھا۔ لیکن رنگ بجائے سفید کے وہی سیاہ۔ میں نے نتیجہ نکالا کہ اُس دُنیا میں کالا رنگ بہت کثرت سے پایا جاتا ہے، ہر چیز سیاہ نظر آتی تھی، حتیٰ کہ درختوں اور بیلوں کے پتے بھی سیاہ رنگ کے تھے۔ اسی لئے ان لوگوں کو یہ رنگ بہت مرغوب تھا۔ اور ارادتاً اپنے جسموں کو سیاہ کر لیتے تھے، چنانچہ اُن کے معیارِ حُسن سے وہی عورت سب سے زیادہ خوبصورت سمجھی جاتی تھی جس کے جسم کی جلد گہری سیاہ ہو۔ نیز وہ ایک قسم کا مصالحہ لگا کر اپنے دانتوں کا رنگ بھی تبدیل کر دیتے تھے۔

انڈوں کے علاوہ بڑی بڑی دیگوں میں ایک قسم کا شوربہ تھا، جس کا مزا کسی قدر تُرش تھا، اور لمبی لمبی اُبلی ہوئی مچھلیاں اس کے اندر تیر رہی تھیں، اور خوشبو بھی نہایت لطیف آرہی تھی۔

ان سب کے ہاتھ میں نوکدار سلاخیں تھیں، جن کو وہ مچھلیوں کے جسم میں چبھوتے اور پھر دیگ میں سے نکال کر کھا لیتے۔ اس کے بعد ایک ڈونگا اس شوربہ کا پی لیتے۔ مجھے بھی اشارہ کیا گیا۔ کہ ان کے ساتھ ناشتہ میں

حصے ہوں، مگر میں اُن کی مُطابقت نہ کر سکا۔ کیونکہ وہ آہنی سلاخیں اس قدر بھاری تھیں کہ میں دونوں ہاتھوں سے نہ اُٹھا سکا۔ اس لئے مجبوراً ہاتھ سے ایک مچھلی نکالی اور اس کا صرف ایک سولہواں حصہ کھایا تھا کہ پیٹ بھر گیا۔ دراں حالیکہ ان میں سے ہر ایک شخص کم و بیش چار پانچ مچھلیاں کھا چُکا تھا۔

شوربے کے بعد انہوں نے انڈے توڑے، میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ اندر سے جانوروں کے بچے بھُنی ہوئی حالت میں نکل رہے ہیں۔ اُن میں سے بعض بچے بھینس کے تھے اور بعض ہاتھی وغیرہ کے۔

بہت ممکن ہے کہ بعض لوگ میرے اس بیان کو تسلیم نہ کریں۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ میں نے بچشم خود وہاں کے چوپایوں کو انڈے دیتے ہوئے دیکھا، اور اس سے زیادہ تعجب خیز بات یہ ہے کہ وہاں کی عورتیں بھی چار ماہ حاملہ رہنے کے بعد دس گیارہ انڈے دیتی ہیں جن میں سے صرف ایک انڈا خاندانی نسل کو قائم رکھنے کیلئے محفوظ کر لیا جاتا ہے۔ اور باقی عزیز و اقارب میں تقسیم کر دئے جاتے ہیں۔ یہ اُن کی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ اُن کو اُبال کر کھائیں یا گھی میں تل کر۔ اُن کے اندر سفیدی یا زردی نہیں ہوتی بلکہ ابتدا ہی سے بچے موجود ہوتے ہیں۔ اسی لئے صرف دو تین دن گرم جگہ رکھنے سے ان کا چھلکہ شکستہ ہو جاتا ہے۔ اور زندہ بچے برآمد ہو جاتے ہیں۔

برسبیل تذکرہ یہ بتا دینا بھی مناسب ہے کہ اُس دُنیا میں استقرار حمل کا طریقہ نہایت عجیب ہے یعنی جب عورت جوان ہو جاتی ہے۔ تو اس کے جسم میں سے ایک قسم کی بدبو خارج ہونے لگتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اب اس کے اندر افزائش نسل کا مادہ پیدا ہو گیا ہے۔ اس وقت وہ عورت اپنے دائیں بازو کا کچھ گوشت کاٹ کر کسی مرد کو پیش کر دیتی ہے، وہ اس کو کچا کھا لیتا ہے اور تین روز تک بالکل بھُوکا رہتا ہے۔ صرف پانی پر گذر اوقات ہوتی ہے۔ تین یوم کے بعد وہ اپنے بائیں بازو میں سے اتنا ہی گوشت کاٹ کر اسی عورت کو واپس کر دیتا ہے، عورت اس کو کھا لیتی ہے اور فوراً حمل قرار پا جاتا ہے۔ دوران حمل میں عورت ہر روز اس مرد کی پیشانی کو چاٹتی رہتی ہے تاکہ انڈے کے اندر بچے کی نشو و نما جلد ہو سکے۔

ان لوگوں نے مجھے بھی ترغیب دی کہ میں اُس دُنیا میں اپنی بقائے نسل کی تدبیر کروں۔ مگر میں نے انکار کر دیا۔ کیونکہ روانگی سے قبل اپنی بیوی سے وعدہ کر لیا تھا کہ اہل مریخ کے ساتھ ہنگامی تعلقات کے سوا کوئی دوامی رشتہ قائم نہیں کروں گا۔ علاوہ ازیں میں نے خود بھی پسند نہیں کیا کہ میری اولاد کسی دوسری دُنیا میں پیدا ہو اور وہاں بود و باش اختیار کرے۔

---

رفتہ رفتہ میری آمد کی اطلاع قُرب و جوار کے تمام شہروں میں ہو گئی اور لوگ نہایت ذوق و شوق کے ساتھ مجھے دیکھنے کے لئے آنے شروع ہو گئے۔ صبح سے شام تک میرے آقا کے مکان پر ایک ہجوم رہتا تھا۔ تمام لوگ تعجب کی نگاہوں سے گھُورتے تھے۔ اُنہوں نے ہمکلام ہونے کے لئے بھی کوشش کی، مگر ناکامیاب۔ اوّل تو زبان کا اختلاف

ہی اتنا زیادہ تھا کہ ہم ایک دوسرے کا مطلب سمجھنے سے قاصر تھے۔ دوسرے لہجہ بالکل متضاد۔ میری آواز بمشکل اُنکے کانوں تک پہنچتی، اور اُن کی آواز اس قدر تیز کہ اس کو سُنکر میرے کان گُنگ ہو جاتے۔ اور اس طرح نہ میں اُنکا مطلب سمجھ سکتا تھا نہ وہ میرا مفہوم۔ مگر پھر بھی ایک تانتا بندھا ہوا تھا اور دُور دُور سے لوگ چلے آتے تھے۔ یہاں تک کہ یہ خبر ایوانِ شاہی تک پہنچ گئی۔ اور ملکہ کو بھی مجھے دیکھنے کا اشتیاق ہوا۔ چنانچہ ایک روز صبح کے وقت جب کہ ہم لوگ ناشتہ سے فارغ ہو کر بیٹھے ہی تھے کہ ایک شاہی پیغام آیا جس کے ذریعہ میرے آقا کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ عجیب و غریب جانور جو تمہاری ملکیت میں ہے فوراً ہمارے دربار میں حاضر کر دو، ورنہ سخت سزا کے مستوجب ہوگے۔

وہاں ہمیشہ سے دستور ہے کہ نظامِ حکومت صنفِ نازک کے ہاتھوں میں رہتا ہے۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ سلطنت ہزاروں خاندانوں کے مجموعے کا نام ہے اور چونکہ یہ امر مسلّم ہے کہ عورت خانہ داری کے اصول سے اچھی طرح واقف ہوتی ہے، اس لئے ثابت کیا جا سکتا ہے کہ یہ صنف حکومت کا انتظام بھی نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دے سکتی ہے۔

بہرحال میرے مالک نے فوراً دارالسلطنت جانے کے لئے سفر کی تیاری شروع کر دی۔ لکڑی کے چھوٹے سے بکس میں بہت سارا اُون بچھا کر اُوپر سے ایک کپڑا ڈال دیا تاکہ نرم بستر بن جائے۔ اس کے اندر میں نہایت اطمینان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ وہ سب طرف سے بند تھا صرف دو سُوراخ تھے جو دروازوں کا کام دے رہے تھے۔ میرا مالک مع مُلازمہ کے ایک بیل گاڑی میں سوار ہوا اور میرا بکس بھی اسکے اندر رکھ لیا۔ گھر کے باقی آدمیوں میں سے اور کوئی ہمارے ساتھ نہیں تھا۔

دو روز اور ایک رات کی طویل مسافت کے بعد ہم سب دارالسلطنت میں پہونچے۔ میرے آقا نے اشاروں کے ذریعہ مجھے آدابِ شاہی سے واقف کر دیا تاکہ ملکہ کے حضور میں کسی قسم کی گستاخی سرزد نہ ہو۔ اُس نے مجھے بتایا کہ دربار میں داخل ہو کر سب سے پہلے تین سجدے کرو۔ پھر دوڑ کر ملکہ کی گدّی کا ایک بوسہ لو۔ اس کے بعد خوب اکڑ کر تخت کے آگے کھڑے ہو جاؤ۔ اس طرح کہ نظریں بالکل نیچی ہوں۔ کیونکہ دربار کے وقت ملکہ لباسِ عریانی میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ اور کسی شخص کو اجازت نہیں ہوتی کہ اس کے برہنہ جسم پر نگاہ ڈال سکے۔

میں ڈر رہا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھ سے آداب بجالانے میں کوئی غلطی ہو جائے، اور جلیل القدر ملکہ میرے لئے موت کا حکم دیدے لیکن خدا کا شکر ہے کہ ملکہ نے مجھ کو دیوان خانہ میں طلب نہیں کیا۔ بلکہ صبح کے وقت جبکہ وہ اپنے صحنِ چمن میں مصروفِ گلگشت تھی تو اپنی ایک کنیز کو بھیجکر مجھے بُلا لیا۔ اُصولاً اس وقت میرے لئے ضروری نہیں تھا کہ ملکہ کا احترام کرنے کے لئے سر جُھکاؤں یا اُسکی گدّی کا بوسہ لوں۔

ملکہ اپنی سہیلیوں کے ہمراہ پھولوں کے ایک تختہ کے قریب کھڑی تھی۔ اس کا لباس نہایت عمدہ اور خوشنما تھا۔ مگر قومی رسم و رواج کے مطابق اس کے چہرے پر سیاہ غازہ اس قدر زیادہ ملا گیا تھا کہ ایک کالی بلا معلوم ہوتی تھی۔ اور اگر اس وقت روز روشن نہ ہوتا تو شاید خوف کے مارے میرے اوپر بیہوشی طاری ہوجاتی۔

ملکہ نے مجھے اپنی ہتیلی پر کھڑا کر لیا۔ اور میں اظہار عقیدت کے لئے اپنے دونوں بازو پھیلا کر اسکی درمیانی انگلی سے بغلگیر ہوگیا۔ اور دیر تک سر انگشت کے بوسے لیتا رہا۔ ملکہ بہت خوش ہوئی اور دوسرے ہاتھ کی چھوٹی انگلی نہایت شفقت کے ساتھ میرے سر پر پھیرنے لگی۔ اس کی سہیلیاں بھی تعجب آمیز تبسم کے ساتھ میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ میں نے از راہ شوخی ملکہ کے گجرے میں سے ایک پھول توڑ لیا۔ اور فوراً اس کی پتیوں کے درمیان بیٹھ گیا۔ جو اس قدر بڑی اور موٹی تھیں کہ اس پھول کی کشتی بنا کر بڑے سے بڑے دریا کو نہایت اطمینان کیساتھ عبور کیا جا سکتا ہے۔ میری اس حرکت پر ملکہ نے ایک ایسا فرمائشی قہقہہ لگایا کہ اس کی شدید گرج سے میں ڈر گیا اور میرا ننھا کمزور دل سینہ کے نیچے دھک دھک کرنے لگا۔

اس کے بعد ملکہ مجھ کو اپنی گود میں لیکر ایک آرام کرسی پر بیٹھ گئی اور اپنی سہیلیوں کو رقص و سرود کا حکم دیا ——— الٰہی توبہ ——— میں نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔ پھر بھی زمین کی لرزش مجھے محسوس ہورہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قرب و جوار میں کوئی آتش فشاں پہاڑ پھٹ گیا ہے جس کے صدمے سے زمین جنبش میں ہے لیکن وہ زلزلہ صرف مجھ کو ہی خوفزدہ بنا سکتا تھا۔ ملکہ بالکل مطمئن تھی۔ اور شاید اس کو یہ کیفیت محسوس بھی نہ ہوئی ہو جس کی وجہ صرف یہ ہوسکتی ہے کہ میرے اور وہاں کے لوگوں کے قد میں زبردست اختلاف تھا اسلئے ان کی ہر معمولی بات بھی میرے لئے کافی اہمیت رکھتی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ ان سب نے مل کر کوئی نغمہ نہ سنایا ورنہ مجھے یقین ہے کہ اس شور قیامت سے میں اسی وقت بہرا ہوجاتا۔ صرف ایک سہیلی نے ہلکے سُروں میں رُباب کی قسم کا ایک ساز چھیڑا جس کے دلفریب نغمے میری روح کو بھی وجد میں لے آئے۔ میں نے سوچا کہ میں بھی کوئی لطیف راگ سُناؤں۔ اور اس خیال کے ساتھ ہی اشارہ کرکے میں نے سہیلی کے ہاتھ سے وہ رُباب لے لیا لیکن خدا کی پناہ ——— اپنی پوری قوت صرف کر دینے کے باوجود میں اسکے ایک تار میں بھی لرزش پیدا نہ کر سکا۔ کیونکہ وہ تار کیا تھے آہنی سلاخیں تھیں۔

---

ملکہ مجھے اپنی محلسرا میں لے گئی۔ اور نہایت آرام کے ساتھ ایک نرم گدیلے پر بٹھا دیا۔ اتنے میں ایک ضعیف العمر شخص جو ملکہ کا باپ تھا کمرے میں آگیا اور مجھے حیرت و استعجاب کے ساتھ دیکھنے لگا۔ ملکہ نے میرا تعارف کرایا جس سے اس کا باپ بہت خوش ہوا۔ پھر دماغ پر زور ڈال کر کسی فراموش کردہ بات کے یاد کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس وقت صاف معلوم ہو رہا تھا کہ یہ شخص فلسفی ہے اور بے شمار علوم و فنون کا ماہر ہے۔ اس کی فکر رسا بالآخر کامیاب

رہی کہ وہ جس بات کو یاد کر رہا تھا ذہن میں آگئی۔ اس نے قریب کی ایک الماری کھول کر آبنوسی لکڑی کا ایک صندوقچہ نکالا جو اپنی پیمائش کے لحاظ سے میرے مُطالعہ کے کمرے سے بڑا تھا۔ لکڑی کرم خوردہ اور بوسیدہ ہو چکی تھی۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ صدیوں سے اسے کسی نے ہاتھ بھی نہیں لگایا کیونکہ اس کے ڈھکنے پر مٹی کی دو یا تین نٹ موٹی تہ چڑھی ہوئی تھی۔

بوڑھے نے صندوقچہ کھول کر ایک چرمی دستاویز نکالی۔ پہلے خود اس کا مُطالعہ کیا پھر بآوازِ بلند اس کو پڑھ کر ملکہ کو سُنایا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اس وقت ان دونوں کے چہرے میں تغیر ظہور پذیر ہو رہے۔ دستاویز پڑھنے کے بعد اُنہوں نے دوبارہ مجھ کو گہری نگاہ سے دیکھا۔ اور پھر آپس میں گفتگو کرنے لگے۔ جس کے مفہوم کو سمجھنے سے میں قاصر تھا میں ڈر رہا تھا کہ مُستقبل قریب میں کوئی آفتِ ناگہانی نازل نہ ہو اور اسی لئے خوف کے مارے میری آنکھیں بند ہوئی جاتی تھیں۔ مگر میں کوشش کر رہا تھا کہ ہوشیار رہوں تاکہ ان کی کوئی نقل و حرکت میری لاعلمی میں نہ ہو۔ میں نے اپنی جیب کو ٹٹولا اور کسی قدر مطمئن ہو گیا۔ میرا پستول جس کے اندر دو تین گولیاں باقی تھیں جیب کے اندر موجود تھا میں نے فیصلہ کیا کہ وقتِ ضرورت مُدافعت کرنے کے لئے اس کو ضرور استعمال کرونگا۔ اگرچہ مجھے بہت کم اُمید تھی کہ اس کی گولی ان دیوزادوں کے جسم میں کوئی اثر کر سکے گی۔

ملکہ نے اپنی ایک کنیز کو کچھ ہدایت کی جو آداب بجالا کر واپس چلی گئی۔ تھوڑی دیر میں ایک دوسرا شخص داخل ہوا جس کے ساتھ مُلازم کے سر پر ایک بہت بڑا صندوق تھا۔ کچھ دیر نو وارد کی بوڑھے سے گفتگو ہوتی رہی۔ اس نے بھی دستاویز پر نظریں ڈالیں پھر مجھ کو دیکھا۔

اس کے بعد اُس نے اپنا صندوق کھولا جس کے اندر چند مٹکے رکھے ہوئے تھے۔ ایک ٹب کے اندر ان مٹکوں میں سے مختلف رنگ کا پانی اُلٹا۔ میں نے قیاس سے معلوم کر لیا کہ یہ ادویات ہیں اور نو وارد ڈاکٹر ہے ــــ لیکن کیسا ڈاکٹر اور کس کا علاج؟ ــــ کیا وہ مجھ کو مریض تصور کر رہے تھے؟۔

میں اس دوا کے پینے کے لئے رضامند نہیں تھا مگر ڈاکٹر نے زبردستی اس کے چند قطرے میرے حلق میں ڈالدئے، اور میں کچھ دیر کے لئے بیہوش ہو گیا۔

---

مجھے ہوش آیا تو میں نے دیکھا کہ ملکہ میرے قریب بیٹھی ہے۔ بوڑھا شخص اور ڈاکٹر قریب کھڑے ہیں۔ اور اُن سب کے چہروں سے حیرت و استعجاب ظاہر ہے۔ مجھ کو عالمِ بیداری میں دیکھ کر ملکہ مسکرائی۔

"ہجلسٹر وپنجم چلیغچند وخنا لپنچپفنلیقرون غفگنفنلسلتم" غیرارادی طور پر یہ جُملے میری زبان سے نکل گئے لیکن جب میں نے غور کیا کہ آخر یہ کون سی زبان ہے جو میں بول رہا ہوں۔

ملکہ ڈاکٹر سے مخاطب ہو کر بولی:۔

"الیسملفپیر چینیا فنخ غیغلیلد ولفت اسلتر ولذ دنم بلا" ور اس جُملے کے ساتھ ہی اُس نے اپنی کنیز کو حکم دیا کہ پینے کے لئے پانی لے آؤ۔ کیونکہ یہی میری استدعا تھی۔ پیاس کے مارے میرے گلے میں کانٹے پڑے جاتے تھے۔

ملکہ بہت مسرور تھی کہ میں اُن کی زبان میں گفتگو کرنے اور اُسے سمجھنے کے قابل ہو گیا' اور اس لئے اس نے ڈاکٹر کا شکریہ ادا کرتے ہوئے مُبارک باد دی تھی۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئی :۔

"اے اسرار مجسم! اے عجیب الخلقت انسان بتا کہ اب تیرا کیا حال ہے؟"

میں :۔ "ہمدردی کا شکریہ۔ لیکن آپ نے میرے وجود میں کیا تبدیلی پیدا کر دی ہے کہ میں بغیر سیکھے آپ کی زبان میں بولنے لگا اور نہ صرف یہ بلکہ گفتگو سمجھنے کے بھی قابل ہو گیا ہوں۔

ملکہ :۔ کچھ نہیں، یہ تو معمولی بات ہے۔ اس سے قبل زحل اور عطارد کے چند لوگ ہماری دُنیا میں آئے تھے۔ اُس وقت بھی ہم کو اسی دقت کا سامنا کرنا پڑا یعنی وہ ہماری زبان بولنے اور سمجھنے سے قاصر تھے۔ اس لئے ان کے جانے کے بعد ہمارے ڈاکٹروں نے کوشش کی کہ ایسی دوا تیار کی جائے جس کے استعمال سے ایک شخص میں ہر زبان بولنے اور سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ اس کا پہلا تجربہ آپ پر کیا گیا۔ اور نتیجہ ظاہر ہے کہ ہمارے ڈاکٹر کامیاب ہو گئے۔

میں :۔ بہت خوب! اچھا یہ تو بتایئے کہ اس چمڑے کے ٹکڑے پر کیا لکھا تھا جو آپ کے والد بزرگوار نے پڑھ کر سُنایا تھا۔

ملکہ :۔ وہ ایک قدیم دستاویز تھی، جو ایک نامعلوم زمانے میں کسی نے تحریر کی تھی اور اس کے ذریعہ پیشینگوئی کی تھی کہ سنہ ۳۲۸۹ھ میں کرہ ارض کا ایک شخص آئے گا۔ اور اس کی ہستی ہم مریخ والوں کے لئے بہت مفید ثابت ہو گی۔ یہی وہ زمانہ ہے یعنی سنہ ۳۲۰۹ھ۔ اور ہم کو یقین ہے کہ تم کرۂ ارض سے آئے ہو۔

میں نے ملکہ کے آخری بیان کی تائید کی۔ اور اس کے بعد بہت دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ کھانے کا وقت آگیا۔

کھانے کے متعلق مفصل حالات بیان کرنے ضروری نہیں۔ کیونکہ اس سے قبل کچھ دائرۂ تحریر میں آچکے ہیں۔ صرف فرق یہ ہے کہ یہاں قصر شاہی میں ہونے کے باعث نہایت عمدہ اور لذیذ کھانے میسر آئے۔ جن کا ذائقہ ابتک میری زبان پر باقی ہے۔

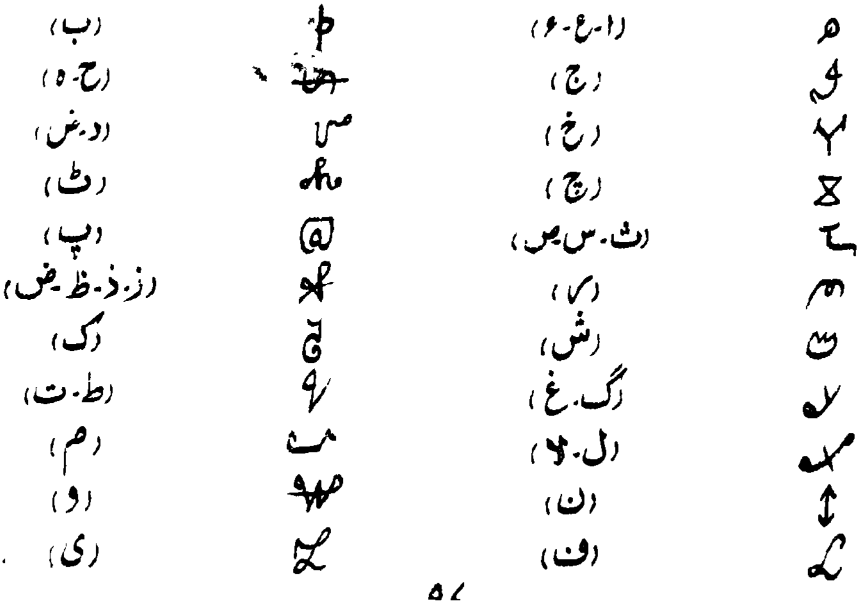
کھانے کے دوران میں پُرلطف گفتگو بھی جاری رہی کیونکہ میں نہایت حسن وخوبی کے ساتھ وہاں کی زبان بولنے لگا تھا۔ میرے نطق میں اس قدر قوت پیدا ہو گئی تھی کہ جانوروں اور درختوں وغیرہ سے ہمکلام ہونے میں بھی کوئی دقت محسوس نہ ہوتی تھی اور اسی طرح ان کی نامعلوم زبانوں کو نہایت آسانی سے سمجھ سکتا تھا۔

اِس وقت عالمِ مریخ سے واپس چلے آنے کے بعد بھی یہ قوت میرے اندر باقی ہے۔ اور کرۂ ارض کے کسی ملک کی زبان ایسی نہیں ہے جو اس وقت میں نہ بول سکوں یا نہ سمجھ سکوں۔ میں ڈاکٹر بوس کے اس نظریہ کی تائید بھی کر سکتا ہوں کہ درختوں میں جان ہے۔ کیونکہ میں اپنی دُنیا میں اُگنے والے درختوں کو آپس میں راز و نیاز کی گفتگو کرتے ہوئے سُنتا ہوں۔

ہماری اِس مختصر سی دُنیا میں عرصۂ دراز سے کوشش کی جارہی ہے کہ ایک ایسی زبان ایجاد کی جائے جو بین الاقوامی ہو۔ بشرطیکہ اُس کے بولنے میں دُنیا کے کسی باشندے کو دقت محسوس نہ ہو۔ وہ نہایت جامع ہو اور اس کی صرف و نحو بدرجۂ اتم مکمل ہو، کیونکہ ماہرِ لسانیات اُسی زبان کو بہتر بتاتے ہیں، جس کے قواعد میں مستثنیات نہ ہوں۔ اِس میں شک نہیں کہ رائج الوقت زبانوں کی افراط سے مختلف قوموں کے درمیان اکثر غلط فہمیاں قائم ہو جاتی ہیں۔ اور اس مشکل کا تدارک محض اسی طرح ہو سکتا ہے کہ تمام دُنیا کے باشندے صرف ایک زبان میں اظہارِ خیال کیا کریں، ایسی صورت میں سیاحوں کو بھی دقت کا سامنا کرنا نہیں پڑیگا۔

اِس سلسلہ میں سینکڑوں علماء و فضلاء نے طبع آزمائی کی، مگر نا کامیاب رہے۔ ابتدا میں انہوں نے خیال کیا کہ نئی زبان ایجاد کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ موجودہ زبانوں میں سے کسی ایک کو منتخب کر لیا جائے۔ مگر یہ تجویز منظور نہ ہوئی۔ کیونکہ ہر ملک والے نے اپنی زبان کو اہم اور بین الاقوامی درجہ حاصل کرنے کے قابل بتایا۔ اس کے بعد دو ایک زبانیں ایجاد بھی کی گئیں۔ جن میں سے اسپرانٹو قابلِ ذکر ہے۔ مگر وہ بھی آخرکار ناقص ثابت ہوئی۔

اہلِ مریخ صرف ایک زبان بولتے ہیں جو بہت مکمل ہے۔ میرے خیال میں اگر اس کو ہم لوگ بھی اپنی دُنیا میں رائج کر لیں تو اس کاوشِ پیہم سے رہائی ہو جائے گی، کیونکہ یہ زبان انتہا سے زیادہ مختصر مگر پھر بھی نہایت جامع ہے۔ سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کی ابجد میں کل بائیس ۲۲ حروف ہیں جس کی وجہ سے یہ اور بھی زیادہ آسان ہو گئی ہے۔ چونکہ میں چاہتا ہوں کہ دُنیا والے اس کو اختیار کر لیں اس لئے اسکی مختصر کیفیت برسبیلِ تذکرہ بیان کر دیتا ہوں۔ اِس زبان کے حروفِ ابجد حسبِ ذیل ہیں:۔



اِن کے علاوہ اُردو کے جن حروف کے مقابل میں کوئی حرف نہیں لکھا گیا، اُن کی بابت یہ سمجھ لینا چاہئے کہ وہ اس زبان میں موجود نہیں ہیں۔ اور شاید اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اہلِ مریخ کی زبان سے اس کا تلفظ ہی نہیں نکلتا۔ مثلاً اہلِ پنجاب کی طرح وہ صرف کؔ بولتے ہیں اس لئے قؔ کی ضرورت نہیں رہی۔

یہ زبان نہ دائیں سے بائیں کو لکھی جاتی ہے، نہ بائیں سے دائیں کو۔ نہ نیچے سے اوپر اور نہ اوپر سے نیچے۔ بلکہ اس کی سطر مرکز سے شروع ہو کر دائرہ کی شکل میں گھومتی رہتی ہے، اور اس طرح تمام صفحہ ختم ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کتابیں بجائے مستطیل ہونے کے بالکل گول یا بیضوی ہوتی ہیں۔

اس زبان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کی گرامر کے تمام قاعدے کلیہ ہیں۔ اور مستثنیات کو بالکل دخل نہیں۔ تمام الفاظ کا مصدر ایک چہار حرفی لفظ ہوتا ہے جس کے آگے مختلف حروف کا اضافہ کرنے سے، اسم فعل اور صفت وغیرہ بن جاتے ہیں۔ مثلاً اسم کے آگے Y (خ) کا اضافہ کرنے سے صفت اور ج (کؔ) کا اضافہ کرنے سے فعل بن جاتا ہے۔ فعل پر تین مختلف نشانات یعنی ےؔ۔ اؔ۔ ٤ؔ کو زائد کرنے سے مختلف زمانوں میں تخصیص ہوتی ہے۔ اسی طرح اسم پر مختلف نشانات لگا دینے سے نکرہ اور معرفہ وغیرہ میں تمیز ہو سکتی ہے۔

اِس زبان کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ تمام الفاظ کا تلفظ اس کی کتابت کے مطابق ہوتا ہے۔ حروف زائد نہیں ہوتے۔ مثلاً انگریزی لفظ Know میں حرف K یا عربی کے عبدالصمد میں "ال" غیر ضروری ہیں۔ یا یہ کہ لفظ "انبہ" لکھا جائے اور بجائے حرف ن کے حرف م کی آواز نکلے۔ نیز ایک قسم کے تلفظ کے لئے صرف ایک ہی حرف مقرر ہے۔ مثلاً اُردو، فارسی، عربی وغیرہ زبانوں کی طرح نہیں کہ س ص اور ث کی یکساں آوازوں کے لئے مختلف حروف ہیں۔ اس کے برخلاف ایک حرف سے صرف ایک ہی تلفظ ادا کیا جاتا ہے۔ مثلاً انگریزی، جرمنی اور فرانسیسی وغیرہ زبانوں کی طرح نہیں کہ کبھی کؔ کی آواز C سے نکلے، کبھی K سے اور کبھی ck یا ch کے اشتراک سے۔ اسکے اندر دوہرے حروف بھی استعمال نہیں ہوتے۔ جیساکہ یورپ کی بعض زبانوں کا قاعدہ ہے۔

اس میں چھوٹے اور بڑے حروف کی قید نہیں۔ سب یکساں طور پر لکھے جاتے ہیں۔ خواہ اس کا وقوع ابتدا میں ہو یا درمیان میں یا آخر میں۔ انگریزی وغیرہ میں کیپٹل لیٹرز (Capital letters) کے وجود نے بہت سی مشکلات پیدا کر دی ہیں۔ اسی طرح اُردو، فارسی یا عربی وغیرہ میں بھی نقص ہے کہ حروف کی کتابت اُن کے جائے وقوع کے لحاظ سے مختلف ہوتی ہے۔ مثلاً حرفِ ج جس طرح آخر میں لکھا جاتا ہے، ابتدا یا درمیان میں نہیں لکھا جاتا۔

انگریزی کی طرح ایک لفظ کے تمام حروف ایک دوسرے سے وصل ہوتے ہیں۔ اُردو وغیرہ کی طرح یہ نہیں ہوتا کہ چند حروف ملا دئے اور چند علیحدہ رکھے۔ اس زبان میں نہ صرف ایک لفظ کے حروف کو بلکہ جملے کے تمام الفاظ کو ملا کر ایک لفظ کی شکل میں تحریر کیا جاتا ہے تاکہ آسانی رہے۔

میں نے اس زبان کی لُغت دیکھی جس کے اندر کُل بیس ہزار الفاظ تھے۔ کیونکہ ہر لفظ کے پانچ مختلف معنے

ہوتے ہیں۔ نہ کم نہ زیادہ۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ الفاظ کی تعداد بھی بہت زیادہ نہیں۔ مگر باوجود اس قلت کے تمام علوم و فنون کی اصطلاحیں اس کے اندر موجود ہیں۔

مریخ سے واپس آتے وقت میں اپنے ساتھ ایک لغت اور مختلف موضوع کی پچاس کتابیں لے آیا ہوں۔ اگرچہ اُن کو لانے میں مجھے کافی مشکلات پیش آئیں۔ کیونکہ ہر کتاب کم و بیش ایک من وزن کی ہے مگر میں نے یہ مصیبت برداشت کرنی گوارا کی محض اس لئے کہ اپنی دُنیا کے لوگ اس سے مستفید ہو سکیں عنقریب ان کا ترجمہ دُنیا کی تمام زبانوں میں کر کے شایع کرنے والا ہوں۔ اور ارادہ ہے کہ مجلس اقوام کے روبرو یہ تجویز پیش کروں کہ وہ اپنے اختیارات خاص سے کام لیکر حکم صادر فرمائے کہ دُنیا کے تمام لوگ مریخ کی زبان بولنا شروع کر دیں اور نوشت و خواند بھی اسی زبان میں ہو۔

اگر یہ ممکن نہ ہوا تو میں حکومت مریخ سے درخواست کروں گا کہ وہ اپنے طبیب خاص سے اس دوا کو تیار کرا دے جس کے استعمال سے ہر شخص تمام زبانوں میں گفتگو کرنے اور اُن کو سمجھنے کے قابل ہو جاتا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ وہ دوا بہت مہنگی ہوگی۔ کیونکہ دریافت کرنے پر مجھے معلوم ہوا تھا کہ اس کے اجزا میں دو تین چیزیں ایسی ہیں جو ہماری دُنیا کے معیار کے مطابق چار ہزار روپے تولہ فروخت ہوتی ہیں۔ ایسی صورت میں تمام حکومتوں کو رعیت کی مدد کرنی ہوگی ان کا فرض ہوگا کہ اس دوا کو خرید کر تمام باشندوں میں تقسیم کرا دے۔

اس کے علاوہ بھی اہل مریخ کے پاس چند دوائیں ایسی ہیں جو طلسمی اور حیرت انگیز معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً ایک دوا کی خاصیت یہ ہے کہ مردہ آدمی کو چند گھنٹے کے لئے زندہ کر دیتی ہے۔ مگر ایک شخص پر یہ عمل پانچ مرتبہ سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔ یہ دوا خاص طور پر اُس وقت کارآمد ہوتی ہے، جب کوئی شخص وصیت کئے بغیر مر جائے۔ یا اس سے کسی سلسلہ میں کوئی گواہی یا تصدیق کرانی مقصود ہو تو زندہ کر لینے کے بعد مقصد پورا ہو جاتا ہے۔

---

میں یہ بیان کر چکا ہوں کہ ڈاکٹری دوا کے استعمال سے میں اُن کی زبان بولنے لگا تھا جس سے یہ فائدہ ہوا کہ اُٹھتے بیٹھتے ہر وقت اُن سے گفتگو ہوتی رہتی تھی۔ رفتہ رفتہ میں اُس دُنیا کے تمام حالات سے واقف ہو گیا۔ ملکہ کو بھی مجھ سے بہت زیادہ دلچسپی ہو گئی تھی۔ ہر وقت اپنے ساتھ رکھتی اور اکثر کرۂ ارض کے متعلق استفسار کرتی رہتی تھی۔

ایک دن اُس نے دریافت کیا "ہم کو آج تک یہ معلوم نہ ہو سکا کہ تم اپنے کرۂ زمین سے ہماری دُنیا تک کس طرح آئے؟"

اِس وقت مجھے بھی خیال آیا کہ میرا جہاز درخت میں اُلجھ گیا تھا اور شاید ابھی تک وہیں ہوگا میں نے

مناسب سمجھا کہ اُس کو منگا لیا جائے تاکہ واپسی کے وقت دقّت نہ ہو۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ اپنی دُنیا تک پہونچنے کے لئے اور کوئی ذریعہ نہیں ہے، اس لئے میں نے تمام حال ملکہ کے گوش گذار کر دیا۔ اور اپنے جہاز کی ہیئتِ خارجی بیان کر کے درخواست کی کہ کسی ملازم کو بھیجکر اُسے منگا لیا جائے۔ آسانی کے لئے اس مقام کا کچھ پتہ ونشان بھی بتا دیا جہاں میں اُترا تھا۔ فوراً ملکہ نے خادم کو حُکم دیا اور جلدی واپس آنے کی تاکید کر دی۔

اس کے بعد مختلف موضوع پر اِدھر اُدھر کی گفتگو ہوتی رہی۔

میں "اہلِ مریخ کے مذہبی عقائد کیا ہیں؟ اور کل کتنے مذہب ہیں؟"

ملکہ "یہ تمام باشندوں کا ایک ہی مذہب ہے اور ہم لوگ صرف ایک خدا کی پرستش کرتے ہیں۔ عبادت کے دو وقت مقرر ہیں ——— صبح اور شام۔"

میں "طریقہ عبادت کیا ہے؟"

ملکہ "کوئی خاص نہیں، علی الصبح ہم لوگ غُسل کر کے تنہائی کی جگہ خاموش بیٹھ جاتے ہیں اور تمام توجہ اپنے معبودِ حقیقی کی طرف مبذول رکھتے ہیں۔ البتہ ہفتہ میں ایک دن کے لئے عبادت گاہ میں اجتماع ہوتا ہے، جہاں ہم اپنے امامِ اعظم کے ساتھ مل کر خُدا کی پرستش کرتے ہیں۔ شام کے وقت بھی جب سورج غروب ہونے لگتا ہے تو بطور شکریہ ہم اپنے معبود کے سامنے سربسجود ہو جاتے ہیں۔ اپنے ذہن میں خُدا کا تصور رکھنے کے لئے ہم نے ایک سنگین شبیہ بنا رکھی ہے جس کو شاید تم نے بھی عبادت گاہ کے قریب دیکھ لیا ہوگا۔ اس کا وجود ایک نامعلوم زمانے سے ہے، کیونکہ قدیم ترین تاریخوں سے بھی یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس کی تعمیر کس ملکہ کے عہد میں ہوئی۔ میرے خیال میں تم نے اس کو ضرور دیکھا ہوگا۔ وہ کافی فاصلہ سے نظر آتا ہے۔"

میں نے سر کی جنبش سے انکار کیا۔

پھر ملکہ نے کہا "اگر تم نے ابھی تک ہمارے خالق کی زیارت نہیں کی تو آؤ میں تم کو اپنے ساتھ لے چلوں، اسکے دیدار سے تم کو روحانی مسرت حاصل ہوگی۔ وہ مقام یہاں سے کچھ زیادہ فاصلہ پر نہیں ہے۔"

ملکہ نے شاہی رتھ تیار کرائی جس کے اندر بیل کی مانند چھ جانور جُتے ہوئے تھے۔ وہ مجھ کو اپنی ہتیلی پر بٹھا کر اس رتھ کے اندر جا بیٹھی۔ راستہ میں کوئی خاص گفتگو نہیں ہوئی۔ دس منٹ کے بعد رتھ عبادت گاہ کے دروازہ کے قریب ٹھیر گئی۔ ملکہ مجھے لیکر باہر نکل آئی۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ ایک سنگین عمارت کے قریب سربفلک پہاڑ ہے۔ میرے ذہن میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ یہی اہلِ مریخ کے خُدا کا مجسمہ ہے۔ ملکہ نے مجھے بتایا۔

"سنگین چٹانوں کو تراش کر یہ انسانی شکل بنائی ہے، اور یقیناً ماہرینِ فن نے صنعت کا بہترین نمونہ پیش کر دیا ہے۔ یہ بُت بمنزلہ خُدا ہے۔ مگر ہم لوگ اس کے سامنے سجدہ نہیں کرتے، بلکہ اس کو صرف مقدس خیال کرتے ہیں۔ اس کی تعمیر جیسا کہ مذہبی کتابوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے ہمارے پیشواؤں اور پیغمبروں کی ہدایت

کے مطابق ہوئی ہے جس کو انتقال کئے تین لاکھ سال گذر گئے۔ اس کا مقبرہ "اُپنیشلیکر دن" کے شہر میں واقع ہے اور اسوقت اس کی اکیا نویں پشت کا ایک شخص ہمارا امام اعظم ہے۔"

اس مجسمہ کے مقابل ایک مینار بھی تھا، جس کی بلندی ملکہ کے بیان کے مطابق تیس ہزار فٹ تھی۔ میں نے اس کی چوٹی پر پہونچنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ چونکہ اس کی طبیعت کسی قدر ناساز تھی، اس لئے میرے ہمراہ چلنے کا عذر کیا اور معذرت چاہی۔ تاہم عبادت گاہ کے محافظ کو حکم دیدیا کہ وہ مجھ کو اپنے ہاتھ میں لیکر مینار کی چوٹی پر چڑھ جائے اور اچھی طرح سیر کرا دے۔

محافظ تعمیل حکم کے لئے فوراً تیار ہو گیا۔ اس نے اپنی کمر کسی اور مجھے اپنی ہتیلی پر بٹھا کر زینہ پر چڑھنے لگا۔ درمیاں میں روشنی اور ہوا کی خاطر چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں لگی ہوئی تھیں اور سانس لینے کے لئے تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر کمرے بنا رکھے تھے۔ محافظ نہایت قوی اور طاقتور تھا۔ صرف ایک گھنٹہ کے قلیل عرصہ میں مینار کی بلندی پر بلاتکان پہونچ گیا۔

میں نے چاروں طرف نگاہ ڈالی۔ دور دور کی عمارتیں نظر آ رہی تھیں، اور خاص طور پر اس طویل القامت مجسمہ کا سر صرف ایک میل کے فاصلے پر مینار کی چوٹی کے متوازی تھا۔ محافظ کے بیان کے مطابق وہ ایک میل کے فاصلہ پر تھا۔ درانحالیکہ بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ بالکل قریب ہے۔ یہ قریب نظر شاید اس کے عظیم الجثہ ہونے کے باعث تھا۔

اہلِ زمین مصر کے ابوالہول کو حیرت و استعجاب کی نظرسے دیکھتے ہیں۔ لیکن اُن کو نہیں معلوم کہ مریخ کا یہ مجسمہ اُن کے بُت سے تین یا چالیس گُنا بڑا ہے —— خدا کی پناہ! اس کو دیکھ کر مجھ پر دہشت طاری ہونے لگی۔ اس کے سر کا طول چار فرلانگ اور ایک آنکھ کے ڈھیلے کا محیط ڈھائی تین سو گز تھا۔ اس کی ایک پلک توڑ کر اگر شہر دہلی میں نصب کر دی جائے تو دوسری قطب مینار معلوم ہو۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس مجسمہ کا حجم کیا ہوگا۔

اس کا تمام رنگ بالکل سیاہ تھا۔ تاہم چہرے پر دوسرے رنگوں سے بھی نقش و نگار بنا رکھے تھے، میں نے زیادہ دیر ٹھیرنا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ شدید سردی کے باعث میرا جسم کانپ رہا تھا۔ اس لئے محافظ سے واپس چلنے کے لئے کہا۔

میں نیچے آیا تو ملکہ اُس وقت عبادت گاہ میں تھی۔ میں بھی اندر چلا گیا۔ ایک اونچے مقام پر بہت بڑی کتاب رکھی تھی۔ ملکہ اس کے قریب کھڑی تھی۔ اور اس کے اوراق جو چمڑے کے تھے، اُلٹ رہی تھی۔

اُس نے مجھے بتایا "یہ اہلِ مریخ کی مذہبی کتاب ہے جس کو "مخلنجلنگشتم" کہتے ہیں۔ مگر کسی ایسی زبان میں لکھی گئی ہے جس کا وجود قدیم زمانہ میں تھا۔ مگر آج کل اہلِ مریخ اس کو نہیں سمجھتے۔ صرف تلاوت کر لیتے ہیں کیونکہ اس کو پڑھ لینا کچھ مشکل نہیں ہے۔"

بلا کسی مخصوص خیال کے میں نے اس کے ایک صفحہ پر نگاہ ڈالی۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ اس پر عربی عبارت لکھی ہوئی ہے۔ میں نے ایک سطر کو پڑھا تو قرآن شریف کی ایک آیت تھی۔ میرا استعجاب بڑھتا گیا۔ اور میں نے زیادہ غور کے ساتھ اس کے بعض دیگر صفحات کا مطالعہ کیا۔ آخر کار اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ وہی قرآن شریف ہے جو کرۂ ارض کے مسلمانوں پر نازل ہوا تھا اور ساڑھے تیرہ سو سال گذر جانے پر بھی اپنی پوری عظمت کے ساتھ موجود ہے۔

میں نے ملکہ سے کہا "ہماری مذہبی کتاب بھی یہی ہے۔ لیکن اس کے مطابق ہمارا طریق عبادت دوسرا ہے۔ ہم خدا کے بتائے ہوئے قاعدوں پر نماز پڑھتے ہیں۔ تعجب ہے کہ تم لوگ اس کی پیروی نہیں کرتے"

اب مجھے یقین کامل ہوگیا کہ ہم مسلمانوں کا یہ دعویٰ کہ قرآن مجید الہامی کتاب ہے بالکل صحیح ہے۔ ورنہ درحقیقت اس سے قبل میرے دل میں بھی صدہا شکوک موجود تھے۔

ملکہ کی استدعا پر میں نے چار یوم میں قرآن شریف کا ترجمہ مریخی زبان میں کر دیا۔ جس کو فوراً حکومت نے شائع کر کے تمام رعیت میں مفت تقسیم کرا دیا۔ اور سب کو ہدایت کر دی کہ آیندہ تلاوت کے ساتھ ساتھ ان احکامِ الٰہی پر عمل بھی کیا جائے۔

علاوہ ازیں میں نے وہاں کے امامِ اعظم کو نماز کا صحیح طریقہ بھی بتایا۔ اور مجھے خوشی ہے کہ میری واپسی تک سب لوگ اسی طرح نماز پڑھنے کے عادی ہو گئے جس طرح دُنیا کے مسلمان پڑھتے ہیں۔

امامِ اعظم نے مجھے بتایا "ہمارا سب سے بڑا پیغمبر اب سے پانچ لاکھ سال پہلے مبعوث ہوا تھا۔ اور اسی پر یہ الہامی کتاب نازل ہوئی تھی۔ اس زمانے کے لوگ اس کو سمجھتے تھے اور اسی کے مطابق نماز پڑھتے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ لوگوں نے عربی زبان چھوڑ کر دوسری جدید زبان اختیار کر لی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف کتاب باقی رہ گئی۔ مگر اس کے مفہوم کو سمجھنے والے ناپید ہو گئے"

میں نے اُن کو مشورہ دیا کہ آیندہ اس سنگین مجسمۂ عظیم کو بھی مقدس تصوّر نہ کریں، ورنہ یہ فعل بُت پرستی پر محمول کیا جائے گا اور یہ احکامِ الٰہی کے خلاف ہے۔ کیونکہ خدا تعالےٰ نے صاف طور پر لکھدیا ہے کہ مجھ سے ملنے کے لئے کسی کا وسیلہ بھی تلاش نہ کرو۔

امامِ اعظم نے میرے مشورہ کی قدر کی اور مزید تائید کرتے ہوئے حکومت سے درخواست کی کہ اس بُت کو منہدم کرا دیا جائے۔ چنانچہ احکام نافذ کئے گئے اور میرے واپسی تک اس بُت کا سر پاش پاش ہو چکا تھا۔

---

دوسرے دن یہ راجہاز بھی آگیا جس میں کسی قسم کا نقص پیدا نہیں ہوا تھا۔ سوائے اس کے کہ پنکھے کا کچھ حصّہ ٹیڑھا ہو گیا تھا۔ میں نے اُس کے اندر سے اپنا تمام سامان باہر نکال لیا۔ اور بعض چیزیں ملکہ کو دکھا کر اُن کی حقیقت سمجھائی، وہ بہت متعجب ہوئی۔ خاص طور پر میرے کیمرے کے عمل پہ اُس کو یقین نہ آیا کہ اتنی ذرا سی بے جان

چیز تصویر کس طرح بنا سکتی ہے۔ میرے ساتھ فوٹوگرافی کا سب سامان موجود تھا۔ اس لئے ملکہ کے پانچ چھ فوٹو مختلف طرز کے اُتار ڈالے۔ اس کیمرے میں ۱۰ × ۱۲ سائز کی پلیٹ لگائی تھی تاکہ تصویر بڑی اور صاف کھنچ سکے۔ مگر پھر بھی اصل مقصد پورا نہ ہوا۔ ملکہ کو اس قدر چھوٹے کاغذ پر کوئی شکل نظر نہ آسکی۔ اُس نے بہت آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا مگر اس کی سطح پر سوائے سیاہ سفید دھبوں کے کچھ دکھائی نہ دیا۔ حالانکہ تصویریں بالکل صاف اور واضح تھیں۔ اچانک مجھے خیال آیا اور میں نے جہاز میں سے وہ دوربین نکال لی جس کے ذریعہ سے دوران سفر میں راستوں وغیرہ کا پتہ معلوم کیا جاتا ہے۔ اس کے شیشے اس قدر طاقتور ہیں کہ اگر کوئی چیز اس کے نیچے رکھ کر دیکھیں تو اپنی اصل جسامت سے پچھتر گُنا بڑی نظر آتی ہے۔ چنانچہ ملکہ اس کے ذریعہ تصویر دیکھنے میں کامیاب ہوگئی۔

دوسری چیز جس نے ملکہ کو محوِ حیرت کر دیا گراموفون کی مشین تھی جس کو میں ذاتی دلچسپی کی غرض سے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ میں نے سب سے زیادہ بلند آواز کا ریکارڈ بجایا۔ تو اُس کے نغمے نہایت مدھم سُروں میں ملکہ کے کانوں تک پہونچ سکے۔ وہ ان کو سمجھنے سے قاصر تھی مگر پھر بھی بہت زیادہ محظوظ ہوئی۔ کیونکہ بہرصورت وہ اس کے لئے بالکل نئی چیز تھی اور نئی چیزیں ہمیشہ دلچسپی کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں۔

میں نے اپنی جیبی گھڑی نکالی۔ جو بند پڑی تھی کیونکہ وقت دیکھنے کی ضرورت محسوس نہ ہونے کے باعث اس کے اندر چابی نہیں دی گئی تھی۔ میں نے اس کو چلایا اور اسی دوربین کے ذریعہ ملکہ کو دکھایا۔ وہ حیران رہگئی اس کی سمجھ میں نہ آسکا کہ آہنی سوئیاں خود بخود کس طرح چل سکتی ہیں۔ میں نے بیان کیا کہ انکی جنبش کے ساتھ ساتھ آواز بھی نکلتی ہے۔ مگر وہ اس قدر خفیف تھی کہ ملکہ کے کان اس کو نہ سُن سکے۔

اس کے بعد اُس نے جہاز کے متعلق مختلف سوالات کئے اور یہ سُنکر متعجب ہوئی کہ وہ ذرا سی مشین جو اس کے سنگارداں کے برابر ہے مجھ جیسے پندرہ آدمیوں کو لیکر ہوا میں اُڑ سکتی ہے۔ اگر میرا جہاز ملکہ کے وزن کو برداشت کر سکتا تو یقیناً میں اس کو بھی فضائے آسمان کی سیر کرا دیتا۔ تاہم میں نے اس سے وعدہ کر لیا کہ دوسرے سفر میں اگر مریخ آنا ہوا تو ایک ایسا جہاز اپنے ساتھ لاؤں گا کہ جو کئی ہزار من کا بوجھ اُٹھا سکے اور اس وقت اگر ممکن ہوا تو مریخ کے دو آدمیوں کو کرۂ ارض میں لے جاؤں گا۔

میں نے ملکہ سے رُخصت کی اجازت طلب کی کیونکہ کرۂ ارض کو چھوڑے ہوئے دو ماہ سات یوم گذر چکے تھے اور وطنِ عزیز کی یاد نے بے حد بےچین کر رکھا تھا۔ ملکہ کو میری جُدائی گوارا نہ تھی۔ مگر میرے اصرار نے اُسے مجبور کر دیا اور وہ بھی اس شرط پر کہ دو سال کے بعد میں دوبارہ ان کے کرّہ میں سیر و تفریح کی غرض سے آؤں۔

ملکہ نے مجھ کو بطور نشانی کے ایک چھوٹا سا رومال اور ایک طلائی انگشتری پیش کی۔ دونوں چیزیں اپنے اصل مقاصد کے لحاظ سے میرے لئے بیکار تھیں۔ مگر میں نے اس غرض سے اُن کو لے لیا کہ

رومال بڑے کمرے میں بطور دری بچھانے کے کام آجائے گا اور انگشتری میں تین پائے لگا کر مشکوں کی گھڑونچی بنالیں گے۔

میں نے منتخب کردہ کتابیں، چند قسم کی دوائیں، اور قابلِ دید مصنوعات جن کو دُنیا میں لے جانا چاہتا تھا، اپنے جہاز پر لادیں، اور ملکہ کی ایک اُنگلی کا بوسہ لیکر جہاز میں بیٹھ گیا۔ موٹر گرم کیا۔ اور جہاز چلانا شروع کردیا۔ مگر مین اُس وقت وزیرِ خارجہ نے ہاتھ بڑھا کر جہاز کو اپنی مٹھی میں پکڑ لیا۔ اس کے گرفت کے مقابلہ میں موٹر کی زبردست طاقت بالکل بے معنی چیز تھی۔

اُس نے مجھ سے کہا۔

"روانگی سے قبل اپنے خیالات کا اظہار فرمادیں کہ آپ یہاں سے کس قسم کے جذبات لیکر واپس دُنیا میں جارہے ہیں"

میں نے کھڑکی میں سے گردن نکال کر ایک طویل تقریر کی جس کے آخری چند جُملے درج ذیل ہیں۔ اور اس کے بعد پوری قوت کے ساتھ جہاز کو چلاتا ہوا اپنی دُنیا کی طرف روانہ ہوگیا۔

"اے عالمِ مریخ کے مُحیّر العقول طویل القامت باشندو! تمہاری پُراسرار ہستیاں اہلِ زمین کے لئے موجبِ حیرت واستعجاب ہیں۔ لیکن مُستقبل قریب میں تمہارے اور ان کے درمیان ہر قسم کے خوشگوار تعلقات پیدا ہونے والے ہیں۔ اور جب وہ اشتراک باہمی اتصال جنسی کی حد تک تجاوز کر جائے گا، تو ایک ایسی معصوم نسل کتمِ عدم سے عرصۂ وجود میں جلوہ گر ہوگی جس کی پرستش کے لئے کون ومکاں کے بڑے بڑے دیوتا اپنا سر جُھکا دیں گے۔ میری دُعا ہے کہ ہمیشہ تم پر یزدانی لُطف وکرم کی بارش ہو"

**فضل حق قریشی دہلوی**

# شیخ صاحب

از جناب مرزا سلیم بیگ دہلوی

حال ہی کی بات ہے کہ ایک بائیسکل کے صدمہ سے شیخ صاحب کمر کی گھوڑے ہو کر رہ گئے۔ ورنہ معمولی طور پر ان کی عمر کا اندازہ کرنا بڑا ہی مشکل کام تھا۔ اس حالت میں بھی وہ سواری کرتے ہیں۔ سارے سارے دن بائیسکل پر لدے لدے پھرتے ہیں۔ ایسا کوئی دوست یا آشنا نہیں جو ۲۴ گھنٹے میں کسی نہ کسی وقت شیخ صاحب کی صحبت سے مستفید نہ ہو جاتا ہو۔ وقت کے تو پابند ہیں مگر احباب سے ملنے کا کوئی مقررہ وقت نہیں۔ اور دوستوں کے اوقات سے ان کو سروکار نہیں۔ جس وقت جی چاہا پہنچ گئے کوئی ہو یا نہ ہو تھوڑی دیر سستا کر پانی پیا۔ پان کھایا خیریت دریافت کی اور اللہ کا نام لے کر اٹھ کھڑے ہوتے۔ کسی اور آشنا کے گھر کی کنڈی کھٹکھٹا دی تھوڑی دیر گپ شپ کی۔ خدا حافظ کہا اور چلدیئے۔ آپ دیکھ رہ گئے۔ قسمیں دیجئے۔ کسی ضرورت کا اظہار کیجئے۔ مگر شیخ صاحب نے کسی اونچی جگہ کا سہارا لیا بائیسکل کو ٹانگوں میں دبایا اور سڑک پر کٹے پتنگ کی طرح جھونے کھانے لگے۔ دوست ہیں کہ قسمیں دیکر روکنا چاہتے ہیں۔ مگر شیخ صاحب ہیں کہ ٹانگیں مارتے گھنٹی بجاتے کبھی سڑک کی داہنی طرف کبھی بائیں طرف چلے جاتے ہیں منہ میں پان دبا ہوا ہے آنکھوں پر عینک چڑھی ہوئی ہے شیروانی کے دامن سمیٹے ہوئے گود میں رکھے ہیں۔ اور گھنٹی کی آواز ہے کہ منزل سے منزل تک برابر چلی آ رہی ہے جب تک بائیسکل پر شیخ صاحب رواں دواں ہیں اُس وقت تک گھنٹی بھی تال سُر پر ہے۔ شیخ صاحب کا رقص بند ہوا اور گھنٹی نے بھی اپنی دہریت موقوف کر دی۔

شیخ صاحب کو جہاں سفر اور کیمیاگری کا شوق ہے وہاں پرانی اشیا کو بھی خریدنے اور بیچنے کا دھندا لگا ہوا ہے۔ کوئی پرانے سامان والا ایسا نہیں جو شیخ صاحب سے واقف نہ ہو یا شیخ صاحب سے کھاتہ نہ رکھتا ہو۔ شیخ صاحب کے پاس بھی ان لوگوں کا نام اسی طرح لکھا ہوا ہے جیسے مارواڑی کے چوپڑ کھاتہ میں راہن کا اندراج ہوتا ہے خود شیخ صاحب پرانی اشیا کے شوقین اور ماہر ہیں۔ ان کا مکان کباڑیے کی دکان یا نیلام گھر بنا ہوا ہے۔ جہاں شیخ صاحب استراحت بھی فرماتے ہیں۔ اور کیمیاگری بھی کرتے ہیں۔ اگر اتفاق سے کوئی دوست ان کے مکان کی چار دیواری میں گھر جائے تو پھر بغیر اجازت باہر جانا ذرا دشوار کام ہے۔ پرانی اشیا کا شوق ہو یا نہ ہو مگر وہ اپنا انتخاب دکھائے بغیر لا اتفاقی کر کے واپس نہیں آنے دیتے۔ پان کھلاتے۔ چاء اور بسکٹ سے تواضع کرتے ہیں۔ بپاس خاطر یا بپاس خاطر خلاق اگر کہیں آپ نے ان اشیاء سے دلچسپی کا اظہار کر دیا تو پھر کھانا بھی کھایئے، رات کو بھی آرام کیجئے۔ اور اس کباڑ خانہ کو ملاحظہ فرمایئے۔ نہ خود سوتے ہیں نہ سونے دیتے ہیں کبھی تو تانا شاہ کے زمانہ کی تین کر کبھی بندوقیں لے آتے ہیں اور اُسکی تعریف و توصیف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے جاتے ہیں۔ کبھی عالمگیری تلوار کبھی ایرانی خنجر اور کبھی بہادر شاہی

ٹوپی۔ غرض ادویات اور نسخہ جات سے لیکر بندوق۔ تلوار۔ ٹوٹے جوتے۔ کہنہ پیرہن۔ کرم خوردہ کتابیں۔ تیل آلودہ وصلیاں۔ کنارہ ٹوٹی رکابیاں۔ تاروں سے بندھے پیالے۔ بانس کے نیچے۔ بدری ملے سب ہی سامنے آجاتے۔ اور سب کی تاریخ بیان کیجاتی۔ دوستوں کی نظروں میں انکی قدر وقیمت ہو یا نہ ہو مگر شیخ صاحب کو وہ چیزیں بہت عزیز تھیں۔ اور ان کا مختصر مکان اس قسم کی چیزوں سے سجا ہوا تھا۔

سفر و سیاحت کے شوق میں وہ ہمیشہ پا بر کاب رہتے ہیں ایسا کوئی دوست نہیں ہے جس سے شیخ صاحب سفر پر چلنے کی فرمائش نہ کیا کرتے ہوں۔ موقع ہو تو وہ ہمیشہ دوستوں کے ساتھ سیاحت کے لئے نکل جاتے اور دنوں دفتر سے غائب رہتے۔ جب سے بائیسکل کا حادثہ پیش آیا شیخ صاحب کا مخصوص احباب کے ساتھ ربط باقی رہ گیا ہے۔ اب وہ زیادہ دوڑ دھوپ کے قابل نہیں رہے ہیں۔ پیدل چلنا تو حقیقتاً ان کے لئے ایک عذاب ہے خاص خاص عزیزوں اور دوستوں سے رسم محبت کو باقی رکھا ہے دو چار چندہ داریاں بھی ہیں۔ جہاں اُن کو حاضری کی پابندی کرنی پڑتی ہے۔ اس لئے بیچارے محبت اور ضرورت سے مجبور ہو کر بائیسکل پر نکلتے۔ دوستوں سے ملتے۔ کچہری دربار کرتے ضروریات خریدتے اور دوستوں کی فرمائش کی تکمیل کرتے ہیں دنیا کا ایسا کوئی کام نہیں ہے جس میں شیخ صاحب کو دخل نہ ہو اور وہ بطور خود اسکو انجام دینے کے لئے آمادہ نہ ہو جاتے ہوں۔ دوستوں کی دعوتوں کا سرانجام۔ شادی بیاہ کی خرید و فروخت زبردستی اپنے ذمہ لیتے ہیں۔ دنوں اور ہفتوں اس میں پریشان اور سرگرداں پھرتے ہیں۔ گرمیوں کی دھوپ اور جاڑوں کی راتیں شیخ صاحب ایسی فرمائشوں کی دوا دوش میں گذار دیتے ہیں اور پیشانی پر ذرا بل نہیں آنے دیتے۔ البتہ شیخ صاحب اُس وقت آپے میں نہیں رہتے جب انکی کوئی چیز ناپسند کر دیجائے۔ یا اُس میں کوئی نقص نکالی جائے۔ بارہا ایسا ہوا ہے کہ جز بز ہو کر جو منہ میں آیا کہا اور ناراض ہو کر چلے گئے ملنا جلنا چھوڑ دیا۔ آمد و رفت کم ہو گئی اور سارے شہر میں دوست کی احسان فراموشی کا چرچا کر دیا۔ میں اپنے ایک دوست کو حیدرآباد سے کچھ سیتا پھل بھیجنے کی فکر میں تھا۔ اتفاق سے شیخ صاحب تشریف فرما تھے زبردستی اس خدمت کو اپنے ذمہ لے لیا میں نے انکار بھی کیا۔ مگر ان کے اصرار سے مجبور ہو کر یہ شرط کی کہ پہلے نمونہ دکھا دیجئے چنانچہ دو دن گذر گئے اور میں یہ تصفیہ نہ کر سکا کہ شیخ صاحب کے پسندیدہ سیتا پھل خریدوں یا نہ خریدوں۔ ایک دفعہ مجھے چند احباب کی دعوت کے موقعہ پر گلدستوں اور پھولوں کی ضرورت تھی۔ شیخ صاحب کے ذمہ اسکا انتظام ایک روز قبل ہی کر دیا تھا۔ دعوت ہو چکی اور شیخ صاحب تشریف نہ لائے۔ دراصل شیخ صاحب کاہل اور سست آدمی نہیں ہیں ہوتا یہ ہے کہ ایک کام کو نکلتے ہیں راستہ میں کوئی دوست مل جاتا ہے۔ یا کوئی اور کام یاد آجاتا ہے۔ اصل کام کو بھول جاتے ہیں اور دوسری طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔

ان گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود شیخ صاحب کو مکان کی صفائی اور امور خانہ داری کا سرانجام بھی خود ہی کرنا پڑتا ہے کسی کے کام پر بھروسہ نہیں اور نہ کسی کا کام پسند آتا ہے عمر کا بہت زیادہ حصہ گذر چکا ہے اور اس میں یہ کئی بار داغ مفارقت اُٹھا چکے ہیں۔ یا یوں کہئے کہ رنڈوے ہو چکے ہیں۔ عنفوان شباب میں شیخ صاحب کا ڈولہ ایک ایسے باعزت خاندان میں دیا گیا تھا جہاں عزت اور اعتماد کے ساتھ دولت و ثروت کے دریا بہتے تھے۔ خدام کی دست بستہ حضوری نے شان

تمکنت میں چار چاند لگا دئے تھے اور شیخ صاحب جواہرات کی چکاچوند میں اکثر دوستوں سے بے نیاز ہوگئے تھے یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ وہ دوستوں کو بھول گئے تھے یا ان سے ملنے کو کسر شان سمجھنے لگے تھے۔ البتہ دوستوں سے ملنے کے لئے ان کو فرصت کم ملتی تھی۔ اگر شاذ و نادر کوئی دوست ان کے در دولت تک پہنچ جاتا۔ یا کسی تقریب میں ملاقات ہو جاتی تو بہت خندہ پیشانی و تواضع سے پیش آتے۔ اپنے پاس بلاتے کیفیت دریافت کرتے اور حسب حیثیت تکلف برت جاتے اندر باہر شیخ صاحب کا بڑا اثر تھا سسرال والے ان کو صاحب الرائے خیال کرتے۔ اور ہر افتاد پر ان سے مشورہ کرتے تھوڑے عرصہ میں شیخ صاحب نے سسرال ہی میں اعتماد پیدا نہیں کیا بلکہ بیگم صاحب کے بھی معتمد ہوگئے اندر باہر ان کی حکومت کا نقارہ بجنے لگا اور ہر معاملہ میں اپنی عادت کے موافق رائے زنی کرنے لگے قاعدہ کی بات ہے کہ زیادہ میٹھا سم زہر اور زیادہ اتحاد دشمنی ہو جاتی ہے بیگم کے اعتماد کی پتنگ اس قدر بڑھی کہ ٹوٹ گئی۔ ان کو ہر معاملہ میں خواہ متعلق ہو یا نہ ہو دخل دینا ضرور تھا اس لئے اگر کوئی معاملہ انکی مرضی اور رائے کے خلاف تصفیہ پاتا تو بار خاطر ہوتا اور اپنے اثرات کی وجہ سے یہ مخالفت کرنے پر آمادہ ہو جاتے۔ رفتہ رفتہ کنبہ میں شیخ صاحب کی اس عادت نے شہرت حاصل کر لی اور لوگ ان سے اپنا معاملہ کہتے ہوئے گریز کرنے لگے چار برس ہنسی خوشی گذر گئے۔ مگر پانچواں برس پورا نہ ہوا۔ اور واقعات میں ایسی کا یا پلٹ ہوئی کہ شیخ صاحب کو چار و ناچار جدائی کا پتھر اپنے سینہ پر اپنے ہاتھ سے رکھنا پڑا۔ پھر وہی کنج قفس اور وہی برباد کا گھر۔ شیخ صاحب جس رنگ میں خانہ آباد اور خانہ داماد ہوئے تھے اسی رنگ میں خانہ برانداز ہوگئے اس قصہ کو بھی عرصہ گذر گیا شیخ صاحب تو شاید نہ بھولے مگر احباب نے اس واقعہ کو بالکل بھلا دیا۔ وہ اگلی ہی سی صحبتیں ہو گئیں اور اگلی ہی سی محفلیں جم گئیں۔ وہی بائیسکل کی سواری وہی کھیل کا شوق پھر تازہ ہوگیا۔

دوستوں کے التفات اور شیخ صاحب کی ذاتی پیروی نے ایک اور خداداد موقع سے دوچار کیا۔ کچھ شرائط اور ذمہ داری کی گفتگو کے بعد شیخ صاحب پھر خوشی کے نعروں میں خانہ آباد ہوگئے۔ یہاں پہلے جیسی ثروت تو نہ تھی تاہم واجبی سب کچھ تھا۔ جائداد تھی گاڑی گھوڑے تھے۔ نوکر چاکر تھے۔ اور عزت آبرو تھی۔ مگر سب سے بڑی دولت بچوں کی فراخی تھی جو ذکور و اناث ملا کر کئی عدد تھے بعض بالغ تھے اور بعض شیر خوار۔ اس چولی دامن کے ساتھ سے جو سب سے بڑا فائدہ ہوا وہ اولاد کی زیادتی تھی۔ جو اللہ تعالیٰ نے غیب سے شیخ صاحب کی تقدیر میں لکھدی تھی یہ دولت شیخ صاحب کو وارثتاً یا یوں کہیئے کہ جہیز میں ملی تھی۔ ان بچوں سے شیخ صاحب کی محبت پدری میں روز بروز اضافہ ہوگیا اور شیخ صاحب نے کوئی دقیقہ انکی فلاح و بہبودی کا فروگذاشت نہ کیا۔ جائداد کے انتظام۔ مقدمات کی پیروی۔ نابالغوں کی ولایت۔ بالغوں کی شادی و بیاہ کا سرانجام اس طرح کرتے تھے جیسے کوئی صلبی اولاد کا کرتا ہو۔ انسانی ہمدردی اور خدمت گذاری کی نعمت انہیں بدرجہ احسن تھی اور اسی وجہ سے وہ عزیزوں اور دوستوں سے بھی بچا کرتے تھے بعض اوقات یہ ہوا ہے کہ کسی کو ان کی ہمدردی پسند نہیں ہوئی اور اس پر ناک و بھوں چڑھائی گئی۔ یا کوئی شبہ کیا گیا ہے اسی طرح اس علاقہ اولاد نے بھی احسان فراموشی کی اور خود مختار ہو کر اسی جائداد کا قبضہ چاہنے لگے جس کو شیخ صاحب کی ذاتی محنت و پیروی نے قرضہ سے سبکدوش کیا تھا یہ سوال ایسا تھا جسکا تصفیہ بخندہ پیشانی نہیں ہو سکتا تھا۔ بڑی جد و جہد اور بہت سی

خدمت گذاری کے بعد تو جائداد کا قبضہ حاصل ہوا تھا اور گذشتہ تلخ تجربہ بھی پیش نظر تھا اسکو بخوبی سمجھے ہوئے تھے کہ قبضہ سچا اور دعویٰ جھوٹا۔ اس لئے پدری جذبات کو نظر انداز ہی کرنا پڑا۔ اور ایسے سوالوں کا جواب بجز خاموشی کے اور کچھ نہ دیا گیا۔ اب اسکو خودغرضی کہئے یا دوراندیشی۔ معاملہ گھر کی چاردیواری سے باہر چلا گیا۔ نزاع بڑھ گئی۔ دیوانی فوجداری شروع ہو گئی۔ اور شیخ صاحب اس پیروی سے گھر کے نہ گھاٹ کے ہو کر سرگرداں ہو گئے۔ نرینہ اولاد نے علیحدگی اختیار کر لی۔ اور یہ بھی انکی صورت سے بیزار ہو گئے۔ ابھی ان آلات سے نجات نہ ہوئی تھی کہ محل مبارک میں اور ایک عدد کا اضافہ ہو گیا۔ یہ آنکھوں دیکھی بات ہے کہ شیخ صاحب خوشی سے جامہ سے باہر تھے۔ باچھیں کانوں تک پھٹی ہوئی تھیں۔ بھانڈوں اور ہیجڑوں کو دل کھول کر انعام دے رہے تھے۔ جوڑے تقسیم کر رہے تھے اور دل کے ارمان گن گن کر نکال رہے تھے کہ زچہ کی علالت نے خطرہ کی صورت اختیار کی اور سنا گیا کہ بچاری نے زہریلے بخار سے انتقال کیا۔
انا للہ وانا الیہ راجعون۔

شیخ صاحب پھر لنڈورے ہو گئے۔ مقدمات کا تصفیہ خودبخود ہو گیا۔ جائداد سے قبضہ خودبخود اٹھ گیا۔ سسرال کا مکان۔ آرائش کا سامان۔ سواری کا آرام خودبخود چھوٹ گیا اور شیخ صاحب پھر اپنے قدیم مکان میں آباد ہو گئے۔ دفتر جاتے اور چلے آتے نہ کسی سے ملتے اور نہ کسی سے ملنے جاتے۔ دوستوں نے بہت کچھ اظہار ہمدردی کیا۔ بہت کچھ دل بہلانے کی دعوتیں کیں۔ مگر شیخ صاحب کو ایسا سخت غم تھا کہ کسی طرح غلط نہ ہوتا تھا۔ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ اگر وہ بچہ ہی زندہ ہوتا تو مجھے اس مرحومہ کا اتنا صدمہ نہ ہوتا۔ وہ غریب اپنی جان سے گئی تو گئی۔ بچہ کو بھی لیتی گئی اور مجھے زندہ درگور کر گئی۔

نسیم

# "اسیر دام"

از جناب ڈاکٹر محمد صدیق صاحب جہانگیری

جس طرح ایک بیوہ اپنی ہمجولیوں میں بیٹھی ہوئی دنیاوی رنج وغم و مصائب سے دل برداشتہ ہوکر دوران گفتگو میں نہایت مایوس کن لہجہ سے کہتی ہے۔ "اے بہن اپنی تو ساری عمر روتے ہی کٹی" عین اسی طرح جب بھی جب کبھی اپنی حالت پر غور کرتا ہوں تو بیساختہ ایک سرد آہ کھینچ کر دل ہی دل میں کہتا ہوں "افسوس اپنی تو ساری عمر ڈرتے ہی کٹی"

عہد طفلی میں والدین کا ڈر ہر وقت غالب تھا کہ کہیں کوئی حرکت ایسی سرزد نہ ہو جو باعث گوشمالی ہو۔ جب ذرا بڑے ہوئے تو مولوی صاحب کے سپرد کیے گئے۔ خدا خدا کر کے یہ منزل طے کی تو اسکول کو رونق بخشی۔ علی ہذا القیاس وہاں بھی ڈر سے نجات نہ ملی، جوں توں کر کے کچھ شُدبُد تحصیل کیا، نوکر ہوئے۔ شادی ہوئی، دلہن صاحبہ محترمہ تشریف لائیں جو ظاہری طور سے "عیش و عشرت کا زمانہ ہونا چاہیے تھا" افسوس کہ اسکے برعکس ثابت ہوا اور اپنی بے تکلفی نے چند ہی روز میں دلہن صاحبہ کو استانی کی شکل میں تبدیل کر دیا [illegible]ی کا ڈر اور دہشت بھی شاگردوں پر اسوقت تک غالب رہتا ہے جب تک کہ شاگرد کو چھٹی نہ ملے۔ مگر یہاں چھٹی کہاں؟ یہاں تو سزائے دائم الحبس ہے۔ شادی کے ابتدائی زمانہ میں "آپ" جو کچھ بہتر [illegible] بیوقوفیوں نے ان کو اور بھی تیز کر دیا۔ "آپ" جسوقت [illegible] ہوکے میری والدہ کے گھر تشریف لائی تھیں اسوقت آپکی مجموعی تعلیم فقط "غلبت المغلوب و ما یغلبون" یعنی ناظرہ خوانی کی کلام مجید کے اتنی بھی تمیز نہ تھی کہ اردو کے ہندسہ تک شناخت کر سکیں۔ قسمت کی گردش میرے دل میں بھی یہ شوق پیدا ہوا کہ موجودہ زمانہ کی فیشن ایبل اور خواندہ خاتون کا شوہر بنوں اور اس شوق کو ضبط نہ کرتے ہوئے اس پر مجبور ہوا کہ لاؤ انکو بھی کچھ تھوڑی بہت ریاضی اور کوئی انگریزی کی چھوٹی موٹی ریڈر وغیرہ پڑھا دوں۔ اگر اور کچھ نہیں تو انگریزی نام و نشان لکھنا سیکھ لینگی۔ "ان" سے اظہار کیا "انہوں" نے شوق ظاہر کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ الف سے آم، بے سے بلی کا سلسلہ اردو میں اور اسیطرح سی۔ اے۔ ٹی کیٹ۔ کیٹ معنی بلی۔ آر۔ اے۔ ٹی۔ ریٹ۔ ریٹ معنی چوہا وغیرہ وغیرہ کی پریشان کن رٹ برابر شروع ہوگئی جس نے دوبارہ بچپنے کی یاد کو تازہ کر دیا۔ دلہن صاحبہ کا شوق خواندگی رفتہ رفتہ ترقی پکڑتا گیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ یہ سلسلہ تعلیم میرے واسطے وبال جان بنکر شام کی سیر و تفریح تک میں دخل انداز ہونے لگا۔ میں ایک زندہ دل انسان ٹھہرا۔ اور آپ خیال فرما سکتے ہیں کہ ایک زندہ دل انسان کیلئے سیر و تفریح ترک کر دینا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ بدیں وجہ میں نے عمداً غفلت کرنی شروع کر دی۔ نوبت بایں جا رسید کہ وہ ناراض ہوگئیں، اور خدا خدا کر کے سلسلے سے تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوا مگر آپکی علمیت میں جو جو پابندیاں اس معصوم دلیر پر عائد ہوئیں شاید اسوقت تک غریب گاندھی بھی ان سے نیاز نہ۔ قصہ کوتاہ انہوں نے کچھ ہی عرصہ بعد مجھ پر وہ قابو پالیا کہ بیان سے باہر۔ مثلاً صبح ٹھیک ساڑھے نو بجے دفتر جاؤں قبل تمام وقت گھر پر موجود رہوں، دفتر سے سیدھا مکان پر آؤں، کھانے وغیرہ سے فارغ ہوکر پھر گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بطور [illegible] بجے اگر کہیں جانا چاہوں تو جا سکتا ہوں۔ تمام ہفتہ میں ایک مرتبہ سینما، تھیٹر قطعی بند، تنخواہ جس روز تقسیم ہو بجنسہ لاکر بیگم صاحبہ

اپیش کردوں۔ جیب خرچ کے واسطے چار آنہ روز اور ایک سگرٹ کا بکس وہ بھی نوکر سے سبزی وغیرہ کے ہمراہ روزمرہ خرید وا کر دیا جاتا تھا۔
——— لیجئے حضرت اور پڑھائیے۔

ایک روز میں نے کہا کہ نیک بخت سگرٹ کا ایک بکس چوبیس گھنٹہ کو کافی نہیں ہوتا اکثر اوقات دوست احباب کو بھی پیش کرنا پڑتا ہے بجائے ایک بکس کے دو بکس منگا دیا کرو۔ تو جواب ملا کہ اس سے زیادہ نہیں مل سکتا۔ اگر زیادہ کی ضرورت ہے تو اپنے روزمرہ کے جیب خرچ سے خرید دیا ان احباب سے مانگو جنکو تم خود پیش کرتے ہو" قہر درویش بر جان درویش" خاموش ہوگیا شادی سے پیشتر جب کبھی شب کو گھر میں ذرا دیر سے آنیکا اتفاق ہوتا تھا اور والدہ صاحبہ مجھ پر ناراض ہوتی تھیں تو میری دادی اماں صاحبہ مرحومہ (خدا ان کو غریق رحمت کرے) فرماتی تھیں" دلہن تو فضول اسکو برا بھلا کہتی ہے اسکی ہرگز سمجھ میں نہ آئے گا۔ یہ تو عشرت جہاں (ہونیوالی دلہن) ہی آن کر ٹھیک کریگی۔ جب ہم بھی دیکھیں گے کہ کیسے یہ ساری ساری رات ناٹک میں جاتا ہے میں سچ کہتی ہوں کہ اسکی تو جلدی سے شادی کردو۔ ورنہ یہ تو ہاتھوں سے چلا" یقین جانئے میں جب کبھی ان کی یہ داستان سنتا تھا تو ایک حقارت آمیز تبسم جو دہن کے کسی نصف گوشہ اور لب کی ایک خفیف سی جنبش سے ہی پیدا ہوسکتا ہے ٹال دیتا تھا مگر واقعی انکی تمام باتیں عملی جامہ پہن رہی ہیں اور وہ عشرت جہاں جو حقیقتاً زمانہ کے واسطے عبرت جہاں سے کم نہیں ہیں جنکو میں اب اُستانی خیال کرتا ہوں، دادی اماں صاحبہ مرحومہ کے قیاس سے دو انگل آگے ہی چل رہی ہیں،

گزشتہ ہفتہ کا ذکر ہے میرے ایک دوست نے ایک رقعہ انگریزی میں لکھ کر نوکر کے لڑکے کے ہاتھ مکان پر بھیجا جس میں تحریر تھا کہ آج شام کو یعنی جمعرات کی شب کو تھیٹر چلیں گے سیٹس ریزرو کرالی ہیں جسوقت وہ لڑکا پرچہ لایا بیگم صاحبہ حسن اتفاق سے قریب ہی تشریف فرما تھیں، میں نے وہ رقعہ پڑھا اور دل میں خیال کیا کہ کس طرح آج شب کو مکان سے غیر حاضر ہونا چاہیئے میں کچھہ کہنے بھی نہ پایا تھا کہ فوراً آپ نے فرمایا۔ کیا ہے؟

میں :۔ کچھ نہیں آج مسٹر قریشی کے بھائی صاحب باہر تشریف لیجا رہے ہیں اُنہوں نے لکھا ہے کہ شب کو اسٹیشن پر بھائی صاحب کو پہنچانے چلنا ہوگا اور کھانا بھی ان کے ہمراہ کھانا ہوگا،

بیگم صاحبہ :۔ (یو" نائٹ" "کم" "گو" ۔ "تھیٹر" وغیرہ وغیرہ الفاظ سے پیشتر ہی اصلی مقصد پر پہنچ چکی تھیں لفظ" تھیٹر" کو انگلی سے بتا کر بولیں) یہ کیا لفظ ہے؟

میں :۔ (نہایت سنجیدگی سے) "تھرس ڈے" یعنی جمعرات کے دن۔ آج چونکہ جمعرات ہے لہذا انہوں نے لکھا ہے کہ آج ہی شب کو جائیں گے،

بیگم صاحبہ :۔ (ایک آویزاں کلنڈر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) اسمیں جو جمعرات کا دن انگریزی میں لکھا ہے اُس میں لفظ "ڈی" موجود ہے مگر اسمیں کیوں نہیں؟

میں :۔ اوہو تم تو بال کی کھال نکالتی ہو، اجی یہ بہت باریک باریک باتیں ہیں۔ جب تک تم خوب اچھی طرح انگریزی نہ پڑھ لوگی ان باریکیوں کو نہیں سمجھ سکتیں۔ انگریزی میں "تھرس ڈے" یوں بھی لکھتے ہیں جس طرح اُنہوں نے لکھا ہے،

بیگم صاحبہ :۔ (میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے) ہوں۔

**میں** :۔ (لڑکے کی طرف مخاطب ہوکر) اچھا اُن سے میرا سلام کہنا اور کہدینا کہ انشاءاللہ ضرور سالف ورچلونگا۔

**بیگم صاحبہ** :۔ نہیں۔ کوئی ضرورت نہیں۔ لکھدو کہ میرے بچے کی طبیعت خراب ہے، میں نہیں چل سکتا۔ میں نے لکھنے سے انکار کیا تو انہوں نے خودہی قلم سے اُردو میں نقط "نو" لکھ کر لڑکے کو پرچہ دیدیا اور کہا جاؤ جواب لکھ دیا۔ میں ہرچند پرچہ چھینتا رہا۔ مگر تو بہ کیجئے انہوں نے لڑکے کو دھکا دیکر بھگا دیا۔ میں نے دل میں خیال کیا یہ کسی کا قصور نہیں ہے اپنا ہی قصور ہے اور ابھی کیا ہے۔ خدامعلوم یہ سی است۔ ٹی کیٹ، کیا کیا رنگ لائیگی اور غنیمت ہے کہ ابھی یہیں تک ہی نوبت پہنچی۔

میرا بچہ چونکہ واقعی بیمار تھا، میں شام کو دوائی لینے گیا، مسٹر قریش سے ملاقات ہوئی، ان سے تمام کیفیت بیان کی اور صلاح لی کہ اب کیا کرنا چاہیئے انہوں نے کہا اب گھر مت جاؤ یہ دوائی لڑکے کے ہمدست مع ایک اطلاعی پرچے کے بھیجدو اور لکھدو کہ جو صاحب آج باہر جارہے ہیں اتفاق سے بازار میں مل گئے میں اُن کے ہمراہ کچھ اشیا خریدنے بازار جارہا ہوں، اور شب کو اسٹیشن پر سوار کراکے واپس مکان آؤنگا۔ میرا کھانیکا انتظار نہ کیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا، پرچہ اور دوائی کی شیشی تو لڑکے کے ہاتھ مکان پر بھیجدی مگر کچھ سوچکر خود بھی ہمراہ گیا، اور دروازے کے باہر ڈیوڑھی میں چھپ کر کھڑا ہو گیا۔ لڑکے کو اندرون مکان بھیجدیا اور خود کان لگا کر سنتا رہا کہ دیکھیے سرکار عالیہ سے کیا حکم صادر ہوتا ہے۔ جھانک کر دیکھا کہ بیگم صاحبہ بغور پرچہ ملاحظہ فرمارہی ہیں، اور مسکراتی جاتی ہیں۔ بعد ملاحظہ لڑکے کو حکم دیا کہ اچھا جاؤ۔ جوں ہی یہ الفاظ اجازت میرے گوش نشین ہوئے فرط مسرت سے دل پر قابو نہ پاتے ہوئے بیساختہ ایک تالی بجادی۔ بیوی صاحبہ نے جب یہ تالی کی آواز سنی تو پھر کیا تھا!

**بیگم صاحبہ** :۔ ..... "یہ ڈیوڑھی میں کون ہے" کہتی ہوئی دروازہ پر آموجود ہوئیں، میں نے ہرچند بھاگنے کی کوشش کی، مگر بدقسمتی سے اچکن کا دامن کواڑ میں الجھ گیا اور "انہوں" نے آن پکڑا۔

**میں** :۔ ..... کمبخت یہ کواڑ کچھ ایسے خراب ہیں کہ میری دو تین نئی شیروانیاں انہوں نے پھاڑ دیں۔ ان کا کیا بندوبست کرنا چاہیئے۔ وغیرہ وغیرہ کہتا ہوا مجبوراً مکان میں داخل ہوا۔ آگے آگے میں اور پیچھے پیچھے بیوی صاحبہ۔ خوب سین تھا۔

**بیگم صاحبہ** :۔ یہ دروازے میں تالیاں کون بجارہا تھا؟

**میں** :۔ ..... (نہایت اطمینان سے) کوئی نہیں دروازے کے باہر پھاٹک میں بچے کھیل رہے ہیں۔ یہاں کون بجاتا!

**بیگم صاحبہ** :۔ ہوں!

**میں** :۔ ..... اچھا اب تمکو ان فضول باتوں سے کیا مطلب؟ کام کی بات کرو، کہو بچے کی دوائی آگئی؟

**بیگم صاحبہ** :۔ دوائی تو آگئی مگر کیوں جی میں نے تم سے اسقدر کہا کہ آج نہ جاؤ مگر تم ہرگز نہ مانے۔ آخر کو پرچہ لکھ کر بھیجدیا افسوس تمکو ان بچوں کا مطلق خیال نہیں۔

**میں** :۔ ..... تم تو دیکھنا مُفت میں سر ہوتی ہو، بھلا خیال تو کرو اگر ان بچوں کا خیال نہ ہوتا تو ان لوگوں کو دم دلاسا دیکر یہاں آتا ہی میری طبیعت از خود ہی یا ہر ایک منٹ کو نہیں لگتی، مگر مجبوری ہے، دنیاوی تعلقات بھی برقرار رکھنے پڑتے ہیں اگر کوئی سیر کا وقعہ ہوتا یا کوئی میلے تماشے کا قصہ ہوتا، تو شاید ٹال بھی دیا جاتا، مگر تم خیال کرو کہ یہ لوگ بھی ہمارے کسقدر کام آتے ہیں اسوقت دو گھنٹہ کی بات ہے میرے خیال میں یہ مناسب نہیں کہ ایک شخص اور خصوصاً ایسا عزیز و مہربان سفر کرے

اور بروقت اسکو اسٹیشن پر پہنچانے تک بھی نہ جایا جاوے۔ یہ بہت اخلاق سے گری ہوئی بات ہے، میں نے اس اس قسم کا لکچر دیا کہ کچھ دیر بعد بیوی صاحبہ قابو میں آئیں، اور اجازت ملی چلتے وقت دریافت کیا کہ کب تک آؤ گے؟ میں نہایت سادگی سے جواب دیا کہ گاڑی کوئی بارہ سوا بارہ بجے چھوٹتی ہے یہی کوئی ساڑھے بارہ۔ ایک تک واپس آجاؤنگا۔

خدا خدا کرکے گھر سے پیچھا چھوٹا۔ مسٹر قریشی کے گھر آیا کھانا کھایا۔ تمام شب باطمینانِ کلی تھیٹر دیکھا۔ صبح تین بجے کے قریب واپسی ہوئی۔ گھر پر آئے۔ اور بستر پر دراز ہوگئے،

حسن اتفاق سے اس روز جو تماشہ تھا، وہ تو تھا ہی۔ مگر دوسرے روز کے واسطے جو اعلان کیا گیا، وہ اس سے بھی عمدہ تھا۔ یاروں نے پھر مجبور کیا کہ جو کچھ بھی ہو، مگر یہ تو دیکھنا ہی ہوگا۔ اب میری حالت عجب کشمکش میں تھی، کہ کیا کروں اور کیا نہ کروں۔ ادہر تماشہ کا شوق دامنگیر ادہر بیگم صاحبہ کا ڈر۔ مگر آپ خیال فرمایئے کہ تماشہ جیسی تفریح کو کس طرح چھوڑا جا سکتا ہے۔ چنانچہ دل میں فیصلہ کرلیا کہ کچھ بھی ہو، اس تماشے کو ضرور دیکھونگا۔ اب اگر مشکل تھی تو صرف یہ کہ خرچ کم تھا، طبیعت نہایت پریشان ہوئی کہ یہ ضرورت کیونکر پوری ہو، دفتر سے واپسی کے وقت میرا احباب نے مزید یاددہانی کردی کہ جس طرح بھی ممکن ہو آنیکی کوشش کرنا۔ دفتر سے گھر آیا کھانا کھایا۔ مگر خرچ کی طرف سے طبیعت پریشان کہ کیونکر اور کہاں سے حاصل کروں، میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک بیگم صاحبہ کے کیش بکس پر نظر پڑی جس میں آپ نے ایک بہت مضبوط قفل لگا رکھا تھا، مانگنے کی ہمت نہیں۔ خیال کیا کہ لاؤ قفل توڑ ڈالیں مگر انجام پر جو نظر کی تو کانپ اٹھے، سوچتے سوچتے ایک تدبیر ذہن میں آئی، فوراً تہبند لے کر کوٹھری میں داخل ہوگئے اور اندر سے دروازہ بند کرلیا، صندوقچے کو اوندھا کرکے اُسکے پیندے کے باریک باریک پینچ چاقو کی نوک سے کھولکر اسکا تختہ علیحدہ کرلیا، جوں ہی نوٹوں پر نظر پڑی خوشی سے دل دھڑکنے لگا۔ کچھ نوٹ جیب میں رکھ ہی رہا تھا کہ بیگم صاحبہ نے دروازہ کی کنڈی کھٹ کھٹائی، اور آواز دی کہ یہ کواڑ کیوں بند ہیں، اس آواز کا کان میں جانا تھا کہ پیروں تلے کی زمین نکل گئی۔ دل بلیوں اچھلنے لگا۔ کاٹو تو خون نہیں، یہ بھی ایک عجیب منظر تھا، صندوقچہ اوندھا ہوا، اسکی کچھ چیزیں اندر کچھ باہر، کچھ ادہر ادہر بکھری ہوئی پیندے کا تختہ ایک طرف پڑا ہوا، اور میں ان تمام چیزوں پر خاموش اوندھا پڑا ہوا کوٹھری کے روشندان کو ٹکٹکی باندھے ہوئے دیکھ رہا تھا اور دل میں کہہ رہا تھا کہ یا خدا اب کیا کروں۔ کہاں جاؤں تو ہی مالک ہے۔ اتنے میں فوراً دوسری کنڈی کی آواز کان میں آئی میں نے سہم کر اور بھی روز سے صندوقچے کو بھینچ لیا مگر چند ہی لمحے بعد دل مضبوط کرکے نہایت کرخت آواز سے جواب دیا

میں ....... تو یہ ایک منٹ کو کواڑ بند کئے ہیں کہ غدر مچا دیا۔ کیوں؟ کیا کہتی ہو؟ میرا کمر بند ٹوٹ گیا ہے، میں دوسرا کمر بند تبدیل کرلوں، ابھی دروازہ کھولتا ہوں، کیوں غل مچا رہی ہو۔

بیگم صاحبہ ....... تو منہ سے کیوں نہیں بولتے۔ پہلی مرتبہ ہی کیوں خاموش ہوگئے اب کہنے سے معلوم تو ہوا کہ یہ بات ہے۔ یہ کہہ کر وہ بڑبڑاتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ میں نے جوں توں کرکے صندوقچے کا پیندا اسی طرح بند کیا۔ جیب میں نوٹ چھپائے اور خاموشی سے باہر آیا۔ اب یہ فکر ہوئی کہ یہاں سے کیونکر بھاگوں۔ خرچ کی ضرورت تو پوری ہو ہی گئی، اب یہاں سے چلنے کی ترکیب کرنی چاہئیے لہذا سوچتے سوچتے خواہ مخواہ میں یوں چیخ اُٹھا۔

میں ....... اچھا۔!!

بیگم صاحبہ..... کون ہے؟

میں... کوئی باہر آواز دے رہا ہے۔ یہ جواب دیکر میں باہر گیا اور دو تین منٹ میں باہر سے واپس آکر بیوی صاحبہ سے یوں بات شروع ہوئی،

بیگم صاحبہ۔ کون تھا؟

میں..... کوئی نہیں وہ بدھن تھا۔ یونہی روزمرہ کے دھندے چلے جاتے ہیں

بیگم صاحبہ:۔ کون بدھن؟

میں:۔ وہ ہمارے بڑے صاحب کے ہاں کا ملازم تھا

بیگم صاحبہ: کیوں آیا تھا

میں : (قدرے تیز ہوکر) اف و بات پوچھتی ہو یا بات کی جڑ۔ اب میں تم کو بتاؤں کون تھا...... کیوں آیا تھا...... کیا کہہ رہا تھا...... اسکے باپ کا کیا نام تھا...... اسکی ذات کیا تھی...... غرضیکہ اسکا تمام شجرہ بتاؤں۔ اجی ہوتا کون...... وہ آج بڑے صاحب کے والد مرحوم کی برسی کی فاتحہ ہے اور اس سلسلے میں ان کے ہاں آج محفل میلاد شریف ہے اسکا بلاوا لے کر آیا تھا۔ اور ہوتا کون......

بیگم صاحبہ (مسکراتی ہوئی) ہوں...... تو کیا آج رات کو بھی غائب ہونیکی دل میں ہے۔ کل تو بارہ بجے کو کہہ کر گئے تو چار بجے واپسی ہوئی۔ آج عرس میں جاؤ گے۔ تو صبح دس بجے کی خبر لاؤ گے۔

میں ...:۔ تو کیا دل پر بھی میرا قبضہ ہے۔ ہوگئی سسری لیٹ..... اب میں کیا کروں۔ اور آج کا کیا ہے۔ اسمیں تمام رات کا کیا کام۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کا واسطہ ہے۔ میری طبیعت از خود خراب ہے نہ کہیں جانیکا اور نہ کہیں آنیکا۔ میں تو فقط نام گنا کر اور صورت دکھا کر واپس آجاؤنگا۔ اب کیا بھی کیا جائے، افسر ماتحتی کا معاملہ ہے اگر شریک نہ ہو تو ایک وہی کیا وہ بس اور دیکھنے کو ہے کہ دیکھئے عرس تھا نا۔ اگر کوئی ناچ رنگ کا معاملہ ہوتا تو فوراً بھاگ کر آتے لیکن جہاں خدا رسول کا ذکر ہو وہاں کیوں آنے لگے تھے

بیگم صاحبہ:۔ جی نہیں۔ معاف فرمایئے کوئی ضرورت نہیں آج کہیں جانیکی۔ رہنے دیجئے اپنے افسر ماتحتی کے تعلقات کو۔

میں... (قدرے تیزی اختیار کرتے ہوئے) تو کیوں صاحب کیا میں تمہارے ہاتھوں فروخت ہوگیا ہوں۔ جہاں ذرا گھر سے قدم نکالنے کا نام لیا۔ اور تم نے غدر مچایا۔ آخر تم نے مجھکو سمجھ کیا رکھا ہے۔ میں تو ہر مرتبہ ہنسی میں ٹال دیتا ہوں مگر تم دن بدن سر پر چڑھتی جاتی ہو..... میں جاؤنگا اور ضرور جاؤنگا۔ دیکھوں کون روکتا ہے...... لو صاحب...... ان کے بچوں کی خاطر اپنا دین اسلام بھی ترک کردو۔ پورے کافر بن جاؤ۔ اچھا گھر کیا۔ کہہ رہا ہوں کہ یہ موقعہ ایسا ہی ہے، اسوقت جانا ہی مناسب ہے، مگر اپنی ایک نہیں کے آگے دوسرے کی بات کی کوئی وقعت ہی نہیں۔ یہ گھر کیا ہوگیا میرے واسطے ایک قید خانہ ہوگیا۔

میں اس قسم کی گرم گرم گفتگو کرتا رہا اور دزدیدہ نظر سے انکو دیکھتا رہا کہ کچھہ کام بنا یا ذرا اور رنگ لاؤں۔ مگر آپ خاموش ہوگئیں۔ کوئی پندرہ بیس منٹ تک یونہی خاموشی رہی کہ اتنے میں مکانداری کا آدمی کرایہ لینے آگیا۔ بیوی صاحبہ نے صندوقچہ

طلب کیا۔ ماما صندوقچہ لائی اور میرے پیروں تلے کی زمین نکل گئی۔ میں نے خاموشی سے اُٹھ کر کپڑے پہننے شروع کردئے اُنہوں نے اتنے میں صندوقچہ منگاکر کھولا اندرونی چیزوں کو کچھ اُلٹ پلٹ پاکر سب طرف کچھ مشتبہ نظر ڈالی اور نوٹ گنے تو گھبراکر میں نے کپڑے پہنتے ہوئے اِدھراُدھر دیکھتے دیکھتے ایک نظر اُدھر بھی ڈالی اور دل میں خیال کیا کہ ابھی رنگ چڑھا ہوا ہے، مناسب ہے کہ فرار ہو چلو، ورنہ ایسا نہ ہو کہ دوسرے جرم میں گرفتاری عمل میں آجاوے۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ بیگم صاحبہ نے کہا

بیگم صاحبہ ...... کیوں جی پرسوں تم نے مجھ کو کتنے روپے دئے تھے؟

میں ...... (ذرا اکڑکر) جتنے ہمیشہ دیتا ہوں۔ اور دیتا کتنے ؟ بیگم صاحبہ اِدھراُدھر خانوں میں دیکھتی رہیں اور میں اس موقعہ کو غنیمت خیال کرتے ہوئے فوراً دبے پاؤں گھر سے باہر نکل آیا۔ بقول کسی کے ؏

"جان بچی لاکھوں پائے"

تمام شب بہ اطمینانِ کلی تھیٹر دیکھا۔ تین بجے واپس آئے۔ خدا معلوم کیونکر مکان کے اندر داخل ہوئے۔ اور بستر پر سو رہے۔

چونکہ وہ شب کے جاگے ہوئے تھے لہٰذا صبح معمول سے زیادہ دیر تک سوتے پڑے رہے۔ تو بیوی صاحبہ نے آن کر یوں جگانا شروع کیا!

بیگم صاحبہ :- کیوں جی۔ آج کب تک یہ پانچ کا سندسہ بنے پڑے رہوگے؟ آج دفتر نہیں جاؤگے؟

میں ...... اسکے اس مزاحیہ فقرہ کو غنیمت تصور کرتے ہوئے فوراً اُٹھ بیٹھا۔ سگریٹ سلگایا۔ اتنے میں بیگم صاحبہ بولیں:-

بیگم صاحبہ :- معلوم ہوتا ہے کہ اس مرتبہ تم نے مجھکو بیس۲ روپے کم دئے ہیں۔ یا کچھ حساب میں بھول ہے،

میں :- (مسکراہٹ ضبط کرتے ہوئے انکو غور سے دیکھ کر) ہوں ......

بیگم صاحبہ :- جب تم نے پورے دئے ہیں تو آخر کہاں گئے۔ صندوقچے میں سے کون لے گیا۔؟

میں ... :- کہاں میں لے گیا؟ میں نے نکال لئے؟

بیگم صاحبہ :- میں کیا یہ کہہ رہی ہوں۔ میں تو تم سے دریافت کرتی ہوں۔ تم تو لڑنے پر آمادہ ہو۔

میں .... :- نہیں ہرج کیا ہے میرا نام لگادو؟ تم کو تو روا ہے جو کوئی بُرائی کی بات ہو میرے سر منڈھ دو۔

میں بڑبڑاتا ہوا بستر سے اُٹھ کر پاخانے گیا۔ اُنہوں نے یہ موقعہ بہتر خیال کرکے میرے کوٹ کی تلاشی لی، بدقسمتی سے شب کے بقیہ سات روپے کچھ آنے برآمد ہوگئے جنکو خاموشی سے نکال لیا گیا اور مجھ سے کچھ نہ کہا میں نے جب دفتر جاتے وقت کپڑے پہنے تو دیکھنے پر علم ہوا کہ کارروائی ہوگئی۔ چپ ...... خاموش ...... کہوں تو کیا؟ اور کس منہ سے .... اور اُلٹا ڈر تھا کہ کہیں یہ سوال ہو کہ کہاں سے آئے، لہٰذا مصلحت اسی میں تھی کہ خاموش ہوجاؤ۔ جیسے آئے۔ ویسے گئے۔ شام کو دفتر سے واپسی پر کھانا کھاتے ہوئے دوران گفتگو میں نہایت سنجیدگی سے میں نے کہا کہ میری جیب میں سے کچھ دام غائب ہوگئے ہیں۔

بیگم صاحبہ :- کتنے؟

میں :- یہی کوئی سات روپے آٹھ آنے کے قریب۔

**بیگم صاحبہ**:۔ وہ تمہارے پاس کہاں سے آئے تھے۔؟

**میں** :۔ تم کو اس سے کیا مطلب؟ جو سوال کرتا ہوں اسکا جواب دینا تو درکنار اور اُلٹا سوال کر بیٹھتی ہو جیسے کسی کے رکھے ڈھکے۔

**بیگم صاحبہ**: غور سے دیکھتے ہوئے مُسکرا کر) ہوں ........ آخر وہ کون ہے جس نے تم کو اپنا خزانچی مقرر کر رکھا ہے،

**میں** :۔ کالا چور۔ تمکو اس سے کیا مطلب؟

**بیگم صاحبہ**:۔ اچھا اب چور اور شاہ تو ہو چکا۔ اب آپ سیدھی طرح سے فرمائیے کہ بقیہ پیسے کہاں ہیں۔ اور اس صندوقچہ میں سے کیونکر لئے، جب کہ اسکی چابی میرے پاس رہتی ہے،

**میں**..... ہر چند ہنسی ضبط کی مگر کامیاب نہ ہوا۔ ایک قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ میرا ہنسنا اور بیگم صاحبہ مدظلہا کا لال پیلا ہونا۔ پھر تو جناب وہ آڑے ہاتھوں لیا کہ الامان۔ چونکہ قصور اپنا ہی تھا لہٰذا مناسب خیال کیا کہ خاموشی سے سُن لوں۔ مگر وہ تو اسبات پر بضد ہوگئیں کہ یہ بتاؤ سے لئے کیونکر۔ بھلا آپ ہی خیال فرمائیے کہ میں یہ نسخہ کیسے بتا سکتا تھا۔

آخرکار اُنکو یقین ہوگیا کہ صندوقچے کی دوسری چابی میرے پاس موجود ہے فوراً بڑبڑاتی ہوئی اُٹھیں اور صندوقچے کا قفل تبدیل کیا۔ اور میں غریب۔ بقول کسی کے ؎

ٹک ٹک دیدم۔ دم نہ کشیدم

خاموشی سے یہ منظر دیکھا کیا۔+

# انجمن محافظ شوہران

(از جناب محمد نقی دہلوی)

**نوٹ:** ذیل کا افسانہ انگلینڈ کے ایک مشہور مزاح نگار کے ظرافت پاش فاؤنٹن پن کا رہین منت ہے۔ اس افسانہ میں مصنف نے یورپ کے اس پیچیدہ مسئلہ یا مغربی طرز معاشرت کے نتائج کہ اس "روشن یا تاریک" پُرلطف یا بے مزہ پہلو پر ایک لطیف انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ جو آجکل ہر خوددار اور باغیرت۔ یا بالفاظ صحیح عورتوں کے مظالم ناروا سے پراگندہ دل اور حواس باختہ مغربی باشندہ کی توجہ کا مرکز اور فکر کا ہدف بنا ہوا ہے۔ کما حقہ ہر شخص اس سے واقف ہے کہ موجودہ زمانہ میں نازنینان مغرب۔ علم و ہنر۔ سائنس و آرٹ۔ صنعت و حرفت۔ قانون و حکومت۔ آئین و عدالت۔ پولٹکس و سیاست۔ شاعری و ادب۔ مصوری اور موسیقی۔ نقاشی اور بت تراشی۔ یا یوں سمجھئے کہ کھیل کود۔ ایکسرسائز اور فنڈش۔ شہسواری اور موٹر ڈرائیوری، جہاز رانی اور ہوا بازی۔ غرض ہر فن۔ اور ہر رنگ میں حتی کہ اوباشی، مے نوشی اور آوارگی میں بھی مردوں کی ہمسری کا عملی دعویٰ کر رہی ہیں اور اسی کے ساتھ صنف نازک ہونے کی حیثیت سے مخصوص مراعات کی طالب بھی ہیں،

بعض لوگ تو ایسے ہیں جو بلا چون وچرا۔ اس تذلیل گوارا اور تحقیر منظور کرنے کے عادی ہوگئے ہیں۔ اور بعض ایسے ہیں جو ابھی تک جھجک، ہچکچاہٹ اور تذبذب کے دریا میں ہچکولے لے رہے ہیں اور تیسرا طبقہ وہ ہے جو یہ چاہتا ہے کہ "اقتدار کی رسہ کشی" میں ہر طرح کسی طرح ہٹنے نہ رہیں۔ بلکہ جس طرح بھی بن پڑے ور رہیں۔ یہ افسانہ اسی طبقہ کی سعی نامشکور اور تخیلات کا آئینہ دار ہے اور میرے خیال میں بہت پرلطف۔

اگر اس افسانہ کو ارباب ذوق نے بہ نظر پسندیدگی دیکھا تو اس مصنف کے دیگر افسانے بھی ہدیہ ناظرین کئے جائینگے۔

محمد نقی

---

کاغذوں کو رکھتے ہوئے حسب معمول میں نے کہا۔

اوہو۔ امریکن ہم سے ہر چیز میں سبقت لیگئے۔

میری بیوی نے کہا۔ ڈیر تمہارا خیال درست ہے

میں نے کہا دیکھو نا۔ انہوں نے یہاں ایک نیا گل کھلایا ہے۔ شوہروں کی حفاظت کیلئے ایک انجمن بنائی ہے جس کا نام "انجمن محافظ شوہران" ہے

کیسا جاذب توجہ نام ہے میری بیوی نے کہا اور ایک انجمن شوہروں کی حفاظت کے لئے کیا تم نے یہی کہا ہے نا؟

میں نے جواب دیا بیشک۔

بیوی نے سوال کیا کس سے حفاظت کیلئے؟

میں نے کہا بلاشبہ ان کی بیویوں سے ان کی حفاظت کیلئے۔

بیوی نے کہا ایک عجیب و غریب نظریہ معلوم ہوتا ہے۔ مگر انہوں نے اسکی اور کیا وضاحت کی ہے؟

میں نے جواب دیا اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جن تلخ کامیوں سے ہمیں یہاں واسطہ پڑ رہا ہے وہ بھی انہی

دوچار ہیں۔ مگر فرق صرف اتنا کہ وہ ان سے نجات حاصل کرنیکی کوشش کر رہے ہیں اور آئندہ کیلئے ان بلیات کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دینا چاہتے ہیں اور کر رہے ہیں۔

بیوی نے جواب دیا۔ بہت خوب۔ مگر وہ کن بلیات اور کونسی تلخ کامیوں کا سدِ باب کرنا چاہتے ہیں۔؟

میں نے جواب دیا وہ عذاب اور مصائب جو ہماری بیویوں نے ہم پر بلائے بے درماں کی طرح مسلط کر رکھے ہیں

بیوی نے کہا۔ کونسے عذاب؟ کونسی مصیبتیں ذرا بتاؤ تو سہی؟

میں نے کہا جو کچھ بھی سمجھو۔ اچھا اب میں تمہیں اس قابل قدر انجمن کے اغراض و مقاصد پڑھکر سناتا ہوں تمام باتیں تم پر بخوبی واضح ہو جائینگی۔

## انجمن کے مقاصد اعلیٰ یہ ہیں :-

**اول** :- گھر میں شوہر کی حکومت قائم کرنا۔ گھر کو تمام و کمال ایک مردانہ ادارہ بنانا۔

بیوی نے دریافت کیا۔ پیارے اس کا کیا مطلب ہوا؟

میں نے جواب دیا۔ یہ کہ مرد گھر کا سرتاج ہے اور کینہ کا اہم ترین رکن ہے۔ اسلئے گھر کی ہر شے اسکی دستِ نگر رہنی چاہیئے۔ نیز گھر کے تمام ممبروں کو اسکے اشاروں پہ حرکت کرنی چاہیئے۔ جیسے زمین۔ چاند۔ ستارے سورج کے ارد گرد گھومتے ہیں۔

بیوی نے جلدی سے کہا۔ میں سمجھ گئی

میں نے شروع کیا۔

**دفعہ دوئم** گھر کے کام کاج کی تکمیل ذرہ برابر بھی شوہر کے فرائض میں داخل نہ ہو،

بیوی نے دخل دیتے ہوئے کہا پیارے کیا اس سے یہ مراد نہیں کہ مردوں کو گھر کے کام کاج میں بیویوں کا ہاتھ بٹانا چاہیئے

میں نے کہا ہرگز نہیں۔ کیوں تمہارا کیا خیال ہے؟

بیوی نے کہا کچھ نہیں۔ میں یہ سوچ رہی تھی کہ برسات کے موسم میں تم صفائی کرا دیا کرتے تھے "کرسمس" کے موقعہ پر حلوا پکا لیتے تھے اور شاید تمہیں یاد ہو کہ ایک دفعہ تم نے روٹیاں تیار کی تھیں اور سارا خمیر چولہے میں جھونک دیا تھا

میں نے کہا اب میں اس انجمن کے قوانین میں سے تم کو ایک بہت ہی عاقلانہ دفعہ سناتا ہوں،

**دفعہ پنجم** :- بیوی کو اپنے میاں کی کسی گذشتہ غلطی یا کوتاہی کا حوالہ دینا قطعی ممنوع ہے

میں نے اپنی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے کہا، تمہاری اس بات نے اور بھی یہ میرے ذہن نشین کرا دیا کہ اس انجمن کے آئین کس قدر عاقلانہ اور ضروری ہیں در اصل یہ انجمن شوہروں کی حفاظت کے لئے ایک اہم ترین چیز ہے میں ضرور اسکا ممبر بنوں گا،

بیوی نے جواب دیا ڈیر یہ تمہارے لئے بہت بہتر ہوگا۔ اچھا یہ اور کیا ہے؟

میں نے کہا میں نے تمکو تیسری اور چوتھی دفعہ نہیں سنائی وہ سنو،

**دفعہ سوئم** :- بیوی کو اپنے شوہر کے مشورہ اور اجازت کے بغیر کوئی چیز خریدنی خواہ وہ ادھار ہو یا نقد قطعی ممنوع ہے (بہت عاقلانہ اور موزوں)

**دفعہ چہارم** :- گھر میں ساس یا بیوی کے کسی رشتہ دار کا داخل ہونا ما سوا انجمن کے کسی آفیسر کی تحریری اور دستخطی اجازت کے قطعی ممنوع ہے۔ نیز ہفتہ اتوار اور

ستلیل رہے، دنوں میں اجازت نامے ہرگز جاری نہیں کئے جائینگے

بہت خوب، بہت خوب، نہایت عاقلانہ اور قابل عمل ہے

دفعہ پنجم ، شوہر کے حقوق قائم کرنا کہ وہ مہینے کے مخصوص دنوں میں متعدد مرتبہ رات کو دیر سے گھر واپس آسکے اور وقت کا تعین تمامتر شوہر کی مرضی پر منحصر ہو،

بیوی نے احتجاج کرتے ہوئے کہا ڈیر یہ دفعہ ایسی مفید مطلب اور لازمی معلوم نہیں ہوتی،

میں نے چلا کر کہا ہیں۔ ضروری نہیں! یقیناً یہ شوہر کے آرام اور خوشی کیلئے نہایت ضروری ہے کہ شوہر کبھی اتفاقیہ طور پر دیر سے گھر آسکے

بیوی نے نہایت محبت سے کہا پیارے یہ تو ٹھیک ہے اگر جب شوہر کو ایک رات دیر سے گھر لوٹنے کی اجازت ملے تو بیوی کو بھی ملنی چاہئے نا! ٹھیک ہے یا نہیں؟

میں نے کہا۔ پیاری میں اس وقت ذاتیات سے بالکل جدا بحث کر رہا ہوں۔ لیکن یہ جانتا ہوں کہ عورتیں اپنے شوہروں کا شام کا باہر رہنا بھی گوارا نہیں کرتیں۔ اور چاہے خود کتنے رات گئے گھر میں گھسیں

اب ہم دفعہ سات پر پہنچ گئے۔

اکمل کھری، ضدی، حسد۔ ہائی اور غیر معقول بیویوں کی بہتر تربیت کے لئے غاری لوگوں کے اصولوں کو وسعت دیجائے۔

میں نے سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

بظاہر یہ کیسا وحشیانہ فعل معلوم ہوتا ہے لیکن بنظر غایر اگر اسکی اصلیت پر نظر ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ چونکہ عورتیں بہت قدیمی مخلوق ہیں لہذا ان کو قدیمی علاج ہی کی ضرورت ہے،

بیوی نے فوراً اسکا اثر ... [illegible]

کے متعلق ہمیشہ یہی کہا جاتا ہے کہ ہم وحشیوں سے محبت کرتے ہیں۔ کیا یہ ہماری ایک ممتاز خوبی نہیں ہے۔؟ اگر یہ بات نہو تو ہماری محبت کا احاطہ کسقدر مختصر رہجائے! اور جلدی سے اسی میں اضافہ کرتے ہوئے کہا پیارے، اگر کسی موقعہ پر تمنے غاری لوگوں کے اصولوں کی مجھ پر آزمائش کی تو میرے بالوں کی تمام رعنائی جاتی رہیگی۔ پھر میں کیا کرونگی۔؟

میں نے تحکمانہ لہجہ میں کہا۔ میں اسی حالت میں سخت قدم اٹھانیکا ارادہ رکھتا ہوں جب تمام سہل طریقے ناکام ہو جائینگے۔ اور مجھے امید ہے کہ تم کسی حالت میں بھی مجھے سخت قدم اٹھانے پر مجبور نہ کروگی،

بیوی نے کہا شکریہ۔ مجھے آپ سے یہی امید ہے اچھا اب اسکی کون کونسی دفعات باقی ہیں۔

میں نے کہا جو دفعات نہایت ضروری اور اہم تھیں، وہ میں نے سنائی ہیں۔ جسوقت میں باہر چلا جاؤنگا اسوقت فرصت میں تم خود اسکا اچھی طرح مطالعہ کر لینا۔ میرا ارادہ ہے کہ میں نہ صرف "نیویارک سوسائٹی" کا ممبر ہوں بلکہ یہاں اسکی ایک شاخ بھی قائم کروں

بیوی نے جواب دیا پیارے یہ آپ کے لئے اور بھی زیادہ بہتر ہوگا۔ اس وقت اسکے لہجہ سے کچھ زودرنجی اور استہزا کا ترشح ہوتا تھا۔

میں نے کہا۔ میں یقین کرتا ہوں کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ حقیقتاً بالکل صحیح کہہ رہا ہوں۔ ہمیں کسی قسم کا مذاق یہ دل لگی نہیں ہے۔ اور تم غور کر سکتی ہو کہ اس انجمن کے اغراض و مقاصد کسقدر انصاف اور دانشمندی پر مبنی ہیں۔

بیوی نے جواب دیا۔ ڈیر واقعی یہی بات ہے مگر ... اسلئے مجھے امید ہے کہ جو قدم ہیں

اُٹھانیوالا ہوں، تم اسکی کسی طرح مخالفت نہ کروگی۔

بیوی نے جواب دیا۔ پیارے شوہر میں آپکے راستہ میں ذرہ برابر بھی رکاوٹ حائل کرنا نہیں چاہتی۔ اور میں آپ کی بہترین "رفیق غار" بننے کی کوشش کرونگی۔

میں اپنی بیوی کی اس غیر متوقع عمدہ سمجھ پر خوش ہوتا ہوا اپنے کام پر چلا گیا۔

کام کی مصروفیت نے دن بھر مجھے گھیرے رکھا اور میں گھر نہ آسکا۔ دن بھر کی محنت شاقہ اور دماغ سوزی سے میرا چہرا ہوگیا تھا۔ نیز تکان کیساتھ خفیف سی سردی بھی محسوس ہو رہی تھی۔ میرے دل میں خیال آیا کہ گھر میں کیسی کیسی آسائشیں میرے لئے آغوش انتظار وا کئے ہوئے ہونگی۔ دہکتی ہوئی آگ۔ گرم کمرہ، مرغن کھانوں سے سجی سجائی میز۔ اور پھر خواب نوشین۔

بہت رات گئے میں گھر واپس لوٹا۔ میری بیوی نے نہایت گرمجوشی کیساتھ ہال میں مجھے خوش آمدید کہا۔ میں "دارالمطالعہ" کی طرف بڑھا۔ چونکہ رات کا کھانا اکثر میں یہیں کھایا کرتا تھا، بیوی نے میرے پیچھے پیچھے دارالمطالعہ کی طرف آتے ہوئے کہا۔

ڈیر اسوقت دارالمطالعہ میں آگ نہیں ہے

میں ناخوشگواری کیساتھ نہیں بلکہ حیرت زدہ اور متعجب ہوکر

۔۔۔ اوہو۔

اچھا تو پھر آج کھانا میں ڈائننگ روم میں کھاؤنگا

بیوی نے جواب دیا۔ پیارے شوہر مجھے افسوس ہے کہ نہ تو آج ڈائننگ روم میں آگ ہے، اور نہ کہیں اور ہے کیونکہ آج ہمارے ہاں کوئلہ ختم ہوگئے۔

میں نے ترش رو ہوکر جواب دیا۔ کوئلہ ختم ہوگئے تو کیا دنیا میں کہیں سے بھی تمکو کوئلہ دستیاب نہ ہوسکے۔

مگر میں کیا کرسکتی تھی؟ بیوی نے کہا۔ آپ کے باہر جانے سے قبل مجھے معلوم نہ ہوا کہ گھر میں کوئلہ نہیں ہیں۔ اسلئے کوئلوں کی خریداری کے بارے میں میں آپ سے مشورہ نہ کرسکی،

میں نے حیرت اور مایوسی کیساتھ کہا۔ میرا مشورہ؟

بیوی نے ذرا چلا کر کہا آپ جانتے ہیں کہ دفعہ تین

میں نے کہا۔ کیا؟ دفعہ تین؟

بیوی نے کہا "انجمن محافظ شوہران" کی دفعہ تین کا یہ منشا ہے کہ بیوی کو اپنے شوہر کے مشورہ اور اجازت کے بغیر کسی چیز کا خریدنا خواہ وہ نقد ہو یا ادھار قطعی ممنوع ہے، اور آپ دیکھتے ہیں کہ مجھے مشورہ کرنیکا موقع ہی نہیں ملا

میں نے کہا۔ صبح سب سے پہلے تم کو کوئلوں کیلئے ٹیلیفون کرنا ہے

اچھا تو میں کھانے کیلئے بھی ٹیلیفون کردں! بیوی نے کہا۔

میں نے کہا یقیناً جس چیز کی تمہیں ضرورت ہو فوراً تمہیں ٹیلیفون کرنا چاہیئے۔

بیوی نے دریافت کیا تو اس اجازت میں قصائی بھی شامل ہے۔ قصائی کو بھی میں فون کرسکتی ہوں؟

میں نے کہا۔ بیشک

بیوی نے کہا۔ پیارے بچے گوشت سے بہت خوش ہونگے۔ چونکہ آج اُن کو گوشت نہیں ملا

میرے منہ سے یک لخت نکلا۔ آج گوشت نہیں ملا

بیوی نے عفو خواہانہ لہجہ میں کہا۔ پیارے آپ کو معلوم ہے کہ گوشت کے بارہ میں بھی صبح سے آپ سے مشورہ نہ کرسکی۔

میں نے بے صبری سے کہا ہاں ٹھیک ہے مگر اب میں کھانا کھاؤنگا۔ بھوک کے مارے میرا دم نکلا جارہا ہے،

کھانا! بیوی نے ٹھنڈا سانس بھرتے ہوئے کہا۔

پیارے میں سمجھ ہی تھی کہ میں نے سب کچھ واضح کر دیا حقیقت یہ ہے کہ بچوں نے سب بچا کچا کھانا بھی کھا لیا۔ اب تمہارے لئے کھانا بالکل نہیں ہے،

میں نے چلا کر کہا۔ کھانا نہیں ہے؟

بیوی نے نہایت حلیمت اور اشتیاق گھگھیا کہا۔

پیارے اگر آپ پسند کریں تو میں آپکے لئے ایک چائے کی پیالی بنا لاؤں لیکن اگر آپ دودھ کی کچھ پرواہ نہ کریں۔ چونکہ آج جسوقت دودھ والا آیا تو مجھے فوراً القا ہوا کہ میں نے آپ سے دودھ کے حساب کے متعلق کبھی مشورہ نہیں کیا۔ اور سوسائٹی کی دفعہ تین صاف طور پر ــــ

میں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ہاں ہاں ٹھیک ہے اچھا اب صبح ہم اسکے متعلق گفتگو کرینگے۔ شب بخیر۔ اوہ میرا کمرہ تو برف خانہ بنا ہوا ہے۔ میں کہاں سوؤں؟

بیوی نے جواب دیا آپ ڈرسنگ روم میں آرام کر سکتے ہیں۔ مگر پیارے مجھے افسوس کیساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ وہاں بھی آپ کو ذرا تکلیف ہوگی۔ کیونکہ آج ٹیوٹی جسوقت بستر ا ٹھیک کر رہی تھی تو "صوفہ" کا پایا ٹوٹ گیا تھا۔ اور اب پایہ معمولی طور پر جڑا ہوا ہے۔ ٹیوٹی بھی کیسی بیہودہ عورت ہے

میں نے کہا۔ مگر خدارا یہ تو بتاؤ کہ تمنے کسی بڑھئی کو کیوں نہیں بلایا؟

بیوی نے کہا مگر میں آپکے مشورہ کے بغیر کیسے بلا سکتی تھی۔ دفعہ تین۔

میں نے کہا ہاں ٹھیک ہے۔ تم صبح سویرے ہی بڑھئی کو بلا لینا۔

بیوی نے کہا آپکی عنایت۔ اور اس اثنا میں کواڑ تک پہنچتے ہوئے کہا۔ آج دوپہر کو خالہ اماں آئی تھیں۔

میں نے چلا کر کہا۔ اوہو خالہ اماں آئی تھیں۔ آخر انکو رحم آ ہی گیا۔ معاف کرنا اور فراموش کر دینا" کہ بہترین اصول پر آخر ان کو عمل پیرا ہونا ہی پڑا

بیوی نے جواب دیا ایسا ہی معلوم ہوتا ہے،

میں نے خوش خلقی سے رائے زنی کرتے ہوئے کہا بہت خوب۔ مرحبا۔ اور آخر اس مختصر سے گھرانے میں ہمیشہ ناچاقی رہنی چاہیے کبھی نہیں تھی، خبر کے اس ٹکڑے کو سن کر مجھے بے انتہا خوشی ہوئی تھی۔ کیونکہ۔

میری بیوی کی "خالہ اماں" سے کچھ عرصہ سے ہماری کھٹکی ہوئی تھی، یہاں تک کہ انہوں نے بات چیت کرنی بھی بند کر رکھی تھی۔ اور ہم انکی بزرگانہ شفقتوں سے محروم تھے۔ اگرچہ انہوں نے بھی اتنے عرصہ تک ہم سے دور رہنے میں اپنی طبیعت پر بے انتہا جبر کیا۔ اور تکلیف اٹھائی۔ مگر آخر کار۔ ان کو ایک دن۔ آج ترس آ ہی گیا۔

مجھے افسوس ہے کہ حالات کے زیر اثر مجھے انکو واپس کرنا پڑا بیوی نے کہا۔

میں نے کہا میرا خیال ہے کہ اب وہ تمام عمر ہمکو کبھی معاف نہیں کر سکتیں، اصل ماجرا کیا ہوا ہے؟

بیوی نے کہا۔ میں آپسے صحیح عرض کر رہی ہوں کہ خود میں نے ان کو نہیں دیکھا۔ میری آنکھیں ان سے دوچار نہیں ہوئیں۔ مگر میں نے ٹوٹنی سے کہدیا کہ جس طرح ہو سکے ظاہر کردے

میں نے کہا۔ کیا تم نے خود ان کو نہیں دیکھا؟ کیا تم خود ان سے نہیں ملیں؟ کیوں؟

بیوی نے متاسفانہ لہجہ میں کہا۔ پیارے تم کو معلوم ہے کہ سوسائٹی کی دفعہ چار کی رو سے ــــ

ساس یا بیوی کے کسی رشتہ دار کا انجمن کے کسی آفیسر کی تحریری اور دستخطی اجازت کے بغیر گھر میں داخل ہونا ممنوع ہے

میں نے جواب دیا مگر جو ٹوٹنی نے انسے کہا ہوگا مجھے

# خاں صاحب

از حضرت امین سلونوی

جس محلّہ میں تھا ہمارا گھر　　وہیں رہتے تھے ایک خانصاحب

ہم نے بھی عجائبات عالم کا خوب خوب مشاہدہ کیا اور جہاں رہے ایک نہ ایک نیا تجربہ ہمیشہ ہوتا رہا یہاں تک کہ ہم اپنے سیاسی تجربات کی بنا پر بالکل لائڈ جارج ہو گئے۔ اتنی سی عمر میں جن جن مقامات کی سیر کی ہے شاید کسی بڑے سے بڑے مورخ کو بھی نصیب نہیں ہوئی ہوگی۔ لوگ تاریخیں مرتب کرتے ہیں تو دور دراز ملکوں کا سفر کرتے ہیں۔ لوگوں سے ملتے ہیں، بات پوچھتے ہیں بات کی جڑ پوچھتے ہیں تب کہیں جا کر تاریخ کا ایک صفحہ مرتب ہوتا ہے لیکن ہمنے ان آنکھوں سے ایسے ایسے عجیب انسان دیکھے ہیں کہ جو بذات خود مکمل تاریخ تھے۔ ہم نے ابتدا میں جس محلہ میں سکونت اختیار کی تھی وہ ایسا محلّہ تھا کہ جہاں سے سینکڑوں تاریخیں نکلی ہوں گی سچ کہتا ہوں محلہ کا گوشہ گوشہ چپہ چپہ ابن آدم کے ابتدائی حالات سے معمور معلوم ہوتا تھا۔ اور جا بجا گری پڑی دیواریں کہنہ اور بوسیدہ عمارتوں پر ایسے ایسے نقوش مرتسم تھے کہ ماہرین نے اس کی اوّلیت کا کبھی صحیح اندازہ نہیں کیا۔ کوئی کہتا تھا کہ یہ چیزیں مسیح علیہ السلام سے بیس ہزار سال پہلے کی ہیں اور کوئی کہتا تھا کہ جب حضرت آدم علیہ السلام پہلے پہل اس دنیا میں بھیجے گئے تھے تو ادھر ہی سے ہو کر گذرے تھے۔ غرضکہ روایات مختلف ہیں۔ بہرحال وہ محلہ اس قابل ضرور تھا کہ اس کو محکمۂ آثار قدیمہ کے دفتر میں محفوظ کر دیا جاتا اور اگر یہ بھی ناممکن تھا تو کم از کم اسی محلہ کو دفتر محکمۂ آثار قدیمہ قرار دیدیا جاتا اور اگر ان میں سے کوئی صورت بھی ممکن نہ تھی تو اس کو اس محکمہ کے زیر نگرانی ضرور ہونا چاہیئے تھا۔ ہم چونکہ ایک عرصہ تک اس محلہ میں رہ چکے ہیں اس لئے یہاں کی ایک ایک چیز کو اس نظر سے دیکھا ہے کہ جیسے ان میں سے ہر چیز تاریخ عالم کا قبرستان تھی یا جیسے پہلے پہل کولمبس نے سرزمین امریکہ کو دیکھا تھا۔ اس محلہ کی ہر چیز سلف صالحین کی ایک یادگار تھی۔ اور راتوں کو تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ تمام دنیا کے گذشتہ مورخین کی روحیں ان کھنڈرات میں تبادلۂ خیالات کے لئے جمع ہوئی ہیں۔ کسی طرف سے ابن العربی کے بولنے کی آواز آتی تھی تو کسی طرف مارسڈن کے چیخنے کی صدا سنائی دیتی تھی۔ کبھی ہمر صاحب اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے کبھی رابرٹس صاحب تقدیم و تاخیر پر چلاتے تھے۔ ایک گوشہ میں لینکا لے سر جھکائے بیٹھے تھے۔ اکثر لوگوں کا یہ خیال تھا کہ ان خالی اور بوسیدہ مکانات میں شاید راتوں کو بدمعاش جمع ہوتے ہیں اور لوٹ مار کا سامان تقسیم کرتے ہیں۔ جو بہت بوڑھے تھے وہ یہ کہتے تھے کہ یہاں ۵۷ء کے غدر میں بہت سے گورے دفن کر دئے گئے ہیں اور راتوں کو ان کی روحیں ڈبل روٹی چاء اور مکھن کی تلاش میں نکلتی ہیں۔ غرضکہ ہر ایک سے ایک نئی بات معلوم ہوتی تھی۔ اب اگرچہ شہر میں محکمۂ امپرومنٹ ٹرسٹ ایک عرصے سے قائم ہے اور اکثر محلے نئی نئی اسکیموں کی زد میں آ چکے ہیں اور بہت سی پرانی دھرانی عمارتیں نئی نئی بستیوں میں تبدیل ہو گئیں۔ اکثر

مکانات تارکول کی چمکتی ہوئی سڑکوں کے نیچے دفن ہو گئے۔ لیکن اب تک محکمہ نے اس محلہ کی طرف بری نگاہوں سے نہیں دیکھا شیطان کے کان بہرے۔ کچھ لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ کسی فقیر کی دعا ہے کہ یہاں کوئی نئی عمارت ہی نہیں بن سکتی لیکن میرا خیال ہے کہ اس کو شاید آثار۔ صنادید پدید ست عجم را کے مصداق بطور یادگار باقی رہنے دیا گیا ہے بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ اس محلہ سے ایک زمانہ میں سلاطین اودھ کی پوری تاریخ مرتب کی گئی تھی۔ اور اب بھی جب کبھی بارش ہو جاتی ہے یا ہوا کا تیز جھونکا آ جاتا ہے تو کسی نہ کسی طرف سے اڑ اڑا دھم دھم کی صدائیں کانوں میں آنے لگتی تھیں اور کھوکھلی بنیادوں سے تاریخ کا کوئی نہ کوئی صفحہ ضرور برآمد ہو جاتا تھا۔ بہرحال اس کی قدامت بالکل اس طرح ظاہر ہے کہ جس طرح پرتھی راج کا چھکڑا، رائے بریلی کا یکہ، سلیم شاہی جوتہ اپنی نایاب اور نادر ساخت کے لحاظ سے اپنے موجدین کا اب تک زندہ کئے ہوئے ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ ہمارے آنے سے قبل بہت سی قدیم عمارتیں نیست و نابود ہو چکی تھیں۔ اور اب صرف چند پرانے کھنڈرات اور کچھ پرانی نالیاں جن کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ یہ غازی الدین حیدر کی نہر کی شاخیں ہیں، باقی تھیں جن میں سڑا ہوا بدبودار پانی اور کیچڑ بھی شاید اسی وقت کی یادگار رہے جو دریاؤں سے آ کر رک گیا تھا۔ ان کے علاوہ ایک زندہ یادگاروں میں محلہ کے خاں صاحب تھے جن کی قدامت بھی اسی وقت سے بتائی جاتی ہے جب سے کہ روح و مادہ کو لوگوں نے جانا سمجھا اور اتنی سی عمر میں کئی مرتبہ خانصاحب بوڑھے اور جوان ہوئے۔ خود ان کی روایت کے مطابق تین مرتبہ ان کے دانت نکلے اور گرے۔ بہرحال ایک بھی دم غنیمت۔ قارون کے خزانے یا فراعنہ کی لاشوں کی طرح باوجود سرد و گرم عالم کے محفوظ تھا۔ غدر ۱۸۵۷ء سے اب تک کے حالات تو ان کے لئے کل کی بات تھی۔ اور اب گو خانصاحب میں وہ بات باقی نہیں ہے جو غالباً اب سے پچیس تیس برس پہلے رہی ہوگی۔ مگر خانصاحب اب بھی بیس پچیس سال تک اس محلہ سے جدا ہوتے ہوئے نہیں معلوم ہوتے تھے اور بات بات میں کڑی کمان کا تیر معلوم ہوتے تھے۔ جب کبھی خانصاحب کا میلے ٹھیلے میں گذر ہو جاتا تو یہ معلوم دیتا کہ جیسے ان کی رگوں میں مئے دو آتشہ بھر دی گئی ہے اس ضعیفی اور کہرسنی کے باوجود ان سے کوئی نوچندی جمعرات اور کوئی عرس باقی نہیں رہتا تھا۔ خانصاحب پر امتداد زمانہ کا پورا پورا اثر ہوا تھا۔ کمر بالکل ختم تو نہیں ہوئی تھی لیکن اگر لکڑی کا سہارا لیکر خانصاحب نہ چلتے تو ایک قیمتی کمان کے مالک ہوتے مگر اس حال میں ہی گھر سے بغیر سرمہ لگائے ہوئے کبھی نہیں نکلے۔ خوش قسمتی سے خانصاحب ہمارے ہمسایہ تھے اور جب کبھی ان کی پٹھائی سے کھٹ پٹ ہو جاتی تو غریب کدہ ان کے لئے ہیچ آفت نہ رسد گوشہ تنہائی ثابت ہوتا۔ اور خانصاحب اپنے دیرینہ تجربات و مشاہدات کے وہ وہ قصے سناتے کہ بس آدمی سنتا رہے اور حقیقت یہ ہے کہ خانصاحب اگرچہ ہمارا وقت تو بہت ضایع کرتے مگر اس کے بدلے ہمارے لئے تفریح کا سامان بھی بہت کچھ بہم پہنچاتے۔ خانصاحب میں یوں تو باطنی صفات بہت تھیں مگر ظاہری صفات بھی کئی ایک تھیں جس کے متعلق صحیح روایات بھی تھیں کہ ایں سعادت بزور بازوئے خود تھی۔ اور یہ واقعہ ہے کہ خانصاحب خود ایک مکمل اور زندہ عجائب خانہ اور اس کی تاریخ تھے۔ اگرچہ ضعیفی نے اب ان کو اس قابل نہیں رکھا تھا کہ وہ اسی اہتمام سے اپنے گذشتہ واقعات کی تاریخ بیان کر سکتے جیسے کسی زمانہ میں عیش باغ کے یاران طریقت میں قمر صاحب ایک بیالی افیون اور چھٹانک بھر بالائی کے صلہ

میں طلسم ہوش رُبا سُنایا کرتے تھے۔ لیکن ماہرین کا اس بارے میں اجماع تھا کہ اگر خاں صاحب کو جرمنی بھیجا جائیں کوئی گراموفون فٹ کرا لیا جائے تو ابھی یہ مدتوں تک کام دے سکتے اور تنہائی کے بہت بڑے رفیق ثابت ہو سکتے تھے۔ خانصاحب میں مرورِ ایام سے اب وہ بانکپن تو نہیں رہا ہے جو ان کی جوانی کے پچھلے پن میں رہی ہوگی مگر وہ نقوش مٹے مٹائے اب بھی باقی تھے۔ اور صبح و شام داڑھی میں کنگھا کرنا اور چڑھانا اب بھی وضعداری میں داخل تھا۔ اور اگر کوئی بھولے سے بڑے میاں کہہ دیتا تو خانصاحب کا چہرہ سرخ پڑ جاتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کسی نے ماں کی گالی دیدی ہو۔ جب کبھی خانصاحب کا کسی سیر میں ساتھ ہو جاتا تو مجمع میں حسین آنکھیں، پتلی کمر، سرخ لب، اور غنچہ دہن کے پرکھنے میں بڑے بڑے باکمالوں کو مات کر دیتے اور کہتے کہ یہ فرنگی بڑے بد ذوق ہیں جو بھوری اور کرنجی آنکھوں کو پسند کرتے ہیں حالانکہ وہ آنکھ ہی کیا جس میں دنبالہ دار سرمہ نہ لگا ہوا ہو، جس کے رس سے انسان متوالا نہ ہو جائے۔ ایک دن خانصاحب کے ساتھ ہم لوگ نوچندی جانے کے لئے تیار ہوئے۔ اُس دن خانصاحب کی سج دھج دیکھنے کے قابل تھی، خانصاحب نے سر پہ بانکی ٹوپی لگائی، بدن پہ چھوکلی کا انگرکھا پہنا، پاؤں میں گھیتلے جوتے، گلے میں رومال۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خانصاحب دولھا ہیں اور ہم سب لوگ شہ بالا۔ غرضکہ شاہ مینا صاحب پہونچ گئے۔ اے صاحب وہ تو نوجوانوں سے بھی زیادہ خوش مذاق ثابت ہوئے اور حسنِ رنگین کے وہ وہ رموز و نکات بتائے، عشق و محبت کی وہ وہ داستانیں دہرائیں کہ بس ہم کو تو یہ یقین ہوتا تھا کہ کیوپڈ آپ ہی کا خاندان ہو۔ خانصاحب نے کہا میاں کیا پوچھتے ہو، وہ وقت نہیں، وہ زمانہ نہیں ورنہ اس شاہراہ میں یہ ساری عمر کاٹی ہے۔ آج اس عالم میں ہمارا پہلو خالی نظر آتا ہے۔ سو وہ بھی اس لئے کہ اب وہ فراغت ہی میسر نہیں ورنہ دل ابھی ویسا ہی جوان ہے۔ خانصاحب میں دو باتیں بڑی خاص تھیں۔ ایک تو یہ کہ آج تک اپنے شہر سے کبھی باہر نہیں گئے۔ اور وہ بھی اس لئے کہ اگر راستہ میں ملک الموت صاحب قبلہ نے مزاج پرسی کر لی تو گھر کے شہر اول سے دور رہیں گے۔ دوسرے یہ بات تھی کہ آج تک خانصاحب کبھی ریل پر سوار نہیں ہوتے تھے۔ کیونکہ خانصاحب اس کی وجہ یہ بتاتے تھے کہ بھائی ایسی سواری کس کام کی جو اپنے قابو سے باہر ہو اور اپنی مرضی سے رُکے اور چلے۔ نہ رکاب نہ لگام نہ آسن جمانے کا کوئی موقع۔ سواری تو وہی سواری ہے جس کی لگام ہاتھ میں ہو۔ خدا معلوم چلتے چلتے راستہ میں کہاں بگڑ جائے اور کس سے لڑ جائے۔ ریل کا تو کچھ نہ بگڑیگا۔ البتہ یہاں لاکھوں کی جان مفت میں ضایع ہو جائے گی۔ پھر یہ کہ ہاتھ سے ٹکٹ کہیں گر گرا جائے تو اور مصیبت۔ لینے کے دینے پڑ جائیں اور کرایہ پھر بھی ادا کرنا پڑے۔ اس سے تو یہ بہتر ہے کہ اپنے ہی پاؤں چلا جائے۔ غرضکہ خانصاحب کشمیری بھانڈوں کی وہ آتشبازی تھے کہ جو چھوڑنے پہ بھی نہ چھٹے۔ خانصاحب نے آج تک کبھی بائیسکوپ اور سینما نہیں دیکھا تھا معلوم نہیں خانصاحب نے اس طرف اب تک توجہ کیوں نہیں کی۔ بہرحال ایک روز ہم لوگوں نے خانصاحب کو شوق دلایا اور یہ کہہ کر اور بھی بھڑکا دیا کہ خانصاحب اگر آپ نے سینما نہ دیکھا تو کہنے کو رہ جائیگا کہ اس زمانہ کی ایک نئی ایجاد سے محروم رہے۔ کچھ خانصاحب کے بھی جی میں سما گئی اور وہ ہم لوگوں کے ساتھ چلنے پہ تیار ہو گئے۔ اب ہم لوگ مع خانصاحب پوری تیاری کے ساتھ

سینما ہال کے اسپیشل کلاس میں داخل ہوگئے۔ ابھی تک سینما ہال برقی قمقموں سے جگمگا رہا تھا۔ کیونکہ تماشہ شروع ہونے میں دیر تھی۔ خانصاحب نے پوچھا کہ تماشہ کہاں ہوگا۔ ہم نے کہا سب سے آگے۔ تو خانصاحب نے فرمایا کہ پھر آگے بیٹھنا چاہیئے۔ نزدیک سے اچھا دکھائی دیگا۔ یہ تو بے وقوفی ہے کہ دام کے دام خرچ کریں اور دور بیٹھکر تماشہ دیکھیں اب اس وقت خانصاحب کو رموز و نکات کون سمجھاتا۔ کیونکہ خانصاحب اُٹھ کھڑے ہوئے تھے اور ایک ہاتھ سے کوچ کو اُٹھانے کی جدوجہد شروع کردی۔ ہم نے کہا خانصاحب اس کو کیوں اُٹھاتے ہو۔ خانصاحب بولے اس کو آگے رکھ لیں گے۔ ہم نے کہا: ہاں بیٹھنے کی جگہیں ہیں۔ بالآخر ہم سب لوگوں کو بھی خانصاحب کی معیت میں چار آنے والوں میں آکر بیٹھنا پڑا۔ تماشہ شروع ہونے کی تیسری گھنٹی ہوئی اور سینما ہال میں بالکل اندھیرا کر دیا گیا۔

خانصاحب نے ایسا تماشہ کبھی کا ہیکو دیکھا تھا کہ جو اندھیرے میں دکھلایا جاتا۔ خانصاحب کو دفعتًا اندھیرا ہوجانے سے کچھ پریشانی ہوئی اور گھبراہٹ میں دوسری طرف منھ کر کے پکارنے لگے ارے بھئی دیکھو اندھیرا نہ کر دو یہ کیا مذاق ہے آخر تماشہ کس طرح دیکھا جائیگا۔ لیکن خانصاحب کی کون سنتا ہے اس پر ان کو اور تاؤ آیا اور لگے زور زور سے ڈانٹنے میں نے کہا خانصاحب یہ کیا کرتے ہو اب تماشہ شروع ہوتا ہے۔ خانصاحب نے مجھ سے مخاطب ہوکر فرمایا۔ ارے میاں اتنی عمر ہوئی مگر آج تک کوئی ایسا تماشہ نہیں دیکھا کہ جو اندھیرے میں ہو۔ مجھ سے مذاق کر رہے ہو۔ بھلا کہیں اندھیرے میں کوئی تماشہ کیا جاتا ہے۔ میں نے کہا خانصاحب مذاق؟ خانصاحب! اور کیا مذاق نہیں تو اور کیا اندھیرے میں تو آنکھ مچولی کھیلی جاتی ہے۔ میں نے کہا خانصاحب سینما اندھیرے ہی میں ہوتا ہے ذرا دیوار کی طرف تو دیکھئے۔ خانصاحب! کیا کہا دیوار کی طرف دیکھوں کیسے دیکھوں کس طرح دیکھوں کیا آنکھوں میں لالٹین لگی ہے کچھ دکھائی دے تو دیکھوں بھی یہ سینما والے بڑے بدتمیز ہیں اگر ایسا ہی تھا تو ایک لالٹین ہی جلا دیتے۔ وہ تو مفت دام لینا تھے لے لئے چلئے فرصت ہوئی۔ تم لوگوں کی نئی نئی آنکھیں ہیں تمکو دکھائی دیتا ہوگا مجھ کو تو کچھ نہیں سوجھائی دیتا۔ اتفاق سے خانصاحب نے دوسری طرف منھ کر لیا تھا اور تماشہ پیچھے ہو رہا تھا۔ بڑی مشکل سے خانصاحب کا منھ سامنے کی طرف کیا گیا۔ دیوار پہ تصویریں جنبش کر رہی تھیں۔ خانصاحب نے اس سے پہلے سینما دیکھا ہی نہ تھا اب جو چلتی پھرتی تصویریں دیکھیں تو منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ تھوڑی دیر میں گھوڑدوڑ کا ایک میدان دکھایا گیا جس میں گھوڑے بڑی تیزی سے دوڑ رہے تھے۔ دوڑ کا رُخ بالکل سامنے تھا اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے یہ اوپر ہی آجائیں گے۔ ہم نے دیکھا کہ خانصاحب گھبرا گھبرا کر پیچھے ہٹنے کی کوشش کر رہے ہیں ہم نے پوچھا خانصاحب یہ کیا ہو رہا ہے۔ فرمانے لگے کہ دیکھتے نہیں ہو یہ گھوڑے سامنے ہی چلے آرہے ہیں اگر انکی بھاری ٹاپیں پڑ گئیں تو ہڈیاں سرمہ ہو جائیں گی اور یہ کہکر خانصاحب ایک مرتبہ اور زور سے پیچھے ہٹے۔ بنچ لڑھکی اور دوسروں پر گر پڑی لیکن غالبًا پیچھے کے بیٹھنے والوں نے بھی سمجھ لیا تھا کہ خانصاحب آج پہلے ہی پہلے سینما دیکھنے تشریف لائے ہیں اس لئے وہ لوگ تو خاموش ہوگئے لیکن خانصاحب نے ایک دفعہ چیخ کر آواز لگا ہی دی کہ بھائی ہم اس تماشہ سے باز آئے کچھ جان دینے تو آئے نہیں کہ زبردستی گھوڑوں کی ٹاپوں سے خود کو کچلوا دیں

اتنی دیر میں رُخ بدل گیا اور گھوڑے بڑی تیزی سے ایک دوسرے کا مقابلہ کر رہے تھے۔ میں نے کہا خانصاحب دیکھئے گھوڑوں کی باگیں موڑ لیں۔ خانصاحب کو اب لطف آنے لگا اور بڑھ بڑھ کر پکارنے لگے شاباش بیٹا مار لیا بازی ایک ایڑ اور لگا دینا بس پہنچ گئے، اول سے اول۔ کیا کہتا ہے اب جیسے جیسے گھوڑے قریب ہوتے جاتے ہیں خانصاحب کا جذبہ بھی ترقی کرتا جاتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے خانصاحب خود ہی گھوڑے پر سوار ہیں۔ میں نے چپکے سے پھر کہا خانصاحب تماشہ میں شور وغل کرنا منع ہے اب خانصاحب آدھے کھڑے تھے اور آدھے بیٹھے۔ ہم نے یہ سمجھ لیا تھا کہ بس ابھی خانصاحب جو جھکے تو دیوار ہی کے پاس نظر آئیں گے اس لئے کسی نہ کسی طرح اُن کو چپ کیا اور بٹھا لیا لیکن خانصاحب عادت سے مجبور تھے، اور پھر ایسی ایسی چیزیں دیکھنے میں آ رہی تھیں کہ خواہ مخواہ خانصاحب کا پٹھانی جذبہ مشتعل ہو رہا تھا۔ اور یہاں یہ خیال کہ ایسا نہ ہو منیجر صاحب ہم سب کو نکلوا دیں۔ کیونکہ تماشہ گاہ میں شور وغل کرنے سے بغیر واپسی ٹکٹ لوگ نکال دئے جاتے ہیں اور پھر زمانہ ایسا ہے کہ بات بات میں دفعہ ۱۴۴ لگا دی جاتی ہے۔ غرض مجھ کو تو نقص امن کا اندیشہ ستا رہا تھا لیکن خاں صاحب اس طرح محویت میں چلا رہے تھے کہ جیسے تمام واقعات انہیں کی ذات سے وابستہ ہیں۔ دفعتاً منظر بدل گیا اور ایسا بدلا کہ خانصاحب اور بے اختیار ہو گئے ایک حسین لڑکی کو کچھ بدمعاش گھیرے ہوئے تھے اور وہ اُن سے مقابلہ کر رہی تھی۔ بھلا خانصاحب کو کہاں تاب تھی جلدی سے آستینیں چڑھا لیں اور کڑک کر بولے بس خبردار ایک ایک کا سر توڑ دوں گا۔ ہم لوگ ہاں ہاں کرتے رہ گئے اور خانصاحب مارے غصہ کے پردے کی طرف جھپٹ پڑے۔ خانصاحب کا جھپٹنا تھا کہ پورے ہال میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ خاں صاحب تیزی میں جھپٹے تو آپ کا سرِ اقدس دیوار سے لڑ گیا۔ اور اسی عرصہ میں تماشہ کا انٹرول ہو گیا۔ خانصاحب نے پردے پر ہاتھ مارا تو انٹرول کے مرغ پر پڑا۔ اور بڑے فخر سے بولے بہت تیرے کی بن گیا مرغا ورنہ ابھی پورا مزہ چکھاتا۔ خاں صاحب کی اس وحشت نے ایک عجیب ابتری پیدا کر دی تھی کچھ ادھر اور کچھ اُدھر لوگ اُٹھ اُٹھ کر بھاگے۔ ہم لوگوں نے جلدی سے اُٹھ کر خانصاحب کو پکڑا اور باہر کھینچ کر لے آئے لیکن خانصاحب اب بھی وہی فرما رہے تھے کہ دیکھا کیسا دُم دبا کر بدمعاش بھاگ نکلے۔ ہم نے کہا خانصاحب یہ کیا غضب کر دیا۔ بھلا یہ کونسی حرکت تھی۔ سارے تماشہ میں ہی ایک تو دلچسپ سین تھا اور آپ نے کسی کو دیکھنے نہ دیا۔ خانصاحب بولے سچ کہتا ہوں میں ابھی لاکھ بوڑھا ہوں مگر ان جیسوں دس کو بھگا سکتا ہوں۔ ہم نے پوچھا خاں صاحب آخر واقعہ کیا ہوا۔ خانصاحب بپھر کر بولے تم کیا جانو غیرت اور حمیت کا کیا وقت ہوتا ہے، ایک بیچاری لڑکی اور اس کو اتنے بدمعاشوں نے گھیر لیا۔ بھلا کوئی شریف انسان اس کو برداشت کر سکتا ہے۔ میں نے کہا خاں صاحب یہ تو تماشہ تھا بھلا اس میں غیرت و حمیت کا کیا سوال تھا۔ خانصاحب بولے بس رہنے دیجئے آپ لوگ مجھے نصیحت نہ کیجئے۔ ایسے تماشہ کی ایسی تیسی۔ اگر نوابی کا زمانہ ہوتا تو ... رستے ان کی گردنیں اڑا دیتا۔ میں نے کہا خاں صاحب ہوش کیجئے یہ تو محض تصویریں تھیں کچھ واقعی انسان تھوڑے ہی تھے۔ خاں صاحب کہنے لگے لاحول ولا قوۃ تو تم نے پہلے ہی کیوں نہ بتا دیا مجھے کیا معلوم

کہ واقعی آدمی ہیں یا کیا۔ بڑی خیریت ہوئی کہ میرے پاس کوئی ہتھیار نہ تھا ورنہ خون خرابا ہوجاتا۔ غرض کہ ہم لوگ چپکے سے خاں صاحب کو اکیلا کر چلے آئے اور دل میں نہایت نادم و پشیمان تھے کہ اللہ نے بڑی خیریت کی ورنہ آج نہ معلوم کیا ہو جاتا۔ اور خانصاحب کے ساتھ ہم لوگوں کی بھی اچھی خاصی مرمت ہو جاتی۔ اس روز سے آج تک میں نے کبھی خاں صاحب سے سنیما دیکھنے کا ذکر نہیں کیا۔ حالانکہ خانصاحب ہمیشہ کہتے رہے لیکن کس کے سر میں اتنے بال تھے جو خانصاحب کے ساتھ سنیما جاتا اور جوتے کھاتا۔ غرضکہ خاں صاحب بذات خود ایک زندہ عجائب خانہ تھے اکثر آپ سے کرامات بھی سرزد ہوتی تھیں۔ لیکن ان کا حلقہ اکثر اسی محلہ کی بوسیدہ دیواروں تک محدود رہتا مگر یہ واقعہ ہے کہ خانصاحب کے ولیا ہونے میں دو باتوں کی کمی تھی ایک تو یہ کہ پٹھان تھے، دوسرے ایک چیز اور تھی جس کے متعلق ہم خود کچھ نہیں بتا سکتے۔ البتہ ان کے ساتھی فریمسن والے اس کو جانتے ہیں لیکن اس کے باوجود بھی خانصاحب کا روحانی تقدس بہت زیادہ ترقی کر چکا تھا۔ اگر خانصاحب اپنی عمر طبعی تک پہنچ گئے تو پھر چوبیس چوبیس کوس کے اردگرد میاں معلم الملکوت کا گذر ہونا بھی ناممکن ہو جائے گا۔ داستان بہت طویل ہے مختصر یہ کہ اب کہاں تک عرض کریں اس لئے کہ یار زندہ صحبت باقی پر ختم کرتا ہوں اور باقی کیلئے اشتیاق و انتظار کی طویل حدیں قائم کرتا ہوں کیونکہ ہمیں یقین ہے کہ ابھی خانصاحب برٹش گورنمنٹ کی کئی جوبلیاں دیکھینگے اس لئے اس وقت تک ہمیں بھی اسکے ختم کرنے کی امید کم نظر آتی ہے۔

---

# کہاں سے لاؤں

از جناب اظہار حسن، اظہارؔ رامپوری

ن فکر میں ہوں یارو دُلہن کہاں سے لاؤں　　لاؤں تو اس کی خاطر جوشن کہاں سے لاؤں
ریب کون دے گا جھانجن کہاں سے لاؤں　　تن کو ہی جب نہیں ہے تو زن کہاں سے لاؤں
گیہوں، چنا، مٹر، جو، بیسن کہاں سے لاؤں
اس دوزخِ شکم کا ایندھن کہاں سے لاؤں

ڑا نہ پیٹ کو ہے، کوڑی نہ ہے کفن کو　　کھا بیٹھے گروی رکھ کے سینی کو اور لگن کو
ے کون قرض ایسے مُفلس کو خستہ تن کو　　آئے کہاں سے آخر ایسے چٹورپن کو
لڈو، اِمرتی، حلوا سوہن کہاں سے لاؤں
اس دوزخِ شکم کا ایندھن کہاں سے لاؤں

فلاس کا بُرا ہو پھرتا ہوں مارا مارا　　ہے وردِ قل ہو اللہ ہوتا نہیں گذارا
ورعِ ابقر کے صدقے بل من کا ہے اِشارا　　اسباب بک گیا ہے بخت گھر کا سارا
توری، گھیا، ٹماٹر، بیگن، کہاں سے لاؤں
اس دوزخِ شکم کا ایندھن کہاں سے لاؤں

حلوں کے خواب شیریں اور جھونپڑوں میں رہنا　　پیسہ نہیں میسّر ہے عیدگاہ پہ ڈیرا
ہے دیکھنے کے قابل واللہ یہ تماشہ　　چٹخارے یہ زباں کے اور بھوجنوں کا ٹوٹا
انگور، سیب، کیلا، جامن کہاں سے لاؤں
اس دوزخِ شکم کا ایندھن کہاں سے لاؤں

ہمسار کرکری کی اِس مفلسی نے کیسی　　ہر چیز بیچ کھائی پھر بھی نہیں ہے سیری
پامال ہو رہی ہیں سب آرزوئیں دل کی　　گھر کے چراغ تک میں بتی پڑی ہے سوکھی
رادھا کے ناچنے کو نومن کہاں سے لاؤں
اس دوزخِ شکم کا ایندھن کہاں سے لاؤں

# ہنسانے والی کتابیں

## مُصورِ ظرافت جناب مرزا عظیم بیگ چغتائی کی کتابیں

**کولتار** چغتائی صاحب کا بہترین مزاحیہ ناول۔ پندرہ باب کا نہایت دلچسپ خندہ خیز ناول جس کا ہر باب ایک مکمل افسانہ بھی ہے اور اگر کڑی سے کڑی ملائیے تو کچھ اور ہی لطف پیدا ہو جائیگا۔ "کولتار صاحب" کے عجیب وغریب واقعات، شریر شاہدہ کی بے نظیر اور ہنسانے والی شرارتیں، شاہدہ کی شادی کے پُر لطف واقعات۔ "ہم والی" کے پُر اسرار حالات اور نوعمر لڑکیوں کی شوخ و شنگ باتیں پڑھکر آپ اُچھل اُچھل پڑیں گے۔ بہت کم جلدیں باقی رہ گئیں ہیں۔ بڑا سائز تقریباً ڈھائی سو صفحات کا قہقہہ خیز و عبرت انگیز ناول قیمت دو روپے علاوہ محصولڈاک ؎

**فل بوٹ** چغتائی صاحب کی یہ تازہ ترین تصنیف ہے۔ چھوٹے چھوٹے اکیس باب کا ناول ہے جو تین حصوں میں منقسم ہے۔ یہ لحاظ پلاٹ اور رنگین بیانی مصنف کی یہ بہتر تصنیف ہے تخیل کی لطافت، پلاٹ اور عبارت کی ظرافت اور واقعات کی شوخی دیکھنے کے لائق ہے۔ مصنف نے اپنی دلچسپ مگر سُلجھی ہوئی مزاحیہ عبارت کی ظرافت میں جس خوبصورتی سے جذبات بھرے ہیں، اُس کی تعریف ناممکن ہے، پلاٹ اس قدر چست ہے اور اس خوبی سے ایک فل بوٹ (جوتا) اس ناول کے ہر ایک باب میں ایک کامک پارٹ ادا کرتا ہے کہ پوری کی پوری کتاب بہترین مزاحیہ ناول ہو گئی ہے۔

کتاب کا اعلیٰ لائبریری ایڈیشن نہایت اہتمام سے نکالا گیا ہے، بہترین جلد سرورق رنگین ہے اور آرٹ کا بہترین نمونہ ہے۔ مصنف کی تازہ ترین فوٹو بلاک کی اس میں تصویر بھی شامل ہے قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے (عہ) علاوہ محصولڈاک ؎

**روحِ ظرافت** مرزا صاحب کے آٹھ بہترین افسانوں کا مجموعہ جس میں "انگوٹھی کی مصیبت" "کولتار" اور "الشذری" جیسے ہنگامہ خیز مزاحیہ افسانے بھی شامل ہیں قیمت مجلد عہ غیر مجلد عہ۔ علاوہ محصولڈاک ؎

**روحِ لطافت** مرزا صاحب کے آٹھ اور دلچسپ افسانوں کا مجموعہ "بہار رانی کا خواب" جیسا لاجواب افسانہ بھی اسی مجموعہ میں شامل ہے ہر افسانہ پسندیدہ ہے۔ قیمت عہ علاوہ محصولڈاک ؎

**مرزا جنگی** لکھنؤ کی مٹی ہوئی تہذیب یعنی آخری تاجدارِ لکھنؤ کے زمانہ کا نقشہ جس خوبی سے چغتائی صاحب نے ڈرامہ کی صورت میں کھینچا ہے بس کچھ دیکھنے ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ قیمت ۱۲ر علاوہ محصولڈاک ؎

**جنّی کی انگوٹھی اور لوٹے کا راز** پہلے حصہ میں ایک صاحب کے پُر لطف مضحکہ خیز واقعات اُنہی کی زبانی بیان کئے گئے ہیں اور دوسرے حصہ میں ایک لوٹا نے اپنی دردناک سوانحعمری بیان کی ہے۔ عجیب وغریب ناول ہے۔ قیمت ۸ر علاوہ محصولڈاک ؎

ملنے کا پتہ۔ ساقی بک ڈپو۔ دہلی

# جرعات

جلد | ساقی دہلی - بابت جون ۱۹۳۳ء | نمبر ۶

SAQI



عروس نو

Calcutta Art Press, Delhi.

"SAQI"



Calcutta Art Press, Delhi.

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# نگاہِ اوّلین

جرائد و رسائل کے اس ہنگامہ زار میں اچھے رسالوں کا وجود بہ غنیمت نظر آتا ہے کہ اُن کے ذریعہ اُردو ادبیات میں پاکیزہ اضافہ ہوتا رہتا ہے لیکن ایسے رسالے ہماری بدذوقی کے باعث یا تو زیادہ عرصہ تک زندہ نہیں رہتے یا اگر بچ رہتے ہیں تو مالی مشکلات میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ لاہور کا مشہور رسالہ "ادبی دُنیا" عرصہ سے دم توڑ رہا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ مشہور ادیب اور لائق جرنلسٹ منصور احمد صاحب نے اس کی عنانِ ادارت اپنے ہاتھ میں لیکر اس کے ساتھ مسیحائی کی اور علم و ادب کے اس سسکتے ماہنامہ کو دوبارہ زندگی بخشی۔ ہمیں یقین ہے کہ ان کے سلیقہ مند ہاتھ جس رسالہ کو مرتب کریں گے وہ دوم درجہ کا کبھی نہیں کہلایا جا سکتا۔ ثبوت میں گذشتہ دو اشاعتیں پیش کی جا سکتی ہیں جو ہر لحاظ سے ماسبق اشاعتوں پر نمایاں فوقیت رکھتی ہیں۔ ادارۂ ساقی کی جانب سے "ادبی دُنیا" کے اس کامیاب دورِ جدید پہ لائق مُدیر کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کیا جاتا ہے۔

ملک محمد اسلم صاحب ایم۔ اے (کیمبرج) بار ایٹ لا کے زیرِ ادارت ایک نیا رسالہ "فسانہ" لاہور سے جاری ہوا ہے۔ اس کا ابھی تک صرف ایک پرچہ شائع ہوا ہے لیکن یہ نقشِ اوّل بھی بہت اچھا کہا جا سکتا ہے۔ خدا کرے کہ جن مقاصد کو لیکر یہ پرچہ نکلا ہے اُن کے حصول میں اسے کامیابی ہو تاکہ یہ خالص ادبی پرچہ پروان چڑھ کر صحافتِ وطنیہ کے لئے باعثِ فخر ثابت ہو۔ ہمیں یہ دیکھ کر بیحد مسرت ہوتی ہے کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات صحافتِ اُردو کی طرف متوجہ ہوتے جاتے ہیں اور وہ وقت ہمیں دُور نظر نہیں آتا جب کہ اور زبانوں کی طرح اُردو بھی اپنی صحافت پر ناز کر سکے گی۔

---

ساقی کی اس اشاعت کے ساتھ اس کی ساتویں جلد ختم ہوتی ہے۔ آٹھویں جلد کی ابتدا "افسانہ نمبر" سے ہوگی۔ "افسانہ نمبر" جولائی میں ہر سال شائع ہوتا رہا ہے اور اپنی نوعیت و بلندیٔ مضامین کے باعث بہترین افسانوں کا مجموعہ تسلیم کیا گیا ہے۔ اس سال بھی مشہور افسانہ نگار حضرات نے اس کی تکمیل میں حصہ لیا ہے۔ اور موصول شدہ افسانوں کو دیکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس سال کا "افسانہ نمبر" گذشتہ سب افسانہ نمبروں سے بازی لیجائے گا۔

**مستقل خریداروں کو افسانہ نمبر بھی مُفت دیا جائیگا**

"شاہد"

---

# اہل سخن سے خطاب

از جناب خان بہادر میر ناصر علی صاحب دہلوی

اس میں شک نہیں کہ سخن سے مُراد اگلے لوگوں نے زیادہ تر نظم سے سمجھی۔ مگر نظم سے غرض محض تُک بندی نہیں بلکہ اُصول و قواعد کی پابندی۔ جس نے ٹکسال کے باہر قدم رکھا شعر و شاعری سے خارج کر دیا۔ نظیر اکبرآبادی کو اساتذہ میں سے نکال دیا۔ اور قومی و ملکی شاعروں کا نام جو چند روز سے نکل آیا ہے دیرپا نہ سمجھنا چاہئیے۔

مگر میری غرض اس گفتگو سے یہ ہے کہ اوّل تو نظم کی اب ضرورت نہیں۔ نظم میں کوئی بات باقی نہیں رہی جو آپ دکھا سکیں۔ جسقدر اگلے کہہ گئے ہیں اُس سے زیادہ کیا اُس کے برابر بھی کہنا مشکل ہے، اور اگر کہا جائے اور قواعد کی پابندیاں ترک کی جائیں تو عوام کی تو میں نہیں کہہ سکتا مگر اس فن کے جاننے والے ہنستے ہیں۔

نظم کی جگہ آپ نثر پر محنت کریں کہ اس میں پابندیوں کی شرط نہیں۔ ردیف و قافیہ، بحر و وزن کا جھگڑا نہیں، زُلفِ جاناں سے بڑا مضمون ہو اور دہن یار سے چھوٹا ہو تو کوئی عیب نہیں۔

ابوالفضل کی عبارت دیکھئے کہ کتنی دُور میں جا کر مطلب نکلتا ہے اور شیخ سعدیؒ کتنی جلدی اپنا مطلب ادا کر دیتے ہیں۔ طاہر وحید کے رُقعات اور رُقعات عالمگیری ملائیے تو کتنا فرق نکلے گا مگر دونوں معتبر طرزِ تحریر ہیں انہیں اپنی اپنی وضع میں لاجواب سمجھیئے۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ آپ کی ادائے بیان میں بیگانگی نہ آنے پائے۔ میں نے دیکھا کہ تذکرہ و تاریخ کی جگہ اب ایک نیا نام نکلا ہے کسی کا تذکرہ یا تاریخ یا حالات لکھتے ہیں تو اس کا نام سوانحعمری رکھتے ہیں۔

سوانح دراصل سانحہ کی جمع ہے۔ سانحہ کے معنی صدمہ و مصیبت کے ہیں۔ محض مصیبتوں اور صدموں کی تفصیل لکھنی ہو تو سوانح لکھنا دُرست ہے۔ اقبال و عروج، شہرت و نمود، عزت و وقار کے حالات سوانح میں داخل نہیں۔ کیونکہ سوانح کا اطلاق روئیداد متوحش اور ناپسندیدہ پر ہوتا ہے۔

یہ میں نے احتیاطاً عرض کیا۔ اس کی بہت پابندی ضرور نہیں، میرا مطلب صرف اس قدر ہے کہ حتی الامکان بیگانہ لب و لہجہ سے احتراز ہو سکے تو اچھا ہے کہ اپنی زبان غیر کی زبان نہ سمجھی جائے۔ غیر زبانوں کے محاورے اُردو میں ترجمہ نہ کئے جائیں۔ مثلاً سُپید جھوٹ، یہ انگریزی محاورہ ہے، اس کو اُردو میں لفظی ترجمہ کر دینے سے کوئی خوبی ہمارے محاورہ کے لحاظ سے نظر نہیں آتی۔ بلکہ میرا بس چلے تو محاوروں میں اُردو کو عربی و فارسی محاوروں سے بھی بچانا اچھا ہے۔ اُردو میں جہاں تک ہو سکے ہندی کے محاورے جو ہر ایک کی زبان پر ہوں زیادہ زیب دیتے ہیں۔

عربی میں سخی کو کثیر الرماد کہتے ہیں۔ رماد بمعنی راکھ یعنی بہت راکھ والا۔ سخی کو بہت راکھ والا اس لئے

کہنا کہ بہت راکھ بہت لکڑی جلنے سے ہوتی ہے اور لکڑیوں کا بہت جلنا بہت کھانا پکنے سے ہوتا ہے اور بہت کھانا پکنا دلیل ہے مہمانوں کی کثرت کی۔ اور جس کے گھر زیادہ مہمان آئیں وہ زیادہ سخی ہے۔ اُردو میں اتنے دُور جاکر معنی نکالنے مشکل ہیں جس کے سمجھنے کے لئے جز تقیل چاہیئے ویک نہ شد دو شد ہے یہ کہنا بہتر ہے ؎

ایک آفت سے تو مر مر کے ہوا تھا جینا　　پڑ گئی اور یہ کیسی مری اللہ میرے

سخی کے لئے عربی میں ایک اور محاورہ ہے "جبان الکلب" یعنی وہ شخص جس کے گھر کے کتے نامرد ہیں کتوں کا نامرد ہونا یہ ہے کہ مار کھائیں اور پلٹیں نہیں۔ یہ بات جب ہے کہ اُن کو استخوان بہت حاصل ہوں۔ اور استخوان کی کثرتِ طعام کی دلیل ہے۔ اور کثرتِ طعام مہمانوں کی کثرت کا ثبوت۔ زیادہ مہمان جس کے ہاں آئیں اُس کے سخی ہونے میں کیا شک ہے؟ لیکن اُردو میں ایسے محاوروں کا ترجمہ کرکے کام میں لانا اپنی زبان کو بیگانہ بنانا ہے۔

بہرحال تمثیل و تشبیہ جہاں تک ہماتے روزمرہ میں ہو وہی فصیح ہے۔ غیر زبانوں کے محاورے ہماری زبان کی خرابی کا سبب سمجھیئے۔

# دنیا اور شاعر

از جناب چودھری صابر علی صاحب صابر

کرتا تھا میں پرواز تخیل کی فضا میں
اک بزمِ دل افروز نظر آئی ہوا میں

ڈھلتی تھی مئے عشق وہاں جامِ فنا میں
اسرار بیاں ہوتے تھے قلقل کی صدا میں

مطرب کے ترانے کا وہاں ساز جدا تھا
ساقی کی نگاہوں کا بھی انداز جدا تھا

اجسام مثالی میں نظر آتے تھے انساں
آئینہ میں جس طرح سے ہو عکس نمایاں

حکام و مشاہیر تھے اور قاضی و سلطاں
تجار کہیں اور کہیں صنعت گر و دہقاں

ہر فن کے وہاں صاحبِ جوہر نظر آئے
کی عرض یہ میں نے جو سخنور نظر آئے

اے باغِ فصاحت کے لئے بادِ بہاری
کچھ کام بھی ہے آپ کا جز وقت گذاری

بیکار سا اک مشغلہ دن رات ہے جاری
مفعول فعولن ہے اور الفاظ شماری

اس شغل سے کچھ حاصلِ دلخواہ نہیں ہے
محنت کا صلہ آپ کی جز واہ نہیں ہے

گر حاجتِ اظہار خیالاتِ نہاں ہے
الفاظ نہ عنقا ہیں نہ معذور زباں ہے

بیکار ہے گر کوششِ تزئینِ بیاں ہے
مشاطگیِ زلفِ سخن آفتِ جاں ہے

تخئیل کی رنگینی و رعنائی سے حاصل؟
کیا مفت کی اس قافیہ پیمائی سے حاصل

حالی نے کہا ہے کہ نہ دھوبی ہوں میسر
تو کپڑے کثافت میں ہوں صافی سے بھی بدتر

حد ہو نہ غلاظت کی جو ناپید ہوں مہتر
موچی نہ اگر ہوں تو ملیں جوتیاں کیونکر

شاعر کی مگر اپنے جو ہو جائے زباں بند
ہرگز نہیں ہو سکتا کوئی کارِ جہاں بند

شاعر کو جواب اس کا نہ کوئی نظر آیا
خجلت ہوئی ایسی کہ پسینہ میں نہایا

حسرت نے جو آئینہ طبیعت کو دکھایا
غوطہ وہیں اک بحرِ تفکر میں لگایا

ابھرا تو کفِ دست میں تھی گوہرِ غلطاں　　گویا ہوئی اس طرح زبانِ گہرافشاں
اور آپ کا ارشاد مناسب ہی بجا ہے　　ہر لفظ مگر دل کے لئے تیرِ جفا ہے
محدود ضرورت کو جو اس طرح کیا ہے　　حضرت کی یہ کوتاہ نگاہی کی خطا ہے
آدم کے زمانے کے وہ انداز جدا ہیں　　تہذیبِ تمدن کیلئے ساز جدا ہیں
تا بارش و تابش سے نہ ہو خطرۂ نقصاں　　اک خانۂ خس پوش ہی کافی ہے پئے انساں
مطبوعِ بشر کیوں ہی مگر زینتِ ایواں　　کیوں کنگرے بنتے ہیں کلس کیوں ہیں درخشاں
کیا نقش و نگارِ در و دیوار سے حاصل؟　　محراب سے کیا سقفِ طلاکاری سے حاصل؟
تن پوشی ہی مطلوب تو اک ٹاٹ ہی درکار　　نمدے کی ضرورت ہے کہ سردی نہ دے آزار
پھر چھینٹیں یہ کس واسطے بنتی ہیں قلمکار　　اور یہ میں ولایت سے کیوں آتی ہیں طرحدار
کشمیر میں شالوں کا بنا جانا عبث ہے　　جاپان ہی ریشم کا یہاں آنا عبث ہے
بھوکا نہ رہے کوئی چنے ہوں جو میسر　　پھر کیوں ہی زباں در پئے حلوا و مزعفر
ناحق ہیں یہ چاقو کے ستم مرغِ سحر پر　　گنّے کا لہو کیوں ہے روا از پئے شکر
ہے کس لئے چٹنی کی مربے کی ضرورت　　بسکٹ کی ضرورت ہے نہ انڈے کی ضرورت
یہ پیکرِ انساں یدِ قدرت سے بنا ہے　　اس میں بھی بہت کام ضرورت سے سوا ہے
عشوہ ہے کرشمہ ہے نزاکت ہے ادا ہے　　کہتے ہیں جسے سبزۂ خط وہ بھی خطا ہے؟
گویا تھا عبث زلفِ چلیپا کا بنانا　　بیکار تھا خالِ رخِ زیبا کا بنانا
مطلوب ہے گر بہرِ مکاں زیب و نفاست　　کپڑے میں ضروری ہے اگر رنگ و ملاحت
کھانے میں ہے گر ذائقہ جویائے حلاوت　　انسان کو درکار ہے گر خوبیِ طلعت
تو حسنِ تخیّل کی ضرورت بھی عیاں ہے　　موتی نہ بکھر جائیں تو کیا لطفِ بیاں ہے

سب کرتے ہیں اظہار خیالاتِ نہانی
خود اپنی زباں سے کوئی خامے کی زبانی

انسان کے ہر لفظ میں ہوتے ہیں معانی
یہ سچ ہے کہ ہے سب کی زبانوں میں روانی

ہر صوت مگر نغمۂ قلقل تو نہیں ہے
ہر مرغ ہوا طوطی و بلبل تو نہیں ہے

دُنیا کو جو شاعر کی نہ خدمات ہوں حاصل
تو کون کرے شیشۂ جذبات پہ صیقل

موسیقی ہو کیونکر سببِ گرمیٔ محفل
گر شعر نہ ہوں گائے گا کیا مطربِ خوشدل

احباب کی تفریح کا ساماں ہے سخن سے
اور گرمیٔ بازارِ حسیناں ہے سخن سے

مذہب کیلئے بھی ہے سخن طرۂ دستار
غازی کی زباں پر ہے رجز ہاتھ میں تلوار

بے شعر کے تاثیر نہ ہو وعظ میں زنہار
مجلس میں رلاتے ہیں عزادار کو اشعار

آنکھوں سے محبوں کی نکلتے ہیں وہ گوہر
جو مرثیے میں کوٹ کے بھرتا ہے سخنور

دُنیا کیلئے وقف ہے شاعر کا خزانا
خود بارِ طبیعت ہے اُسے قفل لگانا

کام اُس کی زباں کا ہے جواہر کو لٹانا
جنت کا نمونہ ہے دلِ شاعرِ دانا

مہکا ہوا گلہائے مضامیں سے چمن ہے
اور فیضِ طبیعت سے رواں نہرِ لبن ہے

کیا بیشِ سخن قیمت نقاشیٔ مانی
ہے شاعری صورت کشیٔ حسنِ معانی

پیدا ہو طبیعت میں کہاں سے یہ روانی
آئے نہ اگر چشمۂ انوار سے پانی

اندازِ بیاں لائیگا کوئی یہ کہاں سے
ہر بات بھلی لگتی ہے شاعر کی زباں سے

ہستی ہے سخنور کی غرض حاصلِ دوراں
ہے محفلِ عالم میں وہ اک شمعِ فروزاں

دُربار زباں اُس کی ہے گلریز ہے داماں
صابر نہ سہی اور سخنور ہوں غزل خواں

تو جلسۂ احباب کو مے خانہ بنا دیں
وہ کیف بھریں شعر کو پیمانہ بنا دیں

# "بشنوئی"[1]

ازجناب مرزا عظیم بیگ چغتائی بی اے ایل ایل بی (عظیم بیگ)

نوٹ :- یہ مضمون بھائی ایم اسلم صاحب کے حکم کے مطابق مشہور رسالہ "کارواں" کیلئے لکھا گیا تھا۔ ادب لطیف لکھنے کی نہ مجھ میں قابلیت تھی اور نہ ہے اور نہ کبھی ہوگی، لیکن پھر بھی یہ مضمون جب سالار کارواں کے پاس پہونچا۔ تو بے حد پسند کیا گیا اور کاتب کو بھی دیدیا گیا اور کتابت بھی ہوچکی۔ اس کے بعد جب کارواں شایع ہوا اور میرے پاس آیا تو مجھے دیکھکر تعجب ہوا کہ یہ مضمون اُس میں نہیں ہے۔ حضرت ایم اسلم صاحب سے وجہ پوچھی تو معلوم ہوا کہ نہ معلوم کس وجہ سے اسکو کتابت ہونیکے بعد کارکنان کارواں نے شامل نہیں کیا۔ مضمون کا مسودہ جو میرے پاس واپس آگیا تھا وہ میں نے جب سنا کہ کارواں شایع ہوگا تو لاپرواہی سے پھینک دیا اس کے بعد جو میں نے چاہا کہ کتابت شدہ کاپی مجھے مل جائے یا اُس کی نقل مل جائے تو وہ بھی نہ دی گئی۔ اتفاق کی بات تھی کہ یہ مضمون پھر مل گیا

میرے لئے کسی مضمون کا کسی رسالہ میں شایع ہونا نہ تو کوئی نئی بات ہے اور نہ باعث فخر۔ لہذا اگر کوئی میرا مضمون رسالہ میں شایع نہ ہو تو مجھے خیال بھی نہیں ہوتا لیکن ایک صاحب کے ذریعہ مجھے یہ معلوم کرکے کچھ خوشی سی ہوئی کہ یہ مضمون کارواں سے محض اس وجہ سے نکال ڈالا گیا کہ اللہ رکھے اس قسم کے جتنے بھی دوسرے مضمون کارواں میں شایع ہوئے ہیں اُن سب میں یہ "بدتر" شمار ہوتا۔ ایسا کہ ادب لطیف لکھنے والوں اور پڑھنے والوں کا دل دکھ جاتا۔ یقین نہ ہو تو اس مضمون کو پڑھکر کارواں کے اسی قسم کے سب مضمون پڑھ ڈالئے۔ آپ خود قایل ہوجائیں گے کہ سب کے سب اس مضمون سے لاکھ درجہ "بہتر" ہیں۔

—— بلکہ اسی بناء پر صاحب مضمون کو باوجود تقاضوں کے مضمون کی نقل نہ دی گئی۔ مگر بھلا ہو اتفاق کا کہ یہ مضمون پھر مل گیا اور اب دیکھنے والے دیکھیں گے کہ کس وجہ سے یہ مضمون کارواں میں شایع نہیں ہوا۔ بہتر ہے کہ سالار کارواں اس امر کی تائید کردیں کہ یہ مضمون واقعی "کارواں" میں اس وجہ سے شایع نہیں ہوا کہ اس قسم کے تمام مضامین سے اسکا ادبی پایہ پست تھا اور اگر کہیں یہ شایع ہوجاتا تو اپنی قسم کے مضامین میں یقیناً "بدترین" رہتا جو کسی طرح بھی "کارکنان" کارواں کو منظور نہ تھا کیونکہ مضمون لکھنے والا بدقسمتی سے نہ تو پنجابی تھا نہ یو۔پی۔ کا بلکہ ایک غریب ماروا ڑی۔

اب اس مختصر دیباچے کے بعد یہ لغو مضمون پڑھئے لیکن "کارواں" کے اسی قسم کے مضمون ضرور دیکھئے گا۔ ورنہ لطف آدھا رہ جائیگا۔

عظیم بیگ

---

[1] "بشنوئی" مارواڑ کے ریگستانی علاقہ کی ایک قوم ہے جو ہرن کی پرستش کرتی ہے اور اُن کے فلسفہ کو سمجھنے کی میں نے کوشش

سے -

(۱)

[1]رانڑاوت جی! رانڑاوت جی! رانڑاوت جی!
میں نے قسم کھائی تھی کہ روزانہ صبح اُٹھ کر ایک سو دفعہ رانڑاوت جی کا نام لونگا!

کیوں؟

اِس لئے کہ رانڑاوت جی جب مجھ سے باتیں کرتی ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ محبت کی پریاں اپنا گیت گا رہی ہیں اور ان کی میٹھی میٹھی سانسوں سے ایک عالم معطر ہو رہا ہے۔

اس لئے کہ رانڑاوت جی جب میری طرف دیکھتی ہیں تو میں غور سے دیکھتا ہوں کہ اُن کی آنکھوں میں جوانی اور محبت کی پریاں ناچ رہی ہیں..... آنکھ کی ہر جھپکی کے ساتھ دل میں اُن کے ناچ کے "جھاکے" کی جنبش پہونچتی ہے۔

اس لئے کہ رانڑاوت جی سے مجھے عشق ہے۔
اس لئے کہ رانڑاوت جی کو مجھ سے عشق ہے۔

(۲)

ابھی دھوپ سے ریگستان کے ذرّے نہیں چٹخے تھے۔

اور نہ ریگستان کے پُرنور سینہ پر ہوا کی جُنبش کے ساتھ دھواں اُٹھتا معلوم ہوتا تھا۔ بلکہ ریگستان کے سمندر میں رات کو ہوا بہنے سے جو لہریں بنی ہوئی تھیں اُن میں سے ایک بھی نہیں بگڑی تھی۔
پاس ہی باجری کا ہرا بھرا کھیت تھا۔

(۳)

باجری کا کھیت!
بالیں جھوم رہی تھیں۔
پتّے ریگستانی گیت گا رہے تھے۔ کچھ تالیاں بجا رہے تھے۔ اور کھیت کے ایک کونے پر کھیجڑی[2] کا درخت کھڑا ہوا سیٹی بجا رہا تھا۔ کیا ہی خوشنما منظر تھا!
میں نے باجری کے کھیت کی طرف دیکھا۔

(۴)

موٹھ کی جھاڑیاں راٹھوری[3] پینچ کی طرح بل کھائی ہوئی تھیں۔ اور پھلیاں خوشی سے دانت نکالے ہنس رہی تھیں۔ سامنے ریگستان موجیں مار رہا تھا۔
"رانڑاوت جی!" میرے مُنہ سے ایک بیخودی کے عالم میں نکلا!
اوہو! میرے دل میں نوجوانی کی بھڑکن تھی!
میں دوڑ رہا تھا۔

(۵)

دوڑ رہا تھا اور ناچ رہا تھا۔
کمٹھے[4] کا ناچ ناچ رہا تھا۔
میں کمٹھا اوچھال رہا تھا۔ رانڑاوت جی! رانڑاوت جی! میں کمٹھا اوچھال رہا تھا۔ رانڑاوت جی! رانڑاوت جی!
ریگستان کی سوندھی سوندھی خوشبو میرے ساتھ گھوم رہی تھی۔ نرم نرم ریت کی میٹھی میٹھی ٹھنڈک میرے ساتھ گھوم رہی تھی۔ نرم نرم ٹھنڈک پیر کے تلووں سے

---

[1] لڑکی کا نام قبیلہ کے نام سے ملا کر بناتے ہیں [2] ایک درخت جو اُس طرف کثرت سے ہوتا ہے [3] راٹھوروں کے صافہ کی بندش۔
[4] کمٹھا یعنی کمان۔ یعنی جنگی ناچ۔

دماغ پر چڑھ رہی تھی۔ نرم نرم ٹھنڈک آنکھوں کی چمک
بن کر نکل رہی تھی۔

سامنے ریگستان ناچ رہا تھا۔

اُس کے پار افق کے پاس کوہ اراولی کے
بچے ناچ رہے تھے۔ میں ناچ رہا تھا اور میرے نوجوان
دل میں عشق کی دھڑکن تھی۔

(۶)

میری نوجوان رگوں میں محبت کا پگھلا ہوا رُوپا[1]
دوڑ رہا تھا۔

رانڑاوت جی کی محبت کا خیال آیا۔

دل کے اندر کسی نے انگڑائی سی لی۔

ایک میٹھا سا درد بل کھاتا ہوا اُٹھا۔

پھر دل میں جلدی جلدی ریت سی سرکتی معلوم
دی۔

سارے بدن میں محبت کی سنسنی پھیل گئی۔

پُر درد لہجہ میں میرے مُنہ سے نکلا "رانڑا......
وت...... جی"

(۷)

رقیب!

میرے دل میں رقیب کا خیال آیا۔

کمٹھا کندھے پر بیقراری سے تڑپتا اور بل کھاتا
معلوم ہوا۔ اور خود بخود جھکنے کے لئے بیقرار معلوم ہوا۔

پگڑی میں ایک چُھپا ہوا خونی تیر تھا۔ اور پگڑی
ہاتھ کو اپنی طرف کھینچنے لگی۔ میرے تن بدن میں غصہ
کی سنسنی پھیل گئی۔

رگوں میں محبت کی پگھلی ہوئی چاندی کے بجائے
غصہ کا سیسہ دوڑنے لگا۔ سینہ اُبھرنے لگا، اور
بازو کشادہ ہونے لگے۔

کمٹھا جھکنے لگا اور اُس کی تانت اینٹھنے لگی۔

میں غصہ کے مارے ہانپ رہا تھا۔

"میں اُسکو قتل کر دونگا" ناچتے ہوئے نینوں کو
میں نے غصہ میں کمٹھا دکھا کر کہا۔ "میں اُسکو قتل
کر ڈالونگا۔ قتل کر ڈالونگا"

دفعتاً ڈر کے مارے یہ ناچتے ہوئے پتے کھیت
کی مینڈ پر سے گھومتے ہوئے میدان کی طرف بھاگے
ریگستان کے ننھے ننھے ذروں نے اپنی بساط کے
موافق کود کود کر اور اُچھل اُچھل کر پتوں کو پکڑنے کی
کوشش کی۔ ہڑ مارنے کی۔

سامنے یہ گستاخ پتے ریگستان کے صاف شفاف
سینہ پر جھکر ناچنے لگے، اور ریت کے ذرّوں نے
اُنہیں مارنا شروع کیا۔

یہ کس کے حمایتی ہیں؟ میرا مذاق اُڑاتے ہیں!

(۸)

میں نے غصہ سے ایک خُنکی ہونکاری "اِن گستاخوں
کو ڈپٹا۔

میری آنکھوں سے چنگاریاں اُڑ رہی تھیں۔

میں اُس کو مار ڈالونگا۔

میں نے کمٹھے کو اپنے پیروں سے خم کر کے زہ کیا۔

صافہ سے چھپا ہوا تیر نکالا۔

اور اُس کو خونی تیر کو ایک بوسہ دیا اور کمٹھے میں
تیر کو جوڑ کر بایاں ہاتھ بالکل سیدھا کر کے اور داہنا
خم کر کے چٹکی کو کان تک گھسیٹ کر چھوڑ دیا۔

[1] چاندی

"ٹوانگ"..... شائیں...... خچ.....!
"تانت کے جھنّاٹے کے ساتھ "شائیں" سے تیر
نکل گیا اور "خچ" سے ریت میں گھُس گیا۔
گستاخ پتے!
خوشی سے دیوانہ وار وہ تیر کی آمد پر اُس کے
اردگرد پرا باندھکر اور بھی تیزی سے ناچنے لگے۔
میں احمق ہوں۔
میرے نوجوان سینہ سے ایک قہقہہ نکلا جسکی
آواز کوہ اراولی کے دامن تک پہنچی ہو گی۔
میں احمق ہوں، اور گاتا ہوا دوڑا۔

(۹)

تیر کو زمین سے کھینچا ہی تھا کہ......
کالا ہرن!
اُس کی سیاہی سورج سے جھگڑنا چاہتی تھی،
اُس کی پشت پر جہاں سیاہی سے سورج
کی سفیدی ملتی تھی۔ یہ معلوم ہو رہا تھا کہ چاندی
چمک رہی ہے۔
میرے مُنہ سے نکلا "شکار!"
راٹھراوت جی نے کالے ہرن کے شکار کو کہا تھا۔
راٹھراوت جی ہرن کے شکار کی بے حد شوقین
ہیں۔

(۱۰)

کمٹھے کی تانت پھر لرزنے لگی۔ پہلے غصّہ میں
لیکن اب خوشی کی وجہ سے۔
کمٹھے کی تانت شکاری گیت گا رہی تھی۔
خونی گیت!
میرا دل بھی گانے لگا۔

(۱۱)

میں نے تیر کی نوک پر سے ریت صاف کی۔
اُس کی نوک پر چمک کی وجہ سے سفیدی تھی۔
تیر نے کہا کہ "میں راٹھراوت جی کی محبّت کی طرح اُجلا
اور صاف ہوں"
جھوٹا کہیں کا۔ مگر......
دوست اور دشمن کے ساتھ ایک سلوک کرتا ہے۔
اس کالے ہرن اور میرے رقیب دونوں کا خون
اس کے لئے ایک ہے۔
یہ خونی ہے۔ خونی۔
مگر اس کے دامن پر خون کا دھبّہ نہیں ہے۔
موت کا پیامبر۔

(۱۲)

پھر میں نے تیر کو جوڑا۔
اُس کی روانی کو انگلی کی گھائی میں سرکا کر دیکھا۔
ہرن دُور تھا اور میں بیٹھ گیا۔
کمٹھے کے بیچوں بیچ میں اپنے دونوں پیر میں نے
اڑا دئے، اور دونوں ہاتھوں سے تانت میں تیر
پھنسا کر اُس کو پورے زور کے ساتھ کھینچا اتنا کھینچا
کہ میں لیٹ[1] گیا۔
ہرن کے سینہ پر شست لی اور تیر چھوڑ دیا۔

(۱۳)

موت کا پیامبر!
تیر ایک شعلہ کی طرح سنّاتا ہوا موت کا پیغام
لیکر پہونچا اور ایک خونی جھپٹ کے ساتھ ہرن کے
سینہ میں ترازو ہو گیا۔ اُدھر وہ تڑپ کر گرا ہے اور
اِدھر میں تڑپ کر اُٹھا ہوں۔

[1] کمٹھا دونوں پیروں اور دونوں ہاتھوں سے اب بھی چلایا جاتا ہے۔

تڑپے تو دونوں تھے۔

(۱۴)

ہرن چوٹ کھا کر گرا تھا۔ مگر اُٹھ کر بھاگا اور میں رنجیدہ ہوا۔ مگر تیر آدھے سے زیادہ باہر تھا اور پھر اُس کی جنبش!

تیر کی "کھٹک" نے ہرن کو بیٹھنے پر مجبور کر دیا،

تیر کی کھٹک بُری ہوتی ہے۔ ہوا سے جُنبش کھا کر تیر کا کھٹکنا!

(۱۵)

میں اپنے شکار کے پاس خوش خوش دوڑ کر پہنچا۔

مگر حیف صد حیف!

میں نے اپنے شکار کو دیکھا!

میں نے خون کے شرّاٹے کو دیکھا۔

میں نے پیاسی ریت کو خون پیتے دیکھا۔

میں نے خونی چاندی چمکتی دیکھی۔

میں نے اپنے قاتل کو دیکھا!

(۱۶)

اے میرے شکار...... ہرن۔

اے میرے مقتول ہرن۔ یعنی میرے قاتل۔

میں نے اپنی نوجوان آنکھوں سے دیکھا۔

میں نے تجھے کُھریاں رگڑتے تکلیف میں دیکھا۔

میں نے تیرے سینہ میں تیر کی بیرحم نوک پیوست دیکھی۔

اُس کی نوک تیرے سینہ کے اندر کہیں کھٹکتی ہوگی

تونے میرا کیا بگاڑا تھا۔

مگر رانتڑا دت جی......

(۱۷)

میں نے دیکھا کہ چُبھے ہوئے تیر نے تیرے تن بدن میں ایک آگ پھونک دی ہے۔

ایک درد و کرب کی دہکتی ہوئی انگیٹھی تیرے بدن کے اندر روشن ہے!

تُو درد کی شدّت اور تکلیف کی گرمی سے پُھنکا جا رہا ہے۔

جانکنی کی تکلیف تجھ پر کیسی سخت ہے۔

مگر رانتڑا دت جی........

(۱۸)

اے میرے قاتل۔

میں نے دیکھا کہ تونے اپنی نوجوان آنکھوں کو میری طرف پھیرا۔

یہ تیرا پہلا حربہ تھا۔

اُن آنکھوں میں درد کی شدّت کی پھڑکن تھی۔

اُن آنکھوں میں شکایت کی جلن تھی۔

نوجوانی بجھ رہی تھی۔

رعنائی کا گلا گھٹ رہا تھا۔

خود جوانی سکرات کے عالم میں تھی۔

موت کی سختی جھلک رہی تھی۔

میری موت آ رہی تھی۔

(۱۹)

اے میرے قاتل-!

میں نے تجھے پھر غور سے دیکھا۔

تکلیف کی شدّت ہر بال و بل سے عیاں تھی۔

انتہائی کرب اور بے چینی سے تیرے ہونٹ سُکڑنے لگے۔

جانکنی سے ہونٹوں میں سُکڑن پیدا ہوئی۔

انتہائی شدّت کے ساتھ سخت تکلیف سے ہونٹوں نے

بل کھائے۔
ایک فریاد تیرے مُنہ سے نکلی۔
میں نے اُس وقت تیری دہکتی ہوئی آنکھوں کو دیکھا۔
اُن کھڑکیوں میں سے موت جھانک رہی تھی۔
میں نے موت کی نیند کو تیری آنکھوں میں بستے دیکھا۔
مگر رانڑاوت جی.........؟

(۲۰)

لیکن، الامان!
تو نے مجھے قتل کر دیا!
اپنی اُن آنکھوں سے جن میں درد اور ٹیسوں کی بجلیاں چمک رہی تھیں!
اپنے اُن کپکپاتے ہونٹوں سے جو تکلیف اور انتہائی تکلیف کا اظہار کر رہے تھے۔
تو نے اپنے قاتل کو خود قتل کر ڈالا!

(۲۱)

کس قدر خوفناک منظر تھا۔
کوہ ارادلی کے دیوزاد بیٹے!
ریگستان کا ہیبتناک سینہ خاک اُڑا رہا تھا!
ہوا دندناتی آ رہی تھی اور ڈھول اُڑ رہی تھی۔
کھیجڑی کے پتوں میں غصہ کی جھرجھراہٹ تھی!
باجری کی بالیں سر پیٹ رہی تھیں اپنے ماتم کر رہے تھے!
موٹھ کی جھاڑیاں مارے غصہ کے بل کھا رہی تھیں!
موٹھ کی پھلیاں پیچ بیچ رو رہی تھیں!

کس قدر خوفناک منظر تھا! میں تجھے مرتا دیکھ رہا تھا۔ اور میری روح میں موت کی خوفناک ٹھنڈک بیٹھتی جا رہی تھی۔ آہستہ آہستہ!
آہ میں مرا!
تُو نے مجھے قتل کر دیا۔
گرتے ہوئے میں نے کہا۔ "ہائے میں مرا"

(۲۲)

میری جان سے پیاری رانڑاوت جی۔
میرے دل کی مالک رانڑاوت جی۔
وہ میری لاش پر کھڑی تھی۔
اُس کے خوبصورت چہرے پر۔
حُسن کی پریاں ناچ رہی تھیں۔
تبسم کی بجلیاں چمک رہی تھیں۔
نُور کی بارش ہو رہی تھی۔
نوجوانی کا پھول کھلا ہوا تھا۔
مگر میں؟
ہائے میں مُردہ تھا۔

(۲۳)

اُس نے مسکراتے ہوئے مجھے دیکھا۔
گویا نوجوانی اور حُسن و محبت نے مجھے مسکراتے ہوئے دیکھا۔
میرے قاتل کی طرف اُسنے خوش ہوکر انگلی اُٹھائی اور پوچھا۔ "اسکو تم نے مارا ہے؟"
میں نے کہا "ہاں۔ اور اُسنے مجھے مار ڈالا!"
اُس نے محبت سے میری طرف جُھک کر کہا "میں تم سے محبت کرتی ہوں۔" میں نے جواب دیا "مُردے نہ کسی سے محبت کرتے ہیں اور نہ اُن سے کوئی محبت کر سکتا ہے۔"

## خمستان

# راحت کدہ

آہ! کیا کیا زخم تیرے ہجر میں کھاتے رہے
زندگی بھر ہم تڑپتے اور تڑپاتے رہے

گریۂ خوں ہی رہا ہے ترجمانِ دردِ دل
پرسشِ احوال پر آنسو ہی بھر آتے رہے

میرے آنسو بھی غضب کے سوز سے لبریز تھے
اور بھی یہ شعلہائے غم کو بھڑکاتے رہے

میری آہیں شعلہ سامان و شرر افشاں رہیں
میرے نالے بھی جہاں میں آگ برساتے رہے

سجدہ گاہِ شوق تھا تیرا ہی سنگِ آستاں
حضرتِ شیخِ حرم گو مجھکو بھڑکاتے رہے

بیٹھے بیٹھے جب کبھی تڑپا گیا تیرا خیال
روح پر تاریک بادل غم کے چھا جاتے رہے

اب کہاں ہیں دل میں وہ نقش و نگارِ آرزو
اس خرابے میں ہزاروں سیلِ غم آتے رہے

کیسے کیسے ماہ پارے ہو گئے پیوندِ خاک
آہ! اس گلشن میں کیا کیا پھول مرجھاتے رہے

سب کی سب باتیں سنیں منہ سے نہ کچھ بولا مگر
دیر تک احباب صہبائیؔ کو سمجھاتے رہے

اثر صہبائی

# تخلیقِ انسان

(شاعرانہ نُقطۂ نظر سے)

اُس وقت کہ جب دُنیا اک گوشۂ خلوت تھی
تاریک فضاؤں میں چھائی شبِ ظُلمت تھی

اِن چھوٹے ستاروں میں یہاں کوئی قوت تھی
دل تو یہی کہتا ہے شاید وہ مُحبّت تھی

القصہ مُحبّت نے اِک رنگ نیا بدلا
اور ماہ کی صورت میں اِک نُور کیا پیدا

اُس نورِ قمر وش نے ہلکے سے ترنّم میں
تسبیح پڑھی آکر آدم کے تکلّم میں

اعلان کیا اپنا ہر ایک ستارے پر
اور جِنّ و ملائک سے فرمایا یہ خوش ہوکر:-

"ہم ہیں جو محبّت کی اقلیم کے سلطان ہیں
ہم ہیں جو بصیرت کی مشعل کے نگہبان ہیں"

اُسوقت ندا آئی کانوں میں ملائک کے
جیسے کوئی کہتا ہے یہ غیب کے پردے سے:-

"لو عالمِ ظاہر کا سُلطان ہوا پیدا
تعظیم کو جُھک جاؤ انسان ہوا پیدا"

جو نُور کے پُتلے تھے یہ حُکم بجا لائے
جو پیکرِ ظُلمت تھے خاموش چلے آئے

سید مقبول حسین، احمد پوری

# عورت کا دل

از حضرت ایم۔ اسلم

کسی علاقے میں سڑک تیار ہو رہی تھی، مزدوری پیشہ لوگ صبح سے شام تک کام کرتے اور رات بسر کرنے کے لئے گاؤں واپس چلے جاتے۔ گاؤں کیا تھا گھاس پھوس کی بیس پچیس جھونپڑیاں تھیں، اور یوں تو جہاں بھی پانچ سات جھونپڑے پڑ گئے وہیں گاؤں آباد ہو گیا۔ مرد کو آٹھ دس آنے اور عورت کو چھ سات آنے روزانہ ملتے تھے۔ مزدوروں میں جوریا اور اس کا شوہر شنبھو بھی تھے۔ جوریا ایک مقبول صورت عورت تھی، کوئی چوبیس پچیس کے سن و سال تھا۔ شنبھو اس کا دوسرا شوہر تھا۔ پہلے شوہر کے بطن سے ایک لڑکا گوپی تھا۔ جب گوپی دو سال کا ہوا تو جوریا نے شنبھو کے ساتھ شادی کر لی۔ شنبھو کو جوریا سے تو محبت تھی لیکن معصوم گوپی تو اُسے ایک آنکھ نہ بھاتا۔ جوں جوں گوپی سیانا ہوتا گیا شنبھو کو اس سے اور بھی نفرت ہوتی گئی۔ جوریا اکثر اُس کو کہا کرتی کہ "معصوم سے کیوں بیر رکھتے ہو۔ جوان ہوگا تو خود ہی سر چھپانے کا آسرا ڈھونڈنے گا" لیکن شنبھو کو تو اپنی کمائی میں سے اِس بچے پر پھوٹی کوڑی صرف کرنا بھی گوارا نہ تھا۔ گو ماتا کی ماری جس طرح بھی ہوتا نبھائے جاتی۔

---

گوپی جب تک انجان تھا شنبھو کی جلی کٹی باتیں گوارا کر لیتا لیکن جب سیانا ہوا تو خود ہی اُس سے الگ تھلگ رہنے لگا۔ جب شنبھو گھر میں ہوتا تو وہ ادھر اُدھر ٹل جاتا لیکن کمبخت شنبھو کو جب موقع ملتا گوپی کو کسی نہ کسی حیلے بہانے خوب پیٹتا۔ اور جب جوریا دخل دیتی تو دو چار لاتیں اُس کے بھی رسید کر دیتا۔ گوپی غریب مار کھا کر روتا لیکن ساتھ یہ بھی کہے جاتا کہ "اچھا بڑا ہو لوں پھر سمجھ لوں گا"

ایک روز اسی طرح گوپی پٹا اور ساتھ ہی جوریا بھی پٹی اور روتے ہوئے بولی "تم کیوں بچے کو مارتے ہو؟ غریب تمہارا کچھ بگاڑتا تو ہے نہیں"

شنبھو نے گرج کر کہا "اگر بچے کی خیر چاہتی ہو تو اسے گھر سے نکال دو۔ خود کھانے کو ملتا نہیں اسے کہاں سے کھلائیں"

"کیوں نکال دوں!" جوریا نے بھی چمک کر جواب دیا "مفت کا تھوڑی کھاتا ہے"

"تو کہہ جو دیا" شنبھو بولا "یہ میرے گھر میں نہیں رہ سکتا"

"یہ نہیں رہ سکتا تو میں بھی نہیں رہ سکتی، تم اپنا گھر سنبھالو"

"خبردار!" شنبھو گھونسہ تان کر بولا "چوٹی کاٹ ڈالوں گا جو تو نے زیادہ بات کی"

ساتھ ہی ظالم نے ایک ایسی لات ماری کہ غریب اوندھے مُنہ جا پڑی۔ اِسی شام وہ بچے کو ساتھ لیکر اپنے میکے کی ایک بُڑھیا کے پاس جو گاؤں سے کچھ فاصلہ پر رہتی تھی، چلی گئی۔ لیکن اگلے روز شنبھو پھر اُسے منا لایا۔ گوپی وہیں رہ گیا۔

---

کچھ روز اس طرح بھی گذر گئے۔ لیکن جب کبھی جوریا بیٹے سے ملنے جاتی تو شنبھو فساد کرتا۔ زمانہ گذرتا گیا حتیٰ کہ گوپی جوان ہو گیا۔ اور اب وہ بھی شنبھو کو ایک کی دس سُناتا اور مقابلے پر ڈٹ جاتا ہے۔ آس پاس والے شنبھو کو اکثر سمجھایا کرتے کہ لڑکا اب جوان ہو گیا ہے، اس مار پیٹ کا نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔ لیکن شنبھو وہی کرتا جو اُس کے جی میں آتا۔ ایک روز جوریہ غریب پٹ رہی تھی کہ گوپی بھی کہیں سے اُدھر آ نکلا۔ اور آتے ہی شنبھو سے گتھم گتھا ہو گیا۔ دونوں جانب سے خوب تان تان کر گھونسے بازی ہوئی۔ آس پاس والوں نے بمشکل سے دونوں کو علیحدہ کیا۔

الغرض آئے دن یہی طرح جوتم پیزار ہوا کرتی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شنبھو سڑک پر کام کرتا تھا اور جوریا بے کار تھی۔ سردی کے دن تھے۔ شنبھو کہیں سے ایک استعمال شُدہ گرم قمیص خرید لایا۔ اس میں دو ایک پیوند لگے ہوئے تھے۔ دل میں بہت خوش تھا کہ سستے داموں کام کا کپڑا مل گیا۔ لیکن جب گھر آیا تو جوریا موجود نہ تھی۔ بیوی کو موجود نہ پاکر اُسے بہت غصہ آیا۔ سیدھا اُس بُڑھیا کے ہاں پہونچا جہاں گوپی رہتا تھا۔ جوریا دو ایک عورتوں کے پاس بیٹھی باتیں کر رہی تھی گوپی موجود نہ تھا۔ شنبھو نے آتے ہی پوچھا "یہاں کیوں آئی؟"

جوریا بولی "گوپی کو دیکھنے آئی تھی سو وہ تو ملا ہی نہیں!"

"شام سر پر آئی، آج پکے گا کیا؟" شنبھو نے ذرا غصہ سے کہا۔

"ستو جو رکھے ہیں" جوریا بولی "وہی کھا لینا"

"دن بھر محنت کرتے کرتے خون پانی ایک ہو گیا۔ اور یہ ستو کھانے کو کہتی ہے۔ چل اُٹھ!"

جوریا چُپکے سے اُٹھکر ساتھ ہولی لیکن گھر میں رکھا ہی کیا تھا جو پکاتی۔ شنبھو کو تو اُسے خواہ مخواہ پیٹنے کی عادت سی ہو گئی تھی۔ رات بھر دنگا فساد ہوتا رہا۔

اگلے روز جب وہ کام پر گیا تو جوریا اپنے دو چار کپڑے اور دو ایک برتن لیکر اُس بُڑھیا کے پاس اُٹھ آئی۔ غلطی سے شنبھو کی گرم قمیص بھی ساتھ اُٹھا لائی۔ شنبھو جب کام سے واپس آیا تو اُسے گھر خالی دیکھ کر بہت غصہ آیا۔ آس پاس کے جھونپڑوں میں زندگی نظر آ رہی تھی۔ کہیں اِدھر اُدھر بچے کھیل رہے تھے۔ کہیں ہنڈیا چڑھی ہوئی تھی، کوئی بیٹھی آٹا گوندھ رہی تھی۔ لیکن اِس کے جھونپڑے میں اُلّو بول رہا تھا۔ اچانک اُسے اپنی گرم قمیص کا خیال آیا، اندر جاکر دیکھا بھالا لیکن کہیں نہ ملی۔ جھونپڑی کا دروازہ بند کرکے بُڑھیا کے ہاں پہونچا۔ بُڑھیا بیٹھی برتن صاف کر رہی تھی۔ جوریا پاس خاموش بیٹھی تھی۔ ایک طرف گوپی وہی گرم قمیص پہنے لکڑیاں کاٹ رہا تھا۔ جوریا تو شوہر کو دیکھ کر اندر چلی گئی۔ لیکن بُڑھیا بولی "ایسے کیسے نبھے گی اِنا بیٹا! اتنا غصہ اچھا نہیں۔ کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں

سمجھدار آدمی ہو۔ کبھی یوں بھی گھر بسا کرتے ہیں۔ مانا! گوپی تمہارا نہیں لیکن جوریا کا تو ہے۔ تم ہی کہو، ماں کیسے بچے کا ملنا جلنا چھوڑ دے۔ اور پھر وہ کوئی چور اُچکا تو ہے نہیں۔ دو چار آنے کما ہی لاتا ہے۔ اور پھر وہ بھی تو تمہارے ہی کام آتے ہیں۔"

"چور نہیں تو اور کیا ہے؟" شنبھو غصے سے بولا۔

"چور کون؟ میں؟" گوپی نے سر اُٹھا کر پوچھا۔

"تو اور کون؟"

"وہ کیسے؟" گوپی نے پوچھا۔

"یہ قمیص کس کی پہن رکھی ہے؟"

گوپی نے قمیص اُتار اُس کی طرف پھینک دی اور کہا "میں نے جانا تھا ماتا کی ہے۔"

"جوریا کہاں ہے؟" شنبھو نے بڑھیا سے پوچھا۔

گوپی نے کہا "تمہیں اس سے کیا کام؟"

"تم کون پوچھنے والے؟" شنبھو بولا۔ اور پھر جھونپڑے کی طرف چلا۔ لیکن گوپی راستہ روک کر کھڑا ہو گیا اور کہا "تم اندر نہیں جا سکتے!"

"کیوں؟ تم روکنے والے کون؟"

"یہ تمہارا گھر نہیں ہے۔"

"اور تمہارا بھی تو نہیں، جو تم مجھے روکتے ہو۔"

"میرا ہے۔ جبھی تو یہاں رہتا ہوں۔"

"ہٹ سامنے سے!" شنبھو نے یہ کہتے ہوئے جھٹک کر لکڑی کاٹنے کی کاٹی گوپی کے ہاتھ سے چھین ... کاٹ کر رکھ دونگا جو آگے بڑھا۔"

... سنتے ہی جوریا باہر آ گئی اور بولی "میرے پیچھے کیوں آئے۔ میں تمہارا کچھ اُٹھا تو نہیں لائی؟"

"... آئی کیوں؟"

"... مرضی!" جوریا نے بھی چمک کر جواب دیا "میں تمہارے پاس نہیں رہنا چاہتی۔"

"... باپ بھی رہے گا۔"

"... زبردستی تھوڑی ہی ہے!"

"... کیا؟" شنبھو نے کڑک کر کہا "چلتی ہے یا میں اور تدبیر کروں!"

... کر اُس نے جوریا کی چوٹی پکڑ لی۔ گوپی سے ماں کی بے عزتی کب دیکھی جاتی۔ آگے بڑھ کر بولا۔

... ماتا کو ...

شنبھو نے قہرآلود نگاہوں سے گوپی کی طرف دیکھا۔ لیکن ممتا کی ماری شوہر کے بگڑے تیور دیکھ کر بولی۔
"گوپی! تمہیں میرے دودھ کی قسم۔ تم دخل مت دو میرے لال!"
اور پھر شنبھو سے "چلو میں تمہارے سنگ چلتی ہوں۔"

---

اس واقعہ کو بہت روز ہو چکے تھے۔ گوپی چوری چھپے ماں سے جا کر کبھی کبھی مل آتا۔ شنبھو جو کچھ کماتا تھا جوئے میں ہار دیتا اور گھر آکر جوریا کو پیٹتا۔ گوپی نے کئی بار ماں سے کہا بھی کہ وہ اس کے ساتھ کسی اور جگہ چلی چلے لیکن شوہر پرست عورت نے تنگدستی میں پتی کو چھوڑنا گوارا نہ کیا۔ خود فاقہ سے رہتی لیکن ادھر اُدھر سے لے کر شوہر کا پیٹ بھرتی۔ دو ایک روز سے جھڑی لگی تھی، نہ شنبھو کام پر گیا نہ گوپی ہی آیا۔ گھر میں کھانے پکانے کو کچھ بھی نہ تھا۔ صبح سے میاں بیوی میں تکرار ہو رہی تھی۔ شنبھو کھانا مانگ رہا تھا۔

"میں کہاں سے لاؤں؟" جوریا بولی۔

"جہاں سے گوپی کو کھلاتی ہے۔"

"رام کا نام لو، وہ تو تمہارے گھر کا پانی تک نہیں پیتا۔"

"ہوں؟" شنبھو بولا "گھر کی صفائی تو کر ڈالی۔ اب پانی کیوں پئے گا۔"

"صفائی کس نے کر ڈالی؟"

"تیرے چھوکرے نے!"

"یہ میرے چھوکرے کی ہی کمائی ہے جو تمہارا پیٹ بھر رہی ہوں۔"

بس اتنی بات پر شنبھو نے غریب کو پیٹنا شروع کر دیا اور مارتے مارتے اُس کی ایک آنکھ بھی پھوڑ دی آخر کبھی آس پاس والوں نے آکر ظالم کے ہاتھ سے غریب عورت کو چھڑایا۔ اور وہ روتی دھوتی بڑھیا کے ہاں چلی گئی۔ شام کے وقت جب گوپی گھر آیا تو ماں کی حالت دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ خون کا سا گھونٹ پی کر چپکا ہو رہا۔

---

اندھیری رات تھی۔ ہوا تیز چل رہی تھی۔ آسمان پر بادلوں نے اپنی نیلی نیلی ردا بچھا رکھی تھی۔ بڑھیا سوتی تھی لیکن جوریا درد سے کراہ رہی تھی اور اپنی قسمت پر رو رہی تھی۔ گوپی چپکے سے جھونپڑی سے نکلا۔ اندھیرے میں گرتا پڑتا اُس جگہ جا پہنچا جہاں شنبھو رہتا تھا۔ اِدھر اُدھر سے سوکھی گھاس اکٹھی کر کے اُس نے ایک گٹھا سا بنا لیا تھا۔ شنبھو کی جھونپڑی اور جھونپڑوں سے ذرا فاصلہ پر تھی۔ گوپی دبے پاؤں جھونپڑی کے پاس جا پہنچا اور کان لگا کر سننے لگا۔ اندر سے شنبھو کے خراٹوں کی آواز آ رہی تھی۔ اُس نے دیا سلائی جلا کر سوکھی گھاس کے گٹھے کو جلایا اور پھر جلدی سے جھونپڑی کو چاروں طرف سے آگ لگا دی۔ چشم زدن میں شعلے بلند

ہوکر آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ اچانک شنبھو کی چیخ سُنائی دی۔ لیکن یہ اُس کی زندگی کی آخری آواز تھی پڑوس والوں کو خبر ہوتے ہوتے شنبھو اور اُس کی جھونپڑی جل کر راکھ ہو چکے تھے۔

---

اگلے روز شنبھو کے وارثوں نے قتل اور آگ کے الزام میں گوپی کو گرفتار کرا دیا۔ گوپی کا کون بیٹھا تھا جو اُس کی امداد کرتا۔ ایک ممتا کی ماری جوریا تھی جو صبح سے شام تک پتی کے لئے روتی تھی۔

گوپی کئی دن تک حوالات میں رہا لیکن آخر کافی ثبوت نہ ہونے کے باعث عدالت نے اُسے چھوڑ دیا۔ عدالت کے دروازے پر لوگوں کا کافی ہجوم تھا جب وہ باہر آیا تو لوگوں نے خوشی کے نعرے لگائے اور اس کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے اور ایک جلوس کی صورت میں گھر لائے۔ لیکن اس خوشی اور مسرت کے وقت جوریا گھر پر نہ تھی۔ گوپی اور بڑھیا جس کے ہاں یہ رہتا تھا اُس کی تلاش میں نکلے اور ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس جگہ آ نکلے جہاں کبھی شنبھو کی جھونپڑی تھی۔

جوریا جلے ہوئے گھر کی راکھ پر بیٹھی پتی کی یاد میں آنسو بہا رہی تھی۔

---

# یاس عظیم آبادی اور تذکرۂ معراج الخیال

از جناب پروفیسر محمد محفوظ الحق، ایم۔ اے

مولوی عبدالمالک آروی کا مضمون "بہار کا ایک دل والا شاعر گمنامی میں" (مطبوعہ سالنامہ ساقی، بابت ۱۹۳۲ء) بہت دلچسپ اور قابلِ قدر ہے۔ یاس عظیم آبادی کا نام خوش گو اور خوش فکر شعرا کی فہرست میں لیا جاسکتا ہے لیکن آج اُن کے کتنے ہم وطن ہیں کہ جو کلام سے قطع نظر اُن کے نام سے بھی واقف نہیں! یہ ضرور ہے کہ زمانہ معمولی اور ادنیٰ درجے کے شعرا کو بھول جاتا ہے لیکن یہ ضرور نہیں کہ جتنے گمنام شعرا ہیں وہ سب کے سب معمولی اور ادنیٰ درجے کے ہوں، کمال کے لئے شہرت لازم نہیں اور نہ شہرت کے لئے کمال۔ بہار کے بہت سے ایسے شعرا ہیں جنکے نام بھی آج کوئی نہیں جانتا لیکن ان میں بعض ایسے بھی ہیں جن کو اچھے شعرا کی صف میں جگہ دی جاسکتی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ان کو شعرا کی اگلی صف میں جگہ دی جاسکتی ہے لیکن یہ ضرور کہونگا کہ وہ دوسری اور تیسری صف میں جگہ پانے کے مستحق ضرور ہیں، اِنہیں شعرا میں یاس بھی ہیں۔

ہمیں مولوی عبدالمالک صاحب کا ممنون ہونا چاہیئے کہ اُنہوں نے "کلیاتِ حسرت" (عظیم آبادی) سے یاس کے حالات دریافت کرکے ہمارے سامنے پیش کر دئے، حسرت کا بیان معتبر اور مکمل ہے لیکن مولوی عبدالمالک صاحب کا یہ کہنا صحیح نہیں کہ "آج محض حسرت کے کلیات کی بدولت یاس کا تذکرہ محفوظ ہے" بلکہ واقعہ یہ ہے کہ آج سے سو برس پہلے خود یاس کے ایک معاصر اور ہم وطن، عبرتی عظیم آبادی نے ان کے حالات اپنے دو تذکروں — ("معراج الخیال" اور "نتائج الافکار") میں قلمبند کر دئے ہیں، یہ عجیب اتفاق ہے کہ جس طرح یاس کو اہلِ بہار بھول گئے اسی طرح بہار کے اس قابلِ قدر تذکرہ نویس (عبرتی) کو بھی وہ بھول بیٹھے۔ عبرتی مرحوم کا پایۂ ادب و انشا میں کافی بلند تھا، اُنہوں نے فارسی میں متعدد تصنیفات یادگار چھوڑی ہیں، جن میں "معراج الخیال" (تذکرۂ شعرا فارسی) اور "ریاض الافکار" (تذکرۂ نثر نویسان فارسی) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ "معراج الخیال" ۱۲۵۸ھ کی تالیف ہے اور "ریاض الافکار" ۱۲۶۰ھ میں لکھا گیا لیکن تالیف کے بعد بھی بعض شعرا اور ادبا کے حالات بڑھائے گئے ہیں۔ چنانچہ یاس کی وفات کا ذکر (جو ۱۲۶۲ھ میں واقع ہوئی) اول الذکر تذکرہ (مرتبہ ۱۲۵۷ھ) میں بھی موجود ہے۔ میں چونکہ عبرتی مرحوم کے سوانح زندگی، ان کے تذکروں اور دیگر تصنیفات پر مفصل تبصرہ ندیم (گیا) کے "بہار نمبر" کے لئے لکھ رہا ہوں اس لئے عبرتی یا اُن کے تذکروں کے متعلق کچھ اور لکھنا نہیں چاہتا، بلکہ تذکرۂ "معراج الخیال" سے صرف ایک اقتباس پر اکتفا کرتا ہوں، اس اقتباس سے معلوم ہوگا کہ عبرتی اور یاس میں ربط خاصہ تھا، دوسرے یہ کہ جوانی میں یاس مرحوم "پری رُخانِ سنبلیں مو" کے دام میں گرفتار تھے لیکن بعد کو توبہ کر لی، تیسرے یہ کہ عظیم آباد (پٹنہ) میں وہ شیخ فضل علی کے مکان میں قیام کرتے تھے اور چھے

یہ کہ ان کے ایک شاگرد میر احسن علی نامی تھے۔ یہ باتیں ایسی ہیں جن کا ذکر "کلیات حسرت" میں موجود نہیں اور اگر ہے تو مولوی عبدالمالک صاحب نے ان کا ذکر نہیں کیا۔

یاس کا جو حال "معراج الخیال" میں درج ہے تقریباً وہی "ریاض الافکار" میں بھی ملتا ہے، لیکن "ریاض الافکار" میں ان کے نام کا آنا اس بات کا ثبوت ضرور ہے کہ وہ فارسی کے انشا پرداز بھی تھے۔

مندرجہ ذیل اقتباس "معراج الخیال" کے ایک قلمی نسخے سے لیا گیا ہے جو ایشیاٹک سوسائٹی بنگالہ میں محفوظ ہے:-

اقتباس از تذکرۂ "معراج الخیال"

مؤلفہ عبرتی عظیم آبادی

یاس اسم حنیف آں طرز استاد نعت گو نی مولوی انور علی است۔ مولد و مرز بوم ش قصبۂ آرہ، بزبانِ فارسی و ریختہ بسا ماہر، نظمِ پارسی آں جادو زباں نسخۂ سحر سامری است از پی دل مشتاقاں، و اشعار ریختۂ آں شیر لساں نمکدانی است نمک پاشِ حالِ ہمعصراں۔ ہمچنیں نثر برجستۂ آں خوش خیال خیلی پاکیزہ و شستہ، تحریری خامہ بدست نہ گرفتہ کہ سرِ صفحہ را مطلعِ خورشیدِ رخانِ معنی (رنہ) نزدہ و شامی بفکر نہ نشستہ کہ برنگین تلاشی ورق را آئینہ دار رنگِ شفق نہ نمودہ۔ خیالِ عالیش خیلی نزاکت آشنا و طبعِ متینش بسیار رسا و نکتہ زا۔ در عالم شباب کہ ایام لاابالی ہر فرد بشر است چندی بسودائے پری رخانِ سنبلیں مو گذرانید، نفس سرکش را حظے وافر داد و پایان کار طریقِ ورع و اتقا پیش گرفتہ بخدمت انا مرتاز یر سایۂ حکاماں گشت۔ گاہ بقصبۂ آرہ تشریف داشتی و گاہ بتقاضائے محبتِ ہم نفساں بہ عظیم آباد پیوستہ بدولت خانۂ شیخ فضل علی کہ از مخلصانِ آں فضیلت دستگاہ بانند فردوکش گشتی، راقم اوراق ہم در عظیم آباد شرف اندوز عالی خدمتش گردیدہ و ہم در قصبۂ آرہ ہمپائے میر احسن علی صاحب کہ از شاگرداں آں وحید عصر بودہ فیض اندوز صحبتِ مستفیض شدہ بخواندن افکارِ برجستۂ خویش ایں مشتاق را می نواخت۔ البتہ در ہمعصراں میر قافلۂ سخن سرائے دانستمی و طرز استاد جادو بیانی می خواندی آخر کار در ۱۲۶۲ھ یکہزار و دو صد و شصت و دو بشوق زیارت بیت اللہ زاد اللہ شرفاً از وطن برآمدہ بعظیم آباد جان بحق تسلیم نمود و بلبل گلزار جنت یاس عالی قدر را مادۂ تاریخ وفاتش یافتند۔ از آں سر حلقۂ درد طلبان یاس است غزل ؎

| | |
|---|---|
| نورِ ماہ ماست یا خورشید نور افزاست ایں | صبحِ عید عاشقاں یا مصحفِ والاست ایں |
| قامت است ایں یا قیامت یا نہالِ باغِ حسن | سرو یا شمشاد یا نخلِ امیدِ ماست ایں |
| باشد ایں یاقوت یا لعلِ بدخشاں یا عقیق | یا لبِ جانانِ ما یا خضر یا عیسیٰ است ایں |
| یارب ایں چشم است یا میخانہ یا جامِ شراب | یا دو ترکِ مست یا غارتگرِ دلہاست ایں |
| ابرِ نیساں است یا عمان یا طوفانِ نوح | بحرِ خوں یا دیدۂ یاس است یا دریاست ایں |

# وارداتِ قلب

از جناب فضلِ حق قریشی دہلوی

کتاب کا مطالعہ کرتے کرتے شام ہو گئی تھی۔ سورج اُفقِ مغرب میں رنگین پہاڑیوں کے پیچھے چھپ رہا تھا اور اُس کی سنہری کرنیں اپنی آخری جھلک دکھا کر بالکل روپوش ہو جانے کے لئے بیتاب تھیں۔ پرندے اپنے آشیانوں کی طرف پرواز کر رہے تھے، میں نے واپس جانے کا ارادہ کیا۔ سامنے ندی کے پانی کی مدھم روانی ہلکے سُروں کا نغمہ پیدا کر رہی تھی۔ کنارے پر اتھلواں پانی میں چھوٹی چھوٹی مچھلیوں کا رقص نہایت دلفریب معلوم ہو رہا تھا۔

تاریکی بڑھتی جا رہی تھی۔

مَیں نے انگڑائی لیتے ہوئے دل میں کہا "کافی دیر ہو گئی۔ اب چلنا چاہیئے"

"میں ساتھ چلوں گی"۔ ایک مدھم مگر بالکل صاف آواز فضا میں گونجتی ہوئی سُنائی دی میں خوف سے اُچھل پڑا اور تمام جسم پر ایک ایسی کیفیت طاری ہونے لگی جس کا نتیجہ اعضاء کی خفیف تھرتھراہٹ میں نمودار ہوتا ہے۔ مُڑ کر دیکھا۔ کوئی متنفس نظر نہ آیا۔ چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ بالکل سُنسان تھا۔ سخت تعجب ہوا۔ مَیں نے دل میں خیال کیا۔

"ضرور کوئی خبیث رُوح ہے۔ جو ارض و سما کے درمیان فضائے بسیط میں منڈلا رہی ہے۔ اُس نے میری نقل و حرکت دیکھی ہو گی اور شاید اب مجھے خوفزدہ کر کے خوش ہونا چاہتی ہے"

ہر چند ایک پیکرِ غیر مرئی سے ڈرنا مضحکہ خیز ہے، مگر اس قدر ویرانہ میں جب کہ تاریکی بھی بڑھتی جا رہی ہو۔ ایک نامعلوم ہستی کی زبان سے اپنے دل میں سوچی ہوئی بات کا جواب سُننا بدحواس کر دینے کیلئے کافی ہے۔ پھر دل میں یہ خیال بھی پیدا ہوا کہ دریاؤں کے کنارے عموماً آسیب زیادہ ہوتے ہیں۔

دلی اضطراب ابھی کم بھی نہ ہوا تھا کہ پھر وہی آواز سُنائی دی:۔

"میں ضرور ساتھ چلوں گی"

اِس دفعہ صاف طور پر معلوم ہوا کہ آواز دائیں طرف سے آئی ہے۔ عام بات ہے کہ انسان ڈر جانے کے باوجود اسی طرف دیکھتا ہے، جس طرف ڈراؤنی چیز کے موجود ہونے کا امکان ہو۔ میری نگاہ بھی ایک جھُنڈ پر جم کر رہ گئی۔ اور غیر ارادی طور پر اس طرف قدم اُٹھنے لگے میں قریب پہنچ گیا' اور پتّوں کے درمیان جھانک کر جھنڈ کے پس منظر میں دیکھا۔

وہاں کوئی خبیث رُوح نہیں تھی۔ بلکہ دو معصوم ہستیاں ایک دوسرے کے ساتھ ہم آغوش تھیں۔

(بقیہ بر صفحہ ۶۹)

# سُلیمان نامہ

## ارکاٹ کی ایک اُردو مثنوی

ازجناب نصیر الدین ہاشمی۔ ایف۔ آر۔ ایس۔ اے۔

جنوبی ہند میں صوبہ مدراس (ارکاٹ) نے زبان اور ادب اُردو کی جو خدمت آج سے پہلے انجام دی ہے اُس کا علم عام طور سے بہت کم ہے۔ ہماری تالیفات "دکن میں اُردو" اور "یورپ میں دکھنی مخطوطات" میں کسی قدر صراحت ضرور ہے مگر پوری تفصیل نہیں ہے۔ ہمارا ارادہ ہے کہ "مدراس میں اُردو" کے نام سے ایک کتاب تالیف کی جائے۔ جس میں تفصیل کے ساتھ مدراس میں اُردو کی ابتدا اور اُس کی ارتقائی مدارج کو ظاہر کریں۔ لیکن اس کیلئے ایک عرصہ درکار ہے۔ ہنوز اس کا مواد فراہم کیا جا رہا ہے۔ سر دست چند مثنویاں پیش کی جاسکتی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ زیر بحث مثنوی "سلیمان نامہ" بھی ہے۔

صوبہ مدراس جو پہلے ارکاٹ سے موسوم تھا حکومت مُغلیہ کے آخر زمانہ میں تقریباً خود مختار ہو گیا تھا یہاں خاندان والاجاہی رئیس ارکاٹ کی حیثیت سے فرمان روا تھا۔ نواب انور الدین خاں گویا اس کے بانی تھے سنہ ۱۱۶۲ھ میں یہ مارے گئے۔ ان کے بعد ان کے فرزند نواب محمد علی خاں والاجاہ اُن کے جانشین ہوئے۔ ان کا زمانہ تاریخ ارکاٹ میں مشہور و معروف ہے۔ اِن ہی کی کوشش اور امداد سے فرانسیسیوں کا تعلق ہندوستان سے منقطع ہو کر شہنشاہیت ہند کا خیال دل کا دل ہی میں فنا ہو گیا۔ انگریزوں کا بول بالا ہو گیا اور ان کی حکومت مستحکم ہو گئی۔

والاجاہ کا زمانہ حکومت علم و فن کی ترویج کے لحاظ سے بھی یادگار رہے۔ فارسی اور عربی کے بڑے بڑے علمار مثلاً مولانا نظام الدین بانی درس نظامیہ بحر العلوم مولانا عبد العلی چشم و چراغ فرنگی محل۔ مولانا امین الدین علی خاں۔ مولانا محمد غوث شرف الملک وغیرہ جیسے جید علمار یگانہ روزگار یہاں جمع تھے جن کے چشمۂ فیض سے دُور دُور کے تشنہ کامانِ علم سیراب ہوتے تھے۔

عربی اور فارسی کے قطع نظر اُردو زبان کی بھی خدمت کی گئی۔ بیسیوں شاعر اقلیم سخن میں نامور ہو کر آسمان شاعری پر آفتاب بن کر چمکے۔ ابجدی۔ امین۔ آگاہ۔ راقم۔ افصح۔ واصف۔ ثاقب وغیرہ کے نام فراموش نہیں کئے جاسکتے۔

والاجاہ کے انتقال (سنہ ۱۲۱۰ھ) کے بعد بھی صوبہ ارکاٹ نامور علمار اور شعرا سے خالی نہیں ہوا بلکہ بدستور علمائے باکمال اور شعرائے نامدار کا مرکز بنا رہا۔ قطع نظر دیگر شعرا کے خاندان والاجاہی کے افراد بھی نہ صرف شعر و سخن سے دلچسپی رکھتے تھے بلکہ خود بھی باکمال شاعر ہوتے تھے۔ ان ہی میں سے ایک غلام اعز الدین خاں بہادر

مُستقیم جنگ المتخلص بہ نامی ہیں۔

نامی حامد علی خاں کے فرزند تھے۔ ۱۱۸۱ھ میں ارکاٹ میں تولّد ہوئے۔ مولانا حافظ محمد حسین سے عربی اور فارسی کی تعلیم پائی اور پھر علامۂ روزگار مولانا باقر آگاہ سے شرفِ تلمیذ حاصل کیا۔ آگاہ کی تربیت سے شاعری کا ملکہ پیدا ہوا اور آگے چل کر نامی نے زمانہ میں نام پیدا کرکے اپنے اُستاد کے نام کو روشن کیا۔

عمدۃ الامراء (۱۲۱۱ھ تا ۱۲۱۶ھ) نے نامی کو ملک الشعراء کے خطاب کے ساتھ اپنے دربار کا شاعر بنایا تھا۔ یہ عربی فارسی اور اُردو میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ کبھی نامی اور کبھی مستقیم تخلص کرتے تھے۔ متعدد مثنویاں مثلاً لیلیٰ مجنوں، شیریں خسرو، وفاتِ نبی، قصہ بنارس، سلیمان نامہ وغیرہ اپنی یادگار چھوڑیں۔ ۱۲۴۴ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ مدراس میں ساحلِ سمندر کے قریب اپنے باغ میں مدفون ہوئے۔

نامی کا زمانہ وہ ہے جب کہ دہلی میں میر و سودا اور خواجہ میر درد کا زمانہ گذر چکا تھا۔ میر اثر مسندِ شاعری پر متمکن تھے، اور لکھنؤ میں جرأت، انشاء اور مصحفی کا بول بالا تھا۔ شاعری اپنے ابتدائی مدارج سادگی اور اصلیت کو گذر کر تصنع اور مبالغہ کی سرحد میں پہونچ چکی تھی۔ آسان اور ہموار زمینوں کے بجائے عمداً سنگلاخ زمین اختیار کی جاتی تھی، متانت اور ثقاہت میں بھی فرق آگیا تھا، اور اب وہ فقراء اور صوفیہ کی خانقاہوں سے نکل کر عام طور سے بادشاہوں اور امیروں کے دربار میں آگئی تھی۔

یہ امر ہنوز تحقیق طلب ہے کہ نامی کے کون کون تصنیفات زیورِ طباعت سے آراستہ ہو چکے ہیں۔ زیرِ بحث مثنوی ایک طویل مثنوی ہے جو غالباً ہنوز طبع نہیں ہوئی۔ اس کا ایک مخطوطہ ہمارے بزرگ مولوی خلیل اللہ صاحب کے کتب خانہ میں ہے۔ اس کے ۲۹۴ صفحے ہیں اور اشعار کی تعداد تقریباً ۳۸۰۰ ہے۔ خط نستعلیق ہے۔ تاریخ کتابت اور کاتب کا نام نہیں ہے۔ اس کی تصنیف ۱۲۲۶ھ میں ہوئی ہے جیسا کہ مصنف کے ان شعروں سے ثابت ہو سکتا ہے:۔

| | |
|---|---|
| ہوا ختم جب نسخۂ دلکشا | میں تاریخ کی فکر کرنے لگا |
| یکایک سروشِ سعادت سرشت | کیا ہے ندا بوستانِ بہشت |

مثنوی میں حسبِ رواجِ مروّجہ اوّل حمد ہے اُس کے بعد مناجات پھر نعت اسی میں منقبت صحابہ اور مدح جیلانی بھی ہے۔ اس کے بعد معراج کا عنوان آتا ہے۔ اس پر ۷۵ اشعار ہیں اس کے بعد مناجات بجنابِ رسالت مآب میں (۳۵) شعر، پھر سببِ تصنیف کتاب پر (۶۶) شعر ہیں۔ اس کے بعد اصل قصہ شروع ہوتا ہے۔

حمد کی ابتدا ان شعروں سے ہوئی ہے:۔

| | |
|---|---|
| سرا ہو سدا اُس سلیمان کو | دیا جا لیا جو جان و انسان کو |
| زمین و فلک اور عرش بریں | ہوئے اُس کی قدرت کو کرسی نشیں |
| اگر جوئے شیریں ہے یا بحرِ شور | ہے دونوں کو بخشا وہی زور و شور |

جیساکہ بیان کیا گیا ہے یہ مثنوی عنوانات کے تحت لکھی گئی ہے۔ ہر عنوان کا پہلا شعر ساقی کی مخاطبت ہی شروع ہوتا ہے۔ مثلاً۔ نعت کا پہلا شعر:-

شتاب آتو اے ساقیِ رشکِ حور — پلا مجھ کو یک دم شرابِ طہور

معراج کا پہلا شعر:-

نہ کر ساقیا آج ہرگز کمی — مے رنگ تو ہے بھر زمزمی

سببِ تالیف:-

پلا ساقیا بادۂ دوستی — نہ رکھ مجھکو مجہول جوں پوستی

سببِ تالیف کے عنوان میں بیان کرتا ہے کہ ایک دن دل میں خیال آیا کہ ماہ و سال گذرے جاتے ہیں کوئی یادگار نشانی چھوڑنی چاہیئے۔ اس کے بعد اولاً پہلی مثنوی شیریں خسرو تصنیف ہوئی اس کے بعد قیس و لیلیٰ پھر وفات نبی اس کے بعد بنارس کا قصہ لکھا گیا۔ اب سلیمان اور بلقیس کا قصہ شروع کیا جا رہا ہے۔

اپنے اُستاد مولانا باقر آگاہ کا ذکر نہایت تعظیم و تکریم سے کیا ہے۔ ان کی وفات پر ماتم کرتا ہے اور اپنے شاگرد ہونے کا اعتراف کرتا ہے۔ بعض شعر ملاحظہ ہوں:-

کیا پہلے میں نے بحسنِ نظام — حکایاتِ شیریں و خسرو تمام

جو بعد اُسکے پھر میں نے کھولی زباں — کیا قصہ قیس و لیلیٰ بیاں

کیا فکر پھر ساقی نامہ وہیں — بنارس کا قصہ لکھا بعد ازیں

کہوں اب بفضلِ خداوندی — حکایت سُلیمان و بلقیس کی

. . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . .

علاوہ جہاں سے کیا انتقال — جو تھا مولوی باقرِ باکمال

سخن گو سخن رس سخنداں تھا وہ — علومِ جہاں جسم اور جاں تھا وہ

کمالوں کا گھر اُس سے آباد تھا — وہی عصر کا شہر اُستاد تھا

مجھے بھی ملا فیض اُس ذات کا — وہ آگہ کیا مجھ کو ہر بات سے

حضرت سلیمان کا قصہ مشہور ہے جو اکثر تفسیروں میں بیان ہوا ہے۔ مگر اس کو دراصل قصہ ہی کہنا چاہیئے جس میں صدق و کذب شریک ہے۔ قصہ کا خلاصہ یا لب لُباب اس طرح ہے۔ جب داؤد علیہ السلام کے انتقال کا وقت آیا تو خداوند کریم نے جبرائیل کو یہ حکم دیکر روانہ کیا کہ اُن کے اٹھارہ لڑکوں سے مختلف سوالات کرے، جو لڑکا جواب صحیح دے اُس کو سلطنت عطا کی جائے۔ جبرائیل آئے اور اُن کے لڑکوں سے سوالات کئے۔ مثلاً دریافت کیا کہ انسان کی جان سے دور اور نزدیک کون سی شئے ہے۔ اور کس چیز سے انسان کو بہت زیادہ اُلفت ہے اور کس سے زیادہ نفرت۔ سلیمان ان کے جوابات دیتے ہیں اس کے بعد ان کو سلطنت دی جاتی ہے خداوند

کریم ایک انگشتری عطا کرتا ہے جس کے باعث جن و پری اور دیو اُن کی اطاعت و فرمانبرداری کرتے ہیں۔ بیت المقدس کی مسجد تعمیر ہوتی ہے۔ حضرت سلیمان تمام انسانوں اور حیوانوں کی دعوت کرتے ہیں مگر دریا سے ایک مچھلی نکل کر کل طعام کا ایک لقمہ کر جاتی ہے۔ اس کے بعد سلیمان کی بادشاہ نوبرہ سے جنگ ہوتی ہے اور اُس کی لڑکی سے حضرت سلیمان نکاح کرتے ہیں۔ آپ کی انگشتری چوری جاتی ہے اور پھر حکومت بھی چلی جاتی ہے اور پھر ایک عورت کو نکاح کرنے سے وہ انگشتری واپس ملتی ہے۔ اس کے بعد دو زاہدوں سے حضرت سلیمان کی ملاقات ہوتی اور پیغمبری ملتی ہے۔ پھر مختلف بادشاہوں سے حضرت سلیمان جنگ کرتے ہیں جن اور دیوؤں سے مقابلہ ہوتا ہے۔ سیر کے لئے کوہ قاف کی طرف جاتے ہیں۔ آپ کا ایک رفیق وہاں کی ایک پری پر عاشق ہو کر اُس سے شادی کرتا ہے۔ اُس کے بطن سے بلقیس تولد ہوتی ہے۔ ایک بادشاہ ان سے شادی کا پیغام بھیجتا ہے۔ مگر وہ راضی نہ ہو کر جنگ کرتی ہے اور وہ قتل ہو جاتا ہے۔ بلقیس اپنی خوبصورتی کے سوا عدل و انصاف شجاعت اور سخاوت میں مشہور ہے۔ حضرت سلیمان کے پاس ہُدہُد شہر صبا سے بلقیس کی خبر لاتا ہے۔ اسی کے ذریعہ یہاں سے پیغام جاتا ہے۔ اس کے بعد ایک عالی شان محل تعمیر ہوتا اور حضرت سلیمان کی بلقیس سے شادی ہوتی ہے۔ ایک مدت تک دونوں کی بسر ہوتی ہے۔ اس کے بعد بلقیس کا انتقال ہوتا اور پھر حضرت سلیمان کا بھی انتقال ہو جاتا ہے۔ اسی پر قصہ تمام ہوتا ہے۔

اب مختلف مقامات سے نمونہ کلام پیش کیا جاتا ہے۔

قصہ کی ابتدا:-

تفاسیر میں اس طرح ہے لکھا[1] — کہ داؤد کو جب بلایا خدا
دیا قابض روح پیغام موت — پلانے کو لائے لئے جام موت
تھے اُس وقت حاضر اٹھارہ پسر — سلیمان ان سب میں تھا خورد تر
کیا حق نے فرمان جبریل کو — کہ جا پاس داؤد کے جلد تو
کئی ہیں سوالات اُسکے جواب — تو اولاد اُسکے پوچھ آشتاب
جو اُنمیں میں سے دیوے جواب سوال — اُسی پر ہے بعد اُسکے دولت بحال

نوبر شاہ سے جنگ کے لئے حضرت سلیمان جاتے اور جنگ کرکے کامیاب ہوتے اور اُس کی دختر کو بیاہ کر لاتے ہیں:-

عرب کے جزیرے میں ہے ایک شاہ — کہ صاحب خزانہ ہے صاحب سپاہ
بہت فوج رکھتا ہے اور مال بھی — بڑا ملک ہے خوب اقبال بھی
کسی کو بھی خاطر میں لاتا نہیں — تکبر کے مارے سماتا نہیں

[1] اشعار کاتب کی غلطیوں کے ساتھ نقل کئے گئے ہیں کیونکہ یہی ہمارا اصول ہے۔ تاکہ کاتب مخطوطہ کی حالت روشن ہو جائے۔ - ہاشمی۔

نہ کافر ہوا نرم اُس شاہ سے　　نہ واقف ہوا دین کے راہ سے
کیا فوج تیار وہ نابکار　　لڑائی کا کرنے لگا شور شار
حماقت کیا سخت بے جا کیا　　مثل ہے جو گرجے گا برسے گا کیا
کہا شاہ نے ملک اُس کا لوٹو تمام　　کرو شہر میں دمبدم قتل عام
لگی ہونے اُس ملک میں مار مار　　ہوئی قتل فوج اُس کی سب ایکبار
غرور و زر و سیم سارا گیا　　خسر نہ گیا شاہ مارا گیا

حضرت سلیمان کا ایک رفیق سیر کے لئے جاتا ہے اور پری پر عاشق ہو جاتا ہے۔ اس میں جنگل اور چاندنی کی کیفیت ملاحظہ ہو:۔

اِسی میں ہوئی ہے وہ جنگل میں شام　　نکل آیا گردوں پہ ماہِ تمام
جو مہتاب سے بن میں پھولا کپاس　　ہوا شب کا یکسر روپہلی لباس
عجب چاندنی کی تھی کچھ آن بان　　بگولا دکھاتا تھا جوں چرخ بان
چمکتا تھا ہر برگ مثلِ شرار　　گرہیں و غنچے تھے ہر جا انار
ہو گلریز جب رات آئی نکل　　ستاروں کے چھوٹے میں تارے منڈل
درختانِ شب مہ کے پرتو سے واں　　ہوئے جوں چراغوں کے لشکر عیاں
ہوائی ہوا کی لگی چھوٹنے　　پٹاخے گلوں کے لگے پھوٹنے
بجا ہے گر اُس کو کہیں شب برات　　کہ اُلفت کی لائی تھی وہ شب برات
زبس ماہ و انجم فروزاں ہوئے　　چکورے خوشی سے غزل خواں ہوئے
زمیں ہو گئی اس طرح زرنگار　　کہ شامِ غریباں تھی صبحِ بہار
فلک پر تھی زہرا جو رشکِ پری　　ہوئی دل سے مہتاب کی مشتری
بھرا دشت و کہسار سب طور سے　　گل و بوٹہ دینے لگا حور سے
نظر کر تماشہ شبِ ماہ کا　　وزیر اس جگہ رات کو رہ گیا

اُس پری کی خوبصورتی کی تعریف:۔

کرشمہ تھا غمزہ تھا اور ناز بھی　　ادا بھی تھا اور آن و انداز بھی
غرور اور شوخی ہنسی اور حیا　　بہت خوشنما تھا نہایت بجا
سراپا تھے اعضا نہایت درست　　تھے جہت تختی یکدست چالاک و چست
چمک اُس کے مکھڑے پہ مہتاب سی　　جبین صاف و شفاف سیماب سی
نظر کر رُخ اُس صبحِ اُمید کا　　اُجالے میں منھ آیا خورشید کا

عجب کیا گر اُس رُخ کا دیکھ آب و تاب گُلِ نیلوفر ہو گُلِ آفتاب

. . . . . . . . . . . . . . . . . . . .

چھٹے رخ پہ دو کاکل عنبریں وہی تھے مگر شام تاتار و چین
تھے زلف اور قدِ حق کے قدرت کا کھیل چڑھی سرد کے جھاڑ پر نازک بیل
کہ اُس کو چہ زلف سے سانپ جائے تو پھر مارے ہیبت کے من کانپ جائے
سیہ بال دیکھ اور گورا سا رنگ شب و روز کہتے تھے عالم ہو دنگ
عجب قدرتِ احسن الخالقین کہ واللیل و الشمس سے ہے قریں
قدم کے زماں میں وہ لپٹے تھے بال ہے اب آگے چلنا سرِ مُو محال

اسی طرح ایک ایک صفت کے لئے کئی کئی شعر وقف کئے ہیں اور پورا سراپا لکھا ہے۔ حضرت سلیمان دیوؤں سے مختلف کام لیتے ہیں وہ ان کی اطاعت و فرمانبرداری کرتے ہیں۔ اہم سے اہم کام انجام دیتے ہیں۔ ایک مرتبہ حکم دیا جاتا ہے کہ سمندر سے دو موتی نکال لائیں۔

کہا شاہ القصہ دیووں سے تب یہ دریا میں ہیں گی دو موتی عجب
سفید ایک ہے اور ایک زرد ہے قمر و بدر جس کے نت گرد ہے
نہیں ویسے موتی جہاں میں کہیں بڑے اس قدر کوئی دیکھا نہیں
اگر دیکھے وہ گوہر شب چراغ گُلِ باغِ رضوان ہو داغ داغ
درخشاں ہیں یکدست شام و سحر ہیں دریائے اخضر کے شمس و قمر
وہ ہیں بحرِ اعظم کے گلہائے باغ وہ ہیں ابرِ نیساں کے چشم و چراغ
تم اس بحر میں آج گر ڈوب کر نکالو یہ گوہر تو ہے خوب تر
کیا شاہ دیووں نے جب خطاب سب اُس بحرِ اخضر میں ڈوبے شتاب
لگے ڈھونڈنے آب میں غوطے مار ملے پھر وہ دونوں دُرِ شاہوار
وہ گوہر سلیمان کو لا کر دئے خوشی سے کھڑے ہو کے مجرا کئے

حضرت سلیمان کی نظر سے ہد ہد غائب ہو جاتا ہے آپ خفا ہوتے ہیں عقاب کو اس کی تلاش میں روانہ کیا جاتا ہے۔ ہد ہد حضرت سلیمان کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرتا ہے۔

کیا عرض ہد ہد کروں گا بیاں اگر جان کی مجھ کو ہو گی اماں
کہا شاہ کہتا ہے کیا کہہ شتاب میں بخشوں گا گر ہو گا عذرِ صواب
نہیں تو دکھاؤں گا تجھکو سزا کہ ہیگی سیاست سزائے خطا
لگا کہنے میں اب گیا تھا جدھر نہیں واں ہوئے گا تیرا گذر

میں دیکھا ہوں جو اب نہ دیکھا ہے تو — سنا ہوں جو میں نہیں سنا تو کبھو
سبا کے طرف سے خبر یک یقیں — لے آیا ہوں شک اس میں ہرگز نہیں
ہے اس ملک میں ایک زن بادشاہ — بہت ہے خزانہ بڑی ہے سپاہ

اس کے بعد تفصیل سنکر حضرت سلیمان بلقیس کی طرف اپنا قاصد روانہ کرتے ہیں۔ اور اُس کو آنے کی دعوت دیتے ہیں۔ بلقیس آپ کی دعوت قبول کر کے اپنے ملک سے روانہ ہوتی ہے۔ حضرت سلیمان ایک قصر تعمیر کرتے ہیں جس کا فرش بلور کا ہوتا ہے۔ جب بلقیس دربار میں حاضر ہوتی ہے تو اس کو گویا پانی نظر آتا ہے، وہ اپنا دامن اُٹھاتی ہے اور اصلیت سے واقف ہو کر شرمندہ ہو جاتی ہے اور پھر:-

وہ دامن کے تئیں چھوڑ شرما گئی — خطا اپنی اس بات سے پا گئی
جو واقف زراز نہانی ہوئی — حیا سے بہت گل کے پانی ہوئی
عجب شرم سے مسکرائی وہاں — ہوئی ایک گھونگٹ ہے اُس جا عیاں
وہ یک نازکی داب و آداب سے — ہوئی آکے حاضر ہنسی داب سے
ادب سے کیا شاہ دیں کو سلام — گئی آکے اُس قصر میں پھر مقام

حضرت سلیمان سے بلقیس کی گفتگو ہوتی ہے، وہ آپ کی انگشتری کے متعلق دریافت کرتی ہے۔

کہی کہہ مجھے اے شہ محترم — ہے انگشتری میں تیری کیا رقم
کہا بعد نام خدا ہے لکھا — کہ ہے کا محمد رسول خدا
لگی کہنے بلقیس اے شاہ دیں — تیرا نام اُس میں لکھے کیوں نہیں
محمد ہے کس شخص کا نام بول — میرے سے تو اُس نام کا بھید کھول
سلیماں کہا شاہ خیر الانام — حبیب خدا ہے علیہ السلام
وہی ہے شہنشاہ ہر دو جہاں — کیا حق اُسے ختم مرسلاں
بلاشک ہے وہ انبیا کا امام — لقب اُس کا احمد محمد ہے نام

اس کے بعد حضرت سلیمان کی بلقیس سے شادی ہوتی ہے۔ تقریب میں بڑی ضیافت ہوتی ہے۔ بلقیس کے لئے ایک قصر تیار ہوتا ہے، وہ اس میں سکونت کرتی ہیں۔

بنا جب وہ کاشانہ بے مثال — رہی اُس میں بلقیس صاحب جمال
لگے رہنے کھاتے کھلاتے ہوئے — لیے اُس میں دیتے دلاتے ہوئے
بہت خیر و خیرات جاری کئے — مدارات دن رات جاری کئے

حضرت سلیمان کا بلقیس سے ایک لڑکا ہوتا ہے۔ ایک مدت کے بعد اول بلقیس کا انتقال ہوتا ہے اور پھر حضرت سلیمان کا انتقال ہو جاتا ہے، آپ کے انتقال پر جن پری اور دیو فرار ہو جاتے ہیں اور اسی پر یہ

قصہ ختم ہوتا ہے۔ چند آخری شعر ملاحظہ ہوں:۔

زبس سحر و جادو کا شہرہ پڑا — کہ بولے سلیماں کو جادوگرا
ہوئے قائل اس بات پر سب بہو — بہت دھوم کرنے لگے کود کود
پھرے ہیں سلیمان کے قول سے — لگے کام کرنے کو بے ڈول سے
بنے دیو اور بھوت سب اُنکے یار — ضلالت سے آکر پڑا کاروبار
غرض دیو و شیطاں کا پھیرا ہوا — اُجالے کے جا اندھیرا ہوا

اب نامی کے کلام کے متعلق چند باتیں قابل ذکر ہیں۔ دکھنی مثنویوں کا عام دستور رہا ہے کہ وہ حمد و نعت اور منقبت وغیرہ کے بعد اپنے بادشاہ کی ضرور مدح کرتے ہیں مگر اس مثنوی میں رئیس وقت کی تعریف نہیں ہے۔ حالانکہ نامی کو دربار ارکاٹ سے خاص تعلق تھا اور وہ ملک الشعرا کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس خصوص میں نامی نے اپنے اُستاد آگاہ کی پیروی کی ہے۔ کیونکہ ان کی مثنویوں میں بھی باوجود دربار کے تعلق کے بادشاہ کی مدح نہیں ہے۔ حتیٰ کہ اُنہوں نے کوئی قصیدہ بھی بادشاہ کی تعریف میں نہیں لکھا ہے۔

شمالی ہند میں طویل مثنویاں کم لکھی گئی ہیں۔ مگر اس کے برخلاف دکن میں عام طور پر ایک شاعر کوئی نہ کوئی مثنوی ضرور لکھتا تھا۔ یہ مثنویاں دو قسم کی ہوتی تھیں۔ یا تو وہ کسی فارسی قصہ کا ترجمہ ہوتیں یا مصنف کی دماغی اپج۔ نامی کی مثنوی کسی فارسی مثنوی کا ترجمہ نہیں ہے، بلکہ میرا خیال ہے کہ غالباً فارسی میں بھی کسی نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے قصہ کو نظم نہیں کیا ہے۔ اس حیثیت سے گویا یہ مصنف کی اپنی جدت اور اپج ہے۔

نامی کے زمانہ میں اُردو شاعری کی جو حالت تھی اس کا تذکرہ قبل ازیں کیا گیا ہے مگر نامی کی شاعری بالکل علیحدہ نظر آتی ہے۔ اس میں سادگی، صفائی اور اصلیت پائی جاتی ہے۔ تصنع اور مبالغہ نہیں ہے۔ لکھنؤ کی طرح ارکاٹ میں بھی شاعری فقرا اور صوفیا سے نکل کر امرا اور رؤسا میں پہنچ چکی تھی مگر اس کے باوجود اس میں اسکی قدیم خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ اس کے اکثر اشعار نظم نہیں بلکہ نثر معلوم ہوتے ہیں۔ کلام کی متانت اور ثقاہت میں فرق نہیں آیا۔ مثلاً شب زفاف کا بیان کس قدر مہذب پیرایہ میں بیان کیا ہے:۔

زبس طاقت صبر سب کھو گئی — جو ہونے کی تھی بات سو ہو گئی
محبت کے مارے حجاب اُٹھ گیا — مثل ہے میاں کو نہیں ہے حیا
خزانے کے گر بیچ بیٹھا ہے چور — کیا موج طوفاں نے کشتی پہ زور
ہوا پردۂ شرم سب تار تار — کیا چاک گلبرگ کو ضرب خار
ہوا نخل اُمید کا بار ور — صدف کو کیا ابر نے بارور
کیا مہر جاں پرور اپنا عمل — ہوا حامل ماہ برج حمل

معلوم ہوتا ہے کہ اِس زمانہ میں شمالی ہند میں اُردو نظم کو عام طور سے ریختہ کہا کرتے تھے اور

دکھنی زبان اور شمالی ہند کی زبان میں فرق کہا جاتا تھا۔ چنانچہ نامی نے مثنوی کے خاتمہ پر ان امور کو بھی نظم کیا ہے:-

ہے اِس مثنوی کی زباں ریختہ ۔ عرب اور عجم سے ہے آمیختہ
نہیں ہے صرف اُردو مگر ہے عیاں ۔ زبان سلیمان ہندوستاں
اگر بولتا ٹھیٹھ ہندی کلام ۔ تو بھاتا تھا وہ پر بیوں کا تمام
زبانِ دکن میں نہیں میں کہا ۔ کہ ہے وہ زباں بھی نپٹ سے جدا
جو دیکھا کہ اوسط ہے خیرالامور ۔ کیا اختیار اس کو میں بالضرور

مثنوی کا خاتمہ تاریخی اشعار کے بعد حسب ذیل دو شعروں پر ہوا ہے:-

یہ تاریخ دونوں کہا جو بیاں ۔ ہے آغاز و انجام اس سے عیاں
اب یہ نظم کرتا ہوں میں اختتام ۔ بنام محمد علیہ السلام

اس تفصیل سے سلیمان نامہ کی وضاحت کے ساتھ نامی کے کلام کا بھی اندازہ ہو سکتا ہے۔ اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ نامی اپنے زمانہ کا نامور اور بلند پایہ شاعر تھا۔

# ارشادات

از جناب شاہ ولی الرحمٰن۔ ایم۔ اے

عقل ہو کیوں نہ دم بخود چشمِ فسوں طراز سے ۔ گرتی ہیں لاکھوں بجلیاں ہر مژۂ دراز سے
ڈر کے وہ چونک چونک اُٹھے رات کو خوابِ ناز سے ۔ سخت خجل ہیں اپنے ہم نالۂ دل گداز سے
عشق نہ کیوں ہو زاہدو اُس بُتِ پاکباز سے ۔ جلوۂ حق ہے آشکار حسنِ رُخِ مجاز سے
عشق پہ میرے زاہدو خندہ زنی روا نہیں ۔ دل کو ازل سے ربط ہے حسن جنوں نواز سے
اشک نہ بہنے پائیں اب بزمِ عدو میں چشمِ تر ۔ بہر خدا خجل نہ کر عشق کرشمہ ساز سے
زخمِ دلِ فگار کا اب تو علاج ہے محال ۔ بڑھ گئی اور بھی خلش مرہمِ چارہ ساز سے
اُٹھ گئے خفتگانِ خاک شورِ نشور سے مگر ۔ اُٹھ نہ سکی جبینِ شوق خاکِ رہِ نیاز سے
دونوں جہاں سے بے نیاز ہو گئے تجھ سے ملکے ہم ۔ عشق نے پھیر دی نظر عشوۂ حرص و آز سے
میکدۂ طلسم ہے نرگسِ پُر خمارِ یار ۔ بزم کی بزم مست ہے جامِ نگاہِ ناز سے

حسرت و یاس کا ہے آہ پھر وہی سامنا ولی
کام نکل سکا نہ کچھ نالۂ عرش تاز سے

# خمستانِ حافظ

حُسن کی اِک "سادگی" تھی ہر طرف چھائی ہوئی
میری نظروں میں سما کر جانِ رعنائی ہوئی

دیکھ کر نازک لبوں پر "برق لہرائی ہوئی"
"آئینہ میں بن گیا" دُنیا تماشائی ہوئی

حُسن کی وہ "سحر نگاہ" "بادہ آگیں" "الاماں"
آج تک ہے عشق پر اِک بیخودی چھائی ہوئی

بادیہ پیما تھا دل بھی لے جنوں یادش بخیر
آرہی ہے "دُور سے" آواز "تھرائی ہوئی"!!

زندگی کی موج دوڑی پیکرِ خاموش میں
گر پڑی جب طورِ دل پر برق لہرائی ہوئی

میں "حریصِ دید" ہوں، "تم جانِ نوازِ آرزو"
"تم جو چاہو" کیوں رہے پھر آنکھ للچائی ہوئی

کچھ وہی سمجھے وہی جانے "مآلِ عاشقی"
جس کا دل تڑپا ہوا ہو "روح تڑپائی ہوئی"

یاد ہے ہاں یاد ہے "بیداریِ حُسنِ ازل"
اور وہ "اک نیند" جو ہر شے پہ تھی چھائی ہوئی

"جل کے مرنا سہل" "ضبطِ سوزِ غم" کارِ اہم
کس طرح کوئی دبائے "آگ بھڑکائی ہوئی"

"اللہ اللہ" کثرتِ احساس" کا طرفہ اثر
لوگ یہ سمجھے کہ حاصل مجھ کو "تنہائی" ہوئی

حُسن کا ہر رنگ ہے "آوارۂ طرزِ نظر"
بلبلِ وارفتہ کیوں گل کی "تمنائی" ہوئی

آچلا تھا "اُن" پہ الزامِ جفا حافظ مگر
خیریت گذری جو "میرے" دل کی رسوائی ہوئی

حافظ غازیپوری

# تاریکی

از حضرت محسنہ عابدی بی۔ اے

گے گن کی ناک میں ایک مکھی گھس گئی، پتہ نہیں کہ وہ اتفاق سے ناک میں گھس گئی یا تاریکی کی وجہ سے کسی طرح چلی گئی۔ بہرکیف ناک نے انتہائی غصہ میں چھینکنے کی اطلاع کر دی۔ گے گن نے چھینکا اور کئی بار چھینکا اور اس قدر زور زور سے چھینکا کہ سارے بستر میں زلزلہ آگیا۔ گے گن کی بیوی میہ یامی ہاکونا بھی، جو متناسب الاعضاء اور قبول صورت خاتون تھی، چونک پڑی، اور اٹھ بیٹھی۔ اس نے اندھیرے میں آنکھیں گڑا کر دیکھا۔ ایک لمبی سانس کھینچی اور دوسری طرف کروٹ پھیر لی۔ پانچ منٹ کے بعد اس نے پھر کروٹ لی۔ اور آنکھیں خوب زور سے بند کر لیں۔ لیکن پھر اس کو نیند نہ آئی۔ تھوڑی دیر تک لمبی لمبی سانسیں لیتی رہی اور پھر اٹھ بیٹھی۔ پہلے شوہر کے پاس پہنچی اور پھر وہاں سے سلیپر پہنکر کھڑکی کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔

باہر چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی چھائی ہوئی تھی، سوائے درختوں کے دھندلے جھنڈ اور اصطبل کی چھتوں کے اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ ہوا بالکل ساکت تھی اور نیند اور تاریکی سے معمور، حتیٰ کہ سنتری بھی جو رات کے سکوت میں خلل انداز ہونے کے لئے تنخواہ پاتا ہے خاموش تھا۔

اس ہیبتناک طلسمی سکوت کو خود میہ یا نے توڑا۔ کھڑکی کے سامنے کھڑے ہو کر اور دالان میں دیکھتے ہوئے اُس نے ایک چیخ ماری، اس نے خیال کیا یا تصور میں دیکھا کہ صحن باغ سے ایک سیاہ مجسمہ گھر کی طرف بہت آہستگی سے حرکت کر رہا ہے، پہلے تو اس نے سوچا کہ یہ کوئی گھوڑا یا گائے ہے، پھر اس نے اپنی آنکھوں کو ملکر دیکھا۔ اور اس کو صاف طور پر ایک آدمی کا خاکہ نظر آیا۔

پھر اُس نے یہ سوچا کہ وہ سیاہ مجسمہ باورچی خانہ کی کھڑکی کے پاس پہنچ گیا، اور ایک لمحہ تک خاموش کھڑے رہنے کے بعد کھڑکی پر ایک پیر رکھا اور تاریکی میں غائب ہو گیا۔

"ایک نقب زن" اس کی آنکھوں میں پھر گیا۔

دوسرے ہی لمحہ اُس کے خیالات نے ایک ڈراونی تصویر پیش کی۔ ایک نقب زن آتا ہے۔ باورچی خانہ [illegible] آتا ہے ― وہاں سے طعام کے کمرہ میں جاتا ہے ― الماری میں چاندی ہے ― خوابگاہ سے ملے ہوئے کمرہ میں ― ایک کلہاڑی ― ایک بدمعاش کا چہرہ ― زیورات ― اس کے تمام جسم میں کپکپی پیدا ہو گئی" داسیا [illegible]س نے اپنے شوہر کا شانہ پکڑ کر ہلاتے ہوئے کہا" باسیل۔ ویسیلی ہیرد کووچ ― آہ ہم پر رحم کرو، ممکن ہے وہ مر چکا ہو۔ اٹھو [illegible] میں میں التجا کرتی ہوں"

"اچھا!" شوہر نے اندر ہی ایک سانس بھرتے ہوئے گنگنا کر کہا۔

"خدا کے لئے جاگو، ایک بدمعاش باورچی خانہ میں گھس گیا ہے۔ میں کھڑکی کے سامنے کھڑی ہوئی باہر دیکھ رہی تھی کہ کوئی شخص کھڑکی میں داخل ہوا۔ وہ اب طعام کے کمرے میں بھی جائیگا۔ چمچے الماری میں۔ باسیل وہ گذشتہ سال "مورا یوگوروناؔ" کے گھر میں آئے تھے۔"

"ک ـــ کیا قصہ ہے؟"

"خدا کی پناہ، اس کی سمجھ ہی میں نہیں آتا ـــ سنو او ڈرپوک، میں تم سے کہتی ہوں کہ میں نے ابھی ایک آدمی کو باورچی خانہ کی کھڑکی میں جاتے ہوئے دیکھا ہے۔ تلیمی ڈر جائے گی اور ـــ اور چاندی الماری میں رکھی ہے۔"

"بیہودہ ـــ لغو ـــ مہمل۔"

"باسیل، یہ امر ناقابلِ برداشت ہے۔ میں تم سے ایک حقیقی خطرہ کا ذکر کر رہی ہوں اور تم سوتے ہو۔ تم کیا چاہتے ہو؟ کیا تم چاہتے ہو کہ ہم لٹ جائیں، قتل کر ڈالے جائیں؟"

گےگن آہستہ سے اٹھکر بیٹھ گیا اور زور زور سے منہ پھیلا پھیلا کر جمائیاں لینے لگا۔

"خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ عورتیں کس قسم کی مخلوق ہیں؟" وہ بڑبڑانے لگا "رات کو بھی ایک آدمی کو چین سے نہیں سونے دے سکتیں۔ ایک آدمی کو ان بیہودگیوں کے لئے جگایا جاتا ہے۔"

"لیکن باسیل، میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں نے ایک آدمی کو کھڑکی میں جاتے دیکھا ہے۔"

"تو پھر کیا ہوا؟ اس کو جانے دو۔ یقیناً وہ تلیمی کا شیدائی ہوگا ـــ وہی فائرمین!"

"کیا، تم نے کیا کہا؟"

"میں کہتا ہوں کہ وہ تلیمی کا فائرمین ہے جو اس کو دیکھنے کے لئے آیا ہے۔"

"ہمیشہ سے زیادہ بدتر" میریا نے جھنجھلا کر کہا "یہ امر تو ایک نقب زن سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہے۔ میں اس گھر میں سنکی مزاجوں کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔"

"اوہو ـــ ہم بہت خوش قسمت ہیں۔ سنکی کے ساتھ نہ رہیں گے، جیسے کہ یہ سنک ہے۔ ان غیر ملکی الفاظ کے استعمال سے کیا فائدہ؟ میری عزیز بیوی، دنیا جب سے شروع ہوئی ہے اس وقت سے ہمیشہ یہی ہوتا رہا ہے، فائرمین کا اور کام ہی کیا ہو سکتا ہے۔"

"نہیں باسیل، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم مجھ کو نہیں جانتے ہیں اس قسم کے خیال کا ...... ایسے نیبال کا اپنے گھر میں ...... تم کو فوراً باورچی خانہ میں جا کر اس کو نکال دینا چاہیئے۔ ابھی [illegible] کھڑکی [illegible] کہونگی کہ وہ اس قسم کی کمینہ حرکتوں میں نہ پڑے ـــ میرے مرنے کے بعد تم اس قسم کی بد [illegible] کو [illegible] میں جہنم لینے دینا۔ لیکن ابھی میری موجودگی میں تم ایسا نہیں کر سکتے۔ بعد باؤ۔"

"بھاڑ میں جائے۔" گےگن بڑبڑایا۔ "ذرا اپنے چھوٹے نسائی دماغ سے سوچو بھی تو۔ کہ آخر [illegible]

جاؤں؟"

"ہاں سیل، میں بیہوش ہو جاؤں گی۔"

گے گن نے کوستے ہوئے جوتیاں پہنیں، پھر کوستا ہوا باورچی خانہ کی طرف چلا۔ تاریکی تہ خانہ سے زیادہ تھی۔ اور اُس کو اپنا راستہ ڈھونڈنا پڑ رہا تھا۔ وہ دروازہ کے راستہ پر چلنے لگا اور آخر وہاں پہنچ کر نرس کو جگایا۔

"ویسی لیسا" وہ بولا "تم نے کل رات کو میرا گون صاف کرنے کے لئے لیا تھا وہ کہاں ہے؟"

"جناب میں نے اُسے پیچی کو صاف کرنے کے لئے دیا تھا۔"

"بے پروائی کی انتہا ہے، تم نے تو لیا، مگر واپس لا کر کیوں نہ رکھا۔ اب مجھے بغیر گون کے جانا پڑے گا۔"

باورچی خانہ کے پاس پہنچ کر وہ کونے کی طرف گیا جہاں ایک صندوق کے اوپر ماما سو رہی تھی۔

"پیچی!" اس نے پیچی کا شانہ ہلاتے ہوئے کہا "پیچی تو بہانہ کیوں کر رہی ہے، تو سو نہیں رہی ہے، ابھی کھڑکی میں سے کون آیا تھا؟"

"اوہ ۔۔۔ تسلیم عرض ۔۔۔ کھڑکی میں سے ۔۔۔ کون آسکتا ہے؟"

"ہوں ۔۔۔ آیا ہے۔ اس بات کو چھپانے کے لئے تمہاری کوششیں بیکار ہیں۔ تم اپنے شیدائی سے کہو کہ وہ یہاں سے فوراً چلا جائے۔ سنتی ہو؟ اُس کو یہاں رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔"

"معاف کیجیے جناب! کیا آپ اپنے ہوش میں بھی ہیں؟ کیا آپ کا خیال ہے کہ میں ایسی بیوقوف ہوں؟ اچھا تماشہ ہے۔ دن بھر تو دوڑتے دوڑتے ٹانگیں ٹوٹ جائیں، ایک لمحہ کو بیٹھنا نصیب نہ ہو اور رات کو پھر مجھ پر یہ تہمت لگائی جائے۔ ماہانہ چار روبل، اس پر طرہ یہ کہ میں چائے اور شکر اپنے پاس سے خرچ کروں، اور اس کا صلہ مجھے یہ مل رہا ہے۔ میں ایک سوداگر کے گھر میں رہتی تھی لیکن وہاں کبھی میری ایسی توہین نہیں کی گئی۔"

"اچھا، رہنے دو اس تفصیل کو۔ بس ۔۔۔ اسی وقت یہاں سے تمہارے دوست کو چلا جانا چاہیے۔ سمجھا تم نے؟"

"آپ کو شرم آنی چاہیے، جناب!" پیچی بولی ۔۔۔ وہ اُس کے آنسوؤں کے بہنے کی آواز کو اچھی طرح سن رہا تھا۔ "شریف لوگ ۔۔۔ تعلیم یافتہ ۔۔۔ اور اتنا بھی خیال نہیں۔ اس محنت اور مشقت میں۔ اس بدنصیبی [illegible] پڑتی ہے۔ ہماری توہین کرنا بہت آسان ہے، کیونکہ ہمارا کوئی والی اور وارث نہیں ہے۔"

"شور، چپ رہو، دیکھو۔ مجھے تو اس کا کوئی خیال نہیں ہے، تمہاری بیگم صاحبہ نے مجھے بتایا تھا۔ تم کھڑکی میں سے شیطان کو بھی بلالو تو مجھے کوئی پروا نہیں ہے۔"

گے گن کو اپنی غلطی کے اعتراف کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ اور وہ اپنی بیوی کے پاس واپس جانے لگا۔

"پلیجی — میں کہتا ہوں کہ —" وہ بولا "تم نے میرا گون صاف کرنے کے لئے لیا تھا وہ کہاں ہے؟"

"اوہ، مجھے اُس کا بہت افسوس ہے جناب، میں اُسکو آپ کی کرسی پر رکھنا بھول گئی، وہ چولھے کے قریب ایک کھونٹی پر ٹنگا ہے"

گےگن نے چولھے کے قریب ہاتھ بڑھا کر گون کو تلاش کیا اور اُس کو پہن کر خاموشی کے ساتھ کمرہ کی طرف چلا گیا۔

جب اُس کا شوہر چلا گیا تو میریا اپنے بستر پر لیٹ کر انتظار کرنے لگی۔ پہلے تین منٹ تک تو اُس کا دماغ ساکن رہا لیکن پھر بے چین ہونے لگا "اس کو جا کر کتنی دیر ہو گئی" اُس نے سوچا "اگر وہ وہاں ہے تو خیر ٹھیک ہے — بد اخلاق آدمی — لیکن اگر وہ نقب زن ہے — ؟"

لیکن پھر اُس کے خیالات نے اُس کے شوہر کی تصویر لا کر سامنے پیش کر دی کہ جیسے کہ اُس کا شوہر تاریک باورچی خانہ میں گیا — کلہاڑی کا وار ہوا — بغیر کسی چیخ پکار کے مر رہا ہے — اور خون کا ایک چشمہ رواں ہے —!

پانچ منٹ گذر گئے — ساڑھے پانچ اور پھر چھ — اُس کی پیشانی عرق آلود ہو گئی۔

"باسیل!" وہ چلانے لگی "باسیل!"

"کیوں چلا رہی ہو؟ میں یہاں ہوں"

اُس نے شوہر کی آواز اور قدموں کی چاپ سُنی۔

"کیا تم قتل کئے جا رہے ہو؟"

گےگن بستر کی طرف گیا اور اُس پر بیٹھ گیا "وہاں کوئی نہیں ہے" اُس نے کہا "یہ محض تمہارا خیال تھا۔ او عجیب الخلقت — یہ محض تمہارا خیال تھا۔ اب تم چین سے سو سکتی ہو — پلیجی کا بیوقوف آدمی اتنا ہی اچھا ہے جتنی اُس کی مالکہ — تم کیسی ڈرپوک ہو گئیں؟"

اور گےگن اپنی بیوی کو چھیڑنے لگا۔ وہ اب پوری طرح بیدار ہو چکا تھا۔ اور اب پھر سونا نہ چاہتا تھا "تم بڑی بزدل ہو" وہ بولا "بہتر ہے کہ تم کل ڈاکٹر کے پاس جا کر اُس سے اپنے اِن وہموں کا علاج کراؤ — سنتی ہو، تم ایک وہمی ہو!" وہ مسکرانے لگا۔

"یہ کس چیز کی بو ہے" اُس کی بیوی نے کہا "کوئی چیز — پیاز — گوبھی کا سالن —"

"ہاں خوشبو تو ہے — میں سو نہیں رہا ہوں — مگر موم بتی کہاں ہے، اور دیا سلائی؟ اور ساتھ ہی ساتھ میں تم کو قصر عدل کے خادم کی تصویر بھی دکھلاؤں گا۔ اُس نے ہم کو ایک تصویر دی تھی کل جاتے وقت، جب وہ خدا حافظ کہہ رہا تھا۔ اور اُس کے دستخط بھی ہیں"

گےگن نے دیا سلائی دیوار سے رگڑی اور موم بتی جلائی۔ لیکن بستر سے ایک قدم آگے بڑھنے سے قبل

اُس نے اپنے پیچھے ایک جگر سوز چیخ سنی اور پھر کر دیکھا۔ اُس کی بیوی متعجب، خوفزدہ اور غضبناک آنکھوں سے گھور رہی تھی۔

"تم نے اپنا گون باورچی خانہ میں اُتار ڈالا؟" اُس نے غمگین ہو کر کہا۔

"کیوں؟"

"اپنے آپ کو دیکھو"

گے گن نے اپنے اوپر نظر ڈالی۔

اُس کے جسم پر اُس کا گون نہیں بلکہ فائرمین کا لبادہ پڑا ہوا تھا۔ وہ اُس کے شانوں پر کس طرح پہنچ گیا ـــــ؟ جب کہ وہ اس معمہ کو حل کرنے میں مصروف تھا، اُس کی بیوی کے خیالات ایک اور ناممکن اور دہشتناک تصویر کھینچ رہے تھے۔ اندھیرا ـــــ سکوت ـــــ سرگوشیاں وغیرہ وغیرہ۔

(چیخوف)

# غزل

عشق میں شمع صفت اُن کے وفاکوش رہے
آتشِ غم سے جلے، جلنے پہ خاموش رہے

خم پہ خم مجھ کو پلا، اور پلا اور پلا
ساقیا مدِ نظر ظرفِ قدح نوش رہے

مستیٔ بادہ میں ہے جلوۂ ساقی بھی شریک
ایسی صورت ہو تو فرمائیے کیا ہوش رہے

اور کیا بادہ کشوں کی ہے دُعا، یہ ہے دُعا
عہدِ ساقی رہے دورِ مۓ سرجوش رہے

رند ہوں عشرتِ امروز مبارک ہو مجھے
دشمنِ عیش جو ہو، محوِ غمِ دوش رہے

اب تو ٹھانی ہے یہ دل کھول کے فریاد کریں
تاکہ تا چند خلافِ لبِ خاموش رہے

سعیِ پیہم کی قسم ڈھونڈھ ہی لیں گے تجھے ہم
غیر ممکن ہے کہ تو آنکھ سے روپوش رہے

تیرے قربان اُٹھا دیکھ، ذرا رُخ سے نقاب
ہوش کے معنی ہیں ممکن ہی نہیں ہوش رہے

صفتِ سبزۂ روئیدہ ہوئے ہم پامال
اور اُف تک بھی نہ کی دیکھ لو خاموش رہے

[illegible] وقت کی لازم ہے کوئی اے مطرب
نغمۂ عہدِ کہن دل سے فراموش رہے

تا بمرگ اُن کے تصور سے رہا کام نہالؔ
عمر بھر بادۂ توحید سے مدہوش رہے

نہالؔ سیوہاروی

# کوہسار کا گلِ رنگیں

اے گلِ دلکش! دل و جانِ عروسِ کوہسار
نقشِ دل آویزِ دامانِ عروسِ کوہسار!

حسن کا پیکر ہے تو، اور جانِ رعنائی ہے تو
چشمِ بینا کیلئے تصویرِ زیبائی ہے تو!

شعلۂ سوزاں میں تجھکو اے گلِ احمر کہوں
یا شرابِ سرخ سے لبریز اک ساغر کہوں

جلوہ گسترِ شاخ پر موسیقیٔ رنگیں ہے تو!
بہرِ شاعر شوخیٔ رخسارِ حورِ عین ہے تو!

نیلگوں پھولوں میں آتا ہے نظر تو اس طرح
آسماں پر شام کو خونِ شفق ہو جس طرح

اک جہانِ جاذبیت ہے مجھے پیکر ترا
چھین لیتا ہے میرے پہلو سے دل منظر ترا

تجھ میں قدرت نے بھری ہیں سربسر رنگینیاں
تیری پتی پتی میں ہیں جلوہ گر رنگینیاں!

آہ لیکن تیرا پیکر بو فشاں اے گل نہیں
تجھ سے دامانِ فضا نکہتستاں ای گل نہیں

گلشنِ ہستی پہ جب طاری ہو افسونِ سکوت
چار سو رقصاں ہوں تاریکی کے ہیبت خیز بھوت

خامشی قابض ہو جوئے و قلزم و کہسار پر
بیخودی سی ہو مسلط دشت اور گلزار پر

دستِ گردوں میں شفق کا اک چھلکتا جام ہو
روئے ہستی پر ردائے تیرگیٔ شام ہو

دلنشیں اُس دم بہت ہوتی ہے رعنائی تری
اک عجب منظر دکھاتی ہے یہ زیبائی تری

غرقِ کیفِ بیخودی انساں کو کر دیتا ہے تو
گوشۂ دل حسن کی جنت سے بھر دیتا ہے تو

جھلملاتے ہیں نظر کے سامنے انوارِ حسن
دستِ قدرت کھول دیتا ہے درِ اسرارِ حسن

میرزا ادیب

# غلام کا خواب

## The Slave's Dream

از جناب سید مقبول حسین احمد پوری بی اے

یہ مشہور نظم امریکن شاعر Longfellow نے حبشی غلاموں کی ہمدردی میں لکھی تھی۔ اسکی مقبولیت کا یہ نمایاں ثبوت ہے کہ ہر اُس ملک میں جہاں انگریزی زبان کا کچھ بھی رواج ہے یہ نظم نصاب تعلیم میں رکھی گئی ہے۔ اس نظم سے شاعری کی اُس قوت کا اظہار ہوتا ہے جو ہر قسم کے تمدن پر بطور ضابطۂ اخلاق جذبات مرحمت پیدا کرنے میں اپنی طاقت اور اہمیت کا اظہار کرے۔

نظم میں جو نتیجہ شاعر نے اخذ کیا ہے اور جس پہلو سے اُسکو ظاہر کیا ہے وہی پہلو شاعری کی اخلاقی طاقت ہو۔ آخری سطور یہاں لکھی جاتی ہیں:

*He could not feel the driver's whip*
*Nor the burning heat of day,*
*For death hath illumined the land of sleep*
*And his lifeless body lay*
*A worn out fetter that the soul*
*Hath broken and thrown away!*

اِن سطور کا مضمون بہت سی باتوں کی طرف اشارہ کرتا ہے جن کے اظہار پر شاید مؤرخ کا قلم بھی کانپنے لگے۔ مثلاً یہ کہ جب کوئی غلام سوتا ہوتا تو اُسکو جگایا نہ جاتا بلکہ زور سے اُسپر چابک لگائی جاتی اور وہ تلملا کر اُٹھ بیٹھتا (یا مر جاتا جیسا کہ نظم والا غلام مر گیا)۔

لانگ فیلو نے جس غلام کا ذکر اپنی نظم میں کیا ہے وہ خواہ فرضی ہی کیوں نہو نہایت کامیاب تمثیل ہے۔ شاعر نے جذبات کو برانگیختہ کرنے کے لئے اُسے بادشاہ ظاہر کیا ہے کیونکہ دریائے نائیجر کے کنارے As a king he strode بہ حیثیت بادشاہ کے چلا جا رہا تھا۔ اِس نظم کا ترجمہ تصرف کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔

ناظرین توافی کی بے ترتیبی کو معاف فرمائیں۔

(۱)

سوگیا کھیت کے کنارے پر
ہاتھ رکھے ہوئے کٹارے[1] پر
گرد میں بال اَٹے کھلا سینا
بدتر از مرگ ہوگیا جینا
دُھندلی دُنیا میں خواب کی سویا
اُس نے دیکھا وطن میں ہوں گویا

(۲)

ویسے ہی ریت[2] کے بیاباں میں
نائیجر[3] بہہ رہی ہے میداں میں
وہ کھجوروں کے جھنڈ میں ہوکر
جا رہا ہے سوار گھوڑے پر
ساربان کو سُنا حُدی گاتے
اور گھاٹی[4] سے کارواں آتے

(۳)

اور دیکھا کہ گھر میں ہے اپنے
خانم آئی ہے ساتھ بچوں کے
کوئی ٹانگوں سے آ لٹکتا ہے
اور کوئی گلے لپٹتا ہے
سونے والے کی آنکھ سے قطرا
گرم آنسو کا پھوٹ کر نکلا

(۴)

خود کو دریا کی سمت لوٹا پایا
اپنے گھوڑے کو خوب دوڑایا
جسکے مُنہ میں طلا کی تھی زنجیر[5]
اور ترکش میں بج رہے تھے تیر
میان[6] پہلو سے جبکہ لگتا تھا
شان سے وہ سمند اُچھلتا تھا

[1] کٹارہ یا کٹار بمعنی وہ اوزار جس سے کھیت کاٹا جاتا ہے۔ عام طور پر اُسکو ہنسیا کہتے ہیں یہ ہلال یا انگریزی علامت استفہام ؟ کی طرح خمیدہ ہوتا ہے۔ [2] ـــ [3] نائجر ندی جو مغربی افریقہ کے جنوبی حصہ میں بہتی ہے اُس کے بہاؤ کی شکل اُردو ہندسہ (۸) سے مشابہ ہے۔ [4] دو پہاڑوں کے بیچ میں جو ڈھلوان راستہ ہوتا ہے اُسکو گھاٹی کہتے ہیں۔ [5] یعنی لگام۔ [6] تلوار کا میان جو گھوڑے کے پہلو سے لگ کر ایک شاندار آن پیدا کرتا ہے۔

(۵)

سامنے کچھ کلنگ اُڑتے تھے
جو درختوں پہ آن گرتے تھے
جب وہ میدان سے بڑھ آگے
قوم کافرؔ کے گھر نظر آئے
جھٹپٹا وقت شام کا چھایا
بحرِ ظلماتؔ سامنے آیا

(۶)

رات کا وقت ببر دھاڑتے تھے
اور ہاتھی کہیں چنگھاڑتے تھے
اور نیستاں سے اسپِ آبیؔ کے
پیر اور سر دکھائی دیتے تھے
رعبِ نظارہ ہر طرف چھایا
خواب میں جشن سا نظر آیا

(۷)

جنگلوں سے صدائیں آتی تھیں
نغمۂ حریتؔ سُناتی تھیں
تُند جھونکے ہوا کے چلتے تھے
اور بگولے کہیں مچلتے تھے
سونے والا ابھی نیند میں چونکا
جوشِ فطرت پہ مسکرا اُٹھا

(۸)

اب نہیں چابکوں کا ڈر اسکو
دھوپ سے بھی نہیں ضرر اسکو
زندگی بھر رہا جو پا اُفتاد
موت نے کر دیا اُسے آزاد
ایک کہنہ قفس تھا جسم اُسکا
روح نے توڑ کر الگ پھینکا

لہ افریقہ کی ایک قوم جو مسلمانوں سے پہلے ( [illegible] ) میں آباد تھی، مسلمان ہونے پر بھی یہ لوگ "کافر" ہی کہے گئے، اب بہتیرے عیسائی بھی ہیں۔ ؎۲ اس سے مطلب رات کی تاریکی نہیں، بلکہ (Atlantic Ocean) جسکو اب بحر اطلانتک بھی کہتے ہیں۔ ؎۳ (Hippopotamus) ؎۴ (Song of Liberty)

# کھال میں مست

از جناب مرزا عبد الحمید بیگ صاحب بی، اے، بی، ٹی (علیگ)

آسائشِ دو گیتی تفسیر این دو حرف است
با دوستان تلطف با دشمنان مدارا!

فلاسفر بالعموم ہر شے کو اس کے انتہائی کمال میں دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں حتیٰ کہ وہ زندگی کو بھی اُس کی آئیڈیل صورت میں دیکھنا چاہتے ہیں جس کے لئے اُنہوں نے چند اصول بھی مقرر کر دیئے ہیں۔ اور یہ توقع کرتے ہیں کہ واقعاتِ زندگی ان ہی اصولوں کے تحت رُونما ہونگے۔ مگر سچ پوچھو تو آئیڈیل زندگی ہماری روزمرہ زندگی سے بہت مختلف ہے۔ قُدرت پھر قدرت ہی ہے، حضرتِ انسان اُس پر کتنا ہی قابو جمانا چاہیں بھلا وہ کیا بس میں آنیوالی شے ہے۔ فلاسفر ہزار اصول مقرر کریں۔ مگر زندگی میں واقعات ان اصولوں کے خلاف رُونما ہو ہی جاتے ہیں اور فلاسفر بیچارے مُنہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔

اِس مضمون کے حصہ اوّل میں زندگی کے متعلق ہم نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے ممکن ہے اُن کی نسبت بھی بعض حضرات یہ خیال کر لیں کہ یہ کسی فلاسفر کے ناممکن العمل اصول اور یا کسی مجذوب کی بڑ ہے اور روزمرہ کی زندگی سے اس کو کوئی نسبت نہیں۔ مگر نہیں۔ ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ وہ خیالات نہ شاعرانہ تخیل ہیں اور نہ کسی مجذوب کی بڑ۔ بلکہ اُس کی بنیاد ایک ایسے جیتے جاگتے انسان کی زندگی کے عملی تجربہ پر قائم ہے جو دنیا کے گرم و سرد سے واقف ہو چکا ہے۔ جس نے آرام و چین کی زندگی بھی بسر کی ہے اور محنت سے سخت وقت بھی کاٹا ہے۔

بات یہ ہے کہ ہماری طبیعتوں میں اِس قدر کمزوری پیدا ہو گئی ہے کہ جو شے بھی ہماری آرام طلبی کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرتی ہے ہم اس کو ناممکن العمل سمجھنے لگے ہیں۔ ہمارا دل قوتِ مقاومت سے بالکل عاری ہو گیا ہے اور ہم کبھی ان رکاوٹوں کو دُور کرنے کا خیال بھی اپنے دل میں نہیں لاتے۔ اگر آپ شاید یہ پوچھیں کہ آخر اس کمزوری کی وجہ؟ تو ہم نہایت بیباکی سے یہ کہنے کے لئے تیار ہیں کہ ہمارے پورے سماج کی جڑ بنیاد کو کھوکھلا کرنے کی بیشتر ذمہ داری اگر کسی گروہ پر ہے تو وہ اوّل تو اُن نازک مزاج لوگوں کا ہے جو گھر بیٹھے نادیدہ معشوق کی زلفِ پیچاں میں پھنسکر صحرا نوردی اور بادیہ پیمائی کرتے کرتے اس طرح آبلہ پا ہو جاتے ہیں کہ اُنہیں اپنی خیالی دُنیا سے نکل کر عملی دُنیا میں قدم رکھنے کی بھی ہمت نہیں ہوتی۔ اور وہ بیچارے بیٹھے ہی بیٹھے نفس کے جھونکوں کے ساتھ گرد و غبار کی طرح اُڑتے چلے جاتے ہیں، وہ اپنا فریضہ بس یہی سمجھتے ہیں کہ اپنی وفا اور

یار کی بیوفائی کی داستانیں سُنا سُنا کر نئی پود کے جذبات اس طرح بھڑکائیں کہ وہ بھی اُن کے نقشِ قدم پر چلنے لگیں۔ جب ذہنی اضمحلال کی یہ کیفیت ہو تو اس کا جو اثر جسمانی جدوجہد پر پڑیگا وہ ظاہر ہے۔ اس کے بعد بھلا بیچاری قوم میں مقاومت کی طاقت کہاں سے آئیگی۔

اس کے بعد ہماری پستی اور کمزوری کا ذمہ دار اگر کوئی دوسرا گروہ ہے تو وہ ان قابل قدر ہستیوں کا ہے جو اپنا پیٹ بھرنے کے لئے دوسروں کی کمائی پر تکیہ کرنے کے عادی ہوگئے ہیں، یہ لوگ تقدیر کے قائل ہیں اور تقدیر کے معنی یہ سمجھتے اور سمجھاتے ہیں کہ ہاتھ پر ہاتھ رکھکر بیٹھے رہو اللہ چھپر پھاڑ کر دیگا۔ ذرا غور تو فرمائیے کہ جس قوم کی نئی پود کو ایک طرف تو یار کے فراق میں گھُل گھُل کر مرجانیکی تعلیم، دوسری طرف مُفت خوری کی تلقین ہو تو وہ قوم کمزور نہ ہوگی تو کیا ہوگا، اور اس میں مُحنت و مشقت کرنے کی عادت کہاں سے آئیگی۔

یقین مانئے کہ اسی تعلیم و تلقین کا نتیجہ ہے کہ ہمارے دل قوتِ مقاومت سے عاری ہوگئے ہیں۔ اور ہم اپنے ماحول کی تربیت کی بدولت اس قدر کمزور ہوگئے ہیں کہ زندگی کے معمولی سے معمولی واقعہ کو بھی مصیبت سمجھکر زبردستی مصروفِ گریہ ہوجاتے ہیں۔ اور بالبعض اوقات ایسے وہمی خطرات کی مصیبت برداشت کرتے رہتے ہیں جن کا دراصل کوئی وجود ہی نہیں ہوتا۔ اور یہ نتیجہ ہے اسی طبیعت کی کمزوری کا جو ہمارے ماحول نے ہم میں پیدا کردی ہے۔ اس کمزوری کے باعث ہم ہمیشہ ایک اصولی غلطی کرتے ہیں اور اس کا نتیجہ ہمارے لئے مُضر ثابت ہوتا ہے۔ غلطی یہ ہے کہ ہم اپنی آرام طلبی کے باعث ہر وقت یہ توقع کرتے ہیں کہ تمام نظامِ عالم ہماری مرضی و خواہش کے مطابق چلے اور دُنیا میں جو واقعات رُونما ہوں وہ ہمارے حسبِ دلخواہ ہوں، اگر معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے تو ہم مغموم ہوجاتے ہیں اور اُس کو اپنے لئے تکلیف کا باعث سمجھ لیتے ہیں، مثلاً اگر ہم کو کسی معاملہ میں خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی تو اُس کو بدقسمتی اور مصیبت تصوّر کرلیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ دُنیا کا بالکل معمولی واقعہ ہے۔ آخر یہ کیا ضروری ہے کہ دُنیا میں ہر کام ہماری مرضی کے مطابق ہو۔ اس کے برخلاف اگر ہم خود نظامِ عالم کے تابع ہوجائیں، یعنی دُنیا میں جس طرح واقعات رُونما ہوتے جائیں ہم اُن کو تسلیم کرتے جائیں تو پھر دیکھئے زندگی کس قدر سہل اور مسرّت آمیز ہوجاتی ہے، جو کام آپ کی خواہش کے خلاف ہو اُس کی نسبت سمجھ لیجئے کہ قدرت کا منشا یہی ہے اور اس میں ضرور کچھ راز ہوگا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جس چیز کو ہم اپنے لئے اچھی اور مفید سمجھتے ہیں وہی ہمارے لئے مصیبت کا پیش خیمہ ثابت ہوجاتی ہے اور جو چیز بظاہر ہمکو تکلیف دہ اور خراب معلوم ہوتی ہے وہ ہمارے لئے باعثِ برکت ہوجاتی ہے۔ تو جب ہم کو قانونِ قدرت میں کوئی دخل نہیں ہے تو آخر پھر ہم اپنے آپ کو قدرت کے تابع کیوں نہ کردیں۔ کوشش کرنا ہمارا کام ہے مگر کامیابی و ناکامیابی اللہ کے ہاتھ ہے۔ مگر بھلا ہو اس طبیعت کی کمزوری کا کہ ہم خود اپنے ہاتھوں سے مصیبتیں مول لیتے ہیں حرص و طمع اور ریس میں تباہ ہوتے ہیں اور قسمت کا نام بدنام کرتے ہیں۔ ہم میں اکثر ایسے ہیں کہ آمد سے زیادہ خرچ کرتے ہیں۔ ظاہری ٹیپ ٹاپ اور نمائش کی خاطر اپنے آپ کو قرض اور سود کی مصیبت میں پھنسا لیتے ہیں۔

گو حیثیت بالکل معمولی ہے مگر بغیر موٹر کے بات نہیں کرتے۔ اور رئیسوں کی ریس کرتے ہیں اور پھر جب خود اپنے ہاتھوں سے تباہ و برباد ہو جاتے ہیں تو نہایت معصوم اور مصیبت زدہ ہو کر قسمت کا رونا روتے ہیں۔ یا اس کے برعکس یوں سمجھئے کہ اللہ نے اتنا دیا ہے کہ عزت کے ساتھ زندگی بسر کر سکتے ہیں مگر بُرا ہو حرص و طمع کا کہ اُس کے ہاتھوں رُسوا ہوتے ہیں۔ دولت کی جستجو میں رات دن سرگرداں پڑے پھرتے ہیں نہ اپنے آرام کا خیال ہوتا ہے نہ چین کا۔ روپیہ بنک میں جمع ہوتا رہتا ہے مگر خود ٹوٹی جوتی اور پھٹے کپڑوں سے مارے مارے پھرتے رہتے ہیں اور بیوی بچے بھی کھانے اور پہننے کو ترستے ہیں۔ یا اگر عزت و شہرت کے جویاں ہوئے تو اس سطح کہ عزتِ نفس اور خودداری کو بالائے طاق رکھکر آستان بوسی پر اُتر آئے۔ ہمیشہ یاد رکھو دولت وہی قابلِ قدر ہے جو جائز طریقہ سے کمائی جائے اور جس کا مصرف پسندیدہ ہو اور عزت وہی قابلِ قدر ہے جو اپنے ذاتی جوہر اور محنت و مشقت کی بدولت خود ہمارے قدموں پر آ گرے۔ اگر ایسا نہیں ہے یعنی اگر اُس کے پیچھے ہم کو "مارے مارے پھرنا پڑے اور عزتِ نفس اور خودداری اور زندگی کی راحت کو اس کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھانا پڑے تو میاں ایسی دولت اور شہرت کو کم از کم ہم دُور ہی سے ڈنڈوت کرتے ہیں۔ ہم غریب ہی بھلے، ایسی دولت و شہرت کی ہمکو ضرورت نہیں۔ لیکن اگر ان حالات میں آپ مصیبت کا رونا روئیں اور قسمت کو بدنام کریں تو یہ سراسر ظلم ہوگا۔ وہی مثل ہوگئی کہ فعلِ بد تو خود کریں اور لعنت کریں آسمان پر۔ اپنے ہاتھوں سے مصیبتیں مول لیں، حرص و طمع کی بدولت خود کو زندگی کے لُطف سے محروم کرلیں۔ یعنی خیالات اور وہمی خطرات سے زندگی دُوبھر بنالیں اور پھر نام بدنام کریں بیچاری قسمت اور غریب فلکِ کج رفتار کا۔ میاں رات دن دولت میں لوٹنے۔ مخمل اور کمخواب کے گدّوں یا پھولوں کی نرم نرم سیجوں میں سونے کا نام زندگی نہیں ہے۔ گو زمانہ کی رفتار ہم کو اسی خیال کی طرف مائل کرتی ہے مگر درحقیقت یہ خیال غلط ہے۔ اگر سچ پوچھو تو "مسرت افزا احساسات" کے مجموعہ کا نام لُطفِ زندگی ہے اور ان احساسات کی سوتیں خود ہمارے دل میں موجود ہیں۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ ہم ان سوتوں کے شیریں پانی سے لُطف اُٹھائیں۔ حماقت۔ جہالت۔ فضول اور لایعنی خیالات کے کوڑے کرکٹ سے ان کو بند کرکے اپنے آپ کو زندگی کے لُطف سے محروم نہ کرلیں۔ زندگی کی راحت اور مسرت کے معاملہ میں ہمیشہ نو نقد نہ تیرہ اُدھار کا ربند رہیں یعنی یہ چیزیں جس وقت جس قدر جب کبھی میسر آئیں اُن کو ہاتھ سے جانے نہ دیں۔ اُن سے فوراً فائدہ اُٹھائیں اور آیندہ کی موہوم اُمید پر زندگی کے موجودہ لُطف اور راحت کو کبھی قربان نہ کریں۔

اگر عالمِ غربت میں بھی آپ آرام و چین کے ساتھ زندگی گذارنا چاہتے ہیں تو اپنی زندگی کی بُنیاد دو اصولوں پر قائم کیجئے۔

(۱) اول یہ کہ زندگی ایک کھیل ہے۔ دُنیا اُس کی بازیگاہ اور تمام کھلاڑی۔ ایک سچے اسپورٹسمن کی بہتر

میں اس کھیل میں حصہ لو۔ ہارنے جیتنے کی بالکل فکر نہ ہو۔ جیتنے کی پوری پوری کوشش کرو۔ لیکن اگر ہار جاؤ تو اپنی شکست کو خندہ پیشانی سے تسلیم کر لو۔ زندگی کو کھیل ان معنوں میں نہ سمجھو کہ اس کی کوئی اہمیت نہیں بلکہ صرف ان معنوں میں کہ قانونِ قدرت اٹل ہے اور تم اُس کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے۔ اگر واقعات تمہاری مرضی کے خلاف بھی رُونما ہوں تو ملول خاطر نہ ہو بلکہ ہنسی خوشی اپنی زندگی کو اُن واقعات کے موافق بنا لو۔ مثلاً جب تم موت پر غالب نہیں آ سکتے اور موت کا آنا برحق ہے تو پھر اُس کے ڈر سے زندگی کی حلاوت کیوں خراب کرتے ہو۔ موت کسی کے روکے نہیں رُکتی۔ اور آنے کے بعد تمہاری چیخ پکار سے مُردہ زندہ نہیں ہو سکتا۔ تو عورتوں کی طرح اس پروائے وبلا کرنے سے فائدہ؟ مذہبی معنوں میں اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم موت سے بے فکر ہو جائیں یا اس کے ڈر کو دل سے نکال دیں اور نہ اس سے یہ مطلب ہے کہ ہم اپنے دل کو اس قدر سخت اور پتھر کا بنا لیں کہ کسی کے مرنے کا رنج و افسوس بھی نہ کریں۔ نہیں۔ مقصد صرف یہ ہے کہ اپنی موت کے خوف اور یا دوسروں کی موت سے اس قدر متاثر نہ ہوں کہ خود اپنی زندگی کا لُطف خراب کر لیں جس وقت تک انسان انسان ہے اور اُس کے پہلو میں دل ہے وہ اس قسم کے حادثات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، لیکن اگر ہم اس کا اثر اس طرح لیں کہ خود زندگی ہی سے بیزار ہو جائیں تو یہ انتہائی بُزدلی ہے۔ بعینہ یہی حالت مالی نقصان کی ہے۔ مالی نقصان کو واپس لینے یا اس کی تلافی کرنے کی کوشش ضرور کرنی چاہیئے مگر اس کے فکر میں ہاتھ پیر ہاتھ رکھکر بیٹھے جلنے سے نقصان کی تلافی نہیں ہو سکتی۔

(۲) مسرت و شادمانی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا دوسرا بنیادی اصول یہ ہے کہ زندگی میں ہمارے جُملہ افعال اور نہ صرف افعال بلکہ خیالات بھی محبت کے تابع ہوں مگر کہیں شوقین حضرات اس محبت سے عاشق مزاجی مطلب نہ سمجھ لیں۔ اس سے ہماری مُراد وہ محبت آمیز اسپرٹ ہے جو ہم کو دوسروں کے ساتھ نیکی کرنے پر اُبھارتی ہے۔ اسی چیز کو حافظ علیہ الرحمتہ نے "با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا" سے ادا کیا ہے۔ اگر آپ اس اصول پر سچے دل سے عمل پیرا ہو گئے تو آپ کا دل بُغض و عداوت اور حسد و کینہ سے پاک صاف ہو جائے گا اور مُنافقت کبھی بھول کر بھی آپ کے پاس نہ آئے گی۔ اس اصول پر کاربند ہونے کے بعد دل و نظر میں بے حد وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ انسان دوسروں کی عیب جوئی کرنے کے بدلے پہلے اپنے گریبان میں مُنہ ڈالتا ہے۔ اور خود اپنے نفس کو پہچاننے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر کوئی اُس کو بُرا بھلا کہتا ہے تو وہ گردن جُھکا کر اوّل سوچتا ہے کہ اُس کا بیان صحت پر مبنی ہے یا نہیں۔ اگر صحیح ہے تو وہ غصّہ ہونے کے بجائے اُلٹا اُس کا شُکر گذار ہوتا ہے اور اگر بے بنیاد ہو تو کہنے والے کو بیوقوف یا کمینہ سمجھکر اس کی بات کو قابلِ التفات نہیں سمجھتا۔ اگر کوئی اس کو ایذا بھی پہونچاتا ہے تو وہ اُس کے بدلے نیکی کرتا ہے اور اس طرح اپنے بدخواہ کو رام کر لیتا ہے اور اگر یہ نہیں کر سکتا تو کم از کم اتنا ضرور کرتا ہے کہ اپنے بدخواہ کو زُمرہ لوگوں کی فہرست میں سے خارج کر کے اُس سے بالکل بے واسطہ ہو جاتا ہے۔ مگر ہاں یہ سب کام کرنے کو

آسان ہے لیکن عملی دنیا میں بے حد مشکل ہے اور اس کی کامیابی کا راز صرف یہ ہے کہ اپنے نفس اور غصّہ کو قابو میں رکھا جائے اگر غصّہ کو قابو میں رکھنا بھی بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ یہ کام بذات خود ایک قسم کا ہُنر ہے اور اس کے لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنے اُوپر بالکل اِس طرح نگرانی رکھیں گویا کہ ہم کوئی غیر شخص ہیں۔ جہاں غدود سے باہر نکلیں فوراً روک تھام شروع ہو جائے اور اگر کبھی ایسا اتفاق ہو اور یہ اکثر ہوتا ہے کہ آپ بے قابو اور غصّہ سے لال پیلے ہوکر بے خود ہو جائیں اور یا کسی صدمہ اور رنج سے بے حد مضمحل اور پریشان ہوں تو اُس کا واحد علاج یہ ہے کہ عین اُس حالت میں کسی نہ کسی طرح اپنے ذہن کو ہماری طرف منتقل کیجئے، ہماری خندہ پیشانی پر —— Never mend —— Look cheerful کے الفاظ جلی حروف میں کندہ دیکھئے اور ہنسی نہ آتی ہو تو بھی زبردستی جھوٹے مُنہ ہنس دیجئے۔ دیکھئے فوراً کتنا آرام ملتا ہے اور طبیعت میں کس قدر فرحت محسوس ہوتی ہے۔ یہ وہ وظیفہ ہے جس سے غصّہ کا جنّ آپ کے قابو میں آجائیگا۔ اور راحت و آرام کی دیوی آپ کی غلام بن جائیگی۔ بس اتنی کوشش کرنا آپ کا کام ہے کہ چشمۂ دل کے صاف اور ستھرے پانی کو ناپاک خیالات اشتعال انگیز جذبات اور غیظ و غضب کے پتھر پھینک کر گندہ نہ کیجئے۔ اس کے برعکس اس پانی میں ہر وقت پاک و پُرامن خیالات محبت و نیکی کی ہوا سے تحمّل کی لہریں اُٹھ اُٹھ کر دوسروں کو فیض پہونچاتی رہیں، زمانہ گذشتہ کے تلخ و ناگوار واقعات کو اس پانی سے اس طرح دھو ڈالئے کہ ان کا نشان بھی باقی نہ رہے اور اگر کبھی وہ یاد آئیں بھی تو صرف عبرت دلانے کے لئے نہ کہ انتقام کی غرض سے زمانہ حاضرہ پر آپکی نظر ہو اور اسی میدان میں آپ ترقی کے لئے کوشاں ہوں آپ کے دل میں سوائے خدا کے کسی دوسرے کا ڈر نہ ہو مگر اولی الامر کا ادب و احترام آپ کا فریضہ ہو۔ قناعت آپ کا طرۂ امتیاز ہو اور نیکی اور بھلائی آپ کا شیوہ۔

بس اگر ان باتوں پر آپ کاربند ہوگئے اور مشکلات و مصائب کو زندگی کی چاشنی سمجھنے لگے۔ تو یقین مانیئے ہماری طرح آپ بھی اس طرح کھال میں مست ہو جائینگے کہ لاٹ کی بھی پرواہ نہ رہے گی اور زندگی کا حقیقی لطف آپ کے قدموں پر نثار ہونے لگیگا ؛

مرزا عبدالحمید بیگ

# ”انارکلی“ کے متعلق دوسری نظر

(ایک مُخلص کے قلم سے)

بہت شرمائے وہ "اتنا نہ سمجھتا تھا اُنہیں | چھیڑنا تھا تو کوئی شکوۂ بے جا کرتا!

گذشتہ دسمبر کے ساقی میں تاج صاحب کے مصنفہ ڈراما "انارکلی" پر میرا جو مضمون شایع ہوا۔ وہ بعض اصحاب کو اتنا شاق گذرا کہ لام کاف پر اُتر آئے۔ سچ بات تلخ معلوم ہوا ہی کرتی ہے، جس سے یہ بھی مستثنےٰ نہ رہے۔ علامہ مضحک نے صحیح فرمایا کہ "انارکلی" درخورِ اعتنا ہی نہیں۔ اُسے منہ لگانا گویا اس کی عزت بڑھانا ہے۔ لیکن کیا صاحب "انارکلی" یعنی بقولِ علامہ "تاجو" بھی قابلِ اعتنا اور منہ لگانے کے لائق ہیں؟ یہ تو ایک نونہالِ ادب ہیں۔ ڈرامی ادب سے بھی انہیں شوق معلوم ہوتا ہے۔ اسی لئے اپنا سمجھکر انہیں بتایا تھا کہ "انارکلی" بندو کی بیٹھے بٹھائے انہیں رسوا کر دیگی۔ اسے ٹھیک کریں۔ اگر یہ اُن کے بس کی بات نہیں تو مخلص حاضر ہے۔ اور آیندہ بھی ذمہ وار ادب پیش کریں تو پہلے پوری طرح سوچ سمجھہ لیا کریں۔ میرا اب بھی یہی کہنا ہے کہ اس میں خود اُن کی بھلائی کی صورت ہے۔ ورنہ پہلے بھی اُنہوں نے فسانے لکھے، اب بھی "پھول" میں لکھتے رہتے ہیں جس کے متعلق بھولوں اُن سے کبھی کچھ نہ کہا گیا۔ لیکن ایک صاحب کو دیکھتا ہوں (جو تاج صاحب کے نیازمندوں میں ہیں!) کہ فروری کے نیرنگِ خیال میں میرے مضمون کا خیرسے جواب دیتے ہیں۔ بچارے جواب کیا دیتے ہیں؟ مارے خفت کے روئے دیتے ہیں! جنگلی سا و ترندی پہ بیساختہ "دعائیں" نکلیں!! ان صاحب کی اس لمبی چوڑی خفت کو ایک ادنیٰ سا سیدھا جواب بھی فرض کرو تو ان کی نیت کا یہ حال ہے کہ جواب یا تو خود لکھا یا کسی اور سے بد توفیق سے لکھوا دیا۔ لیکن اس میں "ہم نیازمند اور نیازمندانِ لاہور" کے الفاظ جھوٹ موٹ لکھدئے تاکہ معلوم ہو کہ اسے ایک سے زیادہ نے سرجوڑ کر لکھا ہے۔ حالانکہ جواب کی شرافتِ علمی اور اُس کے تیسرے صفحے کی آٹھویں سطر میں "ان مثالوں سے میں قارئین..." کے جملے کی ضمیرِ واحد متکلم پکارے کہتی ہے کہ "انارکلی" کا یہ ایک عدد نیازمند حمایتی لا اعتبار! اصل پوچھئے تو میں نے مضمون اس غرض سے لکھا ہی نہیں کہ ما و شما کے جوابات دیتا رہوں۔ اگر بحالتِ موجودہ "انارکلی" کو اُردو ادب میں کوئی جگہ ملی ہے، تو یاد رہے میرا مضمون ملک کے باحمیت افراد کو اپیل کرکے رہیگا۔ کوئی کچھ کہتا ہے کہا کرے۔ البتہ زیرِ نظر جواب دانستہ جس مقصدِ خاص سے شایع کیا گیا اس کا جواب الجواب صرف اس وجہ سے ضروری خیال کرتا ہوں کہ مذکرہ جواب سے عام طور پر غلط فہمی کا اندیشہ ہے کیونکہ "نیازمندانِ لاہور" کے نام سے کسی چیز کے چھپنے کے یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ وہ چند کے مشورے کے بعد چھپی ہے۔ حالانکہ جیسا اوپر ظاہر کیا گیا یہ جواب "نیازمندانِ لاہور" کی برائے نام جماعت میں ایک ہی صاحب کی کاوشِ دماغی کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ نیازمند صاحب میرے مضمون کے ایک لفظ "سب بکٹیو" کے ہی معنی اِدھر اُدھر پوچھتے پھرے ہوں۔ اور

کسی نے مذاق سے اسے "فنِ تنقید کی اصطلاح" بتا کر انہیں بہکا دیا ہو! پھر جواب پر جذبات کا ایسا رنگ دیا گیا ہے گویا تاج صاحب ہی بر امان کر بگڑ رہے ہیں۔ لیکن یہ چیز کم سے کم میں ماننے کے لئے آمادہ نہیں۔ موصوف ایک پڑھے لکھے آدمی ہو کر اس طرح ایمان نہیں نگل سکتے کہ فائدہ کی بات کا جواب گالم گلوچ سے دیں گے۔ وہ ذرا ٹھنڈے دل سے کام لیں تو خود سمجھ سکتے ہیں کہ "انارکلی" پر میرا کہنا سننا زیادہ اس بے رہروی کے اعتبار سے ہے جو اس ڈرامے میں دانستہ اختیار کی گئی۔ اور جو ہماری گذشتہ روایات کے لئے نہایت مُضر ہے۔ اس لحاظ سے ظاہر ہے کہ ان پر بڑی ذمہ داری عاید ہوتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ انہیں ذرا سختی سے ٹوکا گیا۔ جیسے نیاز مند صاحب یا انکی قماش کے دوسرے اپنی خللِ دماغ سے نہیں سمجھتے تو نہ سمجھیں۔ غرض میری دانست میں تاج صاحب تو اتنے نادان ہو نہیں سکتے کہ ایک تو ان سے لائق لحاظ فرو گذاشت ہو اور پھر ہٹ دھرمی بھی کریں۔ یہ علم کے پتلے جنہوں نے جواباً خامہ فرسائی کی بے ضرورت زحمت اٹھائی کوئی ایسے صاحب معلوم ہوتے ہیں جو بدنام کنندہ نکو نامے چند ہیں۔ مگر انہیں تاج صاحب سے تعلقِ خاطر ہے یا رہا ہے، اور جو بزعم خود جواب دیکر گویا ان کا دل رکھ رہے ہیں!

خیر یہ تو جواب سر تا سر ایسا ہے جس میں مارے جذبے کے نیاز مند صاحب آپے میں نہیں ہیں۔ اور جو منہ میں آیا بلا تکلف کہتے چلے گئے ہیں۔ بھلا ایسی نا سمجھی کی باتوں کا کوئی کیا خاک جواب دے۔ لیکن ان صاحب کے یوں آپے سے باہر ہو جانے سے ہوا یہ کہ ان کی دماغی استطاعت کا راز کھل گیا۔ مثلاً ابتدائے مضمون ہی میں انہوں نے "غذائے ادبی" کو "معدے" سے متعلق کر دیا۔ غالباً ان میں یہ نُدرت ہی ہے کہ دماغ کا کام معدے یا معدے کا کام دماغ سے۔ لیتے ہیں۔ جبھی تو جناب فضلات ادب پیش کر سکے! آگے بڑھے تو خواہ مخواہ "اہلِ زبان" کے منہ آئے، اور بلا وجہ لاہور، دہلی اور لکھنؤ کا سوال پیدا کر دیا۔ اب کوئی دوسرا بیچ میں بول اُٹھے تو مفت کا رنج بڑھے اور فساد برپا ہو۔ لیکن نیاز مند صاحب کی فسادی طبیعت کو اس کا احساس تک نہیں۔ انہوں نے تو آنکھیں بند کر کے منہ کھول دیا کہ:

"یوں تو اہلِ زبان کی پت جھڑ شروع ہو کر ختم بھی ہونے کو آئی۔ اور ....... الخ"

نیاز مند صاحب کی خوشی کے خاطر ہم اسے صحیح مان بھی لیں، تو انہیں اس امر واقعی سے شرمانا پڑے گا کہ یہ "پت جھڑ" اس وقت "شروع ہو کر ختم ہونے کو آئی" جب ارباب زبان نے ان کی "زباندان" ہستی پیدا کر دی! مگر یہ بات ایک نورس، نہیں میں بھولا، ایک "نوجوان" کی سمجھ میں نہ آئی۔ بلکہ انہیں تو اپنی جوانی دیوانی کی ترنگ میں میرا مضمون "بے معنی" اور "ژولیدہ بیانی" کا مجموعہ نظر آیا۔ اس پر بھی زمانے ادب تہہ کئے بغیر وہ استصواب کرتے ہیں کہ "اردوئے معلّیٰ" وغیرہ کن اصنافِ ادب میں شامل ہیں؟ جو دراصل اس حقیقت پر مبنی ہے کہ نیاز مند صاحب کو پیش کردہ اقسامِ ادب سے بہرہ ہی نہیں۔ انہوں نے کسی مدرسہ میں پڑھا یا کسی سے سُنا تھا کہ ادب کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ نظم اور نثر۔ یہاں کچھ اور منظر آیا تو چونک گئے۔ خیر اب سمجھ لیں اور پریشان نہ ہوں کہ شاعری، فکشن اور ڈرامہ بھی بالفاظِ مختلف نظم اور نثر کے ہی نام ہیں۔ جنہیں اچھی طرح ذہن نشین کر لیں، ورنہ پھر کسی کے سر ہو جائیں گے۔ البتہ میرا مضمون ڈرامے سے متعلق تھا۔ جو جذبات و حسیاتِ انسانی کا مُرقّع

ہوتا ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں ادب کی وہی قسمیں اُن جیسے عقلمندوں کو سمجھانے کے لئے توضیحاً درج کی گئیں جو باعتبارِ جذبات وحسیات بنیادی اور اٹل ہیں۔ لیکن انہوں نے بلا سوچے سمجھے اسے "اظہارِ علم کا شوق" بیان فرمایا۔ اور چند نادر سوال بھی کئے ہیں۔ جن کا جواب دینے سے نہ دینا ہی اُن کے لئے اچھا ہے۔ کیونکہ ایک تو وہ مایوس ہوں گے کہ ان مسلماتِ ادب سے آج تک نابلد رہے۔ دوسرے اُن کی لاج رہ جاتی ہے۔ ورنہ دنیا دیکھ کر ہنسے گی کہ اپنے آپ کو زعیمِ ادب سمجھ کر وہ ایک ایسے شخص سے استفادہ کر رہے ہیں جس کی مناسبت ذہنی بقول ان کے "اُردو کے معلّی" سے متجاوز نہیں۔ چہ جائیکہ ایسی باتوں سے تو خود انہیں کے متعلق چشمِ سخن یہ اشارہ کر رہی ہے کہ "چار پائے بر و کتابے چند!"

اس وقت گو یہ ممکن تھا کہ نیاز مند صاحب کی دلداری کے خیال سے ان کے استصواب پر اگر ایک طویل فہرست کتب بھی ہوتی تو اس کے متعلق میں انہیں تفہیم کر دیتا کہ کون کون سی کتابیں کن کن اصنافِ ادب میں شامل ہیں۔ مگر اس مروّت اور پاسداری سے ان کے بھولپن میں اضافہ ہی ہوگا۔ انہیں یہ عادت ہو جائے گی کہ جس طرح اب ایک چیز کو بوضاحت سمجھانے پر بھی وہ کورے کے کورے ہیں اور کوئی بات نہیں سمجھتے۔ اسی طرح آئندہ بھی ادب کے کھلے راز وہ مجھ مجھ سے پوچھتے پھریں گے۔ جو ایک طرح کی ادبی گداگری ہے۔ اس واسطے ان کو لازم ہے کہ ذہن پر زور دے کر کسی نہ کسی طرح پہلے اصول سمجھ لیں جس سے بہت سے اسرارِ ادب از خود ان پر منکشف ہو جائیں گے۔ یہی سبب ہے کہ میں نے انہیں اصول بتانے پر اکتفا کیا۔ اور ہر سوال کے جواب میں علیٰحدہ علیٰحدہ فہمایش کرنے کے لئے قارئینِ کرام کا بھی مزید وقت لینا اخلاقاً مناسب نہیں سمجھا! اور تو اور نیاز مند صاحب "شکارپور اور بک اسٹال" کے متعلق اپنی محدود اور محدود معلومات پر داد تحقیق طلب کر کے یہ بھی ریاضت کرتے ہیں کہ:

"سب جکٹیو کی اصطلاح سے فنِ تنقید محض نا واقف ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کا کولس کون ہے؟"

یہاں یہ امر بطورِ خاص قابلِ لحاظ ہے کہ "سب جکٹیو کی اصطلاح سے فنِ تنقید کی محض ناواقفیت" والا جملہ خود نیاز مند صاحب کے اُمّی محض ہونے کی کتنی واضح دلیل ہے حالانکہ اپنے مضمون میں ضمناً میں پہلے ہی بتا چکا کہ یہ کس شے کا نام ہے۔ وہ یہی بات نہیں سمجھ سکے تو اس اصطلاح کی مزید فلسفیانہ موشگافی انہیں اور پریشان کر دیگی۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ پہلے جس قدر بتا دیا گیا اسے ہی کسی پڑھے لکھے سے سمجھ لیں تو بڑی بات ہے، ورنہ صورتِ حال نازک سے نازک تر ہوتی جاتی ہے۔ اب وہ دن دور نہ سمجھیں کہ انہیں کے احباب پکڑ دھکڑ کر ایک دن مجبوراً انہیں "مکتب" پہنچا آئیں گے۔ کیونکہ یہ باتیں تو وہ بالکل ایسی ہی کرتے جیسے ابتدائی جماعت کا کوئی غبی طالب علم اٹلس دیکھے تو کاٹھ کو سے بیون میں تلاش کرے ۔ ۔ ۔

اور آگے بڑھے تو مضمون کے اس حصے پر اعتراض فرمایا ہے۔ جہاں اکبر اعظم کی جبلی ملنساری وغیرہ

کی بنا پر انارکلی کے واقعہ کو درندگی کے مترادف ثابت کیا گیا ہے۔ لیکن نیاز مند صاحب اس حصّے سے جو کچھ سمجھے اُن کے معصوم انداز میں یہ ہے :-

"اگر اس استدلال سے کچھ ثابت ہوتا ہے، تو یہی کہ قصّہ بے بُنیاد ہے۔ پھر نہ معلوم مُخلص صاحب تاج صاحب کی تائید کر رہے ہیں یا تردید؟"

چلئے ستے چھوٹے۔ بھلا اب یہ کون ان سے پوچھے کہ مُشفق! تاریخ کا اکبر بادشاہ ایک طرف آپکے یا آپ کے دوست کے اکبر طولعمرہٗ کی سیرت پر بھی تو اس سے کسی نہ کسی طرح روشنی پڑتی ہے؟ سچ کہئے واقعی یہ بات آپ کی سمجھ میں نہ آئی یا دانستہ چبا گئے؟! میرا خیال ہے کہ شاید آپ اس بھُلاوے میں ہونگے کہ انارکلی والا اکبر "ایجادِ بندہ" کی صورت ہے۔ اس لئے اس کی اس بہیمانہ حرکت سے چشم پوشی کرلی جائیگی کہ اس نے فطرت کی ایک لاڈلی کو عمداً نہیں تو آپ کی ہم آہنگی کی خاطر دیوار میں زندہ چُنوا دیا۔ خیر آپ کا دل بڑھانے کے لئے اس روشن زمانے میں بھی چشم پوشی کرلی جائے تو آپ کے قول پر اعتماد نہیں رہتا کہ خیر سے وہ "عالی وقار، علم دوست اور روشن دماغ" بھی ہے۔ پھر جیسے آپ کی مرضی! اچھا اسی سلسلہ میں آپ نے بر سبیل تذکرہ مگر بلا سمجھے بوجھے "ہندوستان کے ججوں" کو ایک نرالا نوٹ بھی کرایا ہے:-

"اگر ان کے (ججوں کے) سامنے کوئی چھپن برس کا شخص قتل کے الزام میں گرفتار ہوکر پیش ہو تو اس سے پہلی بات یہ پوچھیں کہ کیوں بے جوانی میں تو نے ہیمو بقال کو مارا تھا؟ اگر جواب نفی میں ہو تو اُسے رہا کر دیں۔"

اس کے متعلق بھی مہربان! میں صاف صاف کہوں تو آپ بُرا مان جائیں گے۔ بیشک ججوں کو تو آپ نے مشورہ دیا جس کی داد غالباً شاید لجسلیٹو کونسل سے کسی قانون کے تحت آپ کو ملے تو ملے۔ مگر دیکھئیے یہ بات بھی آپ عامیانہ رنگ میں کہہ گئے یعنی یہی کہ بات "شہنشاہیت" کی تھی۔ آپ "جمہوریت" پر اتر آئے اور رابے تبے کرنے لگے! خیر اگر یہی میلانِ طبع ہے تو پھر مجھے شکایت نہیں۔ آپ یہ اعلانِ عام بھی فرما سکتے ہیں کہ ہندوستان میں چھپن برس کا ہر وہ مجرم جس کے ہاتھ عورت کے خونِ ناحق سے آلودہ ہوں آپ کے ڈرامے کا اکبر ہے!

غرض یہی مثالیں ہیں جن سے کھسیانے ہوکر نیاز مند صاحب ناظرین کرام کو یقین دلانا چاہتے ہیں کہ پیش شدہ مضمون ان کی سمجھ سے بالاتر رہا۔ میں کہتا ہوں ہونا بھی چاہئیے۔ بھلا جس کی ذہنیت بازاری تو تو مَیں مَیں کے متوازی ہوکر رہ گئی ہو، اسے ادب کا کیا دماغ ہوسکتا ہے۔ بازہم سمجھ پر زور دیا تو حضرت کا اعتدالِ حواس ہی ساقط ہوگیا۔ جبھی تو پیراگراف اُلٹے پلٹے دکھائی دئیے۔ فقروں کی نحوی ترکیب کرنی پڑی۔ اور ایک ایک سے معنی پوچھنے کی نوبت آئی۔ بارے شکر ہے کہ ذیل کے تین اجزا ان کی سمجھ میں آہی گئے۔

اولاً جناب فرماتے ہیں کہ ہندوستان کے بچے بچے کی آنکھوں میں تاریخ کے اکبرِ اعظم کی کوئی تصویر پھرتی ہے پھرے۔ ڈرامے کا اکبر اس سے جداگانہ رہے گا۔ کیونکہ دوسروں نے بھی ایسا کیا ہے! اور بحیثیت "انشا پرداز" (اپنے منہ میاں مٹھو!) کسی تاریخی شخصیت کو وہ یا اُن کے رفقا جس طرح چاہیں پیش کریں۔ کوئی کچھ نہ کہے۔ اس میں چاہے ایک عادل، ظالم یا ایک غیور شہنشاہ "جنسِ مشترک" کی حرکات کرنے لگے تو کوئی حرج کی بات نہیں۔ ڈرامٹسٹ نیاز مند صاحب نے اعتماد پر کہہ دے کہ ظلم یا خواجہ سرائی "انسانی فطرت کے منافی" نہیں! یا ایسی باتیں نہیں جو "بجز جنات کی امداد کے ظہور میں ہی نہیں آسکتیں!" یہی مغالطہ تھا جس کی بدولت اکبر اور سلیم جیسی تاریخ کی اولوالعزم ہستیاں انہیں "نہایت معمولی انسان" نظر آئے۔ بہانہ یہ کیا کہ پیغمبروں کو بھی تو لوگ پتھر مارتے تھے۔ شہنشاہوں کو منہ در منہ گالیاں دے دی گئیں تو کیا مضائقہ ہے! اسی غلط منطق سے "انارکلی" بھونڈی ہوگئی جس میں شہنشاہِ عظام نے ادنیٰ باندیوں سے بُرا بھلا سُنا۔ اور اُن کی رگوں کا تیموری خون اتنا سرد ہوگیا کہ آپ جیسے قدردانوں کے ہاتھوں وہ بچارے کافور خواجہ سرا سے زیادہ نہ رہے۔ پھر بھی نیاز مند صاحب شاکی ہیں کہ میں نے انارکلی کا "موضوعِ اصلی" نہیں چھوا "فروعات" میں اُلجھا رہا۔ اور مُصر ہیں کہ ابھی اس کو دس بارہ سال تک روزانہ زیرِ تلاوت رکھوں، جب جاکر کہیں اس کے "موٹے موٹے نکات" کھلیں گے، اور اس کی کیفیاتِ زیر و بم" معلوم ہوں گی! بوڑھے بچے! سمجھئے اور شرمائیے کہ شاہانِ سلف کو اپنے تفننِ طبع کی خاطر ذلیل و خوار کرنا "ریختی کا مسالہ" نہیں۔ آپ نے اسے کبھی شاید اپنی "نور اللغات" میں تلاش کیا! نہ جاننا بھی مزے کی چیز ہے۔ نام خدا آپ تو یہ بھی نہیں جانتے یا جاننا نہیں چاہتے کہ ہر بات کا وزن اس کے موقع و محل اور واقعاتِ گرد و پیش کے لحاظ سے ہوا کرتا ہے۔ ہندوستان جس دور سے گزر رہا ہے اور اس میں خصوصاً مسلمانوں کی جو پوزیشن ہے، اُس کو ذرا آنکھیں کھول کر دیکھئے تو معلوم ہو کہ "انارکلی" کے فرضی قصے کو ایک مسلمان مصنف کا دس بارہ برس کی دماغ سوزی کے بعد اس اہتمام سے پیش کرنا کسی حیثیت سے بھی ثواب کا کام نہیں۔ لیکن آپ یا آپ کے ہم خیال اسے اپنی عقلمندی سے "وقت کی چیز" ثابت کرنے اور صاحبِ تمثیل کی تحسینا پیٹھ ٹھونکنے کے لئے اتنے مضطرب ہیں کہ :-

"کرنا نہیں باقی ہی اک کام تہیا گویا!"

آپ کو تاریخ سے مس ہوتا اور اس کی علتِ غائی سمجھتے تو یہ بھی سوجھتا کہ سلاطینِ تیموریہ کے یمن قدوم سے ہندوستان کیا سے کیا بنا۔ ورنہ شہنشاہ بابر نے یہاں آکر اس کی جو حالت دیکھی اُسے تزک میں یوں لکھا ہے کہ :-

"ہندوستان میں اچھے گھوڑے نہیں، اچھا گوشت نہیں، انگور نہیں، خربزہ نہیں۔ برف نہیں، آبِ سرد نہیں، حمام نہیں، مدرسہ نہیں، شمع نہیں، شمع دان نہیں۔ شمع کے

بجائے دیوٹ ہوتا ہے۔ یہ تین پایہ کا ہوتا ہے۔ ایک پایہ میں چراغ دان کے مُنہ کے شکل کا ایک لوہا لکڑی میں وصل کر کے لگا دیتے ہیں۔ ایک دھیمی بتی دوسرے پائے میں لگی ہوتی ہے، داہنے ہاتھ میں کدو کی ایک تونبی ہوتی ہے۔ جس کا روزن تنگ ہوتا ہے۔ اسی کے ذریعے تیل کی پتلی سی دھار گرتی ہے۔ راجہ مہاراجاؤں کو رات کے وقت روشنی کا جب کچھ کام پڑتا ہے تو نوکر چاکر یہی کثیف دیوٹ لیکر ان کے پاس کھڑے ہوتے ہیں۔ باغوں اور عمارتوں میں آب رواں نہیں۔ عمارتوں میں نہ صفائی ہے نہ موزونی۔ نہ ہوا، نہ تناسب، عام آدمی ننگے پاؤں ایک لنگوٹی لگائے پھرتے ہیں۔ عورتیں لنگی باندھتی ہیں جس کا آدھا حصّہ کمر سے لپیٹ لیتی ہیں، اور آدھا سر پر ڈال لیتی ہیں۔"

ایسے ہندوستان کو تیموری برکات نے کیونکر جنتِ ارض بنایا۔ ان سلاطینِ عظام کی خاکِ پا خود لاہوریوں کی جبینِ نیاز کا کس طرح غازہ بنی رہی؟ ایک تاریخی راز ہے جو نیاز مند صاحب سے بے بصیرت پر نہیں کھل سکتا۔ مجھے افسوس ہے کہ اس اقتباس سے میں نے ایک مشہور بات کے لئے قارئینِ کرام کا کسی قدر وقت لیا۔ مگر یہ عرض کردوں نیاز مند صاحب کو سمجھانے کی غرض سے ضرورت ہے کہ ہندوستان میں گورگانی تاریخ کی الف بے تے سے تو پہلے انہیں مانوس کیا جائے۔ اور گو یہ چیز ان کے حق میں تفہیم بالجبر ہے، مگر یقین مانئے کہ اس سے ان کے چودہ طبق روشن ہوجائیں گے۔ اور سمجھ لیں گے کہ استخواں فروشی کی طرح استخواں فراموشی بھی ایک ناقابلِ معافی گناہ ہے! ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ تاریخ کی بیگانگی سے نیاز مند صاحب کا چراغِ بصیرت گل ہے۔ جسے حضرت اپنی بیداریٔ احساس اور روشن دماغی سمجھتے اور بگاڑ کی باتیں کرتے ہیں۔ لیکن:-

اب شوق سے بگاڑ کی باتیں کیا کریں
کچھ پا گئے جناب کی طرزِ بیاں سے ہم!

انہیں اس سے بھی لحاظ آنا چاہیئے کہ شیکسپیر کا نام تو انہوں نے بڑی شان سے لے لیا۔ مگر اس سے عاری ہی رہے کہ ڈرامے میں "تاریخ سے گریز" کے کیا معنی ہیں۔ ڈرامے کے اس دیوتا نے جولیس سیزر میں حسب ذیل تاریخی اُمور سے جو نمایاں طور پر گریز کیا اُسے مثالاً دیکھئے کہ وہ انگوٹھی میں بیچلے نگ کی طرح جھمکتا ہے:-

(۱) سیزر کا قتل کیپی ٹل میں نہیں ہوا بلکہ سینٹ کے ایک اجلاس موقوعہ کیوریا میں؟ جو ڈرامے میں پامپی کے تیاتر کے نام سے مشہور ہے۔

(۲) سیزر کا دوست مارکس بروٹس نہیں بلکہ ڈی سی مس بروٹس تھا۔

(۳) ڈی سی اس بروٹس کو ڈی سی مس بروٹس ہونا چاہیئے۔

(۴) سیزر کا جنازہ اس کے قتل کے بعد ہی نہیں اُٹھایا گیا۔

(۵) لوپرکے لیا کی ضیافت ۱۵ فروری کو ہوئی۔ مارچ میں نہیں ہوئی۔
(۶) ڈرامہ میں جو وقت دیا گیا اسکے ایک ماہ بعد آگ نے وی اس روم پہنچا۔
(۷) شیکسپیر نے فلپی کی ہر دو لڑائیوں کو ایک کر دکھایا ہے۔ جو دراصل (۲۰) دن کے فصل سے ہوئی تھیں۔

دیکھ لیا۔ یہ ہے ایک امام ادب کا تاریخ سے گریز جو بے مثل ڈرامائی فوقیت کا مالک تھا اور جسے کچھ بگاڑ دینا بھی اس سے سزاوار تھا کہ بہت کچھ سنوارنے میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتا تھا جو سیزر میں جزئی "گریز" معمولاً واقعات میں تسلسل اور ہم آہنگی کے لئے ہے تاکہ ڈرامہ اس طرح غیر مربوط نہ ہو جائے۔ جیسے بعض پُرانے فلم چلتے چلتے بیچ میں سے غائب ہو جاتے ہیں۔ یہ بات ہرگز نہیں کہ سفید و سیاہ کر دکھایا ہو، اور نیاز مند صاحب کے اس بزخود غلط دعوے کی تائید ہو جائے کہ "ڈرامہ نویس یا کوئی انشا پرداز اس بات کا حق رکھتا ہے کہ کسی تاریخی شخصیت کو جس طرح چاہے پیش کر دے" اس لئے بات کو سمجھئے و ہٹ دھرمی سے باز آئیے کہ آپ کے ذہن کی چالاکی آپ کے حق میں وبالِ جان ہو گئی۔ اور بات یہاں تک بڑھ گئی ہے کہ اب آپ اپنی تسلی کے لئے اپنے ہی الفاظ دُہرائیں اور کہیں کہ "ذہانت کے رُخ انور پر تھپیڑا" دیتے بھی کسی ایسی چیز کی زبردستی تائید سے آپ جیسے ہٹ دھرموں کے کیا ہاتھ لگے گا۔ جس پر سب نفرین کریں خدا کا شکر کیجیے اور خاموش ہو بیٹھیے کہ ہندوستان میں پہلی سی حمیتِ اسلامی نہیں ورنہ تاج صاحب تو اعتراف نہ کردہ اشت کے طور پر دانشمندانہ سکوت سے بچ نکلے تھے۔ اس "جہلِ مرکب" کے ہاتھوں البتہ آپ کی جان بخشی ذرا دشوار نہ تھی!

سب تو سب نیاز مند صاحب کو اس چیز سے بڑا دکھ پہنچا۔ اور جس پر بالفاظ خود بالآخر وہ رو [illegible] ہاسے! "انار کلی کے سلسلہ میں چالیس گز طولانی ستونوں کا ذکر کیوں کر دیا!" یہ چیز ان کی معصوم [illegible] ایسی سمائی ہے کہ نکالے نہیں نکلتی۔ جس کا یہ نتیجہ ہے کہ وہ دوسرے مدینہ سورے بھی [illegible] [illegible] گا کیا مزے کی بات ہے، جس ڈرامے میں بقول ان کے اکبر کی عظمت و تدبر، علم دوستی [illegible] بیان کو ضمنا ہی سہی بحث میں آ گئی ہوں۔ اس ڈرامے میں ان [illegible] کو نسبتاً [illegible] [illegible] سے [illegible] لئے کوئی یہ بتائے کہ عہد اکبر کا یہ مغلئی ماحول ہے، جو ایک ہی [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] تھی یہ بھی کہے کہ "نورتن اور مینا بازار" کی طرف بھی [illegible] [illegible] تو نیاز مند صاحب مجھ کے فرماتے ہیں کہ نہیں "انار کلی" [illegible] [illegible] [illegible] کا سین دکھانے کے معنے [illegible] [illegible] [illegible] ہے۔ بعد "انار کلی" کے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

دوسرے فقرے میں "موسم بہار کی ایک دوپہر۔ ظہر کی نماز ادا ہوئے ڈیڑھ گھنٹہ کے قریب وقت ہو چکا" کے سے نفیس "کلام" کے اوصاف گنائے ہیں۔ فرماتے ہیں: "دوپہر کے لفظ سے دھوپ کا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے"

درست! مگر یہ تو سوچئے "دوپہر کی دھوپ کا منظر" آپ "نماز ظہر کے ڈیڑھ گھنٹے" بعد گویا سہ پہر میں دکھا رہے ہیں! اور ماحول (اٹ مُوس فیر) کے معنی کسی پڑھے لکھے سے پوچھ کر بھی آپ نہ سمجھے کہ سہ پہر میں عصر کے قریب نماز ظہر کے تذکرہ سے "ایک مسلمان گھرانے کی مصروفیات کی طرف....."

آپ نے ضمناً جو اشارہ فرمایا وہ بھی بالکل ایسا ہی ہے، جیسے کوئی غیر مسلم نادانی سے یہ کہے کہ نماز عصر میں چار سنتیں، چار فرض، دو سنتیں اور دو نفل پڑھے جاتے ہیں! اسی طرح ایک مسلمان کو یہ بھی جاننا چاہیئے کہ زوال کے وقت سے کیا مراد ہے۔ جس کے بعد سایہ ڈھلنے پر نماز ظہر کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔ لیکن آپ خواہ مخواہ سایہ ڈھلنے اور سایہ طویل ہونے کا فرق کرنے لگے۔ یہ میں نے کب اور کہاں کہا ہے کہ ان دونوں میں فرق نہیں ہے۔ جسے بڑی شدومد سے آپ غلط ثابت کر کے خوش ہو رہے ہیں۔ میں تو اب بھی آپ کو یہ سمجھانا چاہتا ہوں کہ نماز ظہر وقت کے شروع ہوتے ہی عام طور پر نہیں ہو جاتی بلکہ درمیانی وقت میں ہوا کرتی ہے، جو ایک عام بات ہے۔ چونکہ نماز ظہر کا وقت سایہ ڈھل کر دو "سایۂ اصلی" ہو جانے تک رہتا ہے۔ اس لئے "ظہر کی نماز ادا ہوئے" کا یہ مفہوم ہوگا کہ درمیانی وقت ہے اور بالعموم نماز ظہر ہو چکی یعنی دوسرے الفاظ میں سایہ یا تو بظن غالب "سایۂ اصلی" تک پہونچا، یا پہونچا چاہتا ہے۔ اس نوبت پر بالفاظ مثیل "ڈیڑھ گھنٹے کے قریب" اور وقت گذر جائے تو اس کے یہی معنی ہوں گے کہ اس وقت "ستونوں اور محرابوں کے سائے طویل ہو کر اتنے ہو گئے کہ "جن ستونوں پر دھوپ پڑ رہی ہے ان کی لمبائی (سایۂ اصلی) سے خاصے بڑھ چکے ہیں۔ یعنی "سائے طویل ہونے شروع ہو گئے ہیں ـــــ" کا جو مفہوم مصنف صاحب پیدا کرنا چاہتے ہیں، وہ مفہوم ہرگز ان الفاظ سے نہیں نکلتا۔ یہ آپ کے مشاہدے کی بھی خامی ہے کہ آپ یہ بات نہ سمجھے۔ پھر بتاؤ تو سمجھتے نہیں۔ خواہ مخواہ الجھتے ہیں۔

تیسرے فقرے میں اپنی زباندانی کا مزید ثبوت دیتے ہوئے یہ ادعا کیا ہے کہ "مخاطب کے نام کو فقرے کے آخر میں رکھدینے سے فقرے کا تیور جس حد تک بدل جاتا ہے" اُسے بس ایک نیازمند صاحب جیسا عقل کل اور "زباں داں" ہی جانتا ہے۔ یہ "جانہاری" بھی قابل مبارکباد ہے! لیکن حضرت اگر آپ سے کوئی یہ پوچھے کہ "انارکلی" کے ایسے فقروں کی نسبت آپ کیا بات بنائیں گے۔ جن کے آخر سے "مخاطب کا نام" اس صفائی سے غائب ہے جیسے ایک مشہور جانور کے سر سے سینگ! تو آپ کے لئے کیسی مشکل ہو جائیگی ذرا "انارکلی" آپ تاج صاحب سے مانگ لیں۔ اور زیادہ نہیں صرف اس کے چار صفحے (۲۴ تا ۲۷) "میرے کا سرمہ نہیں، پتھر کا چشمہ" لگا کر پڑھیں تو شاید سوجھ جائے کہ اس زعفران زار میں تین کھِلے ؛۔

"یہ کیا ہوا زعفران۔ تم بہت شوخ ہو زعفران۔ انارکلی بھی تم سے بے تکلف ہیں زعفران۔۔"
تو بقول آپ کے ایسے ہیں جن کے آخر میں مخاطب کے نام کا دُم چھلا ہے۔ لیکن ایک نہ دو پندرہ بلا مخاطب کے نام کے ہیں :۔

"پوچھ لے پہلے۔ چل بھی دے چپکے سے۔ انہیں دریا کی سیر سے فرصت کہاں۔ وہ دیکھ رہے تھے لہروں کا ناچ۔ پوچھ لیتے ہیں ہم۔ بہنے جا رہی ہے کھڑی کھڑی۔ جاتے ہیں ہم۔ پھر اس کو بھیج دیجئے یہاں سے۔ اب تو نکلوائیں گی ہی ہمیں۔ تو حضور آدمی دیکھ کر ہی بات ہوتی ہے نہ۔ اور کیا نہیں بھی۔ پھر کیا نہیں بھی۔ تو تم سے کیا باتیں کیا کرتی ہیں وہ۔ اب کوئی باتیں مقرر تو ہیں نہیں۔ غرضیکہ بہت محبت ہے تم کو انارکلی سے"۔ (یہ فقرہ تو کمن انگشت درسو دانِ اکثر دم کے رحم کا گویا ہمردیف ہے!)

ان چار صفحوں میں آدھوں آدھ فقرے اسی شان کے ہیں جنہیں ذہن نشین کریں تو پھر سرسری طور پر میں آپ کو آپ کی خواہش کے بموجب یہ نکتہ بھی بتائے دیتا ہوں کہ "اگر یہ ڈرامہ اسٹیج پر دکھایا جائے" تو کیسی ہنسی کی بات ہوگی۔ مثلاً جن صفحات کا ابھی ابھی اوپر حوالہ دیا گیا ہے انہیں اداکار زیادہ سے زیادہ دو تین منٹ میں ادا کر دیں گے۔ اس لئے اتنے قلیل عرصہ میں یہ شاندار فقرے اپنی بُہتات کی بدولت اسٹیج پر ایسی تسبیحِ بے ہنگام بن جائیں گے کہ اربابِ ذوق کو تو خیر امتلائے ادبی پیدا ہی ہوگا۔ مگر آپ جیسے ہٹ دھرم بھی بلا مبالغہ کانوں میں اُنگلیاں دے دے کر تھیٹر سے بھاگ نکلیں گے! اسٹیج کاری کی رُو سے یہ نمونہ میں نے آپ کے اصرار پر مجبوراً دیا ہے۔ ورنہ یہ اور اس قسم کی بیسیوں باتیں تو اس وقت دیکھنے کی ہیں کہ ڈرامہ اسٹیج کرنے کے قابل بھی تو ہو۔ کاش کہ "انارکلی" پر ایسی معنوی پھبن ہوتی کہ "پیشہ ور اسٹیج" گیا اور کبھی اپنے حریمِ علمی کے لئے اسے قبول کر لیتے! غرض پیش کردہ "مشتے نمونہ" سے اب آپ خود بخود یہ محسوس کر لیں گے کہ "انارکلی" رسمی اور غیر رسمی ساری قیود سے آزاد ہو کر بامِ "ترقی یا تنزل" پر ہے! اسی سلسلہ میں مجھے یہ بھی کہنا ہے کہ نیاز مند صاحب "انارکلی" کی زبان کو اس لئے "مصنوعی" نہیں (کیونکہ نیاز مند صاحب تو اپنی بولی ماں کے پیٹ سے ساتھ لائے ہیں!) بلکہ "جیتی جاگتی" زبان سمجھتے ہیں کہ اس کے فقروں کے آخر میں بار بار مخاطب کا نام "آتا ہے! یا اس میں گرم نیند، تپتی نیند، جھلستی نیند وغیرہ کی ٹیپ ٹاپ پانے والی ترکیبیں ہیں معلوم ہوتا ہے اُنہوں نے کسی سے سُن لیا ہے کہ شکسپیر نے بھی زبان میں جدت کی تھی۔ پھر کیا تھا جدت جدت کا سبق شروع کر دیا۔ اور "انارکلی" میں جو عجیب و غریب ترکیبیں نظر سے گذریں تو تاج صاحب کو ہندوستان کا شکسپیر سمجھ لیا! بچارے کیا کریں شکسپیر کی نسبت جتنی سُنی سُنائی معلومات تھی اُسے ایک سانس میں کہہ گئے۔ بھلا یہ بات کیسے ان کی سمجھ میں آجاتی کہ جہاں مسائلِ زبان سے کہیں زیادہ رموزِ خصلت نگاری بحث میں ہوں، وہاں شکسپیر کی جدتِ زبان پر سرد ھننا اور تاریخ ادب سے واقفیت جتا کر انگلیس بجانا نری بچکانیت ہے"

افسوس! حضرت اقبال کی آغوشِ علمی میں ہو کر وہ اس سے بھی محروم ہیں کہ شکسپیر ایک "زباندان" ہو کر نہیں بلکہ ایک بے مثل رازدارِ فطرت ہونے کے باعث شکسپیر ہے ؎

حفظِ اسرار کا فطرت کو ہے سودا ایسا　　　رازداں پھر نہ کریگی کوئی پیدا ایسا

یہ نہ ہوتا تو وہ بھی اپنے زمانے کا "نیا زمند" اور ننگِ ملک ہوتا! بس جناب اسی علمیت پر آپ نازاں تھے اور پھر خیر سے فرماتے ہیں کہ "کسی اور ٹریجڈی" سے میں نے مقابلہ نہ کیا۔ خدا کی شان! اس بھتے پر آپ ٹریجڈی کے نکات بھی سمجھنے کی ہوس رکھتے ہیں۔ معاف کیجئے آپ کی سطحی باتوں سے تو یہ خیال ہوتا ہے کہ ٹریجڈی کی ایک یہی بات آپ کو ساری عمر سمجھتے رہنے کے لئے کافی ہے کہ ہملٹ کا سوگ ایک ایسے غمگین حسین کی صورت ہے جو ہر ملک و زمانے کے لئے ہے اور جس کے گورے گورے برہنہ ہاتھوں اور بکھرے بالوں میں نوعِ انسان کی زندگی کا سنگار ہے! خیر مجھے اس سے چنداں سروکار نہیں کہ آپ یا آپ کے کوئی دوست "جدّتِ زبان" کے فریب میں ہیں، رہا کریں اور اپنی نئی بھاشا بولتے ہیں، بولا کریں۔ میں نے اپنے مضمون میں جزئی اور ثانوی طور پر صرف اس لئے محاورے وغیرہ کی طرف اشارہ کر دیا تھا کہ جہاں "انارکلی" میں "نشاخاطر رہو" (صفحہ ۱۸۱) کی سی ٹکسالی زبان برتنے کی کوشش کی گئی ہے، وہاں بے تکاپن نہ ہو تو اچھا ہے۔ مگر آپ تو اپنے کو حافظِ نور اللغات جان کر کچھ سمجھنا ہی نہیں چاہتے۔ میں کہتا ہوں حضرت! "جھوٹے منہ" کا محاورہ بے موقع لکھا گیا ہے۔ آپ جواب میں فرماتے ہیں نور اللغات۔ میں نے کہا اس جگہ "پھوٹے منہ" سے کہئے۔ فرمایا نور اللغات۔ پھر میں نے کہا یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ سیخ یا سیخچہ تو کبابی کے ہاں ہوتا ہے۔ فرمایا نور اللغات! غرض ؎

کوئی جواب شافی پہ اُن سے بن نہ آیا!

بلکہ بلا تامل آپ نے لکھ دیا کہ "جھوٹے منہ" اور "پھوٹے منہ" کا اعتراض "محاورہ کا اعتراض نہیں ہے۔" حالانکہ اصطلاح میں خاص اہلِ زبان کے روزمرہ کا نام ہی محاورہ ہے۔

(۱) یہ اہلِ زبان کا روزمرہ ہے کہ "جھوٹے منہ" کیساتھ "سے" زائد اور غیر فصیح سمجھتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے اپنے مضمون میں تمثیلاً پہلے بھی بتایا ہے۔ ڈرامہ میں ہے: "جھوٹے منہ سے دو بول شکریہ کے ... الخ" جو خلاف روزمرّہ ہے۔ چنانچہ ثبوت میں ذیل کا شعر ملاحظہ کیجئے ؎

داغ کو تم سے میری جان یہ اُمید نہ تھی　　　جھوٹے منہ بھی تو نہ پوچھا کہ پریشاں کیوں ہو

(۲) "بزمِ آخر" کی شاہانہ زبان کے مطالعہ سے آپ بہک گئے۔ جیسے کوئی اجنبی شاہی دربار میں سائی سے ہکّا بکّا ہو جاتا ہے۔ مگر آپ کی آنکھوں پر تو بے جا مشیخت کی ایسی پٹی بندھی ہوئی ہے کہ آپ ہزار کچھ پڑھیں ہر پھر کر وہیں رہیں گے۔ جہاں پہلے تھے۔ لگے ہاتھ یہ بھی سُن لیجئے، آپ کے چیتے سے یہ بات اُتر گئی ورنہ معلوم ہوتا ہے "بزمِ آخر" کا ورد آپ نے چھوڑ دیا کہ گنگا جل اور گوش پیچ کی گوٹ کی ترکیبیں اس میں نہیں ہیں۔ البتہ آئینہ اکبری میں تیاری پارچہ جات کے سلسلہ میں ان کا بھی بیان ہے، جسے جواب لکھتے وقت آپ

تاج صاحب سے ہی پوچھ لیتے تو یہ تذبذب نہ رہتا۔ اور غلطی نہ ہوتی۔ وہیں سے ایک نئی چیز دکھائی دینے کے سبب ڈرامے میں بھی بلا لحاظ موزونیت لے لیا گیا۔ مگر میرا یہ کہنا ہے کہ پارچۂ پوشیدنی کے واسطے گنگا جل کا استعمال بالکل نئی اور من گھڑت ترکیب ہے۔ گوش پیچ تو وضع کا ہوتا بھی تھا۔ مگر گنگا جل بالعموم ایسے سوتی پارچہ کو کہتے تھے جو محلوں اور محلسراؤں میں سوزنیوں اور چادروں کے کام آتا تھا۔ کیونکہ اس کی بافت میں یہ کیفیت ہوتی تھی جیسے پانی بہہ رہا ہے۔ فرش فروش میں یہ چیز بڑی بھلی معلوم ہوتی تھی۔ تاج صاحب کو شاید آب رواں سے یہ مغالطہ ہوا کہ جشن کے روز بی کافور کو پہنانا ہی جوڑا سہی مگر سوزنی میں ملفوف کر دیا! یہ آپ کی "زباندانی" ہے جس کے نقص چھپانے کے لئے آپ جا بجا ایک کاکوری کے مفرمار (صاحب نور اللغات) کی دہائی دیتے پھرتے ہیں۔ لیکن آپ رموزِ زبان سمجھنا ہی چاہتے ہیں تو کچھ دن صاحبِ زبان کی صحبت میں رہئے، کہ آپ کے فانوسِ خیال میں مطالب کی پوری پوری پرچھائیاں پھر جائیں۔ سنئے "چھوٹے منہ" کے معنی صاحب نور اللغات کچھ بھی لکھیں آپ میرا کہنا مانئے کہ اس محاورہ میں جس طرح کبھی تحقیر کا بھی پہلو نکلتا ہے، صرف ناخوشی اور بددلی کا بھی مفہوم ہے۔ جس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ محاورے کے مفہوم پر بالکلیہ "تحقیر" مسلط ہے، ورنہ پھر انشاؔ کے اس شعر کے متعلق کیا ارشاد ہوگا۔ جسے میں نے پہلے بھی لکھا ہے:۔

ایک بوسہ ہم نے مانگا راہ مولیٰ واہ جی　　　　چھوٹے منہ سے یہ نہ نکلا لیتے جا نا شاہ جی

کم سے کم اردو شاعری میں تو یہ بات دیکھی جاتی ہے کہ "عاشق" اپنے "معشوق" کی تحقیر در کنار تحسین کے راگ گاتا ہے۔

(۳) کردار کا نفسیاتی تجزیہ ڈرامے کی بڑی خصوصیت ہے۔ جس میں لفظ و خیال کو ایسا زلف و شانہ ہونا چاہیئے کہ ادھر فاعل کے منہ سے بول نکلیں اُدھر اس کے جذبات و حسیات سننے والے پر آئینہ ہو جائیں۔ انارکلی کی ماں نے جس موقع پر "چھوٹے منہ" کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ (صفحہ ۲۵) وہ ایسے مکالمہ کے جزو میں جسے اُس نے "بگڑ کر" شروع کیا ہے۔ (صفحہ ۲۴) اس کا یہ جذبہ ختم مکالمہ تک قائم رہتا ہے۔ تاآنکہ وہ "بگڑ کر چلی جاتی ہے۔ جب انارکلی طول نظروں سے رخصت ہوتے ہوئے دیکھتی رہتی ہے (صفحہ ۲۶)"

اس ضرورت کے مدنظر "چھوٹے منہ" کی جگہ "پھولے منہ" کا محاورہ ناگزیر ہے کہ اس سے خود انارکلی کی ماں کے بگڑے ہوئے تیوروں کی بھی ترجمانی ہوتی ہے۔ مگر یہ بات نیازمند صاحب کی فہم سے بالاتر ہے۔

(۴) لغت میں مترادفات دیکھ کر جو کوئی "زباندان" بننے کی شیخی کریگا، اس کا یہی حشر ہوگا جو نیازمند صاحب کا ہوا۔ یا آیندہ ان کی ضد کے ہاتھوں ہونے والا ہے۔ بلاشبہ سلاخ بھی سیخ کا مرادف ہے۔ مگر جناب "سیخ" کو زیادہ تر اس طرح بولتے ہیں:۔

کبابِ سیخ ہیں ہم کروٹیں ہر سُو بدلتے ہیں　　　　جو جل اُٹھتا ہے یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتے ہیں

مترادفات دیکھ کر کتاب لکھنے کا یہ نتیجہ بھی ہے کہ کسی لغت میں "روزن" کے معنی روشندان دیکھ لئے تو اسے

ڈرامہ میں ایک اچھے خاصے بڑے روشندان کی بجائے استعمال کر دیا گیا۔ (صفحہ ۱۹۶) "انارکلی" میں جس روزن کا تذکرہ ہے وہ اتنا بڑا ہے کہ اس میں سے باہر کا آسمان اور اس کے تارے نظر آرہے ہیں۔ حالانکہ اُردو میں "روزن" کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ:

مرے مزار کو چھلنی کیا ہے تیروں سے
بہانہ یہ ہے کہ روزن کئے ہوا کے لئے

یعنی تیر سے جتنا رخنہ پڑیگا وہی دراصل روزن ہے۔ جو ظاہر ہے کہ "انارکلی" کے "زنداں کے روشندان" کے معنی کھینچ تان کر ہی دے سکتا ہے۔ ورنہ پھر یہ ماننا پڑے گا کہ "زندان" انارکلی یا اس کے حمایتی کا مزار ہے! ساتھ ہی ساتھ یہاں یہ نوٹ کر دینا بھی ضروری ہے کہ ان دو محاوروں اور چند ترکیبوں پر ہی "انارکلی" کی ساری زباندانی ختم نہیں ہے۔ مگر میں نے پہلے بھی محض جزئی طور پر نمونۃً زبان کے متعلق کچھ کہا تھا۔ اب بھی کچھ نہیں کہوں گا کہ "انارکلی" میں جو چیز نسبتاً مقدم اور زیادہ نوٹس کے قابل ہے پہلے اُس کا تصفیہ ہونا ہے۔ ورنہ:

رخنے نکلیں گے سینکڑوں اس میں!

ہاں البتہ نیاز مند صاحب نے اپنی عادت کے موافق یہ بھی دریافت کیا ہے کہ میں انارکلی کے کیرکٹر کے متعلق کچھ کہوں۔ جو بقول ان کے ڈرامہ کی جان ہے۔ چنانچہ طوالتِ بیان کے خوف سے اس ضمن میں صرف ایک اشارہ کر دیتا ہوں۔ نیاز مند صاحب عقلمند ہیں تو یہ ضرور کافی سے زائد ہوگا! موصوف اس سے تو باخبر ہوں گے کہ ڈرامہ میں انارکلی کی ظاہری بناوٹ، عمر اور نام وغیرہ کا ذکر آگیا ہے (صفحہ ۲۲) یہ دیکھتے ہوئے اس کی پوشش کا ذکر نہ آنا بھی اس لئے ناگزیر ہے کہ ایک مکمل کردار نگاری کے لئے جہاں اور اجزائے ترکیبی بیان ہوتے ہیں وہاں تصویر کو اجاگر بنانے کے لئے لباس کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔ لیکن انارکلی کو اس زاویۂ نظر سے دیکھو تو بچاری غیر ملبوس ہے! یہ بات اس لئے بھی ضروری ہے کہ انارکلی بعض موقعوں پر اپنی طرزِ بیان میں نیاز مند صاحب کی اُستانی نظر آتی ہے اور دوسرے ایک عصری پروفیسر کی طرح اس طرح گفتگو کرتی ہے کہ:

"...کی بے خبری میں اس نے میری سوچ کو ..... برہنہ نہ دیکھ لیا ہو!"

اور سب سے بڑھ کر یہ کہ نیاز مند صاحب نے یہ فتویٰ دیدیا ہے کہ:

"ڈرامہ نویس یا انشاپرداز کسی تاریخی شخصیت کو جس طرح چاہے پیش کرے۔ اگر وہ تاریخ کے مطابق نہ ہو تو آپ ایسے شخص کو مورخ کی حیثیت نہ دیں۔"

اس لئے بہت ممکن ہے کہ نیاز مند صاحب کی ذہنیت کا کوئی اسٹیج ڈائرکٹر بھی اُپج کر کے بالحاظ ملبوس تاریخی انارکلی کو میڈن فلم کمپنی کی "سی لیلے" بنا دے! یعنی اب جو بی انارکلی اسٹیج پر تشریف لائیں تو معلوم ہوا کہ آجکل کی کوئی یورپی نازک اندام آگئیں، گھٹنوں تک توسایہ، آستینیں غائب، گریباں غائب، چوٹی غائب، ناک بظاہر سلامت! آڑی مانگ، تیکھی چتون، ایک ہاتھ میں کیسۂ زرآویزاں، ایک ہاتھ میں پھول، اونچی ایڑی کا شو پہنے ہیں۔ اور شیخو بابا کے انتظار میں موٹر سے اُتری کھڑی ہیں!

آخیر میں تو نیاز مند صاحب نے اپنے دل کی ساری سیاہی پھیلا دی ہے۔ جس کا لب لُباب یہ ہے کہ تاج صاحب سے مس حجاب یا مسٹر چغتائی کے جو مراسم ہیں اُن کو معرض بحث میں نہ لانا چاہیئے تھا۔ یہ بات نیاز مند صاحب نے اپنی دانست میں یہ سمجھ کر لکھی ہے کہ میرا کہا ان دونوں کو برا معلوم ہوا۔ چنانچہ آپ کا بیان دیکھ۔ گویا انہیں خوش کر رہے ہیں۔ لیکن وہ یقین جانیں کہ مضمون میں مسٹر چغتائی کے متعلق جو مخلصانہ اظہار خیال کیا گیا۔ وہ ان کے فنی وقار کے لئے موزوں اور اس لئے لائق قدر ہے کہ اس میں انہیں عزت نفس کی طرف لایا گیا ہے۔ ... چغتائی صاحب جانتے ہیں، نیاز مند صاحب نہیں سمجھ سکتے۔ البتہ مس حجاب کے متعلق کئی مہینے پہلے لاہور کے ... ایک نیاز مند نے نہ جانے کیوں یہ اطلاع دی تھی کہ تاج صاحب سے ان کی شادی کا قرینہ ہے۔ یہ بات ... باتوں کی طرح بھولی بسری ہو گئی تھی کہ "انارکلی" کے ڈیڈیکیشن میں کھلے بندوں یہ الفاظ پڑھے۔

"جن مخلصانہ جذبات کا اظہار مقصود ہے وہ ایک لفظ میں ہی ادا ہو سکتے ہیں۔"

... سے بھولی بسری بات پھر تازہ ہو گئی اور خیال آیا کہ لاہوری دوست سچ کہتے تھے۔ آخر خود تاج ... نے بھی یہ بات عام کر دی، اور وہ "ایک لفظ" جس سے انہیں مخلصانہ جذبات کا اظہار مقصود ہے ... محبت ہو۔ جسے انگریزی میں قبل ازشادی "کورٹ شپ" کہتے ہیں۔ ... سمجھ میں نہیں آتا کہ دو ایسے ... نوجوانوں کے متعلق جو ایک کتاب کو بھی اپنے ... ایک دوسرے سے منسوب کرنا پسند کرتے ہوں اگر ... کے ضمن میں مزاحاً کچھ اُن کے متعلق بھی کہہ دیا گیا تو کیا برا ہوا۔ اس بات سے نیاز مند صاحب کچھ ایسے ... گئے ہیں کہ اپنے مضمون میں بھی "محض کنایتہً" اس کو بیان کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی شرمساری سر آنکھوں ... کریں میں نے بھی تو اشارے ہی کئے ہیں۔ یعنی الفاظ "اُن" اور "سرتاج" لطیف اشارے نہیں ... ہیں جو نیاز مند صاحب کو خواہ مخواہ اتنے بڑے معلوم ہوئے۔ اس پر بھی انہیں یا کسی اور صاحب کو اعتراض ... شوق سے یہ الفاظ مجھے کہہ لیں! عوض معاوضہ گلہ ندارد!!

نیاز مند صاحب بگڑیں یا سنوریں میں تحدیث نعمت اتنا اور کہوں گا کہ جس حصہ مضمون پر یہ اپنی بدذوقی ... رض ہیں وہ عروسِ سخن کا سہاگ ہے جسے ایک نوخیز ادب کو تفاولاً سر آنکھوں پر رکھنا چاہیئے۔ ان ... الرحمٰن صاحب مرحوم کو ذوقِ ادب نصیب ہوتا تو "سہرے" سے زیادہ اسے فریم میں سجا کر رکھتے!۔ اسی سلسلہ میں مجھے ... صاحب کو بھی مبارکباد دینی ہے کہ ساقی نے اپنی غیر جانبدارانہ روش سے بھی قدر دانانِ علم و ادب کی ... میں خاص مرتبت حاصل کر لی۔ ایک مدیر کی آزمائش کا اس سے زیادہ نازک وقت شاید ہی کوئی ہو ... وہ ایک چیز کے متعلق اپنی رائے کی مخالفت کی پرواہ نہ کرے۔ اور اپنی انتہائی فرض شناسی کے ثبوت ... مخالف رائے بھی اپنے ہی رسالہ میں آب و تاب سے شایع کر دے، تاکہ کام کی بات نہ رہ جائے اور ... کے روادار حلقے اچھائی برائی خود جانچ لیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ساقی آج اپنی اس ایمانداری سے ... ہوتا ہے، اور کیوں نہ ہو آپ کے ایثار و خلوص کے ہاتھوں کیا اسے اتنا بھی نہ ہونا چاہیئے تھا۔ رہا علم و

ادب کا معاملہ تو حاسد جو چاہے کہیں۔ ادب کے متوالے یہی کہتے ہیں:۔

ہمیں چاہیئے وہی ساقیا! جو برس چلے، جو چھلک چلے
ترے حُسن شیشہ بدست سے، تری چشم بادہ بجام سے

یہاں مجھے ایک بات اور کہنی ہے کہ شاہد صاحب نے "دودمانِ عالیہ" کے "سپلوت" ہو کہ انارکلی کے متعلق اچھے یا بُرے جیسے بھی مضامین شائع کئے وہ اُن کے ذوقِ سخن پر دال ہیں۔ مگر میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ زبدۃ الفضلا، پہلوانِ سخن، جناب مدیر نیرنگِ خیال کس کے فرزندِ ارجمند ہیں۔ جو بڑی بے تکلفی سے انہوں نے اپنے رسالہ کے صفحات کو "فلانچہ، تشہدین اور سفلہ پن" سے رونق بخشی! نیاز مند صاحب کا یہ نرا ادبی چکمہ تھا، جس سے یہ غریب بھی ان کے چکّر میں آ گئے۔ اور بیٹھے بٹھائے اپنے رسالہ کو ہدفِ ملامت بنایا۔ ورنہ یہ حق نہیں کہ اِن کے دوست نما دشمن کے "رشحاتِ قلب وقلم" پر خود انہیں کے ضمیر نے در پردہ اُن پر اس طرح ملامت کی ہے کہ:۔

"یہ مس حجاب امتیٔل کی بدقسمتی ہے کہ وہ اپنی انشاء پردازی کی وجہ سے اِس زمرے میں شامل ہو رہی ہیں جس میں اصطلاحًا نیاز مند صاحب بھی قدم رکھتے ہیں!"

جس پہ چار کے سامنے تو خیر وہ (نیاز مند صاحب سے مُراد ہے!) فخر کریں، مگر تنہائی میں رویا کریں! اور یہاں لگے ہاتھ اڈیٹر انقلاب کے کانوں تک بھی دستِ شوق تو نہیں یہ آوازِ شوق پہونچا دینی ہے کہ حضرت کو شاید معلوم نہیں چغتائی صاحب نے ان کی کیا کُنیت قرار دی ہے "بدزبان" اور "احمق"! جسے "شغل اکبر" کے خمیازے میں گرفتار ہو کر وہ اس طرح پایۂ ثبوت کو پہنچا رہے ہیں کہ "انارکلی" پر جو کچھ کہا گیا اور جس اسپرٹ میں کہا گیا اُسے نادانی سے نہ سمجھے۔ دیکھئے اس دفعہ بھی اسپرٹ کے لفظ کو کہیں "شغل اکبر" کا صرف تلازمہ نہ سمجھ لیجئے گا! کیونکہ قرائن سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ مجازی سالک سے کہیں زیادہ حقیقتہً نرے "احمقِ پھپھوندی" ہیں! سچ ہے کہ پیٹ بھرنے کے لئے اخبار کا کاسۂ گدائی لئے پھرنا اور چیز ہے اور ادب اور چیز ہے! بہرحال چونکہ نیاز مند صاحب نے مجھے بھی جواب الجواب کا چیلنج دیا تھا اس لئے یہ فرمائشی حاضر ہے! جسے افسوس ہے کہ چند ناگزیر اسباب سے کسی قدر بدیر پیش کر سکا۔ ان صاحب کی یہ خواہش بھی تھی کہ جواب "کھسیانا" ہو تاکہ کہیں یہ سرخرو نہیں۔ جس کی میں نے کوشش کی ہے۔ مگر پھر بھی جواب اُن کے حق میں "دنداں شکن" ثابت ہو تو ان کی قسمت!!۔

---

# زرد چنبیلی

از جناب محمد نقی دہلوی

کسی زمانہ میں ایک امیر و کبیر آدمی پھولوں کا عاشق تھا۔ اُس نے ایک بہت وسیع میدان میں پھولوں کا ایک باغ لگایا۔ باغ کیا لگایا گویا پھولوں کی ایک دُنیا بسائی۔ پھولوں کی اس دُنیا میں ہر قسم کے گلاب، گل عباسی، گیندا، موتیا، جوہی، چھوئی مُوئی، بیلا، چنبیلی، نسرین، نسترن، سورج مکھی، بکاولی، سوسن، رات کی رانی غرض دُنیا بھر کے بہترین پھول اس باغ میں جمع تھے۔ اس وقت یہ باغ باغ نہ تھا بلکہ دُنیا کے خوشنما ترین اور عطر بیز پھولوں کا لاثانی اور دلفریب گلدستہ تھا۔ خلقِ خدا اس باغ کو "پھولوں کی جنت" کے نام سے یاد کرتی تھی۔ اِس "پھولوں کی جنت" کے عین وسط میں امیر نے اپنے رہنے کے لئے ایک نفیس بنگلہ بنوا رکھا تھا۔ وہ یہاں تنِ تنہا ایک مالی اور اپنے پھولوں کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ اور دن رات پھولوں کی عطر بیزیوں سے مسرور و سرشار رہتا تھا۔ امیر ایک دن اپنے مالی سے کہنے لگا "کہیں سے کوئی نیا پھول تلاش کرکے لا" بوڑھا مالی یہ سُنکر بہت گھبرایا اور عالتِ یاس و نا اُمیدی میں کہنے لگا "آقا میں مشرق و مغرب، شمال و جنوب، دُنیا بھر میں پھرا ہوں، تمام دُنیا میں جو پھول دستیاب ہوسکتے ہیں وہ آپ کے ہاں موجود ہیں۔ پھر میں کہاں سے کسی نئے پھول کا کھوج نکالوں؟" اس کے آقا نے کہا "میں یہ مانتا ہوں کہ دُنیا بھر کے پھول میرے ہاں اپنی بہار دکھا رہے ہیں مگر میں تو ایک نیا پھول چاہتا ہوں۔ جاؤ جب تک کوئی نیا پھول تم دستیاب نہ کرسکو مجھے اپنی شکل نہ دکھانا!" بوڑھا مالی باغ میں گردن جھکائے چلا جارہا تھا۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں بندھ رہی تھیں، دو چار قدم چلکر زمین پر بیٹھ گیا اور رو رو کر کہنے لگا "ہائے میں تو اس بڑھاپے میں گھر سے بے گھر ہوگیا۔ اب آقا کو کس طرح خوش کروں؟ کہاں سے کوئی نیا پھول لاؤں؟"

---

شام کو اکثر اس باغ میں پریوں کا ایک جھلڑ سیر کرنے کے لئے آیا کرتا تھا۔ اس وقت نیلوفری، گلابی، چھوئی موئی اور سبز پری، اٹھکھیلیاں کرتی ہوئی آرہی تھیں۔ اُنہوں نے اس بوڑھے کو روتے دیکھا تو نیلوفری کہنے لگی "خبر نہیں اس بے چارہ پہ بڑھاپے میں کیا اُفتاد پڑی کہ زمین پر بیٹھا ہوا رو رہا ہے۔ ذرا اس سے پوچھیں تو سہی کہ کیا ماجرا ہے؟ شاید ہماری مدد سے اس بیچارے کی مشکل آسان ہوجائے" چھوئی موئی کہنے لگی "واہ بنو واہ۔ نگوڑا رو رہا ہوگا اپنے کرموں کو ہمیں اس کے ٹسوے بہانے سے کیا واسطہ؟۔ ہم یہاں سیر کرنے اور دو گھڑی دل بہلانے کے لئے آئے ہیں یا کسی کے دُکھ درد میں شریک ہونے؟" نیلوفری نے جواب دیا "بنو تمہارا کلیجہ تو پتھر کا ہوگیا ہے۔ کوئی کتنی ہی ایڑیاں رگڑے پچھاڑیں کھائے تمہارا دل تو پسیجتا ہی نہیں، بنو مجھے تو بیچارے کی اس حالتِ زار پر ترس آرہا ہے۔ میں تو ضرور پوچھوں گی، چاہے تم ٹھیرو یا نہ ٹھیرو" چھوئی موئی بولی "ہاں بڑی بے چاری

انوکھی! تم ہی تو اس کی ایک رفیق غمگسار پیدا ہوئی ہو۔ تمہاری مشکل کشائی کی تو اسے ضرورت ہے۔ بڑی خدا ترس اور رحم دل بنی ہیں!" نیلو فری کہنے لگی "اور نہیں تو تمہاری طرح کہ نام رکھوایا "چھوئی موئی" اور ہیں ایسی سنگدل"

سبز پری نیلو فری سے کہنے لگی "بُو اس موئی "چھوئی موئی" کی تو ہمیشہ یونہی للو چلتی ہے۔ چلو ہم بوڑھے کا حال پوچھیں" اور بوڑھے مالی کے پیچھے کھڑے ہو کر کہنے لگیں "تو کیوں رو رہا ہے؟ کچھ تو بتا۔ شاید ہماری مدد سے تیری مشکل آسان ہو سکے"

بوڑھے مالی نے اپنی گردن اُٹھائی اور آنسوؤں کے پردوں میں سے پریوں کا ایک غول دیکھا، اور کہنے لگا "تختۂ زمین پر جس قدر پھول پیدا ہوتے ہیں وہ سب اس باغ میں موجود ہیں اور اب میرا آقا ایک نیا پھول چاہتا ہے۔ فرض کرو اگر تم نے مجھے بتا بھی دیا کہ فلاں جگہ سے ایک نیا پھول لے آ تب بھی وہاں پہونچتے پہونچتے تو میری عمر تمام ہو جائیگی"

پریوں نے جواب دیا "تمہارے باغ میں سفید چنبیلی ہے۔ تم اُسے رنگ کیوں نہ لو؟" بڈھے نے کہا "مگر میں اس کو کس طرح رنگ سکتا ہوں؟" پریوں نے جواب دیا "اس کو ہم پر چھوڑ دو۔ آنکھیں پونچھو، گھر جاؤ اور آرام سے سو رہو، اور صبح کو سفید چنبیلی کے تختہ پر جا کر دیکھنا تمہیں "زرد چنبیلی" اپنی بہار دکھائیگی۔

---

رات کو جب ساری دُنیا سو رہی تھی۔ نیلو فری اپنی سہیلیوں کو بُلا لائی اور چنبیلی کے تختہ پر لے گئی اور رنگائی کا سامان دیکر کہنے لگی "ان پھولوں کو رنگ دو۔ مگر یہ خیال رکھنا کہ کہیں سب کے سب نہ رنگ جائیں ورنہ تنوع باقی نہ رہیگا اور دلآویزی آدی رہجائیگی۔ اس کے علاوہ سفید چنبیلی بھی تو ایک بہت پیارا پھول ہے ہمیں تو محض اس میں تنوع پیدا کر کے اس بوڑھے کے آقا کو خوش کرنا ہے" پریوں نے سفید چنبیلی کو رنگنا شروع کیا اور صبح ہونے سے پہلے پہلے بہت سے پھولوں کو رنگ کر چلدیں اور اس عمدگی اور صفائی کے ساتھ رنگا کہ ہزاروں سال گذر گئے مگر کسی کو آج تک شبہ تک نہ ہوا کہ یہ رنگے ہوئے ہیں۔ دوسرے دن صبح بوڑھا چنبیلی کے تختہ پر گیا اور جب اُس نے زرد چنبیلی دیکھی تو اُس کی آنکھیں تحیر و تعجب سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ فرطِ مسرت سے ناچنے لگا اور تعریف کے گیت گانے لگا۔ اسکی یہ حالت دیر تک قائم رہی اور اسی حالت میں وہ مالک کے دروازہ پر پہنچا اور اس زور سے چلایا کہ اس کا آقا سوتے سوتے اُچھل پڑا اور بھاگا ہوا باہر آیا۔ بُڈھا کہنے لگا "میرے آقا! میں نے نیا پھول تلاش کر لیا ہے۔ آؤ، چلو دیکھو، وہ کیسا پیارا پھول ہے" اُس کا مالک اپنی پوری رفتار کیساتھ بُڈھے کے پیچھے ہو لیا۔ جب اسکی نگاہیں اس موہنی اور نازک زرد چنبیلی پر پڑیں تو اس نے بوڑھے کو گلے لگا لیا اور کہنے لگا "اب تا زیست تو آرام کی زندگی بسر کر۔ میں اس نئے پھول سے مطمئن ہو گیا اور اب میں محسوس کرتا ہوں کہ دُنیا میں اس سے بہتر خوبصورت اس سے نازک اور لطیف۔ بھینی بھینی خوشبو دار پھول نہ آجتک پیدا ہوا ہے اور نہ آیندہ ہو گا۔

---

# سپید گرجا

از جناب جمیل برنی

"ہاں! کہے جاؤ ـــ سوسن ـــ تم کہے جاؤ۔ نصف شب کی نماز کیسی ہوتی ہے؟"

دسمبر کا مہینہ تھا، بڑا دن قریب تھا۔ پیرٹ کے والدین اپنے کھیتوں سے واپس آ گئے تھے، اُس کی ماں گائے کا دودھ نکالنے لگی اور باپ گودام میں اوزار رکھنے چلا گیا۔ پیرٹ ایک چھوٹی سی کرسی پر آتشدان کے قریب بیٹھا کھانے کا انتظار کر رہا تھا، اور اُس کی بڑی بہن سوسن اُس کے سامنے بیٹھی تھی۔

پیرٹ نے اپنے دونوں ہاتھ آگ کی طرف بڑھائے۔ اُس کا گلاب کی پھول کی طرح سرخ چہرہ اور سنہری بال آگ کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ سوسن بہت متانت سے بیٹھی نیلے رنگ کا ایک اونی موزہ سی رہی تھی۔ آگ کے اوپر ایک دیگچی رکھی تھی، جس میں سے سپید رنگ کی ہلکی ہلکی بھاپ اُٹھ رہی تھی، اور گرم کلجے کی خوشبو آ رہی تھی۔

"سوسن تم کہے جاؤ۔ نماز کیسی اچھی ہوتی ہے؟"

سوسن کہنے لگی "وہاں اس قدر شمعیں روشن کی جاتی ہیں کہ آدمی کو جنت میں پہونچ جانے کا شبہ ہوتا ہے ....... اور سلیمان کے پیارے پیارے گیت گاتے ہیں ....... کم عمر مسیح بہترین پوشاک پہنے ..... کتنا خوبصورت معلوم ہوتا ہے ....... گھاس کے بچھونے پر لیٹا ہوا ....... اور پاک مریم سر سے پاؤں تک نیلی چادر اوڑھے ....... اور سینٹ جوزف سرخ رنگ کے سادے لباس میں ...... اور گڈریے بہت سی بھیڑیں لئے ہوئے ..... بیل اور گدھے ..... مشرق کے بہت سے بادشاہ سپاہیوں کی سی وردی پہنے ...... لمبی لمبی ڈاڑھیاں ..... مسیح کے لئے تحفے لاتے ہیں ...... کیسی اچھی اچھی چیزیں ..... گڈریے اُس کے لئے پکوان لاتے ہیں اور پھر گڈریے ...... اور بادشاہ ...... اور ہمارے پادری ...... اور بیل اور گدھے ..... اور بھجن گانے والے لڑکے ...... اور بھیڑیں ..... سب مسیح سے برکت مانگتے ہیں ....... اور فرشتے بھی آتے ہیں جو آسمان سے مسیح کے لئے ستارے لاتے ہیں"

سوسن پچھلے سال آدھی رات کی نماز کو گئی تھی، اور اُسے یقین تھا کہ اُس نے یہ چیزیں نماز میں دیکھی تھیں۔

پیرٹ بہت خوشی سے سنتا رہا اور پھر کہنے لگا "میں آدھی رات کی نماز کو جاؤنگا"

اُس کی ماں جو ابھی کمرے میں داخل ہوئی تھی، کہنے لگی "تم ابھی بہت چھوٹے ہو، جب سوسن کے برابر ہو جاؤ گے تب ہم تمہیں بھی لے جائیں گے"

پیرٹ بہت غصہ میں بھر کر بولا "نہیں میں ضرور جاؤں گا"

لیکن میرے پیارے بچے گرجا بہت دُور ہے، سردی کا موسم ہے، برف گر رہی ہے تمہیں کیسے لے چلیں۔ زیادہ ضد نہیں کرتے۔ اگر تم اچھے بچوں کی سی باتیں کروگے اور خوشی سے جاکر سو جاؤگے تو تم اپنے بچھونے ہی میں لیٹے لیٹے آدھی رات کی نماز سپید گرجا میں سُن لوگے۔"

پیرٹ اپنی مٹھیاں بند کرکے بولا "نہیں میں ضرور جاؤں گا۔"

---

"کون کہتا ہے کہ میں ضرور جاؤں گا۔؟" یہ پیرٹ کے باپ کی سخت آواز تھی۔

پیرٹ نے زیادہ ضد نہ کی۔ بہت سمجھدار بچہ تھا۔ جانتا تھا کہ ضد فضول ہے۔ اس لئے کہنا مان لینا ہی بہتر سمجھا۔ لہٰذا خاموش ہوگیا۔

سب کھانا کھانے لگے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ لیکن پیرٹ بالکل خاموش رہا۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا۔

"سوسن اپنے چھوٹے بھائی کو سُلادو۔"

سوسن پیرٹ کو سونے کے کمرہ میں لے گئی۔ اس میں سُرخ دری کا فرش ہو رہا تھا۔ ایک طرف سنگ مرمر کی میز بچھی ہوئی تھی جس پر ایک چھوٹی الماری اور گلدان رکھا تھا۔ ایک طرف دیوار پر چوکھٹے میں لگا ہوا کریج کا سیاہ تختہ لٹک رہا تھا جس پر سوسن نے انگریزی میں حروف لکھ رکھے تھے۔ کونے میں بلی بیٹھی تھی۔ دیوار کے قریب ایک بڑا پلنگ تھا جس کی پائینتیوں پر ایک رگ رکھا تھا۔ اُس پر گلاب کے بڑے بڑے پھول بنے ہوئے تھے۔ اُس کے برابر میں دو چھوٹے چھوٹے پلنگ ان دونوں بہن بھائیوں کے تھے۔ جن پر سپید مچھر دانیاں لگی ہوئی تھیں۔

جب پیرٹ اپنے پلنگ پر لیٹ گیا تو سوسن نے مچھر دانی کے پردے گرادئے اور کہنے لگی:۔

"تم دیکھوگے کہ آدھی رات کی نماز سپید گرجا میں کیسی اچھی ہوتی ہے۔"

پیرٹ نے کچھ جواب نہ دیا۔

وہ سویا نہیں اور نہ سونا چاہتا تھا بلکہ آنکھیں کھولے چپکا پلنگ پر لیٹا باورچی خانہ میں اپنے والدین کے پاؤں کی آہٹ سنتا رہا۔ سوسن کے کتاب پڑھنے کی تیز آواز بھی آرہی تھی۔ اسے ایک دم خیال آیا کہ شاید سب کے سب اخروٹ کھا رہے ہیں، اور اس کا بھی دل چاہنے لگا۔

تھوڑی دیر کے بعد اس کی ماں کمرے میں آئی اور مچھر دانی اُٹھاکر بچہ کو دیکھا لیکن اُس نے فوراً اپنی آنکھیں بند کرلیں اور خاموش لیٹا رہا۔ آخرکار اُس نے سب کے باہر جانے کی آواز سُنی۔ دروازہ بند کردیا گیا اور مکان میں خاموشی ہوگئی۔

---

پیرٹ اپنے بستر سے اُٹھا اور اندھیرے میں اپنے کپڑے ڈھونڈنے لگا۔ جرسی بھی مل گئی، کوٹ بھی مل گیا،

لیکن واسکوٹ نہ ملی۔ جلدی میں کوٹ اُلٹا پہن لیا۔ چھوٹی چھوٹی اُنگلیاں سردی سے کانپ رہی تھیں۔ بہت کوشش کی مگر گھبراہٹ میں ایک بٹن بھی ٹھیک نہ لگا سکا۔ موزہ بھی ایک ہی ملا۔ دیوار کے سہارے کھڑے ہو کر اندھیرے میں وہ بھی اُلٹا ہی پہنا گیا، ایڑی اوپر کی طرف آگئی۔ جوتا پہنا وہ بہت تنگ آیا۔ موزہ نہ ہونے کی وجہ سے دوسرا جوتا پاؤں میں ڈھیلا معلوم ہو رہا تھا۔ اندھیرے میں کسی چیز سے بچتا کسی سے ٹکراتا کمرے کے دروازہ تک پہونچا اور کواڑ کھول کر باورچی خانہ میں آیا۔ یہاں روشنی ہو رہی تھی، کھڑکی کھلی ہوئی تھی، اور باہر سُپید سُپید برف گر رہی تھی۔

پیٹر بہت ہوشیار تھا، وہ سڑک کے بڑے دروازہ پر نہیں گیا، اُسے یقین تھا کہ وہاں قفل پڑا ہوگا، اس لئے ایک دوسرے دروازہ سے باورچی خانہ سے نکل کر اصطبل میں آگیا۔

پاؤں کی آہٹ سُن کر گائے نے گردن ہلائی، ایک بکری بھی اُٹھی۔ اور آہستہ آہستہ "مَیں مَیں" کرتی پیٹر کے قریب آکر اُس کا ہاتھ چاٹنے لگی گویا وہ اُسے روکنا چاہتی تھی "کہاں جاتے ہو، یہاں ہمارے پاس ٹھیرو، دیکھو کیسا گرم کمرہ ہے۔ باہر سردی بہت زیادہ ہے، برف گر رہی ہے، تم ابھی بچہ ہو وہاں جاکر کیا کرو گے" لیکن اُس نے ایک نہ سُنی، پنجوں کے بل کھڑے ہو کر اصطبل کے پھاٹک کی چٹخنی کھولی اور برف میں باہر نکل گیا۔

پیٹر کے مکان سے گرجا تقریباً آدھ میل تھا۔ اونچے اونچے درختوں سے گھری ہوئی ایک پختہ اور چوڑی سڑک پر تھوڑی دور چلنے کے بعد سیدھے ہاتھ کو مڑتے ہی سُپید گرجا کی بلند مینار نظر آنے لگی۔

پیٹر بے تکلف اسی سڑک پر روانہ ہو گیا۔ تمام سڑک، جھاڑیاں اور درخت سُپید برف سے ڈھکے ہوئے تھے، تمام فضا میں برف کے گالے اُڑ رہے تھے۔ پیٹر کے پاؤں ٹخنوں تک برف میں دھنس گئے اور جوتے بھیگ کر بہت بھاری معلوم ہونے لگے۔ اس کے بالوں میں اور کندھوں پر بھی برف جم گئی تھی لیکن اس کی اُس نے کوئی پرواہ نہ کی، کیونکہ اُسے اپنی آنکھوں کے آگے ایک تیز سُنہری روشنی میں نوعمر مسیح، پاک مریم، مشرق کے بادشاہ اور فرشتے ہاتھوں میں ستارے لئے کھڑے نظر آ رہے تھے۔ ایک مقناطیسی قوت تھی جو اُسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی، وہ برابر آگے بڑھتا رہا۔ لیکن اُس کی رفتار ہلکی پڑ گئی۔ برف کی وجہ سے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ زمین سے آسمان تک سُپید سُپید روئی سے برف کے گالے اُڑتے اُڑتے پھر رہے تھے اور اُسے خبر نہ رہی تھی کہ میں کہاں ہوں۔

چھوٹے چھوٹے پاؤں سیسہ کی طرح وزنی معلوم ہونے لگے۔ ناک، کان اور ہاتھ سب سردی سے ٹھٹھر رہے تھے۔ سر سے برف پگھل پگھل کر کوٹ کے کالر میں سے اندر اُتر رہی تھی۔ اس سے تمام قمیص بھی بھیگ گئی تھی۔ کسی پتھر سے ٹھوکر کھا کر گرا اور اس کا ایک جوتا پاؤں سے نکل گیا۔ بہت دیر تک برف میں گھٹنے ٹیکے ہاتھوں سے اُسے ڈھونڈتا رہا۔ سردی کی تکلیف نے سب بھلا دیا۔ اب نہ اُسے مسیح دکھائی دیتا تھا نہ مریم۔ مشرق کے بادشاہ اور ہاتھوں میں ستارے لئے فرشتے کوئی بھی یاد نہ رہا۔

رات کی وحشت ناک خاموشی سے اُس کے دل پر خوف طاری ہو رہا تھا۔ برف سے ڈھکے ہوئے اونچے اونچے درخت لمبے لمبے سپید دیو معلوم ہوتے تھے۔

اُس کا دل تھر تھر کانپ رہا تھا۔ خوف سے وہ رونے لگا اور چلایا "اماں! ..... اماں!"

برف گرنی بند ہوگئی۔ پیٹرٹ نے چاروں طرف دیکھا۔ سامنے سپید گرجا کی نوکدار اونچا مینار نظر آیا۔ بجلی کی تیز روشنی کھڑکیوں سے نکل کر باہر برف پر گر رہی تھی۔ پھر اُسے وہی خیال بندھ گیا اور اسکی ہمت بڑھ گئی۔ گرجا سامنے تھا اور وہ ایک مرتبہ پھر مسیح کی پیاری صورت دیکھ رہا تھا۔

اب وہ سیدھی سڑک پر چلنے کے بجائے گرجا کی روشن کھڑکیوں پر نظر جمائے کھیتوں میں سے ہوتا ہوا اُنکی طرف روانہ ہوا۔ ایک درخت کے تنے سے ٹکرا کر گرا اور اس کا دوسرا جوتا بھی کھو گیا۔

غرض کھیتوں میں گرتا پڑتا کھڑکیوں پر نظر جمائے گرجا کی طرف بڑھا چلا جا رہا تھا۔ آہستہ چلنے کی وجہ سے اُسکے چھوٹے چھوٹے پاؤں کے نشانات سپید برف پر اب زیادہ قریب قریب پڑ رہے تھے۔

---

پیٹرٹ برابر آگے بڑھ رہا تھا۔ اور گرجا کے قریب ہوتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ نماز کی آواز کھڑکیوں سے نکل کر اُس کے کانوں میں آنے لگی "آ۔ اے پاک مسیح۔ آ۔ ..."

پیٹرٹ نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیے۔ اس کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ اور وہ اپنے خیال میں غرق گرجا کے قبرستان میں داخل ہوا۔ مغربی پھاٹک کے اوپر محراب دار کھڑکی سے بجلی کی روشنی نکل کر برف پوش زمین پر گر رہی تھی اور اُس کے سامنے بالکل نزدیک سپید گرجا میں نماز ہو رہی تھی۔ اب آواز اور صاف سُنائی دینے لگی۔

"نیچے میدانوں میں۔ مَیں سُنتا ہوں آسمان سے آنے والے فرشتوں کی آواز"

تکان کے مارے اب پیٹرٹ میں چلنے کی سکت نہ رہی تھی۔ اس کی طاقت اور ہمت جواب دے رہی تھیں، مگر آہستہ آہستہ قدم اُٹھائے چلا جاتا تھا۔ نماز کا شوق تھا جو اُسے برابر گرجا کی طرف کھینچ رہا تھا۔

یکایک ایک برف سے ڈھکی ہوئی قبر سے ٹھوکر لگی اور وہ لڑکھڑا کر گر گیا۔ گرتے ہی آنکھیں بند ہوگئیں۔ فرشتوں کے گیت سُن سُنکر وہ اب بھی مُسکرا رہا تھا۔ اس کے کانوں میں برابر آواز آ رہی تھی۔

"بیتلحم میں مسیح پیدا ہوا"

وسیع فضا میں خاموشی سے گرنے والی نرم نرم سپید برف نے اُس کا سارا جسم ڈھک دیا اور اس طرح پیٹرٹ نے نیم شبی نماز سپید گرجا میں سُنی۔

---

(بسلسلۂ صفحہ نمبر ۲) لڑکا شکل وصورت سے کاشتکار معلوم ہوتا تھا اور قریب پڑی ہوئی درانتی اِس خیال کی تائید کر رہی تھی۔ نوجوان لڑکی بھی میلے کچیلے دیہاتی وضع کے کپڑوں میں ملبوس تھی۔ اس کے خد وخال ایسے زیادہ دلفریب نہیں تھے۔ مگر پھر بھی عہدِ شباب نے وہ رعنائی پیدا کر دی تھی جس کو ایک محبت بھرا دل ہی خوب محسوس کر سکتا ہے، وہ میری موجودگی سے قطعی بے خبر اپنی گفتگو میں محو تھے۔

محض اس خیال سے کہ ان کے انہماک میں کوئی خلل پیدا نہ ہو۔ میں دبے پاؤں واپس لوٹ آیا۔ میرا خیال ہے کہ حُسن کی پاکیزہ خلوتوں میں دخل انداز ہونا مسلکِ عشق میں ایک ایسا اخلاقی جُرم ہے جو ناقابلِ معافی ہے۔

میں واپس لوٹ آیا۔ مگر دلی تاثرات میں ایک زبردست انقلاب رُونما ہو چکا تھا۔ گذرے ہوئے واقعات کی یاد نے سرد آہیں کھینچنے پر مجبور کر دیا۔ مجھے وہ زمانہ یاد آ گیا جب دُنیا کی کائنات کا ہر ذرّہ میری نگاہ میں حسین معلوم ہوتا تھا۔ جب میرا عہدِ شباب اپنی پوری بہار پر تھا اور قدرت کے ہاتھوں تودہ خاک سے اُگنے والا ہر پودہ مجسم پھول نظر آتا تھا۔ مجھے وہ لمحہ بھی یاد آ گیا جب "اُس" کے ساتھ پوشیدہ طور پر میری آخری ملاقات ہوئی تھی، اور انجام کار "اُس" نے یہ کہا تھا۔

"مجھ کو تنہا مت چھوڑو ـــ میں ضرور تمہارے ساتھ چلوں گی"

عرصہ دراز کے بعد اِن الفاظ کی صدائے بازگشت ایک دیہاتی لڑکی کی زبان سے سُنی اور میرے آنسو بے اختیار ہو کر آنکھوں سے بہ نکلے۔

# نقد و تبصرہ

## سیرتِ محمد علی

قائد اعظم مولانا محمد علی کی زبردست شخصیت سے بچہ بچہ واقف ہے۔ کبھی ہندوستان کا گوشہ گوشہ اِس بطلِ مشرق کے آوازۂ حق سے گونجتا تھا۔ کبھی اس شیر بیشۂ حریت کی بانگِ فلک شگاف سلطنت کے ایوانوں کو لرزاتی تھی کبھی اسکی "زبانِ برک" سے مدبرانِ فرنگ کے دل آب آب ہوتے تھے۔ کبھی اس کا "قلم میکا لے" قرطاس کا مرثیہ پڑھتا، Choice of the Turks کا دنداں شکن جواب دیکر دشمنِ اسلام کے تخریبی پروپگنڈہ کو شکست دیتا تھا۔ اور کبھی یہ "نپولین کا دل" رکھنے والا ہیرو انتہائی انسانی جرات سے خداوندانِ حکومت سے وہ "اختیار طلب کرتا تھا جس کی رُو سے اگر لارڈ ریڈنگ بھی ہندوستان میں کسی جُرم کے مُرتکب ہوں تو انہیں بھی قید و بند میں ڈال دیا جائے"۔

قوم و ملک کو رئیس احمد صاحب جعفری کا شکر گذار ہونا چاہیئے کہ آپ نے شہید ملت و قوم مولانا محمد علی کی سیرت مرتب کرکے مولانا موصوف کی سوانح حیات کو جو قوم کے لئے شمع ہدایت کا کام دے گی زمانہ کی باد تند سے بچا لیا۔ کسی شخص کی سیرت مُرتب کرنے میں جس قدر کاوش اور جانکاہی کرنی پڑتی ہے اُس کا کچھ وہی لوگ اندازہ لگا سکتے ہیں جن کے ذوقِ تحقیق و تدقیق نے کسی تاریخی واقعہ کی تلاشِ صداقت میں اپنی راتیں کالی کی ہوں۔

کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصہ میں مولانائے محترم کی تعلیم و تربیت، علم و فضل، مذہبی اور سیاسی اعتقادات، اخلاق و کردار اور جذبۂ قوم و ملت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دوسرے حصہ میں مرحوم کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو نہایت واضح اور مشرح طور پر بیان کیا گیا ہے۔ مولانا کی زندگی کا سیاسی پہلو جو نہایت نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ نہایت شرح و بسط کے ساتھ رقم کیا گیا ہے۔ طرزِ بیان نہایت زوردار اور پسندیدہ ہے۔ ادبی لحاظ سے بھی کتاب ایک خاص حیثیت رکھتی ہے۔ کتاب مکتبہ جامعہ دہلی سے شایع ہوئی ہے جو اس امر کی کافی ضمانت ہے کہ وہ کتابت کی غلطیوں اور طباعت کی خامیوں سے پاک ہے۔ قیمت تین روپے۔

مکتبہ جامعہ ملیہ۔ قرول باغ دہلی۔ یا ساقی بکڈپو۔ دہلی سے طلب کیجئے۔

---

## جمہوریہ ٹرکی کا نشاۃ الثانیہ

مولانا محمد علی کا مشہور مصرع ہے "اِسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد"۔ اس مختصر سے مصرع میں جس صداقت کا اظہار کیا گیا ہے اسلامی تاریخ اُسکی شاہد ہے، اور مُسلم قومی زندگی کا یہ کچھ اُصول سا بن گیا ہے کہ جب اس قوم پر حد درجہ مصیبت اور نکبت آئی اور جب اُسے حوادثات زمانہ نے گھیرا، کوئی سرسید، کوئی محمد علی، کوئی رضا شاہ پہلوی، کوئی امان اللہ خاں، کوئی مصطفےٰ کامل پاشا، مصری اور کوئی مصطفےٰ کمال پاشا پیدا ہوا اور اس نے مردہ قالب میں جان ڈالی، اور

خفتہ قوم کو بیدار کیا۔ چنانچہ جنگِ عظیم کے دوران میں اور اُس کے بعد ٹرکی وہ "مردِ بیمار تھا جو بسترِ مرگ پر پڑا ہوا زندگی کے آخری سانس گن رہا تھا" اور جس کی مملکت کے دوَلِ یورپ نے (جو عرصہ سے اس پر اپنے دندانِ آز تیز کر رہے تھے) حصّہ بخرے بھی کر لئے تھے۔ وہی ٹرکی مصطفےٰ کمال پاشاہ کی زیرِ قیادت آج دشمنوں کی چھاتی پر مونگ دَل رہا ہے۔

ضمیر احمد صاحب ہاشمی ایم۔ اے۔ نے جمہوریہ ٹرکی کی ایک مختصر مگر جامع تاریخ قلم بند کی ہے جسکے ابتدائی چند ابواب میں ترکوں کی ابتدائی تاریخ طرزِ تمدن اور طرزِ حکومت پر روشنی ڈالی ہے اور اس خاص طرزِ تمدن اور طرزِ حکومت کے ماتحت جو ہیئت اجتماعی قوم نے اختیار کی اُس کو بھی واضح کیا ہے جس سے مابعد کی تاریخ کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ عثمان خلفائے ٹرکی کے عہدِ حکومت کا مختصر سا خاکہ ہے اور اُن کے مظالم کا اجمالاً بیان ہے۔ آخری ابواب میں قوم کی بیداری کا تذکرہ ہے۔ نوجوان ٹرکی کی عملی جد و جہد، قربانی اور سرفروشی کا مذکور ہے۔ روسیوں سے جنگ اور جنگِ عظیم میں ٹرکی کی شمولیت کا مجملاً بیان ہے۔ ترکوں کی آزادی، کمال پاشاہ کی قیادت، خلافت سے دست برداری کا ذکر ہے۔

موجودہ ٹرکی کے متعلق ہندوستان میں نہایت گمراہ کُن پروپگنڈا کیا گیا ہے جسکی وجہ سے کوئی شخص ٹرکی کے متعلق صحیح رائے قائم نہیں کر سکتا۔ مگر اس کتاب کو پڑھنے کے بعد موجودہ ٹرکی اور اُسکے آیندہ کی ترقی یا تنزل کے امکانات کے بابت ایک خیال ضرور قائم کیا جا سکتا ہے۔ کتاب جامع و مانع ہے لیکن مصنّف سے چند ایسی باتیں فروگذاشت ہو گئی ہیں جن کا بیان ضروری تھا۔ مثلاً مصنّف نے اس امر پر قطعی روشنی نہیں ڈالی کہ باوجودیکہ ٹرکی کے تعلقات برطانیہ کلاں سے ہمیشہ خوشگوار رہے۔ جنگِ عظیم میں ٹرکی نے برطانیہ کے خلاف کیوں حصہ لیا۔ قیمت عہ علاوہ محصول ڈاک۔

ملنے کا پتہ:۔ ساقی بکڈپو۔ دہلی۔

م۔ ح۔

## نوجوان ورتھر کی داستانِ غم

مشہور جرمن فلسفی شاعر اور حکیم حیات گوئٹے کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ فاؤسٹ کی غیر فانی شہرت اُس کے مُصنّف کو زندۂ جاوید رکھے گی۔ ریاض الحسن صاحب ایم۔ اے۔ نے اِسی شہرۂ آفاق و عدیم المثال ہستی کی بے مثل تصنیف "ورتھر" کا لاجواب ترجمہ کر کے اُردو ادبیات میں گرانقدر اضافہ کیا ہے۔ ترجمہ کی دشواریاں یوں ہی کچھ کم نہیں لیکن جن حضرات نے گوئٹے کی کوئی تصنیف (جرمن زبان کی تو خبر نہیں) انگریزی میں پڑھی ہے، جانتے ہیں کہ گوئٹے کی ہمہ گیر شخصیت اس قدر متلوّن اور اس درجہ مشکل پسند واقع ہوئی ہے کہ اس کی کسی تصنیف کو پوری طرح سمجھنا بھی دُشوار نظر آتا ہے۔ لیکن لائق مترجم نے نہ صرف شُستہ و رُفتہ زبان میں "ورتھر" کا مکمل و عمدہ ترجمہ کیا ہے بلکہ ابتدائی ۸۰ صفحات میں گوئٹے کی سیرت، اُس کا فلسفہ، اور اُسکی جُملہ تصانیف پر مفصّل و پُر مغز تبصرہ بھی کیا ہے جس سے اصل کتاب کے سمجھنے کے علاوہ گوئٹے کی دیگر تصانیف کے مطالعہ میں بھی معقول امداد ملے گی۔ "ورتھر" کی عمدگی اور دلکشی کی دلیل اِس سے زیادہ اور کیا ہو گی کہ نپولین جیسے بیدار مغز و مصروف انسان نے اِسے ایک دو دفعہ نہیں پورے سات مرتبہ پڑھا۔ گوئٹے نے اپنی اور اپنے ایک دوست کی سیرت کے باہمی

امتزاج سے "ورتھر" کی تشکیل کی ہے اس لئے اس افسانہ کی ہر سطر میں حقیقت کا رنگ بھرا ہوا ہے اور عین فطرت کے مطابق ہونے کے باعث ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویٹے جو کچھ کہہ رہا ہے دراصل ہمارے ہی دل کی بات ہے ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا     میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

"ورتھر" کا قصہ خطوں کی صورت میں بیان کیا گیا ہے اس لئے اس کا بیساختہ پن دل میں اور بھی کھب جاتا ہے حُسن کی ہلاکت پسندی اور عشق کی نامرادی کی اس داستان جگرخراش کو جو شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی ہے اور کسی تصنیف کو حاصل نہیں ہوئی۔ ریاض الحسن صاحب کی مساعی جمیلہ مشکور ہیں کہ انہوں نے جرمن زبان کے اس شاہکار کو اُردو میں بطریق احسن منتقل کیا۔ کتابت و طباعت دیدہ زیب۔ ضخامت ۲۰۰ صفحات۔ قیمت عہ/

ملنے کا پتہ:- لٹریری سنڈیکیٹ (نمبر ۱ ایلجن روڈ) الہ آباد

---

**نرالی اُردو**- جناب ایم۔ اے مُغنی۔ بی۔ اے دہلوی نے دلی کے "کرخندار وں" کی زبان میں اُنہی کے خیالات کی ترجمانی نہایت خوبی سے کی ہے۔ دہلی کے شرفا کی زبان، بیگماتی زبان اور اُردوئے معلّیٰ کے اکثر نمونے پیش کئے جا چکے ہیں لیکن اُن طبقوں کی زبان جو تعلیمی برکتوں سے محروم ہیں ابتک صفحۂ قرطاس پر منتقل نہیں کی گئی تھی مُغنی صاحب نے اس خدمت کو انجام دیکر ایک اہم ضرورت کو پورا کیا۔ اس دلچسپ کتاب کی اشاعت سے مُصنّف کا مقصدِ خاص اُس سوءظن کا ازالہ بھی ہے جو عام طور سے باہر والوں کو "کرخنداروں" کی عجیب و غریب زبان سُنکر دلی کی ٹکسالی زبان سے ہو جاتا ہے۔ قیمت ۸؍ مُصنّف کوچہ دکھنی رائے دریا گنج دہلی سے طلب کیجئے

---

**مبادی علم المعیشت** یہ اُردو زبان کی بدقسمتی ہے کہ علم المعیشت (اکنامکس) جیسے ضروری علم کے متعلق ہماری زبان میں کتابوں کا اس قدر فقدان ہے کہ اگر کوئی اس کے ابتدائی مسائل اُردو زبان میں پڑھنا چاہے تو مشکل سے اس قسم کی کوئی کتاب دستیاب ہو سکے گی۔ ہمیں مسرت ہے کہ آغا محمد اشرف صاحب بی۔ اے دہلوی نے اس ضرورت کو محسوس کیا اور نہایت عرقریزی اور جانفشانی سے اکنامکس کے اُصولوں پر "مبادی علم المعیشت" لکھ کر اُردو پر احسان کیا۔

مبادی علم المعیشت میں اکنامکس کے تمام مسئلوں کو مبتدیوں کی سہولت کے لئے نہایت سادہ اور سلیس زبان میں لکھا گیا ہے اور ہندوستانی زندگی کی مثالوں سے واضح کیا گیا ہے اس لئے یہ کتاب ہندوستانی طلبا کیلئے اور بھی زود فہم ہو گئی ہے۔ میٹرک اور کالج کے اُن طلبا کے لئے جو اکنامکس لیں اس کتاب کا مطالعہ ازبس مفید ثابت ہوگا۔ کتاب کا سائز ساقی سے نصف ہے، طباعت، کتابت اور کاغذ نہایت عمدہ۔ ضخامت تقریباً دو سو صفحات۔ قیمت صرف ۱۲؍ (بارہ آنے) ہے جو ہمارے خیال میں ایسی کتاب کے لئے بہت کم ہے۔ "مشاہد"

ملنے کا پتہ:- ساقی بُک ڈپو۔ کھاری باؤلی۔ دہلی

**مضامین جوہر** مرتبہ مجلس جوہر جامعہ ملیہ دہلی۔ یہ اُن چیدہ مضامین کا مجموعہ ہے جو جامعہ کے قلمی رسالہ جوہر میں وقتاً فوقتاً شایع ہوتے رہے ہیں۔ اس میں نظمیں اور غزلیات بھی شامل ہیں اور مولانا مرحوم کا ایک فوٹو بھی ہے قیمت عہ

**نفسیات شباب** ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ نے برلن کے مشہور مصنف کی نایاب تصنیف کا ترجمہ کیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ نوجوانوں کی سیرت اور تخیل کیا چیز ہے۔ عشق، تصویر، پاکیزگی خیالات پر اس سے بہتر اور کوئی کتاب نہیں ہو سکتی فلسفۂ محبت اور عشق پر خوب بحث کی گئی ہے ارتقا اور ارتفاع انس کو کمال وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد نوجوان اپنے آپ کو دوسری دُنیا میں پاتا ہے۔ لکھائی چھپائی نہایت عمدہ کاغذ سفید چکنا۔ قیمت صرف تین روپے (۳) علاوہ محصولڈاک۔

**تلاشِ حق** مصنفہ ڈاکٹر عابد حسین صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ مہاتما گاندھی کی آپ بیتی۔ گاندھی جی نے اس میں اپنے اخلاقی ذہنی اور سیاسی تجربات اپنے آپ تحریر فرمائے ہیں۔ آپ پڑھکر متحیر ہوں گے کہ افریقہ اور ہندوستان میں اس دُھن کے پکے انسان نے کیا کیا کارہائے نمایاں انجام دیے۔ متعدد تصاویر۔ قیمت ہر دو حصّہ ..... ۱۲ /

**پردۂ غفلت** ڈاکٹر عابد حسین ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی نے اسلامی معاشرت کی سچی تصویر، تعلیم نسواں، آزادی نسواں اور پردہ پر مفید و محققانہ بحث کی ہے۔ اپنی نوعیت کی یہ پہلی کتاب ہے، دلچسپ ظرافت آمیز اور نتیجہ خیز ہے۔ قیمت صرف ایک روپیہ (عہ)

**کیمیاگر** مختصر افسانوں کا یہ اچھا مجموعہ اپنے اخلاقی اور ادبی محاسن کی بنا پر اردو میں ایک نئی چیز ہے۔ اکثر پڑھنے والوں کو ان افسانوں میں اپنی زندگی کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور نظر آئے گا۔ کیمیاگر اردو کی بہترین کتابوں میں شمار کی جاسکتی ہے۔ قیمت ایک روپیہ (عہ)

**کھیتی** پروفیسر محمد مجیب صاحب بی۔ اے۔ آکسن۔ یہ ڈرامہ مجیب صاحب نے مسلمانوں کی موجودہ حالت کو دیکھتے ہوئے لکھا ہے۔ اور اس میں دکھایا گیا ہے کہ مذہب اور اخلاق کس رستہ پر چلانا چاہتے ہیں زمانہ کی مصلحتیں قومی ضروریات سب پر ایک نظر ڈالی گئی ہے۔ مسلمانوں کی ذہنی اور قومی رہنمائی کیلئے ایک دلچسپ ڈراما ہے۔ قیمت ۶ /

**گناہ کی دیوار** پروفیسر اشتیاق حسین صاحب ایم۔ اے کی تصنیف جسمیں بتایا گیا ہے کہ گناہ بُری چیز ہے لیکن شقاوت قلب اور تکبر بدترین چیز ہے گناہ کی دیوار شاید ٹوٹ جائے لیکن شقاوتِ قلب و تکبر کے بتوں کو توڑنا ناممکن ہے۔ اس کتاب میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ گناہ کی دیوار کیسے ٹوٹ سکتی ہے قیمت صرف ۸ /

**ہمزاد** مصنفہ پروفیسر اشتیاق حسین صاحب ایم۔ اے۔ یہ ڈراما گو دلچسپ اور پُرمذاق ہے تو ساتھ ہی عبرت آموز اور نتیجہ خیز بھی ہے۔ دیکھئے اگر کہیں شوہر صاحب عمر کی کئی منزلیں طے کرچکے ہوں اور بیوی بیچاری کم عمر ہو تو یہ قضیہ کیا صورت اختیار کرلیتا ہے۔ یہ ظرافت کا پہلو لئے ہوئے بہت ہی نتیجہ خیز ڈرامہ ہے۔ قیمت ۶ /

# پاکیزہ لٹریچر کی کتابیں

**گُولتار**۔ اس کے بعض حصے ہنسانے والے، بعض رُلانے والے اور بعض نہایت پُراسرار ہیں۔ قیمت عمہ؍

**ویمپائر**۔ ایک دوشیزہ کی عصمت ریزی کا عجیب و غریب درد انگیز و مضحکہ خیز قصہ۔ قیمت عمہ؍

**شریر بیوی**۔ ایک شوخ و شنگ لڑکی کی داستان جس کو پڑھ کر بے اختیار ہنسی آتی ہے۔ قیمت عہ؍

**فل لوٹ**۔ حُسن و عشق و بے حد دلچسپ مختصر ناول۔ جذبات و تاثرات کا دلآویز مُرقع۔ قیمت عہ؍

**رُوحِ ظرافت**۔ صحیح معنوں میں ظرافت کی رُوح ہے۔ آٹھ نہایت دلکش افسانوں کا مجموعہ۔ قیمت عہ؍ مجلد عہ؍

**رُوحِ لطافت**۔ جذباتِ لطیف کی رُوح ہے۔ آٹھ بیحد دلچسپ و عبرت انگیز افسانے۔ قیمت عہ؍

**مرزا جنگی**۔ لکھنؤ کی پُرانی تہذیب اس دلآویز ڈرامے میں دیکھ کر ہنستے ہنستے لوٹ جائیے۔ قیمت ۱۲؍

**جِنّی کی انگوٹھی اور لوٹے کا راز**۔ ایک صاحب کی ہنسانے والی سرگذشت اور ایک خاتون کی درد انگیز سوانح حیات کا پُرلطف فسانہ دیکھا جائیگا۔ شائقین کے بیحد اصرار پر کتابی صورت میں شایع کیا گیا۔ خوبصورت مضبوط جلد۔ قیمت عہ؍

**جنت کا بھوت**۔ یہ افسانہ بھی اس قدر پسند کیا گیا کہ اس کو کتابی صورت میں شایع کرنا پڑا ہے۔ قیمت ۱۲؍

**تفویض**۔ ایک گریجویٹ خاتون کی شادی ایک مسجد کے مُلّا سے ہو جاتی ہے۔ اسکے عجیب و غریب نتائج۔ قیمت ۵؍

**قرآن اور پردہ**۔ آیاتِ قرآنی کے حوالوں سے بتایا گیا ہے کہ صحیح پردہ کیا ہے اور رسمی پردہ کیا بن گیا ہے۔ قیمت عہ؍

**حدیث اور پردہ**۔ صحیح احادیث کے حوالوں سے پردہ کی حقیقت بیان کی گئی ہے۔ نہایت ضروری کتاب قیمت عہ؍

**رقص و سرود**۔ مسلمان لڑکیوں کیلئے رقص و سرود کی تعلیم کس قدر ضروری ہے؟ مذہبی رو سے اس کا جواز۔ قیمت ۴؍

**نجمہ نوری**۔ ماں کی مامتا سے متعلق ایک دلدوز تمثیل جسکو پڑھکر آپ اپنے آنسو نہ روک سکیں گے۔ قیمت ۱۲؍

**چندرا موہنی**۔ حُسن و عشق کی داستانِ جگر پاش۔ محبت کے لطیف جذبات کا حسرتناک انجام۔ قیمت عہ؍

**سلوےٰ**۔ شہرۂ آفاق ادیب آسکر وائلڈ کی مشہور تمثیل "سالومی" کا لاجواب و کامیاب ترجمہ۔ قیمت ۵؍

**چار چاند**۔ حضرت ناصر نذیر فراق مرحوم کا مجموعہ مضامین۔ دلّی کی نتھری سُتھری بول چال کا اعلیٰ نمونہ۔ قیمت ۸؍

**اخوان الشیاطین**۔ سات سائنٹفک افسانوں کا بیحد دلکش مجموعہ۔ اسکے مطالعہ میں آپکے رُونگٹے کھڑے ہو جائیں گے قیمت عہ؍

**تعلیم زدہ بیوی**۔ اس ڈرامہ کو پڑھکر آپ اپنی ہنسی نہ روک سکینگے۔ عبرت انگیز انجام۔ قیمت ۸؍

**انتخاب دیوان شمس تبریز**۔ مولانا روم کے دیوان کا لاجواب انتخاب اور اس پر ایک نہایت محققانہ مقالہ۔ قیمت عمہ؍

**ترکی جمہوریہ**۔ ترکوں کی حکومت، سیاست، اور معاشرت کا سچا فوٹو۔ ہر لحاظ سے بہترین کتاب ہے۔ قیمت عہ؍